ماہر القادری

باہر کر دیا۔

ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی (آنجہانی) پاکستان کی مخالفت اور ہندوستانی مسلمانوں کی دشمنی میں کسی بھی مہاسبھائی و سنگھی لیڈر سے پیچھے نہ تھے، اُن کے مرنے پر انھی فضل الحق صاحب نے فرمایا کہ دُنیا میں میرا ایک ہی بھائی تھا اور وہ بھائی شیاما پرشاد مکرجی تھا۔

ابھی حال میں مسٹر فضل الحق کا ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا ہے جس میں اُنھوں نے اسلامی دستور کی دفعات کو رجعت پسندانہ کہا ہے! اگر موصوف کے بیان کی پریس نے ٹھیک ٹھیک ترجمانی کی ہو تو پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر فضل الحق نے اسلامی دستور سازی کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا وہ کمیونسٹوں اور ہندوؤں کی آواز ہے! اور اس طرح انھوں نے اپنے رفقاء کے احسانات کا بدلہ چکانے کی کوشش کی ہو۔

جو شخص یہ کہ پاکستانی عوام کے مطالبہ کا خیال کرکے اور جو ہندو [illegible] فراست سے بکر متحدہ محاذ والے اسلامی دستور سازی کے کام کو کتاب و سنّت کی بنیاد پر آگے بڑھائیں اور کمیونسٹوں اور ہندوؤں سے صاف لفظوں میں کہہ دیں کہ ہم اپنے دین اور ضمیر سے غداری نہیں کر سکتے کہ ہمیں ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے ——— اور اگر انھوں نے دین و ملت کے تمام تقاضوں کو پس پشت ڈال کر دوسری راہ اختیار کی تو اسلام پسند طبقہ کی طرف سے اُن کو چیلنج دیا جاتا ہے! جو لوگ نظام اسلامی کے قیام کے لئے لیاقت علی خاں مرحوم، خواجہ ناظم الدین اور ڈاکٹر [illegible] کے دور میں جد و جہد کرتے رہے ہیں وہ سہروردی، فضل الحق، [illegible] اور مولانا بھاشانی ——— کے دور اقتدار میں بھی ان شاء اللہ عزیمت و استقامت کا ثبوت دیں گے۔

اسلام کے خلاف اصلاح و انقلاب کی کسی کوشش کو ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا، ہندوؤں کی دولت اور کمیونسٹوں کے پروپیگنڈے پر لوگ گھمنڈ نہ کریں، یہ سب پانی کے بلبلے ہیں، اسلامی انقلاب کے قدرت رہتے کا بھی آپ دیکھیں گے!

ادب میں فحاشی

ہم نے جو سوہ پاکستان پر تنقید و احتساب کے سلسلہ میں حکومت و سیرت نگری سے کبھی کام نہیں لیا جن باتوں کو ہم نے غلط سمجھا اُن پر حکومت کو ٹوکا اور ہمیشہ ٹوکتے رہیں گے ——— مگر ہم خدا نخواستہ ہٹ دھرم اور عیب جو نہیں ہیں، اور کسی کے محاسن کو چھپانا ہمارے نزدیک بہت بڑی ناانصافی ہے!

فحش لٹریچر کے خلاف حکومت نے جو مہم شروع کر رکھی ہے وہ یقیناً لائق تحسین ہے، فحاشی اور بے حیائی کی روک تھام ہر مہذب حکومت کا فرض ہے، جو حکومت رشوت، چور بازاری اور چوری کا احتساب کرتی ہو اسے فحش ادب پر بھی احتساب کرنا چاہئے!

فحش ادب کی حمایت میں وہی لوگ آواز بلند کر سکتے ہیں جو نہ تو اسلام کی روح کو جانتے ہیں اور نہ اخلاق و شرافت کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں، جن کا مقصد عوام کے جذبات سے کھیل کر سستی شہرت حاصل کرنا اور دولت کمانا ہے!

ادب کو خشک اور کھردرا نہیں نرم و رنگین ہی ہونا چاہئے، مگر رنگینی کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں ———

افتخار اعظمی

"اسلامی تحریک ادب و عمل"

روحِ انتخاب

اسرارِ مشرق

ہماری نظر میں!

ماہر القادری

جلد ۶ نمبر ۲

ماہنامہ

فاران

مئی سنہ ۱۹۵۴ء

ایڈیٹر: ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ر
۸ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱ر

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

پر نظر تھی انہوں نے جیل کی کوٹھری سے لے کر پھانسی کے تختے اور جلاد کی تلوار تک ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور کوئی خوف، لالچ۔ اور دھمکی انہیں جھکا نہ سکی ــ!

جن لوگوں نے تبلیغ دین کا ایسا راستہ اختیار کیا ہے۔ جس میں کسی باطل قوت سے "ٹکراؤ" کا کوئی خطرہ نہیں ہے اور جو وقت کے نمرودوں اور فرعونوں کو ٹوکنا اور ان کے سامنے کلمۂ حق کہنا "سیاست بازی" اور "دُنیاداری" کا کام سمجھتے ہیں۔ ان سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ۔

"کشمکش حق و باطل اور معرکۂ خیر و شر میں تم نے کیا پارٹ ادا کیا؟"

"حق ناشناسوں اور باطل پرستوں نے اللہ کی زمین میں فساد برپا کر رکھا تھا۔ تم نے رفع نزاع و فساد اور قیام امن کیلئے کیا کوشش کی؟

مانا کہ تمہاری پیشانیوں میں سجدوں کے نشان ہیں۔ مگر تمہارے جسموں پہ کوئی زخم بھی ہے؟"

تمہیں صرف نمازیں پڑھنے اور پڑھوانے کے لئے ہی دُنیا میں نہیں بھیجا گیا تھا۔ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی خدمت نہیں سونپی گئی تھی۔ جواب دو کہ تم نے کس "معروف" کو قائم کیا اور کس "منکر" کو مٹایا؟

یہ صحیح ہے کہ تم نے شرابیں نہیں پیں۔

جوا نہیں کھیلا۔

اور دوسری برائیوں سے بھی تم بچے رہے۔

مگر جس قانون کے تحت یہ تمام برائیاں ہو رہی تھیں۔ اور فسق و فجور کا بازار گرم تھا۔ اس قانون کو بدلنے اور اقامت دین کے لئے تم نے کیا جدوجہد کی؟"

تمہارے سامنے اس آخری نبیؐ کا اسوۂ حسنہ تھا جس نے قوت کے ساتھ باطل کے زور کو توڑ کر اللہ کے دین کو غالب ترین طاقت بنادیا۔

اگر تم ہی خود آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ تو جو خدا کے نیک بندے اقامت دین کے لئے تن من دھن کی بازی لگا رہے تھے۔ تم نے اُن کی تائید، رفاقت اور معاونت کا کیا حق ادا کیا؟

داعیانِ حق اور ......!!!

حق کی دعوت دینے والوں کو "غیروں" ہی کے نہیں "اپنوں" کے چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں۔ اور باطل نمرود و فرعون ہی کے لباس میں نہیں بلکہ یزید۔ حجاج اور ابن ھبیرہ کے بھیس میں بھی نمودار ہوتا ہے!

ابن زیاد اور شمر ذی الجوشن کافر نہ تھے۔ وہ نمازیں بھی پڑھتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے۔

لیکن انہوں نے دُنیوی جاہ و دولت اور یزید کی نگاہ میں عزت حاصل کرنے کے لئے حضرت حسینؓ جیسے داعیٔ حق کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا!

یہ اقتدار کا نشہ ہی ایسا ہے کہ آدمی کو بے ضمیر اور سنگدل بنا دیتا ہے ــ!

داعیانِ حق کو سب سے زیادہ تکلیف اس سے پہنچتی ہے کہ جن سے مظلومیت میں غم خواری کی امید اور اس معرکۂ حق و باطل میں رفاقت کی امید ہوتی ہے۔ وہ تائید و معاونت کے بجائے مخالفت اور دشمنی پر اتر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک مُشت دو انگل ڈاڑھیوں، ترشی ہوئی لبوں۔ ہزار دانہ تسبیحوں اور نیچی نیچی عباؤں کے ساتھ اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں پر کفر اور بے دینی کے فتوے صادر کئے جاتے ہیں ــ!

آج بھی حق و صداقت کی تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ اور دُنیا کے جس خطہ میں بھی اقامت دین کے لئے جدوجہد ہو رہی ہے۔ داعیانِ حق طرح طرح کی پریشانیوں۔ مصیبتوں اور آزمائشوں سے دوچار ہیں ــ!

ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان اسلام اور صرف اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اس لئے اس ملک کے ساتھ جو سب سے بڑی خیر خواہی کی جاسکتی ہے، وہ یہی ہے کہ:۔

"پاکستان کے دستور کو!

"معاشرے کو"

"تجارت و تعلیم کو"

غرض یہاں کے سارے کے سارے ماحول کو پورے کا پورا۔

"اسلامی" بنا دیا جائے۔

پاکستان کے مقصدِ وجود کی تکمیل کیلئے جماعت اسلامی جس خلوص و سرگرمی کے ساتھ جد و جہد کر رہی ہے، وہ سب پر ظاہر ہے۔ اس اعتبار سے حکومتِ پاکستان کے اربابِ اقتدار کو سب سے زیادہ اعتماد جماعت اسلامی پر ہونا چاہیئے تھا۔ اتنی مبنی دین کی جدوجہد میں حکومت جماعت اسلامی کی مدد کرتی اور جماعت اسلامی حکومت کا ساتھ دیتی۔ اس طرح مل جُل کر پاکستان کی تعمیر خالص اسلامی بنیادوں پر ہوتی۔

مگر ہو یہ رہا ہے کہ اربابِ اقتدار کو سب سے زیادہ کد بیچاری جماعت اسلامی ہی سے ہے۔ ان کا بس چلے تو اس جماعت کا نام و نشان بھی دنیا میں باقی نہ رہنے دیں!

پاکستان کے اربابِ اقتدار نے جماعتِ اسلامی کے ارکان کو سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ کرکے ان کو بے روزگاری اور فقر و فاقہ کی مصیبتوں میں مبتلا کرنا چاہا، وہ اس غلط فہمی میں تھے کہ:۔

"پیٹ کی مار بُری ہوتی ہے۔ روزگار چھن جانے کی دھمکی دی جائے گی تو یہ لوگ ڈگمگا جائیں گے"

لیکن ان حق پرستوں نے رزق کی کنجیوں کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھا۔

اور حق کے مقابلہ میں لگے ہوئے روزگار کو چھوڑنے میں ذرا سی بھی جھجک اور کمزوری نہیں دکھائی۔

حالانکہ جہاں تک دفاتر کے ڈسپلن اور فرض شناسی کا تعلق ہے، ان میں سے جو شخص جس جگہ پر بھی تھا، اپنے کام کو انتہائی دیانت، محنت اور مستعدی کے ساتھ انجام دیتا تھا۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ:۔

اقتدار کی نگاہ میں حق پرستی جرم ہی کچھ اس نوعیت کا ہے، جسے معاف ہی نہیں کیا جاسکتا۔

عدل و انصاف کی اس "ستم ظریفی" کو کیا کہیئے کہ وہ لوگ جو کسی اہل معاملہ کی چائے کی ایک پیالی کے بھی روادار نہ تھے، انھیں صرف جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے کی بناء پر ملازمتوں سے برطرف کردیا گیا۔ اور وہ لوگ حکومت کی کرسیوں پر پوری آن بان کے ساتھ متمکن ہیں، جن میں سے نہ جانے کتنوں کے لنچ اور ڈنر کا شاید ایک لقمہ بھی رشوت اور ناجائز کمائی سے پاک نہیں ہوتا۔

جماعت اسلامی کے اخباروں اور رسالوں پر حکومت کے بنائے ہوئے "بیلنوں" کے وار ہوتے رہے ہیں۔

کسی سے زرِ ضمانت طلب کی گئی ہے۔

کسی کو بند کیا گیا ہے۔

حالانکہ یہ وہ اخبار اور جریدے ہیں۔ جو پاکستان کے معاشرے کو پاکیزہ بنانے کے خیال سے سینما تک کے اشتہارات نہیں چھاپتے۔

اور جن کے اوراق پر تصویریں بھی نہیں دیکھی گئیں۔!

جن کی تحریریں دیانت و شرافت کا نمونہ ہوتی ہیں۔

اور جو ادب و صحافت کے اس پست ماحول کو ہر اعتبار سے بلند بنانا چاہتے ہیں۔

جماعت اسلامی کا لٹریچر دفتر اور فوج کی لائبریریوں میں نہیں جاسکتا۔ اس پر پابندیاں ہیں۔ حالانکہ جماعت اسلامی کا لٹریچر

اسلامی فکر کے اعتبار سے اس قدر مدلل، بااعتماد، سنجیدہ اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہے کہ سیکڑوں سے بڑھ کر سو دو سو اور ہزار دو ہزار نہیں لاکھوں انسانوں کے صرف دل و دماغ اور ذہن و فکر ہی نہیں زندگیاں تک بدل گئی ہیں۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر نے کالجوں کے نوجوانوں میں شرم و حیا اور اسلامی کردار پیدا کیا ہے —!

جو لٹریچر پاکستان کے عوام، مزدوروں، کلرکوں، سپاہیوں اور افسروں میں زیادہ سے زیادہ پھیلائے جانے کا مستحق تھا۔ اس پر حکومت کی طرف سے قدغن ہے —!

جماعت اسلامی کے مرکزی بیت المال پر چھاپہ مار کر اس کی جمع پونجی حکومت نے اپنے قبضہ میں لے رکھی ہے!

اس کے ارکان قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا کئے جاتے رہے ہیں —!

اور بعض کو آزاد بھی کر دیا ہے تو ان پر تقریر و تحریر کی سخت پابندیاں ہیں —!

اور سب سے بڑھ کر ستم ظریفی یہ کہ جماعت اسلامی کے امیر مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو صرف ایک پمفلٹ لکھنے کے جرم میں موت کی سزا سنائی گئی اور پھر اس سزا کو چودہ سال کی قید سے بدل دیا گیا —!

صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کے شہر شہر اور قریہ قریہ سے مولانا مودودی کی رہائی کے لئے برقیئے، محضر نامے اور احتجاجی مراسلے بھیجے گئے ہیں جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ مگر ہمارے "کرسی نشین" اور "عزت مآب" معلوم نہیں کس ہنگامۂ احتجاج کے منتظر ہیں۔ یہ لوگ تغافل کو ازخود مستی کر رہے ہیں۔ عوام کے مطالبے کو جان بوجھ کر ٹھکرا رہے ہیں۔ یہ اقتدار کے نشہ میں اس قدر سرشار ہیں کہ عوام کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو انہوں نے بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے!

اور حکومت پاکستان کا یہ سلوک اس عظیم المرتبت اسلامی مفکر کے ساتھ ہے جس نے جاہلیت کا گرد و غبار صاف کر کے اسلامی افکار کو بالکل خالص، بے میل اور اصلی رنگ و روپ میں پیش کیا ہے۔ کیا ستم ہے کہ جو شخص بڑی سے بڑی قدر دانی کا مستحق تھا اس کے لئے دار و رسن اور قید و بند کے ہنگامے کھڑے کئے گئے ہیں —!

اگر ابوالاعلیٰ مودودی نے کوئی خطا کی ہے تو اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلاؤ۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو پھر اس کو رہا کرو۔ یا تم ڈرا کرتے ہو نہ دو۔! مانا کہ تمہارے ہاتھ میں طاقت ہے۔ قید خانوں کی کنجیوں سے لے کر مشین گنوں تک کی جوڑیاں اور کمانیاں تمہارے قبضہ میں ہیں۔ مگر تم سے بڑی ایک اور طاقت بھی ہے! وہ اتنی بڑی طاقت ہے کہ آن کی آن میں عزتوں کو ذلتوں سے بدل سکتی ہے۔ اور اس کے ایک اشارے میں تخت نشین، بوریا نشین بن سکتے ہیں!

اللہ کے غضب کو جوش میں آنے کا موقع نہ دو۔ اب بھی وقت ہے کہ تلافی مافات کر کے تم اللہ کی رحمت کے سزاوار بن سکتے ہو! یہ تم کو دھمکی نہیں دی جا رہی ہے۔ اور نہ تم کو ڈرایا جا رہا ہے۔ بلکہ پوری دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ تمہیں ایسا مشورہ دیا جا رہا ہے، جس میں تمہاری دین و دنیا دونوں کی بھلائی ہے۔

وہ تمہارے ہوا خواہ نہیں بدخواہ ہیں جو تمہاری بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کو سراہتے رہتے ہیں۔ کہ:-

"کیا کہنے آپ کی اس ڈپلومیسی کے!"

"کیا انداز جہاں بانی ہے سرکار!"

"بسمارک اور گلیڈسٹون کو بہت پیچھے چھوڑ دیا آپ نے سیاست کے میدان میں!"

"دشمنوں اور حریفوں کو اسی طرح نیچا دکھایا جاتا ہے —— مائی لارڈ!"

پاکستان کے خداوندو! تمہاری خفیہ پولیس پورے چھ سال سے جماعت اسلامی پر نگرانی قائم کئے ہوئے ہے۔ انصاف سے بتاؤ۔ جماعت اسلامی کے خلاف رتی برابر قابل اعتراض مواد مل سکا ہے؟ دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح اگر جماعت اسلامی کا مقصد

صرف عہدے حاصل کرنا اور حکومت کو شکست دینا ہوتا، تو مشرقی پاکستان کے انتخابات میں یہ جماعت متحدہ محاذ میں شامل ہو کر اس "شاندار فتح" میں حصہ دار بن سکتی تھی۔ مگر جماعت نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی اور نہ اسے کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی صلح و جنگ اور وصل و فصل کا پیمانہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی ہے۔ جماعتِ اسلامی نہ تو سودے بازی کرتی ہے اور نہ گھٹیا قسم کی سیاست کے داؤں پیچ اسے آتے ہیں ۔۔۔ !

جن کو اپنا اقتدار۔ اپنی خواہشیں اور اپنی چودھراہٹ عزیز ہے۔ افسوس ہے کہ جماعتِ اسلامی کسی نوبت پر بھی ان کی خواہشوں اور تمناؤں کا ساتھ نہیں دے سکتی ۔۔۔ !

اللہ کی مرضی کو نظر انداز کرنے والے خواہشوں کے بندے، جماعتِ اسلامی سے کسی تعاون کی امید نہ رکھیں !

جماعتِ اسلامی "اشتراکیت" کی مخالفت اس لئے نہیں کرتی کہ وہ لوگوں کی شخصی ملکیت کو بچانا چاہتی ہے۔ جماعتِ اسلامی کی "اشتراکیت" سے جنگ اس لئے ہے کہ یہ ایک لادینی اور کافرانہ نظامِ معیشت ہے۔ اسی طرح جماعتِ اسلامی امریکہ کے نظامِ حکومت کو بھی صحیح نہیں سمجھتی۔ اور جہاں تک غیر اسلامی ہونے کا تعلق ہے امریکہ اور روس کے نظام میں وہ کوئی فرق نہیں کرتی ۔۔۔ !

دنیا کے جس نظام میں۔ دستور و قانون میں۔ معاشرت و تجارت میں۔ بزم و رزم میں۔
خلوت میں۔ جلوت میں۔ آرٹ میں۔ سیاست میں۔ جاہلیت پائی جاتی ہے۔
جماعتِ اسلامی اس کی مخالف ہے، اور اس سلسلہ میں اصلاح و انقلاب کی
ہر امکانی کوشش کرنا اس کے پروگرام کا لازمی بلکہ ناگزیر جزو ہے ۔۔۔ !

جماعتِ اسلامی کو ذاتی طور پر نہ کسی سے محبت ہے اور نہ مخالفت ہے۔ اس کی دوستی اور دشمنی حق و باطل کی نسبت سے ہے! جہاں حق ہے جماعتِ اسلامی کی تمام ہمدردیاں بلکہ نیازمندیاں اس کے ساتھ ہیں۔ اور جہاں باطل ہے جماعتِ اسلامی کی طرف سے اس کو کھلا چیلنج ہے ۔۔۔ !

جماعتِ اسلامی حق و باطل کی آمیزش کو "خالص باطل" سے زیادہ خطرناک سمجھتی ہے۔
پس وہ کسی ایسے نظام یا دستور پر نہ تو قانع ہو سکتی ہے اور نہ اس سے سمجھوتہ کر سکتی ہے۔ جس میں حق کے ساتھ باطل بھی ملا ہوا ہو !
جماعتِ اسلامی حق کے ساتھ کسی قسم کی آمیزش کو گوارا نہیں کر سکتی !

جماعتِ اسلامی کا مقصدِ وجود اور مطمحِ نظر پورے کا پورا اسلام ہے۔ خالص اور بے میل اسلام۔
وہ اسلام۔ جو کتاب و سنت میں پایا جاتا ہے۔ اور جسے صحابہ کرام عملی طور پر برت چکے ہیں۔
وہ اسلام۔ جس کے آخری نبی حضور محمد عربی (فداہ ابی و امی) ہیں۔ جن پر نبوت ختم کر دی گئی۔
جماعتِ اسلامی اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کسی جھوٹے نبی کے بغاوت کا جوڑ اسلام سے ملا دیا جائے!
اور ایک خود ساختہ نبی کاذب (علیہ ما علیہ) کی امت صادق و مصدوق نبی (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کی امت میں شامل کر لی جائے۔
یہ دو رنگی کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ اس تضاد کو کس طرح گوارا کیا جا سکتا ہے !
جماعتِ اسلامی جو دینی نظریے پیش کرتی ہے۔ اسے وہ کسی طاقت۔ کٹ حجتی اور دھاندلی کے زور سے منوانا نہیں چاہتی۔
اس کے پاس دلائل ہیں۔
براہین و نظائر ہیں۔
وہ انسان کی عقلِ عمومی کو دعوت دیتی ہے کہ ان نظریوں کو حق کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لو۔

اور جنہوں نے عصبیت اور تنگ نظری کو بالائے طاق رکھ کر جماعتِ اسلامی کی دعوت کو جانچا اور پرکھا ہے۔ تو نہ صرف یہ کہ وہ مطمئن ہو کر رہ گئے ہیں۔ بلکہ ان کی زندگیاں بدل گئی ہیں۔

کتنے بہت سے تاریک سینے ہیں۔ جن میں اللہ تعالیٰ نے جماعتِ اسلامی کی دعوت کے ذریعہ ہدایت کی شمع روشن کی ہے!

یہ نہ تو مبالغہ اور قیاس آرائی ہے۔

اور نہ سنی سنائی باتیں۔

یہ واقعات ہیں۔ مشاہدات ہیں۔ اس کے ثبوت میں ہزاروں زندگیاں پیش کی جاسکتی ہیں!

پاکستان میں بہرحال دیر یا سویر "اسلام" ہی کو آنا ہے۔ اسلام کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر کے کوئی اپنی دین و دنیا ضرور بگاڑ سکتا ہے مگر اسلام کو روک نہیں سکتا۔ اوپر سے لے کر نیچے تک کے لوگوں اور مسجدوں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک کے افراد کی زندگیاں بے نقاب ہو چکی ہیں۔ کوئی کیسا ہی بھیس بدل کر اور روپ دھار کر کیوں نہ آئے۔ عوام بتا سکتے ہیں کہ کون کیا ہے؟ اسلام کے نام سے غلط فائدہ نہ کوٹ پتلون اٹھا سکتے ہیں اور نہ جبہ و دستار! پچھلے سال کی یہ کشمکش ایک کسوٹی تھی۔ جس نے صاف بتا دیا ہے کہ یہ کھوٹا ہے اور یہ کھرا ہے ——!

ہمیں اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ حق کے لئے یہ انتہائی مظلومیت کا دور ہے۔ اور داعیانِ حق کے واسطے قدم قدم پر پریشانی اور مصیبت کے کانٹے بچھے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ہمیں چلنا اسی منزل میں ہے۔ پاؤں جواب دے دیں گے تو سر کے بل چلیں گے۔ جب تک جان میں جان ہے۔ اللہ کا راستہ چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ہم اختیار کر ہی نہیں سکتے، ہمارا مقصود کامیابی نہیں۔ بلکہ —— "رضائے حق" ہے ——!

لیکن

یہ بھی ہم توقع رکھتے ہیں کہ سدا ایک ہی سے لیل و نہار نہ رہیں گے۔ حالات کو ایک نہ ایک دن بدلنا ہے۔ اور ضرور بدلنا ہے۔ حق پرستوں نے اگر صبر، عزیمت اور استقامت کا ثبوت دیا۔ تو وہ دن دور نہیں جب دنیا اپنی آنکھوں سے:

"جَاءَ الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔"

کا منظر دیکھ لے گی ——!

ماہر القادری

۲۰ اپریل ۵۴ء

کی طرف انتساب درست نہیں ہے اھ۔ یقین کرتے تھے کہ اس کے مشمولات کو فضلاء شیعہ نے لکھا ہے جن میں خود سید رضی بھی شامل تھے

ابن خلکان (متوفی ۶۸۱ھ مطابق ۱۲۸۲ء) نے "وفیات الاعیان" میں شریف المرتضیٰ کے حال میں لکھا ہے کہ:۔

قد اختلف الناس فی کتاب نھج البلاغة المجموع من کلام الامام علی بن ابی طالب رضی اللّٰہ عنہ هل هو جمعه ام جمع اخیه الرضی۔

وقد قیل انه لیس من کلام علی۔ وانما الذی جمعه ونسبه الیه هو الذی وضعه۔ واللّٰہ اعلم[1]

لوگوں کو کتاب نہج البلاغہ کے بارے میں، جو مجموعہ ہے امام علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے کلام کا، اختلاف ہے کہ اسے مرتضیٰ نے جمع کیا ہے یا ان کے بھائی رضی نے اور بعض یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ علیؓ کا کلام نہیں جس نے اسے جمع کیا اور ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی نے یہ بنایا ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن خلکان کے بعد ابن الاثیر نے "مختصر الوفیات[2]" میں صلاح الدین صفدی نے "الوافی بالوفیات[3]" میں علامہ یافعی نے "مرآۃ الجنان[4]" میں ابن العماد نے "شذرات الذہب[5]" میں شریف رتضیٰ کے تذکرے میں تقریباً انھیں الفاظ کو دہرا دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب تذکرہ نگار بھی ابن خلکان کے ہم رائے ہیں۔

علامہ ذہبی نے "میزان الاعتدال[6]" میں اور ابن حجر العسقلانی نے "لسان المیزان[7]" میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:۔

"وهو الشریف المرتضیٰ، المتهم بوضع کتاب نھج البلاغة۔ وله مشارکة قویة فی العلوم ومن طالع کتابه نھج البلاغة، جزم بانه مکذوب علی امیر المومنین رضی اللّٰہ عنه۔ ففیه السب الصراح والحط علی السیدین ابی بکرؓ وعمرؓ وفیه من التناقض والاشیاء الرکیکة والعبارات التی من له معرفة بنفس القرشیین الصحابة وبنفس غیرهم ممن بعدهم من المتاخرین، جزم بان اکثره باطل"

انھیں پر کتاب نہج البلاغہ کے بنانے کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ مختلف علوم میں ان کی بڑی حصہ داری تھی۔ اور جس نے ان کی کتاب نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے نام پر بنائی گئی ہے۔ کیونکہ اس میں کھلی کھلی گالیاں ہیں اور توہین ہے دو سرداروں ابوبکرؓ وعمرؓ کی۔ اور اس میں ایسا تناقض، رکیک باتیں، اور عبارتیں ہیں۔ کہ جسے قریشی صحابہ کا طریقہ کتابت وگفتگو معلوم ہے۔ اور ان کے بعد کے لوگوں کے اسلوب کو پہچانتا ہے۔ وہ یقین کرے گا کہ اس کا بڑا حصہ باطل ہے۔

ابن خلکان اور اس کے متبعین کے تبصروں سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(الف) نہج البلاغہ کے مولف کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے۔ کچھ عالم اسے شریف مرتضیٰ اور دوسرے شریف رضی کی تالیف بتاتے ہیں۔

(ب) خود ان حضرات کے نزدیک شریف مرتضیٰ اس کے جامع ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے کتاب کا ذکر شریف مرتضیٰ ہی کے حال میں کیا ہے۔

(ج) بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ نہج البلاغہ کے خطبے وغیرہ امیر المومنین کے نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے جامع نے خود لکھ کر ان کی طرف منسوب کر دیئے ہیں۔

ذہبی اور عسقلانی کی رائے یہ ہے کہ شریف مرتضیٰ نے اس کتاب کو خود لکھ کر امیر المومنین کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

---

[1] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۳۲۷۔ طبع مصر ۱۲۷۵ھ۔ ۱۸۵۸ء۔ [2] ابن الاثیر۔ یہ کتاب میرے سامنے نہیں ہے لیکن "روضات الجنات" طبع ایران ۱۳۰۷ھ ص ۳۸۹ میں اس کے جو الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ وہ ابن خلکان کی صدائے بازگشت ہے۔ [3] "الوافی" کی پہلی جلد ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) میں استنبول سے شائع ہو چکی ہے۔ مگر یہ محدثین کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس میں شریف مرتضیٰ کا ذکر نہیں آیا ہے میں نے الوافی کا حوالہ "روضات الجنات" ص ۳۸۹ سے نقل کیا ہے۔ جس کے سامنے اس کتاب کا مکمل نسخہ تھا۔ چنانچہ وہ الفاظ جو روضات میں صفدی کے نام سے نقل ہوئے ہیں بعینہ ابن خلکان کے الفاظ ہیں۔ [4] مرآۃ الجنان جلد ۳ ص ۵۵ طبع حیدرآباد ۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء۔ [5] شذرات الذہب جلد ۳ ص ۲۵۷ طبع مصر ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) [6] میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۰۰ طبع لکھنؤ ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۴ء۔ [7] لسان المیزان جلد ۴ ص ۲۲۳ طبع حیدرآباد ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۲ء۔

ان دونوں نے ابن خلکان وغیرہ کے برخلاف اس کتاب کے مشمولات کے جعلی ہونے کے دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ یعنی:-

۱- اس میں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی کھلی توہین نظر آتی ہے۔

۲- اس کے بیانوں میں تناقض اور اختلاف ہے۔

۳- اس میں ایسی رکیک باتیں اور عبارتیں ہیں جو صحابہ کے مزاج اور اسلوب سے دور اور متاخرین کے رویہ کے قریب معلوم ہوتی ہیں۔

اگلے صفحات میں ابن خلکان اور ذہبی کے مذکورہ بالا دعووں اور دلیلوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تاکہ نہج کے مؤلف اور اس کے مندرجات کے متعلق قطعی رائے قائم کی جا سکے۔

مؤلف کی تعیین

تاریخ و تذکرے کی جن کتابوں میں شریف رضی، مرتضیٰ کا ذکر ہوا ہے ان میں سے حسب ذیل مصنفات کے مرتب ان دونوں بھائیوں کے معاصر ہیں۔

۱- یتیمة الدہر و تتمة الیتیمہ - ہر دو مؤلفہ ابو منصور ثعالبی متوفی ۴۲۹ھ - ۱۰۳۸ء۔ [1]

۲- کتاب الرجال - مؤلفہ علامہ نجاشی متوفی ۴۵۰ھ - ۱۰۵۸ء۔ [2]

۳- کتاب الفہرست - مؤلفہ شیخ الطائفہ ابوجعفر الطوسی متوفی ۴۶۰ھ - ۱۰۶۸ء۔ [3]

۴- تاریخ بغداد - مؤلفہ خطیب بغدادی۔ متوفی ۴۶۳ھ - ۱۰۷۱ء۔ [4]

نمبر ۳ میں شریف رضی کا مذکور نہیں ہے اور شریف مرتضیٰ کے ذکر میں ان کی جن کتابوں کے نام لکھے ہیں ان میں نہج البلاغہ شامل نہیں ہے۔

نمبر ۱- اور نمبر ۴ میں دونوں بھائیوں کا حال لکھا گیا ہے۔ مگر نہج البلاغہ کا تذکرہ کہیں بھی نہیں ہے۔

نمبر ۲ میں بھی ان دونوں کا ذکر اور ان کے مصنفات کی تفصیل مندرج ہے۔ مگر اس میں کتاب کا مؤلف شریف رضی کو قرار دیا گیا ہے۔

نجاشی اور طوسی دونوں کی شہادت کی اہمیت محتاج بیان نہیں اور اس لئے اسے مسئلہ زیر بحث میں فیصلہ کن قرار دینا چاہیئے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ دوسری خارجی و داخلی شہادتیں بھی درج کر دوں۔ تاکہ آئندہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ نہج البلاغہ کے مؤلف شریف رضی ہونے کی دیگر شہادتیں حسب ذیل ہیں:-

پہلی دلیل

کتاب کے دیباچہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ میں نے عنفوان سن میں "خصائص الائمہ" نام کی ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کے خصائص لکھنے پایا تھا کہ بعض موانع نے کتاب کے اتمام سے روک دیا۔ اس حصے کے آخر میں ایک فصل ایسی بھی تھی جس میں امیر المومنین کی چھوٹی چھوٹی حکمت و ادب اور امثال پر مشتمل گفتگوئیں درج کی تھیں۔ دوستوں نے اس حصے کو بے حد پسند کیا۔ اور یہ خواہش کی کہ آپ کے مختلف مضامین پر مشتمل خطبے، خطوط، مواعظ اور حکیمانہ اقوال چھانٹ چھانٹ کر ایک کتاب میں جمع کر دوں۔[5]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہج البلاغہ کے جامع نے اسے اپنی دوسری کتاب "خصائص الائمہ" کے بعد تالیف کیا تھا۔ نہج کے بیسویں خطبے کی شرح میں اس کتاب کا حوالہ دے کر مؤلف نے اپنے دیباچہ کے بیان کی توثیق بھی کر دی ہے۔ چنانچہ اس کے یہ الفاظ کہ:-

"قد نبّھنا فی کتاب الخصائص علی عظم قدرھا وشرف جوھرھا۔"[6]　　ہم نے کتاب الخصائص میں اس کی عظمت قدر اور شرافت جوہر کی طرف توجہ کر دیا ہے۔

---

[1] یتیمة الدہر جلد ۲ ص ۲۹۷ طبع دمشق ۱۳۰۴ھ - ۸۵-۱۸۸۴ء - وتتمة الیتیمہ جلد ۱ ص ۵۳ طبع طہران ۱۳۵۳ھ - ۱۹۳۴ء -

[2] کتاب الرجال ص ۱۹۲ و ۲۸۳ طبع بمبئی ۱۳۱۷ھ - ۱۸۹۹ء - [3] کتاب الفہرست ص ۲۱۸ طبع کلکتہ ۱۲۷۱ھ - ۱۸۵۴ء -

[4] - تاریخ بغداد جلد ۲ ص ۲۴۶ و جلد ۱۱ ص ۴۰۲ طبع مصر ۱۳۴۹ھ - ۱۹۳۱ء -

[5] نہج البلاغہ جلد ۱ ص ۱ طبع مصر تصحیح محی الدین عبدالحمید مطبعة الاستقامہ　[6] ایضاً جلد ۱ ص ۵۴ -

"کتاب الخصائص کے رضی کی اپنی تالیف ہونے پر حجت قاطع ہیں۔

اس کتاب کا ایک نہایت قدیم اور بیش قیمت مخطوطہ کتاب خانہ رضا رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد الجبار بن الحسین بن ابی القاسم الحاج فراہانی نے ۵۵۲ھ - ۱۱۵۸ء میں اس کی کتابت سے فراغت حاصل کی تھی۔ کتاب کے سرورق پر خود کاتب کتاب ہی کے خط میں لکھا ہے۔ "کتاب خصائص الائمۃ الاثنی عشر علیہم السلام تصنیف السید الامام، الرضی ذی الحسبین ابی الحسن محمد بن الحسین بن موسی الموسوی رضی اللہ عنہ۔"

اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ خصائص کا مؤلف شریف رضی ہے۔ کاتب کے اس قول کی تائید اس اجازے سے بھی ہوتی ہے جو سرورق ہی پر کتاب و مؤلف کے نام کے نیچے درج ہے۔ اس اجازے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الرضا فضل اللہ بن علی الحسینی الراوندی نے ذیقعدہ ۵۵۵ھ - ۱۱۶۰ء میں یہ کتاب عبد الجبار مذکور کو پڑھائی اور خود اس کی سند "ابو الفتح اسمٰعیل بن الفضل بن احمد الاخشید السراج" سے حاصل کی، سراج نے اس کتاب کی ابو المظفر عبد اللہ بن شبیب سے اور انہوں نے ابو الفضل الخزاعی سے اجازہ لیا، جو خود شریف رضی کا شاگرد تھا۔

اس اجازے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فضل اللہ راوندی کے نزدیک، اس کے اساتذہ کے بیان کے مطابق کتاب الخصائص کا مؤلف شریف رضی ہی ہے۔

خصائص کے کاتب اور اس کے استاد راوندی کی تحریر کی تائید علامہ نجاشی کی کتاب الرجال سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں اس کتاب کو شریف رضی کی تالیفات میں شمار کیا گیا ہے۔[1]

ان سب شہادتوں کی پشت پر خود کتاب الخصائص کی بعض عبارتیں بھی ہیں۔ چنانچہ اس کے ورق ۲۰۰ الف پر امیر المومنین کے ارشاد "قِیْمَۃُ کُلِّ امْرِئٍ مَا یُحْسِنُہٗ" (ہر شخص کی قیمت اس کے نیک کام ہیں) کے تحت لکھا ہے:

"قال السید الرضی ابو الحسن رضی اللہ عنہ وھذا الکلمۃ التی لا قیمۃ لھا ولا کلام یوزن بھا۔"	سید رضی ابو الحسن رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ بات ایسی ہے کہ اس کی کوئی قیمت ہے اور نہ دوسرا کلام اس کے ہم وزن نظر آتا ہے۔

علاوہ ازیں، ورق ۲۰۲ الف و ۲۰۷ ب و ۲۰۸ الف پر بھی مؤلف کے تبصرے "قال الشریف الرضی ابو الحسن رضی اللہ عنہ" سے شروع ہوتے ہیں اور خاتمہ کتاب کی عبارت میں مذکورہ لقب اور کنیت کے ساتھ "ذو الحسبین" بھی لکھا گیا ہے۔ ان کلمات کا "قال المؤلف" یا "اقول" کی جگہ استعمال مؤلف کے شاگردوں کا کام ہے، اور اس قسم کے استعمال عربی کتابوں میں عام طور پر نظر آتے ہیں، اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ خود کتاب کے اندر بھی بحیثیت مؤلف شریف رضی ہی کا نام لیا گیا ہے۔

اور جب خصائص کو رضی کی تالیف مان لیا جائے گا، تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نہج البلاغہ بھی شریف رضی ہی کی جمع کردہ کتاب ہے۔

دوسری دلیل

شریف رضی کی تصنیفات میں نجاشی وغیرہ مورخوں نے ان کی تفسیر قرآن موسوم بہ "حقائق التنزیل" کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس تفسیر کی جلد پنجم نجف اشرف میں ۱۳۵۵ھ - ۱۹۳۶ء میں چھپ چکی ہے اور میرے سامنے موجود ہے، اس کے ص ۱۶۷ پر مؤلف لکھتا ہے کہ:

"من اراد ان یعلم برھان ما اشرنا الیہ من ذلک فلینعم النظر فی کتابنا الذی الفناہ وسمیناہ بنہج البلاغۃ وجعلناہ یشتمل علی مختار جمیع الواقع الینا من کلام امیر المومنین علیہ السلام فی جمیع الانحاء والاغراض والاجناس والانواع من خطب وکتب ومواعظ وحکم وبوبناہ ابواباً ثلاثۃ لیشتمل علی ھذہ الاقسام ممیزۃ مفصلۃ۔"	جو شخص ہمارے اس اشارے کی دلیل جاننا چاہتا ہے، وہ ہماری اس کتاب کو گہری نظر سے دیکھے جسے ہم نے تالیف کر کے نہج البلاغہ نام سے موسوم کیا ہے اور جو مشتمل ہے چیدہ حصہ پر اس سب کلام امیر المومنین علیہ السلام کے جو ہم تک پہنچا ہے۔ تمام اغراض، اقسام اور انواع سے متعلق خواہ خطبے ہوں یا خطوط، نصائح یا حکمت آمیز باتیں، اور ہم نے اسے تین ابواب پر تقسیم کر دیا ہے کہ یہ ان سب قسموں پر جداگانہ اور تفصیلی حیثیت سے مشتمل رہے۔

---

[1] کتاب الرجال ص ۲۸۳۔

اس عبارت میں "نہج البلاغہ" کا نام اور پورا حلیہ بتادیا گیا ہے جس سے بلاشک وشبہ معلوم ہو جاتا ہے کہ "حقائق التنزیل" اور "نہج البلاغہ" کا مؤلف ایک ہی شخص ہے۔ چونکہ "حقائق" کا تالیف شریف رضی ہونا مسلم ہے۔ لہٰذا "نہج" کا مؤلف بھی انھیں کو تسلیم کیا جائے گا۔

تیسری دلیل علامہ نجاشی وغیرہ نے شریف رضی کی ایک اور کتاب "مجازات الآثار النبویہ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ میرے سامنے اس کتاب کا بھی ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے۔ اس کے صفحہ ۲۲ پر مؤلف کہتا ہے کہ:۔

یبین ذلک قول امیر المومنین علی علیہ السلام فی کلام لہ "تَخَفَّفُوا تَلْحَقُوا"۔ وقد ذکرنا ذلک فی کتابنا الموسوم بنہج البلاغة الذی اوردنا فیہ مختار جمیع کلامہ۔

اس کی وضاحت ہو جاتی ہے امیر المومنین علی علیہ السلام کے اس قول سے جو ان کی ایک گفتگو میں ہے کہ "سبک بار ہو۔ جا ملو گے"۔ اور ہم نے اس کا ذکر اپنی کتاب نہج البلاغہ میں کر دیا ہے۔ جس میں آپ کے سارے کلام کا چیدہ حصہ موجود ہے۔

پھر صفحہ ۴۱ پر رقمطراز ہے کہ:۔

ومثل ذلک قول امیر المومنین علی علیہ السلام "مَنْ یُعْطِ بِالْیَدِ الْقَصِیرَةِ یُعْطَ بِالْیَدِ الطَّوِیلَةِ" وقد ذکرنا ذلک کتابنا الموسوم بنہج البلاغة۔

اسی جیسا ہے امیر المومنین علی علیہ السلام کا یہ قول کہ:۔ "جو چھوٹے ہاتھ سے دے گا۔ وہ لمبے ہاتھ سے پائے گا"۔ اور اس بات کو ہم نے اپنی کتاب موسومہ بہ نہج البلاغہ میں بھی ذکر کیا ہے۔

مؤلف "مجازات" نے جن حکیمانہ اقوال کا حوالہ دیا ہے۔ وہ "نہج البلاغہ" میں بجنسہٖ موجود ہیں۔[1] اس سے یہ نتیجہ نکالنا قرین قیاس ہے کہ ان دونوں کتابوں کا مؤلف ایک ہی ہے۔ اور چونکہ "مجازات" کا شریف رضی کی تصنیف ہونا ثابت و مسلم ہے۔ اس بنا پر "نہج" کو بھی انہی کی تالیف ماننا ہوگا۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی مناسب ہے کہ خود "نہج البلاغہ" میں بھی "مجازات" کا ان الفاظ میں ذکر آیا ہے:۔

"وقد تکلمنا علی هذه الاستعارة فی کتابنا الموسوم بمجازات الآثار النبویة"[2]

ہم نے اس استعارے پر اپنی کتاب موسوم بہ مجازات الآثار النبویہ میں بھی گفتگو کی ہے۔

"نہج" میں جس استعارے کا "مجازات" میں مذکور ہونا بتایا گیا ہے۔ وہ امیر المومنین کا یہ قول ہے کہ "الْعَیْنُ وِکَاءُ السَّهِ" (آنکھ سرین کا تسمہ ہے) اور "مجازات" کے محولہ بالا نسخہ میں صفحہ ۱۸۰ پر موجود ہے۔ اس قرینہ پر ان دونوں کتابوں کے نقش ایسے ملتے جلتے ہیں کہ انھیں دو مؤلفوں کا قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب "مجازات" میں "نہج" کا حوالہ آچکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ "نہج" کی تالیف کا کام "مجازات" سے پہلے انجام پا چکا تھا۔ "نہج" کے اندر پھر کتاب کا حوالہ کس طرح آ گیا۔ جو اس کے بعد کی تصنیف ہے۔ اس شبہ نہ کرنے کی دلیل یہ ہے کہ "نہج" کے خاتمہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ میں ہر باب کے خاتمہ میں کچھ اوراق سادہ چھوڑ دوں گا۔ تاکہ مزید منتخب کلام کے اضافہ میں سہولت رہے[3]

"مجازات" کا حوالہ جس عبارت میں نظر آتا ہے۔ وہ عام مطبوعہ و قلمی نسخوں میں تو دوسرے حصوں سے ممتاز نہیں ہے۔ لیکن کتاب خانہ رامپور میں ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ جس کا کاتب وہی عبید بجار ہے جس نے مذکورہ بالا "خصائص الائمہ" کا نسخہ لکھا تھا۔ اس نسخہ کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ میں نے اسے سید ضیاء الدین تاج الاسلام ابوالرضا فضل اللہ بن علی بن عبید اللہ الحسینی کے قلم کے لکھے ہوئے نسخہ سے ۱۹ جمادی الاول ۵۵۳ھ (۱۸ جون ۱۱۵۸ء) کو نقل کیا اور دوران کتابت میں برابر انہیں کی خدمت میں رہا۔ اور پھر اس خاتمہ کے نیچے لکھا ہے کہ میں نے ایک اور صاحب کی معیت میں اس کتاب کو تاج الاسلام سے ۵۵۳ھ میں پڑھا۔

اس نسخہ میں اصل کتاب کے خاتمہ پر لکھا ہے "زیادة من نسخة کُتِبَتْ علی عهد المصنف رحمة الله علیه وسلامه"۔

---

[1] نہج جلد ۱ صفحہ ۵۳ و جلد ۳ صفحہ ۲۰۷۔ [2] ایضاً جلد ۳ صفحہ ۲۶۳۔ [3] ایضاً جلد ۳ صفحہ ۲۶۷۔

(ورق ۱۶۹- الف) یہ عبارت بتاتی ہے کہ اس کے تحت میں جو اندراجات ہوں گے۔ وہ بے شک تسلیم کئے جائیں گے۔ چنانچہ نہج البلاغہ کی عبارت جس میں "مجازات الآثار النبویہ" کا حوالہ آیا ہے اس نسخے کے اندر اسی عنوان کے تحت مندرج ہے۔

دلیل چہارم "نہج البلاغہ"[1] کے کچھ نسخوں میں بھی مختلف تشریحوں سے پہلے شریف رضی کا نام ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں "نہج" کا وہ نسخہ قابل ملاحظہ ہے جسے محمد محی الدین عبدالحمید استاد جامع ازہر نے اپنی تصحیح کے بعد مطبعۃ الاستقامہ قاہرہ سے شائع کرایا ہے۔ ان کے پیش نظر "نہج" کے آٹھ نسخے تھے۔ جن میں سے ایک کے ساتھ ابن ابی الحدید کی شرح اور دوسرے کے ساتھ ابن میثم کی شرح بھی تھی۔ ابن میثم کی شرح کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ بھی دوران تقابل میں ان کے سامنے رہا تھا۔ اس حساب سے انہوں نے ۹ نسخوں سے اپنے نسخے کو مرتب کیا تھا۔

عبدالحمید کے اس نسخہ میں جابجا "قال الرضی" یا "قال رضی ابو الحسن" آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب نسخوں میں نہیں۔ تو کچھ کے اندر تو ضرور شریف رضی کا نام آیا ہوگا۔ ورنہ مصحح اپنی طرف سے کبھی نہ بڑھاتا۔ اور یہ اس کی دلیل ہے کہ نہج البلاغہ شریف رضی کی تالیف ہے۔ ورنہ کہیں اور کسی مخطوطے یا مطبوعہ نسخے میں تو شریف مرتضیٰ کا نام ملتا۔

اس کی تائید ہمارے مخطوطے سے بھی ہوتی ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرماتے ہوئے آخر میں ارشاد کیا ہے کہ:-

"فَمَنْ قَامَ لِلّٰهِ فِيهَا بِمَا يَجِبُ عَرَّضَهَا اللّٰهُ لِلدَّوَامِ وَ الْبَقَاءِ وَمَنْ لَمْ يَقُمْ لِلّٰهِ فِيهَا بِمَا يَجِبُ عَرَّضَهَا لِلزَّوَالِ وَالْفَنَاءِ"[2]	جو شخص نعمات الٰہی میں سے کر اللہ کے لئے واجبات ادا کرے گا۔ اللہ ان نعمتوں کو پائدار بنائے گا۔ اور جو اس حالت میں واجبات ادا نہ کریگا۔ اللہ ان نعمتوں کو زائل فرمائے گا۔

ہمارے نسخے میں (ورق ۲۶۵- الف سطر ۱) "فمن" کے اوپر "لا" اور "والفنا" کے اوپر "بلی" لکھ کر حاشیہ پر تحریر کیا ہے:-

"فی نسخۃ الرضی - وان قام بما یجب للہ فیہا عرض نعمتہ لدوامہا وان ضیع ما یجب للہ فیہا عرض نعمتہ لزوالہا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب اور مصحح میں سے کسی ایک کے پاس "نہج" کا کوئی ایسا نسخہ بھی موجود تھا جو اس کے مؤلف شریف رضی کی ملکیت میں رہ چکا تھا یا خود انہیں کے قلم کا نوشتہ تھا۔ اور یہ ثبوت ہے اس کا کہ کتاب شریف رضی ہی کی تصنیف و تالیف ہے۔

دلیل پنجم نہج البلاغہ کی تقریباً ۴۰ یا ۴۲ عربی اور فارسی زبان میں شرحیں لکھی جا چکی ہیں[3]۔ ان میں سے کم از کم حسب ذیل کے اندر بالیقین شریف رضی ہی کو مؤلف کتاب تسلیم کیا گیا ہے:-

(۱) شرح سید علی بن ناصر علوی موسوم بہ "اعلام نہج البلاغۃ"۔

کشف الحجب سے معلوم ہوتا ہے کہ شارح مذکور مؤلف "نہج البلاغہ" کا معاصر تھا[4]۔ اس شرح کا ایک قلمی نسخہ جو بارھویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ کتاب خانہ میبود میں موجود ہے۔ اس کے ورق ۱۹- ب پر لفظ "ملطاط" کی تشریح شارح نے ان الفاظ میں کی ہے:-

---

[1] - ملاحظہ ہو نسخہ مذکور جلد ۲ صفحات ۲۱۲-۲۲۰ وجلد ۳ صفحات ۲۶- ۷۷- ۱۳۶- ۱۵۹- ۱۶۱- ۱۹۲- ۱۷۰- ۱۹۱- ۱۹۵- ۲۰۴- ۲۰۵- ۲۱۰- ۲۱۱- ۲۲۸- ۲۲۹- ۲۴۵- ۲۴۹- ۲۵۷- ۲۶۲ تا ۲۶۷-

[2] ایضاً جلد ۳ ص ۲۴۳-

[3] - ملاحظہ ہو فہرست کتاب خانہ عمومی معارف، مرتبہ مولانا عبدالعزیز جواہر کلام ص ۱۳۱ بعد، طبع تہران۔

[4] - مجھے اس میں شبہ ہے کہ ہمارا نسخہ مسمیٰ "اعلام نہج البلاغہ" کا ہے۔ جو مؤلف کے معاصر کی تالیف ہے اور "نہج" کی سب سے پہلی شرح مانی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں جابجا "قال بعض الشارحین" نظر آتا ہے۔ جو اس کا ثبوت ہے کہ اس شرح سے پہلے بھی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ نیز اس کا طرز بیان بھی پانچویں صدی کے علماء کا نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے بعید نہیں کہ اس شرح کا مؤلف کوئی متاخر شخص ہو۔ اور اس نے بھی اپنی شرح کا نام "اعلام نہج البلاغہ" ہی رکھ دیا ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کاتب نے دانستہ یا نادانستہ "اعلام" کا دیباچہ کسی مابعد کی شرح کے اول میں لکھکر اس کی حیثیت کو بلند کر دیا ہو۔ جو حضرات قلمی کتابوں سے زیادہ وابستہ رہے ہیں۔ ان کی نظر سے ایسے متعدد قلمی نسخے گذرے ہوں گے جن میں اسی قسم کی کارروائیاں پائی جاتی ہیں۔

"قال السید الاجل الرضی، رضی اللہ عنہ، یعنی بالمعاطہ التسمت الذی امرھم بلزومہ۔ الخ"

سید اجل الرضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ امیرالمومنینؑ کی معاطاسے مراد وہ سمت ہے جس کے اختیار کرنے کا انہوں نے حکم دیا تھا۔

"معاطا" کی یہ تشریح بعض الفاظ میں "نہج البلاغہ" کے اندر موجود ہے۔[1] اس کا یہ مطلب ہوا کہ شارح کے نزدیک "نہج" کا مؤلف شریف رضی ہے۔

(۲) شرح الشیخ ابی الحسن (ابو الحسن) بن ابی القاسم زید بن محمد بن علی البیہقی نیشاپوری، معروف بفرید خراسان۔

شارح مذکور اپنے عہد کا مشہور متکلم فقیہ اور ابن شہر آشوب مؤلف مناقب آل ابی طالب متوفی ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) کا استاد تھا۔[2] اس کی شرح کا ایک مخطوطہ شیخ محمد صالح بن شیخ احمد آل طعان قطیفی بحرینی کے پاس موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شارح نے ۵۱۶ھ (۱۱۲۲ء) میں نہج کو حسین بن یعقوب سے پڑھا۔ انہوں نے شیخ جعفر دوریستی سے قرأت کی اور شیخ جعفر نے خود شریف رضی سے اجازہ پایا۔

یہ سند بھی اس کا ثبوت ہے کہ "نہج" کے مؤلف شریف رضی ہیں۔

(۳) شرح ابن ابی الحدید معتزلی متوفی ۶۵۵ھ (۱۲۵۷ء)

یہ شرح ایران اور مصر دونوں جگہ چھپ چکی ہے اور اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے دیباچہ میں شارح نے کتاب کو شریف رضی کی تالیف قرار دیا ہے اور شرح کے آغاز میں ان کا مفصل تذکرہ بھی درج کیا ہے۔ خود اندرون کتاب میں بھی جگہ جگہ "رضی" کا نام تشریحات وغیرہ کے سلسلے میں نظر آتا ہے۔

(۴) شرح ابن میثم البحرانی متوفی ۶۷۹ھ (۱۲۸۰ء) یہ شرح بھی ایران میں چھپ چکی ہے اور اس میں بھی شریف رضی ہی کو مؤلف کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ حسب ذیل شرحیں بھی کہیں نہ کہیں دستیاب ہوتی ہیں اور مجھے گمان غالب ہے کہ ان میں بھی شریف رضی ہی کو مؤلف نہج البلاغہ قرار دیا گیا ہوگا ورنہ عبدالعزیز جواہر کلام اس کا ضرور ذکر کرتے۔

۱۔ شرح قطب الدین ابوالحسین سعید بن عبداللہ بن الحسن الراوندی متوفی ۵۷۳ھ (۱۱۷۷ء) موسوم بہ "منہاج البراعۃ"۔ روضات، لجنات اور کشف الحجب[3] میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ نیز تہران کے سرکاری کتب خانہ میں اس کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔

۲۔ شرح النفائس مؤلفہ ۷۵۹ھ (۱۳۵۸ء)۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا لیکن ایک مخطوطہ کتاب خانہ رضوی میں موجود ہے۔

۳۔ شرح کمال الدین عبدالرحمٰن بن محمد بن ابراہیم العتائقی الحلی مؤلفہ ۷۸۰ھ (۱۳۷۸ء)۔ اس کا ایک قلمی نسخہ خزانۂ امیرالمومنین نجف اشرف میں محفوظ ہے۔

ان دلائل سے یہ امر صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ "نہج البلاغہ" شریف مرتضیٰ کی نہیں بلکہ ان کے چھوٹے بھائی شریف رضی کی تالیف ہے۔ اور ابن خلکان سے لے کر ڈاکٹر بروکلمان[4] تک جس کسی نے بھی اسے شریف مرتضیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس نے پوری تحقیق سے کام نہیں لیا۔ ورنہ اتنا کھلا ہوا دھوکا کبھی نہ کھا سکتا تھا۔

مندرجات کی حیثیت

نہج البلاغہ کے سلسلے میں دوسرا تحقیق طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس کے خطبے اور خطوط وغیرہ کی سندی حیثیت کیا ہے۔ یعنی یہ جعلی ہیں یا اصلی، اور جعلی ہیں تو یہ جعل کس نے کیا ہے۔ شریف رضی جامع نہج البلاغہ نے یا اس سے پہلے کے فصحاء شیعہ یا غیر شیعہ نے۔ ابن خلکان اور اس کے پیروؤں نے نہج البلاغہ کے مندرجات کو اس کے مؤلف ہی کی کاوش دماغی قرار دیا ہے۔ ان کے اس دعوے کی دلیلوں سے بعد میں بحث کی جائے گی۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ خود کتاب کے اندر بھی ایسا کوئی ثبوت موجود ہے۔ جو اس الزام کی تردید کر سکے۔

---

[1] نہج البلاغہ جلد ۱ ص۹۴۔ [2] کشف الحجب ص۵۵۵۔ [3] ایضاً ص۵۵۵ و روضات ص۳۰۱۔

[4] علمائے جدید میں سے فانڈیک نے (کتاب) القنوع ص۱۸۱ میں سید رضی کی جگہ سید ادنی لکھ دیا ہے۔ جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ جرجی زیدان نے تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد ۲ ص۲۸۸ میں اور ڈاکٹر بروکلمان المانوی نے تاریخ ادب عربی (زبان جرمنی) جلد ۱ ص۴۰۵ اور اس کے تکملہ جلد ۱ ص۷۰۵ میں نہج کا مؤلف سید مرتضیٰ ہی کو قرار دیا ہے۔ گو موخرالذکر نے یہی لکھا ہے کہ بعض نے سید رضی کی تالیف بھی بتایا ہے۔ چنانچہ سید رضی کے حال (تکملہ جلد ۱ ص۱۳۱) میں اس کا ذکر تنہا کر دیا ہے۔ مستقل شمار تصنیفات میں اسے نہیں لیا۔

اس نقطۂ نگاہ سے نہج کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں متقدم مصنفین کے متعدد حوالے نظر آتے ہیں۔

مآخذ کتاب

امیر المؤمنین کا خطبہ نمبر ۳۱۔ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:۔

"یا ایہا الناس، انا اصبحنا فی دھر عنود وزمن کنود یُعدّ فیہ المحسن مسیئاً، و یزداد الظالم عتواً۔ لا ننتفع بما علمنا و لا نسأل عما جھلنا، ولا نتخوف قارعۃ حتی تحل بنا۔"[1]

لوگو۔ ہم کج رو زمانے اور ناشکرے عہد میں واقع ہوئے ہیں۔ جس میں نیکوکار کو بدکار شمار کیا جاتا ہے۔ اور ظالم زیادہ سرکشی دکھاتا ہے۔ ہم اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور ان باتوں کو دریافت کرتے ہیں جن کا علم نہیں رکھتے۔ اور مصیبت کے سر پر آپڑنے سے پہلے اس سے ڈرتے ہیں۔

اس خطبے کو نقل کر کے جامع کہتا ہے:۔

"ھذہ الخطبۃ ربما نسبھا من لا علم لہ الی معاویۃ رضؓ وھی من کلام امیر المؤمنین الذی لا یُشکُّ فیہ واین الذھب من الرغام والعذب من الاجاج! وقد دلّ علی ذلک الدلیل الخرّیت و نقدہ الناقد البصیر عمرو بن بحر الجاحظ۔ فانہ ذکر ھذہ الخطبۃ فی کتاب البیان والتبیین، وذکر من نسبھا الی معاویۃ، ثم قال "ھی بکلام علی علیہ السلام اشبہ، و بمذھبہ فی تصنیف الناس و بالاخبار عما ھم علیہ من القھر والاذلال ومن التقیۃ والخوف الیق"۔ قال: "ومتی وجدنا معاویۃ فی حال من الاحوال یسلک فی کلامہ مسلک الزھاد و مذاھب العُبّاد"[2]

اس خطبہ کو بہت سے لاعلموں نے معاویہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ یہ بلاشک وشبہ امیر المؤمنین کا کلام ہے۔ بھلا پتلی مٹی میں سے سونا کب نکلتا ہے اور کھاری پانی میں سے میٹھا پانی کب پیدا ہوتا ہے۔ اس امر کی طرف حاذق راہنما نے راہنمائی کی ہے اور صاحب بصیرت نقاد عمرو بن بحر الجاحظ نے اسے پرکھا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب البیان و التبیین میں اس خطبہ کا ذکر کیا ہے اور معاویہ کی طرف اس کی نسبت کرنے والوں کو بھی ذکر کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ یہ علی علیہ السلام کے کلام سے زیادہ مشابہ ہے۔ اور لوگوں کے مختلف اقسام بیان کرنے، اور ان کے ڈر، بچاؤ، تذلیل اور زیادتی کی اطلاع دینے میں ان کا جو طریقہ ہے، اس کے زیادہ لائق ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ ہم نے معاویہ کو کسی حالت میں بھی زاہدوں کے مسلک اور عابدوں کے طریقے پر چلتا کب پایا ہے۔

یہ خطبہ جاحظ کی کتاب البیان و التبیین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام سے درج ہے اور اس کے آخر میں جاحظ کی مذکورہ بالا تنقید بھی یک دو الفاظ کی بیشی کے ساتھ موجود ہے۔[3]

جاحظ کا پورا نام ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ المعتزلی ہے۔ وہ یہ محرم ۲۵۵ھ (۸۶۸ء) میں فوت ہوا ہے۔[4]

(۲) امیر المؤمنین کے خطبہ ۲۲۶ کے شروع میں جامع نے لکھا ہے کہ:۔

"ذکرھا الواقدی فی کتاب الجمل۔"

اسے واقدی نے کتاب الجمل میں بیان کیا ہے۔

اور اس کے بعد اس خطبے کا یہ حصہ نقل کیا ہے:۔

---

[1] نہج البلاغہ جلد ۱ ص۳۰۔ [2] ایضاً جلد ۱ ص۳۰۔ [3] البیان التبیین جلد ۲ ص۴۲ طبع مصر ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) نیز دیکھئے منتخبات بیان والتبیین للثعالبی ص۱۰۔ [4] تاریخ بغداد جلد ۱۲ ص۲۲۰ و الکامل لابن الاثیر جلد ۷ ص۸۰۔ و مرآۃ الجنان یافعی جلد ۲ ص۱۶۲۔ لیکن شذرات جلد ۲ ص۱۲۱ میں ۲۵۰ھ میں وفات بتائی ہے۔

فصدع بما أُمر به، وبلّغ رسالات ربه، فلمّ الله به الصدع ورتق به الفتق، وألّف به الشمل بين ذوي الأرحام، بعد العداوة الواغرة في الصدور، والضغائن القادحة في القلوب" ۱

پس رسول اکرمؐ نے ان کاموں کو جن پر مامور تھے برملا پیش کیا اور اپنے رب کے پیام پہنچائے۔ چنانچہ اللہ نے ان کے ذریعہ سے شگاف کو بھر دیا اور پھٹے کو سی دیا۔ اور آپ کی وساطت سے رشتہ داروں کے درمیان افتراق کو اجتماع سے بدل دیا۔ حالانکہ ان کے سینوں میں دشمنی تھی۔ اور دلوں میں بھڑکنے والے کینے پائے جاتے تھے۔

(۳) واقدی کی اس کتاب سے امیرالمومنین کا خط نمبر ۵، نقل کیا گیا ہے۔ جو آپ نے اپنی بیعت لینے کے بعد لکھا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

اما بعد فقد علمتَ إعذاري فيكم وإعراضي عنكم، حتى كان ما لا بُدَّ منه ولا دفع له۔ والحديثُ طويلٌ والكلامُ كثيرٌ، وقد أدبر ما أدبر، وأقبلَ ما أقبل۔ فبايع مَن قِبَلك۔ وأقبِل إليَّ في وفدٍ من أصحابك" ۲

بعد ازاں تم اپنے معاملہ میں میرے عذر کو جانتے ہو۔ اور میرے اعراض سے واقف ہو۔ تاآنکہ جو ہونا تھا اور جس سے گریز نہ تھا، وہ ہو گیا۔ اور بات لمبی ہے۔ اور گفتگو زیادہ ہے۔ اور جو چیز جانے والی تھی، وہ چلی گئی۔ اور جو آگے آنے والی تھی، وہ پیش آ گئی۔ لہٰذا تم اپنے یہاں کے لوگوں سے بیعت لے لو اور اپنے اصحاب کے وفد کے ساتھ میرے پاس چلے آؤ۔

واقدی کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن عمر بن واقد الاسلمی المدنی ہے۔ اور اس نے ذی الحجہ ۲۰۷ھ (۸۲۳ء) میں انتقال کیا ہے۔ ۳ ابن ندیم نے اس کی تصنیفات میں "کتاب الجمل" کا نام لیا ہے ۴ مگر اب اس کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ ابن ندیم جامع نہج البلاغہ کا ہمعصر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک واقدی کی کتاب الجمل کے نسخے ملتے تھے۔

(۴) امیرالمومنین کا خط نمبر ۵۴ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے نام ہے۔ یہ خط ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:-

اما بعد فقد علمتما وإن كتمتما أني لم أُرِد الناس حتى أرادوني، ولم أُبايعهم حتى بايعوني۔ ۵

بعد ازاں تم دونوں واقف ہو، گو چھپاتے ہو کہ میں نے لوگوں کو نہیں چاہا جب تک انہوں نے مجھے نہیں چاہا۔ اور میں نے ان سے بیعت نہیں لی جب تک انہوں نے خود بیعت نہ کی۔

اس خط کے آغاز میں جامع نے لکھا ہے کہ ابوجعفر اسکافی نے اپنی "کتاب المقامات فی مناقب امیرالمومنین" میں یہ خط نقل کیا ہے۔

ابوجعفر محمد بن عبداللہ الاسکافی المعتزلی بغداد کے محلہ سکاف کا باشندہ اور معتزلۂ بغداد کا امام اور فرقہ [illegible] کا بانی ہے۔ ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ قاضی القضاۃ نے اسے معتزلہ کے طبقۂ ہفتم میں شمار کیا ہے۔ یہ جاحظ کا معاصر ہے۔ اور [illegible] "کتاب العثمانیہ" کا رد اسی نے لکھا ہے۔ بغدادی معتزلہ کی رائے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سب صحابہ سے افضل تھے۔ یہ بھی اسی رائے کا تھا۔ بقول سمعانی اس نے ۲۴۰ھ (۸۵۴ء) میں انتقال کیا ہے۔ ۶

ابن ندیم اور کشف الظنون وغیرہ میں اس کتاب کا حوالہ نہیں ملتا۔ جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کتاب نے شہرت نہیں پائی۔

(۵) بذیل خطوط نمبر ۷۴ جامع نے ایک معاہدہ نقل کیا ہے۔ جو بنی یمن اور ربیعہ کے درمیان ہوا تھا۔ اور اس کی عبارت امیرالمومنینؑ نے تحریر فرمائی تھی۔ یہ معاہدہ اپنے مطالب کے لحاظ سے قابل غور ہے۔ اس لئے میں اسے پورا نقل کرتا ہوں:-

---

۱ نہج جلد ۲ صفحہ ۲۵۳۔ ۲ ایضاً جلد ۳ صفحہ ۱۲۹۔ ۳ شذرات جلد ۲ صفحہ ۱۸۔ ۴ کتاب الفہرست صفحہ ۱۴۴ طبع مصر [illegible]
۵ نہج جلد ۳ صفحہ ۱۲۳۔ ۶ کتاب الانساب للسمعانی [illegible]۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۲ صفحہ ۳۲۲ [illegible]۔

"هذا ما اجتمع عليه أهل اليمن، حاضرها وباديها، وربيعة، حاضرها وباديها، أنهم على كتاب الله يدعون إليه ويأمرون به، ويجيبون من دعا إليه وأمر به، لا يشترون به ثمناً، ولا يرضون به بدلاً، وأنهم يدٌ واحدة على من خالف ذلك وتركه، أنصارٌ بعضهم لبعض، دعوتهم واحدة، لا ينقضون عهدهم لمعتبة عاتب، ولا لغضب غاضب، ولا لاستذلال قومٍ قوماً، ولا لمسبة قومٍ قوماً، على ذلك شاهدهم وغائبهم، وسفيههم وعالمهم وحليمهم وجاهلهم. ثم إن عليهم بذلك عهد الله وميثاقه. إن عهد الله كان مسئولا. وكتب علي بن ابيطالب" [1]

"یہ وہ معاہدہ ہے جس پر اہل یمن شہری اور دیہاتی۔ اور بنی ربیعہ شہری اور دیہاتی متفق ہیں۔ یعنی وہ سب اللہ کی کتاب پر چلیں گے اس کی طرف لوگوں کو بلائیں گے اور اس پر چلنے کا حکم دینگے اور جو اس کی طرف بلائیں گے اور اس پر چلنے کا جو حکم دیگا اس کی مانیں گے۔ نہ اسکو کسی قیمت پر بیچیں گے اور نہ اسکا بدل پسند کرینگے اور جو کتاب اللہ کے خلاف ہوگا یا اسے ترک کریگا اسکے مقابلہ میں متحد ہونگے اور ایک دوسرے کی مدد کرینگے۔ ان کی پکار ایک ہی ہوگی۔ اپنے اس عہد کو کسی کی خفگی یا ناراضگی کی بنا پر نہ توڑیں گے اور نہ کسی قوم کو ذلیل کرنے یا کسی کو سب وشتم کرنے کیلئے اس کی خلاف ورزی کریں گے اس معاہدے پر ان کے حاضر اور غائب۔ بیوقوف اور عالم۔ بردبار اور جاہل سب عامل رہیں گے۔ پھر اس معاہدے کی پشت پر اللہ کا عہد و میثاق ہے۔ بیشک اللہ سے جو قول و قرار کیا جائے اس کی بازپرس ہوگی۔ علی بن ابیطالب نے لکھا۔"

اس کے شروع میں جامع نے لکھا ہے کہ میں اسے ہشام بن الکلبی کے خط سے نقل کر رہا ہوں۔ ابن الکلبی کا پورا نام ابو المنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی ہے اور اس نے ۲۰۴ھ (۸۱۹ء) میں انتقال کیا ہے۔ اس نے ۱۵۰ سے زائد کتابیں لکھی تھیں۔ جن میں ۱۴۴ کا ذکر ابن ندیم کے یہاں بھی ملتا ہے[2] اس کی کس کتاب سے جامع نے یہ معاہدہ نقل کیا۔ اس کا پتہ چلانا دشوار ہے بظاہر یہ عہدنامہ اس کی کسی کتاب الحلف سے نقل کیا گیا ہوگا۔ اور جامع کے سامنے اس کا کوئی بخط مؤلف نسخہ موجود ہوگا۔

(۶) امیر المؤمنین کا خط نمبر ۷ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام ہے۔ یہ خط ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

"فإن الناس قد تغيّر كثيرٌ منهم عن كثيرٍ من حظهم، فمالوا مع الدنيا ونطقوا بالهوى" [3]

بیشک بہت سے لوگ اپنے بہت سے حقیقی حظوں کو چھوڑ چکے۔ دنیا کے ساتھ ہو لئے اور ہوا وہوس کی باتیں کرنے لگے۔

اس کے شروع میں جامع نے اپنا ماخذ سعید بن یحییٰ الاموی کی کتاب المغازی کو بتایا ہے۔ اس کتاب کا نام کشف الظنون میں آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی ہجری تک اس کے نسخے موجود تھے۔[4]

کتاب کے مؤلف کا صحیح و پورا نام ابوعثمان سعید بن یحییٰ بن سعید بن ابان بن سعید بن العاص بن الاحیحۃ القرشی الاموی الکوفی البغدادی ہے اور انہوں نے ۲۴۹ھ (۸۶۳ء) میں وفات پائی ہے[5]

---

[1] نہج جلد ۳ صفحہ ۱۴۳۔ [2] کتاب الفہرست صفحہ ۱۴۰ ولسان المیزان جلد ۶ صفحہ ۱۹۶ وشذرات جلد ۲ صفحہ ۱۳۔ فہرست میں ۲۰۶ھ سال وفات بتایا ہے اور کامل میں اسے قول بعض قرار دیا ہے۔ الکامل ج ۵ صفحہ ۱۳۳۔ [3] نہج جلد ۳ صفحہ ۱۵۱۔ [4] کشف الظنون جلد ۲ کالم ۱۲۳۰ و ۱۷۴۷ طبع استنبول ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) [5] تاریخ بغداد جلد ۹ صفحہ ۹۱ طبع مصر ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) وتہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۹۷ طبع حیدرآباد ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) لیکن کشف جلد ۲ کالم ۱۷۴۷ میں ابومحمد یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی الکوفی الحنفی متوفی ۱۹۱ھ کو اور کالم ۱۲۳۰ میں یحییٰ بن سعید بن فروخ التمیمی القطان البصری کو مؤلف بتایا ہے۔ یہ آخری نام تو کسی طرح بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں یہ قرین قیاس ہے کہ سعید کا باپ یحییٰ بن سعید کتاب المغازی کا مؤلف ہو۔ اس لئے کہ تاریخ بغداد جلد ۱۴ صفحہ ۱۳۲ اور شذرات جلد ۱ صفحہ ۳۲۳ میں اسے ابن اسحٰق کی کتاب المغازی کا راوی بتایا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغازی وسیر سے دلچسپی تھی۔ کشف کی دوسری غلطی یہ ہے کہ اس میں یحییٰ القطان کا سال وفات ۱۹۴ھ (۸۰۹ء) لکھا ہے۔ حالانکہ بقول خطیب تاریخ بغداد جلد ۱۴ صفحہ ۱۴۳) وتہذیب التہذیب جلد ۱۱ صفحہ ۲۱۹۔ انہوں نے ۱۹۸ھ (۸۱۳ء) میں وفات پائی ہے۔ اور تیسری غلطی یہ کی ہے کہ یحییٰ بن سعید کی کنیت ابو ایوب کی جگہ ابومحمد بتائی ہے اور سن وفات ۱۹۱ھ لکھا ہے۔ حالانکہ انہوں نے تاریخ بغداد جلد ۱۴ صفحہ ۱۳۵ وتہذیب جلد ۱۱ صفحہ ۲۱۴ کے مطابق شوال ۱۹۴ھ (۸۱۰ء) میں انتقال کیا ہے۔

(۷) حکیمانہ اقوال کے ذیل میں ایک مستقل فصل کے اندر جامع نہج البلاغہ نے امیرالمومنین کے وہ جملے نقل کئے ہیں جن کے اندر غریب الفاظ آئے ہیں۔ ان کی تشریح بھی کی ہے۔ ان میں سے چوتھے جملے کے الفاظ کی شرح میں لکھا ہے کہ

هذا معنى ما ذكره ابو عبيد (القاسم بن سلام)	یہ اس کا مطلب ہے جو ابوعبید نے بیان کیا ہے۔

ابوعبید القاسم بن سلام الہروی البغدادی متوفی ۲۲۴ھ (۸۳۸ء) اپنے عہد کا بہت بڑا محدث فقیہ، اور لغت و شعر کا ماہر ہے۔ جامع نے اس کی کتاب کا نام نہیں بتایا ہے۔ لیکن مجھے تحقیق سے پتہ چل گیا کہ یہ سب جملے اس کی کتاب "غریب الحدیث" سے منقول ہیں۔ اور بیشتر اس کی تشریحات نقل کردی گئی ہیں۔ چنانچہ کتاب خانہ رامپور میں اس کا جو مخطوطہ تقریباً آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا محفوظ ہے اس کے ورق ۱۹۷ الف-۲۰۳ب میں یہ سب اقوال موجود ہیں۔

(۸) امیرالمومنین کا ارشاد ہے کہ:-

ایها المؤمنون، انه من رأى عدوانا یعمل به ومنكراً یدعى الیه، فانكره بقلبه، فقد سلم وبرئ	مومنو! بیشک جو کوئی کسی سرکشی پر عمل ہوتا دیکھے اور منکر کی طرف بلاوا سنے اور پھر اسے دل سے برا جانے تو وہ سالم اور بری رہا۔

اس کے شرح میں جامع نے تاریخ طبری کا حوالہ دیا ہے۔ طبری جس کا پورا نام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری ہے، تاریخ اسلام کا مشہور مولف ہے۔ اس نے ۳۱۰ھ (۹۲۳ء) میں وفات پائی ہے۔ مذکورہ بالا ارشاد علوی اس کی تاریخ کی جلد سوم کے صفحہ ۲۴۳ پر موجود ہے۔

(۹) امیرالمومنین کے قول "اُخْبُرْ تَقْلِهْ" (اس کی حقیقت کو پہچان، نفرت ہو جائے گی) کے ذیل میں لکھا ہے کہ کچھ اہل علم اسے قول رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بتاتے ہیں۔ لیکن میں نے اسے کلام امیر اس بناء پر قرار دیا ہے کہ ثعلب نے ابن الاعرابی کی زبانی بیان کیا ہے کہ خلیفہ عباسی مامون کا قول ہے کہ اگر امیرالمومنین نے "اخبر تقله" نہ کہا ہوتا تو میں کہتا "اقله تخبر" (تو اس سے نفرت کر حقیقت کو پہچان جائے گا)۔

ثعلب نحو و لغت کا مشہور عالم ہے، اور اس نے ۲۹۱ھ (۹۰۳ء) میں انتقال کیا ہے۔ ابن الاعرابی علوم ادبیہ کا امام مانا جاتا ہے۔ اس نے ۲۳۰ھ (۸۴۴ء) میں وفات پائی ہے۔ مامون عباسی بغداد کا شہرۂ آفاق خلیفہ ہے اور ۲۱۸ھ (۸۳۳ء) میں فوت ہوا ہے۔

مجھے ثعلب کا یہ قول کسی کتاب میں نہ ملا۔ لیکن ابوہلال حسن بن عبداللہ بن سہل العسکری متوفی ۳۹۵ھ (۱۰۰۵ء) نے جمہرۃ الامثال میں لکھا ہے کہ یہ بات حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی کہی ہوئی ہے اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے۔

ابوعبید احمد بن محمد الہروی متوفی ۴۰۱ھ (۱۰۱۰ء) نے اپنی کتاب الغریبین میں لکھا ہے۔

"ومنه حدیث ابی الدرداء: وجدت الناس اُخْبُرْ تَقْلِهْ. ای من جرّبهم رماهم بالمقت لخبث سرائرهم وقلة انصافهم وفرط استیثارهم. ولفظه لفظ الامر ومعناه الخبر"	اسی قسم کی ابوالدرداءؓ کی یہ حدیث ہے کہ: میں نے لوگوں کو پایا "اخبر تقله" یعنی جو شخص انسانوں کو آزمائے گا۔ وہ ان کا دشمن ہو جائیگا۔ اس لئے کہ ان کے دلوں میں خباثت اور قلت انصاف اور خود غرضی کی زیادتی ہے۔ اس حدیث کے لفظ تو حکم کے ہیں۔ لیکن معنی خبر و اطلاع ہیں۔

(۱۰) اسی طرح امیرالمومنین کے ارشاد "العَیْنُ وِكَاءُ السَّه" (آنکھ سرین کا بندھن ہے) کے تحت لکھا ہے کہ مشہور یہ ہے کہ مذکورہ جملہ قول رسول ہے۔ مگر کچھ راویوں نے اسے قول مرتضوی بتایا تھا۔ مبرد نے اپنی کتاب المقتضب میں اس کا ذکر کیا ہے۔

مبرد کا پورا نام ابوالعباس محمد بن یزید الازدی النحوی ہے اور اس نے ۲۸۵ھ (۸۹۸ء) میں انتقال کیا ہے۔ اس کی کتاب المقتضب موجود

۱۔ نہج جلد ۳ ص ۲۵۷۔ ۲۔ جمہرۃ الامثال ص ۲۶ طبع بمبئی ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء) ۳۔ الغریبین ورق ۲۳۶ الف مخطوطہ رامپور۔

۴۔ نہج جلد ۳ ص ۲۴۳۔

نہیں۔ لیکن ابن ندیم اور حاجی خلیفہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔[1]

یہ جملہ بحیثیت ارشاد نبوی ابن قتیبہ الدینوری متوفی ۲۷۶ھ (۸۸۹ء) نے کتاب "تاویل مختلف الحدیث ص۶۵" میں بھی لکھا ہے اور ابو عبید احمد بن محمد الہروی متوفی ۴۰۱ھ (۱۰۱۰ء) کی کتاب الغریبین میں بھی مذکور ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"وفی الحدیث۔ العینان وکاء السّہ۔ قال ابو عبید وھو حلقۃ الدبر"[2]

اور حدیث میں آیا ہے: "العین وکاء السہ" ابو عبید نے کہا ہے کہ "سہ" حلقۂ دبر کو کہتے ہیں۔

یہ ابو عبید جس کا قول غریبین میں نقل کیا گیا ہے۔ ابو عبید القاسم بن سلام ہے۔ اس نے اپنی کتاب غریب الحدیث میں احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت اس قول کو نقل کیا ہے۔[3]

دیگر ماخذ جن اہل علم نے تاریخ و ادب و حدیث کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ نہج البلاغہ کے بہت سے مندرجات دوسری متقدم کتابوں میں موجود ہیں۔ گو سید رضی نے ان کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اور اگر بغداد چنگیزیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد نہ ہوا ہوتا اور اس کے عدیم النظیر کتب خانوں کو ان وحشی جاہلوں نے جلا کر خاک نہ کر دیا ہوتا۔ تو آج اس کے یک ایک جملے کا حوالہ ہمارے سامنے ہوتا۔ تاہم نہج کے متعدد ماخذ اس کے شارح ابن ابی الحدید کے دسترس میں تھے اور اس نے ان کی عبارتیں کی عبارتیں اپنی شرح میں نقل کر دی ہیں۔ اس بنا پر کچھ نہ کچھ مزید روشنی اس کتاب کے ماخذوں پر پڑ جاتی ہے۔ ذیل میں چند حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس کے مندرجات کو سید رضی کا مال سمجھنے والے کسی حد تک مطمئن ہو سکیں۔

(۱) نہج کا سب سے زیادہ قابل اعتراض خطبہ "شقشقیہ" ہے جس میں امیر المومنین نے خلافت کی پچھلی تاریخ بیان فرمائی ہے۔ اور اس امر کی شکایت کی ہے کہ مجھے خلافت کا دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق جانتے ہوئے بھی اہل حل و عقد نے نظر انداز کیا۔ تاہم میں نے صبر کیا۔ تا آنکہ چوتھی بار سب نے مجھے اس بار کے اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن کچھ لوگ بیعت کے بعد مخالف ہو گئے اور اہل اسلام میں جنگ چھڑ گئی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ اگر میرے مددگار موجود نہ ہوتے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظالم کی روک تھام اور مظلوم کی مدد فرض نہ ہوتی۔ تو میں اس عہدے سے الگ جا کھڑا ہوتا۔[4]

اس خطبے کا آغاز یہ ہے:-

"اَمَا وَاللہِ لَقَدْ تَقَمَّصَھَا فُلَانٌ۔ وَاِنَّہٗ لَیَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّیْ مِنْھَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحٰی"[5]

بخدا، خلافت کا کرتا فلاں نے پہن لیا۔ حالانکہ وہ خوب واقف تھے۔ کہ خلافت میں میرا مقام وہ ہے جو کیلی کا چکی میں ہوتا ہے۔

یہ خطبہ ابو جعفر احمد بن محمد بن خالد البرقی الشیعی متوفی ۲۷۴ھ (۸۸۷ء) نے کتاب المحاسن میں ابراہیم بن محمد الثقفی الکوفی متوفی ۲۸۳ھ (۸۹۶ء) نے کتاب الغارات میں۔ ابو علی محمد بن عبد الوہاب الجبائی البصری المعتزلی متوفی ۳۰۳ھ (۹۱۵-۱۶ء) ابو القاسم عبد اللہ بن احمد بن محمود الکعبی البلخی معتزلی متوفی ۳۱۹ھ (۹۳۱ء)۔ ابو جعفر محمد بن عبد الرحمٰن بن قبہ الرازی متکلم شیعی تلمیذ ابی القاسم البلخی مؤلف کتاب الانصاف نے اپنی اپنی کتابوں میں[6] ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی الشیعی الشہیر بالشیخ الصدوق متوفی ۳۸۱ھ (۹۹۲ء) نے کتاب علل الشرائع ص۶۵ و معانی الاخبار (۱۳۲/۱) میں۔ ابو عبد اللہ محمد بن النعمان الشیعی المعروف بالشیخ المفید متوفی ۴۱۳ھ (۱۰۲۲ء) نے کتاب الارشاد (ص۱۳۵) میں اور شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی متوفی ۴۶۰ھ (۱۰۶۸ء) نے کتاب الامالی (ص۲۳۷) میں اپنی اپنی خاص سندوں کیساتھ نقل کیا ہے۔

شیخ صدوق نے اپنی دونوں کتابوں میں ان دو سندوں سے اس خطبے کو روایت کیا ہے:-

(۱) "حدثنا محمد بن علی ماجیلویہ، عن عمہ محمد بن القاسم، عن احمد بن ابی عبد اللہ البرقی، عن ابیہ عن ابن ابی عمیر

---

[1] الفہرست ص۵۸ کشف جلد ۲ کالم ۱۹۹۳۔ [2] الغریبین ورق ۱۴۳ الف۔ [3] غریب الحدیث ورق ۱۴۰ ب مخطوطہ ٹانک۔
[4] نہج جلد ۱ ص۲۵۔ [5] شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید ۴۰/۱ و فہرست کتب خطی کتاب خانہ عمومی معارف ۱۳۹/۱۔ منہاج نہج البلاغہ ص۱۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب الغارات کا مخطوطہ موجود ہے۔

عن ابان بن عثمان، عن ابان بن تغلب عن عکرمۃ، عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

(۲) حدثنا محمد بن ابراھیم بن اسحٰق الطالقانی، ثنا عبد العزیز بن یحییٰ الجلودی۔ ثنا ابو عبد اللہ احمد بن عمار بن خالد، ثنی یحییٰ بن عبد الحمید الحمانی۔ ثنی عیسیٰ بن راشد، عن علی بن خزیمہ (یا حذیفہ) عن عکرمہ، عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

نہج کا پانچواں کلام ہے:-

"وَاللّٰہِ، لَا اَکُونُ کَالضَّبُعِ، تَنَامُ عَلٰی طُولِ اللَّدْمِ۔ حَتّٰی یَصِلَ اِلَیْھَا طَالِبُھَا وَیَخْتِلَھَا رَاصِدُھَا" [۱]

بخدا میں بجو جیسا نہیں ہوں، جو کھٹکے پر کھٹکا ہونے پر بھی پڑا سوتا رہتا ہے تا آنکہ اس کا متلاشی سر پر آ جاتا ہے اور اسکی گھات لگانے والا اسے دھوکا دیدیتا ہے۔

اس کلام کا مذکورہ بالا جملہ ابو عبید القاسم بن سلام البغدادی نے غریب الحدیث (ورق ۱۹۶ الف) میں یوں نقل کیا ہے:-

"واللّٰہ، لا اکونُ مثلَ الضّبعِ، تَسْمَعُ اللَّدْمَ۔ حتّٰی تَخْرُجَ فَتُصَادَ۔"

بخدا میں بجو کی طرح نہیں ہوں جو کھٹکا سنتا رہتا ہے، تا آنکہ نکلتا ہے اور شکار ہو جاتا ہے۔

طبری نے اپنی تاریخ (۱۷۱/۵) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۳۳) میں بالتفصیل یہ گفتگو لکھی ہے۔ مگر ان کا عبارت اس طرح کیا ہے۔

"ماکنتُ لاکونَ کالضبعِ تسمعُ باللَّدْمِ۔ ان النبی قُبِضَ وما اریٰ احداً احقَّ بھذا الامرِ منّی۔"

میں بجو کی طرح بننا نہیں چاہتا جو کھٹکا سنتا رہتا ہے۔ بیشک نبی کی وفات ہوئی ہے تو میں کسی کو بھی امر خلافت کا مجھ سے زیادہ مستحق نہیں پاتا تھا۔

(۳) نہج کا چودھواں کلام ہے:-

"وَاللّٰہِ لَوْ وَجَدْتُہُ قَدْ تُزُوِّجَ بِہِ النِّسَاءُ وَمُلِکَ بِہِ الْاِمَاءُ، لَرَدَدْتُہُ۔ فَاِنَّ فِی الْعَدْلِ سَعَۃً۔ وَمَنْ ضَاقَ عَلَیْہِ الْعَدْلُ، فَالْجَوْرُ عَلَیْہِ اَضْیَقُ۔" [۲]

بخدا اگر میں جاگیروں کو یہ پاتا کہ ان پر عورتوں کی شادیاں ہو چکی ہیں، اور ان کے بدلے کنیزیں خریدی جا چکی ہیں۔ تب بھی واپس لیتا کیونکہ عدل میں بڑی وسعت ہے اور جس پر عدل و انصاف تنگ ہو جائے تو ظلم و جور اس پر اور بھی تنگ ہو جائے گا۔

ابو ہلال الحسن بن عبد اللہ بن العسکری متوفی بعد ۳۹۵ھ (۱۰۰۵ء) نے کتاب الاوائل (ص ۲۰۳) میں پورا خطبہ نقل کیا ہے اور ابن ابی الحدید (۵۰/۱) نے لکھا ہے کہ اس خطبہ کو کلبی نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

(۴) نہج کا پندرھواں کلام ہے:-

"ذِمَّتِی بِمَا اَقُولُ رَھِینَۃٌ، وَاَنَا بِہِ زَعِیمٌ۔ اِنَّ مَنْ صَرَّحَتْ لَہُ الْعِبَرُ عَمَّا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْمَثُلَاتِ حَجَزَتْہُ التَّقْوٰی عَنْ تَقَحُّمِ الشُّبُھَاتِ۔ اَلَا وَاِنَّ بَلِیَّتَکُمْ قَدْ عَادَتْ کَھَیْئَتِھَا یَوْمَ بَعَثَ اللّٰہُ نَبِیَّکُمْ۔" [۳]

جو کچھ میں کہوں گا، اس کی صحت کا ذمہ دار اور حقانیت کا کفیل ہوں۔ بیشک جس کے لئے صراحت کر دیگی عبرت ان عذابوں کی جو پیش آ چکے ہیں تو اسے تقویٰ شبہے کے کاموں پر پڑنے سے روک دیگا۔ سن رکھو کہ تمہاری آزمائش اسی طرح ہو گی جیسی اس وقت ہوئی تھی جب اللہ نے تمہارے نبی کو مبعوث کیا تھا۔

یہ گفتگو جاحظ نے کتاب البیان (۱۷۰/۱) میں ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ (۸۸۹ء) نے عیون الاخبار (۲۳۶/۲) میں۔ محمد بن یعقوب الکلینی متوفی ۳۲۸ھ (۹۴۰ء) نے اصول الکافی (ص ۹) میں ابن عبد ربہ متوفی ۳۲۸ھ (۹۴۰ء) نے العقد (۱۶۲/۲) میں شیخ مفید نے الارشاد (ص ۱۲۵ و ۱۴۰) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۱۴) میں نقل کی ہے۔

---

[۱] نہج ۳۶/۱۔ [۲] ایضاً ۴۲/۱۔ [۳] نہج ۴۲/۱۔

(۵) نہج کا سولھواں کلام ہے:-

" إن أبغض الخلائق إلى الله رجلان: رجلٌ وكَلَه الله إلى نفسه، فهو جائرٌ عن قصد السبيل، مشغوفٌ بكلام بدعةٍ ودعاء ضلالة، فهو فتنةٌ لمن افتتن به، ضالٌ عن هدي من كان قبله، مُضِلٌّ لمن اقتدى به في حياته وبعد وفاته، حمّالٌ خطايا غيره، رهنٌ بخطيئته " [1]

اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض دو آدمی ہوتے ہیں: ایک وہ جسے اللہ اس کے نفس کے حوالے کردے اور وہ سیدھے راستے سے ہٹ جائے۔ اور بدعت کی باتوں اور گمراہی کے بلاوے پر فدا ہو۔ ایسا شخص فتنہ ہے اس کے لئے جو اس کی بات قبول کرے۔ اور تارک ہے اپنے پیغمبروں کے چال چلن کا۔ اور گمراہ کرنے والا ہے اسے جو اس کی مانے اس کی زندگی میں یا مرنے کے بعد۔ وہ دوسروں کی خطاؤں کا بوجھ اٹھانے والا ہے۔ اور اپنی خطاؤں میں گرفتار رہے۔

یہ خطبہ ابن قتیبہ نے کتاب غریب الحدیث میں[2]، کلینی نے اصول الکافی (ص ۱۳) میں اور شیخ مفید نے الارشاد (ص ۱۲۵) نقل کیا ہے۔

(۶) نہج کا بیسواں خطبہ جو ایک سو باسٹھویں خطبے کا ایک ٹکڑا ہے۔ حسب ذیل ہے:-

" فإنّ الغاية أمامكم، وإنّ وراءكم الساعة تحدوكم. تخففوا تلحقوا. فإنما ينتظر بأوّلكم آخركم " [3]

بیشک انجام تمہارے سامنے ہے اور قیامت تمہارے پیچھے ہے اور تمہیں کھینچ رہی ہے۔ سبک بار ہو جاؤ مل جاؤ گے۔ اور تمہارے پیشروؤں کی بعثت میں تمہارے پچھلوں کی منتظر ہے۔

یہ پورا خطبہ طبری نے تاریخ (۵/ ۱۵۷) میں نقل کیا ہے۔

(۷) نہج کا بائیسواں خطبہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:-

" أما بعد فإن الأمر ينزل من السماء إلى الأرض كقطرات المطر " [4]

بعد ازاں، معاملات آسمان سے زمین پر بارش کے قطروں کی طرح اترتے ہیں۔

اس خطبہ میں آگے ایک جملہ آیا ہے۔ "كان كالفالج الياسر" (وہ جیسے جیتنے جواری کی طرح ہوتا ہے) یہ جملہ ابو عبیدہ نے اپنی غریب الحدیث (ورق ۱۰۲ ب) میں امیر المومنین کے نام سے نقل کرکے اس کے لفظوں کی تشریح کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا خطبہ اس کے سامنے تھا۔

(۸) نہج کا پچیسواں خطبہ ہے:-

" إن الله بعث محمداً نذيراً للعالمين وأميناً على التنزيل، وأنتم معشر العرب على شرّ دين وفي شرّ دار " [5]

بیشک اللہ نے محمدؐ کو اہل عالم کے لئے نذیر بنا کر بھیجا تھا۔ اور انہیں قرآن کا امین بنایا تھا اور تم اے عربو! برے دین پر چل رہے تھے۔ اور برے گھر میں بس رہے تھے۔

یہ خطبہ الثقفی نے کتاب الغارات میں نقل کیا تھا[6] سید رضی نے اس میں کے چند ٹکڑے انتخاب کرلئے ہیں۔

(۹) نہج کا چھبیسواں خطبہ ان لفظوں سے شروع ہوا ہے:-

" أما بعد فإن الجهاد بابٌ من أبواب الجنة فتحه الله لخاصة أوليائه. وهو لباس التقوى، ودرع الله الحصينة وجُنّته الوثيقة. فمن تركه رغبة عنه ألبسه الله ثوب الذل وشملة البلاء " [7]

بعد ازاں، بیشک جہاد جنت کا ایک دروازہ ہے۔ اللہ نے یہ دروازہ اپنے خاص دوستوں کے لئے کھولا ہے اور وہ پرہیزگاری کا لباس ہے۔ اور اللہ کی مضبوط زرہ۔ اور اس کی مضبوط ڈھال ہے تو جو جہاد کو اس سے بے پروا ہو کر چھوڑے گا اللہ اسے ذلت کا لباس اور مصیبت کی چادر پہنا دے گا۔

۱۔ نہج ۱/ ۴۳۔ ۲۔ ابن ابی الحدید ۱/ ۵۲۔ ۳۔ نہج ۱/ ۵۴ و ۲/ ۹۷۔ ۴۔ نہج ۱/ ۵۶۔ ۵۔ ایضاً ۱/ ۶۲۔
۶۔ ابن ابی الحدید ۱/ ۲۹۵۔ ۷۔ نہج ۱/ ۶۳۔

یہ خطبہ جاحظ نے البیان (۱/ ۱۴۰) میں، الثقفی نے کتاب الغارات میں،[1] مبرد نے الکامل (۱/ ۱۳) میں۔ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (۲/ ۲۳۶) میں۔ ابن عبد ربہ نے العقد (۲/ ۱۶۳) میں۔ ابوالفرج الاصفہانی متوفی ۳۵۶ھ (۹۶۷ء) نے کتاب الاغانی (۱۵/ ۴۳) میں اور شیخ صدوق نے معانی الاخبار (۱/ ۱۳) میں نقل کیا ہے۔

(۱۰) نہج کا ستائیسواں خطبہ یوں شروع ہوا ہے:۔

" اما بعد فان الدنیا قد أدبرت وآذنت بوداع، وان الآخرة أشرفت باطلاع۔ الا وان الیوم المضمار وغداً السباق۔ والسبقة الجنة والغایة النار۔ أفلا تائب من خطیئته قبل منیته؟ الا عامل لنفسه قبل یوم بؤسه؟ "[2]

بعد ازاں۔ بیشک دنیا نے پیٹھ پھیر لی اور رخصت کی اطلاع دے دی۔ اور بیشک آخرت اچانک آ گئی۔ سنو۔ بیشک آج دبلا ہونا ہے اور کل گھڑ دوڑ ہے۔ اور منزل جنت اور انتہا دوزخ ہے۔ تو کیا کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنی خطا سے مرنے سے قبل توبہ کرے؟ اور کیا کوئی ایسا نہیں جو بدحالی کے دن سے پہلے ہی کام کر رکھے؟

یہ خطبہ جاحظ نے البیان (۱/ ۱۷۱) میں۔ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (۲/ ۲۳۵) میں۔ الثقفی نے کتاب الغارات (۱۷/ ۱۲۶) میں۔ ابن عبد ربہ نے العقد (۲/ ۱۶۳) میں۔ ابو محمد الحسن بن علی بن شعبة الحرانی متوفی ۳۳۲ھ (۹۴۳ء) نے تحف العقول (بحار ۱۷/ ۷۹) میں، ابوبکر الباقلانی متوفی ۴۰۳ھ (۱۰۱۲ء) نے اعجاز القرآن (برحاشیہ اتقان سیوطی ۱/ ۱۹۲) میں اور شیخ مفید نے الارشاد (۱۳۸) میں نقل کیا ہے۔

(۱۱) نہج کا اٹھائیسواں خطبہ اپنے ساتھیوں پر عتاب و خطاب پر مشتمل ہے اور ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:۔

" ایھا الناس، المجتمعة ابدانھم المختلفة اھواؤھم کلامکم یوھی الصم الصلاب وفعلکم یطمع فیکم الاعداء۔ تقولون فی المجالس: کیت وکیت۔ فاذا جاء القتال قلتم: حیدی حیاد "[3]

اے لوگو۔ جن کے بدن اکٹھے ہیں۔ لیکن خواہشیں جدا جدا ہیں۔ تمہاری گفتگو سخت چٹانوں کو پھاڑتی ہے۔ اور تمہارا کام دشمنوں کو ڈھیل دینا ہے۔ تم مجلسوں میں کہتے تھے ایسے اور ویسے۔ اور جب جنگ کا وقت آیا۔ تو بول اٹھے کہ بھاگ، بھاگ!

یہ خطبہ جاحظ نے البیان (۱/ ۱۷۱) میں، ابن قتیبہ نے کتاب الامامت والسیاسہ (۱۴۲) میں، الثقفی نے کتاب الغارات میں، ابن عبد ربہ نے العقد (۲/ ۱۶۳) میں، شیخ مفید نے الارشاد (ص ۱۵۰) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۱۱۳) میں نقل کیا ہے۔

(۱۲) نہج کا تیسواں خطبہ جو اختلاف روایت کے ساتھ نمبر ۱۰۰ پر بھی مذکور ہے۔ حسب ذیل ہے:۔

" ان الله بعث محمداً صلی الله علیه وآله ولیس احد من العرب یقرأ کتاباً ولا یدعی نبوة۔ فساق الناس حتی بوأهم محلتهم وبلغهم منجاتهم "[4]

بیشک اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں مبعوث فرمایا کہ کوئی عرب نہ کتاب پڑھتا تھا اور نہ نبوت کا دعویدار تھا۔ پس انہوں نے لوگوں کو کھینچا تاآنکہ انھیں اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔ اور انھیں نجات کے گھر میں پہنچا دیا۔

یہ خطبہ شیخ مفید نے الارشاد (ص ۱۳۳) میں نقل کیا ہے۔

(۱۳) نہج کا تینتیسواں خطبہ جو اپنے ساتھیوں کے عتاب و خطاب پر مشتمل ہے حسب ذیل ہے:۔

---

[1] ابن ابی الحدید ۱/ ۸۰ - [2] نہج ۱/ ۶۶ - [3] نہج ۱/ ۶۹
[4] نہج ۱/ ۷۷۔

"اُفٍّ لکم! لقد سئمتُ عتابکم۔ أرضیتم بالحیاۃ الدنیا من الآخرۃ عوضاً و بالذلّ من العزّ خلفاً؟"[1]

تم پر افسوس ہے! میں ڈانٹتے ڈانٹتے تنگ آگیا۔ کیا تم نے دنیا کی زندگی کو آخرت کا بدل مان لیا۔ اور کیا تم نے عزت کی جگہ ذلت قبول کرلی؟

یہ خطبہ طبری نے تاریخ (۶/ ۵۱) میں معمولی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(۱۴) نہج کا چونتیسواں خطبہ بھی اپنے ساتھیوں کے عتاب و خطاب پر مشتمل ہے اور اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے:۔

"الحمد للہ، وإن أتی الدھر بالخطب الفادح۔ ... اما بعد فإن معصیۃ الناصح الشفیق العالم المجرب تورث الحیرۃ وتعقب الندامۃ۔"[2]

اللہ ہی حمد کا سزاوار ہے۔ اگرچہ زمانہ کیسے ہی گرانبار کام سر پر ڈالے۔ بعد ازاں۔ بیشک تجربہ کار صاحب علم اور مہربان ناصح کی نافرمانی حیرت پیدا کردیتی ہے اور اس کا انجام پشیمانی ہوتا ہے۔

یہ خطبہ نصر بن مزاحم الکوفی متوفی ۲۱۲ھ (۸۲۷ء) نے کتاب صفین میں[3]۔ ابن قتیبہ نے الامامۃ (۱۳۵) میں۔ اور ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ (۶/ ۴۳) میں نقل کیا ہے۔ ابو الفرج الاصفہانی نے اغانی (۹/ ۵) میں اگرچہ اس خطبہ کے الفاظ نقل نہیں کئے۔ مگر آخری شعر کا حوالہ دیا ہے۔

(۱۵) نہج کا پینتیسواں خطبہ امیر المومنین نے خوارج کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا تھا۔ اس کا آغاز یوں ہے:۔

"فأنا نذیر لکم أن تصبحوا صرعی بأثناء ھذا النھر، وبأھضام ھذا الغائط، علی غیر بیّنۃ من ربکم ولا سلطان مبین معکم۔"[4]

تو میں تمہیں بہ خبر بدیہ دیتا ہوں کہ تم اس دریا کے موڑوں اور اس نشیب کی گہرائیوں میں مرے پڑے ہوگے۔ نہ تمہارے پاس پروردگار عالم کی طرف سے کوئی تنبیہ پائی جائے گی اور نہ تمہارے ساتھ کوئی دلیل ہوگی۔

یہ خطبہ ابتدائی حصے کے علاوہ ابن قتیبہ نے الامامۃ (ص ۱۴۲) میں اور طبری نے تاریخ (۶/ ۴۷) میں اور بقول ابن ابی الحدید، محمد بن حبیب البغدادی متوفی ۲۲۵ھ (۸۵۹ء) نے اپنی کسی کتاب میں نقل کیا ہے۔[5]

(۱۶) نہج کا اڑتیسواں خطبہ بھی اپنے رفقاء کے عتاب پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز ہے:۔

"مُنیتُ بمن لا یطیع إذا أمرت، ولا یجیب إذا دعوت۔ لا أبا لکم! ما تنتظرون بنصرکم ربکم؟ أما دین یجمعکم ولا حمیّۃ تحمشکم؟ أقوم فیکم مستصرخاً، وأنادیکم متغوثاً، فلا تسمعون لی قولاً ولا تطیعون لی أمراً۔"[6]

میری ان لوگوں کے ذریعہ آزمائش ہو رہی ہے جو اطاعت نہیں کرتے جب انہیں حکم دیتا ہوں۔ اور جواب نہیں دیتے جب پکارتا ہوں۔ تمہارا باپ نہ رہے! اپنے پروردگار کی مدد کرنے میں کس بات کا انتظار ہے؟ کیا دین تمہیں اکٹھا نہیں کرتا۔ اور کیا حمیت تمہیں نہیں کھینچتی؟ میں تمہارے اندر کھڑے ہوکر پکارتا ہوں اور تمہیں مدد کیلئے بلاتا ہوں۔ مگر تم میری بات نہیں سنتے اور نہ میرا حکم مانتے ہو۔

اس خطبہ کو ابراہیم الثقفی نے کتاب الغارات میں نقل کیا ہے۔[7]

(۱۷) نہج کا اکتالیسواں خطبہ ہے:۔

"أیھا الناس! إن أخوف ما أخاف علیکم اثنان۔ اتباع الھوی، وطول الأمل۔ فأما اتباع الھوی فیصد عن الحق، وأما طول الأمل فینسی الآخرۃ۔"[8]

لوگو! مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے۔ خواہشات کی پیروی اور درازی امید۔ خواہشات کی پیروی حق سے روک دیتی ہے اور درازی امید آخرت کو بھلا دیتی ہے۔

یہ خطبہ ابن مزاحم الکوفی نے کتاب صفین میں[9]۔ ابو جعفر البرقی نے کتاب المحاسن (ص ۱۰۹) نقل کی ہیں۔ ابن قتیبہ نے عیون (۲/ ۳۵۲) میں۔ الحرانی نے

---

[1] نہج ۱/ ۷۶۔ [2] ایضاً ۱/ ۸۰۔ [3] ابن ابی الحدید ۱/ ۱۰۱۔ [4] نہج ۱/ ۸۲۔ [5] ابن ابی الحدید ۱/ ۱۱۴۔
[6] نہج ۱/ ۸۶۔ [7] ابن ابی الحدید ۱/ ۱۱۷۔ [8] نہج ۱/ ۸۸۔ [9] ابن ابی الحدید ۱/ ۱۲۲۔

یہ خطبہ ابن مزاحم الکوفی نے کتاب صفین میں نقل کیا ہے۔[۱]

(۲۲) نہج کا پچپنواں خطبہ ہے:-

"ولقد کنا مع رسول اللہ نقتل آباءنا وابناءنا واخواننا واعمامنا، ما یزیدنا ذلک الا ایمانا وتسلیما ومضیا علی اللقم وصبرا علی مضض الالم"[۲]

ہم رسول اللہ کے ساتھ اپنے باپوں، بیٹوں، بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کرتے تھے۔ اس سے ہمارا ایمان بڑھتا تھا۔ اطاعت اور راہِ حق کی پیروی میں اضافہ ہوتا تھا۔ اور رنج و الم کی سوزش پر صبر میں زیادتی ہوتی تھی۔

یہ خطبہ شیخ مفید نے الارشاد (ص۱۵۳) میں نقل کیا ہے۔

(۲۳) نہج کا چھپنواں خطبہ ہے:-

"اما انہ سیظہر علیکم رجل ... الا وانہ سیامرکم بسبی والبراءۃ منی"[۳]

دیکھو، تمہارے پاس ایک شخص آئے گا ...... دیکھو، وہ تمہیں حکم دے گا کہ مجھے برا بھلا کہو اور مجھ سے اپنی بیزاری کا اظہار کرو۔

یہ کلام اصول الکافی (ص۲۶) میں کلینی نے، اور کتاب الغارات میں معمولی فرق کے ساتھ الثقفی نے[۴] اور امالی (ص۱۳۲-۲۲۲) میں شیخ الطائفہ نے روایت کیا ہے۔

(۲۴) نہج کی ستاونویں گفتگو خوارج سے ہے۔ اس کا آغاز ہے:-

"اصابکم حاصب ولا بقی منکم آبر۔ ابعد ایمانی باللہ وجہادی مع رسول اللہ اشہد علی نفسی بالکفر؟"[۵]

تم پر تیز آندھی آئے اور تم میں کوئی بنانے والا بھی نہ بچے! کیا اللہ پر ایمان لانے اور اس کے رسول کی معیت میں جہاد کرنے کے بعد میں اپنے اوپر کفر کی گواہی دے سکتا ہوں؟

یہ گفتگو طبری نے اپنی تاریخ (۶/۴۷) میں نقل کی ہے۔

(۲۵) نہج کا ستر سٹھواں کلام ہے:-

"ملکتنی عینی وانا جالس، فسنح لی رسول اللہ، فقلت یا رسول اللہ، ماذا لقیت من امتک من الاود واللدد"[۶]

میری آنکھ لگ گئی، درانحالیکہ میں بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں رسول اللہ میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے کہا: اللہ کے رسول! اب میں آپ کی امت کی طرف سے بہت کچھ کجروی اور دشمنی بھگت چکا۔

یہ پورا کلام ابن عبد ربہ نے العقد (۲/۲۹۸) میں اور ابوالفرج الاصفہانی نے مقاتل الطالبیین (ص۲۰) میں نقل کیا ہے۔ اور آخری حصہ معمولی اختلاف کے ساتھ ابوعلی القالی کی کتاب النوادر (ص۱۹۰) میں مندرج ہے۔

(۲۶) نہج کا چونسٹھواں کلام ہے:-

"ان بنی امیۃ لیفوقوننی تراث محمد تفویقا، واللہ لئن بقیت لہم لانفضنہم نفض اللحام الوذام التربۃ"[۷]

بنی امیہ مجھے محمد کی میراث میں سے بہت تھوڑا تھوڑا حصہ دینا چاہتے ہیں، میں انھیں ایسا جھاڑ پھینکوں گا جیسے قصائی گوشت کی بوٹی سے مٹی جھاڑ پھینکتا ہے۔

یہ کلام ابوعبید نے غریب الحدیث (۹۶ ب) میں اور ابوالفرج الاصفہانی نے کتاب الاغانی (ابن ابی الحدید ۱/۲۸۶) میں نقل کیا ہے۔

(۲۷) نہج کا اٹھترواں کلام ہے:-

"ایہا الناس، الزہادۃ قصر الامل، والشکر

لوگو، زہد امیدوں کی کمی، نعمتوں پر شکر

---

[۱] ابن ابی الحمید ۱/۱۸۰۔ [۲] نہج ۱/۱۰۹۔ [۳] ایضاً ۱/۱۱۰۔ [۴] ابن ابی الحمید ۱/۳۵۶۔ [۵] نہج ۱/۱۱۰۔ [۶] ایضاً ۱/۱۱۸۔ [۷] ایضاً ۱/۱۲۳۔

شُعْثاً غُبْراً۔ وقد باتوا سُجَّداً وقیاماً۔ یُراوِحون بین جباههم وخدودهم۔ ویقفون علی مثل الجمر من ذکر معادهم، کأنّ بین اعینهم رُکَبَ المعزی من طول سجودهم۔
اذا ذُکِرَ الله هَمَلَتْ اعینهم حتی تَبُلَّ جیوبهم ومادوا کما یمید الشجر یوم الریح العاصف، خوفاً من العقاب ورجاءً للثواب۔"[1]

دھول میں اَٹے ہوتے تھے اور رات کو سجدوں اور قیام کی حالت میں گزارتے تھے کبھی اپنی پیشانیاں زمین پر رکھتے تھے اور کبھی رخسار۔ وہ اپنی آخرت یاد کرتے تو معلوم ہوتا کہ انگاروں پر کھڑے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے درمیان پے بہ پے سجدے کرنے کے باعث بھیڑ بکری کے گھٹنوں جیسا گھٹا ہوا تھا۔ جب اللہ کا ذکر ہوتا تو ان کی آنکھیں آنسو برساتیں۔ یہاں تک کہ گریبان تر ہو جاتے، اور عذاب کے خوف اور ثواب کی امید سے ایسے لرزتے اور کپکپاتے جیسے تیز آندھی میں درخت کی حالت ہوتی ہے۔

یہ کلام ابن قتیبہ کی عیون الاخبار (۲/۳۰۱) میں، شیخ مفید کی الارشاد (ص ۱۳۸) اور مجالس (بحار ۱۲/۳۲۰) میں، ابونعیم کی حلیۃ الاولیاء (۱/۷۶) اور شیخ صدوق کی امالی (ص ۱۲۵) میں موجود ہے۔

(۳۳) نہج کا خطبہ نمبر ۱۰۶ ایوں شروع ہوا ہے:۔

"الحمد لله الذی شرع الاسلام فسهّل شرائعه لمن ورده واعزّ ارکانه علی من غالبه، فجعله امناً لمن علقه، وسلماً لمن دخله۔"[2]

وہ اللہ سزاوار حمد ہے جس نے اسلام کو شریعت بنایا، اور اس کے احکام کو آسان کر دیا اس کیلئے جو اس میں داخل ہوگیا اور اس کے ارکان کو دشوار قرار دیا اس کے لئے جس نے اس پر غالب ہونا چاہا۔ پھر اسے امن بنایا اس کے لئے جو اس سے لپٹ گیا اور سلامتی اس کیلئے جو اس میں داخل ہوگیا۔

یہ خطبہ کلینی نے اصول الکافی (ص ۱۳۶) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۳۳) میں نقل کیا ہے۔ اور اس کے ایک حصے کو جو "الایمان علی اربع دعائم" سے شروع ہوتا ہے۔ ابو محمد بن شعبۃ حرانی نے تحف العقول (بحار ۷/۳۰۹) میں، ابو علی القالی نے النوادر (ص ۱۲۳) میں، ابونعیم الاصفہانی نے حلیہ (۱/۷۴) میں اور قاضی محمد بن سلامۃ القضاعی نے دستور معالم الحکم (ص ۱۳) میں نقل کیا ہے۔

(۳۴) نہج کا کلام نمبر ۱۰۳ ہے:۔

"وقد رایت جولتکم وانحیازکم عن صفوفکم تحوزکم الجفاة الطغام واعراب اهل الشام، وانتم لهامیم العرب ویآفیخ الشرف والانف المقدّم والسنام الاعظم۔"[3]

میں نے تمہاری صفوں کا پھٹنا اور بکھر جانا اور انتشار دیکھا۔ تمہیں تند خو اور اوباش اور شام کے بدو گھیرے ہوئے تھے۔ حالانکہ تم عرب کے شہسوار اور شرافت کی چوٹی، اور چہرے کی ناک اور بزرگی میں کوہان ہو۔

یہ گفتگو طبری کی تاریخ (۶/۱۴) میں بھی موجود ہے۔

(۳۵) نہج کا خطبہ نمبر ۱۰۶ سے ہے:۔

"ان افضل ما توسّل به المتوسّلون الی الله سبحانه الایمان به وبرسوله، والجهاد فی سبیله فانه ذروة الاسلام، وکلمة الاخلاص فانها الفطرة، واقام الصلوة فانها الملّة، وایتاء الزکوة فانها فریضة واجبة وصوم شهر رمضان فانه جنّة من العقاب، وحج البیت و

اللہ سے قربت حاصل کرنے والوں کا سب سے بہتر ذریعہ قربت اللہ، اور اس کے رسول پر ایمان لانا ہے اسکی راہ میں جہاد کرنا ہے کیونکہ جہاد اسلام کا بلند ترین حصہ ہے اور خلوص کی بات ہے کیونکہ یہ فطرت انسانی ہے اور نماز کی پابندی ہے کیونکہ یہ ملت اسلامی ہے، اور زکوٰۃ دینا ہے۔ کیونکہ وہ ضروری فرض ہے، اور رمضان کے روزے رکھنا ہے۔ کیونکہ وہ عذاب کی

---

[1] نہج ۱/۱۹۰۔ [2] ایضاً ۱/۲۰۲۔ [3] ایضاً ۱/۲۰۵۔

واعتماره، فإنهما ينفيان الفقر ويرحضان الذنب، وصلة الرحم فإنها مثراة في المال ومنسأة في الأجل، وصدقة السر فإنها تكفر الخطيئة، وصدقة العلانية فإنها تدفع ميتة السوء، وصنائع المعروف فإنها تقي مصارع الهوان۔[1]

اعمال ہے اور بیت اللہ کا حج ہے اور عمرہ کرنا ہے کیونکہ یہ دونوں افلاس کھوتے اور گناہ دھوتے ہیں۔ اور اعزا کی مدد۔ کیونکہ یہ مال بڑھاتی اور موت کو پیچھے ہٹاتی ہے۔ اور خفیہ خیرات۔ کیونکہ یہ خطاؤں کا کفارہ ہے، اور علانیہ خیرات کہ یہ بری موت کو دفع کرتی ہے۔ اور نیک کام، کیونکہ یہ ذلت کی جگہوں سے بچاتے ہیں۔

یہ خطبہ ابو جعفر البرقی نے المحاسن (ورق ۱۱۹ الف) میں، الحرانی نے تحف العقول[2] میں، شیخ صدوق نے علل الشرائع (ص ۱۱۳) میں، شیخ مفید نے الامالی[3] میں، شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۱۳۵) میں اور ابو الحسین بن سعید نے اپنی کتاب میں (بحار ۱۷/...) میں نقل کیا ہے۔

(۳۶) نہج کا خطبہ نمبر ۱۰۷ ہے:-

"أما بعد فإني أحذركم الدنيا، فإنها حلوة خضرة، حفت بالشهوات، وتحببت بالعاجلة، وراقت بالقليل، وتحلت بالآمال۔"[4]

بعد ازاں۔ میں تمہیں دنیا سے ڈراتا ہوں۔ کیونکہ یہ میٹھی اور سرسبز ہری ہے۔ یہ خواہشات سے گھری ہوئی ہے۔

یہ پورا خطبہ بنام قطری بن الفجاءة۔ جاحظ نے کتاب البیان والتبیین (۱۹۶/۲) میں۔ اور اس کا ایک حصہ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (۲۵۰/۲) میں اور ابن عبد ربہ نے العقد (۱۹۵/۲) میں درج کیا ہے۔ اور بنام امیر المومنین ابو عبید اللہ مرزبانی معتزلی شیعی متوفی ۳۸۴ھ (۹۹۴ء) نے کتاب المونق میں[5]۔ کلینی نے فروع الکافی (۹۱/۳) میں اور فرج القرشی نے تبیین قرب الاسناد (بحار ۱۰۵/۱۷) میں نقل کیا ہے۔

(۳۷) نہج کا ایک سو تیئسواں کلام ہے:-

"فقدموا الدارع وأخروا الحاسر وعضوا على الأضراس فإنه أنبى للسيوف عن الهام"[6]

پس زرہ پوش کو آگے رکھو اور بے زرہ کو پیچھے کر لو۔ اور ڈاڑھیں خوب بھینچ لو کیونکہ یہ صورت تلواروں کو کھوپڑیوں کاٹنے سے باز رکھتی ہے۔

یہ گفتگو طبری کی تاریخ (۹/۶) اور ابن مسکویہ متوفی ۴۲۱ھ (۱۰۳۰ء) کی تجارب الامم (۵۰۳/۱) میں موجود ہے۔

(۳۸) نہج کا ایک سو اکیسواں کلام ہے:-

"إنا لم نحكم الرجال، وإنما حكمنا القرآن۔ وهذا القرآن إنما هو خط مستور بين الدفتين، لا ينطق بلسان، ولا بد له من ترجمان۔ وإنما ينطق عنه الرجال"[7]

بیشک ہم نے آدمیوں کو حکم نہیں بنایا ہے۔ بلکہ ہم نے حکم بنایا ہے قرآن کو اور یہ قرآن ایک تحریر ہے جو دو دفتیوں میں پوشیدہ ہے۔ زبان سے بات نہیں کرتا اور اس کے لئے ترجمان ضرور ہوتا ہے۔ اور اس کی طرف سے آدمی بات کیا کرتے ہیں۔

یہ گفتگو بھی طبری (۳۷/۶) میں درج ہے۔

(۳۹) نہج کا ایک سو چھتیسواں کلام ہے:-

"لم تكن بيعتكم إياي فلتة، وليس أمري وأمركم واحدا، إني أريدكم لله، وأنتم تريدونني لأنفسكم۔"[8]

تم نے مجھ سے اچانک بیعت نہیں کی تھی اور میرا اور تمہارا معاملہ ایک نہیں ہے۔ میں تمہیں اللہ کے لئے چاہتا ہوں اور تم مجھے اپنے لئے چاہتے ہو۔

---

[1] نہج ۲۰۵/۱۔ [2] بحار الانوار ۹۰/۱۷۔ [3] ایضاً ۱۰۵/۱۷۔ [4] نہج ۲۱۴/۱۔ [5] ابن ابی الحدید ۳۹۷/۱۔ مرزبانی کے لئے دیکھئے ابن خلکان ۲۲/۲، ۷۔ و انساب السمعانی ورق ۵۲۱ الف۔ و شذرات ۱۱۱/۳۔ [6] نہج ۳/۲۔ [7] نہج ۷/۲۔ [8] ایضاً ۲۶/۲۔

شیخ مفید نے الارشاد ص۱۴۳ میں جو خطبہ نقل کیا ہے۔ اس کا یہ ایک ٹکڑا ہے۔

(۴۰) نہج کا ایک سو پینتیسواں کلام ہے۔

"لم یسرع احد قبلی الی دعوة حق وصلة رحم وعائدة کرم" ؎۱

مجھ سے پہلے کوئی بھی حق کی پکار، صلہ رحم اور کرم وجود کے منافع کی طرف تیز نہیں دوڑا۔

یہ کلام طبری نے اپنی تاریخ (۳۹/۵) میں بتمام نقل کیا ہے۔

(۴۱) نہج کا ایک سو اکتالیسواں خطبہ ہے:

"ایها الناس، انما انتم فی هذه الدنیا غرض تنتضل فیه المنایا، مع کل جرعة شرق" ؎۲

لوگو، تم اس دنیا میں نشانہ ہو جس پر موت تیر لگاتی ہے۔ ہر گھونٹ کے ساتھ اچھو ہے۔

یہ خطبہ ابو علی القالی نے کتاب الامالی (۵۷/۲ و ۱۰۲) میں اور شیخ مفید نے الارشاد (ص۱۳۹) الامالی (بحار ۱۰۶/۱۷) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص۱۳۵) میں بنام امیر المومنین نقل کیا ہے۔ لیکن ان سے پہلے الحرانی تحف العقول (بحار ۱۶۵/۱۷) میں بنام امام محمد باقرؑ قدرے اختلاف الفاظ کے ساتھ نقل کر چکا ہے۔

(۴۲) نہج کی ایک سو چھیالیسویں گفتگو ہے۔

"ان هذا الامر لم یکن نصره ولا خذلانه بکثرة ولا قلة۔ وهو دین الله الذی اظهره۔ وجنده الذی اعده وامده۔" ؎۳

بیشک اس امر کی کامیابی و ناکامی کا مدار کثرت و قلت پر نہ تھا۔ یہ اللہ کا وہ دین ہے جسے اس نے غالب کیا ہے اور وہ لشکر ہے جسے خود اس نے تیار کیا ہے اور مدد دی ہے۔

اس گفتگو کا ایک ٹکڑا "فانک ان اشخصت" سے آخر تک طبری کی تاریخ (۲۳۷/۴) اور ابن مسکویہ کی تجارب الامم (۳۱۹/۱) میں نقل ہوا ہے اور پورا کلام شیخ مفید نے الارشاد (ص۱۲۱) میں درج کیا ہے۔

(۴۳) نہج کا ۱۴۸ واں خطبہ اور خطبہ نمبر ۱۸۰ حمد باری پر مشتمل ہیں جنہیں کلینی نے اصول الکافی (ص۳۳) میں انھیں نقل کیا ہے صرف معمولی لفظی اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۴۴) نہج کا ایک سو ساٹھواں خطبہ ہے:

"ان الله بعث رسولاً هادیاً بکتاب ناطق وامر قائم۔ لا یهلک عنه الا هالک۔ وان المبتدعات المشبهات هن المهلکات، الا ما حفظ الله منها" ؎۴

بیشک اللہ تعالیٰ نے ایک رہنما پیغمبر بولنے والی کتاب اور درست دیرپا امر کے ساتھ بھیجا۔ اس سے اب وہی ہلاک ہوگا جو ہلاک ہونے ہی والا ہے۔ اور بیشک ایسی باتیں جو دین کی باتوں سے ملتی جلتی ہوتی ہیں وہی ہلاک کرنے والی ہوتی ہیں۔ مگر وہ جن سے اللہ بچا دے۔

اس خطبے کا پہلا پیراگراف یعنی شروع سے "حتی یأزر الامر الی غیرکم" تک طبری (۱۶۳/۵) میں نقل ہوا ہے۔

(۴۵) نہج کا ۱۷۶ واں خطبہ ہے:

"اللهم رب السقف المرفوع والجو المکفوف، الذی جعلته مغیضاً للیل والنهار ومجری للشمس والقمر" ؎۵

اے اللہ اے اونچی چھت، اور تھامی ہوئی فضا کے پروردگار، جسے تو نے رات اور دن کیلئے منبع اور سورج اور چاند کی گزرگاہ بنایا ہے۔

یہ خطبہ طبری نے اپنی تاریخ (۸/۶) میں نقل کیا ہے۔

؎۱ نہج ۳۱/۲۔ ؎۲ ایضاً ۳۲/۲۔ نیز ج ۹۶/۳ بھی ملاحظہ ہو جہاں بذیل حکم یہ خطبہ تغیر و تبدل اور کمی بیشی کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔
؎۳ نہج ۴۴/۲۔ ؎۴ ایضاً ۵۳/۲ و ۱۲۷۔ ؎۵ ایضاً ۹۹/۲۔ ؎۶ ایضاً ۱۰۱/۲۔

(۴۶) نہج کا ۱۹۷ واں خطبہ ہے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَا تُوَارِیْ عَنْهُ سَمَاءٌ سَمَاءً وَلَا اَرْضٌ اَرْضًا ؀[۱]

سزاوارِ حمد ہے وہ اللہ جس سے کوئی آسمان دوسرے آسمان اور کوئی زمین دوسری زمین کو نہیں چھپا سکتی۔

اس خطبہ کو ابراہیم الثقفی نے کتاب الغارات میں نقل کیا ہے[۲]

(۴۷) نہج کا ۱۷۴ واں کلام ذِعلب یمانی سے رؤیتِ باری میں ہوا ہے۔ اس کا آغاز ہے:-

لَا تُدْرِكُهُ الْعُيُونُ بِمُشَاهَدَةِ الْعِيَانِ، وَلٰكِنْ تُدْرِكُهُ الْقُلُوبُ بِحَقَائِقِ الْاِيْمَانِ ؀[۳]

اسے آنکھیں ظاہری مشاہدے کے ذریعہ نہیں دیکھ سکتیں بلکہ دل ایمان کی حقیقتوں کی وساطت سے پا سکتے ہیں۔

یہ گفتگو ابوجعفر البرقی نے کتاب المحاسن (ورق ۹۳، الف) میں، کلینی نے اصول کافی (ص۵۲) میں، شیخ صدوق نے کتاب الامالی (ص۲۸) اور کتاب التوحید (ص۳۳ و ۳۲۳) میں اور شیخ مفید نے الارشاد (ص۱۳۱) میں نقل کی ہے۔

(۴۸) نہج کا خطبہ نمبر ۱۸۱ ہے:-

"مَا وَحَّدَهُ مَنْ كَيَّفَهُ، وَلَا حَقِيْقَتَهُ اَصَابَ مَنْ مَثَّلَهُ" ؀[۴]

جس نے اس کی کیفیت بیان کی اس نے ایک نہ مانا، جس نے اس کی مثال قرار دی وہ اس کی حقیقت تک نہ پہنچا۔

یہ خطبہ شیخ صدوق نے کتاب التوحید (ص۴۳) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص۱۳) میں امام رضا علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔ اس کے کچھ حصے شیخ صدوق نے کتاب التوحید (ص۳۳ و ۳۲۳) میں، شیخ مفید نے الارشاد (ص۳) میں اور سید مرتضیٰ نے امالی (۱/۱۰۳) میں امیرالمومنین کے نام سے نقل کئے ہیں۔

(۴۹) نہج کا کلام نمبر ۱۹۵ ہے:-

وَاللّٰهِ، مَا مُعَاوِيَةُ بِاَدْهٰى مِنِّىْ، وَلٰكِنَّهُ يَغْدِرُ وَيَفْجُرُ وَلَوْ لَا كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ اَدْهَى النَّاسِ ؀[۵]

خدا، معاویہ مجھ سے زیادہ ہوشیار نہیں لیکن وہ دھوکا دیتا ہے اور بڑا خطاکار بنتا ہے، اور اگر دھوکے کو میں برا نہ جانتا تو ساری دنیا سے زیادہ چالاک ثابت ہوتا۔

یہ کلام کلینی نے اصول الکافی (ص۲۳۲) میں نقل کیا ہے۔

(۵۰) نہج کا ۲۰۵ واں کلام ہے:-

"اِنَّ فِیْ اَيْدِی النَّاسِ حَقًّا وَبَاطِلًا، وَصِدْقًا وَكَذِبًا، وَنَاسِخًا وَمَنْسُوْخًا، وَعَامًّا وَخَاصًّا، وَمُحْكَمًا وَمُتَشَابِهًا، وَحِفْظًا وَوَهْمًا، وَلَقَدْ كُذِبَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ عَلٰى عَهْدِهٖ، حَتّٰى قَامَ خَطِيْبًا فَقَالَ: مَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ" ؀[۶]

بیشک جو لوگوں میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، ناسخ اور منسوخ، عام اور خاص، محکم اور متشابہ، یاد اور وہم سب کچھ ہے۔ اور یقیناً رسول اللہ پر خود ان کے زمانے میں جھوٹ بولا گیا۔ تا آنکہ آپ نے کھڑے ہو کر تقریر فرمائی اور کہا جو کوئی مجھ پر جان بوجھ کے جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا آگ کو بنالے۔

یہ کلام ابوصادق سلیم بن قیس الہلالی العامری الکوفی (جناب امیرالمومنین و حسن و حسین و زین العابدین علیہم السلام) نے اپنی کتاب میں (نسخہ القال ورق ۱۶۱، الف تا ۱۶۲، الف) الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۳۷) میں، کلینی نے اصول الکافی (ص۱۵) میں نقل کیا ہے۔

(۵۱) نہج کا دوسو بارھواں [۲۱۲] کلام ہے:-

---

[۱] نہج ۲/۱۰۲ [۲] ابن ابی الحدید ۱/۲۹۵ [۳] ایضاً ۲/۱۰۲ [۴] ایضاً ۲/۱۲۲۔

[۵] نہج ۲/۲۰۶۔ [۶] ایضاً ۲/۲۱۴

"دَعُونِي وَالْتَمِسُوا غَيْرِي. فَإِنَّا مُسْتَقْبِلُونَ أَمْرًا لَهُ وُجُوهٌ وَأَلْوَانٌ" [1]

مجھے چھوڑ دو اور کسی اور کو تلاش کرو۔ ہم ایک ایسے کام سے دوچار ہونے والے ہیں جس کے کئی رُخ اور متعدد رنگ ہیں۔

یہ خطبہ طبری کی تاریخ (۵/۱۵۶) اور ابن مسکویہ کی تجارب الامم (۱/۵۰۸) میں موجود ہے۔

(۵۷) نہج کا کلام نمبر ۱۲۶ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہے:۔ اس کا آغاز یہ ہے:۔

"يَا أَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ غَضِبْتَ لِلّٰهِ، فَارْجُ مَنْ غَضِبْتَ لَهُ. إِنَّ الْقَوْمَ خَافُوكَ عَلَى دُنْيَاهُمْ، وَخِفْتَهُمْ عَلَى دِينِكَ" [2]

اے ابوذر، بیشک تو اللہ کے لئے خفا ہوا ہے۔ پس جس کے لئے خفا ہے اسی سے امید رکھو۔ بیشک قوم نے تجھے اپنی دنیا کے لئے اور تو نے انہیں اپنے دین کے لئے خطرناک مانا ہے۔

یہ گفتگو ابوبکر احمد بن عبد العزیز الجوہری نے کتاب اخبار السقیفہ میں بالتفصیل نقل کی ہے۔ [3]

(۵۸) نہج کی ۱۳۱ ویں گفتگو یوں شروع ہوتی ہے:۔

"يَا ابْنَ اللَّعِينِ الْأَبْتَرِ، وَالشَّجَرَةِ الَّتِي لَا أَصْلَ لَهَا وَلَا فَرْعَ أَنْتَ تَكْفِينِي" [4]

اے بے اولاد ملعون کے بیٹے، اور ایسے درخت کے پھل جس کی نہ جڑ نہ شاخ۔ تو مجھے کافی ہوگا۔

یہ گفتگو عوانہ بن الحکم الاخباری الکوفی متوفی ۱۵۸ھ (۷۷۵ء) نے کتاب الشوریٰ ومقتل عثمان میں نقل کی ہے۔ [5]

(۵۹) نہج کا ۱۵۹ واں کلام حضرت عثمان رضی اللہ سے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"إِنَّ النَّاسَ وَرَائِي، وَقَدِ اسْتَسْفَرُونِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُمْ، وَوَاللّٰهِ مَا أَدْرِي مَا أَقُولُ لَكَ، مَا أَعْرِفُ شَيْئًا تَجْهَلُهُ، وَلَا أَدُلُّكَ عَلَى شَيْءٍ لَا تَعْرِفُهُ" [6]

لوگ میرے پیچھے ہیں اور انہوں نے مجھے تمہارے اور اپنے درمیان سفیر بنایا ہے اور بخدا میں نہیں جانتا کہ تم سے کیا کہوں۔ میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا جو تمہیں معلوم نہ ہو، اور نہ ایسی بات کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا جسے تم پہچانتے نہ ہو۔

یہ گفتگو احمد بن یحییٰ البلاذری متوفی ۲۷۹ھ (۸۹۲ء) نے انساب الاشراف (۵/۶۰) میں۔ طبری نے تاریخ (۵/۹۶) میں۔ ابن عبد ربہ نے العقد (۲/۲۷۳) میں اور ابن مسکویہ نے تجارب الامم (۱/۴۸۰) میں نقل کی ہے۔

(۶۰) نہج کی ۱۶۳ ویں گفتگو ان حضرات سے ہے، جنہوں نے امیر المومنین کو یہ مشورہ دیا تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے بدلہ لیں۔ فرماتے ہیں۔ اس کا آغاز ہے:۔

"يَا إِخْوَتَاهْ! إِنِّي لَسْتُ أَجْهَلُ مَا تَعْلَمُونَ، وَلَكِنْ كَيْفَ لِي بِقُوَّةٍ، وَالْقَوْمُ الْمُجْلِبُونَ عَلَى حَدِّ شَوْكَتِهِمْ" [7]

بھائیو! میں تمہاری معلومات سے بے خبر نہیں ہوں۔ لیکن مجھ میں قوت نہیں اور باغی اپنی قوت کی انتہا پر ہیں۔

یہ گفتگو تاریخ طبری (۵/۱۵۸) اور تجارب الامم ابن مسکویہ (۱/۵۱۰) میں نقل ہوئی ہے۔

(۶۱) نہج کا ۱۷۵ واں خطبہ یہ ہے:۔

"أَحْمَدُ اللّٰهَ عَلَى مَا قَضَى مِنْ أَمْرٍ، وَقَدَّرَ مِنْ فِعْلٍ، وَعَلَى ابْتِلَائِي بِكُمْ، أَيَّتُهَا الْفِرْقَةُ الَّتِي إِذَا أَمَرْتُ لَمْ تُطِعْ، وَإِذَا دَعَوْتُ لَمْ تُجِبْ" [8]

میں اللہ کی تعریف کرتا ہوں اس امر پر جس کا اس نے فیصلہ کیا اور اس کام پر جس کو اس نے مقدر فرمایا اور تمہارے ذریعہ اپنی آزمائش پر۔ اے وہ گروہ جو میرا حکم نہ مانے اور میری پکار کا جواب نہ دینے والو۔

---

[1] نہج ۱/۱۸۲۔ [2] ایضاً ۲/۱۲۔ [3] ابن ابی الحدید ۱/۳۵۵۔ [4] نہج ۲/۲۵۔ [5] ابن ابی الحدید ۱/۳۴۳۔ عوانہ کے لئے دیکھئے ... ۲/۳۰۶ وکتاب البیان للجاحظ ۱/۱۳۷۔ [6] نہج ۲/۸۴۔ [7] ایضاً ۲/۹۸۔ [8] ایضاً ...

یہ خطبہ الثقفی نے کتاب الغارات میں نقل کیا ہے۔[۱]

(۶۲) نہج کا انیسواں کلام اشعث بن قیس سے مخاطب ہے۔ اس کا آغاز ہے:۔

وما یُدریک ما علیّ ممّا لی، علیک لعنة الله ولعنةُ اللاعنینَ۔[۲] — تجھے کیسے معلوم ہوا کہ کیا میرے خلاف ہے اور کیا موافق۔ تجھ پر اللہ کی لعنت اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ہو۔

یہ گفتگو ابوالفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی (۱۸/۱۵۹) میں نقل کی ہے۔

(۶۳) نہج کا کلام نمبر ۱۹۸ یہ ہے:۔

ایها الناس، انما الدنیا دار مجاز والآخرةُ دارُ قرارٍ۔ فخذوا من ممرّکم لمقرّکم۔[۳] — لوگو۔ دنیا گزرگاہ ہے اور آخرت قیام گاہ۔ پس اپنی گزرگاہ سے اپنی قیام گاہ کے لئے کچھ لے جاؤ۔

یہ خطبہ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (۲/۲۵۳) میں۔ مبرد نے کتاب الکامل (تہذیب ۱/۲۸) میں۔ ابن عبدربہ نے العقد (۲/۲۰۰) میں۔ ابوعلی القالی نے کتاب الامالی (۱/۲۵۸) میں۔ بیہقی نے کتاب المحاسن والمساوی (۲/۳) میں۔ اور البکری نے سمط اللآلی (۱/۵۶۹) میں۔ ایک اعرابی کے نام سے اور ابن نباتہ مصری نے سبحان بن زفر اوکی متوفی ۵۴ھ (۶۷۳ء) کے نام سے شرح العیون (ورق ۳۹ ب) میں اور شیخ صدوق نے امالی (مجلس ۲۳ و ۳۹) میں بنام امیرالمومنین درج کیا ہے۔

(۶۴) نہج کا ۲۲۸ واں کلام ہے:۔

ألا إن اللسانَ بضعةٌ من الانسان، فلا یُسعِدُهُ القولُ إذا امتنع، ولا یُمهِلُهُ النطقُ إذا اتّسع۔[۴] — دیکھو۔ زبان انسان کا ایک جزو ہے پس بات اس کی مدد نہ کرے گی جب وہ خود باز رہیگا۔ اور گفتگو اس کیساتھ نرمی نہ برتے گی جب خود پھیلاؤ دیگا۔

بقول ابن ابی الحدید، ابومسلم الخراسانی متوفی ۱۳۷ھ (۷۵۵ء) نے بعینہ یہی الفاظ اپنے ایک خطبے میں دہرائے تھے۔[۵]

(۶۵) نہج کا بارھواں کلام اہل بصرہ کی مذمت میں یوں شروع ہوا ہے:۔

کنتم جندَ المرأةِ، واتباعَ البهیمةِ رغا فأجبتم۔ وعقرَ فهربتم۔ اخلاقکم دِقاقٌ۔ وعهدکم شقاقٌ ودینکم نفاقٌ۔ وماؤکم زُعاقٌ۔[۶] — تم عورت کا لشکر اور چوپائے کے پیچھے لگے تھے۔ وہ بلبلایا تو تم نے قبول کیا۔ وہ اس کی کونچیں کاٹ دی گئیں تو تم بھاگ کھڑے ہوئے۔ تمہارے اخلاق پست ہیں اور تمہارا قول و قرار اختلاف ہے۔ اور تمہارا دین دوغلا نہیں ہے اور تمہارا پانی کھاری ہے۔

یہ کلام ابن قتیبہ نے عیون (۱/۲۱۶) میں، ابن عبدربہ نے العقد (۲/۲۰۹ و ۲۰۲) میں اور ابن الشیخ نے امالی (ص۴) میں نقل کیا ہے۔

(۶۶) نہج کا تیسواں کلام حضرت ابن عباسؓ سے ہے۔ جبکہ انھیں جنگ جمل سے پہلے حضرت زبیرؓ سے گفتگو کرنے بھیجا تھا۔ اس کا آغاز ہے:۔

لا تلقینّ طلحةَ، فإنک إن تلقهُ تجدهُ کالثّورِ عاقصٌ قرنَهُ۔ یرکبُ الصّعبَ ویقولُ هو الذّلولُ۔[۷] — تو طلحہ سے ہرگز مت ملنا کیونکہ اس سے ملے گا تو اسے بیل کی طرح اپنے سینگ اٹھائے پائے گا۔ وہ دشوار گزار راہ پر چلتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سہل اور آسان ہے۔

یہ گفتگو ابن قتیبہ نے عیون (۱/۱۹۵) میں نقل کی ہے۔

(۶۷) نہج کا اکتیسواں خطبہ ماخذ کتاب کے تحت گزر چکا ہے۔ اسے، علاوہ جاحظ کے، ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (۲/۲۳۶) میں۔ ابن عبدربہ نے العقد (۲/۱۷۳) میں اور باقلانی نے اعجاز القرآن (۱/۱۹۷) میں شعیب بن صفوان کے حوالے سے بنام حضرت سعدیؓ درج کیا ہے۔

۱؎ ابن ابی الحدید ۱/۲۹۶۔ ۲؎ نہج ۱/۵۱۔ ۳؎ ایضاً ۲/۲۰۰۔ ۴؎ ابن ابی الحدید ۲/۳۰۷۔ ۵؎ نہج ۲/۲۵۴۔ ۶؎ نہج ۱/۴۰۔ ۷؎ ایضاً ۱/۷۳۔

(٦٨) نہج کا کلام نمبر ١٢١ : اپنے ساتھیوں پر عتاب ہے۔ اس کا آغاز ہے :-

"هٰذا جزاء من ترك العقدة. أما والله، لو أني حين أمرتكم بما أمرتكم به، حملتكم على المكروه الذي يجعل الله فيه خيراً: فإن استقمتم هديتكم، وإن اعوججتم قومتكم، لكانت الوثقى! ولكن بمن وإلى من؟ أريد أن أداوي بكم، وأنتم دائي. كناقش الشوكة بالشوكة، وهو يعلم أن ضلعها معها!"[1]

یہ اس شخص کا بدلہ ہے جس نے گانٹھ (عہد) کو چھوڑا۔ بخدا۔ اگر میں جب تمہیں حکم دے رہا تھا ایسی ناپسندیدہ بات پر آمادہ کرتا جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہاری بھلائی رکھی تھی، پھر تم قائم رہتے۔ تو تمہیں راہ راست دکھاتا اور ٹیڑھے چلتے تو سیدھا کر دیتا۔ تو یہ بات زیادہ مضبوط ہوتی۔ لیکن کس کی مدد سے اور کس کو؟ میں تمہارے ذریعہ علاج کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ تمہیں میرا مرض ہو۔ جیسے کانٹے کو کوئی کانٹے ہی سے نکالے۔ اور یہ جانتا ہو کہ اس کانٹے کی کجی اس کے ساتھ ہے۔

یہ کلام ابن عبد ربہ نے العقد (١٦٥/٢) میں بھی نقل کیا ہے۔

(٦٩) نہج کے ١٣٣ ویں کلام کا دوسرا حصہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے :-

"فأقبلتم إليّ إقبال العوذ المطافيل إلى أولادها تقولون: البيعة البيعة. قبضت يدي فبسطتموها، ونازعتكم يدي، فجذبتموها."[2]

پھر تم میری طرف ایسے ٹوٹ پڑے جیسے نئی بیاہی بچوں والی اونٹنیاں اپنے بچوں کی طرف دوڑتی ہیں۔ تم کہتے تھے بیعت بیعت۔ میں نے اپنا ہاتھ بند کر لیا تو تم نے اسے پھیلا دیا۔ اور میں نے تم سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا تو تم نے اسے کھینچ لیا۔

یہ کلام ابن عبد ربہ نے العقد (١٦٢/٢ و ٢٧٧) میں نقل کیا ہے۔

(٧٠) نہج کا چھتیسواں کلام "فقمت بالأمر" سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا آخری جملہ یہ ہے :-

"فنظرت في أمري، فإذا طاعتي قد سبقت بيعتي، وإذا الميثاق في عنقي لغيري"[3]

میں نے اپنے معاملے پر نظر کی۔ تو دیکھا کہ میری اطاعت میری بیعت سے آگے نکل چکی ہے اور دوسرے کے لئے قول و قرار میری گردن میں ہے۔

یہ جملہ البیہقی نے کتاب المحاسن (٣٦/١) میں نقل کیا ہے۔

(٧١) نہج کا انتالیسواں کلام خارجیوں کے قول "لا حكم إلا لله" کا جواب ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے :-

"كلمة حق يراد بها الباطل"[4]

حق بات ہے جس سے مقصود باطل ہے۔

یہ قول مبرد نے الکامل (٩٣٠/٣) میں باختلاف الفاظ نقل کیا ہے۔

(٧٢) نہج کا ٦٣ واں کلام اہل صفین کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا ہے۔ اس کا آغاز ہے :-

"معاشر المسلمين! استشعروا الخشية، وتجلببوا السكينة، وعضوا على النواجذ."[5]

مسلمانو! خوف الٰہی کو اپنا شعار بناؤ۔ اور سکون کو اپنی چادر قرار دو۔ اور دانت بھینچ کر بند کر لو۔

یہ کلام ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (١١٧/١ و ١٣٣) میں اور البیہقی نے کتاب المحاسن (٣٢/١) میں نقل کیا ہے۔

(٧٣) نہج کا اکہترواں خطبہ یہ ہے :-

"اللهم، داحي المدحوات، وداعم المسموكات، وجابل القلوب على فطرتها شقيها وسعيدها."[6]

اے اللہ! اے زمینوں کے پھیلانے والے اور آسمانوں کے محافظ۔ اور دلوں کے ان کی اصل حالت پر پیدا کرنے والے، خواہ وہ بدبخت ہوں یا خوش نصیب۔

---

[1] نہج ٧٣/١ - [2] ایضاً ٢٣٣/١ - [3] نہج ٨٥/١ - [4] ایضاً ٨٧/١ - [5] ایضاً ١١٠/١ - [6] ایضاً ١١٦/١ -

یہ خطبہ ابو علی القالی نے کتاب النوادر (ص ۱۷۵) میں نقل کیا ہے۔

(۴) نہج کا کلام نمبر ۸۰ حسب ذیل ہے:-

عَجَبًا لابنِ النابغۃ، یَزعُمُ لاھلِ الشام اَنَّ فِیَّ دُعَابَۃً وَ اِنِّی امرؤٌ تِلعابۃٌ۔ [۱]

ہمیں ابن النابغہ پر تعجب آتا ہے۔ شامیوں سے کہتا ہے کہ علی پر مزاح ہے۔ اور وہ بہت کھلنڈرے انسان ہیں۔

یہ کلام ابن قتیبہ نے عیون (۱/۲۶۳) میں، البیہقی نے کتاب المحاسن (۱/۱۳۹) میں اور شیخ المفید نے امالی (ص ۳۲) میں نقل کیا ہے۔

(۵) نہج کا ۱۱۹ واں کلام میدان جنگ میں اپنے سپاہیوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے۔ اس میں یہ جملہ بھی ہے:-

اِنَّ الموتَ طالبٌ حثیثٌ لا یَفُوتُہُ المُقیمُ ولا یُعجِزُہُ الھاربُ۔ [۲]

بیشک موت تیز رفتار متلاشی ہے۔ نہ مقیم اس سے بچ سکتا ہے اور نہ بھگوڑا اسے ہرا سکتا ہے۔

یہ کلام ابن عبد ربہ نے العقد (۲/۲۰۷) میں، اور شیخ المفید نے امالی (ص ۱۳۵) میں نقل کیا ہے۔

(۶) نہج کا ۲۱۴ واں کلام ہے:-

لقد اصبحَ ابو محمد بھذا المکانِ غریبًا۔ اَمَا واللہِ لقد کنتُ اَکرہُ اَن تکونَ قریشٌ قتلیٰ۔ [۳]

ابو محمد اس جگہ مسافر ہوگئے۔ بخدا میں اسے برا جانتا تھا کہ قریش مارے جائیں۔

یہ کلام مبرد نے الکامل (۱/۱۸۵) میں، ابن عبد ربہ نے العقد (۲/۲۶۹) میں اور البیہقی نے المحاسن (۲/۵۳) میں نقل کیا ہے۔

ماخذ خطوط

ان خطبوں کے ساتھ ساتھ حسب ذیل خطوط بھی تاریخ وادب کی کتابوں میں منقول ہوئے ہیں:-

نہج کا سب سے پہلا خط اہل کوفہ کے نام ہے، جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنے برتاؤ کا ذکر فرمایا ہے اس کا آغاز ہے:-

"اما بعد فانی اُخبِرُکم عن امرِ عثمان حتی یکونَ سمعُہ کعیانِہ۔

ان الناس طعنوا علیہ۔ فکنتُ رجلًا من المھاجرین اُکثِرُ استعتابَہ واُقِلُّ عتابَہ۔" [۴]

بعد ازاں، میں تمہیں عثمان کے قضیے کی خبر سناتا ہوں۔ تاکہ اس کا سننا ایسا ہو جیسے اس کا دیکھنا۔

لوگوں نے ان پر الزام لگائے۔ میں مہاجرین میں سے وہ شخص تھا کہ ان کو خوش زیادہ رکھتا تھا، اور خفا کم ہوتا تھا۔

یہ خط ابن قتیبہ نے الامامہ (ص ۴۰) میں اور ابن الشیخ نے امالی (ص ۸۰) میں نقل کیا ہے۔

(۲) نہج کا پانچواں خط اشعث بن قیس عامل آذربائیجان کے نام ہے۔ اس کا آغاز ہے:-

واِنَّ عملَکَ لیس لکَ بطعمۃٍ، ولکنّہ فی عُنُقِکَ امانۃٌ۔ وانتَ مُسترعیً لِمَن فوقک۔ [۵]

تیرا کام تیرے کھاجا نہیں ہے۔ بلکہ وہ تیری گردن میں امانت ہے، اور تو اپنے سے بلند رتبہ کی نظر کے نیچے ہے۔

یہ خط مکمل صورت میں ابن قتیبہ نے الامامہ (ص ۹۲) میں اور ابن عبد ربہ نے العقد (۳/۲۰۳) میں نقل کیا ہے۔

(۳) نہج کا چھٹا خط حضرت معاویہؓ کے نام ہے۔ فرماتے ہیں:-

"انہ بایعنی القومُ الذین بایعوا ابا بکر و عمر و عثمان علی ما بایعوھم علیہ۔ فلم یکن للشاھد ان یختار ولا للغائب ان یردّ۔" [۶]

بیشک میری بیعت ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے ابوبکر، عمر اور عثمانؓ کی بیعت کی تھی اور اس بات پر کی ہے جس پر ان کی تھی۔ پس حاضر کو پسند کرنے کا اور غائب کو رد کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

---

[۱] نہج ۱/۱۵۵۔ [۲] ایضاً ۲/۲۔ [۳] ایضاً ۲/۲۳۹۔ [۴] نہج ۲/۲۔ [۵] ایضاً ۲/۳۔ [۶] ایضاً ۲/۸۔

یہ خط نصر بن مزاحم الکوفی نے کتاب صفین میں[1]۔ ابن قتیبہ نے الامامۃ (۹۳/۱) میں۔ ابوحنیفہ دینوری متوفی ۲۹۰ھ (۹۰۳ء) نے الاخبار الطوال (ص۱۶۶) میں اور ابن عبد ربہ نے العقد (۲۸۴/۲) میں نقل کیا ہے۔

(۴) نہج کا ساتواں خط بھی انہیں کے نام ہے اور اس طرح شروع ہوا ہے:۔

"امابعد فقد اَتتنی منک مَوْعِظۃٌ مُوَصَّلَۃٌ ورِسالَۃٌ مُحَبَّرَۃٌ"[2]

بعد ازاں مجھے تیری جانب سے بناوٹی نصیحت اور آراستہ خط ملا۔

یہ خط نصر بن مزاحم الکوفی نے کتاب صفین میں[3]۔ ابن قتیبہ نے الامامۃ (ص۱۰۱) میں۔ مبرد نے الکامل (۱۹۳/۱) میں۔ ابن عبد ربہ نے العقد (۲۸۴/۲) میں نقل کیا ہے۔

(۵) نہج کا آٹھواں خط جو جریر البجلی کے نام ہے۔ یوں شروع ہوا ہے:۔

"امابعد فاذا اَتاک کتابی ھذا فاحْمِلْ معاویۃَ علی الفَصْلِ"[4]

بعد ازاں جب میرا خط تجھے ملے۔ تو معاویہ کو قطعی فیصلے پر آمادہ کرنا۔

یہ خط نصر بن مزاحم نے کتاب صفین[5] میں اور ابن عبد ربہ نے العقد (۲۸۴/۲) میں نقل کیا ہے۔

(۶) نہج کا نواں خط یہ ہے:۔

فاراد قَومُنا قَتْلَ نبینا، واجتیاحَ اَصْلِنا۔ وھَمُّوا بنا الھُمُومَ وفَعلوا بنا الافاعیل"[6]

پس ہماری قوم نے چاہا کہ ہمارے نبی کو قتل کر ڈالے اور ہماری جڑ اکھاڑ پھینکے، اور انہوں نے ہمارے سلسلہ میں بہت سے ارادے اور بہت سے کام کئے۔

یہ پورا خط نصر بن مزاحم نے کتاب صفین میں[7] اور اس کا بیشتر حصہ ابن عبد ربہ نے العقد (۲۸۴/۲) میں نقل کیا ہے۔

(۷) نہج کا دسواں خط یوں شروع ہوا ہے:۔

"وکیف انت صانعٌ اِذا تکشّفتْ عنک جلابیبُ ما اَنْتَ فیہ من دُنیا قد تبَهّجتْ بزِینتِھا وخَدَعتْ بِلَذَّتِھا"[8]

تو اس وقت کیا کرے گا جب تیرے ان ملبوسات زندگی کے پردے اٹھ جائیں گے وہ دنیا جو اپنے سنگار کے باعث خوبصورت نظر آتی ہے۔ اور اپنی لذت سے دھوکا دیتی ہے۔

یہ خط نصر بن مزاحم نے کتاب صفین میں مکمل نقل کیا ہے[9]۔

(۸) نہج میں بسلسلۂ خطوط نمبر ۱۱ ایک وصیت بھی ہے۔ جو لشکر کو جنگ پر روانہ کرتے وقت کی گئی تھی۔ اس کا آغاز یہ ہے:۔

"فاِن نزلتم بعدُوٍّ او نزل بکم، فلیکنْ معسکرکم فی قُبُلِ الاشرافِ وسِفاحِ الجبالِ"[10]

جب تم دشمن کے مقابلے میں پڑاؤ ڈالو یا وہ تمہارے سامنے اُترے تو تمہاری لشکرگاہ بلندیوں کے آگے اور پہاڑوں کی تلہٹی میں ہونا چاہیے۔

یہ وصیت زیادہ مفصل صورت میں نصر بن مزاحم نے کتاب صفین میں نقل کی ہے[11]۔

(۹) نہج کا تیرھواں خط یہ ہے۔

وقد اَمَّرتُ علیکما وعلی من فی حَیّزِکما مالکَ بن الحارثِ الاشتر۔ فاسمَعالہ واطیعا واجعلاہُ دِرْعًا ومِجنًّا"[12]

میں نے تم پر اور تمہاری کمان کے آدمیوں پر مالک بن حارث اشتر کو حاکم بنا دیا۔ اب تم اس کی سنو اور مانو۔ اور اسے زرہ اور ڈھال بنالو۔

---

[1] ابن ابی الحدید ۱۳۶/۱۔ [2] نہج ۷/۳۔ [3] ابن ابی الحدید ۱۴۰/۱۔ [4] نہج ۹/۳۔ [5] ابن ابی الحدید ۱۳۹/۱۔ [6] نہج ۹/۳۔ [7] ابن ابی الحدید ۲۱۹/۱۔ [8] نہج ۱۲/۳۔ [9] ابن ابی الحدید ۲۲۱/۱۔ [10] نہج ۱۴/۳۔ [11] ابن ابی الحدید ۱۵۰/۱۔ [12] نہج ۱۶/۳۔

یہ خط طبری نے اپنی تاریخ (۱۵/۴) میں نقل کیا ہے۔

(۱۰) نہج کا سترھواں خطبہ ہے:-

وَ مَا طَلَبْكَ مِنِّي الشَّامَ فَإِنِّي لَمْ أَكُنْ لِأُعْطِيَكَ الْيَوْمَ مَا مَنَعْتُكَ أَمْسِ۔[1]

رہا تیرا مجھ سے شام کا ملک مانگنا۔ تو تجھے آج بھی وہ نہیں دوں گا۔ جو کل روک چکا ہوں۔

یہ خط نصر بن مزاحم نے کتاب صفین میں[2]۔ ابن قتیبہ نے الامامہ (ص۱۱۳) میں۔ دینوری نے الاخبار الطوال (ص۱۹۹) میں۔ مسعودی متوفی ۳۴۶ھ (۹۵۷ء) نے مروج الذہب (۴۸/۲) میں اور البیہقی نے کتاب المحاسن والمساوی (۳۶/۱) میں نقل کیا ہے۔

(۱۱) نہج کا اٹھارھواں خط ہے:-

اِعْلَمْ أَنَّ الْبَصْرَةَ مَهْبِطُ إِبْلِيسَ وَ مَغْرِسُ الْفِتَنِ فَحَادِثْ أَهْلَهَا بِالْإِحْسَانِ إِلَيْهِمْ، وَ احْلُلْ عُقْدَةَ الْخَوْفِ عَنْ قُلُوبِهِمْ۔[3]

یہ جان لو کہ بصرہ شیطان کا گھر اور فتنوں کی زمین ہے اس کے باشندوں سے احسان کا برتاؤ کرنا اور ان کے دلوں سے خوف کی گانٹھ کھول ڈالنا۔

اس خط کے کچھ جملے نصر بن مزاحم نے کتاب صفین[4] میں نقل کئے ہیں۔

(۱۲) نہج کا بائیسواں خط ہے:-

أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ الْمَرْءَ قَدْ يَسُرُّهُ دَرْكُ مَا لَمْ يَكُنْ لِيَفُوتَهُ وَ يَسُوءُهُ فَوْتُ مَا لَمْ يَكُنْ لِيُدْرِكَهُ۔[5]

بعد ازاں۔ آدمی کو کبھی اس شے کا پانا خوش کرتا ہے جسے وہ کبھی کھو نہ سکتا تھا۔ اور اس شے کا کھو دینا غمگین بنا دیتا ہے جسے وہ کبھی نہ پا سکتا تھا۔

یہ خط الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۲۶) میں۔ القالی نے الامالی (۹۶/۲) میں اور باقلانی نے اعجاز القرآن (۱۹۵/۱) میں نقل کیا ہے۔

(۱۳) نہج کا تیسواں خط ہے:-

فَاتَّقِ اللّٰهَ فِيمَا لَدَيْكَ، وَ انْظُرْ فِي حَقِّهِ عَلَيْكَ، وَ ارْجِعْ إِلَى مَعْرِفَةِ مَا لَا تُعْذَرُ بِجَهَالَتِهِ۔[6]

تو اللہ سے اُن چیزوں کے بارے میں ڈرتے رہنا جو تیرے پاس ہیں۔ اپنے اوپر اس کے حق کو نظر میں رکھنا اور اس چیز کے جاننے کی طرف دھیان دینا جس کے نہ جاننے پر معذور قرار دیا جائے۔

ابن ابی الحدید (۲۶۰/۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ارباب سیر نے زیادہ مکمل شکل میں نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ اس کا آغاز یوں بتاتا ہے:-

"أَمَّا بَعْدُ، فَقَدْ بَلَغَنِي كِتَابُكَ تَذْكُرُ مُشَاغَبَتِي" الخ۔

(۱۴) نہج کا تینتیسواں خطبہ ہے:-

وَ أَرْدَيْتَ جِيلاً مِنَ النَّاسِ كَثِيراً۔ خَدَعْتَهُمْ بِغَيِّكَ، وَ أَلْقَيْتَهُمْ فِي مَوْجِ بَحْرِكَ۔[7]

تو نے بہت لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ انہیں اپنی گمراہی سے دھوکا دیا۔ اور اپنے سمندر کی موج میں ڈال دیا۔

یہ خط ابو الحسن علی بن محمد المدائنی متوفی ۲۲۴ھ (۸۳۹ء) نے مع اس کے جواب کے نقل کیا ہے[8] اور اس کا آغاز یوں بتایا ہے:-

أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ الدُّنْيَا دَارُ تِجَارَةٍ، وَ رِبْحُهَا أَوْ خُسْرُهَا فِي الْآخِرَةِ۔

بعد ازاں۔ دنیا تجارت گاہ ہے۔ اور اس کا نفع یا نقصان آخرت میں ملے گا۔

(۱۵) نہج کا چونتیسواں خط ہے:-

---

[1] نہج ۱۳/۳۔ [2] ابن ابی الحدید ۲۲۴/۲۔ [3] نہج ۲۰/۳۔ [4] ابن ابی الحدید ۱۵۹/۱۔ [5] نہج ۲۳/۳۔
[6] نہج ۱۴/۳۔ [7] ایضاً ۲۲/۳۔ [8] ابن ابی الحدید ۲۸۰/۲۔

"امابعد فقد بلغتني مُوجدتك من تسريح الأشتر الى عملك. وإني لم أفعل ذلك استبطاءً لك في الجهد" [1]

بعد ازاں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اس سے رنجیدہ ہو کہ میں نے کام پر اشتر کو بھیج دیا ہے۔ میں نے یہ کام اس بناء پر نہیں کیا ہے کہ تمہیں کوشش کے اندر سست پاتا تھا۔

یہ خط ابراہیم الثقفی نے کتاب الغارات [2] میں اور طبری نے اپنی تاریخ (۶/۵۵) میں نقل کیا ہے۔

(۱۶) نہج کا پینتیسواں خط ہے:۔

امابعد فان مصر قد افتتحت ومحمد بن ابی بکر رحمة الله، قد استشهد. [3]

بعد ازاں۔ مصر فتح ہو گیا اور محمد بن ابی بکر اللہ اس پر رحم کرے۔ شہید کر ڈالا گیا۔

یہ خط بھی ابراہیم الثقفی نے کتاب الغارات [4] میں اور طبری نے تاریخ (۶/۶۳) میں نقل کیا ہے۔

(۱۷) نہج کا چھتیسواں خط ہے۔

"فسرّحت اليه جيشاً كثيفاً من المسلمين. فلما بلغه ذلك شمّر هارباً" [5]

میں نے اس کی طرف مسلمانوں کا ایک بڑا لشکر بھیجا۔ جب اسے اس کی اطلاع ملی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

ابن قتیبہ نے الامامہ (ص ۴۲) میں اور ابوالفرج اصفہانی نے الاغانی (۱۵/۴۴) میں اس خط کو پورا نقل کیا ہے۔

(۱۸) نہج کا سینتیسواں خط ہے:۔

فسبحان الله ما اشدّ لزومك للاهواء المبتدعة والحيرة المتّبعة [6]

سبحان اللہ۔ تو نے کیسا مضبوط پکڑ رکھا ہے۔ نئی نئی خواہشوں اور بیہودہ حیرت کو۔

(۱۹) نہج کا ۳۸ واں خط اہل مصر کے نام یوں شروع ہوا ہے:۔

"من عبد الله علي امير المومنين الى القوم الذين غضبوا لله حين عُصي في ارضه وذُهب بحقه" [7]

اللہ کے بندے علی امیرالمومنین کی طرف سے ان لوگوں کے نام جو اللہ کی خاطر غضبناک ہوئے۔ جب زمین میں اللہ کی نافرمانی کی گئی۔ اور اس کا حق غصب کیا گیا۔

یہ خط طبری نے اپنی تاریخ (۶/۵۵) میں نقل کیا ہے۔

(۲۰) نہج کا انتالیسواں خط ہے:۔

"فانك قد جعلت دينك تبعاً لدنيا امرء ظاهر غيّه مهتوك ستره" [8]

بیشک تو نے اپنا دین ایسے آدمی کی دنیا کا تابع بنا دیا ہے۔ جس کی گمراہی ظاہر ہے۔ اور پردہ چاک ہے۔

یہ خط نصر بن مزاحم نے کتاب صفین میں نقل کیا ہے۔ [9]

(۲۱) نہج کا چالیسواں خط ہے:۔

"امابعد، فقد بلغني عنك امر إن كنت فعلته فقد اسخطت ربك وعصيت امامك واخزيت امانتك" [10]

بعد ازاں۔ مجھے تیری طرف سے ایسی بات کی اطلاع ملی ہے کہ اگر تو نے وہ بات کی ہے تو اپنے رب کو ناراض کر لیا۔ اور اپنے حاکم کی نافرمانی کی۔ اور اپنی امانت کو رسوا کیا۔

---

[1] نہج ۳/۶۱۔ [2] ابن ابی الحدید ۲/۲۹۲۔ [3] نہج ۳/۶۷۔ [4] ابن ابی الحدید ۲/۲۹۵۔ [5] نہج ۳/۶۷۔ [6] ایضاً ۳/۶۹۔

[7] نہج ۳/۷۰۔ [8] ایضاً ۳/۷۱۔ [9] ابن ابی الحدید ۲/۳۰۵۔ [10] نہج ۳/۷۲۔

یہ خط ابن عبد ربہ نے العقد (۲/۲۹۵) میں نقل کیا ہے۔

(۲۲) نہج کا اکتالیسواں خط ہے:

اما بعد، فانی کنت اشرکتک فی امانتی، وجعلتک شعاری وبطانتی۔ [1]

بعد ازاں۔ میں نے تجھے اپنی امانت میں شریک کیا تھا، اور اپنا ظاہر و باطن لباس قرار دیا تھا۔

اس خط کو ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (۱/۵۰ و ۲/۸۲) میں، ابن عبد ربہ نے العقد (۲/۲۹۶) میں اور ابو ہلال العسکری نے کتاب الاوائل (ص ۳۶۲) میں نقل کیا ہے۔

(۲۳) نہج کا چھیالیسواں خط کسی گورنر کے نام ہے۔

اما بعد، فانک ممن استظہر بہ علی اقامة الدین، واقمع بہ نخوة الاثیم۔ [2]

بعد ازاں۔ تو ان میں سے ہے جن سے میں امداد چاہتا ہوں دین کی اقامت میں۔ اور جن کے ذریعہ گناہگار کی نخوت کا قلع قمع کرتا ہوں۔

طبری نے اپنی تاریخ (۶/۵۲) میں اس خط کو نقل کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس کا مکتوب الیہ اشتر ہے۔

(۲۴) نہج کا سینتالیسواں خط حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو وصیت ہے۔ اس کا آغاز ہے:

اوصیکما بتقوی اللہ وان لا تبغیا الدنیا، وان بغتکما، ولا تأسفا علی شیء منہا زوی عنکما، وقولا للحق، واعملا للاجر، وکونا للظالم خصما وللمظلوم عونا۔ [3]

میں تم دونوں کو تاکید کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی۔ اور یہ کہ دنیا طلب کرنا، خواہ وہ تمہاری طالب ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو دنیوی شے تم سے کھو جائے اس پر غم نہ کھانا۔ اور حق بات کہنا۔ اور اجر کے لئے عمل کرنا اور ظالم کے دشمن اور مظلوم کے مددگار رہنا۔

یہ وصیت مبرد نے الکامل (۲/۱۵۲) میں، طبری نے تاریخ (۶/۸۵) میں، الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۴۴) میں، ابو الفرج اصفہانی نے مقاتل الطالبیین (ص ۱۵) میں، اور ابو القاسم الزجاجی متوفی ۳۳۷ھ (۹۴۸ء) نے کتاب الامالی (ص ۱۱۵) میں نقل کی ہے۔

(۲۵) نہج کا انچاسواں خط ہے۔

اما بعد، فان الدنیا مشغلة عن غیرہا، ولم یصب صاحبہا منہا شیئا الا فتحت لہ حرصا علیہا۔ [4]

بعد ازاں۔ دنیا دوسری چیزوں سے بے پروا بنا دیتی ہے۔ اور دنیا دار جب اس کا کچھ حصہ پا لیتا ہے تو وہ اس پر حرص کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

یہ خط ابن مزاحم الکوفی نے کتاب صفین میں اور دینوری نے الاخبار الطوال (ص ۱۶۲) میں نقل کیا ہے۔

(۲۶) نہج کا ۵۴ واں خط ہے:

اما بعد، فقد علمتما، وان کتمتما، انی لم ارد الناس حتی ارادونی۔ [5]

بعد ازاں۔ تم دونوں جانتے ہو اگرچہ چھپاتے ہو۔ کہ میں نے لوگوں کا اس وقت تک قصد نہ کیا جب تک وہ میری طرف نہ بڑھے۔

یہ خط ابن قتیبہ نے الامامہ (ص ۶۴) میں اور اعثم کوفی نے کتاب الفتوح (مناقب ابن شہر آشوب ۳/۹۰) میں نقل کیا ہے۔

(۲۷) نہج کا باسٹھواں خط اہل مصر کے نام ہے۔ یہ یوں شروع ہوا ہے:

"اما بعد، فان اللہ سبحانہ بعث محمدا نذیرا للعالمین" [6]

بعد ازاں۔ بیشک اللہ سبحانہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے جہان کے لئے نذیر بنا کر بھیجا۔

---

۱ نہج ۳/۷۰۔ ۲ ایضاً ۳/۸۰۔ ۳ ایضاً ۳/۸۵۔ ۴ نہج ۳/۸۸۔ ۵ ایضاً ۳/۱۲۲۔ ۶ ابن ابی الحدید ۴/۳۱۲ و ۴/۱۰۲۔
۷ نہج ۳/۱۳۱۔

یہ خط ایک طویل خطبہ کی شکل میں ابراہیم الثقفی نے کتاب الغارات میں نقل کیا ہے۔[1]

(۲۸) نہج کا اڑسٹھواں خط حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے نام ہے۔ جو آپ نے خلیفہ ہونے سے قبل تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط یوں شروع ہوا ہے:۔

اما بعد، فانّ مثل الدنیا مثل الحیّۃ لیّنٌ مسّھا قاتلٌ سمّھا۔[2]

بعد ازاں۔ دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے سانپ کہ اس کی کھال نرم ہوتی ہے اور زہر قاتل۔

یہ خط کلینی نے اصول الکافی (ص ۱۴۰) میں اور شیخ مفید نے الارشاد (ص ۱۵۱) میں نقل کیا ہے۔

(۲۹) نہج کا اڑتالیسواں خط یوں شروع ہوتا ہے:۔

وانّ البغی والزّور یُذیعان بالمرءِ فی دینہ ودنیاہ۔[3]

بیشک بغاوت اور جھوٹ انسان کو اس کے دین اور دنیا دونوں میں رسوا کر دیتے ہیں۔

یہ خط ابن مزاحم الکوفی نے کتاب صفین میں اور ابراہیم الثقفی نے کتاب الغارات میں نقل کیا ہے۔[4]

ماخذ حکم و امثال

امیر المومنین حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے بہت سے حکیمانہ اقوال جو نہج البلاغہ کے تیسرے باب میں نقل کئے گئے ہیں ان میں سے شاید دو چار قول ہی ایسے ہوں جن پر کسی طرح کا شبہ کیا جا سکے۔ پھر تاریخ و حدیث و ادب کے بہت دور میں سے ان ہیرے اور لعلوں کے معدنوں کا کھوج لگانا بھی نہ آسان ہے اور نہ تھوڑے وقت میں۔ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ذیل میں صرف چند اقوال کے متقدم حوالے پیش کرتا ہوں جن پر دوران کار میں مطلع ہو گیا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) "قُرنت الھیبۃ بالخیبۃ والحیاء بالحرمان"۔[5]

ڈر ناکامی سے ملا ہوا ہے اور شرم محرومی سے۔

یہ قول ابن قتیبہ نے عیون (۱۲۳/۲) میں۔ القالی نے امالی (۷/۱ اور ۵/۲۹) میں اور شیخ مفید نے امالی (بحار ۱۳۶/۱۷) میں نقل کیا ہے۔

(۲) "لنا حقٌّ۔ فان اُعطیناہ، والا رکبنا اعجاز الابل، وان طال السُّریٰ"۔[6]

ہمارا حق ہے، اگر ہمیں دیا گیا تو فبہا۔ ورنہ ہم اونٹ کے سرینوں پر سوار ہو جائیں گے۔ چاہے سفر طویل ہی کیوں نہ ہو۔

یہ قول ایک طویل خطبے کا ٹکڑا ہے جسے طبری نے اپنی تاریخ (۲۶/۵) میں نقل کیا ہے اور خود یہی ٹکڑا ابو عبید الہروی نے کتاب الغریبین (ورق ۱۲۶۔ العنم) میں درج کیا ہے۔

(۳) "وسئل عن الایمان۔ فقال: الایمان علیٰ اربع دعائم۔ الصبر والیقین والعدل والجھاد"۔[7]

ایمان کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا، ایمان کے چار ستون ہیں۔ صبر، یقین، عدل اور جہاد

یہ ارشاد الحرانی نے تحف العقول (بحار ۲۰۹/۱۷) میں۔ کلینی نے اصول الکافی (ص ۳۹۰) میں۔ القالی نے کتاب النوادر (ص ۱۷۳) میں۔ ابو نعیم الاصفہانی نے حلیۃ الاولیاء (۷۲/۱) میں۔ شیخ الطائفہ نے امالی ص ۲۳ میں اور قاضی محمد بن سلامۃ القضاعی نے دستور معالم الحکم (ص ۲۱) میں نقل کیا ہے۔

(۴) الحکمۃ ضالّۃ المؤمن۔ فخذ الحکمۃ ولو من اھل النفاق۔[8]

دانائی مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ پس دانائی کو لے لو خواہ منافقوں ہی سے کیوں نہ ملے۔

یہ قول ابن قتیبہ نے عیون (۱۲۳/۲) میں۔ القالی نے الامالی (۹۵/۲) میں۔ شیخ مفید نے امالی (بحار ۲۰۹/۱۷) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۲۲۳) میں نقل کیا ہے۔

(۵) "قیمۃ کلّ امرئٍ ما یُحسنہ"۔[9]

ہر آدمی کی قیمت اس کا نیک کام ہے۔

---

[1] ابن ابی الحدید ۲۹۵/۱۔ [2] نہج ۱۲۱/۳۔ [3] ایضاً ۸۷/۳۔ [4] ابن ابی الحدید ۱۰۳/۱۔ [5] نہج ۱۵۵/۳۔ [6] ایضاً۔ [7] ایضاً ۱۵۶/۳۔ [8] ایضاً ۱۶۶/۳۔ [9] ایضاً۔

یہ قول جاحظ نے البیان (۱/۳۶ و ۱۹۹) میں۔ ابن قتیبہ نے عیون (۲/۱۲۰) میں۔ مبرد نے کامل (۱/۳۲) میں۔ ابن عبدربہ نے العقد (۱/۲۰۰) میں۔
الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۲۶) میں شیخ صدوق نے الامالی (مجلس ۷۰) اور شیخ مفید نے امالی میں۔ ابو منصور ثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ = ۱۰۳۸ء)
نے الایجاز والاعجاز (ص۳۰) میں اور البیہقی نے کتاب المحاسن (۲/۱۰۲) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص۳۱۵) میں نقل کیا ہے۔

(۶) "أُوصِيكُمْ بِخَمْسٍ لَوْ ضَرَبْتُمْ إِلَيْهَا آبَاطَ الْإِبِلِ لَكَانَتْ لِذَلِكَ أَهْلًا: لَا يَرْجُوَنَّ أَحَدٌ مِنْكُمْ إِلَّا رَبَّهُ وَلَا يَخَافَنَّ إِلَّا ذَنْبَهُ" [۱]
میں تمہیں پانچ باتوں کی تاکید کرتا ہوں۔ اگر تم ان کے لیے اونٹ بھی دوڑاؤ تو بیجا ہوگا۔ سوائے اپنے رب کے کسی سے امید نہ رکھنا۔ اور بجز اپنے گناہ کے اور کسی چیز سے خوف مت کھانا۔

یہ ارشاد دعبل بن الولید الخطاط نے اپنی کتاب میں (بحار ۱۷/۱۱۵) میں۔ جاحظ نے البیان (۲/۲۷) میں۔ ابن قتیبہ نے عیون (۲/۱۱۹) میں۔ البرقی نے کتاب المحاسن والآداب (ورق ۲ب) میں۔ الماوردی متوفی ۴۵۰ھ (۱۰۵۸ء) نے ادب الدنیا والدین (ص۲) میں۔ ابو الفرج القزوینی نے قرب الاسناد (بحار ۱۷/۱۰۵) میں۔ الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۵۲) میں۔ ثعالبی نے الایجاز (ص۳) میں اور ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء (۱/۷۵)
میں نقل کیا ہے۔

(۷) "أَنَا دُونَ مَا تَقُولُ وَفَوْقَ مَا فِي نَفْسِكَ۔" [۲]
میں تیرے کہے ہوئے سے نیچا۔ اور جو تیرے دل میں ہے اس سے اونچا ہوں۔

یہ قول جاحظ نے البیان (۱/۹۰ و ۲۲۰) میں۔ ابن قتیبہ نے عیون (۱/۲۲۷) میں اور سید مرتضی نے الامالی (۱/۱۹۰) میں نقل کیا ہے۔

(۸) "بَقِيَّةُ السَّيْفِ أَبْقَى عَدَدًا وَأَكْثَرُ وَلَدًا۔" [۳]
تلوار سے بچے ہوئے گنتی میں پائدار اور کثیر الاولاد ہوتے ہیں۔

یہ قول جاحظ نے البیان (۲/۳۵) میں۔ ابن قتیبہ نے عیون (۱/۱۳۰) میں۔ ابن عبدربہ نے العقد (۲/۲۲۷) میں اور ثعالبی نے الایجاز
(ص۳) میں نقل کیا ہے۔

(۹) رَأْيُ الشَّيْخِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ جَلَدِ الْغُلَامِ۔ [۴]
بڈھے کی رائے مجھے جوان کی مضبوطی سے زیادہ محبوب ہے۔

یہ قول جاحظ نے البیان (۱/۸۵) میں اور ابن عبدربہ نے العقد (۳/۲۲۶) میں نقل کیا ہے۔

(۱۰) عَجِبْتُ لِمَنْ يَقْنَطُ وَمَعَهُ الِاسْتِغْفَارُ [۵]
میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو ناامید ہے حالانکہ استغفار اس کے ساتھ ہے۔

یہ قول بتغیر الفاظ ابن قتیبہ نے عیون (۲/۳۰۲) میں اور مبرد نے کامل (۱/۱۰۷) میں نقل کیا ہے۔

(۱۱) الْفَقِيهُ كُلُّ الْفَقِيهِ مَنْ لَمْ يُقَنِّطِ النَّاسَ مِنْ رَحْمَةِ اللهِ، وَلَمْ يُؤْيِسْهُمْ مِنْ رَوْحِ اللهِ، وَلَمْ يُؤْمِنْهُمْ مِنْ مَكْرِ اللهِ" [۶]
پورا سمجھدار وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ کرے۔ اور اس کی مہربانی سے مایوس نہ بنائے اور اس کی پکڑ سے نڈر نہ کرے۔

یہ قول کلینی نے اصول الکافی (ص۲۹) میں۔ الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۲۷) میں۔ شیخ صدوق نے معانی الاخبار (ص۴۳) میں اور ابو نعیم
نے حلیۃ الاولیاء (۱/۷۷) میں بحیثیت قول مرتضوی اور کتاب الجعفریات (بحار ۱۷/۲۰۷) میں بطور حدیث نبوی نقل کیا ہے۔

(۱۲) لَا يَقِلُّ عَمَلٌ مَعَ التَّقْوَى، وَكَيْفَ يَقِلُّ مَا يُتَقَبَّلُ۔ [۷]
پرہیزگاری کیساتھ ہو تو عمل کم نہیں ہوتا۔ اور جو چیز قبول ہو جائے وہ کم کہاں ہے۔

یہ قول الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۵۳) میں۔ کلینی نے اصول الکافی (ص۲۷۳) میں۔ ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء (۱/۷۵) میں اور شیخ الطائفہ نے
امالی (ص۳۰۵) میں نقل کیا ہے۔

(۱۳) يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُقَرَّبُ فِيهِ إِلَّا الْمَاحِلُ۔ وَلَا يُظَرَّفُ فِيهِ إِلَّا الْفَاجِرُ" [۸]
لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا۔ جس میں سوائے چغل خور کے کسی کو تقرب حاصل نہ ہوگا۔ اور بجز بدکار کے کوئی ظریف نہ مانا جائے گا۔

---

[۱] نہج ۳/۱۶۸۔ [۲] ایضاً۔ [۳] ایضاً۔ [۴] ایضاً ۳/۱۶۹۔ [۵] ایضاً۔ [۶] ایضاً۔ [۷] ایضاً ۳/۱۷۰۔ [۸] ایضاً ۳/۱۷۱۔ ایضاً ۳/۱۷۳۔

اس قول کے مختلف اجزاء ابن قتیبہ نے عیون (۲/ ۲۰ و ۲۵۵) میں، ابن عبد ربہ نے العقد (۱/ ۲۰۶) میں، شیخ مفید نے الارشاد (ص ۱۳۳) میں اور بیہقی نے کتاب المحاسن (۲/ ۴۵) میں نقل کئے ہیں۔ پوری وصیت ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء (۱/ ۷۹) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۱۳۳) میں نقل کی ہے۔

(۲۰) "یا ابن آدم، ما کسبتَ فوقَ قوتِکَ، فأنتَ فیہ خازنٌ لغیرِکَ"۔ [1]

اے آدم کے بیٹے! جو تو نے اپنی ضرورت سے زیادہ کمایا ہے، اس میں تو دوسرے کا خزانہ دار ہے۔

یہ قول ابن قتیبہ کی عیون (۲/ ۳۷۰) میں موجود ہے۔

(۲۱) "إنَّ القلبَ إذا أُکرِہَ عَمِیَ"۔ [2]

بیشک جب دل کو مجبور کیا جائے۔ تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔

یہ قول مبرد نے کامل (۲/ ۸۶۶) میں نقل کیا ہے۔

(۲۲) "لم یذہبْ مِن مالِکَ ما وعظَکَ"۔ [3]

تیرے مال کا وہ حصہ ضائع نہ گیا جس سے تجھے نصیحت حاصل ہو گئی۔

یہ قول بھی مبرد کی کامل (۱/ ۱۶۶) میں موجود ہے۔

(۲۳) "أیُّہا النّاس، اتّقوا اللّٰہ، الذی إن قلتُم سمِعَ، وإن أضمرتُم عَلِمَ"۔ [4]

لوگو، اس اللہ سے ڈرو جو سنتا ہے جب تم کہتے ہو۔ اور جانتا ہے جب تم چھپاتے ہو۔

یہ کلام بھی مبرد نے اپنی کامل (۱/ ۳۰۳) میں نقل کیا ہے۔

(۲۴) "قال فی قولہ تعالیٰ۔ إنَّ اللّٰہ یأمُرُ بالعدلِ والإحسانِ۔ العدلُ: الإنصافُ والإحسانُ: التفضّلُ"۔ [5]

اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے۔ اللہ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ تو عدل انصاف ہے اور احسان مہربانی کرنا ہے۔

یہ قول ابن قتیبہ کی عیون الاخبار (۳/ ۱۹) میں نقل ہوا ہے۔

(۲۵) "لا تدعُوَنَّ إلی مبارزۃٍ، وإن دُعیتَ إلیہا فأجِبْ"۔ [6]

کسی کو مقابلے کے لئے کبھی مت بلانا۔ اور اگر تجھے مقابلے کے لئے بلایا جائے تو اسے قبول کرنا۔

یہ قول بھی ابن قتیبہ کی عیون (۱/ ۱۲۸) میں موجود ہے۔

(۲۶) "ہذا الخطیبُ الشّحشحُ"۔ [7]

یہ ماہر تقریر کرنے والا ہے۔

یہ قول ابوعبید نے غریب الحدیث (ورق ۱۹۰۔ الف) میں اور طبری نے اپنی تاریخ (۵/ ۱۹۲) میں نقل کیا ہے۔

(۲۷) "یا ابن آدم، لا تحمِلْ ہمَّ یومِکَ الذی لم یأتِکَ علی یومِکَ الذی قد أتاکَ"۔ [8]

اے آدمی۔ اس دن کے غم کو جو ابھی نہیں آیا۔ اس دن کی پیٹھ پر مت لادو جو آچکا ہے۔

یہ قول ابن قتیبہ نے عیون (۲/ ۳۷۰) میں اور مبرد نے کامل (۱/ ۹۲) نقل کیا ہے۔

(۲۸) "کانَ لی فیما مضی أخٌ فی اللّٰہِ"۔ [9]

زمانہ گذشتہ میں میرا ایک اللہ واسطے کا بھائی تھا۔

یہ ارشاد حرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/ ۱۳۵) میں بنام امیرالمومنین کلینی نے اصول الکافی (ص ۲۸۲) میں بنام امام حسن علیہ السلام نقل کیا ہے۔

(۲۹) "یا أشعثُ، إن تحزنْ علی ابنِکَ فقد استحقّتْ منکَ ذلکَ الرّحِمُ"۔ [10]

اے اشعث! اگر تو اپنے بیٹے پر غم کھائے۔ تو بیشک تجھ سے رشتہ کا یہی تقاضا ہے۔

یہ تعزیتی کلمات ابن قتیبہ نے بھی عیون (۳/ ۶۱) میں با اختلاف الفاظ نقل کئے ہیں۔

---

[1] نہج ۳/ ایضاً ۱۹۶/۳ ۔ [2] ایضاً ۱۹۶/۳ ۔ [3] ایضاً ۱۹۶/۳ ۔ [4] ایضاً ۱۹۷/۳ ۔ [5] ایضاً ۲۰۳/۳ ۔ [6] ایضاً ۱۹۹/۳ ۔ [7] ایضاً ۔ [8] ایضاً ۲۱۱/۳ ۔ [9] ایضاً ۔ [10] نہج ۲۲۳/۳ ۔ [11] ایضاً ۲۲۳/۳ ۔

(۲۹) "المؤمن بشره في وجهه، وحزنه في قلبه"۔[1] — ایمان والے کی خوشی اس کے چہرے میں اور رنج اس کے دل کے اندر ہوا کرتا ہے۔

یہ ارشاد کلینی نے اصول الکافی (ص ۲۳۸) میں اور شیخ صدوق نے امالی (بحار ۱۸/۲۶۹) میں نقل کیا ہے۔

(۳۰) "إذا قدرت على عدوك، فاجعل العفو عنه شكراً للقدرة عليه"۔[2] — جب تو اپنے دشمن پر قدرت حاصل کر لے تو اسے معاف کرنے کو اس پر قدرت ملنے کا شکریہ قرار دے۔

یہ قول ابن درید نے المجتنیٰ (ص ۲۰) میں نقل کیا ہے۔

(۳۲) "أعجز الناس من عجز عن اكتساب الإخوان، وأعجز منه من ضيّع من ظفر به منهم"۔[3] — سب سے زیادہ عاجز آدمی وہ ہے جو دوست حاصل کرنے میں عاجز ہو۔ اور اس سے بھی زیادہ عاجز وہ ہے جو دوست پا کر اسے ضائع کر دے۔

یہ قول ابن قتیبہ نے عیون (۳/۱) میں اور القالی نے ذیل الامالی (ص ۱۲۱) میں نقل کیا ہے۔

(۳۳) "يا بني، احفظ عني أربعاً وأربعاً، لا يضرك ما عملت معهن"۔[4] — میرے بچے، مجھ سے چار اور چار باتیں یاد کر لے، ان کے ساتھ جو کچھ بھی تو کرے گا، وہ تجھے ضرر نہیں دے گا۔

یہ قول ابن درید نے المجتنیٰ (ص ۳۴) میں نقل کیا ہے۔

(۳۴) "يا دنيا، يا دنيا! إليك عني! أبي تعرضت؟ أم إليّ تشوقت؟ لا حان حينك! غرّي غيري"۔[5] — اے دنیا۔ اے دنیا مجھ سے الگ رہنا! کیا تو میرے درپے ہے؟ کیا تو میری مشتاق ہے؟ تیرا وقت ابھی نہیں آیا۔ کسی اور کو دھوکا دینا۔

یہ قول القالی نے امالی (۲/۱۳۹) میں ابونعیم نے حلیہ (۱/۸۵) میں اور البیہقی نے کتاب المحاسن (۱/۳۴) میں نقل کیا ہے۔

(۳۵) "رُئي عليه إزار خلق مرقوع، فقيل له في ذلك، فقال: يخشع له القلب، وتذل به النفس، ويقتدي به المؤمنون"۔[6] — آپ کو پرانی پیوند لگی تہبند باندھے دیکھا گیا۔ جب اس بارے میں کسی نے آپ سے کہا۔ تو فرمایا۔ اس سے دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے۔ اور نفس ذلیل ہوتا ہے اور اہل ایمان اس کی پیروی کرتے ہیں۔

یہ ارشاد ابونعیم نے حلیہ (۱/۸۳) میں نقل کیا ہے۔

(۳۶) "طوبى للزاهدين في الدنيا الراغبين في الآخرة"۔[7] — پاکیزگی ہے دنیا سے منہ موڑنے والوں اور آخرت سے رغبت رکھنے والوں کے لیے۔

یہ ارشاد ابونعیم نے حلیہ (۱/۷۹) میں نقل کیا ہے۔

(۳۷) "مثل الدنيا كمثل الحية لين مسها"۔[8] — دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے جس کی کھال نرم ہوتی ہے۔

یہ قول ابن درید نے المجتنیٰ (ص ۳۱) میں نقل کیا ہے۔

(۳۸) "الدنيا دار ممر لا دار مقر"۔[9] — دنیا گزرگاہ ہے قیام گاہ نہیں۔

یہ ارشاد ابن درید نے المجتنیٰ (ص ۳۰) میں نقل کیا ہے۔

(۳۹) "لا تكن ممن يرجو الآخرة بغير العمل"۔[10] — آخرت (کی بھلائی) کی امید عمل کے بغیر مت رکھ!

یہ قول ابن درید نے المجتنیٰ (ص ۳۹) میں۔ الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۰۶) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۲۶) میں نقل کیا ہے۔

(۴۰) "من وضع نفسه مواضع التهمة، فلا يلومن من أساء به الظن"۔[11] — جس نے اپنے آپ کو تہمت کی جگہ رکھ دیا۔ وہ سوءظن کرنے والوں کو ملامت نہ کرے۔

۱؎ نہج ۳/۲۲۲ - ۲؎ ایضاً ۳/۵۲ - ۳؎ ایضاً - ۴؎ ایضاً ۳/۱۶ - ۵؎ ایضاً ۳/۱۹۶ - ۶؎ ایضاً ۳/۱۴۳۔

۷؎ نہج ۳/۱۶۲ - ۸؎ ایضاً ۳/۱۷۸ - ۹؎ ایضاً ۳/۱۶۲ - ۱۰؎ ایضاً ۳/۱۶۳ - ۱۱؎ ایضاً ۳/۱۸۹۔

یہ قول الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۳۲) میں اور البیہقی نے کتاب المحاسن (۲/۵۷) میں نقل کیا ہے۔

(۴۱) مَنْ كَتَمَ سِرَّهُ كَانَتِ الْخِيَرَةُ بِيَدِهِ۔" [1] — جس نے اپنا بھید چھپایا، وہ اپنے ہاتھ میں اختیار رکھتا ہے۔

یہ قول ابن درید نے المجتنیٰ (ص ۳۹) میں، الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۳۲) میں اور البیہقی نے المحاسن (۲/۵۷) میں نقل کیا ہے۔

(۴۲) "اَلنَّاسُ أَعْدَاءُ مَا جَهِلُوا۔" [2] — لوگ اس چیز کے دشمن ہوتے ہیں جسے نہیں جانتے۔

یہ قول ثعالبی نے الایجاز والاعجاز (ص ۸) میں، شیخ مفید نے امالی (بحار ۱۷/۱۲۸) میں اور شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۳۱۵) میں نقل کیا ہے۔

(۴۳) اِتَّقُوا اللهَ تَقِيَّةَ مَنْ شَمَّرَ تَجْرِيداً۔" [3] — اللہ سے اس شخص کی طرح ڈرو جو دوڑ پڑتا ہے کپڑے اٹھا کر۔

یہ قول ابن درید نے المجتنیٰ (ص ۳۴) میں اور الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۲۹) میں نقل کیا ہے۔

(۴۴) "أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْناً مَا، عَسَى أَنْ يَكُونَ بَغِيضَكَ يَوْماً مَا۔" [4] — اپنے دوست سے بہ حد مناسب محبت کرو، ممکن ہے کسی دن دشمن ہو جائے۔

یہ قول حدیث نبوی کی حیثیت سے ترمذی متوفی ۲۷۹ھ (۸۹۲ء) نے کتاب الجامع میں۔ الطبرانی متوفی ۳۶۰ھ (۹۷۱ء) نے المعجم الصغیر میں اور الدارقطنی متوفی ۳۸۵ھ (۹۹۵ء) نے الافراد میں درج کیا ہے [5] اور بحیثیت قول مرتضوی بخاری متوفی ۲۵۶ھ (۸۷۰ء) نے الادب المفرد (ص ۱۹۱ طبع مصر) میں۔ البلاذری نے انساب الاشراف (۵/۹۵) میں۔ القالی نے الامالی (۲/۲۰۶) اور کتاب النوادر (ص ۴۲) میں۔ ابو الطیب محمد بن احمد الوشاء النحوی متوفی ۳۲۵ھ (۹۳۷ء) نے کتاب الموشیٰ (ص ۳) میں اور الحرانی نے تحف العقول میں [6] العسکری نے جمہرۃ الامثال (ص ۴۹) میں اور ابن الشیخ نے امالی (ص ۹) میں نقل کیا ہے۔

(۴۵) "لَا تَصْحَبِ الْمَائِقَ، فَإِنَّهُ يُزَيِّنُ لَكَ فِعْلَهُ، وَيَوَدُّ أَنْ تَكُونَ مِثْلَهُ۔" [7] — نادان سے دوستی مت کر کیونکہ وہ اپنا کام تجھے آراستہ کر کے دکھائے گا اور یہ چاہے گا کہ تو بھی ویسا ہی ہو جائے۔

یہ قول ابن قتیبہ نے عیون (۳/۹) میں اور الحرانی نے تحف العقول (بحار ۱۷/۱۲۸) میں نقل کیا ہے۔

(۴۶) أَنَا يَعْسُوبُ الْمُؤْمِنِينَ، وَالْمَالُ يَعْسُوبُ الْفُجَّارِ۔ [8] — میں مومنوں کا سردار ہوں اور مال فاسقوں کا سردار ہے۔

یہ قول ابو القاسم الزجاجی نے کتاب الامالی (ص ۱۹) میں، شیخ الطائفہ نے امالی (ص ۳۳) میں اور ابن الشیخ نے اپنی امالی (ص ۶) میں نقل کیا ہے۔

(۴۷) "لَا تَظُنَّنَّ بِكَلِمَةٍ خَرَجَتْ مِنْ أَحَدٍ سُوءاً وَأَنْتَ تَجِدُ لَهَا فِي الْخَيْرِ مُحْتَمَلاً۔" [9] — کسی کی اس بات پر سوء ظن مت کر جس میں کوئی بھلا احتمال نکل سکتا ہو۔

یہ قول البیہقی نے کتاب المحاسن (۲/۵۷) میں نقل کیا ہے۔

(۴۸) "سُئِلَ عَنْ مَعْنَى قَوْلِهِمْ: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ۔ إِنَّا لَا نَمْلِكُ مَعَ اللهِ شَيْئاً۔" [10] — آپ سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے معنی پوچھے گئے۔ تو فرمایا کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی شے کی ملکیت میں شریک نہیں ہیں۔

یہ قول ابن درید نے المجتنیٰ (ص ۳) میں نقل کیا ہے۔

(۴۹) مَالِكٌ وَمَا مَالِكٌ۔ وَلَوْ كَانَ جَبَلاً لَكَانَ فِنْداً۔ [11] — مالک، کون مالک! اگر وہ پہاڑ ہوتا تو بڑا پہاڑ ہوتا۔

یہ قول ابو عمر الکندی متوفی ۳۵۰ھ (۹۶۱ء) نے کتاب الولاۃ (ص ۲۳) میں نقل کیا ہے۔

(۵۰) يَهْلِكُ فِيَّ رَجُلَانِ، مُحِبٌّ غَالٍ وَمُبْغِضٌ قَالٍ۔ [12] — میرے معاملے میں دو قسم کے انسان ہلاک ہو گئے۔ غلو کرنے والا دوست اور کینہ رکھنے والا دشمن۔

---

[1] نہج ۳/۱۹۲ - [2] ایضاً ۳/۱۹۳ و ۲۵۸ - [3] ایضاً ۳/۲۰۰ - [4] ایضاً ۳/۲۱۶ - [5] سعد الکافی ۳/۹ - [6] بحار الانوار ۱۷/۱۲۷ -
[7] نہج ۳/۲۲۵ - [8] ایضاً ۳/۲۲۹ - [9] ایضاً ۳/۲۳۸ - [10] ایضاً ۳/۲۵۰ - [11] ایضاً ۳/۲۵۸ - [12] ایضاً ۳/۲۶۳

یہ قول البیہقی نے المحاسن (۱/ ۴۹) میں نقل کیا ہے۔

(۵۱) شَرُّ الإِخْوَانِ مَنْ تَكَلَّفَ لَهُ۔[1] سب سے بُرا بھائی وہ ہے جس کیلئے تکلف کرنا پڑے۔

یہ قول ابوحیان التوحیدی متوفی ۴۰۰ھ (۱۰۰۹ء) نے کتاب فی الصداقت والصدیق (ص ۱۸۷) میں نقل کیا ہے۔

جامعین خطب وغیرہ

نہج البلاغہ کی جمع و ترتیب سے پہلے جن اصحاب نے امیرالمومنین کے خطبوں اور خطوں وغیرہ کو اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا تھا۔ ان میں سے اکثر کے حوالے اوپر گزر چکے ہیں۔ ذیل میں اُن مصنفوں کے نام پیش کرتا ہوں۔ جن کا ذکر اس لئے نہ کر سکا کہ ان کی کتابیں ضائع ہو چکی ہیں۔ یا ان کی خاص خطبوں وغیرہ پر لکھی ہوئی کتابوں کا اوپر مذکور نہیں ہوا۔ یا ان کی بعض ایسی تالیفات کا نام نہیں لیا گیا تھا جن میں خطبے اور خطوط وغیرہ کا اندراج ہوا ہو گا۔

آگے بڑھنے سے قبل یہ بھی عرض کر دوں کہ مسعودی کے بیان کے مطابق امیرالمومنینؑ کے خطبوں کی تعداد (۴۸۰) سے کچھ اوپر ہے۔ یہ خطبے علی البدیہہ دیئے گئے تھے اور اہل علم میں قولاً و عملاً متداول ہیں۔[2]

(۱) زید بن وہب الجہنی الکوفی متوفی ۹۶ھ (۷۱۴ء)۔ انہوں نے "کتاب خطب امیرالمومنین علی المنابر فی الجمع والاعیاد وغیرہا" نام کی تالیف چھوڑی تھی۔ یہ کتاب پانچویں صدی ہجری تک محفوظ تھی اور شیخ الطائفہ ابوجعفر الطوسی متوفی ۴۶۰ھ (۱۰۶۸ء) نے اسے روایت کیا تھا۔[3]

(۲) ابویعقوب اسمٰعیل بن مہران بن محمد بن ابی نصر السکونی الکوفی متوفی بعد ۲۰۰ھ (۸۱۵ء)۔ انہوں نے "کتاب خطب امیرالمومنینؑ" مرتب کی تھی اور یہ کتاب بھی پانچویں صدی ہجری تک موجود تھی۔ اس لئے کہ ابوالعباس احمد النجاشی متوفی ۴۵۰ھ (۱۰۵۸ء) نے اسے روایت کیا تھا۔[4]

(۳) ابومخنف لوط بن یحییٰ الازدی الغامدی متوفی قبل ۱۷۰ھ (۷۸۶ء) مورخ مشہور۔ ابن ندیم نے اس کی ۳۳ کتابوں کے نام لکھے ہیں جن میں سے حسب ذیل کے اندر آپ کے خطبوں اور خطوں کا درج ہونا یقینی ہے۔[5]

کتاب الجمل۔ کتاب صفین۔ کتاب اہل النہروان والخوارج۔ کتاب الغارات۔ کتاب مقتل علیؑ۔ کتاب مقتل محمد بن ابی بکر والاشتر و محمد بن ابی حذیفہ۔ کتاب الشوریٰ و مقتل عثمانؓ۔

(۴) ابومحمد (یا ابوبشر) مسعدۃ بن صدقۃ العبدی الکوفی شاگرد امام موسی الکاظمؑ متوفی ۱۸۳ھ (۷۹۹ء)۔ انہوں نے کتاب خطب امیرالمومنینؑ مرتب کی تھی۔ اسے بھی نجاشی نے روایت کیا ہے۔[6]

(۵) ابواسحٰق ابراہیم بن الحکم بن ظہیر الفزاری الکوفی۔ یہ قاضی شریک متوفی ۱۷۷ھ (۷۹۳ء) کا بھی شاگرد ہے۔ اس نے کتاب الملاحم کے علاوہ خاص طور پر "کتاب خطب علیؑ" بھی تالیف کی تھی اور اسے بھی نجاشی نے پڑھا تھا۔[7]

(۶) ابواسحٰق ابراہیم سلیمان النہمی الکوفی الخزاز۔ یہ ابراہیم الفزاری کا شاگرد اور "کتاب الخطب"، "کتاب الدعا"، "کتاب خلق السموات" اور "کتاب مقتل امیرالمومنین" کا مصنف ہے۔[8]

(۷) ابومنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی متوفی ۲۰۶ھ (۸۲۱ء)۔ ابن ندیم نے اس کی کتابوں کی جو لمبی فہرست دی ہے۔ اس میں "کتاب مقتل عثمانؓ"، "کتاب الجمل"، "کتاب صفین"، "کتاب النہروان"، "کتاب الغارات"، "کتاب مقتل امیرالمومنین" کے علاوہ خود "کتاب خطب علیؑ" بھی ہے۔ جو نجاشی کے مطالعہ میں بھی آ چکی ہے۔[9]

(۸) ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی المدنی قاضی بغداد متوفی ۲۰۷ھ (۸۲۳ء)۔ ابن ندیم نے اس کی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے

---

[1] نہج ۳/ ۲۶۶۔ [2] مروج الذہب ۲/ ۳۶۔ [3] فہرست الطوسی ۱۳۰ و منہج المقال ورق ۱۴۲-الف۔ [4] طوسی ۷۱ و نجاشی ۱۹ و لسان المیزان ۱/ ۴۹ و ابن ندیم ۱۳۱، ۱۳۲ و منہج ورق ۱۴۱ الف۔ [5] فہرست ابن ندیم ۱۳۶ و شرح ابن ابی الحدید ۱/ ۲۶ و منہج ورق ۲۶۷ ب۔ [6] نجاشی ۲۹۵ و منہج ۳۰۲ ب و لسان ۲۰۷۔ [7] طوسی ۱۱ و نجاشی ۱۱ و منہج ورق ۷ ب و کشف الحجب ۲۰۶۔ [8] طوسی ۱۲ و منہج ورق ۸ ب و لسان ۱/ ۹۶۔ [9] ابن ندیم ۱۴۰ و نجاشی ۳۰۵ و منہج ورق ۳۵۷ ب۔

"کتاب الجمل" کا حوالہ خود سید رضی دے چکے ہیں۔ باقی میں سے "کتاب صفین" اور کتاب السنت والجماعت وذم الہوی وترک الخوارج فی الفتن"۔ بھی قابلِ لحاظ ہیں۔[1]

(۹) ابو الفضل نصر بن مزاحم المنقری الکوفی العطار متوفی ۲۱۲ھ (۸۲۷ء) کی "کتاب صفین" کے حوالے اوپر گزر چکے ہیں۔ اور یہ کتاب ایران میں چھپ بھی چکی ہے۔ لیکن نجاشی نے اس کی "کتاب الجمل۔ کتاب النہروان اور کتاب الغارات" بھی پڑھی تھیں۔ یہ سب بھی خطب وخطوط امیر المومنین پر مشتمل ہیں۔[2]

(۱۰) ابو الخیر صالح بن ابی حماد الرازی متوفی بعد ۲۱۴ھ (۸۲۹ء)۔ اس کی "کتاب خطب امیر المومنین" بھی نجاشی نے روایت کی ہے۔[3]

(۱۱) ابو الحسن علی بن محمد المدائنی متوفی ۲۲۴ھ (۸۳۹ء)۔ ابن ندیم نے اس کی مصنفات بھی گنائی ہیں اور ان میں علاوہ "تاریخ الخلفاء" اور کتاب الاحداث والفتن" کے "کتاب خطب علیؑ وکتبہ الی عمالہ" بھی درج کی ہے۔[4]

(۱۲) ابو القاسم عبد العظیم بن عبد اللہ بن علی الحسنی الرازی متوفی ۲۵۰ھ (۸۶۴ء) تقریباً۔ انہوں نے بھی کتاب خطب علیؑ مرتب کی تھی۔[5]

(۱۳) ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الثقفی متوفی ۲۸۳ھ (۸۹۶ء) کی "کتاب الغارات" کا ذکر آچکا ہے۔ لیکن مسئلہ زیر بحث پر اس کی حسب ذیل کتابیں خاص اہمیت رکھتی ہیں:۔

"کتاب رسائل علی۔ کتاب کلام علی فی الشوری"۔ اور کتاب الخطب المعربات"۔

ان کے علاوہ "کتاب السقیفہ۔ کتاب مقتل عثمانؓ۔ کتاب بیعت امیر المومنین۔ کتاب الجمل۔ کتاب صفین۔ کتاب الحکمین۔ کتاب النہروان اور کتاب مقتل امیر المومنین" میں بھی آپ کے خطبات اور مکاتیب کی خاص تعداد منقول ہونا چاہیئے۔[6]

(۱۴) ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری (معاصر ابن جریر الطبری مورخ مشہور) اس نے "کتاب المسترشد فی الامامت" اور کتاب الرواۃ عن اہل البیت" میں آپ کے خطبے وغیرہ نقل کئے ہیں۔[7]

(۱۵) ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلینی متوفی ۳۲۸ھ (۹۳۹ء) نے "کتاب الکافی" کے علاوہ۔ جس کے حوالے اوپر گزر چکے ہیں۔ "کتاب رسائل الائمہ" بھی خاص زیر بحث موضوع پر لکھی تھی۔[8]

(۱۶) ابو احمد عبد العزیز بن یحییٰ بن احمد بن عیسی الجلودی الازدی البصری متوفی ۳۳۲ھ (۹۴۳ء) نے حسب ذیل کتابیں تصنیف کی تھیں:۔

کتاب الجمل۔ کتاب صفین۔ کتاب الحکمین۔ کتاب الغارات۔ کتاب الخوارج۔ کتاب حروب علی۔ کتاب خطب علی۔ کتاب شعر علی۔ کتاب رسائل علی۔ کتاب مواعظ علی۔ کتاب ذکر کلام علی فی الملاحم۔ کتاب قول علی فی الشوری۔ کتاب ما کان بین علی وعثمان من الکلام۔ کتاب قضاء علی۔ کتاب الدعاء عن علی۔ کتاب الادب عن علی علیہ السلام۔[9]

(۱۷) ابو محمد الحسن بن علی بن شعبۃ الحرانی متوفی ۳۳۲ھ (۹۴۳ء) اس نے "تحف العقول عن آل الرسول" نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی جس میں امیر المومنینؑ کے خطبے اور حکیمانہ اقوال وغیرہ بھی جمع کئے تھے۔ یہ کتاب ایران میں چھپ چکی ہے۔ مگر میری دسترس میں نہ آسکی۔ اور اس لئے میں بہت سے مزید حوالے مہیا کرنے سے قاصر رہا۔[10]

(۱۸) ابو الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی متوفی ۳۴۶ھ (۹۵۷ء)۔ اس نے "کتاب اخبار الزمان"۔ کتاب الاوسط۔ اور مروج الذہب کے علاوہ

---

[1] ابن ندیم ۱۳۳ و نجاشی ۱۳۰۔ [2] نجاشی ۳۰۱ و منہج ورق ۳۶۲ الف۔ [3] نجاشی ۱۳۰ و منہج ورق ۱۸۰ الف۔ [4] ابن ندیم ۱۴۹ و معجم الادبا یاقوت ۱۲۴/۱۴۔ [5] منہج ورق ۱۸۰ ب و فہرست کتابخانہ علوی سعادت ۱۳۹۔ [6] طوسی ۱۸۔ معجم الادبا یاقوت ۲۲۳/۱ و منہج ورق ۱۰ ب و منہاج ۱۲۔ [7] منہج ورق ۲۹۹ الف۔ لسان ۱۰۳/۵ و فہرست کتابخانہ علوی ۱۳۸۔ [8] منہج ورق ۲۳۹ الف و فہرست کتابخانہ علوی ۱۳۸۔

[9] رجال نجاشی ۱۶۷ و ابن ندیم ۱۶۷ و تنقیح المقال ۱۴۳ و منہج ورق ۸۰ ب۔ [10] کشف الحجب ۱۰۲ و منہاج ۳۱۶۔

"حدائق الاذہان فی اخبار آل محمد" اور "مزاہر الاخبار وطرائف الآثار" میں امیرالمومنینؑ کے خطبے وغیرہ خاصی تعداد میں نقل کئے تھے۔ مگر سوء اتفاق سے یہ کتابیں اب دستیاب نہیں ہوتیں۔[۱]

(۱۹) ابو طالب عبد اللہ بن ابی زید احمد بن یعقوب بن نصر الانباری متوفی ۳۵۶ھ (۹۶۷ء) نے جو ۱۴۰ کتابوں کا مؤلف ہے۔ ایک کتاب بنام "کتاب ادعیۃ الائمہ" لکھی تھی۔ جس میں امیرالمومنین سے مروی دعائیں مندرج تھیں۔[۲]

(۲۰) ابو عبد اللہ احمد بن ابراہیم بن ابی رافع، الصیمری الکوفی البغدادی استاد شیخ مفید نے "کتاب الکشف فیما یتعلق بالسقیفہ" اور "کتاب الضیاء (یا الصفاء) فی تاریخ الائمہ" میں آپ کا کلام درج کیا ہے۔[۳]

(۲۱) ابو العباس یعقوب بن احمد الصیمری نے جو متقدم الذکر بیٹا معلوم ہوتا ہے "کتاب فی کلام علیؑ وخطبہ" لکھی تھی۔[۴]

(۲۲) ابو سعید منصور بن الحسین الآبی الوزیر متوفی ۴۲۲ھ (۱۰۳۱ء) نے "نزہۃ الادب فی المحاضرات" اور اس کے اختصار "نثر الدرر" میں آپ کا کلام نقل کیا ہے۔ موخر الذکر کا ایک مخطوطہ نجف اشرف کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔[۵]

آخر میں اتنا عرض کر دینا مناسب ہے کہ میرا یہ مقالہ جامع ومانع حیثیت نہیں رکھتا جیسے جیسے میرا مطالعہ وسیع ہوتا جارہا ہے۔ مزید حوالے ملتے جارہے ہیں۔ امید ہے کہ کسی اگلی صحبت میں نئے نتائج مطالعہ بھی پیش کروں گا۔

جہاں تک نہج البلاغہ کے "استناد" کا تعلق ہے یہ ایک مستقل مضمون ہے۔ اس کے بعد وہ حصہ لکھا جائے گا جس کا تعلق نہج البلاغہ کے مضامین سے ہے اور یہ جانچنے کی کوشش کی جائے گی کہ کیا یہ باتیں امیرالمومنین کی کہی ہوئی یا لکھی ہوئی مانی جاسکتی ہیں۔

والحمد للہ اولاً وآخراً والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

---

[۱] مروج الذہب ۳۹/۲۔ [۲] طوسی ۱۸۶ و نجاشی ۱۱۰ و منہج ۱۹۷ الف۔ [۳] طوسی ۱۹ و نجاشی ۶۱ و منہج ۱۹ الف۔ [۴] ابن ابی الحدید ۲۲/۴۔ [۵] کشف الظنون حرف زن، و فہرست کتاب خانہ غروی ۱۳۸ و ۱۳۹۔

عاصی کرنالی

فتنۂ انکارِ حدیث

نااہل ہیں اور دعویٰ گفتار و قلم ہے
اللہ ترے دین پہ کیا جور و ستم ہے

اطفال کم آموز ہیں اور جرأت بیکار
ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں برہان کی تلوار

ہر عیب بعنوانِ ہنر بیچ رہے ہیں
ہر زہر بہ عنوانِ شکر بیچ رہے ہیں

شاہنشہ کونین کے احکام سے ٹکر
یہ اصل میں ہے قوتِ اسلام سے ٹکر

ریشم کو نہیں عظمتِ فولاد گوارا
شبنم کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے شرارا

جو علم کے میداں میں سدا پیچھے رہے ہیں
اسلام کی شہ رگ پہ چھری پھیر رہے ہیں!

کج رائیٔ انکار کو سمجھے ہیں فضیلت
یہ طرۂ دستار کو سمجھے ہیں فضیلت

ان کی تو ہمیشہ سے روایات یہی ہیں
ظاہر میں بڑا شور، مگر جیب تہی ہیں

تاریخ سمجھتے ہیں یہ اقوالِ نبیؐ کو
کیا کہیے اب افکار کی اس بوالعجبی کو

جو اسوۂ کردارِ شہنشاہِ عرب ہے
تاریخ کا درجہ اسے دیتے ہیں غضب ہے!

دیتے ہیں حقائق کو حکایات سے پیوند
یہ خامیٔ افکار کے زنداں میں نظربند!

کرتے ہیں محمدؐ کی احادیث سے انکار
یہ جہل کی زنجیر کے حلقوں میں گرفتار!

یہ ظن و قیاسات کے سانچے میں ڈھلے ہیں
حق چھوڑ کے ظالم رہِ باطل پہ چلے ہیں

قرآں کے امیں، اور شریعت سے بغاوت
اللہ کے طرفدار، رسالت سے بغاوت!

قرآں سے سنت کو الگ دیکھنے والو
اسلام پہ اس طرح غلاظت نہ اچھالو

یہ کوششِ تخریب ہے، یہ کام نہیں ہے
یہ تفرقہ ہے، خدمتِ اسلام نہیں ہے!

فرقہ کوئی سنت سے اگر برسرِ کیں ہے
یہ جنگ خدا سے ہے، محمدؐ سے نہیں ہے

قرآں ہے چمن، جلوۂ تنویر ہے سنت
اس نکتۂ توحید کی تفسیر ہے سنت

اسرار کے مفہوم کا گنجینہ ہے سنت
قرآن ہے آئین، تو آئینہ ہے سنت

سنت کی اگر ہاتھ میں مشعل نہیں ہوتی
انسان کی توحید مکمل نہیں ہوتی!

اے فرقۂ گمراہ و کج اندیش و سیہ کار
اے شیشہ گرو! لاکھ کرو حجت و انکار

ہاں مکر دکھاتے رہو اے حیلہ طرازو
ہاں سحر جگاتے رہو اے شعبدہ بازو

کرتے رہو دعوائے طرفداریٔ قرآں
ہٹتے رہو سنت کی صداقت سے گریزاں

تم نورِ حقیقت پہ جفا کر نہیں سکتے
خورشید سے کرنوں کو جدا کر نہیں سکتے

Companion for all time

10 Cigarettes
S
TRADE MARK
Shaheen
Cigarettes

تنقیدیں اور خاکے : "تنقیدیں اور خاکے" از۔ جلیل قدوائی (ایم اے) ضخامت ۱۹۰ صفحات۔ مجلّد رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ اردو اکیڈمی سندھ، مشن روڈ۔ کراچی۔

جناب جلیل قدوائی اُردو زبان کے خاموش خدمت گزار ہیں اور اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ زبان و ادب کی خدمت میں گزرا ہے۔ موصوف کی ایک درجن کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں خود اُن کی شاعری بھی ہے۔ دوسروں کے کلام کا انتخاب بھی ہے۔ افسانے اور ادبی تنقیدیں بھی ہیں۔ یہ جامعیت کسی کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک "وہب" و "کسب" شریک کار نہ ہوں۔

اس کتاب میں ذیل مضامین ہیں:

مولانا حسرت موہانی —— یاقیات فانی —— صغر صاحب اور میں —— عزیز لکھنوی کی یاد میں —— افرستان —— حالی اور اُن کا مسدس —— اکبر الہ آبادی کی شاعری —— اقبال کی بعض اُردو نظموں کا ابتدائی متن —— چوری اور سینہ زوری۔

ان مضامین کو پڑھ کر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جلیل قدوائی ایک اچھے تنقید نگار ہیں۔ ان کی تنقیدیں متوازن ہی نہیں شگفتہ اور دلچسپ بھی ہیں۔ "ترقی زدہ تنقید نگاروں" کی طرح وہ بات کو الجھاؤ میں نہیں ڈالتے۔ اُن کے خیال و اظہار میں سلجھاؤ پایا جاتا ہے اور اپنے ما فی الضمیر کو پوری طرح ادا کرنے کی صلاحیت اور قدرت رکھتے ہیں۔

تنقید نگاروں کی ہمارے اُردو ادب میں کمی نہیں ہے۔ مگر ان میں سے کتنے ہیں جو شعر کا صحیح ذوق رکھتے ہیں! جناب جلیل قدوائی شعر کو پرکھنا جانتے ہیں۔ اس لئے شاعری پر اُن کی تنقید سطحی اور اُوپری نہیں۔ گہری اور بلند ہوتی ہے۔

"میری آمد کی خبر سن کر نہ جانے کیا جی میں آئی مجھے دیکھنے کے لئے (حسرت موہانی) تشریف لائے تو گاڑھے کے کھری کرتے پاجامے پر خوب سرخ و سیاہ دھاریوں والے موٹے کپڑے کا جسے یو پی میں شاید ناپٹی کہتے ہیں اور جسے جلاہے یا اسی قبیل کے لوگ پہنتے ہیں، فرغل پہنے تھے ......" (صفحہ ۲۶)

جہاں تک ہمیں معلوم ہے مولانا حسرت موہانی دیسی کپڑا تو ضرور پہنتے تھے مگر "کھدر" (گاڑھا) ارادتاً نہیں پہنتے تھے۔ اسی بات پر اُن سے اور گاندھی جی سے اختلاف تھا۔ وہ ہندوستان کے کارخانوں کے بنے ہوئے کپڑے کے پہننے کے حق میں تھے اور گاندھی جی کی طرح ہاتھ کے کتے ہوئے سوت یا جلاہوں کے کرگھے کے بنے ہوئے کھدر کے بارے میں غلو سے کام نہ لیتے تھے۔

"فانی حسرت ہی کے ہم بزم و ہم نوا ہیں اور اُن کے تمام کلام میں وہی حصہ بہترین ہے جس میں حسرت کا رنگ پایا جاتا ہے۔" (صفحہ ۳۷)

فاضل تنقید نگار کی اس رائے سے ہم متفق نہیں ہیں۔ اس لئے کہ فانی کی غزل میں خود اُن کا اپنا رنگ پایا جاتا ہے۔ حسرت کے رنگ شاعری اور انداز سخن سے وہ متاثر نہیں ہوئے۔ فانی پر سب سے زیادہ اثر غالب کا ہے۔ پھر وہ عمر میں حسرت موہانی سے بڑے تھے۔ علی گڑھ کالج میں مولانا حسرت موہانی جب بی اے میں تھے تو فانی گریجوایٹ ہو چکے تھے۔ اور وہ ایل ایل بی میں پڑھتے تھے۔

"یہ رنگ شاعری بطور ایک عزیز ارث کے انھیں اپنے پیش روؤں اور بزرگوں سے ملا تھا۔" (صفحہ ۸۵)۔ "ارث" عربی زبان کے اعتبار سے صحیح ہے۔ مگر اُردو بولنے والوں کے لئے غریب اور نامانوس ہے۔ "ورثہ" یا "میراث" لکھنا تھا —— "ہمارے مقبول ترین اور ذی حس ترین شاعر تھے۔" (صفحہ ۱۲۴)۔ "ذی حس ترین" کو وجدان مشکل ہی سے گوارا کرے گا —— "اسی طرح انشاء و مصحفی کے معرکے ہیں جو حضرت اکبر کے کارناموں کے مقابلہ میں دوم بلکہ سوم درجہ کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔" (صفحہ ۱۳۲)۔ جہاں تک زبان کی بے ساختگی اور روزمرہ کا تعلق ہے "دوم" اور "سوم"

اک حیرت تھی جسے اہلِ نظر مانگ چکے ـــــ اب کوئی ان کے علاوہ نہیں آئینے میں

جہانِ خیر و شر میں جانے کس شے کی ضرورت ہو ـــــ سکونِ دل سے پہلے اک خلش بھی مانگ لی ہم نے

اچھا ہوں جس حال میں ہوں ـــــ لیکن یہ احساس بھی کیوں؟

بیرونِ نظر ہی لیکن یوں ـــــ پھر تو کوئی امید کروں

عمرِ گل لالہ و گل سے یہ خبر ملتی ہے ـــــ خون ہوتا ہے چمن کا تو کلی کھلتی ہے

جب قفس میں چراغ جلتے ہیں ـــــ تو نکلتی ہے آشیانے سے

اہلِ دل شدتِ غم سے کہیں گھبراتے ہیں ـــــ اوس پڑتی ہے تو پھول اور نکھر جاتے ہیں

فروغ پائیں گے اہلِ قفس بہار کے بعد ـــــ یہ دور آئے گا لیکن کچھ انتظار کے بعد

ہزاروں اندھیرے درِ آشیاں تک ـــــ اُجالا کرے ایک بجلی کہاں تک

ہر چیز یہاں شعبدۂ وہم و یقیں ہے ـــــ دنیا کا یہ عالم کبھی تھا اور نہیں ہے

تمہیں نظر پہ مجھے دل پہ اختیار رہے ـــــ وہ گل کھلاؤ کہ دونوں طرف بہار رہے

کسے سجدہ کریں اہلِ محبت ـــــ محبت خود جبیں خود آستانہ

مٹ نہیں سکتی محبت مرگِ بے ہنگام سے ـــــ میں پکارا جاؤں گا برسوں ترے نام سے

غمِ زندگی کو قیامت نہ کہیئے ـــــ قیامت تو اک نغمۂ مختصر ہے

انھیں پکار کے چپ ہو گئے ہیں دیوانے ـــــ یہی سکوت مرتب کرے گا افسانے

لبوں تک آ گئی ہوئی مسکراہٹوں کو نہ روک ـــــ تری بلا سے جو بڑھ جائے زندگی غم کی

دوسرا رُخ:-

حرم ہو کہ دیر ایک جا چاہتا ہوں   تحیر سے دور آئینہ چاہتا ہوں   (صفحہ ۱۳)

پورا شعر ایک چیستان سے کم نہیں۔

محبت میں ترکِ محبت سے پہلے   ترے روبرو آئینہ چاہتا ہوں   (صفحہ ۱۳)

اس شعر کا بھی یہی رنگ ہے جو اس سے اوپر والے شعر کا ہے۔

آپ آزردۂ محبت ہی نہ ہوں   انتقاماً نظر اٹھائی ہے   (صفحہ ۱۴)

اول تو انتقاماً غزل کی نزاکت پر بار ہے۔ پھر اس ایک لفظ کی وجہ سے پورا شعر مبہم ہو کر رہ گیا۔

اکتسابِ خار و خس تو اک پرانی بات ہے   اب کوئی فکرِ مکرر آشیانے کیلئے

یہاں "فکرِ مکرر" کا نہیں "فکرِ جدید" کا محل تھا۔ "مکرر" تو کسی چیز کی تکرار کو کہتے ہیں اور شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ خار و خس جمع کر کے آشیاں بنانا تو ایک فرسودہ رسم اور پرانی بات ہے۔ آؤ! ہم کسی دوسرے انداز پر آشیانہ مرتب کریں! کاش "اکتسابِ خار و خس" کی جگہ "اہتمامِ خار و خس" ہوتا۔

ڈالی نگاہ جو خلشِ روزگار نے   سب تھے مگر مجھی کو پکارا بہار نے   (صفحہ ۲۸)

نجم صاحب کو چاہیئے کہ وہ اپنے اس قسم کے اشعار کی خود تشریح فرما دیں، ورنہ دماغ غور و فکر کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہی پھریں گے۔

بہ ہر رنگ اشکِ وفا رنگ لائے   چپے ہم تو شبنم نے آنسو بہائے

"چپ ہو گئے" کو "چپے" کہنا اردو روزمرہ کے لحاظ سے بہت کچھ محلِ غور ہے۔ بیدیوں میں اس طرح اگر بولتے ہیں تو یہ ایک مقامی اندازِ گفتگو ہے۔

اہلِ قفس کا حال نہ پوچھ   جبرِ مقدم، مدت ساز   (صفحہ ۲۲)

اس شعر کا مفہوم بھی "بعض شاعر" میں بند ہو کر رہ گیا۔

ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ جناب انجم کی طبیعت کا میلان ندرت و ایجاد کی جانب ہے۔ اس لئے ان کے بعض شعر اس کوشش کے چکر میں آکر "ابہام" بن کر رہ گئے ہیں۔ کاش! ہماری ناقص فہم ان شعروں کی گہرائی تک پہنچ سکتی ——!

بے نیازی کو لیا ہے تو غمِ ناز نہ دے —— اپنے ماحول سے ہٹ کر انہیں آواز نہ دے

تابشِ جلوہ نادم ہے —— کود پڑے تو آگ میں ہم (صفحہ ۴۸)

جلوۂ صبح سے جب ان کی نظر ملتی ہے —— بے بلائے ہوئے ہر شاخِ چمن ہلتی ہے (صفحہ ۵۰)

چمن والوں نے سمجھا ہی کہاں روحِ رفتن مجھ کو —— بہت سوچا کہ گذرے بے نشانِ آشیاں مجھ کو (صفحہ ۶۲)

بقول چوک کس سے نہیں ہوتی۔ بہرحال "اجالے" میں انجم شوقی کے کلام کی شعریت، ندرت اور جدت طرزی سے کوئی اہلِ ذوق صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

ماہ فروری

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اسلامی مسائل کا عالمگیر ربط و تلازم

بندوق رائفل پستول
اور کارتوس ہر قسم
آرمس کمپنی ۔ وکٹوریہ روڈ ۔ کراچی

ہماری نظر میں

حیاتِ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی

ماہر القادری

جلد ۶ — نمبر ۴

ماہنامہ

فاران

جولائی سنہ ۱۹۵۴ء

ایڈیٹر: ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ر

۸ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱ر

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

نقشِ اوّل

کمیونزم کوئی ہنگامی اور وقتی جیسی ہوئی تحریک نہیں ہے۔ یہ ایک باضابطہ آئیڈیالوجی ہے اور اس کے ماننے والے ایک مخصوص تصورِ حیات رکھتے ہیں — اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک کمیونسٹ ضبط و آئین کے حدود میں رہ کر کسی عسکری دور پر صبر و قناعت نہیں کر سکتا۔ اقتدار پرستی اور ہنگامہ آرائی اس کا مزاج و شکست و ریخت اس کی فطرت اور جبلّت ہے۔ ابتدا ہی سے ان کی تعلیم ہی یہ دی جاتی ہے اور ان کے دل و دماغ کی تربیت ہی اس انداز پر ہوتی ہے کہ ہر غیر اشتراکی نظام کو برباد اور تباہ کرنے کی کوشش کرو یہاں تک کہ کمیونزم کے لئے فضا سازگار اور زمین ہموار ہو جائے!

کمیونسٹ اخلاقی قوانین و ضوابط پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک دنیا کی کوئی اخلاقی قدر مستقل اور پائیدار نہیں ہے۔ زمانہ کے حالات کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں اور حق بدلتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ آج دنیا جسے "ظلم" کہتی ہے۔ کل وہی "انصاف" بن سکتا ہے!

کمیونسٹ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اگر انہیں کہیں گڑبڑ پھیلانی اور کسی نظامِ حکومت میں ابتری پیدا کرنی مقصود ہو تو وہ امن کے لئے عوام کے کسی جلسہ کو بموں سے اڑا سکتے ہیں۔ ریل گاڑیوں کو پٹڑیوں سے اتار کر ہزاروں بے گناہ مردوں کا خونِ ناحق اپنی گردن پر لے سکتے ہیں!

کمیونسٹ خشک، بے لچک اور شدید متعصب ہوتا ہے۔ مروّت اور رواداری کے الفاظ اس کی لغت میں نہیں پائے جاتے اپنے مخالفوں کو وہ برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ اسٹالن کی پوری زندگی ہمارے سامنے ہے۔ کریملن "فولادی انسان" نے اپنے مخالفوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس کے جانشین مالنکوف نے زمامِ حکومت سنبھالتے ہی پہلا کارنامہ یہ انجام دیا کہ روس کے ان بڑے لوگوں کو جو اس کی پالیسی سے اختلاف رکھتے تھے گولیوں کا نشانہ بنا دیا!

ساری دنیا میں تنہا سوویٹ روس ہی وہ مستبد اور جابر حکومت ہے جہاں "حزبِ اختلاف" کا وجود نہیں پایا جاتا۔ حزبِ مخالف جانے دیجئے وہاں کون ہمت کر سکتا ہے۔ حکومت کی کسی اسکیم پر تنقید اور نکتہ چینی کرنا بھی بہت بڑا جرم ہے! شراب، رقص و سرود شعر و نغمہ، محبت و آشتی [illegible] موضوعِ گفتگو بن سکتے ہیں۔ مگر حکومت کے کسی فعل اور حرکت پر گفتگو درحقیقت جرم ہے

اور ضرورت مند کی نیازمندی اور بے ضمیری کا یہ عالم ہے کہ وہ ساہوکار کو خوش کرنے کے لئے اپنی بیوی اور بیٹی تک کو رہن رکھ دیتا ہے۔ اور اس بے غیرتی کو وہ "ضرورت" کے نام پر گوارا کر لیتا ہے ـــــ دوسرا شخص بھی ساہوکار سے قرض لیتا ہے اور ساہوکار کے ظاہری احترام میں کوئی کمی نہیں کرتا۔ مگر نیازمندی کے ان تمام مظاہر کے باوجود اپنی شرافت اور عزت و ناموس پر ذرہ برابر حرف نہیں آنے دیتا۔ ضرورت کسی کو کہاں تک جھکا سکتی ہے اس کے بھی کچھ حدود ہیں۔ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا وہ ضرورت کی نزاکتوں اور شرافت و خودداری کے تقاضوں میں توازن قائم رکھ سکتا ہے!

وہ شخص منافق بلکہ بے ایمان ہے جو پاکستان کی ترقی اور استحکام کو دیکھ کر اپنے دل میں پیچ و تاب محسوس کرتا ہے۔ پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کا ہم سے زیادہ خواہشمند شاید ہی کوئی دوسرا ہوگا۔ ہماری تو یہ تمنا بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ التجا ہے کہ پاکستان اس قدر مضبوط اور قوی ہو جائے کہ وہ نہ صرف اپنی حفاظت کر سکے بلکہ دوسرے ملکوں کے مظلوم مسلمانوں کو بھی ظلم کے پنجے سے چھڑانے کے قابل ہو جائے۔ اور اس کے قشونِ قاہرہ کی دھاک واشنگٹن سے لے کر ماسکو تک محسوس کی جائے!

پاکستان ایک آزاد اور خود مختار حکومت ہے۔ اسے ہر دوسری مملکت سے معاہدہ کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ غلہ، ڈالر اور جنگی سامان کی امداد بھی پاکستان لے سکتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے اونچا ہوتا ہے۔ اور امداد قبول کرنے والے کو امداد دینے والے کی تھوڑی بہت برتری تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے مفر ممکن نہیں۔ مگر تھوڑی بہت برتری اور بہت زیادہ "فعال و ناظر" میں زمین و آسمان کا فرق ہے!

پاکستان "اسلام" اور صرف "اسلام" کی بنا پر وجود میں آیا ہے۔ اس نوزائیدہ مملکت کی بقا اسی آئیڈیالوجی سے وابستہ ہے۔ مگر ہمارے حکمران طبقہ نے پاکستان میں اسلامی تصورات حیات کو متشکل نہیں ہونے دیا۔ اس صورت میں امریکہ کی مالی و جنگی امداد اور پاکستان کی آئیڈیالوجی کے درمیان اگر ترجیح و انتخاب اور توازن کی نوبت آئی تو اس وقت ہمارے ارباب اقتدار کی کیا روش ہوگی؟ اس کا جواب ہم کیا دیں۔ پاکستان کے ارباب اقتدار کے افکار و اعمال قوم کے سامنے ہیں۔ یہ حضرات اسلامی آئیڈیالوجی کے ساتھ جو سلوک اب تک کر رہے ہیں۔ اس کا ہر گوشہ بے نقاب ہو چکا ہے ـــــ!

امریکہ کی جنگی امداد صرف اسلحہ کی درآمد تک محدود نہ رہے گی۔ بلکہ اس کے ساتھ وہاں کے ماہرین آئیں گے۔ انجینئر و مبصرین آئیں گے اور اس دوستی کو مزید تقویت دینے کے لئے کلچرل وفود اور آرٹسٹ آئیں گے۔ اور ان کے جلو میں امریکہ کی معاشرت بھی آئے گی۔ وہ بہر وہ معاشرت ہے جسے ہمارا حکمران طبقہ تمدن و تہذیب اور تنویر فکر کا مظہر سمجھتا ہے۔ اس لئے خطرہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی معاشرت کے جو تھوڑے بہت آثار پائے جاتے ہیں۔ کہیں ان سے بھی ہم محروم نہ ہو جائیں ـــــ!

پاکستان میں ان "بڑے لوگوں" نے کس قسم کا معاشرہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مسز روزویلٹ جب امریکہ سے پاکستان تشریف لائی تھیں تو ان کے استقبال کے لئے مسلمان لڑکیوں کو اوپن گاڑیوں پر بے پردہ کراچی کی سڑکوں پر گشت کرایا گیا تھا ـــــ اور تازہ ترین شاہکار یہ ہے کہ بیگم لیاقت علی خاں کو ہالینڈ کا سفیر مقرر کیا گیا ہے۔ امریکہ کی تہذیب و معاشرت میں۔ عورت چاہے کتنی ہی روشن خیالی کی دلیل ہو۔ مگر اسلامی نقطۂ نگاہ سے سخت معیوب ہے۔ بعض لوگوں نے بیگم صاحبہ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا ہے۔ مگر ہم تعزیت کا فرض انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ ایسی باتوں سے ایک مسلمان عورت کے "عورت پن" کی موت واقع ہو جاتی ہے ـــــ!

ہم مانتے ہیں کہ اسلام عورت کو گڑیا بنا کر رکھنا نہیں چاہتا۔ مگر اسلام کو یہ بھی پسند نہیں ہے کہ ایک مسلمان خاتون بے پردہ ہو کر غیر مردوں سے ہاتھ ملائے۔ ہزاروں میل کا سفر غیر محرم کے بغیر کرے اور جلسوں اور پارٹیوں اور انجمنوں کی زینت بنے! [illegible]

کی معاشرت و تہذیب میں یقیناً فرق ہونا چاہیئے۔ وہ دونوں ایک سطح پر آگئیں تو جاہلیت اور اسلام کے مابین حد امتیاز کیا باقی رہی۔

ہمارے وزیر اعظم گزشتہ مہینے ترکی تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے وہاں ایک تقریر میں فرمایا کہ پاکستان کو اتاترک کی اصلاحات کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے"۔ کوئی شک نہیں کہ اتاترک ایک مخلص لیڈر تھا اور اپنے وطن کی ترقی اور خوشحالی کا بے پناہ جذبہ رکھتا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اتاترک نے ترقی و اصلاح کے جوش میں اسلام کی بہت سی قدروں کو پامال کیا، اور اپنے بعد سیاست و معاشرت میں جاہلیت کا نمونہ چھوڑا! اتاترک کی اصلاحات میں اس حکومت کے لئے کوئی مثالی نمونہ نہیں ہے۔ جو خالص اسلام کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ پاکستان میں اتاترک کے "اسلامی تصورات" کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس قسم کی اصلاحات یہاں نہیں چلنے دی جائیں گی۔ پاکستان کے سامنے تو ایک ہی نقش قدم ہے اور وہ حضور سید الاولین والآخرین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش قدم ہے! انسانوں کے تولنے جانچنے اور پرکھنے کا جو پیمانہ اسلام نے ہمیں دیا ہے وہ "تقویٰ" کا پیمانہ ہے۔ اس پیمانہ پر جو پورا نہیں اترتا وہ عقل و فراست میں اپنے وقت کا ارسطو اور عزم و حوصلہ مندی میں سکندر اعظم ہی کیوں نہ ہو ہمارے لئے اس کی زندگی نمونہ اور مثال نہیں بن سکتی۔ مسلمانوں کی قیادت و پیشوائی کے سزاوار وہ انسان ہو سکتے ہیں، جو صاحب فراست اور حوصلہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ نیک کار اور پاکیزہ کردار ہوں ——— ہمیں ایسے فوجی جنرل نہیں چاہئیں جو شراب پی پی کر فوجیں لڑاتے ہوں — ہمیں ایسے فوجی افسر درکار ہیں جن کی پیشانیوں میں سجدوں کے نشان جھلکتے ہوں، جن کے دل خدا کے خوف سے لبریز ہوں۔ اور جو اللہ کے بھروسے پر فوجوں کی کمان اس قدر پامردی اور جرأت و حوصلہ مندی کے ساتھ کریں کہ اسلامی فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے دشمنوں کے بڑے بڑے لشکروں کے چھکے چھڑا دیں —!

ایک چیلنج

ابھی حال ہی میں مشرقی پاکستان کے مطلق العنان گورنر میجر جنرل اسکندر مرزا نے ایک بیان میں فرمایا کہ "پاکستان کو دو خطرے لاحق ہیں۔ ایک کمیونزم کا خطرہ ہے جو مشرقی پاکستان تک محدود ہے، اور دوسرا خطرہ "مذہبی دیوانگی" کا ہے۔ جو پاکستان میں ہر جگہ پایا جاتا ہے"

اسکندر مرزا صاحب کا یہ بیان ان کے عزائم و افکار کا آئینہ دار ہے۔ فکر و نظر کی غلطی کے علاوہ یہ بیان سوء تدبیر اور بے دانشی کی دلیل ہے۔ ایک ہی وقت میں دو دشمنوں سے لڑائی لڑنا، اور جنگ کے دو محاذ کھول دینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے، مگر صہبائے اقتدار کو کیا کیجیے کہ اس کے ایک ہی جرعہ میں آدمی بہکنے لگتا ہے۔ فضل الحق صاحب بھی اسی نشۂ اقتدار سے سرشار ہو کر بڑی اونچی باتوں پر اتر آئے تھے۔ انہوں نے ایسے ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات دیئے جن کی کسی ہوشمند آدمی سے توقع نہیں ہو سکتی۔ میجر جنرل اسکندر مرزا کا یہ بیان بھی سیاسی بصیرت کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے!

کیا میجر جنرل صاحب کو معلوم ہے کہ کمیونزم ایک آئیڈیالوجی ہے اور آئیڈیالوجی طاقت کے زور سے نہیں مٹ سکتی۔ فوج کی رائفلیں جسموں کو پارہ پارہ کر سکتی ہیں۔ مگر تصورات کو نہیں بدل سکتیں۔ "آئیڈیالوجی کا توڑ آئیڈیالوجی ہی کر سکتی ہے۔" لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔ کمیونزم کو پاکستان میں صرف اسلامی تصورات کے ذریعہ شکست دی جا سکتی ہے۔ اسلامی تصورات کے سامنے اشتراکی تصورات نہیں ٹھہر سکتے! یہ وہ آفتاب جہاں تاب ہے جس کے آگے دوسروں کے چراغ نہیں جل سکتے! مگر مقام حیرت و افسوس ہے کہ جو چیز مشرقی پاکستان میں کمیونزم کو مغلوب کر سکتی ہے، اس کو "جنون" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں اندیشہ ہے کہ بنگال میں کمیونزم کہیں کوئی خطرناک صورت اختیار نہ کر لے!

پاکستان میں کمیونزم، صوبہ پرستی اور دوسری جاہلانہ عصبیتوں کو ابھرنے کا موقع اسی لئے ملا ہے کہ اسلام کو یہاں قائم نہیں ہونے

حالات کتنے ہی نامساعد اور فضا کتنی ہی ناسازگار کیوں نہ ہو، گھبرانا اور بددل نہ ہونا چاہئیے۔ افراد پر، قوموں، حکومتوں، اور جماعتوں پر نازک وقت بھی آتے رہتے ہیں۔ بالکل یکساں حالات کبھی رہے ہیں اور نہ رہ سکتے ہیں۔ حق پرستوں کیلئے ہر زمانے میں دار و رسن کے ہنگامے کھڑے کئے گئے ہیں۔ مگر ــــ

مرد حق کوش کے تیور کہیں ہوتے ہیں ملول　　موت کا حکم سنانے سے بھی کیا ہوتا ہے!

پاکستان میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو یہاں خالص اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اور دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو مغرب زدہ ہیں اور اسلامی حکومت کا نام سن کر جن کا چہرہ غصے کے مارے لال پیلا ہو جاتا ہے۔ آپ قطعی فیصلہ کرکے یکسو ہو جائیے کہ آپ کس کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ اگر اسلام کا نظام آپ کا مقصود اور مطلوب ہے تو پھر ان لوگوں کی معاونت کیجئے اور ان کا ہاتھ بٹائیے جو پاکستان میں اقامت دین کی دعوت لے کر اٹھے ہیں۔ جن کے پاس اسباب وسائل کی کمی سہی مگر اخلاص و یقین کی کمی نہیں ہے۔ جو اب تک تمام آزمائشوں میں پورے اتر چکے ہیں اور نازک سے نازک موقع پر بھی اُن کے پائے استقامت میں جنبش تک نہیں ہوئی ــــ!

قیامت کے دن پوچھا جائیگا کہ نیک لوگوں کی ایک جماعت جب اللہ کے دین کو قائم کرنے کیلئے جد و جہد کر رہی تھی تو تم اس وقت کہاں تھے؟ کسی غار میں جا کر چھپ گئے تھے یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ اگر تم انہی کے درمیان رہتے تھے اور تمام واقعات تمہاری آنکھوں کے سامنے گزر رہے تھے، تو بتاؤ کہ تم نے حق کی حمایت میں کیا پارٹ ادا کیا۔ تمہارے ہاتھ سے کونسی برائی مٹی اور تمہاری کوشش سے کونسا معروف قائم ہوا۔

پاکستان بڑے شدید خطروں میں گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف ہمارے ہمسایہ ملک میں پاکستان کی مخالفت کا ہنگامہ گرم ہے۔ دوسری طرف مفاد پرست پاکستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ کمیونزم الگ پر پرزے نکال رہا ہے۔ صوبہ پرستی پاکستان کی وحدت اور سالمیت کیلئے ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی ہے صوبوں کیلئے پورے اختیارات مانگے جا رہے ہیں جو پاکستان کے مرکز کو تنہا کمزور اور بے اثر بنا دینگے۔ "اردو بنگلہ" مسئلہ نے ایک دوسری کشمکش کی بنا ڈال دی ہے۔ جن کے ہاتھوں میں پاکستان کی زمام حکومت ہے وہ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ ان کی کرسیاں محفوظ رہیں۔ اور ہر کا مغرب زدہ طبقہ اس توڑ جوڑ میں مصروف رہتا ہے کہ اقامت دین کی دعوت دینے والوں کے زور کو کس طرح توڑا جائے۔ مسلم لیگ جو پاکستان کی قومی اجارہ داری کی مدعی ہے اس کے انتشار، اختلاف اور پراگندگی کی کوئی حد نہیں۔ مسلم لیگ نے قوم کے مزاج کو بگاڑ دیا ہے ــ "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" ــ کا عالم ہے!

ایسی صورت میں وہ لوگ جو پاکستان اور اسلام سے بےغرض محبت رکھتے ہیں اور اسلامی حکومت ہونے کی بنا پر ہی پاکستان کا ایک ایک ذرہ جن کے نزدیک مقدس اور محترم ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی حد تک ان حالات کو بدلنے کی کوشش کریں۔ پاکستان کے حالات بدلنے کیلئے مریخ و مشتری سے کوئی خاص مخلوق نہیں آئیگی، ہمیں کو یہ فرض انجام دینا ہوگا اور ہمیں پر اسکی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انگریزی دور رخصت ہو چکا جب ملک کے نظم و نسق کی ابتری دیکھ کر ہم خوش ہوا کرتے تھے کہ اس طرح انگریز کمزور ہو رہا ہے۔ اب یہ ہماری اپنی حکومت ہے اور اس حکومت کا ہر نقصان ہمارا ذاتی نقصان ہے!

اللہ تعالیٰ پاکستان کو اندرونی اور بیرونی خطروں سے محفوظ رکھے ــــ اس دعا پر ہزار بار "آمین" نہ صرف ہماری طرف سے بلکہ قدسیان عرش کی طرف سے بھی! لیکن دعا کیساتھ جب تک ہم خود میدان تدبیر و عمل میں نہ آئیں گے اس وقت تک محض دعاؤں سے کام نہ چلے گا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے بڑھ کر کس کی دعا مقبول ہو سکتی ہے۔ لیکن تاریخ و سیر کا ایک ایک ورق گواہ ہے کہ اقامت دین کیلئے "تدبیر و عمل" کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے حضورؐ نے نہ اپنایا ہو۔ اقامت دین کی جد و جہد میں حضورؐ کی سیرت اور آپ کے صحابہ کے آثار ہی ہماری رہنمائی کریں گے۔ اور انشاء اللہ وہ دن دور نہیں ہے جب اسلام جو آج بے سر و سامان ہے کل پاکستان کے ہر شعبۂ حیات پر اسی کا عمل دخل اور غلبہ ہوگا۔ اور وہ دن جشن مسرت منانے کا نہیں بلکہ اللہ کے حضور سجدۂ شکر ادا کرنے کا ہوگا۔ اس دن اللہ کے مخلص بندے اترائیں گے نہیں بلکہ اپنے رب کے حضور شکر و مسرت کے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرینگے اور اپنی کوششوں پر فخر کرنیکے بجائے اپنی کوتاہیوں کی معافی چاہیں گے ــ!

ماہر القادری　۲۵ جون ۴۸ء

ترجمہ - طیبہ عثمانی ندوی

"انسانِ کامل"

اقبال کی نگاہ میں

استاذ مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فواد یونیورسٹی قاہرہ میں "یوم اقبال" کے موقع پر ایک مقالہ پڑھا تھا - یہ مضمون اس کا اُردو ترجمہ ہے - جہاں اشعار کے عربی تراجم تھے - وہاں اقبال کے اصل اشعار لکھ دیئے گئے ہیں - (طیبہ عثمانی)

اقبال کی نگاہِ تجسس کو اس عالمِ رنگ و بُو میں جو اپنے اندر گوناگوں دلفریبیاں اور دلچسپیاں رکھتی ہے صرف درندوں کا بھٹ اور چوپایوں کا جنگل نظر آیا - اور اس کی متجسس نگاہیں ان درندوں اور چوپایوں کی دُنیا میں کسی "انسان" کی جویا رہیں - اپنی اس تلاش و جستجو کی ابتداء اپنی مشہور کتاب "اسرارِ خودی" میں مولانا جلال الدین رومی کے ان اشعار سے کی ہے ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

"کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اندھیری رات ہے اور ایک درویش سن رسیدہ ہاتھ میں مشعل لئے کوچہ و بازار کی خاک چھانتا پھرتا ہے - جیسے اس کی نگاہ کسی گم شدہ کی تلاش میں ہو - میں نے کہا - حضرت سلامت! کس چیز کی تلاش ہے؟ فرمانے لگے - اس درندوں اور چوپایوں کی بستی میں رہتے رہتے طبیعت عاجز آ گئی ہے - اب اس وسیع کائنات میں کسی "انسان" کی تلاش میں نکلا ہوں - ایک ایسا نوجوان جس کی مردانگی اور شخصیت میری روح کو تسکین اور بالیدگی عطا کر سکے - میں نے کہا - آپ کس دھوکے میں ہیں؟ یہ تو عنقا کی تلاش ہے - اس کے پیچھے اپنے آپ کو کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں - میں نے اس راہ میں در در کی خاک چھانی ہے - دشت و صحرا، آبادی و ویرانہ کوئی جگہ ایسی نہیں - جہاں میرے قدم نہ پہنچے ہوں - مگر اس کی حقیقت تو کیا پرچھائیں بھی نظر نہ آئی - درویش نے کہا - مجھے تو اس شے کی تلاش و جستجو زیادہ محبوب ہے جس کا وجود نادر اور جس کا حصول آسان نہ ہو"

سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس "گم شدہ انسان" کو اس وسیع کائنات میں پالیا - یا حیران و سرگرداں بھٹکتے پھرے؟ اقبال کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کی طرف اچھی طرح نشاندہی کرتا ہے - بیک نظر اور بلا خوف تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے اس کھوئے ہوئے انسان کو پالیا اور نہ صرف پایا بلکہ اس کو اچھی طرح پہچانا اور زندگی کے طویل ایام اس کے ساتھ گزارے - اقبال کا یہ انکشاف کولمبس کی "نئی دنیا" کے انکشاف سے زیادہ وسیع اور بڑی انکشاف ہے اور بلا شبہ ایک فتح عظیم ہے - اس لئے کہ کھوئے ہوئے انسان کی تلاش و جستجو اور پھر اس میں کامیابی اس عالم کی سب سے بڑی خوش بختی اور سب سے بڑی "بازیافت" ہے - خصوصاً اس دور میں جب کہ انسان کھو چکا ہو اور انسانیت افسانہ بن چکی ہو -

اقبال کا وہ گم شدہ انسان جسے وہ "انسانِ کامل" سے تعبیر کرتا ہے - کہاں ہے؟ اور کون ہے؟ مجھے یہ ڈر ہے کہ ہم میں سے

اکثر اس سوال کا جواب سن کر چونک پڑیں گے۔ جبکہ ان کے سامنے یہ حقیقت آئے گی کہ اقبال کا "انسان کامل" ایک سچا "مسلم" ہے اور ان کا یہ چونکنا بڑی حد تک بجا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جن کی نگاہوں کے سامنے لفظ "مسلم" کے بعد ایک خشک، جامد اور بجھی بجھی زندگی گزارنے والے انسان کی تصویر پھر جاتی ہے۔ وہ کبھی بھی اقبال کے انسان کامل کا تصور کسی "مسلم" سے نہیں کر سکتے۔ لیکن اقبال کا مرد مومن دراصل قرآنی نظریہ کا "انسان کامل" ہی ہے۔

اقبال کے اس "مرد مومن" اور "مسلم مثالی" کو اس کے ایمان کی قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت دنیا کے ان سارے انسانوں سے جو شک و ریب میں مبتلا ہیں ممتاز کر دیتی ہے۔ اور اسی طرح وہ بزدل انسانوں کے مقابلہ میں اپنی شجاعت و مردانگی، و روحانی قوت سے ممتاز ہے ایک مسلم کی توحید خالص اسے بندۂ انسان اور بندۂ مال و زر سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ اس کی آفاقیت و انسانیت، وطن پرستی، قوم پرستی اور رنگ و نسل کے امتیاز کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ وہ مسلم مثالی زندگی کا ایک پیام رکھتا ہے۔ جس کے ماتحت وہ زندگی گزارتا ہے۔ زندگی کی قدریں خواہ بدل جائیں اور انسانی زندگی میں کتنا بڑا ہی انقلاب کیوں نہ آ جائے۔ لیکن اس کے آئندہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ وہ خود اپنے آپکو بدل سکتا ہے۔ اس مسلم کی مثال قرآن نے اپنے سادہ اور بلیغ لفظوں میں اس طرح بیان کی ہے۔

کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء

اس کی مثال ایک ایسے پاک درخت کی ہے جس کی جڑیں جمی ہوں اور شاخیں دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ اقبال کہتا ہے ؎

نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقیں　　　اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز!

"انسان کامل" کے اس تصور سے ہمارے ذہنوں میں "مسلم" کی دو تقسیمیں آتی ہیں۔ ایک اس کا وجود انسانی ہے۔ دوسرا اس کا وجود ایمانی۔ اپنے وجود انسانی میں اس میں اور دوسرے انسانوں میں اشتراک ہے۔ عام انسانوں کی طرح پیدا ہوتا ہے اور ویسے ہی پروان چڑھتا اور بڑا ہوتا ہے۔ ہر انسان کی طرح اسے بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی۔ اسے گرمی کا بھی احساس ہوتا ہے اور سردی کا بھی۔ بیمار بھی پڑتا ہے اور صحت مند بھی ہوتا ہے۔ فقر و غنا میں بھی وہ عام انسانوں کے مثل ہے۔ زراعت و تجارت اور دوسرے انسانی شعبوں سے بھی اسے دلچسپی ہے۔ اولاد سے محبت کرتا ہے اور اپنے پہلو میں دل بھی رکھتا ہے۔ غرض کہ وہ اپنے وجود انسانی میں قانون طبعی کا ویسا ہی تابع ہے جیسے اس کے مثل اور دوسرے انسان۔ انقلاب زمانہ اور حوادث روزگار اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برت سکتے۔ محض اس لئے کہ اس کا کوئی خاص نام ہے اور اس کا تعلق کسی خاص نسل سے ہے یا وہ کوئی خاص قسم کا لباس پہنتا ہے۔ بلکہ اس کا وجود اس وسیع کائنات میں صرف ایک ذرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور عالم کے اس بحر زخار میں اس کی مثال ایک موج کی ہے۔ اگر ایک مسلم بھی عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنے پر اکتفا کرے تو پھر اس کی اس کائنات میں کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ اور اس کی موت پر نہ زمین روئے گی اور نہ آسمان ماتم کناں ہوگا۔ اور نہ اس دنیا کی نیرنگیوں میں کچھ بھی کمی واقع ہوگی۔ لیکن اس کا وجود ایمانی اپنے اندر ایک پیام رکھتا ہے جو انبیاء کا پیام ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کے کچھ مبادی اور اعتقادات ہیں۔ جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے گزرتی ہے۔ اس حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو وہ حیات انسانی کے اسرار سربستہ کا ایک راز ہے۔ عالم بقا کے لئے اس کا وجود ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے۔ لہٰذا وہ مرد مومن اور مسلم مثالی اس بات کا مستحق ہے کہ وہ اس کائنات میں زندگی گزارے، پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ کائنات کی بقا کے لئے اس کا وجود اور اس کا پھلنا پھولنا پروان چڑھنا ضروری ہے۔ جس طرح اس کائنات کو پانی، ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اسے ایک مرد مومن کی بھی ضرورت ہے۔ اگر حیات انسانی پانی، ہوا، روشنی، و حرارت و برودت کے وجود پر منحصر ہے تو اسی طرح ایک ایسے مقصد زندگی، روح ایمانی اور اخلاق کا

وجود بھی ناگزیر ہے جس کی روشنی انبیاء علیہم السلام کی دعوت و پیام سے حاصل کی گئی ہو اور جس کا بوجھ ایک مرد مومن کا ندھوں ناتواں اُٹھائے ہوئے ہو - اور اس کے بقا و دوام کے لئے اپنی زندگی کی ساری قوتوں اور توانائیوں کو لگا رکھا ہو - اس لئے کہ اگر مومن نہ ہو تو یہ پیام زندگی اور مقاصد بلند ضائع ہو جائیں گے - اور ان کا وجود عالم میں ایک راز سربستہ بن کر رہ جائے گا - اس مرد مومن کا وجود و بقاء اس عالم میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت آفتاب جہانتاب کی ہے - اور ان دیکش ستاروں کی نسلیں اور امتیں پیدا ہوں گی اور فنا ہوں گی آبادیاں ویران ہوں گی اور ویرانے آباد! حکومتیں بنیں گی اور مٹیں گی - ایک تہذیب کی جگہ دوسری تہذیب لے گی اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا - لیکن اس مسلم مثالی کا وجود ہمیشہ باقی رہیگا -

اقبال کا "مرد مومن" - "زندہ جاوید" ہے - اس لئے کہ وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیام رکھتا ہے - اس کے سینے میں ایک زندہ جاوید امانت ہے - اور اس کی زندگی ایک زندہ جاوید مقصد کے لئے گزرتی ہے ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے　　　اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل!

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد ہمیشہ زندہ رہیگا اور موت کبھی اسے اپنے آغوش میں نہ لے گی - بلکہ اس کی مثال اس بحر زخار کی ہے جس کی گود میں موجیں اٹھتی رہتی ہیں اور فنا ہوتی رہتی ہیں - حیات انسانی کے اس سمندر میں بھی موجیں اٹھتی رہیں گی اور فنا ہوتی رہیں گی لیکن اس کی حقیقت ہمیشہ باقی رہے گی!

اقبال کی نگاہ بلند یہاں پر رکتی نہیں - بلکہ اس کی نگاہ کہیں اوپر پہنچتی ہے - وہ کہتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا مقصد وجود بھی صرف مرد مومن ہے - عالم کا وجود اسی کے لئے ہے اور وہ صرف اللہ کیلئے، علماء و محدثین کے نزدیک یہ حدیث نبوی "لولاک لما خلقت الافلاک" کی صحت لفظاً و روایتاً خواہ کیسی ہی ہو - لیکن اس کی نگاہ حقیقت بیں کچھ اور دیکھتی ہے - وہ قرآن کی روح اور اس کی حقیقت پر نظر رکھتا ہے اس کے سامنے "ایک مسلمان" اور اس کا "بلند پیغام" ہے - وسیع انسانی تاریخ پر اس کی غائر نظر ہے - عالم کی تمدن اور اشیاء کے خواص کا اُسے خوب اندازہ ہے - اس لئے یہ حقیقت اس پر اچھی طرح واضح ہے کہ یہ کائنات اور اس کے سارے واقعات صرف ایک سچے مسلمان کے لئے وجود میں آئے ہیں - وہ اللہ کا اس سرزمین پر نائب اور خلیفہ ہے - اس کائنات کے تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وہ وارث ہے ؎

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث　　　مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے!

اور اس عقیدہ و فکر کو عملاً بروئے کار لانے کے لئے اس پر مسلسل جد و جہد اور کوشش واجب ہے -

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کا یہ عقیدہ و ایمان تھا کہ ایک "مسلمان" ہوا کے رُخ پر نہیں چلتا - بلکہ وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ بہتے ہوئے دھارے کا رُخ پھیر دے - عالم کو اپنی راہ پر چلائے - تہذیب و تمدن اور سوسائٹی اور سماج کا رُخ موڑ دے اور ساری انسانیت اس کے عمل و ارادہ کے تابع ہو جائے - اس لئے کہ وہ اپنے پاس اس دکھی انسانیت کیلئے ایک زندہ پیام رکھتا ہے جو اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہے - اس کے پاس ایمان و یقین کی جیتی جاگتی طاقت ہے - اس عالم کی رہنمائی کا وہی ذمہ دار ہے دنیا کی امامت و قیادت اسی کو زیب دیتی ہے - اس عالم میں وہ صاحب امر و نہی کی حیثیت رکھتا ہے - اگر زمانہ اسے قبول نہ کرے - سماج اس کا مخالف ہو اور سیدھی راہوں سے ہٹا ہوا ہو - تو پھر اس کے لئے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ زمانے کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اپنے آپ کو غلط سماج کے سپرد کر دے - بلکہ اس پر ضروری ہے کہ زمانے کے خلاف علم بغاوت بلند کرے - سوسائٹی اور سماج سے جنگ کرے - یہاں تک کہ کامیابی و کامرانی اس کے قدموں سے آ لگے - اقبال کے نزدیک "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا نظریہ زندگی ایک مرد مومن کیلئے کسی طرح صحیح نہیں - وہ کہتا ہے ؎

حدیث کم نظراں ہے "تو باز مانہ بساز"　　　زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!

اقبال کا خیال ہے کہ ایک مومن زندگی کی غلط قدروں کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا۔ بلکہ وہ زندگی کی نا سد قدروں سے نبرد آزمائی کرتا ہے۔ اس کا کام حیاتِ انسانی کی بگڑی ہوئی قدروں کی اصلاح ہے اور اس سلسلہ میں اگر اسے شکست و ریخت سے بھی کام لینا پڑے تو تخریب روبہ بربنائے تعمیر و اصلاح ہوگا۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ ! پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار ! اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اقبال کے نزدیک حالات و مصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دینا اور قضا و قدر کا عذر پیش کرنا ایک مردِ مومن کا کام نہیں۔ اس قسم کا عذر تو وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو ضعیف الایمان اور کمزور عزم والا دے کے ہیں۔ مردِ مومن خود تقدیرِ الٰہی ہے ؎

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی !

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال نے جب تاریخ عالم پر نگاہ ڈالی تو انھیں نظر آیا کہ مصائب انقلاب ہمیشہ "مردِ مومن" کا رہینِ منت رہا ہے۔ اور وہی اس کا سرچشمہ ہے۔ اس کی مثال اس عالم کے مطلع پر ایک صبح سعادت کی سی ہے۔ وہ انقلاب کا قائد اور زندگی کا پیامبر ہے۔ زندگی کی تاریک راتوں کے لئے گویا وہ صبح صادق کا مؤذن ہے۔ اور اس کی اذان کی آواز عالم کے اس سکوت کو توڑ دیتی ہے۔ جو اپنے اندر رات کی سی خوفناک خاموشی اور موت کا سا بھیانک سکوت رکھتا ہے۔ اور پھر وہ اذان بس تھکی ہاری نیند کی ماری دنیا کو ایک نشاط اور زندگی بخشتی ہے۔ یہ وہی اذان اور بلند پکار ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوئی جس نے اس وسیع کائنات کو ایک گہری نیند سے بیدار کیا جو صدیوں سے مدہوش پڑی تھی اور یہ اذان مردہ انسانیت اور پریشان حال دنیا کے لئے ایک صورِ قیامت ثابت ہوئی اور آج بھی اس اذان میں انسانیت کو جگانے اور ضمیرِ انسانی کو زندہ کرنے کی وہی قوت و طاقت موجود ہے۔ ضرورت صرف اس مردِ مومن کی ہے جو اسی روحِ بلالی سے پکار دے ؎

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق مومن کی اذاں ندائے آفاق

اور ایک مردِ مومن کی اذان ہی اس "سحر" کو نمودار کرے گی جس سے ایک "عالمِ نو" انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوگا ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا!

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

علامہ اقبال اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ایک مردِ مومن کی طاقت و قوت خرقِ عادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی طاقت کے سامنے عقلِ انسانی حیران ہے بلکہ وہ انسان کے لئے ایک معجزہ سے کم نہیں۔ وہ اپنے پیغام اور اپنے ایمان و یقین سے اپنے اندر ایک نئی قوت و توانائی حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور قوت قاہرہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ تو پہاڑ روک سکتا ہے اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔ اقبال ایسے ہی مردِ مومن کے متعلق کہتا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اسلامی قائد فاتح اندلس طارق ابن زیاد اندلس کے میدانِ جنگ میں اپنے پروردگارِ حقیقی کے حضور میں اسلامی فوج کیلئے دعا گو ہیں۔ یہ مجاہدینِ اسلام اقبال کے مردِ مومن کی زندہ تصویریں ہیں۔ ؎

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے — جنہیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

کیا تم نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں

اور صرف یہیں تک نہیں بلکہ اقبال کی نگاہ دُور رس مردِ مومن کی پوشیدہ طاقتوں کا رسا اور گہرائی سے اندازہ کرتی ہے۔ پھر کہتے ہیں ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کے اس قول پر تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں، اور بلاشبہ مومن صادق کی مٹھی بھر جماعت نے دشت و دریا کو دشمن در جگہ اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں اور قدموں سے روند ڈالی اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ اسلامی شہسواروں کے واقعات آج بھی تاریخ کے صفحوں پر اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سعد ابن ابی وقاص۔ خالد بن ولید۔ مثنیٰ ابن حارثہ۔ عقبہ ابن عامر۔ محمد بن قاسم۔ موسیٰ ابن نصیر اور طارق ابن زیاد کے زندہ جاوید کارنامے تاریخ عالم کے مطلع پر ہمیشہ روشن رہیں گے۔ اور اقبال کے قول کی سچی اور اصلی تصویریں ہیں۔

اقبال کے نزدیک عالم میں ایک "مسلم" کی حیثیت ایک عالمی حقیقت کی ہے۔ رنگ و نسل اور وطن و ملک کے جغرافیائی حدود میں اُسے پابند نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ وہ مکان و زمان کے حدود سے متجاوز ہے۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو اپنے خاص انداز میں یوں ادا کیا ہے ؎

اس کی زمیں بے حدود اس کا اُفق بے ثغور — اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب — عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیٔ اربابِ ذوق فارسِ میدانِ شوق — بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل

اقبال کو اس بات پر یقین تھا کہ ایک "مسلم ربانی" کا کوئی محدود وطن نہیں ہے۔ بلکہ سارا عالم اس کا ملک و وطن ہے۔ اس کے یہاں مشرق و مغرب کی کوئی تقسیم نہیں ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے!

اقبال کا یہ خیال تھا کہ چونکہ ساری کائنات خدا کی ہے، ایک "مومن" صرف خدا کا ہے۔ اس لئے یہ ساری دُنیا مومن کا اپنا وطن ہے۔ اس سلسلہ میں طارق ابن زیاد کے اس زریں واقعہ کو جبکہ اس نے اندلس کی سرسبز و شاداب زمین پر قدم رکھا۔ تو ان کشتیوں کو جن پر کہ وہ آیا تھا جلا دینے کا حکم دیا تاکہ پھر واپسی کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے۔ فوج کے کچھ لوگوں کو طارق کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ انہوں نے کہا آپ یہ کیا کرتے ہیں؟ ہمارا وطن یہاں سے دُور ہے اور ہمیں آخر واپس بھی ہونا ہے۔ اس کے جواب میں طارق کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی اس نے "تلوار" اپنے ہاتھ میں لی، اور کہا کہ اب واپسی کا کیا سوال؟ ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے۔ اس لئے کہ یہ ساری کائنات ہمارے خدا کی ہے اور ہم خدا کے ہیں۔ اقبال کی شاعرانہ جولانی اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتی ہے ؎

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم — ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست

خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

ایک "مردِ مومن" مختلف اور متضاد اخلاق و صفات کا حامل ہوتا ہے۔ جو اس کی طبعی رنگا رنگی اور تنوع پسندی کی آئینہ دار ہوتی ہے اور وہ مختلف و متضاد صفات دراصل اللہ تعالیٰ کی صفات و احوال کے مظاہر ہیں۔ ہر ایک "مومن" اللہ تعالیٰ کی اُن صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ مثلاً کثرت وہ قلبی۔ عفو و درگزر اور حلم و بُردباری میں وہ خدا کی صفت "غفار" کا پرتو ہے اور اسی طرح دینِ حق کے بارے میں شدّت کفر و باطل پر غیظ و غضب اس کی صفت "قہار" کا مظہر ہے۔ اور پاکی، پاک دامنی، پاک نفسی صفت قدوس کی آئینہ دار ہے۔ ایک "مسلمان" اپنے دین کا ہو بہو نمونہ اور اسلام کی سچی تصویر اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ ان تمام اخلاق و صفات کا اپنے آپ کو پَرتَو نہ بنالے ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں!

اقبال کہتا ہے۔ ایسے ہی "مردِ مومن" کی مثال اس روشن آفتاب کی سی ہے جس کے لئے غروب نہیں۔ جو ہمیشہ طلوع ہی رہتا ہے۔ اگر ایک طرف غروب ہوا تو دوسری جانب طلوع ہوا ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں ادھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!

اور یہ بات یقیناً سچ ہے تاریخ کے صفحات اس پر شاہد ہیں کہ جب کبھی عالمِ اسلام کے کسی حصّہ پر مسلمانوں ہی کی کمزوریوں کے باعث کوئی افتاد پڑی تو فوراً ہی اس کی تلافی کسی دوسرے حصہ میں ہو گئی۔ اگر اسلام کو دُنیا کے ایک حصہ میں کچھ نقصان پہنچا تو دوسرے حصّہ میں اسے بڑی فتح حاصل ہوئی۔ اسلام کا اگر ایک ستارہ گردش میں آیا تو مطلعِ عالم پر ایک "نیا ستارہ" نمودار ہوا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اندلس کا خاتمہ ملّتِ اسلامیہ کے لئے ایک اندوہناک واقعہ اور عظیم حادثہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی یورپ کے قلب پر حکومتِ ترکیہ کی ایک نئی اسلامی حکومت نمودار ہوئی۔ غرناطہ کا سقوط اور دولتِ عثمانیہ کا عروج یہ دو واقعے ہیں جو ایک ہی زمانے میں واقع ہوئے۔ تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی بھی تاریخِ اسلام کا بڑا افسوسناک حادثہ ہے۔ لیکن اسی زمانے میں ہندوستان کی مسلم حکومت نے ترقی و وسعت اختیار کی اور اس انیسویں صدی کے شروع میں یورپ کے ہاتھوں عالمِ اسلام کو سخت چرکے لگے اور یورپ کی حکومتوں نے حکومتِ ترکیہ کو وراثت کے طور پر تقسیم کر لیا۔ لیکن ساتھ ہی سارا عالم جیسے جاگ اٹھا۔ دینی بیداری عام ہوئی۔ آزادی و حرّیت کا سیاسی شعور پیدا ہوا اور مختلف اسلامی تحریکیں چل پڑیں۔ آج ایسا نظر آ رہا ہے کہ جیسے سارا عالمِ اسلام ایک نئی کروٹ لینے کو ہے۔ دیکھئے پردۂ غیب میں کیا پوشیدہ ہے؟ تاریخِ اسلامی ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اسلام کا آفتاب اگر ایک افق میں چھپتا ہے تو دوسرے اُفق سے اس کی تیز کرنیں نمودار ہوتی ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ اسلام ہی اللہ کا وہ آخری پیغام ہے جو ساری انسانیت کے لئے شمعِ ہدایت ہے اس کے بعد اس عالم کے لئے اب کوئی دوسرا پیام نہیں اور مسلمان اس "پیغام" کی حامل آخری امت ہیں۔ اگر یہ ہلاک اور ضائع ہو گئے تو پھر وہ آخری پیغام ضائع ہو جائے گا اور انسانیت کی کشتی ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے گی!

یہی وجہ ہے کہ اسلام کا وجود اس کائنات میں کفر و باطل کے لئے ہمیشہ "ایک خطرہ" رہا ہے اور اسلام ہی وہ واحد نظامِ زندگی ہے جس کی بقا سارے باطل نظام ہائے حیات کے لئے پیامِ موت ہے۔ کافرانہ نظامِ زندگی اور ابلیس کی خدائی اسی وقت تک جاری ہے جب تک اسلامی نظامِ حیات اُبھر کر سامنے نہیں آ جاتا۔ اور "مردِ مومن" کا کوئی گروہ اس دُنیا میں موجود نہ ہو۔ لیکن جس دن یہ اُمت بیدار ہوئی۔ جس کی خاکستر میں "شرارِ آرزو" پوشیدہ ہے تو پھر ابلیس کی خدائی اور کافرانہ نظامِ حیات نقش بر آب ثابت ہوگا ——
علامہ اقبال نے اپنی بے مثال نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اس حقیقت کی اچھی طرح نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے تمثیلی انداز میں

یہ بات واضح کی ہے کہ آج ابلیسی نظام کو سارا خطرہ و خوف "اسلام" ہی سے ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ اسلام کا آئین چشمِ عالم سے پوشیدہ رہے تو اچھا ہے، کیونکہ اسی میں ہماری بقا ہے اور بسا غنیمت ہے کہ آج خود مومن محروم یقین ہے اور پھر اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ اچھا ہے انہیں الٰہیات اور علم کلام کے مباحث میں الجھائے رکھو تاکہ بساطِ زندگی میں ان کے تمام مہرے مات ہوں اور اسی میں ہماری خیر ہے کہ اس جہان پر اوروں کا قبضہ رہے اور مومن قیامت تک غلام رہے۔ کیونکہ ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

اقبال کی یہ تمثیلی نظم ابلیس کی زبان میں اس حقیقت کی اچھی طرح پر نشان دہی کرتی ہے کہ اس عالم میں "مسلمان" ہی کا وجود کفر و باطل کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہے اور اس کائنات میں پھیلے ہوئے ابلیسی نظام کو اگر کوئی خوف و خطرہ ہے تو وہ صرف "اسلام" سے ہے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باطل پرستوں اور ابلیس کے کارندوں نے اپنی "مسلم دشمنی" کی اس مہم میں کامیابی حاصل کی اور یہ دراصل اسلام اور اس کی آئندہ آنے والی نسلوں کے خلاف ایک منظم سازش تھی۔ ان کی سب سے بڑی کوشش یہی رہی کہ مسلمان نئی نسلوں کے سینوں میں جو ایمان و یقین کی چنگاریاں دبی پڑی ہیں انہیں جس طرح بھی ہو سکے بجھا دیا جائے۔ اور عرب و عجم ہر جگہ ان کی غیرتِ دینی اور جذبۂ اسلامی کو فنا کر دیا جائے۔ کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو ایک "مسلمان" کو ہر قسم کی قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ بڑے سے بڑے مصائب میں بھی اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہوتی۔ بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں اس حقیقت کی طرف خوب نشاندہی کی ہے ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا — روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات — اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج — مُلا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے آسان اور بہتر راستہ ایسا نظامِ تعلیم جاری کرنا تھا جو مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ سے دینی روح، جذبۂ اسلامی اور فکرِ اسلامی کو یکسر ختم کر دے اور ان میں ایسا مادی نقطۂ نظر پیدا کر دے جو انہیں مادی زندگی کا رسیا اور عارضی و فانی زندگی کا دلدادہ بنا دے۔ خود اعتمادی جاتی رہے۔ اور شک و ریب میں مبتلا ہو جائے۔ اکبر مرحوم نے ایسے ہی نظامِ تعلیم کے متعلق کہا تھا ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

اقبال کی نگاہِ حقیقت شناس دیکھتی ہے کہ کفر و باطل اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔ دینی شعور سارے عالم میں کمزور ہو چکا ہے ایمان کی چنگاریاں بجھ چکی ہیں۔ روحِ جہاد جا چکی ہے۔ مادیت اور نفع پرستی کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

ذکرِ عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں — نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات!
قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اقبال کی طبیعتِ حساس کو جب مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا احساس ہوتا ہے تو بے چین ہو جاتا ہے۔ خون کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی شاعری سے خونِ دل و جگر کی تراوش ہوتی ہے۔ اور وہ توحیدِ اسلامی کے اس وارث سے شکوہ سنج ہوتا ہے ؎

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں — گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے — کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

اسی قسم کا شکوہ اور دوسرے مقامات پر بھی کیا گیا ہے ؎

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

اقبال کے نزدیک ان تمام خرابیوں کا سبب مومن کا وہ قلب ہے۔ جس میں ایمان کی جھلک بس کچھ یونہی سی پائی جاتی ہے اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہیں۔ کہتا ہے ؎

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اقبال کی نگاہوں کے سامنے مسلمانوں کی موجودہ حالت و کیفیت عیاں ہے اور وہ اس حالتِ زار پر بے چین و پریشان اور شکوہ سنج بھی ہے لیکن چونکہ اقبال یاس و قنوطیت کا شاعر نہیں بلکہ امید اور آس اور یقین و ایمان کا پیغام دیتا ہے اس لئے وہ مایوس نہیں ہے۔ اسے اس بات پر یقین ہے کہ عالمِ اسلام کو جو سیاسی تھپیڑے لگے ہیں اس نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے اور ان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ اپنی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" میں وہ کہتا ہے ؎

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبال کی نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ مغربی تہذیب نے اپنا پارٹ اب ادا کر دیا ہے۔ اس کی زندگی کے دن اب پورے ہو چکے ہیں۔ اس کے چہرے سے ضعف و اضمحلال کے آثار نمایاں ہیں۔ اس عالم میں اس کا وجود اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ اس کی مثال اس پکے ہوئے پھل کی ہے جو عنقریب ٹوٹ کر گرنے والا ہے۔ اس کی جگہ اب ایک نئی تہذیب لینے والی ہے۔ یہ "عالمِ پیر" مر رہا ہے۔ اور ایک "جہانِ نو" پیدا ہو رہا ہے۔ مگر اقبال کو اس بات پر بھی یقین ہے کہ جب تک اس "جہانِ نو" کی امامت و قیادت مردِ مومن کے ہاتھوں میں نہیں آتی۔ اس وقت تک یہ انسانیت ان فرنگی مقامروں کے ہاتھوں ہلاکت و بربادی سے دوچار ہوتی رہے گی۔ ضرورت ہے کہ مردِ مومن اٹھے اور ایک "جہانِ نو" کے بانی کی حیثیت سے موجودہ بیمار انسانیت کے دکھوں کا مداوا بن کر اسے ایک نئی زندگی اور توانائی عطا کرے ؎

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

اسرار احمد

اسلامی ادب

ہماری زندگی ایک کُل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بہت سے اجزاء و عوامل کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک ادب بھی ہے۔ ہمیں اس جزو کا مقام تلاش کرنا ہے کہ یہ جزو کیا حیثیت رکھتا ہے۔ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ کس طرح پرورش پاتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے تو کیا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ کیا کیا فوائد اور کون کون سے نقصانات وابستہ ہیں۔ اس کے فوائد سے زیادہ سے زیادہ کس طرح مستفید ہونا چاہیے۔ اور اس کے نقصانات سے کیونکر دامن بچانے کی سبیل نکل سکتی ہے۔

ہمارا موضوع سخن اسلامی ادب ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ پہلے ہم خالص ادب کی کوئی جامع تعریف متعین کر لیں۔ پھر اسلامی ادب کے متعلق گفتگو کریں۔

ادب دراصل صورت احساس کی نقش گری کا نام ہے۔ یعنی جذبات و احساسات کو موزوں اور دل آویز الفاظ میں بیان کر دینا ادب ہے۔ ادب تقریر و خطاب کی صورت میں نمودار ہو سکتا ہے۔ شعر و شاعری کے لباس میں جلوہ آرا ہو سکتا ہے۔ ادب نثر نگاری کے مختلف پیرایوں میں نیرنگیاں دکھا سکتا ہے۔ ادب اور ہمارے معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زندگی کی قدروں کو متعین کرنے میں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ جمالیاتی شعور کو جلا دینا اس کا کام ہے۔ جمالیاتی شعور میں توازن۔ زندگی سے ہم آہنگی اور معیاری لطافت پیدا کرنا اس کے ذمہ ہے۔ شعور اخلاقی کو بیدار کرنا۔ اس کی تربیت کر کے پروان چڑھانا اس کی کارگزاری ہے۔ ضمیر کو نفس امارہ پر بالادستی عطا کرنا۔ مذاق سلیم کی جلا اور تزئین اسی کا فرض منصبی ہے۔ تہذیب و تمدن کے معیار کو بلند کرنے کا بھی یہی ذمہ دار ہے یہ ہمارے شعور۔ لاشعور اور تحت الشعور کی تحلیل نفسی کر کے ہمارے کردار کی کمزوریوں کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ ہماری زندگی کے ایک ایک گوشہ میں جھانکتا ہے۔ یہ ہماری خوشیوں کا بھی ساتھی ہے۔ ہمارے غم کا بھی شریک ہے۔ غریب کے جھونپڑے میں بھی پہنچتا ہے اور بادشاہوں کے محلوں کی بھی سیر کرتا ہے۔ ادب دراصل ہمارے دل کی دھڑکن کی لطیف سی آواز ہے۔ جو الفاظ کا خوشنما جامہ پہن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اگر مجموعی حیثیت سے سمجھا جائے تو ادب تہذیب و تمدن کا ایسا جزو ہے جسے نہ نظرانداز کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کا انفکاک ممکن ہے!

ادب چونکہ ہماری زندگی کے ماحول کا عکاس ہے۔ اس لئے ہم یہ بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر معاشرے کا ادب اپنے اندر کچھ نہ کچھ خصوصیات پیدا کر لیتا ہے۔ کچھ روایات ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو اس ادب کے لئے مخصوص ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ماحول کی انفرادیت، روایات کی خصوصیت۔ اعتقادات کی یک رنگی مل کر ایک خاص قسم کا طرز فکر پیدا کر دیتی ہیں۔ طرز فکر کی انفرادیت طرز ادا میں بھی ایک خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے بعض محققین کا یہ دعویٰ کہ تمام دُنیا کا لٹریچر ایک ہی ہے، غلط ہے دُنیوی زندگی کے بنیادی مسائل ایک حد تک یکساں ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان پر غور کرنے کا۔ ان کو حل کرنے کا۔ ان پر عمل کرنے کا۔ ان کے نتائج سے متاثر ہونے کا طریقہ ہر معاشرہ کا اپنا علیحدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں اور ان کے ادبی سرمائے پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسلام ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر مذہب ہے جو زندگی کے پورے اصولوں پر حاوی ہے۔ وہ دین و دُنیا کی زندگی میں

راہبوں اور سنیاسیوں کی طرح فرق نہیں کرتا۔ مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور ادبی زندگی میں وہ کسی قسم کے امتیاز کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتا کہ آپ عبادت میں تو اسلامی توازن کا پورا پورا لحاظ رکھیں۔ مگر ادبی زندگی میں ایسے ادب پاروں کی تخلیق اور اشاعت کریں جو کہ معاشرے کو اخلاقی لحاظ سے تباہ کر کے رکھ دیں۔ اور یہ اسلام پر کیا منحصر ہے آپ جن اصول کو اپنی زندگی میں حتمی طور پر نافذ کریں گے ان کے کچھ اپنے مطالبات ہوں گے۔ اور وہ مطالبات بہر حال آپ کو پورے کرنے پڑیں گے۔ آپ اپنی زندگی بہر حال لاقانونیت کے سپرد نہیں کر سکتے۔ اگر ہماری زندگی پر انارکی مسلط ہو جائے تو شاید سرے سے زندگی ہی باقی نہ رہے۔ اور اگر رہے تو وہ اشرف المخلوقات کی زندگی تو بلاشبہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ارذل المخلوقات کی زندگی ہوگی۔ میرے خیال میں اس قسم کے معاشرے پر کوئی شخص بھی صحت ہوش و حواس راضی نہیں ہو سکتا۔ اور یقینی وہ یہی نتیجہ نکالے گا کہ ہماری زندگی کے لئے کوئی اصول کوئی طریق کار مرتب کرکے ہمارے حقوق و فرائض متعین کرے۔ تاکہ ہم ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے سے جھگڑتے نہ رہیں —— دوسروں کے حقوق ادا کریں۔ اپنے حقوق حاصل کریں۔ اگر کوئی باہمی نزاع پیدا ہو تو اس مجموعۂ قوانین کو قول فیصل بنالیں۔ اور صلح و صفائی سے اس مجموعہ کے ذریعہ اپنے تمام باہمی نزاعات کا تصفیہ کریں!

اسلامی ادب کے موضوعات قرآن کی روشنی میں۔

اسلام نے مسلمانوں کو قدم قدم پر حسنِ سلوک، مہربانی، عفو و درگزر کی تعلیم دی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔

والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین۔

یعنی غصہ کو برداشت کرنے والے اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرنے والے ہیں اور خدا احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے مناسب انتقام کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ ہم خطاکار کو معاف کر دیں۔ اسلام سے پہلے عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ ذرا ذرا سی خطا کا زبردست انتقام لیتے تھے۔ جاہلیت کے خطیبوں اور شعراء عربوں کا یہ اہم ترین فرض تھا کہ اپنے قبیلہ کو انتقام لینے پر اکساتے رہیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ خطا کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کے احکام نے ان کی اس پرانی عادت کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اور انسان کی جان کو سب سے زیادہ محترم مقام دیا۔

اسلام کا یہ اصول اور طریق کار ہے کہ جس گناہ سے جس قدر زیادہ لذت نفسانی حاصل ہوتی ہے۔ اس کو اتنی ہی سختی سے روکنے کا اہتمام کیا ہے۔ اور اتنی ہی سخت سزا تجویز کی ہے بلکہ اس بارے میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ ان تمام راستوں کو بند کر دیا ہے جو کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس فعل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً زناکاری سے روکنا مقصود ہے تو عورتوں کو غیر مردوں سے آزادانہ اختلاط کی ممانعت ہے۔ رقص و سرود اور استعمال مسکرات کے لئے سخت قدغن ہے۔ سن بلوغ کے بعد شادی کرنے کے استحباب کے احکام ہیں غرضکہ انتہائی کوشش اس امر کی گئی ہے کہ یہ لعنت کسی معاشرے کو اپنی گرفت میں نہ لے سکے!

لیکن اس کے برخلاف آجکل ہمارے معاشرے کا یہ حال ہے کہ ہم ہر ممکن طریقہ سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہماری نسلوں میں زیادہ سے زیادہ بداخلاقی اور بدچلنی پھیلے۔ سینما دن رات بداخلاقی، عریانی اور فحاشی کی اشاعت کر رہے ہیں۔ ان کے مکالمے، کہانیاں، گیت۔ سب آوارگی کا سبق دے رہے ہیں۔ شاعر و ادیب کے دل میں اگر خدا کا خوف باقی نہ رہے تو یہ لوگ وہ گل کھلاتے ہیں کہ غیرت و حمیت ان کی تاب نہیں لا سکتی۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کا صرف یہی فرض نہیں ہے کہ وہ خدا کا خوف دل میں رکھیں اور اسلام کے قوانین پر عمل پیرا ہوں بلکہ ان پر یہ فرض بھی عائد کیا گیا ہے کہ وہ تمام عالم کو پیام حق سنائیں۔ بھلائی کرنے کی ترغیب لوگوں کو دیں اور برائی سے روکنے کی

کوشش کریں۔ یہاں بھلائی، برائی، نیکی و بدی کا معیار وہی ہوگا جو قرآن نے مقرر کیا ہے!

خداوند تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے کہ ہم نے تم کو ایک ہی نفس سے بنایا ہے۔ اس لئے تمہارے درمیان انسان کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ "ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ" - اگر دنیا میں کوئی فرق پیدا ہو گیا ہے تو وہ انسان کا خود اپنا پیدا کیا ہوا ہے۔ کوئی شریف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسروں کو رذیل سمجھتا ہے۔ کوئی کالے گورے کا امتیاز لئے بیٹھا ہے تو یہ سب انسان کی خود بینی کی فتنہ کاریاں ہیں۔ خدا کا فرمان تو صاف ہے کہ تم سب آدم کی اولاد ہو۔ اس لئے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ البتہ اگر کسی لحاظ سے فوقیت ہو سکتی ہے تو وہ زہد و تقویٰ کا لحاظ ہے۔ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" یعنی تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔ اس معیار کے علاوہ تمام دوسرے بزرگی و برتری کے معیار ہیچ ہیں اور ان کی خدا کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اس معیارِ قرآن کے علاوہ بزرگی و برتری کا دعویٰ کرتا ہے تو ہمیں اس کا دعویٰ ہرگز تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اس کی مذمت کرنی چاہیئے۔ اور اس پر برملا واضح کر دینا چاہیئے کہ تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں ہمیں بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے!

خداوند تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے کہ اگر کسی قوم یا اس کے افراد کے اعمال صالح ہوں گے تو ان کو دنیا میں بھی فلاح و بہبود نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی سرخ روئی حاصل ہوگی۔ لیکن اگر وہ بداعمالی پر اتر آئے۔ فسق و فجور میں پڑ گئے، خدا کی نافرمانی کرنے لگے۔ حلال و حرام کی تمیز اٹھا دی تو دونوں جہان کی ذلتیں ان کے لئے مقدر کر دی جائیں گی۔ اس سلسلہ میں فرمایا ہے:-

"ان الارض یرثھا عبادی الصالحون" یعنی زمین کی خلافت ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو خاص صفات سے موصوف زندگی گزارتے ہیں!

پست ہمت، جاہل، نفس آسان لوگ خلافت فی الارض کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے — اس لئے ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم امت کو پستی سے نکالنے کے لئے، اور اس کو صلاحیت کے معیار پر لانے کے لئے انتہائی کوشش کریں۔ اس لئے کہ ذلت کی زندگی زیادہ عرصہ تک ذلت کی حالت میں بھی قائم نہیں رہ سکتی - بلکہ بہت جلدی معدوم ہی ہو جاتی ہے۔ ذلیل اور پست افراد و اقوام کا دنیا خود ہی مصلحتاً نام و نشان مٹا دیتی ہے۔ کتنی پست اقوام اور کتنے پست نظریات جو اپنے زمانے میں بلا شرکت غیرے دنیا پر حاوی تھے۔ آج معدوم ہیں یا آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ اس لئے اگر زندگی درکار ہے تو قوی بازو، بلند ہمت، اور اعلیٰ کردار کے مالک بن کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ معدوم ہونے کے لئے تیار ہو جائیے!

قرآن شریف میں ایک اور مقام پر مومنین کا کردار کچھ اس قسم کے الفاظ میں بیان کیا ہے کہ مومن ناحق کسی کی جان نہیں لیتے - اور نہ بدکاری کرتے ہیں اور نہ جھوٹی گواہی دیتے ہیں اور جب کسی بیہودہ مشغلہ کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزر جاتے ہیں - ایک مسلمان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ان قدروں کو جو ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں اجاگر کرے اور ان کے مخالف جو قدریں ابھریں ان کی مخالفت کرے۔

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں میں دلیری اور شجاعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے بڑے مذاہب نے قوت و جبروت کو ایک بری چیز سمجھ کر اس کے استیصال کی کوشش کی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے قوت کا حاصل کرنا بقائے ملت کیلئے ناگزیر ہے۔ اس قوت کو حق کی مدد اور باطل کے مٹانے کے لئے استعمال کرنا چاہیئے - اگر قوت نہ ہوگی تو باطل کی قوتوں کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکیگا - اور نہ اسلام کا مقدس فریضۂ جہاد کامیابی کے ساتھ ادا کیا جا سکیگا - چنانچہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر قوت جمع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاکہ ناگہانی طور پر ضرورت آ پڑنے سے مسلمانوں کے

ہاتھ پیر پھول نہ جائیں۔ ایک جگہ فرمایا ہے "اپنا زور، قوت اور گھوڑے تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور دوسرے لوگوں کو جنہیں تم نہیں جانتے ہو مرعوب کر سکو" بزدلوں کی کئی جگہ سخت مذمت کی ہے۔ فرمایا ہے "اے ایمان والو! جب تم میدان جنگ میں کافروں سے مقابلہ کرو تو ان کو ہرگز پیٹھ نہ دکھاؤ، اور جو اس دن پیٹھ دکھائے گا سوائے اس کے کہ وہ لڑائی کا کوئی داؤ کرتا ہو تو وہ اللہ کے غضب کا مستحق ہوا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے"۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے "جب خطرے کا وقت آتا ہے تو ذرا ان بزدلوں کی حالت دیکھا کرو کہ کس طرح تمہاری طرف وحشت زدہ ہو ہو کر دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی وہ کیفیت ہوتی ہے جیسے ان پر موت کی غشی طاری ہو رہی ہو"۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے "اللہ نے مومنوں کی جان اور مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے"۔

قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات نظر آتی ہیں جن میں ہمارے کردار کی باریک کمزوریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے، اور ان سے ہمیں روکنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً "اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ شاید کہ فریق ثانی تم سے بہتر ہو۔ اور کسی کو طعنہ نہ دو اور برے القاب سے یاد نہ کرو۔ اے ایمان والو، ظن و تخمین کی زیادتی سے بچو۔ بعض دفعہ ظن گناہ ہوتا ہے اور کان مت لگاؤ اور غیبت نہ کیا کرو" وغیرہ اس قسم کی بہت سی آیات نکالی جا سکتی ہیں جن میں مسلمانوں کو اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ یہاں چند بطور مثال کے عرض کر دی گئی ہیں۔ آپ کو آیات کے ان تراجم سے تھوڑا سا یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا کہ قرآن اور اسلام ایک مسلمان کے کردار سے کیا کیا توقعات وابستہ رکھتا ہے۔ مسلمان کے کردار کی بلندی و پستی کے تولنے کا معیار کیا ہے۔ کون کون سے جذبات و خیالات ایسے ہیں جن کو اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرے میں رواج دینا چاہیئے۔ اور وہ کون کون سی کردار کی کمزوریاں ہیں جن سے انسانی کردار کو عموماً اور مسلمانی کردار کو خصوصاً محفوظ رکھنا چاہیئے۔ میں نے مندرجہ بالا آیات سے حق و باطل، نیک و بد، کی اسلامی حدود متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام پسند ادیب اسی قسم کی قدروں کو اجاگر کرتے رہے ہیں۔ اب بھی کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

ہمارے زمانے کی اسلام پسند ادیبوں کی تحریک بھی اپنا یہی مقصد رکھتی ہے کہ تمام و کمال قرآن کے دیئے ہوئے نقشہ پر معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کرے، اور قرآن کی عطا کردہ اخلاقی و معاشرتی اقدار کو ابھارے اور اس کے مخالف عناصر کو دبانے کی کوشش کرے۔ یہاں اسلامی ادب کے صف اول کے ترجمان جناب نعیم صدیقی صاحب کے چند جملے جو انہوں نے اسلامی ادب کا مقصد اور معیار بیان کرتے ہوئے سپرد قلم کئے ہیں، نقل توں کے طور پر پیش کر دینا بیجا نہ ہوگا۔ نعیم صاحب فرماتے ہیں:-

"ہم اسلام کو ایک زندگی گیر انقلابی اصول، ایک عالمگیر تحریک اصلاح اور ایک دوامی نظام حیات سمجھتے ہیں۔ ہر انقلابی اصول، تحریک اصلاح اور نظام حیات اپنا پیغام دینے کیلئے شعر و ادب کی زبان تلاش کرتا ہے۔ یک شعوری مسلمان کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ عقائد و اخلاق میں اسلام کو اختیار کر کے شعر و ادب میں کسی غیر اسلامی نظریہ کو اپنا سکے۔ اسلامی شعر و ادب وہ ہے جس میں زندگی کے وہ اصل سمو دیئے گئے ہوں جن کو اسلام نے انسانیت کیلئے موجب فلاح شمار کیا ہو۔ اسلامی شعر و ادب وہ ہے جس میں انسانی سیرت و کردار کے ان نمونوں کو ابھارا گیا ہو جن کو قرآن نے "انسان مطلوب" کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہمیں ایک معیار دیا ہے۔ اسلامی شعر و ادب وہ ہے جو اسلام کی حیاتی قدروں کی طرف دعوت دے اور اخلاق کی غیر اسلامی قدروں سے دور ہٹانے کی کوشش کرے"!

میں نے اس مختصر سے مضمون میں یہ کوشش کی ہے کہ اسلامی ادب کا جو خاکہ میرے ذہن میں تھا اس کو آپ حضرات کے سامنے پیش کر دوں۔ گو یہ انتہائی نامکمل سی کوشش ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس نے ایک دھندلا سا خاکہ اسلامی ادب کے مفہوم کا آپ کے ذہن میں ضرور تیار کر دیا ہوگا۔

(حلقۂ ادب اسلامی گوجرانوالہ میں پڑھا گیا۔)

ادارۂ "فاران"

مولانا ابوالکلام آزاد کے "ترجمۂ قرآن"

کی

چند جھلکیاں

اس دنیا میں کچھ ایسے ذہین افراد بھی پائے جاتے ہیں، جنہوں نے بعض شخصیتوں کے بُت اپنے دل و دماغ میں بٹھا لئے ہیں اور جو ان (بزعم خویش معصوم) شخصیتوں پر کسی عنوان تنقید گوارا ہی نہیں کر سکتے۔ کسی کی ذات سے محبت اور عقیدت کوئی غیر مستحسن چیز نہیں ہے مگر اس عقیدت و نیازمندی کی لے یہاں تک تو بڑھنی نہیں چاہیئے کہ، خلاق و شائستگی کی تمام حدیں توڑ کر اپنے کسی "مخفیدات پناہ" کے ناقد پر، صرف یہ کہ جوٹیں کی جائیں بلکہ اسے بے نقط گالیاں سنائی جائیں اور اس پر طرح طرح کے بہتان تراشے جائیں!

مولانا ابوالکلام آزاد کی "عربی دانی" کے سلسلہ میں "فاران" میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا ایک قول نقل کیا گیا تھا۔ اس پر لاہور کے ایک ہفت روزہ اخبار نے میری ذات پر سب و شتم کی جو بوچھاڑ کی ہے اس کو پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی! حیرت اس پر کہ کسی صحافت نگار کے قلم سے اس قسم کے رکیک جملے کس طرح نکلے؟ اور افسوس اس کا کہ لکھنے والے نے خدا اور بندوں کے سامنے اپنی ذمہ داری کا کوئی احساس ہی نہیں کیا!

پھر ذکر مولانا ابوالکلام آزاد کی "عربی دانی" کا تھا۔ اُن کے "کردار" اور اُن کی "زندگی" پر ایک حرف بھی نہیں کہا گیا تھا۔ مگر مولانا آزاد کے اس حاشیہ بردار نے علمی اور ادبی بحث سے گریز کر کے میری زندگی اور ذات پر بہت کچھ لے دے کی ہے! نہ معلوم کس خوف اور اندیشے کے سبب یہ "پیش بندی" کی گئی ہے اور یہ پانی ہر مرتبہ دکھائی دے رہا ہے۔

گو جرانوالہ کے "الاعتصام" میں بھی کئی قسطوں میں ایک مقالہ شائع ہو رہا ہے۔ جس میں بعض غیر متعلق باتوں کو درمیان میں لا کر اس بحث کو خواہ مخواہ اُلجھا دیا گیا ہے۔ مجھ ہیچمداں کا یہ مُنہ نہیں ہے جو میں مولانا آزاد کی "عربی دانی" کے بارے میں ایک حرف بھی زبان سے نکال سکوں۔ میں نے تو مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا ایک قول نقل کر دیا تھا۔ تو اس قول کے نقل کرنے کی بنا پر مجھے بے علم و کم سواد ٹھہرانے کی جو سعی فرمائی گئی ہے۔ وہ اپنی جگہ چاہے کتنی ہی حقیقت سے قریب ہو۔ مگر اس بحث سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اہلِ علم کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ اصل بحث سے ہٹ کر غیر متعلق باتوں کا ذکر چھیڑیں!

اگر اظہارِ واقعہ میں میری طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مجھے سزا دے گا، اور اگر دوسروں نے زیادتی کی ہے اور وہ جوشِ انتقام میں عدل و حق شناسی کی حدود سے آگے نکل گئے ہیں تو میں اپنے اور ان کے معاملے کو اللہ پر چھوڑتا ہوں!

مولانا ابوالکلام آزاد کی غیر معمولی ذہانت، بلند پایہ خطابت اور مثالی انشاپردازی اپنی جگہ مسلّم ہے مگر یہ جو

اُن کی "عربی دانی" کا چار دانگ عالم میں اس شدّت سے پروپیگنڈا کیا گیا ہے جیسے وہ اپنے وقت کے "زمخشری" ہیں — تو اس شہرت کے اعتبار سے مولانا مسعود عالم ندوی نے اُن کی "عربی دانی" کے بارے میں اظہار خیال کیا تھا۔ اور ہاں! ایک بات تو رہی جاتی ہے جو میں نے اس وقت نہیں کہی تھی مگر اب اسے دُہراتا ہوں ——— وہ یہ کہ جب اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد اسلامی ممالک کے دورے پر جانے والے ہیں تو مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے پیش گوئی کی تھی کہ مولانا آزاد مصر جانے سے گریز کریں گے۔

ہندوستان میں اکثر و بیشتر ایسے علماء پائے جاتے ہیں جن کو عربی بولنے اور لکھنے کی مشق نہیں ہے۔ اگرچہ وہ قرآن کے مفسر اور احادیث کے شارح بھی ہیں، اور دوسرے اسلامی علوم میں بھی بصیرت رکھتے ہیں۔ ان حضرات سے عربی عبارت کے ترجمہ کی غلطیاں بھی ہوتی ہیں مگر ان کی یہ غلطیاں اس لئے زیادہ قابل گرفت نہیں ہیں کہ ان کی "عربی دانی" کی کوئی شہرت نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی "عربی دانی" کی غیر معمولی شہرت ہے اور ان کے عقیدت مند اُن کو کم سے کم علامہ رشید رضا اور امیر شکیب ارسلان کے درجہ کا "عربی داں" ضرور سمجھتے ہیں۔

ایک مثال :۔ کسی شخص کی "فارسی دانی" کی غیر معمولی شہرت ہے۔ اب اگر وہ شخص "مرغزار" کو "مرغ زار" بولتا ہے اور "شمع رابکش" کا ترجمہ "شمع کو مار ڈال" کرتا ہے تو کہا جائیگا کہ یہ شخص فارسی نہیں جانتا۔ اسی طرح ایک وہ شخص جو عربی میں عبارت نا مدر رکھتا ہے وہ "یامر" اور "یحکم" کے معنوی فرق سے ضرور واقف ہوگا اور ترجمہ میں "فیصلہ کرنے" اور "حکم دینے" کے فرق کو ضرور ملحوظ رکھے گا!

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تنقید و احتساب میں بڑی احتیاط اور ذمہ داری کا لحاظ رکھتے تھے۔ اُن کی تنقید بڑی وزنی ہوتی تھی۔ انہوں نے جس بنیاد پر مولانا آزاد کی "عربی دانی" کا ذکر فرمایا تھا۔ اس کے ثبوت میں یہ مضمون حاضر ہے!

(ماہر القادری)

مولانا محمد حنیف صاحب ندوی نے "دار العروبہ کا عجیب و غریب انکشاف۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو عربی نہیں آتی" کے عنوان سے ایک لمبا چوڑا مضمون "الاعتصام" میں لکھا تھا۔ اور نہایت ہی شستہ اور مہذب زبان ؟ میں جماعت اسلامی، مولانا مودودی، دار العروبہ، تفہیم القرآن وغیرہ کی خبر لی تھی۔ جس کی داد نہ دینا قطعی مولانا کی حق تلفی ہے۔ مولانا کی ذات گرامی سے اس سے کم مہذب اور شستہ زبان کی امید بھی نہیں تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی "عربی دانی" کے سلسلہ میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے جو کچھ بھی اظہار خیال فرمایا۔ اس کے ذمہ دار وہ خود تھے۔ مگر ذات بڑی جماعت اسلامی پر اور ملتے ملے اس کے تمام ارکان کو! اللہ کا شکر ہے جماعت اسلامی اس سے بلند و برتر ہے کہ وہ کسی شخصیت کو، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، اپنا حریف سمجھے اور اپنی کتابوں کی اشاعت بڑھانے کیلئے اسے گرانے اور نیچا دکھانے کی کوشش کرے اور نہ دار العروبہ کے قائم ہونے کا یہ مقصد ہے کہ وہ لوگوں کی عربی دانی اور علم و فضل کو جانچے، اور انہیں بدنام کرنے کی کوشش کرے ——— جیسا کہ مولانا محمد حنیف صاحب نے خود سمجھا ہے اور عام پڑھنے والوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جماعت اسلامی کا کوئی رکن اگر کوئی ایسی رائے ظاہر کرتا ہے جو آپ کے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ تو اسے پوری جماعت کی رائے اور مسلک سمجھ کر پوری جماعت کو ہدف بنا لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کے ارکان ایک واضح اور معروف مقصد پر جمع ہوئے ہیں۔ جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے

سب ایک ہیں اور مل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمام ارکان اپنی ذاتی رائے رکھنے میں خود مختار ہیں اور کسی ایک کی رائے کی ذمہ داری پوری جماعت پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ "چراغ راہ" اور "فاران" میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے جو رائے ظاہر کی تھی۔ وہ اُن کی اپنی رائے تھی۔ اور اس کی ذمہ داری خود اُن ہی پر تھی۔ باقی رہا یہ کہ مدیر چراغ راہ نے مولانا مسعود عالم صاحب کی اس تحریر پر نوٹ نہیں دیا۔ جس میں انہوں نے مولانا ابو الکلام آزاد کی عربی پر اپنی رائے ظاہر کی تھی۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ اگر مدیر چراغ راہ نوٹ دے دیتے تو کیا جماعتی طور پر اس کی تردید ہو جاتی؟ اور اگر خود مدیر چراغ راہ بھی مولانا مسعود عالم صاحب ندوی سے متفق ہوں۔ تو کیا یہ جرم ہے۔ اور اس کی ذمہ داری پوری جماعت اسلامی عائد ہوتی ہے؟

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم نے فاران اور چراغ راہ میں مولانا آزاد کی عربی دانی کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی۔ وہ انہوں نے نہایت سوچ سمجھ کر قائم کی تھی اور بہت عرصہ پہلے سے قائم کی تھی۔ اگر اُن کا مقصد خدانخواستہ مولانا آزاد کو اپنا حریف سمجھتے ہوئے بدنام کرنا اور انھیں نیچا دکھلانے کی کوشش کرنا ہوتا۔ جیسا کہ مولانا محمد حنیف صاحب نے عام پڑھنے والوں کے ذہن میں مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تو وہ اس کا اظہار بلکہ اعلان بہت عرصہ پہلے کر چکے ہوتے۔ اور کسی دوسرے طریقے سے! مرحوم نے اگر کبھی اس رائے کا اظہار کیا بھی ہے، تو اپنی خالص نجی مجلسوں میں اور وہ بھی احباب کے شدید اصرار و استفسار پر!

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی بلاشبہ سید صاحب مرحوم کو ہندوستان و پاکستان اور عالم اسلام کے تمام علماء سے زیادہ ہمہ گیر سمجھتے تھے۔ یہ اُن کی رائے تھی جس کے رکھنے کا بہرحال انھیں حق تھا۔ سید صاحب کی ہمہ گیری کا ذکر کرتے ہوئے اگر انہوں نے مولانا ابو الکلام آزاد۔ سید رشید رضا اور امیر شکیب ارسلان کا ذکر کر دیا ہے تو اس کا ہرگز ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ ان حضرات کو بدنام کرنا چاہتے تھے۔ یا ان کو کسی حیثیت سے اپنا یا جماعت اسلامی کا حریف سمجھتے تھے۔ ان حضرات کا تذکرہ اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ ان حضرات کی علمی برتری اور ہمہ گیری بہرحال مسلّم ہے۔ لیکن سید صاحب مرحوم کی ہمہ گیری ان سے بھی زیادہ تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جن جن پہلوؤں سے ان حضرات کا سید صاحب مرحوم سے تقابل کیا گیا ہے۔ وہ ان میں بالکل کورے اور نابلد تھے یا ہیں۔ مولانا محمد حنیف صاحب کو غالباً یہی غلط فہمی ہوئی ہے!

جہاں تک مولانا آزاد کی قابلیت، ذہانت، انشاء اور زور بیان کا تعلق ہے۔ مولانا مسعود عالم صاحب اس کے حد درجہ معترف تھے۔ بلکہ اس حیثیت سے وہ مولانا آزاد کے کسی غالی معتقد سے پیچھے نہ تھے۔ مولانا آزاد کی تفسیر کا جو نسخہ اُن کے پاس تھا۔ اس پر اُن کے اپنے قلم کی یہ لکھی ہوئی تحریر آج بھی موجود ہے۔ "مؤلف کی عظمت، ذہنی و دماغی عبقریت کا معترف و معتقد۔ مسعود عالم ندوی میاں الصیار" لیکن بہرحال وہ مولانا آزاد کو تمام پہلوؤں سے مرد کامل نہ سمجھتے تھے۔ اور ان کی زندگی کے چند کمزور پہلوؤں میں اُن کی عربی دانی کا پہلو بھی اُن کے سامنے تھا۔ اگر اُردو تحریر میں موٹے موٹے الفاظ، مسجع عبارتیں اور ترکیبیں اور جا بجا عربی اشعار لے آنا کسی آدمی کے عربی زبان میں کامل و ماہر ہونے کی دلیل ہوتا۔ تو بےشک مولانا ابو الکلام آزاد ہندوستان و پاکستان کے سب سے بڑے عربی دان اور ادیب و انشاء پرداز ہوتے۔ لیکن مولانا مسعود عالم ندوی سمجھتے تھے کہ اُردو تحریر میں عربی کے بڑے بڑے الفاظ لے آنا اور چیز ہے اور خود عربی میں ماہر و کامل ہونا دوسری چیز ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی اُردو بھی خوب جانتے تھے اور عربی کا بھی نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اگر یہ چیز ہمارے مولانا محمد حنیف صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی۔ تو ہم بہرحال انھیں معذور سمجھتے ہیں۔ ہر انسان کا

سلہ اور ان میں بھی دو تین شعر ایسے ہیں جن کو مولانا آزاد نے بار بار اپنی تحریروں میں دہرایا ہے!

اپنا اپنا ایک دائرۂ عمل ہوتا ہے جس سے باہر نکل کر دوسرے غیر متعلق امور میں دخل دینا اس کے لئے کسی طرح صحیح نہیں ہوتا۔ اگر معاملہ اُردو یا پنجابی زبان کا ہوتا تو شاید ہم مولانا محمد حنیف صاحب کی رائے کو بھی تسلیم کر لیتے یا اسے مولانا مسعود عالم ندوی کی رائے پر ترجیح دیتے!

ہمیں یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی عربی دانی پر بحث نہیں کرنا ہے۔ اس بارے میں ان ہی لوگوں کی رائے قابل قبول ہونی چاہئے۔ جو ایک طرف مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی سمجھتے ہیں اور دوسری طرف عربی زبان میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اور ایسے اہل نظر کی اس ملک میں کمی نہیں ہے۔ ہم صرف ذیل میں مولانا آزاد کی تفسیر کے حصۂ اوّل میں سے چند ایسے مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جو ہم جیسے کم علم لوگوں کی نظر میں بھی کھٹکتے ہیں۔ اگر مولانا محمد حنیف صاحب یا ان کے علاوہ کوئی دوسرے صاحب ان کی صحیح توجیہ فرما سکیں۔ تو ہم صدر جہ ممنون ہوں گے۔ واضح رہے کہ اس جگہ ہم صرف ان چند مقامات کی نشاندہی کریں گے (اور وہ بھی صرف حصۂ اوّل میں سے) جو زبان کے لحاظ سے ہمیں کھٹکتے ہیں۔ باقی رہے وہ متعدد مقامات جن میں انہوں نے متحدہ قومیت یا وحدتِ ادیان جیسے نظریوں کا اظہار فرمایا ہے۔ اس کا ذکر ہم چھیڑنا نہیں چاہتے۔ کہ وہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔ وبیدہ اللہ التوفیق!

۱۔ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ۔ (بقرہ۔ ۳)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "اور ہم نے جو کچھ روزی انھیں دے رکھی ہے، اسے نیکی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں"

یہاں پر "مِمَّا" کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

۲۔ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ۔ (بقرہ۔ ۱۶)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "اور نہ ہدایت ہی پر قائم رہے"

صحیح ترجمہ:۔ اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے یعنی انہوں نے سرے سے ہدایت ہی نہ پائی نہ یہ کہ وہ اس پر قائم نہ رہے۔

۳۔ وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ۔ (بقرہ۔ ۵۷)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "تم نے (اپنی ناشکریوں سے) ہمارا کیا بگاڑا، خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے"

حالانکہ صیغہ غائب کا ہے۔

۴۔ اَلَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ۔ (بقرہ۔ ۱۵)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "اہلِ کتاب میں جو لوگ ایسے ہیں جو کتاب الٰہی کی ٹھیک ٹھیک تلاوت کرتے ہیں"

صحیح ترجمہ:۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی۔ وہ اس کی ٹھیک ٹھیک تلاوت کرتے ہیں۔

۵۔ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ۔ (بقرہ۔ ۱۷۷)

ترجمہ مولانا آزاد: "تنگی و مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت لیکن ہر حال میں صبر کرنے والے"

یعنی مولانا آزاد نے "حِينَ الْبَأْسِ" کا ترجمہ "خوف و ہراس کا وقت" کیا ہے۔ حالانکہ "بأس" کے معنی جنگ کے ہیں اور "حِينَ الْبَأْسِ" کا ترجمہ ہے "جنگ کا وقت"۔

۶۔ وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ۔ (بقرہ۔ ۲۸۲)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا جب تک میعاد باقی ہے۔ دستاویز لکھنے میں کاہلی نہ کرو"

صحیح ترجمہ:۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اسے میعاد تک یعنی میعاد کے تعین کے ساتھ۔ لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔

۷۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ۔ (آل عمران۔ ۴۵)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "اور (پھر) جب ایسا ہوا کہ فرشتوں نے کہا: "اے مریم! اللہ تجھے اپنے کلام کے ذریعہ (ایک لڑکے کی) بشارت دیتا ہے!"

مولانا نے "بِکَلِمَۃٍ" کا ترجمہ "اپنے کلام کے ذریعہ" کیا ہے۔ حالانکہ یہاں "ب" "یُبَشِّرُکِ" کا صلہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ "اللہ تجھے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے"۔

۸۔ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ۔ (آل عمران۔ ۱۰۸)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں فی الحقیقت سناتے ہیں"۔

یعنی "بالحق" کا ترجمہ "فی الحقیقت" کیا گیا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ "بالحق" کا مطلب ہے "حق کے ساتھ" یعنی بالکل ٹھیک ٹھیک۔

۹۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا۔ (آل عمران۔ ۱۵۴)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "پھر (دیکھو) ایسا ہوا کہ اللہ نے (ہزیمت و پریشانی کے) غم و افسوس کے بعد تم پر بے خوفی کی خود فراموشی طاری کر دی"۔

یعنی "نُعَاس" کا ترجمہ مولانا نے "خود فراموشی" کیا ہے۔ حالانکہ اس کے معنی "اونگھ" کے ہیں۔ تاویل کرتے وقت مولانا نے لفظ کے اصل معنی کو بھی باقی نہ رکھا۔

۱۰۔ وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ ۔۔۔۔۔ (النساء۔ ۷۵)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "اور (مسلمانو) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے۔ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم و تشدد سے عاجز آکر) فریاد کر رہے ہیں۔ خدایا ۔۔۔۔۔"

یعنی اس جگہ "وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ الخ" کو حال لیا ہے۔ حالانکہ اگر یہ فقرہ حال ہوتا تو ایک تو یہ مستقل جملہ ہوتا اور دوسرے والمستضعفین مرفوع یعنی والمستضعفون ہوتا۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔ کہ "اور (مسلمانو) تمہیں کیا ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کے (بچانے) کے لئے جنگ نہیں کرتے جو ۔۔۔۔۔"

۱۱۔ لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْھَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ۔ (النساء۔ ۱۶۶)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "(اے پیغمبر! اگر یہ لوگ تمہاری سچائی سے انکار کرتے ہیں۔ تو انکار کریں) لیکن اللہ نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے۔ وہ اسے نازل کرکے (تمہاری سچائی کی) گواہی دیتا ہے۔

حالانکہ آیت کا واضح مطلب یہ ہے کہ "اللہ اس چیز کی گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے۔ اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے۔

۱۲۔ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ (المائدۃ۔ ۳)

ترجمہ مولانا آزاد:۔ "اور یہ بات بھی کہ (کسی جانور کا گوشت یا کوئی چیز بطور جوئے کے) تیروں کے پانسوں سے آپس میں تقسیم کرو"

یعنی "تَسْتَقْسِمُوْا" کے معنی مولانا ابوالکلام صاحب نے "تقسیم کرنے" کے لئے ہیں۔ حالانکہ اس کے معنی ہیں "قسمت معلوم کرنا"۔

تیروں کے ذریعے تقسیم کیا ہو گی؟ اگر کہا جائے کہ یہ تاویل ہے تو یہ بہت ہی دُور کی تاویل ہے۔ جو کسی نے اختیار نہیں کی۔

۱۳ - وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ - (المائدۃ - ۱۳)

ترجمہ مولانا آزاد: "جس بات کی انہیں نصیحت کی گئی تھی۔ اس سے کچھ بھی فائدہ اُٹھانا اُن کے حصہ میں نہ آیا۔"

معلوم نہیں یہ ترجمہ مولانا نے کس طرح ([illegible]) میں اکر کر دیا۔ حالانکہ اس کا بالکل واضح اور صاف مطلب ہے۔ "جس بات کی انہیں نصیحت کی گئی تھی اس کا ایک (بڑا) حصہ وہ بھول گئے۔"

۱۴ - وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (المائدۃ - ۴۴-۴۵-۴۷)

ترجمہ مولانا آزاد: "جو کوئی خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق حکم نہ دے۔"

یعنی مولانا نے "حَكَمَ يَحْكُمُ" کا ترجمہ اُردو کا "حکم کرنا" کیا ہے۔ حالانکہ عربی میں حَكَمَ يَحْكُمُ کے معنی ہیں فیصلہ کرنا یعنی جو اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کرے۔

۱۵ - أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ (المائدۃ - ۵۰)

ترجمہ مولانا آزاد: "کیا جاہلیت کے عہد کا سا حکم چاہتے ہیں؟"

یہاں بھی "حُكْم" کا ترجمہ مولانا نے اُردو کا "حکم" ہی کیا ہے۔

۱۶ - وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوقِنُونَ (المائدہ - ۵۰)

ترجمہ مولانا آزاد: "اللہ سے بہتر حکم دینے والا کون ہو سکتا ہے؟"

یہاں بھی "حکم" کا ترجمہ اُردو کا "حکم دینا" ہی ہے۔

۱۷ - إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ - (الانعام - ۱۳۵)

ترجمہ مولانا آزاد: "یقیناً خدا ظلم کرنے والوں کو کبھی کامیاب نہیں کرے گا۔"

مولانا کو یہاں ضمیر شان سے دھوکا ہوا ہے اور انہوں نے "أفلح يُفلح" کو متعدی سمجھا ہے۔ حالانکہ یہ بھی نہیں دیکھا کہ آگے "الظالمین" نہیں "الظالمون" ہے۔ آیت کا صحیح ترجمہ ہے:

"یقیناً ظلم کرنے والے کامیاب نہیں ہوں گے۔"

شوق کھنڈوی

بگولے

ہوا کے دوش پہ اٹھ جانے پھولوں کے
جو دیدہ زیب بھی ہیں اور مشکبار بھی ہیں
سیاہ پوش کیا ہے ستم شعار دں کو
حقیقتوں کے تصور پہ ڈال کر جلباب
سحر کے جلوے اندھیروں کی پاسبانی میں
تلاطموں کو کنارے سبق پڑھاتے ہیں
صنم کدوں میں ہوئے رہن منبر و محراب
ہوا کے رحم و کرم پر چراغ روشن ہیں
بھڑک اٹھے ہیں تنگوں کے سلگتے ہیں گلاب
قدم قدم پہ نئے خار زار ملتے ہیں

چمن پہ کس قدر احسان ہیں بگولوں کے
وہی شگوفے گلستاں میں دلفگار بھی ہیں
قرار پھر بھی نہ آیا فریب کاروں کو
ہوس پرستوں نے پیدا کئے ہیں سو گرداب
ہوس کا زور حقیقت کی راجدھانی میں
تجلیوں کو اندھیرے دئیے دکھاتے ہیں
یہ کارِ خیر بھی کر آئے خیر سے احباب
ہوس کی آگ سے قلب و دماغ روشن ہیں
دھواں دھواں ہیں کئی آفتاب عالمتاب
روش روش پہ نئے فتنہ کار ملتے ہیں

زمین تنگ ہے اور آسماں قریب نہیں
تڑپ کے جان جو دے دیں تو کچھ عجیب نہیں

اختر عالم

تجلیاتِ اختر

نہیں بہار فقط گل کے رنگ و بو کیلئے
ہے یہ تمام گلستاں کی آبرو کیلئے
یہ چاہتا ہوں کہ لے جاؤں زندگی کو دوام
نہ جانے کونسی منزل کی جستجو کیلئے
قدم قدم پہ ہے ٹھوکر مگر یہ کیا کم ہے
حیات وقف ہوئی اس کی جستجو کیلئے

تمہارا اب یہ تقاضا کہ آرزو نہ کرو
تمہیں نے دل کو ابھارا تھا آرزو کیلئے

رشنا برہی

التجا

روشنی کیا ملے گی آنکھوں کو
روشنی کے ان استعاروں سے
اب تو ہو جا طلوع میرے چاند؟
کام چلتا نہیں ستاروں سے

محمود سعیدی

چمن کے باغبانوں سے

کیوں ہے روشِ روش یہ بیاباں جواب دو!
کیا ہو گیا ہے رنگِ گلستاں جواب دو!

کیوں زلفِ رنگ و بُو ہے پریشاں جواب دو!
کیوں منتشر ہے نظمِ گلستاں جواب دو!

کیوں عارضِ بہار پہ وہ تازگی نہیں؟
افسردہ کیوں ہیں لالہ و ریحاں جواب دو!

غافل ہے کیوں نسیمِ سحر اپنے فرض سے
کیوں روئے گُل ہے گرد میں پنہاں جواب دو!

شبنم کے موتیوں میں نہیں کیوں وہ آب و تاب
کیوں ماند ہے گلاب کی افشاں جواب دو!

شامِ خزاں ہے کیوں متبسم بتا دو تو!
صبحِ بہار کیوں ہے پشیماں جواب دو!

کیوں نظمِ نو سے باغ کے دل مطمئن نہیں
کیوں اہلِ گلستاں ہیں پریشاں جواب دو!

اُس اہتمامِ بادہ و ساغر کو کیا ہوا؟
کیوں منتشر ہے حلقۂ رنداں جواب دو!

کیوں ہم سے اب تمہاری نگاہیں بدل گئیں
کیا ہو گئے وہ عہد، وہ پیماں جواب دو!

ایک مری جبینِ عبادت پہ بار ہیں
سجدے ادا ہوں جو اس آستاں سے دور

جو رِ زمیں سہی، ستمِ آسماں سہی
ہم وہ نہیں ہیں جو کسی امتحاں سے دور

وہ دل ہی کیا کہ جس میں نہ ہو تیری آرزو
وہ سر ہی کیا ہے جو ترے آستاں سے دور

نازک تھے ہی نظر کبھی پہنچی ہے باغباں
جو پھول گلستاں میں بھی ہیں گلستاں سے دور

جانے یہ گمرہی ہے کہ معراجِ جستجو
میں چل رہا ہوں رہ گزرِ کارواں سے دور

تاثرات

شیوۂ اہلِ وفا شکوۂ صیاد نہیں
دل تڑپتا ہے مگر مائلِ فریاد نہیں

جانے کیوں اپنی تباہی پہ چمن والوں کو
باغباں کا ہے گلہ، شکوۂ صیاد نہیں

جانے کیا سوچ کے خاموش ہیں اربابِ وفا
تم سمجھتے ہو انھیں جراتِ فریاد نہیں

کل بھی تہمت تھی کہ ہم سبزۂ بیگانہ ہیں
اب بھی الزام ہے ہم پر کہ چمن زاد نہیں

یوں وہ آبادیٔ گلشن پہ ہیں نازاں جیسے
کچھ شریک اس میں مری کوششِ برباد نہیں

ہائے آزادیٔ اربابِ وطن اے محمود
جسم بھی قید میں اور روح بھی آزاد نہیں

گوشِ مشتاق! یہ آوازِ انھیں کی تو نہیں
سازِ ہستی پہ کوئی نغمہ سرا ہے تو سہی

پھر بھی اے محوِ ستم، دل کی ہر اک حرکت پہ نظر
عاشقی شیوۂ تسلیم و رضا ہے تو سہی

بے خودی! ہاں وہ اسی راہ سے گزرے ہیں ابھی
ذرّے ذرّے میں ستاروں کی ضیا ہے تو سہی

نہ ہوا دردِ محبت کا مداوا معلوم
ورنہ ہر درد کی دنیا میں دوا ہے تو سہی

ان جفاؤں سے بھی محروم نہ کر دیں وہ کہیں
اے دل ان سے تجھے امیدِ وفا ہے تو سہی

کوثر نیازی

موجِ کوثر

بخشتا کون مجھے آپ کی رحمت کے سوا
میں کہ کچھ تھا ہی نہیں داغِ ندامت کے سوا

طرب و عیش کے آغاز پہ مرنے والو!
کچھ ملا بھی غمِ انجامِ مسرت کے سوا

شکوہ ہائے ستمِ یار ہوئے نذرِ کرم
یاد کچھ بھی نہیں اب ان کی عنایت کے سوا

آپ کے جوشِ عبادت میں جنابِ زاہد!
اور سب کچھ ہے بس اخلاص کی دولت کے سوا

اک ذرا دیکھئے اسے جرأتِ ایماں کہ یہاں
قابلِ عفو ہے ہر جرم صداقت کے سوا

اور موضوعِ سخن بھی تو ہیں اے فن کارو!
زلف و رخسار کی پامال حکایت کے سوا

دلِ ناشاد کہ ہے آہ مجسم کوثر!
کر ہی کیا سکتا ہے خاموش شکایت کے سوا

(مسٹر اجمل لائیڈ)

جلیل قدوائی

(ایم اے)

افکارِ جلیل

اُن کو ہم یاد کیا کرتے ہیں
جی کو یوں شاد کیا کرتے ہیں

اور تو کچھ نہیں ہوتا ہم سے
ایک فریاد کیا کرتے ہیں

ہم سے برباد تمنا دل کو
غم سے آباد کیا کرتے ہیں

جن کی آنکھوں میں نمی ہوتی ہے
جانے! کیا یاد کیا کرتے ہیں

کون تھا دادطلب ان سے جلیل
کیوں وہ بیداد کیا کرتے ہیں

انوار ظہوری

ظہورِ انوار

درحقیقت صرف کانٹے ہی نہیں عنوانِ غم
پھول کی آنکھیں بھی ہو جاتی ہیں اس گلشن میں نم

ڈگمگا جاتے ہیں جن راہوں میں اکثر کے قدم
ہم نے اُن راہوں کا توڑا ہے غرورِ پیچ و خم

زلزلے آتے رہیں، طوفان منڈلاتے رہیں
مسکراتے جائیں گے سیلِ حوادث میں بھی ہم

تیرے بندوں کی تنگ ظرفی کا یارب کیا علاج
اپنے ہاتھوں سے بنا کر توڑ دیتے ہیں صنم

کیسی کیسی ناز پروردہ بہاریں لٹ گئیں
کیسے کیسے رہرو دل کو کھا گیا منزل کا غم

ہو گئے دونوں فریبِ آرزو میں مبتلا
اضطرابِ دل کے دھوکے میں اسے سمجھے نہ ہم!

روحِ انتخاب

جماعتِ اسلامی کے بنیادی عقیدے کے متعلق اکابر علماء کی رائیں

اور ان کے فتوے

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل عبارت کے بارے میں:-

"رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔" (دستورِ جماعتِ اسلامی بنیادی عقیدہ جزو دوم کی دفعہ ۶)

الف: کیا یہ عبارت ایک مومن اور مسلم کا عقیدہ ہو سکتی ہے؟

ب:- کیا اس سے انبیائے سابقین علیہم السلام کی تکذیب، صحابۂ کرام و بزرگانِ دین کی توہین و تنقیص اور خود رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تکذیب لازم آتی ہے؟

ج:- کیا جس جماعت کا یہ عقیدہ ہو وہ جماعت مشرقی، چکڑالوی اور قادیانی جماعتوں کی طرح قرآن و حدیث کی قطعی منکر اور ایمان و اسلام کے صریح مخالف ہے؟

د:- ایسا عقیدہ رکھنے والی جماعت سے کسی قسم کا اشتراک و تعاون جائز ہے یا نہیں؟

ہ:- کیا ایسی جماعت کی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا، بیچنا خریدنا حرام ہے؟

و:- اگر کسی کے پاس ایسی جماعت کا لٹریچر ہو تو اسے فوراً جلا دینا چاہیے یا اسے فوراً زمین میں دفن کر دینا چاہیے؟

ز:- کسی دینی درسگاہ میں اگر اس جماعت والے ملازم یا مدرس ہوں تو انہیں فوراً الگ کر دینا چاہیے؟

ح:- اس جماعت سے تعلق رکھنے والے طلبہ اگر کسی درسگاہ میں تحصیل علوم عربیہ کر رہے ہوں تو کیا انہیں فوراً اس درسگاہ سے خارج کر دینا چاہیے؟

ط:- اگر کوئی مدرسہ عبارتِ مذکورہ بالا کو کسی جماعت کی ضلالت اور بے دینی پر ثبوتِ تام نہ پاکر یا اس کا دوسرا جائز محمل سمجھتے ہوئے اپنے یہاں اس جماعت کے لوگوں کو مدرس یا ملازم رکھ چھوڑے اور انہیں علیحدہ نہ کرے تو ایسے مدرسہ کو چندہ دینا اور اس کی کسی طرح کی کوئی اعانت کرنا حرام و ناجائز ہے؟

مذکورہ بالا سوالات کا مفصل جواب کتاب و سنت کی روشنی میں مرحمت فرمایا جائے۔ یہ عبارت اس علاقہ میں مسلمانوں کے اندر بڑے ہیجان و اضطراب کا باعث بنی ہوئی ہے!

جواب استفسار از مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی مدیر صدق جدید لکھنؤ و صدر مجلس علمی دار المصنفین اعظم گڑھ۔

آپ نے "بنیادی عقیدہ" کی جو عبارت نقل کی، وہ تو عین حق و صواب ہے۔ اور ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا ہی چاہئیے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کے ساتھ بعض توضیحی فقرے بڑھا دیئے جاتیں۔

رسول خدا کو معیار حق بنانے کے معنی یہ ہیں کہ سارے انبیاء کی تصدیق اس میں آگئی۔ بہ قول عارف رومی سے

نام احمد نام جملہ انبیاءست چونکہ صد آمد نود ہم پیش ماست

معترض کو شاید "تنقید" اور "توہین و تنقیص" کے درمیان فرق نہیں معلوم۔ محدثین نے کس غضب کی تنقید رد و برد کی ہے۔ کیا وہ سب توہین و تنقیص کے مرتکب ہوئے ہیں؟ بالفرض کسی بزرگ کی توہین ہو بھی جائے تو یہ دائرۂ اسلام سے خارج کیسے کر دے گی؟ اس درجہ کی چیز تو صرف اہانت رسول ہے۔

علی ہٰذا معترض کو "پیروی" اور "ذہنی غلامی" کے درمیان بھی فرق نہیں معلوم۔ پیروی تو اپنے استاد کی، باپ کی، ہر صالح و بزرگ کی کی جا سکتی ہے۔ "ذہنی غلامی" یعنی بے چون و چرا اتباع و انقیاد کا حق صرف رسول معصوم کا ہے۔ (عبد الماجد)

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی۔ مدیر رسالہ برہان دہلی و پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ۔

آپ نے فتوے کی جو دفعات لکھی ہیں اگر وہ صحیح ہیں اور درحقیقت ان کا مبنیٰ دستور جماعت اسلامی کے بنیادی عقیدہ جزو دوم کی ضمنی دفعہ ۶ کی وہی عبارت ہے جس کو آپ نے نقل کیا ہے تو بلاشبہ یہ ایک نہایت افسوسناک اور سخت حیرت انگیز جرأت ہے جس کو میں بالکل نہیں سمجھ سکتا۔

"تنقید" اگر بشکل تنقیص ہو یا بربنائے عناد و مخاصمت ہو اور صحابہ کرام میں سے کسی ایک کی بھی شان میں ہو تو یہ "اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضاً" کے حکم کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ اور اس بناء پر شدید ترین معصیت و عظیم گناہ ہے اور اگر یہ تنقیص کسی امام یا عالم کا کیا ذکر، کسی ایک ادنیٰ درجہ کے مسلمان یا کسی انسان سے متعلق ہو تو یہ آداب و تعلیمات اسلامی کے خلاف ہے۔ اور اس کے معصیت ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن اگر تنقید صحیح معنی میں تنقید ہو اور غرض صرف احقاق حق ہو اور اس میں شائبہ توہین و تذلیل نہ ہو تو وہ پیغمبر کے علاوہ ہر ایک پر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ محدثین و ارباب جرح و تعدیل نے ایسی تنقیدیں کی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب کسی ایک مسئلہ میں دو یا دو سے زیادہ رائیں ہوں تو مسئلہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے اور اس کو نکھار لینے کے لئے تنقید کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے!

یہی حال "ذہنی غلامی" کا ہے۔ اگر ذہنی غلامی نہ ہونے سے مراد سرکشی، انانیت، اعجاب برایہ ہے تو بے شبہ یہ گمراہی اور ضلالت ہے لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ "اطاعت مطلقہ" سوائے خدا اور رسول کے کسی اور کے لئے نہیں ہے۔ تو یہ عین قرآن کی اور اسلام کی تعلیم ہے۔ قرآن کی آیت "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" میں اولی الامر سے مراد علماء ہوں یا سلاطین یا دونوں بہر حال ان کی اطاعت مطلقہ نہیں بلکہ مقیدہ مراد ہے۔ چنانچہ "وان تنازعتم فی شیٍٔ فردوہ الی اللہ والرسول" اور صحیح حدیث "لا طاعۃ الا فی معروف" سے حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن میں صرف رسول کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ "وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا" اور اسی طرح "ولقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کے ارشاد کے مطابق اسوۂ حسنہ

صرف پیغمبر کی ذات ہے اور معیارِ حق وہی ہے۔ اسی پر ہر ایک کے قول و عمل کو جانچنا اور پرکھنا چاہیئے۔ اسی بناء پر ایک شخص حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر اور راشد خلیفہ سے کہہ سکتا ہے کہ اگر آپ غلط راستہ پر چلے تو آپ کو چرخے کے تکلے کی طرح سیدھا کر دیں گے۔ اگر "ذہنی غلامی" نہ ہونے سے مراد یہی حریتِ فکر ہے تو نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں ہے بلکہ مستحسن ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایک شافعی مذہب امام ابوحنیفہؒ کی ذہنی غلامی سے آزاد ہے۔ ایک حنفی امام شافعیؒ امام مالکؒ۔ امام احمد بن حنبلؒ وغیرہم کی ذہنی غلامی سے آزاد ہے۔ ان کے متعلق کیا ارشاد ہوگا؟

بہرحال آپ کی عبارتِ منقولہ کے الفاظ کا جہاں تک تعلق ہے۔ میں اس میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھتا جس کی وجہ سے اس طرح کا فتویٰ دے کر ایک نہایت شدید جرأت کی جائے۔ اور مسلمانوں کو خواہ مخواہ ایک ابتلاء و کشمکش میں مبتلا کیا جائے۔ بہتر یہ تھا کہ جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے پہلے دریافت کر لیا جاتا کہ "تنقید" اور ذہنی غلامی سے ان کی مراد کیا ہے۔ (سعید احمد)

مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی۔ مدیر رسالہ "معارف" دار المصنفین اعظم گڑھ۔

اس عبارت سے میرے نزدیک نہ انبیائے سابقین کا انکار لازم آتا ہے، نہ صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کی توہین و تنقیص نکلتی ہے۔ اور نہ ائمہ کی تقلید اور اتباعِ سلف کی دشمنی ظاہر ہوتی ہے۔ اس عبارت کا تعلق مسلمانوں سے ہے اور ان سے خطاب کے وقت عموماً ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معیارِ حق یا معیارِ کامل کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے مکمل نمونہ اور اسوۂ عمل آپ ہی کی ذاتِ گرامی ہے اور من کل الوجوہ آپ ہی کے اقوال و اعمال واجب العمل ہیں۔ اس قسم کے فقرے بڑے بڑے علماء بے تکلف اپنی تحریروں اور تقریروں میں استعمال کرتے ہیں جن سے نہ انبیاء سابقین کا انکار مقصود ہوتا ہے اور نہ کوئی شخص یہ نتیجہ نکالتا ہے۔

اسی طریقے سے دوسرے فقرے سے صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کی توہین و تنقیص بھی لازم نہیں آتی۔ اس لئے کہ تنقید کے معنی تنقیص کے نہیں۔ کسی چیز میں خطا و ثواب اور صحت و سقم کو جانچنے اور پرکھنے کے ہیں اور اہل سنت کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی انسان معصوم عن الخطا نہیں۔ ان کے علاوہ ہر انسان سے خواہ وہ کسی درجہ کا بھی ہو غلطی ہو سکتی ہے۔ اور جب غلطی ہو سکتی ہے تو دینی امور میں اس کے جانچنے اور پرکھنے کی بھی ضرورت ہوگی۔ جس کا معیار کتاب و سنت ہے۔ اسی کی روشنی میں خطا و صواب کو جانچنے کا نام "نقد" یا "تنقید" ہے۔ یہ تو محدثین کا بنایا ہوا اصول ہے۔ اس کے بغیر حدیث کی صحت و سقم کا، جس پر دین کی بنیاد قائم ہے، اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی کے لئے فنِ رجال وجود میں آیا۔ جس کی کتابیں تنقید سے بھری ہوئی ہیں۔ اس لئے تنقید کا مقصد تنقیص نہیں بلکہ خطا و صواب کو جانچنا ہے۔ مگر اس تنقید کا حق صرف انہی لوگوں کا ہے جو علم و دین و تقویٰ میں اسی درجہ کے ہوں جن پر تنقید مقصود ہے یا کم از کم دیانت و تقویٰ کے ساتھ دینی علوم میں پوری بصیرت رکھتے ہوں۔

تیسرے فقرے سے مقصد تقلید و اتباعِ سلف کا انکار ظاہر نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک "ذہنی غلامی" میں مبتلا ہونے کا مقصد کسی شخص کی بے سوچے سمجھے اندھی اور رسمی تقلید ہے۔ اس قسم کی تقلید عوام اور جہلا کے لئے نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے لیکن اصحاب علم و نظر کے لئے جائز نہیں۔ اور غور و فکر اور اطمینانِ قلب کے بعد جو تقلید کی جائے وہ ذہنی غلامی نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس کے تحت میں بھی نہیں آتی۔ اور ہر حال میں اور ہر شخص کے لئے تقلیدِ شخصی ضروری بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس عبارت سے جو نتائج نکالے

گئے ہیں۔ وہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دوسرے اور تیسرے فقروں کو خلاف احتیاط کہا جاسکتا ہے جس سے اگر بدگمانی کو راہ دی جائے تو غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ (معین الدین احمد ندوی)

مولانا عبدالودود صاحب ندوی :-

عبارت مسئولہ کا مفہوم بالکل صاف ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کا اغلاق ہے جو تشریح طلب ہو اور نہ ابہام غلط ہے جو آپ الرشح یا قابل اعتراض ہو۔ توحید خالص کا آئینہ ہے جو اصول شرعیہ کے معیار پر ڈھلا ہے۔

بعض اکابر کا فتویٰ نفس عبارت پر مبنی نہیں۔ اس کی بنا لازم منطوقہ پر ہے اور میرے خیال میں ان لوازم کی حیثیت التزام مالا یلزم کی ہے۔

رسول خدا پر "معیار حق" کے حصر سے انبیاء سابقین کا انکار لازم نہیں آتا۔ لفظ رسول اس سے قطعاً انکار کر رہا ہے۔

کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھنے سے صحابہ کرام و بزرگان دین کی توہین و تنقیص لازم نہیں آتی۔ رسول خدا کو معیار حق تسلیم کرنے والا اسوۂ رسول کا دلدادہ ہو گا۔ فرامین رسالت پناہ کو دانتوں سے پکڑنے والا ہو گا۔ وہ اس منطوقہ لازم سے منزلوں دور رہے گا۔ وہ تو عامتہ المسلمین کی توہین و تنقیص کو حرام سمجھے گا۔ صحابہ کرام اور بزرگان دین تو اس کے نزدیک بڑی چیز ہیں۔

کسی کی "ذہنی غلامی" میں مبتلا نہ ہونے سے تقلید کا انکار لازم نہیں آتا۔ بلکہ صحیح تقلید کی یہی صورت ہے۔ ائمہ علیہم الرحمہ کا ارشاد گرامی کہ اگر "میرا قول نص کے خلاف پاؤ تو نص کو لو اور میرے قول کو دیوار پر مارو"۔ اسی صحیح تقلید کی دعوت دیتا ہے۔

میرے خیال میں حضرات مفتیین نے فتویٰ دینے میں جلدی کی جو اصولاً خلاف ہے۔ حق یہ تھا کہ افراد سے ان لوازم کے ظہور یا اقرار کے بعد فتویٰ صادر کیا جاتا۔ (عبدالودود ندوی)

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی محدث مبارکپوری :-

(الف) عبارت مذکورہ فی السوال بلاشبہ مومن و مسلم کا عقیدہ ہو سکتی ہے بلکہ یہی ہر مسلمان کا عقیدہ ہونا چاہیے۔ اس عبارت میں جو کچھ مذکور ہے کتاب و سنت سے ماخوذ ہے، یہ بالکل ظاہر اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ پیغمبر خدا کے علاوہ کوئی انسان خواہ صحابی ہو یا تابعی۔ ولی ہو یا امام۔ محدث ہو یا فقیہ۔ معیار حق نہیں ہے۔ معیار حق صرف پیغمبر کی ذات ہے۔ اور صرف ایک پیغمبر ہی اپنی عصمت کی وجہ سے تنقید سے بالاتر ہے۔ دوسرا کوئی انسان غیر معصوم اور غیر واجب الاتباع ہونے کی وجہ سے تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔ پیغمبر خدا کے سوا کسی انسان کی ذہنی غلامی یعنی تقلید اجتہاد جائز نہیں۔ دوسرے تمام انسان اسی ایک معیار حق (ذات رسول) کے تابع ہیں۔ "فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول"

(ب) اس عبارت سے نہ کسی نبی سابق کی تکذیب لازم آتی ہے نہ کسی صحابی یا امام کی توہین و تنقیص ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے آنحضرت صلعم کی تکذیب لازم آتی ہے۔ رسول خدا کو معیار حق بنانا تو پیغمبر برحق کی تصدیق ہوئی نہ کہ اس کی تکذیب۔

کسی امتی کو خواہ صحابی ہو یا امام مجتہد تنقید سے بالاتر نہ سمجھنے کا عقیدہ ہرگز اس امتی کی توہین و تنقیص کو مستلزم نہیں ہے "تنقید" کو توہین و تنقیص کے معنی پر محمول کرنا جہل ہے۔ کتب عقائد میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ ملاحظہ ہو (شرح عقائد نسفی ص۱۲۰) (شرح فقہ اکبر لملا علی القاری ص۸۰) (والظفر الامانی فی مختصر الجرجانی ص۲۱۲ و ۲۱۳)

(ج) جس جماعت کا یہ عقیدہ ہو اس کو مشرقی - چکڑالوی - قادیانی جماعتوں کی طرح بتانا اور اس کو قرآن وحدیث کی منکر کہنا اور اس کو ایمان و اسلام کی صریح مخالف سمجھنا انتہائی جرأت ہے - عبارت مذکورہ فی السوال کے مطابق عقیدہ رکھنے والی جماعت جماعت حقہ ہے اور قرآن وحدیث کی متبع اور عین اسلام پر ہے -

(د) ایسا عقیدہ رکھنے والی جماعت سے ہر قسم کا اسلامی اشتراک و تعاون جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے -

(ہ) ایسی کتابوں کا جن کے مندرجات کتاب وسنت کے مطابق ہوں پڑھنا پڑھانا، بیچنا خریدنا حرام نہیں بلکہ ذریعہ قربت وباعث اجر وثواب ہے -

(و) ہرگز جلانا اور دفن کرنا جائز نہیں بلکہ اس کا احترام اور اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے -

(ز - ح) ہرگز نہیں الگ کرنا چاہیئے - اس جماعت سے تعلق رکھنے والے طلبہ اور مدرسین و ملازمین اہل حق ہیں - پھر کیا اہل حق کو الگ کرکے اہل باطل سے ایک دینی مدرسہ آباد کیا جائے گا -

(ط) ایسے مدرسہ کی مالی امداد واعانت کرنا بلاشبہ جائز اور درست ہے - (عبیداللہ رحمانی)

مولانا محمد سعید صاحب مفتی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ :-

(الف) اس عبارت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی مومن ومسلم کے عقیدے میں فساد پیدا کرے - ایک مومن ومسلم کا یہی عقیدہ ہونا چاہیئے محمد الرسول اللہ کی جو شرح کی گئی ہے وہ بالکل صحیح ہے -

(ب) اس عبارت سے نہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تکذیب لازم آتی ہے اور نہ خود آنحضرت صلعم کی تکذیب لازم آتی ہے - اور نہ صحابۂ کرام اور بزرگان دین کی توہین وتنقیص لازم آتی ہے - جائے تعجب ہے کہ یہ عبارت محمد رسول اللہ کے عقیدے کی تشریح میں ہے پھر تکذیب وتوہین کا کیا سوال - خیر الہدیٰ ہدیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کیا ہو سکتا ہے - یہ جمہور امت کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہے - حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اشخاص سے خطا وثواب دونوں کا امکان ہے - خطا معلوم ہو جانے پر اس کا اتباع کیسے جائز ہوگا - اور اس خطا وصواب کا معیار کتاب اللہ اور سنت رسول ہی ہے -

(ج) جس جماعت کا یہ عقیدہ ہے وہ عقیدہ عین اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے - مشرقی، چکڑالوی اور قادیانی سے تشبیہ دینا ظلم ہے اور خدا سے ڈرنے کا مقام ہے کہ یہ کیا لکھ رہے ہیں - نہ یہ جماعت قرآن وحدیث کی منکر ہے اور نہ ایمان واسلام کی مخالف ہے - بلکہ عین قرآن وحدیث صحیح کے مطابق اسلام کی خدمت کر رہی ہے -

(د) ایسی جماعت سے اشتراک وتعاون، اسلامی برادری کا تعلق رکھنا چاہیئے - مخالفت کرنے میں مسئولیت کا خطرہ ہے -

(ہ) اس جماعت کی کتابوں کو نہ پڑھنا پڑھانا حرام ہے اور نہ خریدنا حرام ہے بلکہ پڑھنا پڑھانا، خریدنا باعث ثواب ہے -

(و) اس جماعت کا لٹریچر جس کے پاس ہو تو جلانے اور دفن کرنے کا شرعاً کوئی حکم نہیں ہے اور اس کے جلانے یا دفن کرنے کی کوئی وجہ شرعی بھی نہیں ہے -

(ز) محض اس جماعت سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان مدرسین وملازمین کا علیحدہ کرنا صحیح نہ ہوگا -

(ح) ایسے طلبہ کا اخراج صحیح نہ ہوگا -

(ط) جو مدرسہ ایسے حضرات کو جو اس جماعت سے تعلق رکھتے ہوں، علیحدہ کرے اس کو چندہ وغیرہ نہ دینا صحیح نہیں ہے۔ اور نہ ایسے مدرسہ کو چندہ دینا حرام ہے بلکہ مدارس عربیہ دینیہ کو چندہ دینے پر جو اجر و ثواب ملتا ہے وہ یہاں دینے پر بھی ملے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی جماعت کے غلط صحیح ہونے کے لئے فقروں ٹکڑوں کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اس سے غلط نتائج اخذ کرنا صحیح نہیں ہے۔ جب تک مجموعی طور پر اس کے صحیح و غلط ہونے کا ثبوت نہ مل جائے۔ اسی لئے عبارتوں کے سیاق و سباق، موقع و محل کا دیکھنا ضروری ہے۔ عام مسلمانوں کو چاہیئے کہ بعض اشخاص کی آپس کی عداوت و ضد سے راہ راست سے نہ ہٹیں اور کام کرنے والوں کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کریں ورنہ اس فتنہ پردازی کی مسئولیت عند اللہ بہت سخت ہوگی۔ دنیا سے زائد آخرت پر نظر رہنی چاہیئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(دستخط مہر) محمد عبید عفا اللہ عنہ۔ دار العلوم ندوۃ العلماء

جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی - جانشین حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ -

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل عبارت کے بارے میں:

"رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔"

(دستور جماعت اسلامی بنیادی عقیدہ جزو دوم کی دفعہ ۶)

(الف) کیا یہ عبارت ایک مومن اور مسلم کا عقیدہ ہو سکتی ہے؟

کلمہ اسلام کے دوسرے جزو محمد الرسول اللہ کے معنی یہی ہیں کہ اب معیار حق سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی انسان نہیں ہے اس لئے یہ عبارت ہر مومن و مسلم کا عقیدہ ہے اور ہونی چاہیئے۔

(ب) کیا اس سے انبیاء سابقین علیہم السلام کی تکذیب صحابہ کرام اور بزرگان دین کی توہین و تنقیص اور خود رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تکذیب لازم آتی ہے؟

ہرگز نہیں۔ سیدنا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معیار حق ہونا۔ جملہ انبیاء کی معیاریت کا ان کے زمانہ میں مؤید ہے۔ کیونکہ آپ تمام انبیاء و رسل کے مصدق ہیں اور صحابہ کرام و اولیاء عظام کی معیاریت بھی آپ ہی کے معیار پر پورا اترنے سے ہوتی ہے۔ اصل معیار حق آپ ہی کی ذات ستودہ صفات ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ بعثت محمدیہ کے بعد آپ کے سوا کوئی انسان بھی تنقید سے بالاتر نہیں ہے امام مالکؒ کا قول لیس منا احد الا رادّ و مردود علیہ الا صاحب ھذا القبر الکریم۔ ظاہر ہے کہ امام مالکؒ کی مراد غیر انبیاء ہیں۔ یہی مراد اس عبارت کی ہے۔ اس سے خواہ مخواہ انبیاء و اولیاء کی توہین یا تکذیب نکالنا زبردستی ہے۔

(ج) کیا جس جماعت کا یہ عقیدہ ہو وہ جماعت مشرقی، چکڑالوی اور قادیانی جماعتوں کی طرح قرآن و حدیث کی قطعی منکر اور ایمان و اسلام کی صریح مخالف ہے؟

ہرگز نہیں۔

(د) کیا ایسا عقیدہ رکھنے والی جماعت سے کسی قسم کا اشتراک وتعاون جائز ہے یا نہیں؟

بالکل جائز ہے ۔ عدم تعاون کی کوئی وجہ نہیں ۔

(ہ) کیا ایسی جماعت کی کتابوں کا پڑھنا، پڑھانا، بیچنا، خریدنا حرام ہے؟

ہرگز نہیں ۔

(و) اگر کسی کے پاس ایسی جماعت کا لٹریچر ہو تو اسے فوراً جلا دینا چاہیئے یا اسے زمین میں فوراً دفن کر دینا چاہیئے۔

ہرگز نہیں ۔

(ز) کسی دینی درسگاہ میں اگر اس جماعت والے ملازم یا مدرس ہوں تو انھیں فوراً نکال دینا چاہیئے؟

کبھی نہیں ۔

(ح) اس جماعت سے تعلق رکھنے والے طلبہ اگر کسی درسگاہ میں علوم عربیہ کی تحصیل کر رہے ہوں تو کیا انھیں فوراً اس درسگاہ سے خارج کر دینا چاہیئے؟

ہرگز نہیں ۔

(ط) اگر کوئی مدرسہ عبارت مذکورہ بالا کو کسی جماعت کی ضلالت اور بے دینی پر ثبوت تام نہ پاکر یا اس کا دوسرا جائز محمل سمجھتے ہوئے اپنے یہاں اس جماعت کے لوگوں کو مدرس یا ملازم رکھ چھوڑے اور انھیں علیحدہ نہ کرے تو ایسے مدرسہ کو چندہ دینا اور اس کی کسی طرح کی کوئی اعانت کرنی حرام اور ناجائز ہے؟

اوپر تفصیل سے بتا دیا گیا ہے کہ اس عبارت میں گمراہی اور بے دینی کی کوئی بات نہیں ۔ تو پھر اس جماعت کے لوگوں کو کسی مدرسہ میں مدرس یا ملازم رکھنا بالکل جائز ہے ۔ اور ایسے مدرسہ کو چندہ دینا اور اس کی اعانت کرنا ہرگز حرام یا ناجائز نہیں ۔ صرف اس عبارت کی وجہ سے مسلمانوں میں ہیجان و اضطراب پیدا ہونا محل تعجب ہے ۔

مذکورہ بالا سوالات کا مفصل جواب کتاب وسنت کی روشنی میں مرحمت فرمایا جائے ۔ یہ عبارت اس علاقہ میں مسلمانوں کے اندر بڑے ہیجان و اضطراب کا باعث بنی ہوئی ہے ۔

واللہ اعلم بالصواب ۔

ظفر احمد عثمانی تھانوی عفا اللہ عنہ
۲۵ رجب ۱۳۷۳ھ

غلام محمد
(بی اے۔ عثمانیہ)

"اسلام اور ملّازم"

ہندو مت میں مذہبی قیادت برہمن کے سوا کسی کا حق نہیں۔ پرماتما ہی برہمن خاندان میں کسی کو جنم دے کر یہ کرم فرمائے تو فرمائے ورنہ کسی غیر برہمن کا اپنے زور علم یا ایثار و قربانی کے ذریعہ اس مقام مقدس پر پہنچنا نا ممکن ہے۔ اسی طرح خواہ اصل انجیل کی تعلیم کچھ بھی رہی ہو لیکن بعد کی عیسائیت میں تو "پاپائیت" ایک خاندان میں گھر کر رہ گئی۔ اب مجال ہے جو کوئی غیر اس مسند رفیع پر قدم دھر سکے۔ لیکن اسلام میں آج بھی دیکھ لیجئے کہ دینی قیادت نہ کسی خاندان میں محصور ہے نہ کسی نسل تک محدود۔ اسلامی قیادت و سرداری کا مدار نہ رنگ و نسل پر ہے، نہ قوم و ملک پر۔ اس کی تعلیم عام ہے۔ اس کا معیار "چند صفات عالیہ" ہیں۔ جو شخص بھی ان سے متصف ہو جائے دینی معظم ہے، محترم ہے، مقتدی ہے! باقی رہے نسل، قوم، رنگ اور زبان کے فرق و اختلافات تو یہ صرف جان پہچان کے لئے ہیں۔ انسانی رفعت کے لئے نہیں:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (حجرات - ۲)

اے انسانو! تم سب کو ہم نے ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تم کو قبیلہ قبیلہ اور خاندان خاندان صرف اس لئے بنایا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ ہمارے نزدیک سب سے اکرم وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے!

... ...

یعنی جو سب سے زیادہ حقوق اللہ میں لرزاں اور حقوق عباد میں ترساں ہے۔ وہی نائب الٰہی کی حیثیت سے سب کا امیر اور سب پر حکمران ہے۔ اب اگر وہ عجمی ہے تو عربی کو اس کے دست حق پرست پر بیعت کرنی ہوگی اور اگر وہ غلام زادہ ہے تو ایک سید زادہ کو بھی اس کے جھنڈے تلے آنا ہوگا۔ کوئی غیر اختیاری امر یہاں باعث فضیلت نہیں۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف اعلان ہے:-

لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ - لَا فَضْلَ لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ

عرب کو عجم پر فضیلت ہے اور نہ عجم کو عرب پر۔ نہ گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر۔

کیوں؟ اس لئے کہ:-

كُلُّكُمْ أَبْنَاءُ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ -

تم سب آدم زاد ہو اور آدم خاک زاد!!

نبی خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) سارے عالم کے لئے تا قیامت تک کے لئے بشیر بھی ہے اور نذیر بھی۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا -

اور ہم نے نہیں بھیجا تم کو (اے محمد) مگر تمام انسانوں کیلئے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا۔

پھر یہ نہیں کہ اپنے کنبہ کے لئے "بشیر" اور غیروں کے لئے "نذیر"[1] نہیں جو بات اوروں کے لئے ٹھیک وہی بات اپنے

---

[1] جیسا کہ متبنیٔ قادیان نے دعویٰ کیا ہے۔ لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔

جیسی صاحبزادی تقویٰ و طہارت کی تبلیغ کیلئے بھی :-

وَيَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَلِينِي مَا شِئْتِ مِنْ مَالِي لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا (کتاب الوصایا۔ بخاری)

اور اے فاطمہ بنت محمد! تم مجھ سے میرا مال جس قدر چاہو لے لو۔ مگر خدا کے عذاب سے تمہیں کچھ بھی نہیں بچا سکتا۔

اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ آفتاب رسالت کے چھپ جانے کے بعد حضرت علیؓ کے ہوتے ہوئے بلا امتیاز تعلق نسب مسلسل تین خلیفہ منتخب ہوئے اور پھر حضرت علیؓ کے بعد سے اس وقت تک تاریخ ہر ہر پہلو سے اپنا یہ کرشمہ دکھا رہی ہے۔ کہ مسلمانوں کی قیادت و امامت میں دنیائے اسلام نے کبھی بھی عرب و عجم اور سیاہ و سپید وغیرہ کے آنی و فانی امتیازات دیکھے نہیں۔ نہ سلطنت کی نگرانی میں، نہ علوم دینی کی امامت میں، نہ تقویٰ و طہارت کی بلندی میں!

کُردی غلام صلاح الدین ایوبی کی قیادت سے کس کو انکار رہا؟ ابو حنیفہؒ کے امام الفقہ ہونے میں کس نے شک کیا؟ بخاریؒ کے امام الحدیث ہونے میں کس کو کلام ہے؟ شیخ جیلانیؒ کو "قطب الاقطاب" ماننے میں کس نے جھجک محسوس کی ہے؟ یہ چند مثالیں تو نمونۃً ہیں ورنہ تاریخ اسلام کا ایک ایک ورق ہمارے اس دعوے کی کھلی دلیل ہے۔

سوال یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے۔ لیکن کیوں "سادات" محض اپنے نسلی تفوق کی بنا پر مسلمانوں کی امامت کے اجارہ دار نہ بن سکے؟ حالانکہ کم و بیش ہر مسلمان اپنے نبی برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دل و جان سے فدائی ہے۔ کیوں دیار عرب کے باشندے محض عربیت کی وجہ سے دین کے غیر متبدل قائدین نہ بن سکے؟ حالانکہ رسول عربیؐ کے مخاطب اوّل یہی تھے۔ اور انہی کی زبان میں قرآن پاک اُترا تھا۔ وجہ صرف یہی کہ "اسلام کا مزاج" ہی کچھ ایسا ہے کہ اس میں برہمنیت یا پاپائیت "ملائیت" بن کر کبھی قائم ہی نہیں ہو سکتی! جو بھی اپنے آپ کو اس پیام ربّانی کا مخاطب صحیح ثابت کرے گا وہی سر بلند و سرفراز رہیگا اور جو کوئی اس جام حیات کو رکھتے ہوئے اس کو نوش جان نہ کرے گا وہ خراب و برباد ہو جائے گا۔ اور اس کے ہاتھ سے وہ جام حیات چھین کر دوسرے قدر دانوں کے حوالے کر دیا جائے گا :-

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (سورۃ محمد)

اور اگر تم منہ موڑو گے تو (خدائے تعالیٰ) تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا۔ پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

"چو کفر از کعبہ خیزد کجا ماند مسلمانی" محض شاعرانہ خیال بندی ہے۔ کعبہ والے چھوڑیں گے تو رب العالمین ہمیشہ اس بات پر قادر ہے کہ غیر کعبہ والوں سے دین کی خدمت لے لے۔ بلکہ تاریخ اس "امکان عقلی" کو کتنی بار مشاہدہ حقیقت بنا بنا کر پیش کر چکی ہے ؎

ہے عیاں شورش تاتار کے افسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

غرض اسلام میں "ملا ازم"[1] کا نہ کبھی وجود رہا ہے۔ نہ قیامت تک کبھی "ملا ازم" اس میں جگہ پا سکتا ہے۔ اسلام میں "ملا ازم" کا خطرہ تو نہ شخص محسوس کر سکتا ہے جو اسلام کے مزاج سے اس کی عام تعلیم سے اور اس کی تاریخ سے نا آشنا ہے۔ "ملا ازم ختم کر دو" کا نعرہ لگانے والے جی چاہے تو اس وقت بھی دیکھ لیں کہ آج جن علماء کے دینی شکوہ سے وہ لرزہ براندام ہیں۔ وہ علماء کتنی پشتوں سے دین و تقویٰ کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں؟ اگر اس تلاش میں ان کی نظر واماندہ و حیران رہ جائے۔ تو پھر ان کو یقین کر لینا چاہیئے کہ ان کا یہ نعرہ اور ملا ازم کے خلاف غم و غصہ ویسا ہی ہے جیسے کوئی مالیخولیہ کا مریض محض اپنی ذہنی شکوک کو

---

[1] اور جہاں یہ امتیاز پایا جاتا ہے وہ "عجمیت" کی یادگار ہے۔ (م۔ق)

دیکھ دیکھ کر ڈر ڈر جائے اور پھر پے بہ پے اُن پر حملہ کرے ۔ حالانکہ ہر صاحب ہوش دیکھ رہا ہے کہ خارج میں کوئی چیز موجود نہیں اور اس دیوانگی سے خود اس دیوانے کے ہاتھ زخمی ہو رہے ہیں !

"ملاازم" کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں ۔ ملائیت کا اجارہ چاہے دین میں موجود نہ ہو ۔ مگر یہ کیا کہ "مولوی" ہر شعبہ زندگی میں دین کو دخیل بناتے ہیں ۔ اللہ رسول کو مان لیا ۔ نماز پڑھ لی ۔ روزہ رکھ لیا ۔ بس مسلمان بن گئے ! اب یہ کیا ہے کہ وضع و قطع بھی اسلامی ہو ۔ میل ملاپ اور شادی بیاہ کے طور و رسوم بھی دینی ہوں ۔ معیشت و سیاست کے مبادی و اصول بھی ٹھیک ٹھیک وہی ہوں جو قرآن و سنت میں نظر آتے ہیں ۔ کیا اُٹھنا بیٹھنا ، چلنا پھرنا تک اسلام کے حصار سے باہر نہ ہو ؟

"اینٹی ملاازم" کے نعرہ بازوں کی قرآن دانی اور رسول شناسی دیکھ لی ، بیچاروں کو یہی نہیں معلوم کہ دین اسلام میں "خدا" "قیصر" برہمن و شودر ۔ ویش و چھتری کا تقسیم نہیں اور یہاں درحقیقت دین و دنیا کی کوئی تفریق ہی نہیں ۔ اسلام تو ہر ہر مسلمان کی زندگی کے ہر ہر پہلو پر حکمران ہے ۔ اس کے مخصوص عقائد ہیں ۔ اور ان کی ایک خاص توجیہہ رسول کریم نے فرمائی ہے ۔ اس کی چند خاص عبادات ہیں ۔ اور اُن کو پیکرِ صداقت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کر کے دکھایا ہے ۔ اس کے اندر فرد و اجتماع میں ایک خاص نوعیت کا ربط ہے ۔ کچھ فرائض عائد کئے گئے ہیں ، کچھ حقوق دیئے گئے ہیں ۔ اس کے اصولِ اخلاق اور اصولِ معاشرت متعین ہیں ۔ وہ انسانیت کی ترقی کی کسی منزل میں اس کو نہیں چھوڑتا ۔ اور یہ اس کا طرۂ امتیاز ہے ۔ اسی محیط فضا میں جینے کا نام "اتباعِ اسلام" ہے ۔

اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۔ اسلام میں پُوری پُوری طرح آجاؤ ۔

لیکن یہی جامعیت اور کاملیت ، ان نعرہ بازوں کو "ملائیت" نظر آتی ہے ۔ ۔ ۔ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ کیا چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں ہم حکم خداوندی کے پابند ہیں ؟ کاش یہ حواس باختہ جانتے کہ ان کی زبان سے ٹھیک وہی طنز یہ جملہ نکل رہا ہے ۔ جو ایک معاندِ رسولؐ یہودی نے کہا تھا ۔

"کیا تمہارا پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے اور معمولی معمولی باتیں بھی سکھاتا ہے ؟"

صحابی نے فخراً جواب دیا تھا :-

"ہاں ، ہاں ہمارا پیغمبر ہم کو ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے ۔ یہاں تک کہ استنجا اور آبدست کی بھی تعلیم دی ہے !"

حقیقت کیسی بدل گئی ۔ جو چیز اصحاب رسولؐ کیلئے مایۂ فخر تھی ۔ آج مسلمانوں کیلئے موجبِ زحمت اور وجہ اعتراض ہے ۔ انا للہ ! اس قلبِ ماہیت کے بعد غور کیجئے کہ یہ کامل مسلمان ہیں یا وہ اصحاب رسولؐ تھے جن کو جیتے جی اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی کی سند عطا فرما دی :-

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۔ اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ۔

اور یہ سندِ امتیاز کیوں ملی ؟ محض اسی اس کی وجہ سے جس کو آج "عار" سمجھا جا رہا ہے ۔ وہی ہر ہر بات میں ، چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی حکم الٰہی کو ڈھونڈنا اور اس کے عدول کے تصور سے لرز جانا ۔

ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ۔ (سورہ بینہ) یہ اس کے لئے ہے جو خدا ترس ہے ۔

ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے ۔ جو علماء آج آسمانِ اسلام کے چاند اور تارے نظر آتے ہیں ۔ انہوں نے اپنی کوشش و جانفشانی اور محنت و ریاضت سے برسوں رسالت سے اکتسابِ فیض کیا ہے ۔ برسوں قرآن حکیم اور حدیث پاک کی خدمت میں

صرف کر دیئے، اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو ان علوم کے حصول میں لگا دیا۔ اپنے عقائد و عبادات کو اور اخلاق و کردار کو، معاملات و معاشرت کو۔ اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اب جو وہ نکھر گئے ہیں اور لوگوں نے ان کے اندر دینی عظمت کے آثار پا کر اپنے آپ کو ان کے آگے جھکا دیا۔ تو "عوامی طاقت" ہی کو سب کچھ سمجھنے والے ان علماء کرام سے سہم گئے اور نعرہ لگایا کہ یہ اسلام کے اجارہ دار بن بیٹھے ہیں۔ اسلام کی تعبیر و تشریح کا حق تنہا انہی کو نہیں بلکہ ہم کو بھی حاصل ہے۔ لہٰذا "ملا ازم" کو ختم کر دو۔ بے شک تم بھی اسلام کو سمجھ اور سمجھا سکتے ہو۔ لیکن تم نے اس کی صلاحیت اور استعداد کب پیدا کی؟ عمر تو ساری "عشقِ بتاں" میں کٹی مسلمان بننے بنانے کی سرے سے کوشش ہی نہیں کی۔ اور اب جو دیکھا کہ مسلمان بنے بغیر چارہ نہیں۔ قرآن والی جنت سے بغیر، قوم میں کوئی وقعت نہیں اور قوم میں مقام کے بغیر "جنتِ دنیا" ملتی نہیں۔ تو لگا دیا ایک نعرہ مستانہ کہ اسلام کی تشریح و تعبیر کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ اسلام کسی کا شخصی اجارہ نہیں۔ کَلِمَةُ حَقٍّ اُرِیْدَ بِهَا الْبَاطِلُ۔ (بات سچی مگر منشاء باطل۔) بیشک اجارہ کسی کا نہیں مگر سوچیئے کہ جس روز یہ نعرہ باز قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح کے واقعتہً اہل ہو جائیں گے تو خود یہ بھی "ملا" نہ بن جائیں گے؟ اور جس دریائے فیض کو آج سکھانا چاہتے ہیں کیا خود اس کی ایک نہر نہ بن جائیں گے؟ البتہ جب تک یہ بغیر کچھ ہوئے اپنے آپ کو اسلام کی توضیح و تعبیر کا مدعی جتاتے رہیں گے ان کا کوئی مقام پیدا نہیں ہو سکتا۔ پس کچھ عجب نہیں کہ پہلی بات سے محرومی اور دوسری صورت سے خوف ہی کی وجہ سے یہ "اینٹی ملا ازم" کا نعرہ بلند ہو رہا ہے۔ کہ نہ علماء رہیں، نہ علماء و غیر علماء کی تفریق نظر آئے۔ مگر اس پر تو وہی مثل چسپاں ہوتی ہے۔ جو ایک اندھے کے متعلق مشہور ہے کہ کسی نے اُس سے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟ تم بینا ہو جاؤ یا ساری دنیا اندھی ہو جائے؟" اس نے فوراً جواب دیا۔ "ساری دنیا اندھی ہو جائے!" یہ جواب اندھے کی جس نفسیات کا پتہ دے رہا ہے۔ غور سے دیکھیئے کہ "اینٹی ملا ازم" کے نعرہ بازوں میں وہی ذہنیت کار فرما ہے یا نہیں؟ مدعیانِ تقسیم دین آج اسی فتنہ میں مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں، یا نہیں جس سے مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ہی چونکا دیا تھا:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ
مِنَ الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ
حَتّٰى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوسًا
جُهَّالًا فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا
وَأَضَلُّوا۔ (کتاب العلم۔ بخاری)

اللہ علم کو اس طرح نہیں اٹھاتا کہ بندوں کے سینوں سے نکال لے بلکہ علماء کو موت دے کر علم کو اٹھاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہیگا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے اور ان سے دینی مسائل پوچھیں گے اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دینگے۔ خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرینگے۔

"اینٹی ملا ازم" کا نعرہ اسی قیامت کا صور ہے۔ اور "ملاؤں کی اجارہ داری" کو توڑنے کا شور و غوغا اسی حشر کے بپا کرنے کی تمہید ہے۔ ورنہ "اسلام اور ملا ازم" ایک مہمل ترکیب ہے۔ جس کے معنی نہ تعلیماتِ اسلام بتاتی ہے اور نہ تاریخ اسلام!!

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ!

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

بلبل چودھری نہ صرف یہ کہ رقاص تھا بلکہ رقص و سرود کو رواج دینا اس کی زندگی کا مشن تھا۔ ناچنے گانے والوں کی پوری پارٹی کے ساتھ وہ یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں گھوما اور "پاکستانی آرٹ" کے نام سے رقص کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان کے سفیروں نے رقص و سرود کی ان محفلوں کی سرپرستی فرمائی۔ یورپ کے اخباروں کا تو پتہ نہیں کہ انہوں نے اس نچکئے (dancer) کی کس طرح پذیرائی کی۔ مگر کراچی کے روزنامہ "ڈان" میں بلبل چودھری کے رقص کی تصویریں چھپتی رہیں ـــــ خیالات کا عجیب تضاد ہے کہ کچھ لوگوں کے سروں پر کلاہ افتخار کج ہوئی جاتی تھیں کہ بلبل چودھری گا بجا کر اور ناچ کر یورپ میں پاکستان کا نام بلند کر رہا ہے اور کچھ خدا کے بندے ایسے بھی تھے جن کے دل شرم و غیرت کے مارے کٹے جاتے تھے کہ رقص و سرود کے ان مظاہروں سے وہ پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا ہے ذلیل ہو رہا ہے یہ "آرٹ" نہیں، بے حیائی ہے۔ اسلام ایسی باتوں سے ہزار بار پناہ مانگتا ہے۔

ہاں! تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا! اتنی بلبل چودھری صاحب کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ یعنی ان کی موت واقع ہو گئی۔ موت ہر جان کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اس سے کسی کو رستگاری نہیں۔ بس آگے پیچھے کی بات ہے! ؎

یہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں!

سُنا ہے کہ پاکستان کی کچھ "بیگمات" بلبل چودھری کی موت کا سوگ منا رہی ہیں اور "اپوا" کی سب سے بڑی "بیگم صاحبہ" نے تو اپنے غم و الم کا اظہار اخباروں میں ایک تعزیتی بیان کے ذریعہ فرما بھی دیا ہے ـــــ اور صاحب یہ غم کی بات نہیں بلکہ جائے گریہ اور مقام ماتم و سینہ کوبی ہے کہ رقص و سرود کا اتنا بڑا دیوتا چل بسا! فرنگی آرٹ کے قدردشناس جب تک حکومت کی گدی پر براجمان ہیں تو پاکستان میں ناچنے والے پیدا ہوتے رہیں گے۔ مگر بلبل چودھری کی طرح گھونگھروؤں کو کون کھنکائے گا۔ اس مایۂ ناز آرٹسٹ کی طرح اسٹیج پر کون تھرکے گا۔ وہ ناچ کے توڑے، وہ ساز کے زیر و بم پر پنڈلیوں کی لچک۔ وہ تڑپ اور وہ چلت پھرت۔ بڑی بڑی نازک اندام ناچنے والیوں کو شرما دیا تھا اس بلبل چودھری نے! اس کی سی بات دوسروں میں آتے سے رہی!

پاکستان کے "آرٹ" کا کتنا عظیم الشان نقصان ہوا اس مایۂ ناز رقاص کی موت سے! ناقابلِ تلافی نقصان! اس آرٹسٹ کی بجائے کچھ پروفیسر، عالم، شاعر اور سائنس دان مر جاتے تو غنیمت تھا کہ ان کا بدل تو مل سکتا تھا۔ مگر اس رقاص کا تو بدل ملنا ناممکن ہے ـــــ اللہ میاں نے یہ کیا کیا؟ مرگِ بے ہنگام، نا وقت موت! ملک الموت نے ہائے! کس دل سے اتنے بڑے آدمی کی جان قبض کی ہوگی! ـــــ فریاد!

سمجھ میں نہیں آتا کہ بلبل چودھری کی موت پر ہم پسماندگان کے گھر والوں کو دیں یا "اپوا" کی بیگمات کو! کتنا بڑا سانحہ ہے۔ کتنی دردناک "ٹریجڈی" ہے ـــــ "اپوا" کے ساتھ ہمیں بھی اس غم میں ہمدردی ہے۔ اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ "اپوا" کی سرپرستی میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوں گے وہ بلبل چودھری کے نام کو زندہ رکھیں گے اور "اپوا" کی کوششوں کی بدولت قوم میں "بلبل چودھری" ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے!

سُنا ہے کہ کراچی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بہادر نے ایک "حکم نامہ" جاری فرمایا تھا کہ رمضان المبارک کا احترام کیا جائے —— ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب! "ایک ہزار بار زندہ باد" کہ جنہوں نے قوم کو اس کا فرض بروقت یاد دلایا۔ اور اس حکم نامے کے بعد ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور چائے خانوں کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے گئے — صاحب نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ تندرست لوگ روزے رکھیں بلکہ حکم "احترام ماہ صیام" کا دیا گیا تھا —— اور "احترام" کے اس لفظ میں اس قدر معنوی وسعت ہے کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک ہٹا کٹا عاقل و بالغ مسلمان کسی ہوٹل میں جاکر شراب پی سکتا ہے۔ بس سڑکوں پر شراب نوشی نہیں ہونی چاہیئے۔ ہوٹلوں کے اندر یہ کام ہوتا ہے تو "احترام ماہ صیام" کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔ اور سینما ہاؤسوں کے دروازوں پر مسلمانوں نے ٹکٹ لینے کے لئے لائن لگا کر اور کبھی کبھی پولیس کے ڈنڈے کھا کر "احترام ماہ صیام" کا جو ثبوت دیا ہے وہ اپنی جگہ اس قابل ہے کہ اس کو کیمرے میں محفوظ کر لیا جائے۔ یہ تو خاک نشینوں اور چھوٹے بھیاؤں کا حال تھا۔ اُن کا جن کو "عوام" کہا جاتا ہے۔ مگر "بڑے آدمیوں" نے اس "احترام ماہ صیام" کے ساتھ جو سلوک فرمایا ہے۔ وہ سچ تو یہ ہے کہ انہی کرسی نشینوں کو زیب دیتا ہے! اس تماشائی کے کانوں تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک بہت بڑے حاکم پیر اتوار کو ہاکس بے تشریف لے گئے ہیں اور شہر سے اتنی دور "لنچ" کھا کر "احترام ماہ صیام" کا وہ ثبوت دیا ہے، وہ ثبوت دیا ہے کہ بے اختیار "نعرۂ تکبیر" بلند کرنے کو جی چاہتا ہے!

سُنا ہے کہ ان صاحب کے ساتھ بہت سی بوتلیں بھی ساتھ جاتی تھیں۔ مگر تماشائی کسی پر تہمت نہیں جوڑ سکتا۔ اس لئے کہ اس بیچارے کو "بیر" اور "سوڈے" کی بوتلوں کی پہچان نہیں ہے۔ اور مسلمان کے ساتھ "حسن ظن" رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کراچی کے ان مناظر کو دیکھ کر ماہ صیام بیچارہ زبانِ حال سے فریاد کرتا ہوگا۔

"مجھے میرے احترام کرنے والوں سے بچاؤ!"

علامہ مشرقی "مسلم لیگ" کے تن مردہ میں جان ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور اس کیلئے وہ پاکستان کے وزیر اعظم سے ملاقات بھی فرما چکے ہیں۔ نہیں معلوم کہ ان دونوں بزرگواروں میں کیا بات چیت ہوئی۔ کیا اسکیم بنی اور وہ کس نتیجے پر پہنچے۔ مگر ہمارا قیاس ہے کہ جناب مشرقی مدظلہ نے وزیر اعظم سے فرمایا ہوگا کہ جناب والا! میں دوسرے لیڈروں کی طرح نہیں ہوں جو لمبی اخباروں میں بیان دیا کرتے ہیں۔ یا کسی قومی جلسے میں ہار پہن کر ایک عدد تقریر جھاڑ دیتے ہیں۔ میں ایک تحریک چلا چکا ہوں "خاکسار تحریک" کے شور سے سارا ہندوستان گونج چکا ہے۔ اور پھر میں نے اس تنظیم کو اپنے حکم سے توڑ بھی دیا۔ میں نے جس تحریک کو خلعت پہنایا تھا اسی کو کفن بھی پہنایا۔ یہاں تک کہ اسے دفن بھی کر دیا۔ تو جناب والا! میں ایک بہت بڑی تحریک کے کفن دفن کا تجربہ لے کر آیا ہوں اور اپنے اس تجربہ کی مسیحا نفسی سے مسلم لیگ کے تن بے جان میں جان ڈال کر رہوں گا —— "O.K"

میاں افتخار الدین اگر پوری طرح "سرخ" نہیں ہیں تو "گلابی" اور کم سے کم "چت کبرے" تو ضرور ہیں۔ اور سب سے بڑی لطف کی بات یہ ہے کہ اس قدر ٹھاٹ باٹ، سرمایہ و جاگیر رکھنے کے باوجود اپنے دل میں مزدور کا غم چھپائے ہوئے ہیں۔ وہ جب اپنے شیورلیٹ کے مخملیں گدّے پر استراحت فرماتے ہیں تو مزدور کی خاک نشینی اور مہاجرین کا فٹ پاتھ پر پڑا رہنا انہیں یاد آجاتا ہے اور یہ غم انہیں چین کی نیند سُلا دیتا ہے۔ ان کے غم میں اضطراب اور ان کے درد میں بے چینی نہیں —— اپنے اپنے ظرف کی بات ہے! ہاں! تو فضل الحق کی وزارت کے برطرف ہونے کے بعد ایکا ایکی سننے میں آیا کہ میاں صاحب لندن تشریف لے گئے! مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے

پاکستان میں جب کوئی ایسا واقعہ ظہور میں آتا ہے تو میاں صاحب ہوائی جہاز میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا! خواجہ ناظم الدین کی وزارت جب چھنی تھی تو بھی آپ کو لندن کی طرف اُڑان بھرتے ہوئے دیکھا گیا۔ تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں جب لاہور میں مارشل لا نافذ ہوا۔ اُس وقت بھی اس "ببر شیر" نے ولایت کی راہ لی۔ اور غالباً مسٹر لیاقت علی خان مرحوم کے دردناک قتل کے بعد بھی میاں صاحب نے سات سمندر پار کا سفر اختیار فرمایا ——— اور یہ وہ "شیر نیستاں" ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں جب دھاڑتا ہے تو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیتا ہے۔ مگر خطرے کے وقت یہ "شیر قالین" بن جاتا ہے ——— بلکہ روباہی پر اُتر آتا ہے۔ کہاں وہ شور انگیزی اور کہاں یہ بے نمکی! شاعرانہ اصطلاح میں اسے "شترگربہ" کہا جاتا ہے ——— عروض میں یہ "عیب" ہے اور لیڈری کے ادب میں "صنعت" ——— !

اخبارات میں خبر چھپی ہے اور جب سرکاری حلقوں سے اس کی تردید نہیں ہوئی تو یہ خبر سچ ہی ہوگی جو ٹ کا ہیکو ہونے لگی ——— وہ یہ کہ پاکستان کی حکومت "وزارت اوقاف" قائم کر رہی ہے۔! جس شخص کے بھی ذہن رسا نے اس تجویز کو تراشا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جنم دیا ہے۔ اس کو داد نہ دینا ایک طرح کی بیدادی ہے! "زندہ باد"۔ "جگ جگ جیو"۔ "عمر دراز"۔

تم سلامت رہو قیامت تک   اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو!

اسی کو کہتے ہیں "دام ہمرنگ زمیں"۔ جہاں بانی اور فرمانروائی کے یہ ڈھنگ نہ جانے حضور نے کس سے سیکھے ہیں! پاکستان میں علماء کی ساکھ اللہ کے فضل سے ابھی تک باقی ہے۔ اور انہی "کبوتران بام حرم" کے پھانسنے کیلئے "وزارت اوقاف" کا یہ جال لگایا جا رہا ہے ——— اور اس پاکستان میں ہر مولوی "ابوالاعلیٰ مودودی" تو نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے مولوی اور مولانا بھی پڑے ہوئے ہیں جو سرکار دربار میں تقرب کے حیلے ڈھونڈتے رہتے ہیں!

یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ اخبارات میں یہ خبر نظر سے گزری کہ علماء کرام کی ایک جماعت نے "وزارت امور مذہبی" کے قیام کا مطالبہ فرمایا ہے۔ یوں سمجھیئے کہ "صید" خود "صیاد" کی منتیں کر رہا ہے کہ خدا کے لئے مجھے گرفتار کرو ~

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا   طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا!

اکبر الہ آبادی کے اس شعر کے معنی اب سمجھ میں آئے ——— !

ہندوستان میں حمیدہ نام کی کوئی پہلوان عورت ہے۔ جو سنا گیا ہے کئی مشہور پہلوانوں کو کشتی میں نہ صرف یہ کہ زیر کر چکی ہے۔ بلکہ پچھاڑ چکی ہے۔! اس "مرد مار عورت" نے سارے پہلوانوں کو اس عنوان کے ساتھ چیلنج دے رکھا ہے کہ جو کوئی اس سے کشتی میں جیت جائے گا۔ اسی سے وہ اپنا بیاہ رچائے گی ——— کیا ہندوستان میں کوئی "رام مورتی" اور پاکستان میں کوئی "اسلام مورتی" نہیں ہے۔ جو اس عورت کے چیلنج کو قبول کر سکے!

عورت کو "صنف نازک" کہا جاتا رہا ہے۔ مگر بیسویں صدی عیسوی میں یہ اصطلاح بدل گئی۔ اب عورت نازک اور شرمیلی نہیں رہی۔ وہ اب مردوں کی طرح پولو، ہاکی اور کرکٹ کھیلتی ہے۔ سمندروں اور دریاؤں میں تیرتی ہے۔ یہاں تک کہ اکھاڑے میں کشتی بھی لڑتی ہے ——— عورتوں کی یہ "کرختگی" مردوں کو گوارا کرنا ہو گی۔ کہ یہ ڈھیل انہیں کی دی ہوئی ہے۔ آزادی کی رسّی جب دراز ہوتی ہے تو پھر وہ کسی حد پر جا کر رک نہیں سکتی۔ بیباکی کے ہر اقدام کے بعد "ہل من مزید" کی آواز آتی ہے اور پھر عورت جو کچھ بھی کر دکھائے تھوڑا ہے!

بنگال کے "شاہی فرمان" کا ایک اقتباس:۔

"پاکستان دو خطروں سے دوچار ہے۔ ایک کمیونسٹوں کا خطرہ جو مشرقی پاکستان تک محدود ہے۔ دوسرا "مذہبی مجنونوں" کا خطرہ۔ جو پاکستان میں ہر جگہ پایا جاتا ہے"

معلوم ہوتا ہے مشرقی پاکستان کی "آب و ہوا" میں کچھ تاثیر ہی ایسی ہے کہ وہاں کے تخت حکومت اور کرسی فرمانروائی پر بیٹھتے ہی دماغ مریخ و مشتری کی فضا میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ فضل الحق صاحب نے وزارت عظمیٰ کی کرسی پر جلوہ افروز ہوتے ہی بڑ ہانکنی شروع کی ہے اور رعونت اور کبر و غرور کے جو مظاہرے کئے ہیں۔ وہ صاف بتا رہے تھے کہ "عزت مآب" کا دماغ چل گیا ہے ——— یہاں تک کہ "his bubble burst" اس "غبارے" کو ٹوٹ ہی جانا چاہیے تھا۔ کسی غبارے میں جب گنجائش سے زیادہ ہوا بھر جاتی ہے تو اسے ٹوٹ جانا ہی پڑتا ہے۔ حیرت ہے لوگ ان واقعات سے عبرت حاصل نہیں کرتے اور نہیں سمجھتے کہ زمانہ کی ایک ہی گردش میں سارا نشۂ اقتدار ہرن ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں کچھ "بڑے لوگوں" کو یہ کسی طرح پسند نہیں ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو۔ اور وہ ہمیشہ اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ جیسے بھی ہے "اسلام" کو یہاں آنے سے روک دیا جائے۔ ان کے دل کی بات لاکھ چھپانے پر بھی ظاہر ہو کے رہتی ہے۔ کبھی "ملا ازم" کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں اور کبھی "مذہبی جنون" کی طنز فرمائی جاتی ہے۔ اگر اس کے جواب میں "مذہبی مجنونوں" کی طرف سے "مغربی مجنونوں" کو ٹوکا جائے تو "جبینِ خسروی" پر نہ جانے کتنی شکنیں پڑ جائیں گی۔ اور کہا جائے گا کہ یہ پاکستان کے غدار ہیں۔ ملک میں انتشار پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ اور "مذہبی مجنونوں" کا یہ گروہ اس قابل ہے کہ اُن کو توپ دم کرا دیا جائے!

یور ایکسیلنسی !

کم کن ز کبر و ناز کہ دیدہ است روزگار　　چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے!

پیرزادہ عبدالستار کے "ستارہ" کی یہ کرامت ہے کہ مرکزی وزارت سے ہٹے تو سندھ کی وزارت عظمیٰ کے سنگھاسن پر براجمان ہو گئے۔ اُن کا "ستارہ" کیا ہے جادو کی چھڑی ہے کہ اس کے لگتے ہی آدمی مسحور ہو جاتا ہے۔ بلکہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے ——— پیر علی راشدی بڑے پھکیت واقع ہوئے ہیں مگر حیرت ہے کہ سیاسی داؤں پیچ کے میدان میں بھی "پیرزادہ" سے "پیر" بازی لے گیا اجی! محض وزارت سے نکلوا کر چھوڑا ان "غدار وزیروں" کو!

سندھ کی وزارت زمانہ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ کوئی ٹھیک نہیں نہ جانے کب کیا ہو جائے؟ اس ساڑھے چھ سال کی مدت میں سندھ کی وزارت کو کیسے کیسے انقلابوں کے دَور سے گزرنا پڑا ہے۔ اور کس کس کی کمان چڑھ چڑھ کر اُتری ہے۔ کتنے سابق وزراء ہیں کہ جن کی آستان بوسی لوگوں کے لئے باعث فخر و مباہات تھی۔ اور اب لوگ انہیں دیکھتے ہیں تو کترا کر نکل جاتے ہیں۔ زوالِ نعمت کے ایسے مناظر چشم فلک نے کم دیکھے ہوں گے!

شیخ سعدی کا مقولہ پوری طرح یاد نہیں رہا۔ فرماتے ہیں:۔

"آواز کودکاں و مزاج شاہاں اعتبارے ندارد"

تو گلستان کے پاکستانی نسخوں میں "مزاج شاہاں" کے بعد "وزارت سندھ" کا اگر اضافہ کر دیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا!

ہماری نظر میں

معارف الحدیث

"معارف الحدیث" (کتاب الایمان — جلد اول) تالیف: مولانا محمد منظور نعمانی - ضخامت ۲۰۸ صفحات کاغذ چکنا سفید اور دبیز - کتابت و طباعت دیدہ زیب - قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے - غیر مجلد تین روپے بارہ آنے - ملنے کا پتہ :- کتب خانہ الفرقان لکھنؤ - (ہندوستان)

احادیث نبوی کا جدید انتخاب اردو ترجمہ اور مفید و ضروری تشریحات کے ساتھ "معارف الحدیث" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے اور کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اپنی افادیت کے اعتبار سے اتنی اہم، گرانقدر اور بابرکت ہے کہ اردو داں مسلمانوں کے ہر گھر میں اس کا پہنچنا ضروری ہے۔

"معارف الحدیث" کا مقدمہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے لکھا ہے - جو سنتِ رسولؐ کے دین میں حجت ہونے پر ایک گرانقدر دستاویز بلکہ برہانِ ناطق ہے۔ اس انتخاب میں اکثر و بیشتر حدیثیں "مشکوٰۃ المصابیح" سے لی گئی ہیں - اور فاضل مؤلف نے ان احادیث کو ترجمہ و تشریح کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ جن کا تعلق ایمان سے ہے! کتاب کے آخری حصہ میں وہ احادیث درج ہیں جن میں برزخ، قیامت اور آخرت کا بیان ہے!

دیباچہ میں صاحبِ تالیف نے لکھا ہے :-

"جن حدیثوں کے بارے میں کسی طبقہ میں کچھ غلط فہمیاں ہیں - یا کچھ گمراہ کن لوگ ان کے ذریعہ مسلمانوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں - اُن کی تشریح اور ازالہ کی خصوصیت سے کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً بعض حدیثوں میں صرف "لا الٰہ الا اللہ" کہنے پر جنت کی بشارت دی گئی ہے - یا ہر کلمہ پڑھنے والے پر آتشِ دوزخ حرام ہونے کی خوشخبری سنائی گئی ہے - اسی طرح بعض حدیثوں میں ہر ایسے شخص کی تکفیر سے منع فرمایا گیا ہے جو مسلمانوں کا ذبیحہ کھاتا ہو، اور ان کے قبلہ کو اپنا قبلہ مانتا ہو - اور اس کے برعکس بعض حدیثوں میں بعض گناہوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کا کرنے والا مسلمان ہی نہیں - اور ایمان میں اس کا کوئی حصہ نہیں - الغرض اس طرح کی مشکل اور شرح طلب حدیثوں کی تشریح اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی خاص مدد سے ایسی ہو گئی ہے کہ ان شاء اللہ اس کے مطالعہ کے بعد کسی کے لئے مغالطہ کی گنجائش نہیں رہے گی - اِلّا یہ کہ کسی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور راست روی مقدر ہی نہ ہو، اور اس کے واسطے کجروی کا فیصلہ من جانب اللہ ہو چکا ہو۔"

کتاب کا مطالعہ لائق مؤلف کے اس "اعتراف" کی تصدیق کرتا ہے - یہ تشریحات واقعی دل کی گرہیں کھولتی اور وسوسوں کو دور کرتی ہیں - ترجمہ[1] سلیس اور تشریحات عام فہم ہیں - اور کتاب کی ایک ایک سطر میں مؤلف کے ذوقِ ایمانی اور محبتِ رسولؐ

---

[1] "محلہ والوں میں سے بھی چند آدمی آکر جڑ گئے" (صفحہ ۱۰۵) "شامل ہو گئے" موزوں تر تھا - "اس بشارت عامہ کا تذکرہ پہلے جب حضور کے سامنے آئیگا......" (صفحہ ۱۱۱) "تذکرہ" کے بجائے "ذکرا" ہوتا تو ادب و احترام کے تقاضے کا کوئی گوشہ چھٹنے نہ پاتا!

کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ابوجہل اور ابولہب بھی تھے۔ جن کو حضور کی ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت (سنت) سے کد تھی اور دوسری طرف سلمانؓ و ابوذرؓ جیسے حق شناس بھی تھے۔ جو حضورؐ کے قول و فعل پر جان دیتے تھے اور حضورؐ کے اتباع کو ایمان اور اسلام کا سب سے بڑا تقاضا سمجھتے تھے۔ تاریخ آج بھی اپنے کو دہرا رہی ہے۔ یعنی ابوجہل اور ابولہب کی ذریت "منکرین حدیث" کے بھیس میں حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ اور دوسری طرف مولانا محمد منظور نعمانی جیسے اہل ایمان بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کو سلمان و ابوذر (رضی اللہ عنہما) کے عشق رسولؐ کی گرمی ملی ہے۔ اور جو "فتنۂ انکار حدیث" کا پوری عزیمت و استقامت کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء !

مواعظ حسنہ

"مواعظ حسنہ" - ترجمہ :- مولوی عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم ضخامت ۱۰۵ صفحات - سرورق رنگین و مطلا مجلد قیمت پانچ روپے آٹھ آنے - ملنے کا پتہ :- ادارۂ ایمان و یقین مومن لائبریری ۲۴۹ بلاسس روڈ بمبئی ۸ (بھارت)

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل، تقویٰ، سیرت و صورت اور فکر و خطابت سبھی کچھ عطا فرمائی تھی۔ حضرت شیخ آفندی کے درمیان جو اپنے ملفوظات چھوڑ گئے ہیں وہ عرفان و حکمت کے بیش بہا نگینے ہیں۔ جن کی چمک سے دل کی دنیا میں اجالا ہو جاتا ہے! حضرت شیخؒ بلند پایہ خطیب اور شعلہ بیان واعظ بھی تھے۔ آپ کے یہ سلسلۂ مواعظ اور چند ملفوظات کا اردو ترجمہ مولوی عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم نے بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ زبان آسان اور عام فہم ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں مترجم کے درجات بلند فرمائے کہ ان کے قلم نے اس نفس قدسی صفات کے مواعظ کی ترجمانی کی ہے جو تجدید و احیائے دین کے منصب پر مامور تھا۔

یہ وہ مواعظ ہیں جو زیادہ تر خانقاہ شریف اور مدرسہ معمورہ میں حضرت شیخ جیلانی کی زبان فیض ترجمان سے سننے گئے۔ ان مواعظ کو "مجالس" پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ہر مجلس کے آغاز میں وعظ کی تاریخ، مقام اور وقت تک لکھ دیا گیا ہے۔ حضرت شیخ کے مواعظ حسنہ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ملت کی اصلاح کا کتنا جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے۔ اور عوام و خواص کے عیوب پر کس قدر سختی کے ساتھ احتساب فرماتے تھے! یہ مواعظ کوئی وقتی چیز نہیں ہیں۔ ان کی اہمیت اور افادیت آج بھی اسی طرح تازہ ہے جس طرح سوا آٹھ سو سال پہلے تھی۔ چھٹی صدی ہجری میں مسلمانوں کی آخرت فراموشی اور دنیا پرستی کا جو عالم تھا۔ چودھویں صدی ہجری میں یہ نقشہ اترا نہیں ہے بلکہ اور تیز ہو گیا ہے!

ان مواعظ میں حضرت شیخ کے قلب باصفا کی دلکشی ہی نہیں گرمی بھی پائی جاتی ہے۔ ملت کے انتشار اور دین سے بیزاری پر شیخ کا دل پارے کی طرح مضطرب ہو ہو جاتا ہے۔ آپ نے سب سے زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ مسلمان خوف آخرت اور خدا کی محبت کی طرف مائل ہوں کہ یہی اسلام اور ایمان کی بنیاد ہے!

شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف لوگوں نے کیا کیا باتیں منسوب کر دی ہیں۔ مگر شیخ کی تعلیمات کا یہ رنگ ہے۔ فرماتے ہیں:-

"ہر حقیقت جس کی شہادت شریعت نہ دے وہ زندقہ ہے"

اور اقامت دین کی جد و جہد کا یہ عالم ہے:-

"نیک کام کی ترغیب دینا اور خلاف شرع امر سے روکنا میرے نزدیک خلوت خانوں کے ہزار عابدوں سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے"

حضرت شیخ کے کچھ ایسے ناسمجھ عقیدت مند بھی پائے جاتے ہیں جو اُن کے نام کی دہائی دیتے ہیں۔ حالانکہ شیخ نے مرض الموت میں

اپنے فرزند شیخ عبدالوہاب کو یہ وصیت کی تھی:۔

"اللہ کا تقویٰ اور اس کی اطاعت لازم کر لیجیو اور نہ کسی سے خوف رکھیو اور نہ طمع۔ ساری حاجتیں حق تعالیٰ کے
حوالے کیجیو اور اسی سے مانگیو اور حق تعالیٰ کے سوا نہ کسی پر بھروسہ رکھیو نہ اعتماد۔ توحید ــــ توحید۔
توحید۔ ہر چیز کا خلاصہ توحید ہے"

(صفحہ ۳۱۷) "اللہ والوں کا غلام اور ان کے (پاؤں کے نیچے کی) زمین اور حاضر باش خدمت گار بن جا" ــــ اردو ترجمہ میں "ان کے پاؤں کی خاک" لکھنا چاہیئے تھا ــــ (صفحہ ۳۶۹) "سواروں کے گروہ، گروہ دوڑ کے ڈھنگ بنے تھے" ــــ "ڈھٹھ کے ڈھٹ" پہلی بار نظر سے گزرا۔ اردو کا محاورہ "ٹھٹ کے ٹھٹ" ہے ــــ (صفحہ ۳۴۴) "شہر بہ شہر گاؤں بہ گاؤں چلتا پھرتا رہوں گا" ــــ شہر شہر اور گاؤں گاؤں کافی تھا۔ "بہ" کی ضرورت نہ تھی۔ "گاؤں" کے ساتھ فارسی کے "بہ" کا کیا جوڑ!

"مواعظ حسنہ" میں توحید۔ تقدیر اور اتباع رسولؐ پر جو کچھ لکھا ہے وہ حرز جان بنانے کے قابل ہے۔ اللہ تعالیٰ مترجم کو اس سعی و محنت کا اجر عطا فرمائے گا! فاران کی کسی اشاعت میں "مواعظ حسنہ" کے منتخب اقتباسات انشاء اللہ عنقریب شائع ہوں گے۔

یتیم پوتے کا حق وراثت

"یتیم پوتے کا حق وراثت" از:۔ سید غلام احمد بی اے۔ ایل ایل بی۔ پلیڈر۔ ضخامت بیس صفحے۔
ملنے کا پتہ:۔ سید غلام احمد بی اے۔ ایل ایل بی۔ پلیڈر۔ منٹگمری۔

"کج فہم، پراگندہ خیال و مغرب زدہ افراد جو اللہ کے دین کو "ماڈرن" بنانے کی فکر میں ہیں۔ انہوں نے یتیم پوتے کی مظلومیت کی آڑ میں شریعت پر چوٹیں شروع کر دی ہیں۔ یہ کتابچہ اسی فتنہ کے رد میں لکھا گیا ہے۔ اور فاضل مصنف نے ٹھوس دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ "یتیم پوتے کے حق وراثت" کے سلسلہ میں شریعت کا جو حکم ہے وہ درست اور جائز ہے!

دنیا کی بہنو بیٹیو

"دنیا کی بہنو بیٹیو" از چودھری محب اللہ (بی اے علیگ) ڈپٹی کلکٹر پنشنر۔ ضخامت ۲۷ صفحات۔
قیمت چار آنہ ملنے کا پتہ:۔ چودھری محب اللہ سنڈیلہ ضلع ہردوئی (یوپی)

چودھری محب اللہ صاحب نہ مفکر ہیں اور نہ اہل قلم۔ وہ سیدھے سچے مسلمان ہیں اور مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس کتابچہ میں انہوں نے نکاح۔ مہر۔ زوجین کا ترکہ۔ عورتوں کے ساتھ برتاؤ۔ نماز۔ امانت۔ جہاد۔ ہجرت وغیرہ عنوانات کو سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے۔ کتاب کی تالیف و تدوین کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح حال ہے۔ کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد پوری طرح ادا کریں اور آخرت کے محاسبے سے ڈرتے رہیں۔ اس طرح ان کا دین ہی نہیں دنیا بھی سنور جائے گی!

اسلامی پردہ

"اسلامی پردہ" از۔ محمد عبدالحلیم قاسمی، ناظم جمعیۃ العلماء اسلام لاہور۔ ضخامت ۸ صفحات۔ قیمت صرف ڈیڑھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مدرسہ حنفیہ۔ ٹمپل روڈ۔ بہاولپور ہاؤس لاہور۔

مولانا عبدالحلیم قاسمی نے اس کتابچہ میں عورتوں کی بے پردگی۔ آزادی اور بے باکی پر تنقید کی ہے۔ اور پردے کی اہمیت کو واضح فرمایا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

"عورت بہرحال عورت ہے اور مرد بہرحال مرد ہے۔ دونوں کا دائرہ عمل الگ الگ ہے۔ دونوں
کے فرائض منصبی اور حقوق مختلف ہیں۔"

کاش! یہ حقیقت ان "بیگمات" کے دلوں میں اتر سکتی جنہوں نے پاکستان میں "اپوا" کا فتنہ برپا کر رکھا ہے۔ اور جو مسلمان لڑکیوں کو ایکٹریس اور رقاص بنانے کی درپے ہیں۔ اور جن کو مشہور رقاص جبل چودھری کی موت پر اس قدر غم ہوا ہے۔ جو

بو علی سینا۔ فارابی۔ ابن خلدون یا جابر بن حیان دنیا سے اٹھ گیا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ پہلے مردوں کی عقلوں پر پردہ پڑا ہے جب کہیں جاکر یہ عورتیں بے پردہ ہوئی ہیں۔ اور آزادی کی منزل میں رقص و سرود اور مینا بازار تک پہنچی ہیں۔

ایک اسلام

"ایک اسلام" از۔ احمد یار خان (گجرات) ضخامت ۱۶ صفحے۔ قیمت دو آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ مخزن علم پاکستان۔ رابسن روڈ۔ کراچی۔

اس کتابچہ میں جناب احمد یار خان صاحب نے سوال و جواب کے انداز پر دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حدیث دین میں حجت ہے۔ اور کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہ بھی دین کی عمارت کا ایک ستون ہے۔ لائق مؤلف نے کتنی اچھی بات کہی ہے:۔

"خود قرآن کا قرآن ہونا حدیث سے ثابت ہے۔ ہم نے قرآن اُترتے اور جبریل علیہ السلام کو وحی لاتے نہیں دیکھا۔ سرکار نے فرمایا کہ "یہ قرآن ہے"۔ ہم نے مان لیا اور سرکار کا یہ فرمان حدیث ہے۔"

کوئی کوئی بات ایسی بھی مصنف کے قلم سے نکل گئی ہے جو سطحی بھی ہے اور محل غور بھی۔

رسولِ جہاں

"رسول جہاں"۔ از۔ خان صاحب محمد ظفر ایم اے۔ ایل ایل بی (میانوالی) ضخامت ۱۵۶ صفحات (پاکٹ ایڈیشن) ملنے کا پتہ:۔ محمد ظفر ایم اے۔ ایل ایل بی وکیل مہتمم سلسلہ رفیق الاسلام میانوالی (یہ کتاب چھ پیسے کے ٹکٹ بھیجکر طلب کی جاسکتی ہے)

جناب محمد ظفر خان صاحب نے آسان اور عام فہم زبان میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مقدس زندگی کے مبارک حالات قلمبند کئے ہیں۔ جن کا مطالعہ بچوں کیلئے خاص طور سے سود مند ہوگا۔

(صفحہ ۱۰) "ہر جگہ گمراہی اور گناہوں کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ لیکن عرب سب کے سروں پر ہاتھ پھیر گیا"۔ یہ بالکل نیا محاورہ دیکھنے میں آیا۔ اردو روزمرہ تو "بازی لے جانا" ہے۔ صفحہ ۲۲ پر گوتم بودھ کو "حضرت بودھ" لکھا ہے۔ حالانکہ بودھ اس صف میں نہیں آتا جس صف میں کرشن جی مہاراج یا چین کے کنفوشیس آتے ہیں۔ اس لئے کہ بودھ کی تعلیمات میں خدا کا تصور نہیں ملتا۔ بودھ نے "روح" ہی کو سب کچھ سمجھا اور وہ آتما کے چکر سے نہ نکل سکا!

فتنۂ انکار حدیث

"فتنۂ انکار حدیث" از۔ مفتی رشید احمد لدھیانوی۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔
ملنے کا پتہ:۔ مفتی رشید احمد۔ جامعہ دینیہ دار الہدیٰ ٹھیڑھی ریاست خیرپور (سندھ)

اس کتابچہ میں کیا ہوگا؟ یہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ فاضل مؤلف نے رسالہ "طلوع اسلام" کا حوالہ[1] دے کر وہ جملے نقل کئے ہیں۔ جن میں نماز روزہ۔ حج اور قربانی پر طنز کی گئی ہے۔ مؤلف نے پرویز کو چودھویں صدی کا "ابولہب" کہا ہے۔ اور ٹھیک کہا ہے۔ اس کتاب میں ان اعتراضات کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو "منکرین حدیث" کی طرف سے "احادیث" پر وارد کئے جاتے ہیں!

فتنۂ انکار حدیث کی روک تھام کیلئے جو کوئی بھی حسب مقدور و استطاعت دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں انشاءاللہ ملے گا اور بے حساب ملے گا!

---

[1] صفحہ ۹ پر جو عبارت (۱۶) درج ہے وہ پرویز سے غلط منسوب کی گئی ہے۔ غالباً رسالہ فاران کے کسی مضمون کا یہ کوئی حصہ ہے!

قرع الاذنین بشرع الاذانین

"قرع الاذنین بشرع الاذانین" از عنایت اللہ اثری وزیرآبادی۔ ضخامت ۲۰ صفحات۔ اہلِ علم حضرات چار آنہ محصولڈاک روانہ فرما کر کتاب کو مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ عوام سے محصولڈاک کے علاوہ آٹھ آنے قیمت لی جاتی ہے۔ جو مجلد کی لاگت ہے ۔۔۔ ملنے کا پتہ:- ناظم انجمن اہلِ حدیث جامع اہلِ حدیث جامع مسجد روڈ راولپنڈی شہر۔

جناب مولانا عنایت اللہ اثری وزیرآبادی نے یہ کتاب جمعہ کی دو اذانوں کے ثبوت میں لکھی ہے۔ اور اس کے لئے قوی دلائل فراہم کئے ہیں۔ فاضل مصنف کا انداز عالمانہ ہے اور اس مسئلہ میں انہوں نے بڑی کاوش و تحقیق سے کام لیا ہے۔

(صفحہ ۲۹) "عبدالرحمٰنؓ اپنے قافلہ کے ہمراہ جس میں دحیہ کلبیؓ سفیر بن کر گیا ہوا تھا" (صفحہ ۳۵) "دحیہ کلبیؓ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا" (صفحہ ۶۲) "بلالؓ اذان تو اپنے ٹھیک وقت پر دیا کرتا تھا" ۔۔۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت دحیہ کلبی اور حضرت بلال (رضی اللہ عنہم) جیسے جلیل القدر صحابہ کا ذکر اس انداز سے دوران کے لئے تکلیف دہ ہے۔ حالانکہ اسی کتاب میں صفحہ ۶۰ پر "نیز حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں" لکھا ہوا نظر آیا۔ اور ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔

کیل الموفی

"کیل الموفی لمن یکتال علیہ لیعنی المتوفی" از عنایت اللہ اثری وزیرآبادی۔ حجم ۷۶ صفحات۔ قیمت ۸ آنے۔ ملنے کا پتہ:- ناظم انجمن اہلِ حدیث جامع مسجد اہلِ حدیث گجرات۔

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے لئے جو "توفّی" کا لفظ آیا ہے۔ یہ کتاب اسی ایک لفظ کی تحقیق کیلئے لکھی گئی ہے اور مفسرین اور ماہرین زبان و لغت کے اقوال و آراء اور خود قرآن کی آیتوں کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اس لفظ کے جو معنی (موت) لئے ہیں۔ وہ قطعاً غلط ہے! مولانا عنایت اللہ اثری نے دلائل و براہین کے زور سے اس جھوٹے (نبی) کو اس کے گھر تک پہنچا دیا ہے۔ دلائل اتنے قوی اور مستحکم ہیں کہ کسی کے ہلائے ہل نہیں سکتے۔ قادیانیت کی تردید میں جو کوئی جتنی بھی جدوجہد کر رہا ہے قیامت کے دن انشاء اللہ وہ غازیوں اور مجاہدوں کے ساتھ محشور ہوگا۔

نظر خبیر

"نظر خبیر من لبصیر خبیر" از عنایت اللہ اثری وزیرآبادی۔ حجم ۲۱۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ:- ناظم انجمن اہلِ حدیث۔ جامع مسجد اہلِ حدیث۔ گجرات۔

مولانا عنایت اللہ اثری نے ۱۹۴۶ء میں آیت للسائلین کے نام سے عربی زبان میں سورۂ فاتحہ سے ناس تک قرآن کی تفسیر لکھی تھی۔ اس پر گجرات کے کسی صاحب نے (جن کا نام ظاہر نہیں کیا گیا) اس تفسیر پر تنقید کی ہے۔ یہ کتاب اسی تنقید کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اور فاضل مصنف نے معترض کی بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اصل تفسیر اور اصل اعتراضات اگر سامنے ہوں تو محاکمہ کیا جا سکتا ہے کہ اقرب من الحق کون ہے؟

عرب کا چاند (مکی زندگی)

"عرب کا چاند" (جلد اول) از سوامی لکشمن جی مہاراج۔ ضخامت ۳۱۲ صفحات۔ مجلد قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیر انسانیت۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔

حضور شفیع المذنبین خاتم النبیین علیہ الصلٰوۃ والسلام کی یہ سیرت ایک ہندو نوجوان کی لکھی ہوئی ہے۔ حضور کی ولادت باسعادت سے لے کر ہجرت مکہ تک کے حالات بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ لکھے ہیں۔ ایک ایک لفظ سے محبت رسولؐ کی خوشبو آتی ہے۔

(صفحہ ۱۰) "حساب میں غلطی کھاتی" "غلطی کی" لکھنا چاہیئے تھا۔ (صفحہ ۲۰۵) "یہاں تک کہ گردن گھٹنے سے آپ کی آنکھیں باہر نکل آئیں" "گلے کے گھٹنے سے" کا محل تھا۔ (صفحہ ۲۲۴) "پھر بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا" روزمرہ یوں طرح ہے۔

"پھر بال پکڑ کر گھسیٹا" "بالوں سے پکڑا کر گھسیٹا" کا تو یہ مفہوم ہوا کہ پکڑنے والے نے دوسرے شخص کو اپنے بالوں میں لپیٹ کر پکڑا اور گھسیٹا ہے۔ (صفحہ ۲۲۹) "وہ کچلے ہوئے ناگ کی طرح غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا بہن اور بہنوئی کی طرف پلٹا" "چوٹ کھائے ہوئے ناگ (یا سانپ) لکھنا چاہیئے تھا۔

صفحہ ۱۳۵ پر "رضاعی ماں" کو "رضائی ماں"، "شعاعیں" کو "شعائیں" (صفحہ ۲۰۱) اور "خباب بن الارت" کو "جناب بن الارث" (صفحہ ۲۲۹) لکھا ہے ــــ انداز تحریر میں زیادہ پختگی نہیں ہے۔ لکھنے کا انداز یہ ہے۔

"بیٹیوں کے کاشانۂ چمن کو جو غنچے لہلہاتے بستان رسولؐ کی عطر آفرینیوں سے کاشانۂ چمن بنے ہوئے تھے ہمیر بیابان بنا دیا۔" (صفحہ ۲۰۴)

سوامی لکشمن جی مہاراج نے حضورؐ کی سیرت لکھ کر حقیقت میں بہت بڑی سعادت کا شرف حاصل کیا ہے۔ ایک ہندو نوجوان ادیب کی یہ ادبی پیشکش محبت و عقیدت کا سدا بہار گلدستہ ہے!

اور مقدمہ چلتا رہا

"اور مقدمہ چلتا رہا" از :- الیاس احمد مجیبی۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت چھے آنے۔
ملنے کا پتہ :- سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار دہلی۔

جناب الیاس احمد مجیبی بچوں کے مصنف و ادیب ہیں۔ ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ یہ ایک افسانہ ہے جسے مجیبی صاحب نے دلی کی ٹکسالی زبان میں لکھا ہے جو کافی دلچسپ ہے۔

(صفحہ ۹) "اور کچھ نہ کچھ سفلہ پروری اور غلط بخشیوں کے لفتنے بھی ہمیشہ ہی رہے ہیں" "غلط بخشیوں کا ہمیشہ یہی رنگ رہا" لکھنے تو مطلب زیادہ واضح طور پر ادا ہو جاتا ــ "کچھ نہ کچھ" بھی اس جملہ میں اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے۔ (صفحہ ۱۱) "آخر سگائی طے پا ہی گئی" "آخر نسبت طے پا ہی گئی" لکھنا تھا کہ "سگائی" عام طور پر ہندوؤں کے یہاں "نسبت" اور "منگنی" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

(صفحہ ۲۷) "باپ کا داغ کچھ نہ کچھ بھرنے ہی لگا تھا" "باپ کی موت کا زخم کچھ نہ کچھ بھرنے ہی لگا تھا" لکھنا تھا۔ "داغ" کے ساتھ بھرنا نہیں "مٹنا" بولا جاتا ہے۔

فارابی

"فارابی" - مترجم :- رئیس احمد جعفری۔ حجم ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔
ملنے کا پتہ :- مطبوعات چٹان بہار کالونی۔ کلیش روڈ۔ کراچی نمبر ۵۔

اس کتاب کے اصل مصنف مصر کے ادیب عباس محمود ہیں۔ اور اس کو اردو میں جناب رئیس احمد جعفری نے منتقل کیا ہے۔ ترجمہ رواں اور شستہ ہے۔ فاضل مترجم نے ترجمہ میں اصل کتاب کی تلخیص کی ہے۔

حکیم ابو نصر فارابی کو "معلم ثانی" کہا جاتا ہے۔ فلسفہ و منطق کا یہ شخص امام تھا۔ ابن سینا جیسے یگانۂ روزگار نے فارابی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ فاضل مصنف نے بہت خوب لکھا ہے کہ فارابی نے دریا کو کوزہ میں بند کیا اور ابن سینا نے کوزہ کو دریا بنا دیا۔

اس کتاب میں حکیم ابو نصر فارابی کے فضل و کمال، شخصیت، علمی مقام، سوانح و حالات اور جدید فلسفہ و منطق کی تفصیل علی الخصوص طور سے فارابی کی کتابوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ پوری کتاب معلومات آفریں ہے!

فریب نظر

"فریب نظر" مصنفہ :- فریڈا اوٹلے۔ مترجمہ :- ابو ندیم ایم اے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ مجلد۔ خوبصورت گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ :- مکتبہ چراغ راہ کراچی۔

یہ کتاب ایک فرنگی خاتون ــ فریڈا اوٹلے کی لکھی ہوئی ہے جس نے اشتراکی لٹریچر سے متاثر ہو کر اشتراکیت کو قبول کر لیا تھا۔

اس خاتون نے انگلستان میں مزدوروں کی انجمن میں مل کر بڑے جوش اور خلوص کے ساتھ کام کیا۔ پھر وہ خود روس چلی گئی اور ایک روسی سے شادی کر کے مشرق بعید میں چند دن اپنے شوہر کے ساتھ رہی۔

جب وہ پہلے پہل روس پہنچی ہے تو سے وہاں پہنچتے ہی اس علمی قدغن سے دوچار ہونا پڑا کہ روس میں آئن سٹائن کی تصانیف پڑھنے کی ممانعت تھی۔ روس پہنچنے کے بعد وہاں کی زندگی، عام عادات، دفتروں، محکموں اور خود حکومت کی پالیسی کا اس خاتون کو جو تجربہ ہوا وہ نہ صرف یہ کہ عجیب وغریب بلکہ اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ چنانچہ اسے اقرار کرنا پڑا:۔

"اس بات کا پتہ مجھے بعد میں چلا کہ اسٹالن کے مقابلہ میں زارشاہی کا جور وستم
کس قدر نرم اور معمولی تھا!"

فریڈا اوٹلے کا خیال تھا کہ روس کے معاشرے میں وہاں کی عورتیں سماجی تفریق سے ناآشنا اور دولت وسرمایہ کی آغوش میں نشوونما پائی ہوئی عورتوں سے مختلف ہوں گی۔ مگر روس پہنچ کر اسے تجربہ ہوا:۔

"روسی عورتیں سماجی تفریق۔ معاشی حیثیت کے غرور۔ قیمتی ملبوسات کی پسندیدگی۔ خود نمائی اور تحسین پسندی کا اسی طرح شکار ہیں۔ جس طرح سرمایہ دار معاشرے کی عورتیں ——— روسی معاشرے میں درجہ بندی اور [illegible] عام ہے۔"

فریڈا اوٹلے کے تجربہ ومشاہدہ کے بعد چند تاثرات:۔

——— "لیکن اب میرا سامنا مجلس وقف کے عادات سے تھا۔ جو بائیں بازو کی انتہائی متشدد حکمت عملی پر چلی جا رہی تھی اور اس بات پر مصر تھی کہ ایک اشتراکی کا کام شورش اور محض شورش ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم کوئی نظری تشریح نہ کیا کریں اور نہ لڑائی کا پول کھولنے میں اپنا وقت اور زور صرف کریں۔ ہمیں صرف ہڑتالوں کو ہوا دینا اور مزدوروں کو اکسانا تھا کہ وہ ہڑتال کریں۔ نتیجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو"

——— "جلد ہی مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا کہ روس میں زندگی بسر کرنے کا مطلب، دوسروں کی نسبت یہ سمجھنے کہ برائی اچھائی سے کہیں زیادہ ہے۔ اور یہ کہ اچھائی اتنی سرعت سے غائب ہو رہی ہے کہ عنقریب سوائے برائی کے اور کچھ نہیں رہے گا!"

——— "بعد میں مجھے ایسے اشتراکیوں سے بھی ملنا پڑا جو کسی فاقہ کش بچے کو دروازے سے دھتکارنے کے بعد مجھ سے کہا کرتے تھے کہ مجھے کسی حال میں بھی ان ننھے فقیروں کو کچھ نہیں دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ غالباً لاکھوں زمینداروں کے بچے ہیں!"

——— "چنانچہ حکومت روس کے ہاتھوں زمینداروں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ جس کی مثال جور وستم کے اعتبار سے انسانیت کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ لفظ "قتل عام" کا استعمال میں جان بوجھ کر کر رہی ہوں۔ کیونکہ اگرچہ زمینداروں کو قطار میں کھڑا کر کے انھیں گولی نہیں ماری گئی تھی۔ تاہم وہ جس طریقے سے ختم کئے گئے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ظالمانہ تھا۔ خاندان کے خاندان۔ مرد۔ عورتیں۔ بچے سب گھروں سے نکال دیئے جاتے تھے۔ ان کی املاک ضبط کر لی جاتی تھیں۔ حتی کہ ان کے گرم کپڑے نوچ کر پھینک دیئے جاتے تھے اور پھر انھیں سردی کے موسم میں مویشیوں کے ٹھنڈے چھکڑوں میں بند کر کے سائبیریا اور روس کے دوسرے غیر آباد علاقوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔"

"بعض سخت جان بچ جاتے تھے اور ان غیر علاقوں میں جہاں وہ جلاوطن کئے جاتے تھے نئے سرے سے زندگی شروع کر دیتے اور کاشتکاری کرنے لگ جاتے۔ لیکن عورتیں اور بچے ہلاک ہو جاتے تھے۔ لاکھوں مزارع بحر منجمد شمالی کے منطقے میں عمارتی لکڑی کے قید خانوں میں اکٹھے کر لئے جاتے تھے جہاں وہ بھوک، سردی اور محنت شاقہ سے نڈھال خفیہ پولیس کے محافظوں کے کوڑوں سے [illegible]

ماسکو سے باہر کہیں دور لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔ مبادا کہ کوئی جنبی ان فاقہ کش اور بے خانماں لوگوں کا انبوہ دیکھ لے:

—— "استالن کی اشتراکی حکومت کا آغاز روسی کسانوں اور مزدوروں کو غلام بنانے سے ہوا۔ اس لیے اپنی بقا کی خاطر اسے دوسرے ملکوں کو غلام بناتے چلے جانا ایک لازمی اور ناگزیر امر ہے۔"

—— "استالن —— معصوم۔ لاثانی۔ ہمارا سورج۔ ہماری روح ہے۔ وہ عوام یا روسیوں کا خدا ہے۔ جسے انہی کی شبیہ میں پیدا کیا گیا ہے۔ وہ "سرخ زار" ہے اور اپنی قوم کا چھوٹا باپ ہے۔"

—— "آزاد خیالی کو مسخ کر دیا گیا ہے اور اس کے معنی چھین لیے گئے ہیں۔ جس شخص میں انسانی ہمدردی باقی ہے اور جس کی ذہانت ابھی سلب نہیں ہوئی۔ وہ ضرور پکار اٹھے گا کہ اگر آزاد خیالوں اور جماعت پسندوں کی منزل محض تشدد ہی ہے۔ تو مجھے انتہائی رجعت پسند سرمایہ داری قبول ہے۔"

—— "اشتراکی عہدہ دار ایسے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں کہ ایک عام شہری صرف اس کا خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔"

—— "جب میں نے چھوٹی صنعتوں کے محکمے میں اکا ؤنٹنٹ اور میں نے ایک ہی مزدور کو دو تنخواہیں پاتے دیکھا۔ جب کہ وہ عادی تھے پوری ڈیوٹی پر چلتے ہوئے ہیں ٹائپسٹ کرکوں کے صرف ایک شخص کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کو ہٹانے کی کوشش کی تو روسی ماہر نے جو میرے ساتھ ہی کام کر رہا تھا۔ مجھے بتایا کہ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اپنی زبان بند رکھو کیونکہ کئی روسی انجینئر جنہوں نے اسی قسم کی تنقید کی تھی، تخریب کاری کے الزام میں گرفتار ہو چکے ہیں۔"

—— "استالن نے غیر جماعتی ماہرین کو گرفتار کرنے اور ان سے زبردستی اعتراف کرانے کا طریقہ رائج کیا۔"

—— "کالی دیوی کی طرح اشتراکی ریاست بھی وقتاً فوقتاً معصوم انسانوں کی بھینٹ مانگتی ہے۔"

ان اعترافات کے بعد مصنف کو اپنے اشتراکی بننے پر پچھتاوا ہوتا ہے اور وہ کس قدر حسرت سے اندازہ کرتا ہے:

"کاش، میں فوراً ہی ان اچھے لوگوں کے ساتھ شریک ہو گیا ہوتا جنہوں نے تنہا روسی عوام اور اشتراکیت کے نام نہاد علمبرداروں کے درمیان ناچاقی پیدا کرنے کی کوشش کی۔"

ترجمہ شستہ اور رواں ہے۔ مگر کہیں کہیں مترجم کے قلم سے بھول چوک بھی ہو گئی ہے۔

(صفحہ ۸۵) "لینن نے ان مدشین کی مذمت کی ہے" "کی" کا "سے بہار" "پر" یا "کو" کا محل تھا۔

(صفحہ ۲۸۸) "لیکن ہزاروں میں محض ایک" "محض" کا استعمال یہاں ٹھیک نہیں ہوا۔ "لیکن ہزاروں میں کم" کافی تھا۔

(صفحہ ۳۵) "وہ لینن کو خود دل چاہتا تھا" "کو" "نہیں" "سے" لکھنا چاہیے تھا۔

(صفحہ ۱۶۶) "مجھے بازو سے پکڑا" افسوس ہے کہ یہ غلطی عام ہوتی جا رہی ہے۔ اس جملے سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ پکڑنے والے دوسرے شخص کو اپنے بازو سے پکڑا۔ حالانکہ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس نے میرا بازو پکڑا۔

(صفحہ ۳۰۵) "آخر میں تصحیح خلوت آ گئی تھی" اس جملہ میں کتابت میں "میسر" چھوٹ گیا اور "صحیح" کی جگہ "حقیقی" "یا" "مفہوم" کی بہتر طور پر ترجمانی ہوتی۔ (صفحہ ۳۱۲) "مجھے جگہ بہ جگہ اور شخص بہ شخص مارے مارے پھرنا پڑا" دونوں جگہ "بہ" کی ضرورت نہ تھی۔ لکھنا یوں چاہیے تھا "مجھے جگہ جگہ اور ایک ایک شخص کے پاس ... پھرنا پڑا۔"

کتاب کے آخر میں انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ اور "اشارات" درج ہیں۔ یہ کتاب ہر اردو داں کی نظر سے گزرنی چاہیے۔

تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ "سوویٹ روس" جسے "جنتِ ارضی" بتایا جاتا ہے۔ حقیقت میں "جہنمِ ارضی" ہے۔ اور اشتراکی حکمرانوں نے ظلم زیادتی اور ناانصافی میں شہنشاہوں کو منزلوں پیچھے چھوڑ دیا ہے!

نئی نسلیں | "نئی نسلیں" - ادارہ [illegible] - م۔ نسیم اور طیب عثمانی - ضخامت ۵۲ صفحات - قیمت فی شمارہ چار آنے - چھ شمارے ڈیڑھ روپیہ ملنے کا پتہ - دفتر "نئی نسلیں" ۶-۱۰۲ نظیرآباد لکھنؤ - اور پاکستان میں ۶۵۰ کلیٹن روڈ کراچی

"نئی نسلیں" ایک دوماہی رسالہ ہے۔ جو پاکیزہ اور تعمیری ادب کا ترجمان ہے۔ اس کی دو اشاعتیں اب تک منظر عام پر آئی ہیں جو ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ سرورق۔ کاغذ۔ کتابت اور طباعت ہر چیز جاذبِ نگاہ ہے۔ یہ تو "صورت" کا حال ہے "سیرت" اور "باطن" اور زیادہ حسین و متناسب ہے۔

"ادب برائے زندگی
زندگی برائے زندگی"

اس رسالہ کا "مقصدی عنوان" ہے۔ اور رسالہ کے مرتبین کا عزم یہ ہے:-

"ہم ذوق بدلیں گے، مذاق ڈھالیں گے اور لوگوں کو تعمیر پسند بنا کر دم لیں گے"

کس قدر مبارک ہے یہ مقصد اور کس درجہ بلند و پاکیزہ ہے یہ عزم! اللہ تعالیٰ ان اہلِ قلم اور اربابِ فکر کے عزائم کو کامیاب فرمائے کہ یہ لوگ وہ نہیں ہیں جو ہوا کے رخ پر بہنے لگتے ہیں۔ یہ تو ہواؤں کا رخ موڑ دینے کا عزم رکھتے ہیں۔

۱۹۵۵ء کو نمونہ کا سال قرار دیا گیا ہے۔ اس سال میں مرتبین اس کا اندازہ لگائیں گے کہ رسالہ کن حلقوں میں مقبول ہوتا ہے۔ اور لوگوں کا عام رجحان کیا ہے۔ اور اپنے مقصد کو کس طرح پیش کرنا چاہیئے!

ہم "نئی نسلیں" (لکھنؤ) کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں اور اس سے اچھی توقعات رکھتے ہیں

فہرست میں "نظم پابند" نظر آیا۔ نظم کے ساتھ "آزاد" کا جوڑ تو ٹھیک بیٹھتا ہے مگر نظم کے ساتھ "پابند" لکھنا اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے کہ حقیقی شاعری بحر، وزن اور ردیف و قافیہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتی!

نظم اور افسانوں کے معیار کو خاص طور سے بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مجلہ حقیقت میں شعر و ادب کے بت کدوں میں "اذان و تکبیر" کا فرض انجام دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے!

اسلامی زندگی | "اسلامی زندگی" کے عنوان سے آٹھ کتابچے ہیں جو اسلامی پبلشنگ ہاؤس، باقی منزل، محلہ بہادرگنج - اعظم گڑھ - (یوپی) نے شائع کئے ہیں۔ ہر کتابچے کی قیمت ۲ آنے ہے۔ ان کتابوں میں مسلم۔ بخاری۔ ترمذی۔ بیہقی۔ مسند احمد بن حنبل۔ ابوداؤد۔ طبرانی اور ابن ماجہ سے احادیث لی گئی ہیں۔ ایک طرف اصل حدیث کی عربی عبارت ہے اور اس کے سامنے اردو ترجمہ ہے ——— ایک نمونہ:-

المحتکر ملعون[1] :- جو تاجر قیمتیں چڑھنے کیلئے مال روکے وہ ملعون ہے۔

یہ کتنے دیدہ زیب اور رنگین ہیں۔ جن کو دیواروں کی زینت بنانے میں تو ثواب اور آرائش کی آرائش ہے! یہ کتبے نگاہ کے سامنے رہیں۔ تو ہر ایک مسلمان محسوس کر سکتا ہے کہ اس کی زندگی میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے کہاں جھول پیدا ہو گیا!

---

[1] "احتکار" عربی میں قیمت چڑھانے کی نیت سے غلہ کو جمع کر کے روکے رکھنے کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے "محتکر" غلہ اور کھانے پینے کی چیزوں کے تاجر کو کہیں گے ——— !

تحفۂ اسلام۔ نسخۂ زکوٰۃ۔ تحفۂ عید قربان

(۱) "تحفۂ اسلام" ضخامت ۲۰ صفحات۔ (۲) "نسخۂ زکوٰۃ" ضخامت ۹۶ صفحات (۳) "تحفۂ عید قربان" ضخامت ۲۰ صفحات۔ یہ تینوں کتابیں خان صاحب مولوی محمد ظفر صاحب ایم اے، ایل ایل بی وکیل ابانوالی نے لکھی ہیں اور منیجر سلک مروارید نے چھپوا کر مفت تقسیم کی ہیں۔ کتابوں کا پاکٹ سائز ہے۔

"تحفۂ اسلام" میں مصنف نے افسانوی انداز میں اسلامی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔ "نسخۂ زکوٰۃ" اور "تحفۂ عید قربان" کا بھی یہی رنگ ہے۔ زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ اور باتوں ہی باتوں میں زکوٰۃ۔ قربانی اور عید الضحیٰ کی نماز کے مسائل بیان کر دیئے ہیں۔ (صفحہ ۹۔ نسخۂ زکوٰۃ) "اور ایسا مجرب نسخہ ہے کہ پٹ نہیں پڑتا"۔ "پٹ پڑنا" کوڑی یا پانسہ کے ساتھ بولتے ہیں۔ "ایسا مجرب نسخہ ہے کہ اپنا اثر دکھا کر رہتا ہے" لکھنا تھا۔ (صفحہ ۱۹ تحفۂ عید قربان) "ان میں مینگ مینخ نکالیں۔" "مین میکھ" محاورہ ہے۔ (صفحہ ۲۰) "کفار نے آپ کی توحید کے دلائل سے تنگ آکر آپ کو آگ میں ڈال دیا"۔ اس مفہوم کو دوسرے لفظوں میں ادا کرنا چاہیئے تھا۔

یہ کتابچے عوام کی اصلاح اور دینی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے مفید ہیں۔ لائق مصنف نے بڑی دردمندی کے ساتھ انھیں مرتب فرمایا ہے۔ اور بعض مغرب زدہ ارباب قلم کی طرح جدت طرازی اور فلسفہ آرائی کی کوشش نہیں کی۔ کتاب و سنت کی تعلیمات خدا کا خوف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام قلم کے ساتھ ساتھ رہا ہے!

اس دَورِ الحاد و انکار میں جو کوئی جس پیمانہ پر بھی دین کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ وہ قابل مبارکباد ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان ادیب اور اہل فکر کے قلم و زبان کی باگیں دین کی طرف موڑ دے۔ (آمین)

انوار التوحید

"انوار التوحید" از۔ محمد صادق سیالکوٹی۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات۔ جلی کتابت۔ دیدہ زیب طباعت۔ رنگین سرورق (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:۔ دائرۃ التبلیغ پورہ ہیراں سیالکوٹ شہر۔

دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام نے بے میل خالص "توحید" کو پیش کیا ایسی توحید جس میں نہ حلول ہے اور نہ تجسیم ہے۔ قرآن پکار پکار کر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ بناؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعت کو "ضلالت" سے تعبیر فرمایا اور ایک شخص نے جب یہ کہا کہ "جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں"۔ حضورؐ نے اسے ایسا کہنے سے روکا۔ اور فرمایا کہ (تنہا) "یوں کہو کہ جو اللہ چاہے"۔۔۔ یہ ہے کتاب و سنت کی تعلیم! مگر اس بد توفیقی اور کج اندیشی کو کیا کہیئے کہ مسلمانوں میں طرح طرح کی مشرکانہ رسوم رواج پا گئیں۔ اور بدعتوں کے دروازے کھل گئے۔

قرآن کہتا ہے کہ مصیبت کے وقت صرف اللہ تعالیٰ کو پکارو۔ اس کے سوا اور کون ہے کہ جو مصیبت کو دور کر سکے، وہی فریادرس ہے۔ وہی مشکل کشا اور دستگیر ہے۔ مگر مسلمانوں میں کچھ ایسے جہلاء اور جفاکار بھی پائے جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر "یا رسول اللہ"۔ "یا علی" "یا غوث"۔ "یا پیر دستگیر" "یا غریب نواز" پکارتے ہیں۔ اور اپنی اس شرک آمیز نادانی پر تو بہ و ندامت کی جگہ اُلٹا فخر کرتے ہیں۔ اور کوئی خدا کا بندہ انھیں ٹوکتا ہے تو اس پر "وہابی" کی پھبتی چست کر دیتے ہیں!

"انوار التوحید" میں اسی قسم کے مشرکانہ عقائد اور بدعتوں کی خوب قلعی کھولی گئی ہے۔ اور فاضل مصنف نے قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کے حوالے سے بتایا ہے کہ "توحید" کے اصل تقاضے کیا ہیں؟ اور مسلمان جن خرافات میں اُلجھے ہوئے ہیں وہ خرافات کس قدر بے اصل، دین کی روح کے مخالف اور توحید کی ضد ہیں!

کتاب کے آغاز (انتساب) میں حافظ شیرازی کا جو شعر درج ہے اس میں "صومعہ زاہد" کو "صومہ زاہد" لکھا گیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی معلوم

ہوتی ہے۔ "موحد" تقریباً ہر جگہ "موحد" لکھا ہوا ملا۔ (صفحہ ۱۰۶) "رحمۃ للعٰلمین کی غیر شرعی جھوٹی محبت کے دھوئیں سے آنکھوں میں آنسو لاکر آپ کو پہچاننے، مان جانے اور ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں" جملہ میں کتنا تکلف ہے اور ادبیت" مفقود۔ (صفحہ ۱۷۵) "تم براہِ راست خدا کو نہیں مل سکتے"۔ "کو" "نہیں" "سے" کا محل تھا۔ (صفحہ ۲۰۱) "ہر شخص نے ایک نہ ایک دن ضرور مرجانا ہے"۔ "نے" کا اس طرح استعمال روزمرہ کے خلاف ہے۔ (صفحہ ۲۹۱) "اس آیت کے خنجر بیان نے شرک کی شہ رگ کاٹ کر رکھ دی ہے اور "نخس خون" انہیں کی تلبیسی دلدل کی طرف بڑی تیزی کا ساتھ بہہ رہا ہے۔" یہ اندازِ بیان ہی عجیب و غریب ہے۔ (صفحہ ۳۰۳) "بلکہ ان کی کشت زارِ توحید میں شرک کے علاوہ باطل اور صنم پرستی کی زردوم صفت روئیدگی پھوٹنے لگی"۔ یہ بچکانہ قسم کا طرزِ نگارش ہے۔ "بحث و جھگڑا"، "راکھ و دھواں"، "دعا و پکار"، "اور بچگانی دلبستگی" میں واو عطف کا استعمال غلط ہے۔ اور "بچھڑے سے بچھڑیت" کی ترکیب جو تراشی گئی ہے اسے پڑھ کر تو وجدان تلملا اٹھا۔ صفحہ ۲۵۵ پر "شدتِ بھوک" بھی نظر آئی۔ "بزرگی کے جبل ترنگ کا نشہ"۔ "چھاہنا دعا کی شکل میں"۔ "توحید کی دیباتی صدا"۔ اس قسم کے ذیلی عنوانات پر ذوقِ سلیم مسکرانے لگتا ہے۔ صفحہ ۱۲۲ پر "تکرمت" کو "تکرمنٹ" لکھا ہے۔ اور یہ کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے!

یہ حدیث جو مشہور ہے کہ "انا من نور اللہ والخلق کلھم من نوری" تو اس کے بارے میں فاضل مؤلف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بناوٹی اور موضوع حدیث ہے!

"انوار التوحید" اپنے موضوع پر بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔ فاضل مصنف کے قلم نے شرک و بدعت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ اس کے مطالعہ سے توحید کی اہمیت اور زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا محمد صادق سیالکوٹی کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے بڑی جرأت کیساتھ شرک و بدعت کیخلاف کلمۂ حق بلند کیا ہے اور دین میں نکالی ہوئی بعض باتوں (بدعات) کو خود حنفی فقہ کی کتابوں سے غلط ثابت کیا ہے!

چمکدار لیکن

سکون بخش

جی سنز کے لیمپ قلیل مدت میں تمام پاکستان میں پھیل گئے
آپ انہیں مکانوں، آفسوں اور فیکٹریوں میں جس جگہ پاتے ہیں یہ درحقیقت
ایک اعلیٰ درجہ کی چیز ہے جو آپ کی خدمت کیلئے پیش کی گئی ہے۔ آپ
جی سنز ہی استعمال کیجئے کیونکہ یہ بہترین ہیں

پاکستان میں بنے ہوئے

جی سنز الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ

ماہر القادری

جلد ۶ نمبر ۵

ماہنامہ

فاران

اگست ۱۹۵۴ء

ایڈیٹر
ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸/

۸ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱/

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

یہ اگست کا مہینہ ہے، اس مہینے میں حکومت پاکستان آزادی کا جشن منائے گی۔ فوجوں کی پریڈ ہوگی۔ چراغاں ہوگا۔ دعوتیں اور پارٹیاں ہوں گی۔ اخبارات بڑے شاندار پیمانے پر "آزادی نمبر" شائع کریں گے۔ ریڈیو پاکستان سے آزادی کے عنوان پر تقریریں، نظمیں اور ڈرامے نشر ہوں گے۔ یقیناً آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور یہ نعمت اظہار مسرت کی مستحق ہے۔ کسی قوم اور ملک کی آزادی کا دن "عظیم الشان" "یادگار دن" ہوتا ہے۔ اس دن دل جتنی بھی خوشی محسوس کریں تھوڑی ہے!

ہمیں پہلے اپنے دلوں کا جائزہ لینا ہے کہ کیا واقعی ہمارے دل اطمینان و مسرت سے لبریز ہیں؟ کیا ہماری آنکھوں میں کامرانی کی چمک اور ہمارے چہروں پر خوشی کی جھلک پائی جاتی ہے؟ ہمارے لبوں کا تبسم کہیں مصنوعی تو نہیں ہے؟ ہم کہیں جھوٹی ہنسی تو نہیں ہنس رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہمارے دل لہولہو ہوں اور ہم لوگوں کے دکھانے کیلئے قہقہے لگا رہے ہوں!

ہماری مسکراہٹوں اور قہقہوں سے دنیا ممکن ہے دھوکا کھا جائے مگر ہم اپنے کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ دل کے زخموں کو یہ کاغذ کے مرہم کب تک چھپائے رکھیں گے۔ کانٹوں کی نوکوں پر چل کر کوئی احساس کو کیسے دھوکا دے سکتا ہے کہ وہ کانٹوں پر نہیں بلکہ فرشِ گل پر چل رہا ہے!

پاکستان جب بنایا جا رہا تھا تو طرح طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں کے باوجود دلوں میں اُمنگ تھی۔ جذبہ تھا اور عجیب ترنگ پائی جاتی تھی۔ اور اب اُمنگوں کا یہ حال ہے جیسے اُن پر اوس پڑ گئی ہو۔ جذبات کی یہ کیفیت ہے جیسے اُن کو کچل دیا گیا ہو۔ کیسی ترنگیں اور کہاں کی اُمنگیں، پوری قوم پر عجیب قسم کی افسردہ دلی اور بے اطمینانی چھائی ہوئی ہے۔ پھیکی ہنسی، بے جان مسکراہٹ۔ افسردہ چہرے۔ بجھے بجھے سے تیور۔ جیسے دنیا میں سب سے کم خوشی اور سب سے زیادہ غم ہم پاکستانیوں کے حصہ میں آیا ہے!

پاکستان نام چند بنگلوں اور چند کوٹھیوں کا نہیں ہے۔ اس لئے چند شبستانوں میں اگر خوشی کے فانوس روشن ہیں۔ تو

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پاکستان کے ہر گھر میں اسی طرح اُجالا ہو رہا ہے ۔ پاکستان کی بہت بڑی آبادی مسرت کے چراغوں سے محروم ہے! اُن کے یہاں اندھیرا ہے، اُداسی ہے۔ بددلی اور افسردہ خاطری ہے! بعض لوگ ملک کی بدحالی کو دیکھ کر پاکستان کے بارے میں ایسی بدفالی کی باتیں زبان سے نکالتے ہیں کہ جن کو سن کر دل کانپ کانپ جاتا ہے۔ کہ جس ملک کے لوگ اتنے پست ہمت ہو چکے ہوں، اُس ملک کا بس خدا ہی حافظ ہے!

کیا پاکستانیوں کو غم سے محبت اور خوشی سے بیزاری ہے ؟

اور انہوں نے جان بوجھ کر مسرت کو ٹھکرا کر بیزاری قبول کر لی ہے ؟

نہیں ایسا نہیں ہے۔ کوئی آدمی جس میں رتی برابر بھی عقل پائی جاتی ہو۔ غم کو خوشی پر اور پریشان حالی کو سکون و اطمینان پر ترجیح نہیں دے سکتا ؟

پاکستانیوں پر افسردہ دلی اور پریشان حالی کی گھٹا میں جو چھائی ہوئی ہیں۔ اس کے اسباب ہیں ۔

مسلمان قوم اللہ کے فضل سے بلند حوصلہ ہے، پست ہمت اور ایثار و قربانی سے جی چرانے والی نہیں ہے۔ پاکستان کے لئے مسلمانوں نے کیسی کیسی عظیم الشان قربانیاں دی ہیں۔ کیسے کیسے دُکھ اٹھائے ہیں، صرف پاکستان کی خاطر نہ جانے کتنوں کو آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا ہے!

مسلمانوں نے یہ تمام مصیبتیں ایک مقصد کے لئے ہنسی خوشی برداشت کی تھیں۔

اور وہ مقصد "اسلام" تھا۔

جس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا۔

اگر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو جاتا تو پاکستانی مسلمان فاقے کر کے بھی مسکراتے ۔

اور طرح طرح کی پریشانیاں اٹھا کر بھی خوش ہوتے ۔

کیونکہ کسی مقصد کی تکمیل اپنی جگہ خود بہت بڑی مسرت ہے۔ اور اس ایک خوشی کے لئے نہ جانے کتنی خوشیاں قربان کرنی پڑتی ہیں۔

مگر "پاکستان" میں اسلامی نظامِ حکومت کی راہ روکنے کے لئے جو جو تدبیریں اختیار کی گئی ہیں ۔

اور جیسے جیسے پینترے بدلے گئے ہیں۔ اُن کو دیکھ کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا کسی قوم میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ جن کو قوم کے مقصدِ وجود سے دشمنی اور عناد ہو ؟

یہاں اسلامی نظامِ حکومت کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے اور مضامین لکھنے والوں کو طرح طرح سے نوازا گیا ہے اور ان کے زبان و قلم کی بڑی بڑی قیمتیں ادا کی گئی ہیں۔

اس کے برخلاف نظامِ اسلامی کی دعوت دینے والوں پر جو "مہربانیاں" اور "کرم فرمائیاں" ہوئی ہیں۔ اُن کو دیکھ کر غالب کا یہ مصرعہ بے اختیار یاد آتا ہے ؏

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

انگریز اخلاق، معاشرت، تعلیم و تربیت اور تمدن و تہذیب کا جو ماحول پیدا کر گیا اور جو نقوش و آثار چھوڑ گیا تھا۔ وہ جوں کے توں قائم ہیں۔ ان کو بدلنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ بلکہ اُن نقوش میں اور رنگ بھرا گیا ہے۔!

کلب گھروں کی عیش و تفریح !
ریس کورسوں کی قمار بازی !
عورتوں اور مردوں کا بے باکانہ اختلاط۔
آرٹ کے نام پر رقص و سرود کی محفلوں کا جماؤ !
شراب اور جوئے کی کثرت !
غرض وہ کونسی بُرائی ہے۔جو پاکستان کی معاشرت میں نہیں پائی جاتی۔
بلکہ بعض بُرائیوں میں تو ہم پاکستانیوں نے انگریز کو بھی منزلوں پیچھے چھوڑ دیا ہے اور شاگرد اپنے استاد سے بڑھ گئے ہیں !
انگریز کے زمانے میں جرائم کی یہ کثرت، رشوت ستانی اور چور بازاری کا یہ زور شور اور اقربا پروری اور خویش نوازی کی یہ بے اعتدالی کہاں پائی جاتی تھی۔جو اب پائی جاتی ہے ؟
کسب معیشت اور تن پروری میں جائز اور ناجائز کا امتیاز اٹھتا جا رہا ہے اور عام معاشرت کی یہ حالت ہے کہ سودے سلف اور کھانے پینے کی چیزیں تک خالص نہیں مل سکتیں۔ملاوٹ اور دھوکا ہی نہیں ناپ تول میں کمی بھی کی جاتی ہے !
دن دہاڑے قتل۔کھلے خزانے ڈکیتی۔بات بات میں جعل سازی اور فریب کاری، عہد شکنی، وعدہ خلافی—! ع
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود !
تجارت کا وہ عالم کہ تاجر لوگ ہر وقت ڈرے اور سہمے رہتے ہیں کہ نہ جانے حکومت کس وقت کس تجارتی پالیسی کا اعلان کردے اور بازار کے نرخ کہاں سے کہاں پہنچ جائیں !
اور ہاں : پاکستان کی کرنسی کی بے وقعتی دیکھنی ہو تو بولیں مارکیٹ کے نٹ پاتھ پر اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے !
تعلیم و تہذیب کے اس روشن دور میں شاید پاکستان ہی وہ تنہا ملک ہے۔جہاں کاغذ پر کنٹرول کا یہ عالم ہے کہ حکومت سے کاغذ کی منظوری لئے بغیر کوئی ایک کتاب تک نہیں چھاپ سکتا ! اور خریداروں کی مانگ اور پڑھنے والوں کے شوق بے انتہا کے باوجود کسی اخبار اور رسالہ کو اجازت نہیں ہے کہ وہ منظور شدہ تعداد میں اضافہ کر سکے !
باہر کے ملکوں میں پاکستان کی عزت، مقبولیت اور ساکھ کا اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ طہران میں ہمارے وزیر خارجہ کشمیر کے مسئلہ پر پریس کانفرنس کرتے ہیں۔تو اسے کوئی اخبار چھاپتا تک نہیں۔اور کسی اخبار میں ذکر آتا بھی ہے تو اس طرح جیسے معمولی خبریں چھپا کرتی ہیں — !
مگر ہندوستان کے سفیر ڈاکٹر تارا چند جب اس کی تردید میں بیان دیتے ہیں۔تو وہ بیان طہران کے روزناموں میں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتا ہے !
اور یہ وہ ایران ہے جہاں کا بادشاہ ہی نہیں جہاں کی رعایا بھی مسلمان ہے۔جس کی سرحد پاکستان سے ملتی ہے۔جس کے والی و فرمانروا کے استقبال پر ہماری حکومت سنا ہے کہ ایک کروڑ روپے کے قریب خرچ کر چکی ہے۔اور جہاں ہمارے وفود جلد جلد آتے جاتے رہتے ہیں — !
پاکستان کے کتنے سفیر ہیں جو سفارت کے ساتھ اپنے ذاتی تجارتی کاروبار میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور ہمارے سفارت خانے عیش و تفریح میں دوسرے سفارت خانوں سے پیچھے نہیں بلکہ دو چار قدم آگے ہی نکلیں گے !

انگریز اپنے جور و استبداد کے لئے کتنا بد نام ہے، مگر اس نے اپنے سیاسی حریفوں اور مخالفوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ اس کا مقابلہ پاکستان کے حالات سے کیجئے کہ یہاں سیاسی انتقام کے لئے عدل و شرافت کی حدود کا کہاں تک احترام کیا جاتا ہے!

اور انصاف و دادرسی سے محروم کرنے کے لئے کیسی کیسی چالیں چلی جاتی ہیں۔

آنے والے مؤرخ لکھیں گے کہ گاندھی جی کے ساتھ انگریز نے کیا کیا۔

اور ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ پاکستان کی اسلامی حکومت نے کیا سلوک روا رکھا؟

ملک میں بے روزگاری، بھوک اور افلاس بڑھتا جا رہا ہے۔

آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں۔

مگر چیزوں کی گرانی میں اضافہ ہو رہا ہے!

نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ چل کر، اقتصادی حالات کیا رُخ اختیار کریں گے۔ یہاں ترقی کے لئے بس پلان ہی پلان بنتے رہتے ہیں —! ع

شہر کے شہر تخیل میں بسا دیتے ہیں!

مگر عملاً کیا ہوتا ہے، یہ داستان بڑی تکلیف دہ ہے۔ اس کا ذکر نہ چھڑے تو اچھا ہے!

لاکھوں آدمی بے گھر اور بے در ہیں۔ جنہیں سر چھپانے کے لئے سایۂ دیوار تک نہیں ملتا۔ اُن کے بسانے کے لئے مرکزی حکومت میں ایک وزارت تک قائم ہے، مگر برسات کے زمانے میں جب مہاجرین کے حالِ زار پر ترس کھا کر اخبارات واویلا مچاتے ہیں تو کچھ چٹائیاں اور کمبل اُن میں بانٹ دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد وزارتِ مہاجرین جو لمبی تان کر سوتی ہے تو جاگنے کا نام ہی نہیں لیتی!

پالیسی شاید یہ ہے کہ یہ نامراد ہندوستان سے یہاں آئے کیوں؟ انہیں چٹھی بھیج کر کس نے بلایا تھا۔ بن بلائے آدھمکے ہیں تو اپنے کئے کی سزا بھی بھگتیں؟ حکومت کے وزیروں اور سیکرٹریوں کو یورپ کے دورے پر جانے کے لئے ہی کافی روپیہ چاہیئے۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے!

ملک کے نظم و نسق کا یہ عالم ہے کہ مشرقی پاکستان میں گورنری راج قائم ہے اور مغربی پنجاب میں جگہ جگہ دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے۔ سیفٹی ایکٹ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے داسکئے جا رہا ہے!

پاکستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جس کی وزارتوں کو انقلابات سے دوچار نہ ہونا پڑا ہو!

گورنر جنرل اور گورنروں نے اپنے اختیارات پوری قوت کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔ اور یہ کرشمہ پاکستان ہی میں دیکھنے میں آیا ہے کہ صوبہ کے ایک وزیر کو گورنر کسی بے عنوانی کے سبب علیحدہ فرما دیتے ہیں اور پھر انہی صاحب کو دوبارہ وزارت میں شامل کر لیا جاتا ہے!

پارٹی بندیوں اور سیاسی توڑ جوڑ کی وہ شورا شوری ہے کہ مرکزی وزارت تک اس میں مبتلا ہے۔ اور یہ خصوصیت بھی پاکستان کی وزارت کو حاصل ہے کہ بعض "بڑے آدمیوں" پر ملک کی اکثریت اعتماد نہیں رکھتی۔ مگر وہ ہیں کہ کرسیوں پر جمے بیٹھے ہیں۔ سات سال ہونے کو آئے مگر ملک کا دستور ہی کسی طرح نہیں بن پاتا۔ یہاں تک کہ ملک میں سندھی پنجر،

پنجابی اور بنگالی کلچر کے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے اور "اردو بنگلہ" کشمکش تو اس منزل میں ہے کہ جہاں ایک ملک کے باشندوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹ جاتے ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ ابھی تک الجھن ہی میں پڑا ہوا تھا کہ نہری پانی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔

بین الاقوامی مسائل میں ہماری نمائندگی وہ صاحب فرماتے ہیں۔ جن کی وکالت اور نمائندگی کا یہ کرشمہ ہے کہ پاکستان کا کوئی مسئلہ اب تک سلجھ نہیں سکا۔

اور پاکستان کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ ان صاحب کی کوششوں سے دوسرے ملکوں کو فائدہ پہنچ جائے تو پہنچ جائے۔

مگر پاکستان کو۔

ملتِ اسلامیہ کو۔

اور اسلام کو۔

ان کی ذات سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

یہ وہ داخلی اور خارجی فتنے ہیں جن سے پاکستان دوچار ہے۔ یہ وہ خرابیٔ حالات ہے جن میں ہم پھنسے ہوئے ہیں۔ حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں!

"تنقید" کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ اس فریضہ کو ہم بڑی ناخوشگواری کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ کاش! اس کی نوبت نہ آتی مگر حالات کی ابتری کو دیکھ کر ملک کا کوئی بہی خواہ اگر خاموش رہنا چاہے گا تو بھی وہ خاموش رہ نہیں سکتا!

ہم نے اوپر جتنی باتیں کہی ہیں اگر اس میں ہم نے کوئی مبالغہ کیا ہے۔

یا کسی سے کوئی ایسی بات منسوب کی ہے جو فی الواقع درست نہیں ہے۔

تو ہمیں اس پر مطلع کر دیا جائے۔ ہم اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں کریں گے۔

لیکن جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو پھر اظہارِ حق کی پاداش میں ہم ہر عتاب اور ہر خفگی کے نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہیں!

جب یہ حالات ہوں تو ہم جشنِ آزادی کس منہ سے منائیں؟

کیا ان حالات میں خوشی منانا اور مسرت کے شادیانے بجوانا ہمیں زیب دیتا ہے؟

کیا ہماری خوشی جھوٹی خوشی نہیں ہے اور ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے گھر میں آگ لگتی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ اس طرح گھر میں روشنی تو ہو رہی ہے!

پاکستان ان مٹھی بھر "شاہانِ بے خبر" کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ تو پاکستان کے عوام کا ملک ہے! پس ان حالات میں عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی بہتری اور خوشحالی کے لئے میدانِ عمل میں آ جائیں۔ تماشائی بن کر ساحل پر بیٹھے بیٹھے نظارہ طوفاں کرنے کا وقت گزر گیا۔ اب تو دریا میں آ کر اور موجوں کے تھپیڑے سہہ کر کشتی کو بچانا ہو گا!

خطرے ٹل سکتے ہیں۔ فتنوں سے بچاؤ ہو سکتا ہے۔ حالات کو بدلا جا سکتا ہے۔ خرابیاں دور کی جا سکتی ہیں۔ مگر یہ سب اسی وقت ہو گا جب عوام بیدار ہوں گے اور اپنے فرض کو پہچانیں گے۔ عوام کی بیداری ہم پاکستان کی تعمیر کیلئے چاہتے ہیں اور پاکستان کی تعمیر کتاب و سنت کی بنیادوں پر ہو گی۔ کمال اتاترک کی اصلاحات کو پاکستان میں ہرگز ہرگز چلنے نہ دیا جائے گا!

عوام اُٹھیں اور یہ عزم لے کر اُٹھیں کہ پاکستان کو ہمیں پورے طور پر اسلامی حکومت بنانا ہے اور اس حکومت کی زمامِ اقتدار اُنہی لوگوں کو دی جائے گی۔ جن کی زندگیاں اسلام کے مطابق ہوں گی اور جو اپنے مفاد کو قوم اور اسلام کے مفاد پر بے دریغ قربان کر دینگے!

اس عزیمت و استقامت کے بعد اللہ تعالیٰ بھی مدد فرمائے گا۔ اس کی نصرت بھی ہمارے شریکِ حال ہوگی۔ یہاں تک کہ پاکستان ساری دُنیا کے لئے ایک مثالی حکومت بن جائے گا۔ اور دُنیا کی حکومتیں سیاست، تمدّن کے اصول اور تہذیب معاشرت کے گُر ہم سے سیکھیں گی۔ اور اُس وقت ہم صحیح معنوں میں وہ ڈیوٹی انجام دیں گے جس پر ہم اُمتیانِ محمدؐ کو فائز کیا گیا ہے!

مسلمان کسی عالم میں بھی مایوس نہیں ہوتا۔ وہ اس خدا کا بندہ ہے جو حیّ و قیوم ہے۔ وہ اس نبی کا اُمتی ہے جس کی نبوت جب تک دُنیا قائم رہے گی۔ مسلمان پھانسی کے تختہ اور پھولوں کی سیج دونوں جگہ شہادتِ حق کا فرض انجام دیتا ہے۔ پس جو کوئی بھی اس فریضہ کی دینی اہمیت کو محسوس کرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ قیامت کے دن ہر کوتاہی اور غفلت پر بازپرس ہوگی تو پھر اس پر آرام و راحت کی ایک سانس بھی حرام ہے!

عوام سُن لیں اور اربابِ اقتدار بھی۔ کہ آئینی حدود میں رہ کر اصلاح و انقلاب کی جدوجہد قانون و انصاف کی نگاہ میں ذرہ برابر بھی قابلِ اعتراض اور موردِ عتاب نہیں ہے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ کوئی ان آئینی کوششوں پر بھی پابندیاں لگا دے۔ اور فرمان جاری ہو کہ ان باتوں سے ملک میں انتشار اور بد نظمی پیدا ہوتی ہے — مگر ایسی تہمتوں سے بچنے کے لئے اصل مقصد کو تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اصلاح کرنے والوں پر تاریخ کے ہر دَور میں اسی قسم کے الزام لگائے جاتے رہے ہیں۔ اس مقدس گروہ کو وقت کے جابروں نے کبھی معاف نہیں کیا!

قومی مفاد اور شخصی مفاد کے درمیان ہمیشہ ٹکراؤ رہا ہے۔ ملک کے حقیقی بہی خواہوں اور سچائی کے داعیوں کے لئے ہر دَور میں دار و رسن کے ہنگامے کھڑے کئے گئے ہیں!

مگر تاریخ بتاتی ہے اور جو کچھ بتاتی ہے ٹھیک بتاتی ہے کہ کاروانِ حق و صداقت جب چل پڑتا ہے تو پھر کسی کے روکے رُک نہیں سکا ہے۔ اور نیک لوگوں کو جتنا دبایا گیا ہے۔ اُتنے ہی زیادہ وہ اُبھرے ہیں!

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اربابِ اقتدار کے پاس خزانوں کی کنجیاں اور فوج اور پولیس کی طاقت ہے۔ اور وہ لالچ اور خوف کے ہر گُر سے واقف ہیں کہ کس کو کس طرح رام کیا جا سکتا ہے۔ اور کس کو کیسے دبا سکتے ہیں۔ اُن کے پاس دھمکیاں بھی ہیں۔ طرح طرح کی پیشکش بھی ہے۔ وہاں عتاب و خفگی کے ساتھ انعام و اکرام اور لطف و نوازش بھی ہے۔ حکومت کے تمام ذرائع اور وسائل اُنہی کے قبضہ میں ہیں۔ مگر عوام کے پاس بھی اتحاد، عزیمت اور استقامت کی ناقابلِ شکست طاقتیں ہیں۔ اُن کے پاس دعائے نیم شبی اور آہِ سحرگاہی ہے۔ وہ کم سے کم اپنے خدا کے حضور آنسو تو بہا سکتے ہیں۔ اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پریشان حالوں کے آنسو زیادہ دن تک جاری نہیں رہ سکے ہیں۔ ان آنسوؤں کو آخر کار انقلابات کے دامن نے خشک کیا ہے!

پاکستان کے اربابِ اقتدار کی جو روش ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ خطرہ ہے کہ ان کی بے دانشی کمیونزم کے لئے یہاں زمین ہموار کر دے گی۔ کیونکہ یہ حضرات اس انداز پر نہیں سوچتے کہ کمیونزم ایک آئیڈیالوجی ہے جسے اس کے مقابلہ کی آئیڈیالوجی کے ذریعہ ہی دبایا جا سکتا ہے۔ طاقت کے اندھا دھند استعمال سے اور اُلجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ اور واقعات اس کی گواہی دیتے ہیں کہ کمیونزم کے دبانے کے لئے جہاں بھی طاقت صرف کی گئی ہے۔ وہاں یہ کوہِ آتش فشاں اور زیادہ تیزی کیساتھ

پھٹا ہے — !

دوسرا خطرہ بیرونی ممالک کے سیاسی غلبہ کا ہے۔ اس لئے کہ پاکستان ان "بڑے لوگوں" کی نااہلی اور غفلتوں کے سبب دوسروں کا دستِ نگر بن کر رہ گیا ہے !

پس یہ عوام کا کام ہے کہ وہ ان خطروں کے سدِباب کی کوشش کریں اور پاکستان کی حفاظت، وحدت، سالمیت اور اس کے استحکام کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیں۔

مسلم لیگ کے تنِ مردہ میں جو جان ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ مفاد پرستوں کی ایک سیاسی چال ہے۔ م زمانے ہوئے کو آزمانا بہت بڑی جہالت ہے! اس سے ندامت و پشیمانی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کی تباہی میں سب سے زیادہ ہاتھ مسلم لیگی قیادت کا ہے۔ یہ لوگ شخصی مفاد اور ذاتی عزت و وجاہت سے بلند ہو کر مشکل ہی سے کچھ سوچ سکتے ہیں — !

پاکستانی عوام کو ملک کی تمام پارٹیوں اور جماعتوں کے کارناموں کا جائزہ لینا ہے۔ کہ کس نے کیا کیا؟ اور کس جماعت کے کیا عزائم اور مقاصد ہیں اور اس کے ارکان کی سیرتیں اور زندگیاں کیسی ہیں؟ جہاں کردار نہیں وہاں بھلائی نہیں۔ اجہاں خوفِ خدا نہیں وہاں پاکبازی اور نیکوکاری نہیں !

پاکستان میں انقلاب شرارت، سازش اور فتنوں کی راہ سے نہیں۔ پاکبازی، نیکی اور استقامت کی راہ سے آئیگا!

یہ انقلاب آگ اور لہو کے اُفق سے نہیں۔ سچائی اور امن و صلاح کے اُفق سے طلوع ہوگا۔

یہ انقلاب اس طرح آئے گا کہ لوگ اسے عذاب نہیں رحمت سمجھیں گے۔

اس انقلاب میں "سروں" اور "جسموں" کی تبدیلی ہی نہیں فکر و نظر اور آئیڈیالوجی کی بھی تبدیلی ہوگی۔

اس انقلاب کا ورق نہ تو سرخ ہوگا نہ سیاہ۔ یہ نہایت ہی روشن اور تابناک ورق ہوگا۔ جس پر نور کی سپیدی سے

"اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ"

لکھا ہوگا۔ اور اس دن اہلِ پاکستان کے نام عرش و کرسی سے رحمت کے پیام آئیں گے !

ماہر القادری

۲۰ر جولائی ۵۷ء

حبیب الرحمٰن الاعظمی

حدیث دین میں حجّت ہے!

بلاشبہ قرآن پاک دین و شریعت کی اصل اساس ہے اور ادلۂ شرع میں وہی سب سے مقدم اور سب سے محکم ہے۔ مگر اس کا کام صرف اصول بتاتا ہے۔ تفریع و تفصیل اور توضیح و تشریح حدیث و سنّت کا وظیفہ ہے۔

ہر باخبر جانتا ہے کہ قرآن کریم امّت کو بلا واسطۂ رسول نہیں دیا گیا تھا کہ تم ہدایت خود یا اپنے ہی جیسے غیر نبی لوگوں کی مدد سے پڑھو اور سمجھو۔ اور اس پر عمل کرو۔ بلکہ اس کے نزول سے پہلے ایک برگزیدہ رسول کو دنیا میں بھیجکر اُن پر قرآن نازل کیا گیا۔ اور یہ صرف اس لئے کیا گیا تاکہ لوگ اپنے اپنے طور پر نہیں بلکہ صرف رسول کے بیان اور تشریح کی روشنی میں اللہ کی اس کتاب کو سمجھیں۔ چنانچہ قرآن پاک ہی میں ارشاد ہوا:۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل - ۴۴)

اور نازل کیا ہم نے آپ کے پاس ذکر (کتاب) کو تاکہ آپ کھول کھول کر بیان کریں لوگوں کے واسطے اس چیز کو جو نازل کی گئی اُن کی طرف اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

اور پھر قرآن ہی کے ذریعہ رسولؐ کے فرائض اور ان کے منصب سے دنیا والوں کو آگاہ کیا گیا اور بار بار اعلان کیا گیا کہ یہی تم کو قرآن کے کلمات، حروف سنائیں اور یاد کرائیں گے اور یہی تم کو اس کے معنی و مطالب اور رموز و حِکَم بھی بتائیں گے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا:۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (بقرہ - ۱۸۶)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب و حکمت۔ اور سکھاتا ہے تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (آل عمران - ۱۶۴)

بے تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جبکہ بھیجا اُن میں ایک رسول انھیں میں سے کہ تلاوت کرتا ہے اُن پر اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو اور تعلیم کرتا ہے اُن کو کتاب و حکمت اور بالیقین تھے وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔

تیسری جگہ ارشاد ہوا:۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔

(جمعہ ع ۱)

وہی وہ ذات ہے جس نے بھیجا اَن پڑھوں میں ایک رسول انھیں میں سے کہ تلاوت کرتا ہے اُن پر اُس کی آیتیں اور اُن کو پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے بالیقین وہ تھے اس سے پہلے کھُلی گمراہی میں!

ان تینوں آیتوں میں دو چیزیں الگ الگ ذکر کی گئی ہیں:-

(۱) تلاوتِ آیات ۔ (۲) تعلیم کتاب ۔

پہلی چیز یعنی تلاوتِ آیات کا مطلب تو ظاہر ہے۔ اب تعلیم کتاب کی نسبت غور کرنا ہے کہ اس کی کیا مراد ہے؟ اگر اس کی مراد بھی قرآن پاک کے مربوط و مرتب کلمات کو پڑھ کر سنانا اور یاد کرانا ہی ہے تو یہ تلاوتِ آیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس سے الگ ذکر کی گئی ہے۔ پس یقیناً اس سے مراد آیات کی تشریح۔ اس کے معانی و مطالب کی توضیح اور آیات کے حِکَم اور احکام کا بیان ہے۔

پس جب قرآن ہی سے یہ معلوم ہوچکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ رسالت میں جس طرح الفاظ و کلماتِ قرآن کی تلاوت تبلیغ ہے۔ اسی طرح اس کے معانی و مطالب کا بیان بھی فرائضِ رسالت میں داخل ہے۔ تو لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس طرح متنِ قرآن حجت ہے اسی طرح اس کی نبوی تشریحات بھی حجت اور واجب القبول ہیں۔ ورنہ آپ کو تعلیم کتاب کا مکلف بنانا اور تعلیم کتاب کو آپ کا منصبی وظیفہ بتلانا بالکل بے معنی ہوگا۔ الغرض ان قرآنی نصوص کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے "پیغام رساں" ہونے کے ساتھ اس پیغام کے معلّم اور مبیّن بھی ہیں۔

اور جب قرآنی نصوص سے آپ کا معلّم و مبیّنِ قرآن ہونا ثابت ہوچکا تو جو شخص آپ کی رسالت و نبوت پر ایمان رکھتا ہے۔ جس طرح اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ آپ نے متنِ قرآن کی تلاوت و تبلیغ فرمائی۔ اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کرسکتا کہ آپ نے اس کی تعلیم و تبیین بھی فرمائی۔ اور چونکہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری نبی ہیں اور اب کوئی نئی کتاب اور کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لئے آخری کتاب کا اس کے نزول کے وقت سے رہتی دنیا تک ہر دور میں محفوظ و باقی رہنا ضروری ہے اور جب اس کی بقاء ضروری ہے تو اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و عملی تشریحات و توضیحات کا بھی ہر دور میں منقول و متداول اور موجود رہنا ضروری ہے۔

اب تک ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

(۱) قرآنی نصوص کی رُو سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے معلّم و شارح و مبیّن ہیں۔

(۲) آپ نے جس طرح متنِ قرآن کی تبلیغ کی اسی طرح اس کی شرح و تبیین بھی فرمائی۔

(۳) آپ کی تشریحات و بیانِ قرآن کا قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہنا ضروری ہے۔

اس کے آگے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم دو طرح دی ہے۔ آپ نے اپنے فعل و عمل سے بھی اس پر عمل کرنے کی صورت سکھائی اور اس کا مفہوم سمجھایا ہے اور اس کی قولی تشریح بھی فرمائی ہے۔ عملی تشریح کی صورت یہ تھی کہ قرآن میں ایک حکم نازل ہوا۔ آپ نے اس حکم پر عمل کرکے لوگوں کو دکھا دیا جس کی وجہ سے الفاظِ قرآن کا مفہوم بھی متعین ہوگیا۔ اور

جس بات کا حکم ہوا ہے اس کا عملی نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ مثلاً قرآن پاک میں اقامت صلوٰۃ کا تاکیدی حکم نازل ہوا اور اس کے ارکان اور بعض اجزائے ترکیبی (مثلاً قیام، رکوع، سجود، قرأت وغیرہ) کا ذکر بھی قرآن میں کیا گیا مگر ان اجزاء کو کسی خاص ترتیب کے ساتھ ادا کرنے کا بیان اور نماز کی پوری ترکیب اس میں کہیں ذکر نہیں کی گئی۔ پس ان اجزاء کو خاص ترکیب کے ساتھ باہم مربوط کرکے نماز قائم کرنے کی ایک خاص شکل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے متعین ہوئی۔

قرآن پاک میں "اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" کا حکم دیکھ کر ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ضروری ہے کہ اس حکم پر عمل کس طرح کیا جائے اور اقامت صلوٰۃ کا کیا طریقہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ" ——— تم جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھو۔ گویا اسی سوال کا جواب ہے۔

نیز حکم "اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" کی اس عملی تشریح کے علاوہ کبھی کبھی آپ نے اقامت صلوٰۃ کی ترکیب زبانی بھی ارشاد فرمائی ہے۔ اسی طرح مثلاً قرآن پاک میں حج کو فرض قرار دیا گیا مگر حج کا طریقہ اور ترتیب وار اس کے ارکان و مناسک نہیں بیان کئے گئے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کرکے دکھا دیا کہ اس طرح اس فریضہ کی بجا آوری ہونی چاہئے۔ اور اسی لئے کہ قرآن کی تشریح و تبیین صرف آپ ہی کے قول یا عمل سے ہو سکتی ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں جہاں سارے حجاج تھے اعلان فرمایا:۔

"خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِكَكُمْ لَعَلِّیْ لَا اَرَاكُمْ بَعْدَ عَامِیْ هٰذَا" لوگو! تم سب حج کے مناسک مجھ سے سیکھ لو۔ شاید اس سال کے بعد میں تمہیں نہ دیکھوں۔

پھر قولی تشریح کی بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ قرآن پاک کی کسی آیت کا ذکر یا اس کی طرف اشارہ کرکے اس کی تفسیر یا اس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے اس کو بیان فرماتے تھے اور دوسری صورت یہ تھی کہ اپنے وہبی علم اور فہم مخصوص کی بناء پر جو استنباط و استفادہ آپ نے قرآن کریم سے کیا اس کو آیت کا حوالہ دیئے اور اس کی طرف اشارہ کئے بغیر بیان کر دیتے تھے۔

پہلی صورت کی کثیر التعداد مثالوں میں سے صرف تین مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ کو حق تعالیٰ پکارے گا وہ کہیں گے "لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ يَا رَبِّ" خدا پوچھے گا تم نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ جواب دیں گے ہاں! اس کے بعد اُن کی اُمت سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس نوحؑ نے ہمارا پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ تب خدائے تعالیٰ حضرت نوحؑ سے مخاطب ہوگا کہ تمہارے حق میں کون گواہی دے گا؟ وہ عرض کریں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی اُمت۔ اس کے بعد اُمت محمدیہ گواہی دے گی کہ حضرت نوحؑ نے پیغام پہنچا دیا تھا اور اُمت کی گواہی کی تصدیق رسول کرے گا۔ (یعنی میں کروں گا) آنحضرتؐ نے یہ ارشاد فرمانے کے بعد فرمایا کہ حق تعالیٰ کے ارشاد "وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" میں یہی بیان ہے (صحیح بخاری کتاب التفسیر بروایت ابوسعید خدری)

(۲) حضرت عدی بن حاتمؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا اَلْخَيْطُ الْاَبْيَضُ اور اَلْخَيْطُ الْاَسْوَدُ سے دو دھاگے مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ لَا بَلْ هُوَ سَوَادُ اللَّيْلِ وَبَيَاضُ النَّهَارِ (نہیں بلکہ رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے)۔ (بخاری کتاب التفسیر)

(۳) حدیبیہ کے سفر میں حضرت کعب بن عجرہؓ کے سر میں بے انتہا جوئیں پڑ گئی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا

فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی تکلیف و مشقت میں مبتلا ہو گئے ہو۔ کیا ایک بکری تم پا سکتے ہو؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اچھا سر منڈوا ڈالو اور تین روزے رکھ لو۔ یا چھ مسکینوں کو فی مسکین ایک صاع کے حساب سے صدقہ دے دو (بخاری کتاب التفسیر)

اس واقعہ میں بظاہر آیت کا حوالہ یا اشارہ نہیں ہے۔ مگر "فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ" کا نزول اسی واقعہ میں ہوا ہے۔ اس لئے ہم نے اس مثال کو بھی اسی ضمن میں ذکر کیا ہے۔

قرآن پاک کی قولی تشریح کی دوسری صورت میں احادیث نبویہ کا اکثر حصہ یا اُن کی بہت بڑی تعداد داخل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسی حدیثوں کا قرآنی ماخذ اپنے علم و عقل کی کوتاہی، و قصور فہم کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ لیکن ایسی حدیثوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن کا قرآنی ماخذ تھوڑی سی توجہ اور تامل سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ کم از کم دو مثالیں ناظرین اس کی بھی ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے:۔

"لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ"۔

تم میں سے کوئی اس وقت تک صاحب ایمان نہ ہوگا جب تک کہ اس کی خواہش اور رجحان اس تعلیم و ہدایت کا تابع نہ ہو جائے جس کو میں لایا ہوں۔

اس کی نسبت بہت آسانی سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ارشاد قرآن پاک کی حسب ذیل آیتوں سے مستفاد ہے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء۔ ۹)

سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو اُن میں اُٹھے پھر نہ پائیں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلے سے اور قبول کریں خوشی سے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ۔ (احزاب۔ ۵)

اور کام نہیں کسی ایمان والے مرد کا اور نہ ایمان والی عورت کا جبکہ فیصلہ کردیں اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا۔ یہ کہ ان کو رہے اختیار اپنے اس معاملہ میں (یعنی اللہ اور رسول کے حکم کے بعد ایمان والوں کا کام صرف تسلیم و اطاعت ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

... ...

(۲) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلَىٰ بَيْتِ اللَّهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا۔

جو شخص زاد راہ اور ایسی سواری پائے جو اس کو بیت اللہ تک پہنچا دے پھر بغیر حج کے مر جائے تو اس پر کچھ مشکل نہیں کہ یہودی ہو کر مر جائے یا نصرانی ہو کر۔

(رواہ الترمذی عن علی ونحوہ ما رواہ الداری عن ابی امامۃ)

اس کی نسبت خود ترمذی کی روایت میں اشارہ موجود ہے کہ یہ قرآن پاک کی آیت "وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الْآيَةَ" سے مستنبط ہے مگر روایت میں چونکہ پوری آیت مذکور نہیں ہے اس لئے بہت سے لوگوں کو وجہ استنباط سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ پوری آیت سامنے ہو تو اس کے آخری حصہ سے صاف وہ تہدید مفہوم ہوتی ہے جو حدیث میں مذکور ہے۔ سنیئے پوری آیت یوں ہے:

وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ (آل عمران۔ ۱۰)

اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا بیت اللہ کا اُن پر جو استطاعت رکھتے ہوں اس کی طرف راہ چلنے کی اور جو کوئی کفر کا طریقہ اختیار کرے تو پھر اللہ پروا نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔

اس قسم کی اور بھی کثیر التعداد مثالیں پیش ہوسکتی ہیں۔ مگر اس وقت چونکہ ہمارا موضوع بحث یہ نہیں ہے۔ اس لئے ان دو ہی مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ احادیث نبویہ کا اکثر حصہ قرآن پاک کی تشریح یا تفصیل یا اس سے استنباط ہے۔ جو "یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ" اور "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" جیسے نصوص کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت میں داخل ہے۔ اور یہی قرآنی نصوص و بینات ہم کو یہ بھی بتلاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تشریحات و تفریعات اور استنباطات بھی واجب القبول اور واجب الاتباع ہیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کی بیان کی ہوئی ایک اور حقیقت پر غور کیجئے۔

تعلیم حکمت

قرآن حکیم نے تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فریضہ بتایا ہے۔ یہ حکمت کیا چیز ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے فکر صحیح اور فہم سلیم کی ضرورت ہے۔

حکمت کی مراد معلوم کرنے کیلئے سب سے پہلے خود قرآن پاک کی طرف رجوع کیجئے۔ تو اس میں آپ کو ایسی متعدد آیات ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کو اللہ نے اُتارا اور نازل کیا ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ایک جگہ ارشاد ہے:۔

وَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا۔ (النساء۔ ۱۷)	اور نازل کی اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اور سکھایا تجھ کو وہ جو تو نہیں جانتا۔ اور ہے اللہ کا فضل تجھ پر بڑا۔

سورۂ بقرہ میں ایک موقع پر فرمایا:۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ (بقرہ۔ ۲۹)	اور یاد کرو اللہ کی نعمت اپنے اُوپر اور جو نازل کی تم پر یعنی کتاب اور حکمت۔ نصیحت کرتا ہے اللہ تم کو اس کے ساتھ!

سورۂ احزاب کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں کی طرح حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاوت ازواج مطہرات کے گھروں میں ہوتی تھی۔ ارشاد ہے:۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى عَلَيْكُنَّ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ۔ (احزاب۔ ۴)	اور یاد کرو اس کو جس کی تلاوت ہوتی ہے تم پر تمہارے گھروں میں یعنی اللہ کی آیتیں اور حکمت۔

سوال یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں قرآن کی آیتوں کے علاوہ دوسری کیا چیز پڑھی جاتی تھی؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو قرآن کے علاوہ کیا سُناتے تھے؟

اس سوال کا صرف یہی ایک جواب ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی حدیث اور آپ کی سنت تھی (یعنی آپ کے عام دینی نصائح اور دینی افادات و ارشادات) اور چونکہ اس آیت میں حکمت کے ذکر کا (یعنی اس کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا) حکم ہے اس لئے اسی آیت سے حدیث و سنت کے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا وجوب بھی معلوم ہوگیا۔ اور یہ بات بھی تقریباً بدیہی اور مسلم ہے کہ علم و ذکر و حفظ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ بلکہ عمل کیلئے مقصود ہیں۔ اس لئے اسی آیت سے حدیث و سنت پر عمل کا واجب اور ضروری ہونا بھی معلوم ہوگیا۔

اور جب سنت ہی کا دوسرا نام حکمت ہے تو اس سے پہلی آیتوں سے (جن میں کتاب کی طرح حکمت کو بھی منزل من اللہ فرمایا گیا ہے) یہ ثابت ہوا کہ سنت بھی منزل من اللہ اور وحی خداوندی ہے۔

قرآن کے بعد جب ہم معلّمِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو جس طرح قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے علاوہ ایک اور چیز بھی (جس کا نام حکمت ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر اُتاری ہے اسی طرح معلّمِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی ہم کو یہی بتلاتی ہیں۔

اَلَاۤ اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ ۔ کہ مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اس کیساتھ ایک اور چیز بھی اُس کے مثل دی گئی۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی عن المقدام بن معدی کرب)

کتاب وسنّت کے انہیں نصوص کی بناء پر تمام ائمہ وعلمائے سلف اس بات پر متفق ہیں کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اور اس طرح کی دُوسری آیات میں جو حکمت کا لفظ وارد ہوا ہے اس سے مراد سنّت ہی ہے اور سنّت بھی وحی الٰہی کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قیم کتاب الروح میں لکھتے ہیں:۔

اِنَّ اللّٰہ سُبْحَانَہ وتعالیٰ اَنْزَلَ علیٰ رَسُوْلِہٖ وحیین، واوجب علی عبادہ الایمان بھما۔ والعمل بمافیھما، وھما الکتٰب والحکمۃ وقال تعالیٰ "وانزل اللّٰہ علیک الکتاب والحکمۃ" وقال تعالیٰ "ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم اٰیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ" وقال تعالیٰ "واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من اٰیات اللّٰہ والحکمۃ"
والکتاب ھوالقراٰن والحکمۃ ھی السنۃ باتفاق السلف، وما اخبربہ الرسول عن اللّٰہ فھو فی وجوب تصدیقہ والایمان بہ کما اخبربہ الرب تعالیٰ علیٰ لسان رسولہ ھذا اصل متفق علیہ بین اھل الاسلام، لاینکرہ الامن لیس منھم وقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ (ص ۹۲)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول پر دو قسم کی وحی نازل کی اور دونوں پر ایمان لانا اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس پر عمل کرنا واجب قرار دیا اور وہ دونوں قرآن وحکمت ہیں (اس کے بعد علامہ نے اس دعوے کے ثبوت میں وہی قرآنی آیات درج کی ہیں جو اُوپر پیش کی جاچکی ہیں جن میں کتاب وحکمت کی تنزیل تعلیم کا ذکر اور ان کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا حکم ہے۔ ان آیات کو درج کرنے کے بعد علامہ لکھتے ہیں:)
کتاب تو قرآن ہے اور حکمت سے باجماع سلف سنت مراد ہے۔ رسول نے اللہ سے پاکر جو خبر دی اور اللہ نے رسول کی زبان سے جو خبر دی۔ دونوں واجب التصدیق ہونے میں یکساں ہیں۔ یہ اہل اسلام کا بنیادی اور متفق علیہ مسئلہ ہے اس کا انکار وہی کرے گا جو ان میں سے نہیں ہے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے کتاب دی گئی۔ اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور چیز بھی دی گئی۔ (یعنی سنّت)

اسوۂ رسول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی جو تشریح وتبیین فرمائی اور وہ حکمت جو آپ پر نازل کی گئی۔ ہر مومن بالقرآن کے لئے ان دونوں کا واجب القبول ہونا آپ معلوم کرچکے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری چیز جو

پیروی ہر مومن پر قرآن نے لازمی قرار دی ہے۔ وہ ہے پوری اسلامی و مذہبی زندگی کا وہ نمونہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں جلوہ گر تھا۔ سورۂ احزاب میں ارشاد ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	تمہارے لئے بھلی تھی سیکھنی چال رسول اللہ کی
لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ	اس کے لئے جو امید رکھتا ہے اللہ کی اور پچھلے
كَثِيرًا۔ (احزاب - ۳)	دن کی اور یاد کرتا ہے اللہ کو بہت سا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے زندگی کے ہر ہر مرحلہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کا حکم ہم کو دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف جنگ کی حالت میں اور پریشانی کے موقع پر آپ کے صبر و ضبط کی مثال سامنے رکھنے اور فقط اس کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہو جیسا کہ اس آیت کے متعلق آجکل کے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اس کی تو کوئی کمزور سے کمزور وجہ نہیں ہو سکتی کہ جنگ کے موقع پر تو آپ کا طرز عمل واجب الاتباع ہے مگر امن و صلح کے موقع پر آپ کا طرز عمل واجب الاتباع نہیں ہے۔ یا باب جہاد میں تو آپ کی ذات میں ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے مگر اقامت صلوٰۃ و ادائے حج کے باب میں آپ کی ذات میں ہمارے لئے کوئی قابل پیروی نمونہ نہیں ہے!

یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ پر اس شخص کو جو خدا سے محبت کا دعویٰ کرتا ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم بالکل عموم و اطلاق کے ساتھ دیا گیا۔ ارشاد ہے:۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي	کہئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرے پیچھے
يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ۔ (آل عمران - ۴)	چلو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

یہاں اللہ کی محبت کا معیار مطلق نبی کا اتباع قرار دیا گیا۔ اگر رسول کی ذات اسوۂ عمل نہیں ہے اور قرآن کے ماننے والے اس کی پیروی کے مامور نہیں ہیں۔ تو بتلایا جائے کہ اللہ نے اپنی نبی سے اپنی پیروی کرنے کو کیوں کہا؟

یہ کہنا تو عقل و فہم کی رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے کہ "میری پیروی کرو" کا مطلب صرف اتنا ہے کہ میں جو قرآن سناتا ہوں بس اس کو سن لو۔ اس لئے کہ اتباع یا پیروی یا پیچھے چلنے کا یہ مطلب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوتا۔ ان الفاظ کے معنیٰ تو کسی کے طرز عمل کی تقلید اور کسی کے طور طریقہ پر کاربند ہونے ہی کے آتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ہر حق طلب اور حق پسند کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح آگئی ہوگی کہ قرآن پر ایمان رکھنے والوں کو مجرد قرآن کے ماننے اور اپنے اپنے طور پر اس کو سمجھنے اور اپنے اپنے فہم کے مطابق اس پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ قرآن کے ساتھ حکمت کو بھی ماننے اور قبول کرنے اور اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوۂ عمل قرار دینے کے بھی وہ مامور ہیں۔ نیز قرآن پاک کو رسول سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ انھیں کی تعلیم، تبیین اور تشریح کی روشنی میں سمجھنے کے وہ مکلف ہیں۔

جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی جو تبیین فرمائی اور تعلیم دی اور وہ حکمت جو آپ پر اتاری گئی۔ نیز آپ کی پوری زندگی جس کا مکمل نقشہ ان خوش قسمتوں نے ہمارے سامنے کھینچکر رکھ دیا ہے جنھوں نے اس زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔ انھیں تینوں چیزوں کا نام حدیث و سنت ہے۔ اور نصوص کتاب اللہ کی رو سے ان تینوں کے واجب القبول ہونے کا مطلب بالفاظ دیگر یہ ہے کہ قرآن۔ حدیث و سنت کو واجب القبول اور واجب الاتباع قرار دیتا ہے!

حدیث کے حجت ہونے کی ایک اور قرآنی دلیل

حدیث حجت ہے یا نہیں ؟ اور اس کو کوئی مسلمان نظر انداز کر سکتا ہے یا نہیں ؟ اس کا فیصلہ ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہے اور وہ طریقہ بھی خود قرآن پاک کا بتایا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے اتباع سبیل المؤمنین (مومنین اولین کے طریقہ پر چلنے) کو ضروری بتایا ہے۔ ارشاد ہے:-

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء - ۱۷)

اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے بعد اس کے کہ واضح ہو گئی اس کے لئے ہدایت اور راہ پکڑے مومنین کے راستے سے الگ ہم حوالہ کریں گے اس کو اس راہ کے جس کی طرف اس نے رُخ کیا ہے اور انجام کار ہم اس کو داخل کریں گے دوزخ میں اور بُرا ہے وہ ٹھکانا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے مومنین کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کو سخت وعید سنائی ہے اور اس کو مستحق دوزخ قرار دیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں بھی یہ معلوم کیا جائے کہ مومنین اولین کا راستہ کیا تھا ؟ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو یا بلفظ دیگر حدیث و سنت کو حجت مانتے اور اس کو مشعل راہ قرار دیتے تھے یا نہیں ؟ پس جب ہم اس باب میں مومنین اولین کی راہ و روش معلوم کرنے کے لئے اسلامی روایات اور اسلامی تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم کو حسب ذیل حالات و واقعات ملتے ہیں:-

(۱) تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۹ میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی قضیہ آتا تھا تو پہلے وہ کتاب اللہ میں نظر فرماتے تھے - اگر کتاب اللہ میں ان کو فیصلہ مل جاتا تو وہی فیصلہ صادر فرماتے - اس میں ناکامی کی صورت میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت اس باب میں انھیں معلوم ہوتی تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے - اگر خود ان کو اس باب میں کسی سنت کا علم حاصل نہ ہوتا تو باہر نکل کر دوسرے مسلمانوں (صحابہ) سے دریافت فرماتے کہ ایک اس طرح کا معاملہ میرے پاس آیا ہے، اگر تم کو معلوم ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے معاملہ میں کیا فیصلہ کیا ہے تو بتاؤ - پھر ایسا ہوتا تھا کہ بعض اوقات کئی کئی آدمی اکٹھا ہو کر بتاتے تھے کہ ہاں اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکر فرماتے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْنَا مَنْ یَّحْفَظُ عَنْ نَبِیِّنَا۔

خدا کا شکر ہے جس نے ہم میں ایسے لوگ بنائے جو ہمارے نبی کی باتیں یاد رکھتے ہیں۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اور سب سے مشکل مسئلہ یہ سامنے آیا کہ آپ کا جانشین کس کو مقرر کیا جائے۔ تو اس مسئلہ کا حل بھی صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں "تلاش کیا"۔

طبقات ابن سعد و تاریخ الخلفاء وغیرہ میں حضرت علی کا قول منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم نے اپنے معاملہ (مسئلہ جانشینی) میں غور و فکر کیا تو ہم نے یہ پایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق کو اپنی زندگی میں نماز کے لئے آگے بڑھایا (یعنی امام مقرر کیا) تو جس کو آپ نے ہمارے دین کے لئے پسند کیا تھا ہم نے اس کو اپنی دنیا کے لئے پسند کر لیا (اور ابوبکر کو آگے بڑھایا۔ (جانشین رسول منتخب کر لیا)

تاریخ الخلفاء وغیرہ میں حضرت ابن مسعود کا بیان مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انصار کی زبانوں پر یہ بات آئی کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم (مہاجرین) میں سے ہو - یہ بات حضرت عمر کو معلوم ہوئی تو انھوں

انصار کے پاس جا کر کہا۔ اے گروہ انصار! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو مامور فرمایا کہ وہ لوگوں کی امامت کریں۔ اگر جانتے ہو تو بتاؤ کہ کس کا دل گوارا کرتا ہے کہ ابوبکر سے آگے بڑھے۔ یہ سنتے ہی انصار کی آنکھیں کھل گئیں اور بول اٹھے:۔

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ نَتَقَدَّمَ اَبَا بَکْرٍ۔ — خدا کی پناہ کہ ہم ابوبکر کے آگے بڑھیں۔

یعنی سنت نبی سامنے آجانے کے بعد تمام انصار مطمئن ہو گئے اور بے چون وچرا اس کو تسلیم کر لیا۔

نیز اسی کتاب میں ہے کہ وفات نبوی کے بعد انصار کے مجمع میں حضرت ابوبکر نے حضرت سعد کو مخاطب کر کے فرمایا کہ سعد! تم جانتے ہو، تم بیٹھے ہوئے تھے کہ آنحضرتؐ نے ایک دفعہ فرمایا تھا قُرَیْشٌ وُلَاۃُ ھٰذَا الْاَمْرِ (اس امر کے والی قریش ہیں) حضرت سعد نے تامل ہوئے کہ آپ نے سچ کہا۔ ہم وزیر و پشت پناہ ہوں گے اور آپ لوگ امیر و والی (یعنی آنحضرتؐ کا قول یاد دلانے کے بعد انصار نے خلافت کا خیال چھوڑ دیا)

(۳) وفات نبوی کے بعد دوسرا مسئلہ آپ کے دفن کا تھا۔ اس میں اختلاف رائے تھا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے۔ اس کا فیصلہ بھی حدیث نبوی سے ہوا۔

اسی کتاب اور دوسری بہت سی کتب (مثلاً "تاریخ کامل ص۲۱۳") میں ہے کہ جب یہ اختلاف رائے ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ہر نبی اپنی اسی خوابگاہ کے نیچے مدفون ہوتا ہے، جہاں اس کی روح قبض کی گئی ہو" یہ سنتے ہی سارا اختلاف ختم ہو گیا۔ اور بالاتفاق رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی مقدس سرزمین میں جہاں آپ کی روح پاک قبض کی گئی تھی سپرد خاک کئے گئے۔

(۴) تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم واقعہ جمع قرآن کا واقعہ ہے۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو جب یہ مشورہ دیا کہ پورا قرآن یکجا کر دیا جائے اور ابتداء سے انتہا تک یکجا لکھ کر ایک مصحف میں دو دفتوں کے درمیان محفوظ کر دیا جائے تو حضرت ابوبکر ابتداءً بار بار یہی فرماتے تھے کہ:۔

كَيْفَ اَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ — میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔

پھر حضرت ابوبکر کو شرح صدر ہو گیا اور انہوں نے حضرت زید بن ثابت کو بلا کر جمع قرآن کی اہم خدمت ان کے سپرد کرنا چاہی تو ابتداء میں ان کو بھی تامل ہوا اور وہ بھی بار بار یہی کہتے تھے کَیْفَ تَفْعَلَانِ شَیْئًا لَمْ یَفْعَلْہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لیکن بعد میں اللہ نے ان کے سینہ کو بھی کھول دیا اور شیخین کی رائے کا حق ہونا ظاہر کر دیا تو وہ اس خدمت کی انجام دہی پر کمربستہ ہو گئے۔

اس واقعے کے نقل کرنے سے یہ مقصد ہے کہ اس سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو ہر کام پر اقدام کرنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی تلاش وجستجو ہوتی تھی۔ یہی ان کی روش اور ان کا راستہ تھا۔

(۵) موطا امام مالک میں ہے کہ ایک آدمی کی وفات کے بعد اس کی دادی حضرت ابوبکر کی خدمت میں اپنی میراث طلب کرنے آئی۔ آپ نے فرمایا:۔

مالک فی کتاب اللہ شئ وما علمت لک فی سنۃ رسول اللہ شیئاً فارجعی حتی اسأل الناس۔ — کتاب اللہ میں تیرا کچھ حق نہیں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تیرا کوئی حق مجھے معلوم نہیں۔ لہٰذا اسوقت لوٹ جا۔ تاآنکہ میں اور لوگوں سے دریافت کروں!

اس کے بعد انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو حضرت مغیرہ نے بتایا کہ میری موجودگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

میّت کی دادی کو سدس (چھٹا حصّہ) دلایا تھا۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا۔ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ تو حضرت محمد بن مسلمہ انصاری نے بھی کھڑے ہو کر یہی بیان کیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے اس عورت کو سدس دلایا۔

(۶) پارسیوں کا ملک اسلامی مفتوحات میں داخل ہونے کے بعد حضرت عمر کو فکر لاحق تھی کہ پارسیوں سے جزیہ لیا جائے یا نہیں۔ (اس لئے کہ قرآن پاک میں صرف اہل کتاب سے جزیہ لینے کا ذکر ہے اور قرآن کی زبان میں اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ مراد ہوتے ہیں) تا آنکہ عبد الرحمٰن بن عوف نے شہادت دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے۔ تب حضرت عمر نے پارسیوں سے جزیہ لیا۔

(۷) صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ حضرت ابن عباس سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ ایک عورت نے اپنے شوہر کی وفات کے صرف چالیس دن بعد بچّہ جنا تو اس کی عدّت پوری ہو گئی یا نہیں؟ حضرت ابن عباس نے جواب دیا کہ وضع حمل اور چار ماہ دس دن پورے ہونے میں سے جو بعد میں واقع ہوگا اس سے عدت منقضی ہو گی۔ اس مجلس میں ابو سلمہ اور حضرت ابوہریرہ بھی موجود تھے۔ ابن عباس کا جواب سُن کر ابو سلمہ نے کہا۔ (قرآن میں ہے):-

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔

حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔

ابو سلمہ کا مطلب یہ تھا کہ صورت مسئولہ میں عدت پوری ہو گئی۔ یہ سُن کر حضرت ابوہریرہ بولے کہ میں بھی اپنے بھتیجے ابو سلمہ سے اتفاق کرتا ہوں۔ تب حضرت ابن عباس نے اپنے غلام کریب کو حضرت ام سلمہ کے پاس بھیجا (انہوں نے سوال سن کر) فرمایا سبیعہ اسلمیہ حاملہ تھیں کہ اسی حالت میں ان کے شوہر شہید کر دیئے گئے۔ واقعہ شہادت کے چالیس دن بعد سبیعہ کے بچّہ پیدا ہوا اور نکاح کے پیغام آنے لگے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح کرا دیا۔

حافظ ابن حجر اس واقعہ کے تحت میں فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن عباس کے شاگرد اور متبعین کا قول جماعت کے موافق ہے۔

اس واقعہ سے اختلاف رائے اور دو آیتوں میں بظاہر تعارض کے وقت صحابہ کا سنّت کی طرف رجوع کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا بالکل ظاہر ہے۔

(۸) ابوداؤد۔ ترمذی وغیرہ میں ہے کہ رومی سلطنت اور حضرت معاویہ کے درمیان ایک معاہدہ کی رُو سے ایک خاص مدت تک جنگ بند تھی۔ جب وہ مدّت قریب ختم ہوئی تو حضرت معاویہ نے اپنی فوج کے ساتھ دشمن کے ملک کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مدّت کے اندر جنگ تو شروع نہ کریں گے۔ لیکن ان کے قریب پہنچ جائیں گے اور جب مدت ختم ہو جائے گی تو اچانک یکبارگی دھاوا بول دیں گے۔ ایک دن حضرت معاویہ کو دُور سے ایک سوار آتا دکھائی دیا۔ جو بلند آواز سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا "اللہ اکبر! اللہ اکبر! عہد کو پورا کرنا ہے۔ توڑنا نہیں ہے" لوگوں نے بغور دیکھا تو وہ سوار حضرت عمرو بن عبسہ صحابی تھے۔ حضرت معاویہ نے اُن سے پوچھا۔ بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا۔ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ جس شخص کا کسی قوم سے کوئی معاہدہ ہو تو اس عہد میں کوئی ردوبدل نہ کرے۔ جب تک کہ اس کی مدّت نہ گزر جائے یا اس قوم کو مطلع نہ کر دے۔ حضرت معاویہ یہ سُن کر اپنی فوج کے ساتھ دار الاسلام کو واپس ہو گئے۔

(۹) تاریخ طبری و تاریخ کامل ص ۲۹۲/۲ میں ہے کہ حضرت عمر ایک بار مدینہ سے بارادہ شام روانہ ہوئے۔ جب مقام سرغ میں پہنچے تو امرائے لشکر نے آکر خبر دی کہ ملک شام میں اس وقت وبا پھوٹ پڑی ہے۔ طاعون بڑے زوروں کا پھیلا ہوا ہے۔ حضرت عمر نے یہ سُن کر پہلے مہاجرین و انصار کو جو ساتھ میں تھے اکٹھا کر کے مشورہ کیا تو وہ مختلف الرّائے ظاہر ہوئے۔ کچھ لوگوں نے کہا

لوٹ چلئے اور کچھ نے کہا جب وجہ اللہ آئے ہیں تو واپس کیوں؟ حضرت عمرؓ نے یہ اختلاف دیکھ کر ان لوگوں سے اُٹھ جانے کو کہا۔ اور فرمایا۔ اب قریشی مہاجرین فتح کو بلاؤ۔ وہ آئے تو سب کے سب لوٹ جانے کے حق میں تھے۔ اس بناء پر حضرت عمرؓ نے واپسی کا قصد کیا۔ مگر حضرت ابو عبیدہ نے اس سے اختلاف ظاہر کیا۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگ اسی پیچ میں تھے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ آ پہنچے۔ وہ پہلے مشورہ میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اور ان کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے پوچھا کیا قصہ ہے؟ جب ان کو بتایا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ میرے پاس اس باب میں ایک علم ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ صاحب امانت اور قابل تصدیق ہیں۔ بتائیے وہ کیا علم ہے؟ انہوں نے کہا۔ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ:-

"جب تم سنو کہ کسی سرزمین میں وبا پھیلی ہوئی ہے تو وہاں جاؤ مت۔ اور جب تمہارے جائے قیام میں وبا پھیل جائے تو بقصد فرار اس جگہ سے نکلو مت۔"

یہ سنتے ہی سب اختلاف مٹ گیا اور حضرت عمرؓ سب کو لے کر مدینہ لوٹ آئے۔

(۱۰) تاریخ کامل و تاریخ الخلفاء وغیرہ تمام کتب تاریخ میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور تمام صحابہ نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کرنے کے بعد بایں الفاظ بیعت کی تھی:-

نبايعك على كتاب الله	ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت اس شرط پر کرتے
وسنة رسوله وسنة الخليفتين	ہیں کہ آپ کتاب اللہ، رسول کی سنت اور
بعدہ۔	دونوں سابق خلفاء کی روش پر عمل کریں گے۔

یہ دس مثالیں بلا مبالغہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ اس سے زیادہ کی ہم اس لئے ضرورت نہیں سمجھتے کہ ایک منصف مزاج کے لئے یہی کافی سے زیادہ ہیں اور ان کو سامنے رکھنے کے بعد کوئی بھی منصف اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ مومنین اولین کا راستہ حدیث و سنت کے ساتھ احتجاج اور ہر باب میں اس کو مشعلِ راہ قرار دینا تھا۔

اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اوپر "سبیل المومنین" کے بیان کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا اس کا ماخذ حدیث و تاریخ کی کتابیں ہیں جو صحابہ کے بعد لکھی گئی ہیں اور وہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو گذارش ہے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ قرآن پاک نیز اس کے احکام اور اس پر ایمان و عمل کا حکم باقی ہو اور "سبیل المومنین" کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ اور اس کی کوئی صورت موجود نہ ہو۔ ایسا کہنا تو قرآن کو ناقابل عمل اور معطل قرار دینا ہے۔ جس کی جرأت کوئی مومن تو مومن کوئی صاحب علم و انصاف غیر مومن بھی نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک پر عمل کا دروازہ جب تک کھلا رہیگا اس وقت تک یہ راستہ بھی کھلا رہیگا۔ اور اس راستے کے پورے معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بھی موجود رہیں گے۔ اور جب ایسا ہے تو بتایا جائے کہ بجز مجامیع احادیث و کتب طبقات و اسماء الرجال اور کتب سیرو تاریخ کے اور کونسا ذریعہ ہے جس سے مومنین اولین کی راہ و روش کا تفصیلی علم حاصل ہو سکے۔ اگر کوئی دوسرا ذریعہ بھی ہے تو بتایا جائے۔ اور اگر نہیں ہے تو مذکورہ بالا چیزوں کو بالکلیہ جعلی بے بنیاد اور بے اعتبار کہنا درحقیقت قرآن پاک پر عمل کا دروازہ بند کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام اور مسلم قوم کو دوسرے مذاہب و اقوام عالم پر جو مخصوص تفوق و امتیاز حاصل ہے اس کو بھی برباد کرنا ہے۔ اس لئے کہ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ مسلم قوم کی نہ کوئی تاریخ ہے نہ اس کے علمی و عملی کارنامے ہیں اور نہ ان کارناموں کا کوئی ذریعۂ علم دنیا میں موجود ہے۔ کیا ایسی بات کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے۔؟

اس سلسلہ میں بعض منکرین حدیث کا یہ رویہ کس قدر عجیب و غریب اور کیسا ناقابل فہم ہے کہ وہ تاریخ پر تو اعتماد کرتے ہیں اور روایات حدیث کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے۔ حالانکہ کتب تاریخ کے تمام مصنفوں نے ہر ہر واقعہ کی نسبت نہ تو بتانے کا التزام کیا ہے کہ وہ ان کو کس واسطہ اور کس سلسلے سے معلوم ہوا۔ نہ ان واسطوں کی عدالت و ثقاہت وغیرہ ان شرائط کی سختی سے پابندی کی ہے جن کی محدثین

نے لی ہے۔ بایں ہمہ تاریخ تو قابلِ قبول اور لائقِ اعتماد ہو لیکن مجامیعِ احادیث جن میں ہر ہر قول و فعلِ رسولؐ یا آثار و احوالِ صحابہ کے لئے پورا پورا التزام ہے کہ مصنف کو جن واسطوں سے علم ہوا ہے ان کو سلسلہ وار اس طرح بتائے کہ کہیں انقطاع نہ ہو۔ اور یہ واسطے بھی ایسے ہوں کہ ان کے معتبر، عادل اور ثقہ ہونے کا ثبوت موجود ہو۔ غرض اس التزام و احتیاط کے باوجود حدیث کے مجموعے قابلِ اعتبار نہ ہوں۔ یہ کتنی عجیب بات اور کیسی ستم ظریفی ہے۔

علاوہ ازیں پختہ اور کچی سندوں کے ساتھ بھی حدیثوں کو نہ ماننے اور ان کو بے اعتبار رکھنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہی تو ہے کہ کتبِ احادیث کے مصنفوں نے محض بے بنیاد باتوں کو بالکل جعلی اور فرضی سندوں کے ساتھ کتابوں میں درج کر دیا ہے۔ ان حضرات کو خاص علمی طور پر کبھی تو سوچنا چاہیئے کہ ایسا ممکن کیونکر ہے؟ کیا جب احادیث کے یہ مجموعے لکھے گئے اس وقت دنیا میں ایک بھی "صحیح قسم" کا مسلمان نہیں تھا جو اس ساری جعل سازی اور افترا پردازی کا مقابلہ کرتا؟ یا کم از کم اس پر نکیر ہی کرتا۔

مثال کے طور پر میں موطا کا نام لیتا ہوں۔ حدیث کا یہ مجموعہ بقول ابو طالب مکی سنہ ۱۲۱ھ یا سنہ ۱۳۱ھ کے بعد یعنی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سو دس یا ایک سو بیس برس بعد وجود میں آیا۔ (مقدمہ تنویر الحوالک ص ۶) اور اس کے وجود میں آنے سے چند برس (تقریباً ۱۳ یا ۲۳ برس) پہلے تک یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار و گفتار سے شرف اندوز ہونے والے اصحابِ رسولؐ اس دنیا میں موجود تھے۔ اور ان لوگوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں جنہوں نے صحابۂ رسول کی صحبت کی سعادت پائی تھی۔ اور بلادِ اسلام مثلاً بلادِ حجاز، شام، عراق اور مصر وغیرہ کا ذکر اس وقت چھوڑ دیجئے صرف مدینہ منورہ ہی کو لیجئے جہاں یہ کتاب وجود میں آئی۔ اسی میں اتنی کثرت سے تابعین (جنہوں نے صحابہ کی صحبت پائی تھی) موجود تھے جن کا شمار مشکل ہے۔ مثال کے طور پر چند نام سنئے:۔

(۱) اسحٰق بن عبداللہ بن ابی طلحہ المتوفی سنہ ۱۳۴ھ
(۲) اسماعیل بن محمد بن زہری المتوفی سنہ ۱۳۴ھ
(۳) ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن المتوفی سنہ ۱۳۶ھ
(۴) زید بن اسلم المتوفی سنہ ۱۳۶ھ۔
(۵) سالم بن ابی امیہ المتوفی سنہ ۱۲۹ھ
(۶) سعد بن اسحاق المتوفی بعد سنہ ۱۴۰ھ
(۷) سعید بن ابی سعید المقبری المتوفی سنہ ۱۲۳ھ
(۸) سلمہ بن دینار المتوفی بعد سنہ ۱۴۰ھ
(۹) شریک بن عبداللہ بن ابی نمر المتوفی بعد سنہ ۱۴۰ھ
(۱۰) صالح بن کیسان المتوفی بعد سنہ ۱۴۰ھ
(۱۱) صفوان بن سلیم المتوفی سنہ ۱۳۲ھ
(۱۲) عبداللہ بن ابی بکر بن ابی حزم المتوفی سنہ ۱۳۵ھ
(۱۳) عبداللہ بن دینار المتوفی سنہ ۱۲۷ھ
(۱۴) ابو الزناد المتوفی سنہ ۱۳۰ھ
(۱۵) عبد ربہ بن سعید المتوفی سنہ ۱۳۹ھ
(۱۶) محمد بن المنکدر المتوفی سنہ ۱۳۱ھ
(۱۷) مخرمہ بن سلیمان المتوفی سنہ ۱۳۰ھ
(۱۸) موسیٰ بن عقبہ المتوفی سنہ ۱۴۱ھ
(۱۹) وہب بن کیسان المتوفی سنہ ۱۲۷ھ
(۲۰) یحییٰ بن سعید قاضی مدینہ المتوفی سنہ ۱۴۳ھ
(۲۱) یزید بن رومان المتوفی سنہ ۱۳۰ھ
(۲۲) یزید بن عبداللہ بن لیثی المتوفی سنہ ۱۳۹ھ
(۲۳) ہشام بن عروہ المتوفی سنہ ۱۴۵ھ
(۲۴) مسور بن رفاعہ المتوفی سنہ ۱۳۸ھ
(۲۵) ابو طوالہ قاضی مدینہ المتوفی آخر ایام بنی امیہ۔ (در آخر ایام بنی امیہ سنہ ۱۳۲ھ)

علمی سلسلہ کے علاوہ ترتیبِ زمانی کے لحاظ سے بھی تابعین کی حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے وہی تھی جو نسبی سلسلہ میں پوتوں کی حیثیت دادا کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اس لئے اگر سلسلۂ اخذ و تعلیم نہ ہوتا تب بھی جس طرح دادا کے حالات اور کارنامے پوتوں کو اپنے گھروں میں معلوم ہو جاتے ہیں اسی طرح اس عہد کے لوگوں کو باقاعدہ تعلیم کے بدون ہی آنحضرت کے بکثرت حالات اور کارناموں کا علم حاصل ہونا ایک بدیہی بات ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایسے عہد اور ایسی حالت میں اور ایسے لوگوں کی موجودگی میں پھر ایسی جگہ پر جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری دس سال گزرے ہوں اور جہاں کا کوئی گھر اور کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کو آنحضرت سے وابستگی اور آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل نہ ہو۔ اس سرزمین میں ایک شخص (امام مالک) آپ کی حدیثوں اور سنتوں کے بیان میں ایک مجموعہ تیار کرکے اسی سرزمین میں اس کو علی الاعلان سناتا ہے اور ہزاروں آدمی تمام بلاد اسلامیہ سے رخت سفر باندھ کر مدینہ آتے اور اس مجموعہ کو سن کر اور بہت سے لوگ اس کی نقلیں لے کر اپنے اپنے وطن واپس جاتے ہیں اور وہاں پہنچ کر ان میں کا ہر آدمی اس کو سینکڑوں اور ہزاروں مسلمانوں میں پھیلاتا ہے۔ مگر مدینہ مقدسہ یا کسی جگہ کا ایک متنفس بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ ساری حدیثیں یا ان میں سے بہت سی جعلی ہیں ——— کوئی صاحب عقل بتلائے کہ اولاً تو ایسی حالت میں امام مالک کو اگر (معاذ اللہ وہ مفتری ہوتے) اس کی ہمت ہی کیسے ہوتی۔ اور اگر بالفرض ہوتی بھی تو سارے اہل مدینہ اس "افترا پردازی" اور دین میں "جعلی چیز کے اضافہ" اور اس کی اشاعت کا خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہ جاتے!

مالکم کیف تحکمون ۰

مزید برآں یہ کہ اس مجموعہ میں امام مالک مذکورہ بالا پچیس اشخاص اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے باشندگان مدینہ کا نام لے کر فرماتے ہیں کہ انھیں لوگوں نے ہم سے یہ حدیثیں اور سنتیں بیان کی ہیں۔ اگر بالفرض امام مالک نے غلط بیانی سے کام لیا ہوتا تو ناممکن ہے کہ جو لوگ اس وقت زندہ تھے، ان کی تکذیب نہ کرتے۔

حاصل کلام یہ کہ موطا یا دوسرے مجامیع حدیث اور ان کی اسنادوں کو بالکل بے سروپا کہنا صرف ضلالت ہی نہیں بلکہ قابل عبرت، جہالت وحماقت بھی ہے۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور۔

یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ سے پہلے کسی نے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی بلکہ اس کے برخلاف ان مجموعوں کے زمانۂ تصنیف سے لے کر آج تک ہر دور میں اصولی طور پر ان کو صحیح وثابت اور واقعی چیز تسلیم کیا گیا۔ اور ہر دور میں ان مجموعوں کو سینکڑوں ہزاروں اہل علم نے اپنے بڑوں سے سنا اور روایت کیا۔ خود امام مالک سے موطا کو تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے سنا جب کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بستان المحدثین ص۲۰ میں تحریر فرمایا ہے۔ اور سیوطی نے تنویر الحوالک کے مقدمہ میں تقریباً پچاس ایسے آدمیوں کا نام بنام ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے امام مالک سے موطا کو سن کر روایت کیا ہے۔ پھر ان لوگوں سے آج تک اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تواتر کے ساتھ اس کی روایت ہوتی آئی ہے۔

پھر حیرت ہے کہ یہ منکرین حدیث اس دیدہ دلیری سے حدیث کا انکار کرتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے اور کیوں اس پر غور نہیں کرتے کہ اپنے بزرگوں اور اکابر کے آثار کی حفاظت اور ان کے کارناموں کو زندہ اور ان کے سوانح کو یاد رکھنے کا جذبہ فطری طور پر ہر قوم میں ہوتا ہے اور دنیا میں ہر زندہ قوم اپنے بزرگوں کے آثار، بہادروں کے کارناموں اور شاعروں کے کلام کو باقی اور محفوظ رکھنے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لاتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلم قوم جو دنیا کی سب سے بہتر اور سب سے زیادہ علم دوست اور سب سے زیادہ محاسن کمالات اور ذہنی خصوصیات کی حامل ہے۔ اس نے اپنے اور خود اپنے پیغمبر ورسول ہی کی ہدایات ان کے سیر ومغازی اور ان کے اخلاق وعادات کو نہ محفوظ رکھا ہو۔ نہ دوسروں تک پہنچایا ہو۔ دنیا میں کون صاحب عقل ایسا کہہ سکتا ہے۔ اور کون اس کو باور کرسکتا ہے؟

قرآن مجید کی بہت سی آیات کا مطلب بھی روایات کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا

پھر اس بات پر بھی دھیان دینا چاہیئے کہ اگر قرآن پاک کے علاوہ اور کوئی مستند ذریعہ معلومات نہ ہو اور احادیث وآثار کی روایات کو قابل اعتبار نہ سمجھا جائے تو خود قرآن پاک کی بہت سی آیات کا مفہوم ومطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا ۔
(احزاب ۔ ع ۔ ۵)

پھر جب زید تمام کر چکا اس عورت سے اپنی غرض، ہم نے وہ تیرے نکاح میں دی۔

کیا روایات کو یکسر نظر انداز کر دینے کے بعد قرآن مجید کے صرف ان الفاظ سے اس واقعہ کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اور کیا صرف قرآن سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ زید کون تھے اور ان کی بی بی کون تھیں اور قصہ کیا پیش آیا تھا۔ یا مثلاً ارشاد ہے:۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ۔
(عبس)

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس پر کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تجھ کو کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا اور پاک صاف ہوتا۔

بتایا جائے کیا صرف قرآن سے یہ پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ یہ آنے والے الاعمیٰ کون تھے اور وہ کون لوگ تھے جن کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے آنے کے وقت متوجہ تھے؟

اسی طرح غزوۂ احزاب و حنین وغیرہ کے جن واقعات کا ذکر قرآن پاک میں ہے بتائیے کہ روایات کے سارے ذخیرہ کو نا معتبر قرار دے کر ان واقعات کی ضروری تفصیل بھی کہاں سے معلوم کی جائے؟

یا مثلاً قرآن پاک میں ہے:۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ
اَنَّهَا لَكُمْ ۔ (انفال ۔ ع ۔ ۱)

اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے قبضہ میں آئے گی۔

کیا کوئی صرف قرآن سے یہ بتلا سکتا ہے کہ یہ دو جماعتیں کون تھیں؟ اور اللہ جس وعدہ کو یہاں یاد دلا رہا ہے وہ وعدہ قرآن میں کہاں ہے؟ اگر قرآن میں نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ کوئی دوسری قسم کی وحی بھی آنحضرت پر آتی تھی۔

یا مثلاً قرآن پاک میں ہے:۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ
الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ (انفال ۔ ع ۔ ۵)

جس وقت تم تھے ورے کے ناکے اور وہ پرے کے ناکے اور قافلہ نیچے اتر گیا تم سے۔

کوئی مدعی صرف قرآن سے بتائے کہ یہ کہاں کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور کس جگہ کے قریب و دور کے ناکے مراد ہیں اور کس قافلہ کا نیچے اترنا بیان ہوا ہے؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۔
(توبہ ۔ ع ۔ ۴)

مدد کر چکا ہے اللہ تمہاری بہت سے میدانوں میں۔

کیا روایات کا انکار کرنے کے بعد ان "بہت سے میدانوں" کی تفصیل کہیں سے معلوم ہو سکتی ہے؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ
اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ
هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ
اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔ (توبہ ۔ ع ۔ ۶)

اگر تم نہ مدد کرو گے رسول کی تو اس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت نکالا اس کو کافروں نے دو جان سے جب وہ دونوں تھے غار میں۔ جب کہنے لگا اپنے رفیق کو تو غم نہ کھا۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

آنحضرتؐ کہاں سے نکالے گئے۔ یہ دوسرا آپ کا رفیق کون تھا؟ اور کس غار میں آپ اپنے رفیق کے ساتھ روپوش تھے؟ کیا صرف قرآن سے ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے؟ کیا روایات کی طرف رجوع کے سوا کوئی دوسری صورت بھی ان باتوں کو معلوم کرنے کی ہے؟

علیٰ ہذا قرآن پاک میں ہے:۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا۔ (توبہ۔ ع۱۳)	جس مسجد کی بنیاد دھری پرہیزگاری پر پہلے دن سے وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اس میں۔ اس میں وہ مرد ہیں جن کو چاہت ہے پاک رہنے کی۔

یہ کس مسجد کا ذکر ہے؟ اور وہ کون لوگ ہیں جن کی اس آیت میں مدح ہو رہی ہے؟ اور ان کی طہارت پسندی کا کیا خاص معیار تھا۔ جس کو اس آیت میں سراہا گیا ہے؟ کیا ان باتوں کا جواب صرف قرآن سے مل سکتا ہے؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:۔

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا۔ (توبہ۔ ع۱۴)	اور (اللہ کی مہربانی ہوئی) اُن تین شخصوں پر جن کے معاملہ کو ملتوی رکھا گیا تھا۔

یہ کون تین شخص ہیں اور ان کا کیا قصہ تھا۔ اور کیوں ان کا معاملہ ملتوی رکھا گیا؟ کیا روایات کے بغیر یہ باتیں حل ہو سکتی ہیں؟

اسی طرح قرآن پاک میں ہے:۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا۔ (احزاب۔ ع۳)	اور اُتار دیا اُن کو جو اُن کے رفیق ہوئے تھے اہل کتاب میں سے اُن کی گڑھیوں سے اور ڈالا اُن کے دلوں میں رُعب۔ کتنوں کو تم مارنے لگے اور کتنوں کو قید کیا۔ اور وارث کیا تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا اور ایک زمین جس پر نہیں ڈالے تم نے قدم۔!

یہ مظاہرین کون تھے؟ اور ان کی زمین و جائداد کہاں تھی؟ نیز وہ دوسری زمین جہاں مسلمانوں کے قدم نہیں پہنچے تھے مگر اس کے وارث بنائے گئے۔ کونسی تھی؟ کیا روایات سے قطع نظر کر کے ان باتوں کا جواب دیا جا سکتا ہے؟

یہ صرف چند مثالیں بلا قصد استیعاب بیان کی گئی ہیں۔ اس طرح کی ابھی بہت سی مثالیں ذکر کی جا سکتی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ روایات کا انکار کر دینے کے بعد قرآن کی مذکورہ بالا آیات کا واضح اور متعین مفہوم سمجھنا اور سمجھانا قریباً ناممکن ہے۔

الغرض جو شخص قرآن پاک کو اللہ کی کتاب مانے اور اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہر زمانہ کے اہل ایمان کے لئے ضروری سمجھے۔ اس کو حدیث و سیر کے اس ذخیرہ کو بھی ماننا پڑے گا جس کو پوری طرح جانچ پرکھ کے ائمہ محدثین و اہل سیر نے محفوظ کیا ہے۔ اور جس کے بڑے حصے کی حیثیت یقیناً قرآن کے ضروری توضیحی ضمیمہ کی ہے۔

حدیث و سنت کے مثبت احکام ہونے پر ایک اور قرآنی دلیل۔

یہاں پہنچ کر حدیث و سنت کے مثبت احکام ہونے پر ایک اور قرآنی دلیل ذہن میں آگئی اس کو بھی یہیں عرض کرتا ہوں:۔

جو حضرات دراصل کسی علمی مغالطہ ہی کی وجہ سے یہ بات کہتے ہیں کہ دینی حجت بس قرآن ہی ہے اور قرآن کے سوا کسی اور ذریعہ سے شریعت کا کوئی حکم اور کوئی دینی مسئلہ ثابت نہیں ہو سکتا اور رسول کا کام بس قرآن پہنچا نا ہی تھا۔ وہ اگر ایک طالب حق اور جویائے ہدایت کی طرح قرآن مجید ہی کو غور سے دیکھیں تو اس میں ان کو اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ بطور حکایت اور واقعہ کے یا کسی اور سلسلہ میں کسی دینی عمل کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل زمانہ نزول قرآن میں ایک دینی عمل کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ حالانکہ قرآن مجید میں کہیں اس عمل کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا حکم ان کو سنت کے ذریعہ دیا گیا تھا — یہاں اس کی صرف دو تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

قرآن میں حکم ثابت بالسنۃ کے ذکر کی چند مثالیں

سورۂ توبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے جنازوں کی نماز پڑھنے سے ان لفظوں میں منع فرمایا گیا ہے:۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ۔ ع۔ ۱۱)

(ان میں سے جو کوئی مرے آپ کبھی اس کے جنازے کی نماز نہ پڑھیں)

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے نماز جنازہ مشروع ہو چکی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اموات کے جنازوں پر نماز پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ قرآن میں اس سے پہلے نازل ہونے والی کوئی آیت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو جنازہ کی نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ نماز جنازہ کا حکم سنت کے ذریعہ دیا گیا تھا۔

اسی طرح سورۂ جمعہ کی آیت "وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا۔" (جمعہ۔ ع۲) میں ایک حکایت اور شکایت کے ضمن میں جمعہ کا خطبہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور قطع نظر اس سے ہمارا خیال ہے کہ حدیث و سنت کے جو منکرین ہمارے مخاطب ہیں وہ غالباً اس کا انکار نہ کر سکیں گے کہ خطبۂ جمعہ ایک شرعی حکم اور دینی عمل ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود دیا کرتے تھے اور امت میں اب تک اسی طرح متوارث ہے — لیکن کوئی قرآنی آیت نہیں بتلائی جا سکتی جس میں اس خطبہ کا حکم دیا گیا ہو۔ پس لازماً یہی ماننا پڑے گا کہ اس کا حکم سنت کے ذریعہ ملا تھا۔

علی ہذا اپنے کو مسلمان کہنے والا کوئی آدمی بھی اس سے انکار نہیں کر سکے گا کہ نماز سے پہلے جو اذان دی جاتی ہے یہ ایک دینی عمل ہے اور عہد نبوت سے لے کر اب تک متوارث ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی واقعہ کی حکایت کے طور پر ایک جگہ اس اذان کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں عقل کے دشمن کافروں کی اس جہالت اور شرارت کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ وہ "اذان کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس کی نقل کر کے منہ چڑاتے ہیں"۔ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (مائدہ ۹۴) اسی طرح سورۂ جمعہ میں بھی ایک دوسرے حکم کے بیان کے سلسلہ میں جمعہ کی اذان کا ضمنی ذکر آیا ہے۔ اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ۔ جمعہ۔ ۲۶) بہرحال ان آیات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عہد نبوی میں ان آیات کے نازل ہونے سے بھی پہلے سے اذان ایک دینی عمل کی حیثیت سے مروّج تھی۔ اور قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں بتائی جا سکتی۔ جس کے ذریعہ اذان کا حکم دیا گیا ہو۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ اذان کا حکم قرآن کے ذریعہ نہیں۔ بلکہ سنت کے ذریعہ ملا تھا۔

اس کی مثالیں قرآن مجید سے اور بھی بہت سی پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس مقدمہ کے محدود صفحات میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں — !

حدیث و سنّت کے حجت دینی اور واجب الاتباع ہونے پر یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اگرچہ الحمدللہ ایک طالبِ حق خدا ترس کیلئے وہ بھی بالکل کافی ہے۔ لیکن آخر میں ایک اصولی بات عرض کر کے سلسلۂ کلام ختم کیا جاتا ہے۔

رسولؐ کا صحیح مقام

ہمارے خیال میں حدیث و سنّت کے منکرین کی اصل غلطی یہ ہے کہ انہوں نے رسولؐ کی اصل حیثیت اور اس کے صحیح مقام کو نہیں سمجھا ہے۔ اگر وہ مقامِ نبوت کو سمجھنے اور نبی و رسول کی معرفت حاصل کرنے کے لئے صرف قرآن ہی میں تدبر کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت صرف ایک پیغامبر اور پیام رساں ہی کی نہیں ہے۔ بلکہ آپ مطاع، متبوع، امام، ہادی قاضی، حاکم، حَکَم وغیرہ وغیرہ بھی ہیں اور قرآن ہی نے آپ کی ان حیثیتوں کو بھی بیان کیا ہے۔

(۱) رسول مطاع ہے اور اس کی اطاعت اہل ایمان پر فرض ہے۔

قرآن مجید میں جابجا اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:۔

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۔ اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

اس حکم میں "أَطِيعُوا الرَّسُولَ" کو "اطیعوا اللہ" سے الگ مستقل جملہ کی شکل میں قرآن مجید میں جس طرح مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے ہر وہ شخص جس کو عربی زبان کا کچھ بھی ذوق ہو۔ یہی سمجھے گا کہ اللہ کی اطاعت کی طرح اہل ایمان پر رسول کی اطاعت بھی مستقلاً فرض ہے۔ یعنی اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کی طرف سے جو کتاب رسول لائے ہیں اس کو مانا جائے اور اس کے حکموں پر چلا جائے۔ کیونکہ اگر صرف اتنی ہی بات کہنی ہوتی تو یہ تو "اطیعوا اللہ" میں کہی جا چکی تھی۔ پھر امرِ اطاعت کے مستقل اعادہ کے ساتھ "اطیعوا الرسول" کے اضافہ کی کیا ضرورت تھی۔

علاوہ ازیں خود قرآن مجید کی بعض دوسری آیات سے بھی یہ بات اور زیادہ صاف اور واضح ہو جاتی ہے۔

سورۂ نساء کے پانچویں رکوع کے آخر میں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دینے کے بعد ان منافقین کی مذمت کی گئی ہے جو اپنی غرض پرستی اور منافقت کی وجہ سے اللہ و رسول کی اطاعت میں کوتاہی کرتے تھے۔ اسی سلسلۂ بیان میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے:۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا۔ (نساء - ع - ۹)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کتاب کی طرف جس کو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف تو اے رسول تُو دیکھے گا اُن منافقوں کو کہ اعراض اور روگردانی کرتے ہیں تیری طرف سے۔

اس آیت میں "ما انزل اللہ" (یعنی کتاب اللہ) کی طرف بلانے کے ساتھ "رسول" کی طرف بلانے کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے وہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ اُوپر کی آیتوں میں اطاعتِ رسول کا جو حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی طرف سے اس پر نازل ہونے والی کتاب کی اطاعت کرو۔ بلکہ رسول کی اطاعت اس سے الگ اور مستقل چیز ہے!

اور اسی سورہ کے اسی رکوع میں دو ہی آیتوں کے بعد اللہ کی طرف سے آنے والے ہر رسول کے متعلق فرمایا گیا ہے:۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۔ (نساء - ع - ۹)

اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس واسطے کہ اس کے حکم پر چلا جائے اللہ کے فرمان سے۔

(۲) رسول منجانب اللہ ہادی اور امام ہوتے ہیں۔ ارشاد ہے:۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا۔
(انبیاء - ۶ - ۵)

اور ہم نے بنایا اُن کو امام و پیشوا۔ وہ ہدایت و رہنمائی کرتے تھے ہمارے حکم سے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بجانب اللہ حاکم اور حَکَم بھی قرار دیے گئے تھے۔ اور ہر اختلاف و نزاع میں آپ کو حَکَم بنانا اور آپ کا فیصلہ دل و جان سے ماننا تمام اہل ایمان کیلئے فرض بلکہ شرطِ ایمان قرار دیا گیا۔ سورۂ نسار کی یہ آیت (جو پہلے بھی ایک جگہ درج ہو چکی ہے) پھر پڑھیے:-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝
(نسار - ۶ - ۹)

بے پیغمبر قسم تیرے پروردگار کی یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حَکَم بنائیں تجھے اپنے نزاعی معاملات میں پھر جب تو اپنا فیصلہ دیدے تو کوئی تنگی اور ناگواری نہ پائیں اپنے دلوں میں تیرے فیصلے سے اور تسلیم کرلیں اس کو پوری طرح مان کر۔

اسی طرح سورۂ احزاب کی آیت:-

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ (احزاب - ۶ - ۵)

اور کسی ایمان والے مرد اور ایمان والی عورت کی یہ شان نہیں ہے کہ جب حکم دیدے اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا تو رہے اُن کا کچھ اختیار اپنے معاملہ میں۔

اور سورۂ نور کی آیت:-

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔
(نور - ۶ - ۷)

ایمان والوں کو جب بلایا جائے اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ دیں اُن کے درمیان تو اُن کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کہیں "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" (یعنی ہم نے سن لیا اور مان لیا)۔

الغرض یہ سب آیتیں اس باب میں نص صریح ہیں کہ مسلمانوں کے جس معاملہ میں رسول جو فیصلہ کریں وہ واجب التسلیم ہے اور کسی مسلمان کو اس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) کسی شخص کی کامیابی اور فوز و فلاح کیلئے جس طرح اللہ کی اطاعت ضروری ہے اسی طرح رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے اور جس طرح اللہ کی نافرمانی گمراہی اور بدبختی ہے اسی طرح رسول کی نافرمانی بھی موجبِ ضلالت و شقاوت ہے:-

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔ (احزاب - ۶ - ۸)

جس نے اطاعت کی اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اس نے بڑی مراد پائی۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (احزاب ۶ ۵)

اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور اس کے رسول کی وہ بڑی کھلی گمراہی میں جا پڑا۔

نیز قرآن ہی میں بتایا گیا ہے کہ کفار دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جس طرح خدا کی نافرمانی کرنے پر کفِ افسوس ملیں گے اور اپنا ماتم کریں گے اسی طرح رسول کی نافرمانی پر بھی افسوس کریں گے۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا۔ (احزاب ع ۸)

جس دن اوندھے ڈالے جائیں گے اُن کے منہ آگ میں کہیں گے کاش ہم نے کہا مانا ہوتا اللہ کا اور کہا مانا ہوتا رسول کا۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:۔

يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ۔ (النساء۔ ع۔ ۶)

اُس دن آرزو کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور رسول کی نافرمانی کی کہ برابر کردیے جائیں زمین کے (یعنی خاک ہوکر زمین کا جزء بن جائیں اور عذاب سے بچ جائیں)

نیز مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ رسول کی نافرمانی کی کوئی بات بھی آپس میں نہ کریں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ۔ (مجادلہ۔ ع۔ ۲)

اے ایمان والو جب تم چپکے چپکے آپس میں باتیں کرو تو گناہ اور ظلم و زیادتی کی، اور رسول کی نافرمانی کی کوئی بات نہ کرو۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دیں اس کو قبول کرنا اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جانا واجب ہے۔

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ (حشر۔ ع۔ ۱)

جو تم کو رسول دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اُس سے رک جاؤ۔

اگر اس آیت کا تعلق صرف اموال سے بھی مانا جائے تب بھی ہمارے مدعا کے لئے مضر نہیں کیونکہ اس صورت میں بھی کم از کم تو آیت سے ثابت ہی ہوگی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صوابدید سے جو تقسیم کریں وہ اہل ایمان کے لئے واجب التسلیم ہے اور کسی کو اس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔

(۶) ایک مومن کا اپنی جان پر جتنا حق ہے اس سے زیادہ اس کی جان پر نبی کا حق ہے۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ۔ (احزاب۔ ۱) نبی زیادہ حقدار ہے مومنین کا ان کی جانوں سے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس آیت پر جو دو سطریں لکھی ہیں، اُن کے نقل کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے:۔

"نبی نائب ہے اللہ کا۔ اپنی جان مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا جتنا نبی کا۔ اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنی روا نہیں اور نبی حکم کرے تو فرض ہے"

(۷) اللہ کے ساتھ اس کے رسول کو بھی راضی کرنا ضروری اور شرط ایمان ہے۔

وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ۔ (توبہ۔ ع۔ ۸)

اور اللہ کو اور اس کے رسول کو راضی کرنا ان کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے اگر وہ ایمان رکھتے ہیں۔

(۸) اللہ کی طرح اس کے رسول کو بھی دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب رکھنا ضروری ہے۔ جو ایسا نہ کریں وہ فاسقین اور اللہ کی ہدایت سے محروم رہنے والے ہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ

اے پیغمبر کہو (مسلمانوں کو) اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور تمہارا کمایا ہوا مال اور

تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۔

(توبہ ۔ ع ۔ ۳)

تمہاری تجارت جس کے بند ہو جانے سے تم ڈرتے ہو اور تمہارے رہنے کے مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ ساری چیزیں) تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جدوجہد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ کرے اللہ اپنا فیصلہ اور (یاد رکھو) کہ اللہ ہدایت نہیں دیتا فاسق لوگوں کو۔

(۹) اللہ کے رسول جب کسی کام کے لئے دعوت دیں اور پکاریں تو اس پر لبیک کہنا ہر مومن پر فرض ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ

(انفال ۔ ع ۔ ۳)

اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا جب بلادے تم کو اس کام کی طرف جس میں تمہاری حیات ہو۔

(۱۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کام کے لئے لوگوں کو بلائیں تو بلا اجازت اُٹھ کر چلا جانا کسی مومن کے لئے جائز نہیں اور جو ایسا کریں گے اُن کے لئے "عذاب الیم" کا اندیشہ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۔

(النور ۔ ع ۔ ۹)

ایمان والے وہی ہیں جنہوں نے مانا ہے اللہ کو اور اس کے رسول کو اور (جن کا طریقہ یہ ہے کہ) جب وہ کسی اجتماعی کام میں اس کے رسول کے ساتھ ہوتے ہیں تو کہیں نہیں جاتے تاوقتیکہ اُس سے اجازت نہ لے لیں۔

آگے اسی سلسلہ میں اُن لوگوں کے بارے میں جو بلا اجازت چپکے سے سرک جاتے تھے فرمایا گیا ہے:-

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (النور ۔ ع ۔ ۹)

پس ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو خلاف چلتے ہیں اس کے حکم سے۔ اس بات سے کہ مبتلا ہوں وہ کسی سخت فتنہ میں یا پہنچے ان کو دردناک عذاب!

رسول کے مقام و منصب کا بیان ایک مستقل موضوع ہے اور اگر اس پر شرح و بسط سے لکھا جائے تو جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے بہت زیادہ لکھا جا سکتا ہے اور بلا مبالغہ سینکڑوں آیتیں اس سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہاں اس وقت انہی اشارات پر اکتفا کر کے میں کہنا چاہتا ہوں کہ جب قرآن مجید سے آپ کا مطاع۔ متبوع، امام و ہادی۔ آمر و ناہی۔ حاکم و حَکَم وغیرہ وغیرہ ہونا ثابت ہوگیا تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دین کے سلسلہ کا آپ کا ہر امر و نہی، ہر حکم و فیصلہ اور ہر قول و عمل واجب التسلیم اور لازم القبول ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک اس دنیا میں رونق افروز رہے تمام امت کے لئے آپ کی اور آپ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کی یہی حیثیت تھی اور آپ کے ارشادات کو بلا واسطہ سننے والے اور آپ کے اعمال و افعال کو بچشم خود دیکھنے والے صحابہ کرام نے علم و ہدایت کے اس پورے خزانہ کی غیر معمولی اہتمام اور شغف کے ساتھ حفاظت کی اور پوری امانت کیساتھ بعد والوں کو پہنچایا۔ پھر بعد کے قرنوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے بہترین افراد کو احادیث و سنن کے اس بے پایاں

دفتر کی تدوین و ترتیب، تحقیق و تنقید، تعلیم و تعلم، ترجمہ و تشریح، حفظ و اشاعت اور اس سے متعلق بہت سے مستقل علوم و فنون کی ایجاد اور پھر ہر فن میں بہتر سے بہتر تالیف و تصنیف وغیرہ وغیرہ سینکڑوں قسم کی خدمات کی ایسی توفیق دی جو کبھی کسی قوم اور کسی امت کو نہیں ملی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اگرچہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا سے گئے ساڑھے تیرہ سو سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے۔ لیکن آپ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کی روشنی ہر راہ رو کے لئے آج بھی ایسی ہی موجود ہے جیسی کہ قرن اول میں تھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت ختم کر دیئے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی حفاظت کا یہ انتظام ہونا ضروری بھی تھا جبکہ آپ کے بعد کوئی نیا پیغمبر اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے اور آپ ہی اس دنیا کی آخری نسل تک کے لئے جب نبی ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کی تعلیمات و ہدایات اور آپ کا اسوۂ حسنہ اس دنیا کے آخری دن تک محفوظ رہے۔ تاکہ ہر زمانے کے طالبانِ ہدایت اس سے وہ روشنی اور وہ نور حاصل کر سکیں جو آپ کے زمانہ میں آپ پر ایمان لانے والے خوش نصیب آپ کی مقدس اور منور ہستی سے حاصل کیا کرتے تھے۔

آج کوئی دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ پچھلی ساڑھے تیرہ صدیوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلسل یہ انتظام رہا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ آئندہ بھی یہ خداوندی انتظام یوں ہی رہے گا۔ اور اس مقصد کے لئے جب جس خدمت کی ضرورت ہوگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بندوں کو اس کی توفیق ملتی رہے گی۔[۱]

---

[۱] (مقدمہ "معارف الحدیث")

ماہرالقادری

دین و دانش

اسلام دینِ فطرت ہے اور فطرت میں اعتدال، اقتصاد اور توازن کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس لئے اسلام میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط۔ دین کے جس مسئلہ پر بھی غور کیا جائے گا تو عقل اسی نتیجہ پر پہنچے گی بلکہ مشاہدہ کرے گی کہ وہاں دُو انتہائیں یعنی شوراشوری اور بے نمکی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ فطری تناسب و توازن کے ساتھ ہے اور دین کے چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ میں بھی اقتصاد اور میانہ روی پائی جاتی ہے ——!

اسی لئے اسلام نہ تو عقل کو بالکل معطل اور مفلوج کر دینا چاہتا ہے اور نہ عقل کو اتنی ڈھیل اور آزادی دیتا ہے کہ عقل خود اپنی امام، رہبر، قائد اور شارع بن جائے اور عقل کے تجربوں پر انسانی زندگی کا نظام ترتیب پائے۔ عقل کو پوری آزادی دے دینا بظاہر بڑی روشن خیالی اور تنویرِ فکر کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ مگر یہ تصوّر خود عقل کے ساتھ اور انسانی زندگی کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہے۔ ہر چیز سے اُتنا ہی کام لینا چاہیئے جس کی اس میں استطاعت ہو۔ استطاعت اور وسعت سے زیادہ کسی کام کا بار ڈالنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے ——!

دُنیا میں وہ کونسا شخص ہے جس کی عقل کو ہر اعتبار سے کامل کہا جا سکتا ہے۔ جس کا ہر فیصلہ سَو فیصدی صحیح ہو اور جس میں نقص اور خامی کا امکان ہی نہ ہو۔ دُنیا کے تمام اسرار و رموز کی گرہ کسی بڑی سے بڑی ہستی کی عقل بھی نہیں کھول سکی۔ اس لئے اسلام عقل کی رہبری اور قیادت پر اتنا اعتماد نہیں کرتا کہ انسانی حیات کی باگ ڈور آنکھ بند کر کے عقل کے حوالے کر دے اور جو کچھ عقل کہے، اسی کے مطابق زندگی گھومتی رہے!

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ قرآن نے انفس و آفاق میں تعقل، تدبر اور تفکر کی بار بار دعوت دی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عقل کا ایک مقام ہے، ایک حیثیت ہے اور پوزیشن ہے۔ اور اس جوہرِ قابل کی اسلام کی نگاہ میں وقعت ہے — اور اس سے کام لینا چاہیئے۔ جو شخص عقل کے بارے میں اسلام کے اس رویّہ کو سمجھ لے گا اسے عقل اور دین میں کوئی تصادم نظر نہ آئے گا۔ اور جہاں اس تصادم کے امکانات دکھائی دیں گے، وہاں اس کی فہم خود مطابقت پیدا کر لے گی ——!

عقل اور دین کے دوراہے پر انہی لوگوں کو ٹھوکر لگتی ہے جو عقل اور دین میں مطابقت کی استعداد نہیں رکھتے اور یہیں سے عقل کی بے راہ روی اور مذہبی جمود کے راستے پھٹتے ہیں اور حقیقت پیچ در پیچ روایات میں گم اور بے راہ روی اور انتشار خیالی کے ہاتھوں مجروح ہوتی چلی جاتی ہے!

اسلام نے عقل کو جو آزادی دی ہے، وہ اس لئے نہیں دی کہ کسی کی عقل مسلّمات ہی کو توڑ دے یا "محکمات" کی تکذیب پر آمادہ ہو جائے۔ انفس و آفاق میں غور و فکر کی عقل کو دعوت اسلام نے اس لئے دی ہے کہ اللہ کی ان نشانیوں کو دیکھ کر عقل خالق کائنات کی ربوبیت کا اقرار کرے اور اپنے بنانے والے کو پہچان لے۔ اسلام میں عقل کی آزادی "تسلیم و اقرار" کے لئے دی گئی ہے "انکار و بغاوت" کے لئے نہیں ——!

دین کے ہر کام میں اللہ تعالیٰ نے مصلحتیں رکھی ہیں اور اسلام کا کوئی حکم بھی مصلحت سے عاری نہیں ہے۔ لیکن عقل کو

انفرادی اسلام نے نہیں دی کہ جب تک دین کے ہر اصول اور جزیہ کی مصلحت اس کی سمجھ میں نہ آجائے اس وقت تک وہ اسے
تسلیم ہی نہ کرے ۔ !

یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے کہ عقل بہت سی باتوں کی مصلحتیں سمجھ نہیں سکتی یا سمجھ سکتی ہے تو اس کا کلی احاطہ نہیں کر سکتی ۔
سی کی عقل کہے کہ سورج بنانے میں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت ہے اور اسے جواب دیا جائے کہ سورج سے دنیا کو روشنی اور گرمی
تی ہے ۔ اس کے بعد وہی معترض عقل پھر کہے کہ اللہ تعالیٰ کو روشنی اور گرمی کیلئے سورج کو پیدا کرنے کی زحمت اٹھانے کی کیا
ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت "کن فیکون" سے کام لینا تھا کہ اس کے "کن" کہتے ہی دنیا میں روشنی بلا واسطے کے
بغیر ہو جایا کرتی اور گرمی بھی ۔ !

عقل جب اس قسم کے اعتراضات پر اتر آئے اور مصلحتوں کو سمجھنے کے لئے یہ طرز اختیار کیا جائے تو پھر ایسی عقل کو دنیا میں کون
مطمئن کر سکتا ہے، یہی وہ موقع ہے جہاں عقل سے کہا جائے گا کہ مصلحت سمجھ میں آنے کے باوجود بھی یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس کے
بغیر چارہ کار نہیں ۔

اگر عقل بات بات میں مصلحت سمجھنا چاہے اور برہان و ثبوت طلب کرے تو پھر آدمی کی زندگی اجیرن بن کر رہ جائے گی ۔ بلکہ ایسی
مصلحت میں عقل کے ہاتھوں نظام زندگی تہ و بالا ہو جائے گا ۔ اور یہ بات جو کہی جا رہی ہے وہ عقل کے عین مطابق ہے ۔ یہ کوئی بے عقلی
بے دانشی کی بات نہیں ہے اور نہ یہ وہ چیز ہے جسے "تیر تکے لڑانا" کہتے ہیں ۔ !

دنیا کی کوئی چیز کیوں نہ ہو وہ عقل سے کسی نہ کسی حد تک "تسلیم و انقیاد" کا مطالبہ بھی کرتی ہے ۔ اس لئے کہ یہ ناگزیر صورت حال
ہے ۔ جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ۔ مثلاً ایک شخص کسی دفتر میں ملازمت اختیار کرتا ہے ۔ دفتر میں ملازمت اختیار کرنے
کے بعد خود عقل ہی کا یہ فیصلہ ہے کہ اسے دفتر کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرنی ہے ۔ ! اور دفتر میں جو ڈسپلن قائم ہے وہ
دفتر ہی کی بھلائی کے لئے ہے ۔ !

اب اس شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی عقل کو دفتر کے کام کو حسن و خوبی سے انجام دینے میں صرف کرے اور ایسی تدبیریں
سوچے جو دفتر کے لئے ہر اعتبار سے مفید ہوں اور جن پر عمل کرنے سے دفتر کے اصول و ضوابط نہ صرف یہ کہ ٹوٹتے نہ ہوں بلکہ ان
کو مزید تقویت ملتی ہو ۔ !

لیکن اگر یہ شخص دفتر میں کام شروع کرتے ہی سوالات کرنے لگے کہ حاضری کا رجسٹر رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟ اور یہ رجسٹر
سفید کاغذ سے کیوں بنایا گیا ہے بادامی کاغذ سے کیوں نہیں بنایا گیا؟ اور دفتر میں حاضری کا وقت ۹ بجے کیوں رکھا گیا
ہے ۔ اس میں کیا مصلحت پنہاں ہے؟ اور یہ فائلیں جن الماریوں میں رکھی جاتی ہیں وہ لکڑی کی کیوں ہیں؟ انہیں لوہے کی ہونا
چاہیئے ۔ اور یہ چپراسی سفید وردی کیوں پہنتے ہیں؟ مجھے تو سرخ رنگ پسند ہے ۔ اس قسم کی مستفسرانہ ذہنیت اگر دفتر کے تمام عملہ
ہو جائے تو دفتر کا کام کیا ایک منٹ کے لئے بھی چل سکے گا؟ اور اتنے زیادہ ذہین، ضرورت سے زیادہ عقلمند اور مصلحتوں
سمجھنے والے کلرک جس دفتر میں بھی جمع ہو جائیں گے اس دفتر کا نظام کیا تہ و بالا نہ ہو جائے گا؟

یہ نہیں ہے کہ دفتر کے کاروبار میں مصلحتوں کی رعایت نہیں رکھی گئی ۔ مگر بات بات پر مصلحت دریافت کرنا یہ اس بات کی
دلیل ہے کہ پوچھنے والا دفتر کے کسی اصول اور ضابطے سے مطمئن ہی نہیں ہے ۔ اسے یہ بتایا جائے گا کہ دفتر میں حاضری کا وقت
۹ بجے جو رکھا گیا ہے اس میں یہ مصلحت ہے کہ دفتر والے صبح اٹھ کر، کھا پی کر، اپنے گھروں میں سودا سلف کا انتظام کر کے آسانی
کے ساتھ دفتر پہنچ سکتے ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ مگر وہ شخص یہی کہے جاتا ہے کہ میرے خیال میں تو وقت دس بجے کا ہونا چاہیئے
مجھے تو اسی میں سہولت نظر آتی ہے ۔ !

اس کے جواب میں اس سے یہی کہا جائے گا کہ تمہیں سہولت ہو یا تکلیف۔ تمہاری سمجھ میں کوئی مصلحت آئے یا نہ آئے۔ تمہاری عقل مطمئن ہو یا نہ ہو۔ بہرحال اگر تمہیں دفتر میں نوکری کرنی ہے تو تمہیں ۹ بجے آنا ہوگا۔ اور اگر تم دفتر کے اس ضابطہ کو اپنے اوپر "جبر" سمجھتے ہو تو سمجھا کرو۔ تمہارے لئے دفتر کا نظام نہیں بدلا جا سکتا ——!

اسی مثال کو دین پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ کوئی کہے کہ روزے ایک ماہ کے اور نماز پانچ وقت کی کیوں فرض کی گئی ہے زکوٰۃ کا نصاب ڈھائی فیصد کیوں ہے؟ رضاعی بھائی بہن کے درمیان نکاح ہونے میں کیا قباحت ہے؟ سود قطعاً حرام کیوں ہے۔ ضرورت کے وقت تھوڑے بہت سود لینے دینے کی اجازت ہونی چاہیئے تھی؟ سرد ملکوں میں صحت برقرار رکھنے کے لئے اگر اعتدال کے ساتھ شراب پی لی جائے تو کیا حرج ہے؟ عصر کی نماز میں فرض کے بعد نفل پڑھنا کیوں ممنوع قرار دیا گیا ہے؟ ——
ان سوالات کے جوابات دیئے جا سکتے ہیں مصلحتیں بتائی جا سکتی ہیں۔ مگر ہر مصلحت کے بعد "کیوں"؟ کا مطالبہ ہو۔ تو پھر اس کا جواب یہی ہوگا کہ اگر تمہاری سمجھ میں دین کی مصلحت نہیں آتی ہے تو کسی دلیل کے بغیر مانو اور اس بات پر مطمئن ہو جاؤ کہ دین میں ذرّہ برابر نقص اور خامی نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہے خود تمہاری عقل اور فہم کا قصور ہے ——!

اگر کوئی شخص کسی بڑے سے بڑے سائنس داں سے یہ پوچھے کہ پانی رقیق کیوں ہوتا ہے؟ تو وہ اس کا یہی جواب دے گا کہ پانی جن عناصر سے مرکب ہے۔ ان کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ ترکیب پانے کے بعد رقیق اور مائع صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس پر اگر پھر سوال کیا جائے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ عناصر ترکیب پانے کے بعد "جامد" کیوں نہیں ہو جاتے۔ تو اس قسم کی ذہنیت کو کون مطمئن کر سکتا ہے؟ آخر میں یہی جواب دیا جائے گا کہ بنانے والے نے ان اجزاء کو ایسا ہی بنایا ہے یا یہ اجزاء ایسی ہی خاصیت رکھتے ہیں۔ تمہارا جی چاہے مانو جی چاہے نہ مانو!

خدا کے وجود کی یقیناً دلیلیں ہیں اور اتنی دلیلیں ہیں کہ جن کی کوئی حد و شمار نہیں۔ زمین کا ایک ایک ذرّہ۔ پانی کا ایک ایک قطرہ اور درختوں اور پودوں کی ایک ایک پتّی خدا کے وجود پر دلیل ہے جو شخص خدا کا منکر ہے اس سے کہا جائے گا کہ اس دنیا میں کوئی چیز بھی آپ ہی آپ نہیں بن جایا کرتی۔ جب اسے کوئی بناتا ہے تو بنتی ہے۔ وجود شئے خود اس کے صانع کے وجود پر سب سے بڑی دلیل ہے۔ ایک ذرا سی آلپین اور ننھی سی سوئی آپ ہی آپ نہیں بن سکتی۔ تو اتنی بڑی کائنات خود بخود کیسے بن سکتی ہے۔ اور ہم کائنات کے اس قدر منظم اور باضابطہ کارخانے کو کسی اتفاقی حادثہ کا سبب کیسے مان لیں؟ کیا دنیا میں کبھی کسی نے مشاہدہ کیا ہے کہ کسی طبعی حادثہ کے سبب آپ ہی آپ کوئی مکان بن کر تیار ہو جائے اور کسی جنگل میں خود بخود ایک چمن نمودار ہو جائے۔ جس میں روشیں بھی ہوں، حوض اور فوارے بھی ہوں۔ اور جس کی منڈیروں پر قرینے کے ساتھ بیلیں بھی چڑھی ہوئی ہوں ——!

ایک منکر خدا کے سامنے اس قسم کی بہت سی دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں اور جہاں تک الفاظ، بیان۔ دلیل اور تحریر و تقریر ساتھ دے سکتی ہے وہاں تک اسے سمجھایا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ اس پر بھی نہ مانے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اور پھر دین میں زبردستی بھی نہیں ہے (لا اکراہ فی الدین ——) کہ تلوار کے زور سے خدا کا اقرار اس سے کرا کے ہی چھوڑیں۔ ایک منکر اور بے راہ رو کو ہدایت کی تعلیم دی جا سکتی ہے اور راہ ہدایت کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ ہدایت دینا اور ہدایت کے راستہ پر اسے چلا دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہمہ شما کا کیا ذکر انبیاء کرام تک کو یہ طاقت نہیں دی گئی اور خود سید الانبیاء خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بار بار اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ تم ان کافروں اور منکروں پر محتسب بنا کر نہیں بھیجے گئے تمہارا کام تو "بلاغ" —— یعنی اللہ کے پیام کا پہنچا دینا ہے۔ ہدایت و ضلالت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

یهدی من یشاء ویضل من یشاء ——!

للہ پر ایمان

مگر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کو خالق کائنات مانتا ہے اُس پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ اس دُنیا میں صرف "اقرار" سے کام نہیں چلتا - اگر آپ کسی حکومت کی رعایا بننے کے بعد کسی ذمہ داری کو قبول نہ کریں۔ نہ حکومت کے کسی ضابطہ کو مانیں اور نہ اس کے لگائے ہوئے ٹیکس ادا کریں۔ تو اس "اقرار" کے باوجود کہ آپ حکومت کی رعایا بن گئے ہیں۔ آپ کے ساتھ حکومت جو سلوک کرے گی اس کا اندازہ آپ خود ہی لگا لیجئے - جب آپ حکومت کی رعایا بنے ہیں تو حکومت کے قوانین و ضوابط کی بھی آپ کو پابندی کرنی ہوگی -

کوئی شخص پانی کو مانتا ہے کہ اس کا وجود ہے - تو پانی کے ماننے کے یہ معنی ہوئے کہ وہ پانی کو اس کے تمام خواص اور تمام صفات کے ساتھ مانتا ہے - اگر وہ یہ کہے کہ میں پانی کو تو مانتا ہوں - لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ پانی سے پیاس کس طرح بجھتی ہے اور پانی میں پیاس بجھانے کی خاصیت واقعتاً ہے بھی یا نہیں —— ! اس تشکیک و تذبذب کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ وہ شخص "پانی" پر ایمان رکھتا ہے - یہ تو "پانی" کے ساتھ ایک طرح کا مذاق اور فکر و خیال کی شوخی ہوئی —— !

خدا کا ماننا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کے ساتھ اسے مانا جائے - کوئی یہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو تو مانتا ہوں - مگر اس پر بھی میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرح مادہ بھی قدیم ہے - تو اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی صفت میں مادے کو شریک کیا - اس لئے اس کا اقرار نامعتبر ہے - یا کوئی یہ کہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق ہے - مگر کائنات کو خلق کرنے کے بعد اس نے ایک نظام بنا دیا ہے جس کے تحت یہ کائنات چل رہی ہے - اس نظام میں اللہ تعالیٰ کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا - کائنات کی تخلیق اور اس کے لئے نظام بنا دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کا اب کوئی تعلق نہیں رہا - تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کا انکار ہے —— !

یا کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کے جسم میں حلول کیا تھا اور وہ شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کا مظہر تھا - یا فلاں شخص اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے اور فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں —— خدا کا اقرار کرنے کے باوجود یہ تمام عقیدے انکار، الحاد اور زندقہ کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں !

یا کوئی اس عقیدے پر قائم ہو کہ خدا کے علاوہ بزرگوں کی روحیں بھی انسانوں کی مدد کرتی ہیں - لوگوں کی فریاد سنتی ہیں - اُن کی مرادیں پوری کرتی ہیں - اور اُن خدا رسیدہ روحوں کو اللہ تعالیٰ نے کائنات میں تصرف کا اختیار دے دیا ہے - وہ چاہیں تو آئی ہوئی مصیبت کو ٹال دیں - اس قسم کے عقیدے "توحید" کا حقیقت میں مذاق اڑاتے ہیں -

اللہ تعالیٰ کو جو کوئی اس کی تمام صفات کے ساتھ مانے گا اور اس کی صفت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرے گا - اسی کا "ایمان" اور "اقرار" معتبر اور مستند سمجھا جائے گا - ایک صحابی کی زبان سے فرطِ محبت میں یہ لفظ نکل گئے :-

"جو آپ چاہیں اور اللہ تعالیٰ چاہے "

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا - اور ان لفظوں کی فوراً اصلاح فرما دی - کہ یوں کہو "صرف تنہا اللہ تعالیٰ چاہے "

اللہ تعالیٰ کو اس طرح ماننا چاہئے کہ وہ خالق ہے، رب ہے - قادر ہے - عالم الغیب ہے - مدبر امور ہے - غفور رحیم ہے - مالک یوم الدین ہے - عادل ہے - مالک الملک ہے - لم یلد و لم یولد ہے - صمد ہے - احد ہے - رازق ہے - دستگیر اور فریاد رس ہے اور رہیگا - اس کی ذات و صفت کمی اور اضافہ کے نقص سے پاک ہیں - دُنیا میں کوئی شے اس کی مثل نہیں -

کوئی بھی نہ اس کے جوڑ کا ہے اور نہ اس سے ملتا جلتا ہے۔ وہ سمیع ہے اور ایسا سمیع ہے کہ کوئی خفیف سے خفیف اور پست سے پست آواز چاہے وہ پاتال میں کیوں نہ ہو۔ سن لیتا ہے۔ وہ بصیر ہے اور ایسا بصیر ہے کہ زمین کے نیچے سے نیچے طبقہ کی دھندلی سے دھندلی فضا اور موتی سے موتی تہہ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ نہ دیکھ رہا ہو۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کوئی احتیاج نہیں رکھتا۔ اس کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں۔ جو کچھ وہ کرتا ہے وہی عین عدل ہے اور جو کچھ وہ حکم دیتا ہے وہی ضابطہ اور قانون ہے۔ انبیاء کرام جو انسانوں میں سب سے زیادہ معزز اور محترم ہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر چاکر اور بندے ہیں۔

"مقلب القلوب" بھی وہی ہے اور "ہادی و مضل" بھی اسی کی ذات ہے۔ جس کو وہ کچھ عطا کرنا چاہے کوئی اسے روک نہیں سکتا اور جسے وہ بنانہ چاہے کوئی دوا نہیں سکتا۔ تمام مخلوق اس کے سامنے سرفگندہ، مجبور اور عاجز و درماندہ ہے انبیاء اور اولیاء بھی اسی کے در کے فقیر ہیں۔ کس کی مجال ہے جو اس کے جلال و جبروت کے آگے دم بھی مار سکے۔

صحابہ کرام اللہ تعالیٰ پر ایسا ہی ایمان رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کے یہاں فلسفہ اور کلام کی بحثیں پیدا نہ ہوئی تھیں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں کرید نہ کرتے تھے۔ ان کا کام "سمع و طاعت" تھا۔ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اس پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت میں تن من دھن سے لگ گئے۔

شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ تو وہ جن میں سے کسی کسی کی ایک رات بھی جام و بادہ کے بغیر نہ گزرتی تھی۔ انہوں نے شراب کے پیالے اور خم توڑ ڈالے اور کسی کسی کا پیالہ ہونٹوں تک پہنچا ہی تھا کہ حرمت شراب کی منادی سن کر اس نے پیالہ کو پھینک دیا ــــ عورتوں کے لئے آیت حجاب نازل ہوئی تو چہروں پر "خمار و جلباب" آگئے اور زینتیں چھپائی جانے لگیں۔ جہاد کا حکم دیا گیا تو فقر و فاقہ کی حالت میں ٹوٹی ہوئی تلواروں اور پھٹی ہوئی زرہوں کے ساتھ کافروں کے جرار لشکروں سے ٹکرا گئے۔ ایمان و یقین کا یہ عالم تھا کہ زخموں سے چور تھے اور دم نکل رہا تھا مگر زبان پر "فزت برب الکعبہ" تھا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات ہیں۔ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے۔ جنت و دوزخ کی لذت و عذاب مادی ہیں یا غیر مادی ــــ اس قسم کی تمام بحثیں اس زمانے میں پیدا ہوئی ہیں جب مسلمانوں پر عجمی تہذیب اور یونانی فلسفہ کا سایہ پڑا۔ اور "سمع و طاعت" کی جگہ عقل کی موشگافیوں نے لے لی ــــ!

جس مسئلہ پر سب سے زیادہ گفتگو ہوئی ہے بلکہ بحث و نظر کی معرکہ آرائیاں رہی ہیں وہ تقدیر و اعمال کا مسئلہ ہے۔ اگر مجرد "عقل" کی روشنی میں اس مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو حقیقت میں یہ مسئلہ اتنا الجھ جاتا ہے کہ ایک گرہ کھلنے نہیں پاتی کہ دوسری گرہ پڑ جاتی ہے!

اہل علم نے اپنی استعداد اور فہم کے مطابق اس مسئلہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے۔ یعنی یہ کہ بندہ کو فعل کا "کاسب" اور اللہ تعالیٰ کو "خالق" کہا ہے۔ کہ اس طرح نہ اللہ تعالیٰ کی ذات بندے کے افعال کی ذمہ دار ٹھہرتی ہے نہ بندہ مجبور محض بنتا ہے اور پھر اللہ کی قدرت پر حرف بھی نہیں آتا۔

مگر کوئی یہ کہے کہ بندہ اپنے فعل کا "کاسب" ہی سہی مگر یہ "کسب فعل" کیا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے باہر ہے اور کیا بندہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کسب فعل کر سکتا ہے ـــ تو یہ گرہ جو بظاہر "کشود" نظر آتی ہے ژولیدہ تر ہو جائے گی!

پھر اضطرار اور اختیار کے سلسلہ میں یہ بحث کہ ایک وہ شخص جو رعشہ کا مریض ہو وہ مضطر کہا جائے گا اور وہ جس کا ہاتھ

بالکل تندرست ہو۔ اس کے ہاتھ کی حرکت اضطراری نہیں اختیاری ہوگی۔ اس پر بھی گفتگو ہوسکتی ہے کہ اضطرار واختیار کے سررشتہ کی گرہ کس کے ہاتھ میں ہے۔ بندے کے یا خدا کے؟ اس اعتراض کے بعد پھر ایک نئی اُلجھن پیدا ہوگی!

تقدیر و اعمال اور جبر و تقدیر کے نازک مسائل تنہا عقل کے زور سے حل نہیں ہوسکتے اور اگر ہوئے بھی تو یہ عقدہ "ہم وا" رہیگا۔ ان کے حل کرنے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کیا جائے!

ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مسائل کا عقل و استدلال سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ جو کوئی خدا کا نیک بندہ عقلی دلائل سے کسی کو مطمئن بنانے اور اس کی کوششوں سے کسی کے دل کی گرہ کھل جائے تو یہ بہت بڑی نیکی ہوگی۔ ایک بار مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم و مغفور سے راقم الحروف نے عرض کیا تھا کہ مولانا! دین میں فلسفہ اور علم کلام کی بحثیں نہ آتیں تو اچھا تھا ان سے بڑی اُلجھنیں پیدا ہوگئیں۔ مولانا مرحوم نے جواب دیا کہ اچھا یہی تھا کہ کلام و فلسفہ کی بحثیں دینی مسائل میں نہ آتیں مگر جب آگئیں اور اس طرح دین میں گفتگو ہونے لگی۔ تو پھر اعتراضات دُور کرنے کے لے علماء حق کو بھی اس میدان میں آجانا پڑا۔ اور کلامی انداز میں گفتگو کرنی پڑی — !

آج بھی کوئی پوچھنے والوں کے شبہات دُور کرنے کے لئے عقلی استدلال کے ذریعہ شکوک و شبہات رفع کرتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے یہاں یقیناً اجر ملے گا۔ مگر میرے سامنے ایک دوسری منزل ہے جس میں خس و خاشاک نام کو بھی نہیں۔ عقلی مباحث میں بعض دقت الیسی نازک باتیں آجاتی ہیں کہ خود سمجھنے والا اپنے صحیح مُوقف سے ہٹتا ہوا نظر آتا ہے اور خوف لگتا ہے کہ ان اُلجھنوں سے زیادہ نازک مسائل پر گفتگو کرتے کرتے کہیں سمجھنے والا ہی غور و فکر کی بھول بھلیوں میں نہ پھنس جائے!

جو شخص عمل و تقدیر پر گفتگو کرتا ہے یا کسی کے دل میں اس قسم کا شبہ گزرتا ہے۔ تو اس سے یہ کہا جائیگا کہ تم خدا کو عادل مانتے ہو یا نہیں؟ وہ مسلمان ہے تو یہی کہیگا کہ اللہ تعالیٰ کو میں عادل مانتا ہوں! پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی تھی اور اس کے کسی حرف اور شوشہ میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور قرآن پڑھنے والے سے کہتا ہے؟۔

"ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ"

اس کتاب میں (کسی قسم کا بھی کوئی) شک نہیں ہے۔ کیا تم ان باتوں پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر وہ شخص مسلمان ہے تو اس کی طرف سے جواب "اثبات" میں ملے گا۔

اس منزل پر پہنچنے کے بعد اس سے کہا جائیگا کہ جس خدا نے "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" کہا ہے اور جو "تقدیر" کا خالق ہے اور جس کے حکم کے بغیر نہ کوئی ذرّہ حرکت کرسکتا ہے اور نہ کوئی پرندہ پر مار سکتا ہے۔ وہی خدا یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال پر محاسبہ بھی ہوگا اور ایک ذرہ ذرہ کا حساب لیا جائے گا۔ تو تم جب خدا کو عادل مانتے ہو اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہو کہ اللہ کی کتاب میں شک نہیں ہے تو تم "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" پر بھی ایمان رکھو اور اس پر بھی ایمان لاؤ کہ بندوں کے اعمال قیامت کے دن تولے جائیں گے اور ان کی جانچ پڑتال ہوگی۔ اس تصور اور عقیدہ کے بعد پھر کوئی اُلجھن انشاء اللہ باقی نہیں رہے گی — !

اللہ تعالیٰ ہم سب کو کتاب و سنت کے مطابق ٹھیک ٹھیک عقیدے رکھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین!)

ماہر القادری

ترجمۂ قرآن کی جھلکیوں کے بعد

مولانا ابوالکلام آزاد کی انشاپردازی بلکہ جادو نگاری اور خطابت کا مجھ سے زیادہ مداح شاید ہی کوئی اور ہوگا۔ اُن کی ذہانت اور فطانت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ مولانا آزاد نے اُردو ادب میں ایک اچھوتے اسلوب نگارش کی بنا ڈالی ہے مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا سا بھی تامل نہیں ہے کہ مولانا موصوف کے بلند پایہ مضامین سے میں نے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا کی اسی شخصیت کا اثر تھا کہ اب سے تقریباً بائیس سال قبل میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں مولانا آزاد کی تحریروں سے وہ جملے انتخاب کئے تھے جو "ضرب الامثال" بن سکتے ہیں۔ اس مضمون کے لئے میں نے الہلال کی تمام فائلیں جو حسن اتفاق سے مدرسۂ آصفیہ حیدرآباد دکن کی لائبریری میں مجھے مل گئی تھیں۔ لفظاً لفظاً پڑھی تھیں۔ یہ مضمون اسی زمانے میں ماہنامہ ہمایوں (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔

اب سے دو سال قبل "فاران" میں میرا مضمون جو مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں چھپا تھا۔ وہ ایک "تحقیقی" مضمون تھا۔ "تحقیقی" اس اعتبار سے کہہ رہا ہوں کہ مشہور شخصیتوں کے وطن، حسب نسب، اساتذہ، تلامذہ اور دوسرے حالات کے بارے میں تحقیق اور اس کے نتائج کا اظہار ہر دَور میں نقد و تحقیق کا موضوع رہا ہے۔ کیا دنیا کے ہر ادب میں اس کی مثالیں نہیں ملتیں کہ مشہور شخصیتوں کے سنہ پیدائش، سنہ وفات، مولد و منشاء اور بعض دوسری باتوں پر اہلِ تحقیق کے درمیان بڑے معرکے رہے ہیں۔ مثلاً حضرت سعدی شیرازی سومنات آئے تھے یا نہیں آئے تھے۔ اس پر لکھنے والوں نے کتنا لکھا ہے اور اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اظہارِ خیال کیا ہے۔ تاریخ و سیر کی کتابیں اس قسم کی اختلافی بحثوں سے بھری پڑی ہیں۔

فارسی کے مشہور شاعر حضرت حسن سجزی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہٗ کے مریدِ خاص اور حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کے ہم عصر اور خواجہ تاش تھے۔ ان کا دیوان اب سے سولہ سترہ سال قبل حیدرآباد دکن میں چھپا تھا۔ جس کے مصارف مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے برداشت کئے تھے۔ مولوی مسعود علی محوی مرحوم نے اس دیوان کا دیباچہ لکھا اور کتنے ہی صفحے صرف اسی تحقیق میں صرف کر دیئے کہ حضرت حسن کا وطن "سجز" تھا یا "سجز" اور اس نسبت سے ان کو "سجزی" کہنا چاہیئے یا "سجزی"۔

اس کا پتہ بھی اہلِ تحقیق ہی نے چلایا ہے کہ وہ دیوان جو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور اور منسوب ہے وہ حقیقت میں ملا معین واعظ کا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے جو کتاب منسوب کی جاتی ہے اور شریف الرضی

---

[1] مثلاً جو شخص بستر سے اُٹھ کر راستے میں سو گیا وہ اگرچہ بستر سے اُٹھ چکا ہے مگر نیند سے بیدار نہیں ہوا۔ یا۔ حق کا اعلان ہی اس کی کامیابی ہے۔ (مفہوم یہی تھا۔ الفاظ اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں تو یہ میرے حافظہ کا قصور ہے۔ م ق)

جس کے جامع اور مدوّن تھے۔ اس کے بارے میں اہل علم نے کیسی کیسی تحقیق کی ہے اور بحث ونظر نے کیا کیا اختلافی پہلو اختیار کئے ہیں۔

بعض باتیں مشہور شخصیتوں کے بارے میں غلط بھی مشہور ہو جاتی ہیں مثلاً پنڈت موتی لال نہرو کے متعلق لوگوں میں یہ بات کس قدر شہرت پا چکی ہے کہ ان کے کپڑے پیرس دُھلنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں اس کی پُر زور تردید کی ہے — !

اس قسم کے اختلافی مباحث کسی ممتاز اور مشہور شخصیت کی وفات کے بعد اور زیادہ زور پکڑتے ہیں۔ جس کی ذات سے ان مباحث کا تعلق ہوتا ہے وہ شخصیت دُنیا سے اُٹھ چکی ہوتی ہے اور تحقیق کرنے والے قرائن و واقعات سے نتائج اخذ کرتے رہتے ہیں — !

اگر کسی مشہور شخصیت کی زندگی ہی میں اس کے سوانح حیات کے بعض اختلافات اور شبہات کے بارے میں خود اسی شخص سے تحقیق کر لی جائے تو یہ کتنی اچھی بات ہے اور اس سے کتنی بہت سی اُلجھنیں دُور ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ بعض اسی قسم کی اختلافی باتیں مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات کے بارے میں میرے علم میں آئی تھیں۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ اُن باتوں کو سُنتے ہی سپرد قرطاس کر دیتا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا کہ مقصد بلاوجہ کی چھیڑ نہیں بلکہ تحقیق تھی۔

چنانچہ میں نے ایک عریضہ مولانا آزاد کی خدمت میں بھیجا اور چند باتوں کی جو اُن کی زندگی سے متعلق تھیں وضاحت چاہی۔ اس خط کا مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر میں نے چند دن انتظار کرنے کے بعد دوسرا عریضہ گزرانا اور پہلے خط کی یاد دہانی کی۔ مگر صدائے برنخاست — کیوں؟ اس کا مجھے علم نہیں۔ شاید اس کا سبب کاتب اور مکتوب الیہ کی شخصیتوں کا تفاوتِ درجات ہو۔ مگر کیا "چھوٹوں" کے استفسارات کا "بڑوں" نے جواب نہیں دیا ہے۔ اور بڑے آدمیوں نے اپنی سطح کے اشخاص کے علاوہ اپنے سے چھوٹوں کو کیا کبھی شایانِ خطاب اور لائقِ جواب ہی نہیں سمجھا — ؟

مولانا ابوالکلام آزاد تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ ہم جیسے چھُٹ بھیّاؤں کے بارے میں یہ صورت رہی ہے۔ کہ جب میں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا تو میرے نام بعض خطوط کے پتوں میں "پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی" لکھا آتا تھا۔ اور میں ہاتھ کے ہاتھ جواب دے دیا کرتا تھا کہ میں پروفیسر نہیں ہوں۔ "قادری" کی نسبت سے بعض لوگ مجھے "سید" سمجھتے تھے۔ اس کی بھی تردید کرنی پڑی۔ مجھے بعض لوگ "بدایونی" سمجھتے اور لکھتے تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے دیوبند کے ریلوے اسٹیشن پر پہلی بار نیاز حاصل ہوا تو مولانا موصوف بولے۔ "آپ تو "بدایونی" ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو ضلع بلند شہر کے ایک گاؤں دکھیر کلاں کا رہنے والا ہوں — اور ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ بعض شعروں کے متعلق پوچھا گیا ہے اور وہ میرے شعر نہیں تھے تو میں نے جواب دے دیا کہ ان شعروں کی میری ذات سے نسبت غلط ہے — !

بڑی شخصیت ہوں یا چھوٹے آدمی ہوں۔ جب بھی ان کی ذات اور شخصیت کے بارے میں کوئی بات پوچھی جائے اس کا جواب دے دینا چاہیئے۔ اس سے بات صاف اور اُلجھن دُور ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی کسی شخص کو اطمینان نہ ہو اور بلاوجہ کی چھیڑ نکالے تو یہ اس کا اپنا فعل ہے۔ اگر کسی کے بارے میں پہلے سے یہ علم ہو کہ فلاں شخص بدنیت اور مفسد ہے اور اس قسم کے سوالات سے اس کا مقصد تحقیقِ واقعہ نہیں بلکہ بات کو اُلجھا دینے میں ڈالنا ہے تو بعض حالات میں جواب کے بجائے سکوت بھی اختیار کیا جا سکتا ہے — !

مگر مولانا ابوالکلام کی خدمت میں مجھ ہیچمدان نے زندگی بھر میں پہلا عریضہ بھیجا تھا اور میں نے ان کی ذات پر کبھی

تنقید بھی نہیں کی تھی - اس لئے مولانا موصوف کو میرے خط کا جواب دے دینا چاہئے تھا - جبکہ خود ان کی ذات کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان تھا - جب میرے دونوں خطوں کا "بارگاہِ عالی" سے جواب نہیں ملا تو پھر میں نے اپنی تحقیق اور معلومات کے نتائج ایک مضمون (پردہ اٹھتا ہے) کی شکل میں پیش کر دیئے -

میرے اس مضمون کو مولانا ابوالکلام آزاد کے عقیدت مندوں نے پسند نہیں کیا - اور ان کو اس پر ناخوشی کا حق بھی حاصل ہے - مگر تحقیق اور تنقید کرنے والے، لوگوں کی خوشی اور ناخوشی کی پروا کیا کرتے اور اس ڈر سے کہ کسی کی عقیدت کو ٹھیس نہ پہنچ جائے علمی اور تاریخی حقائق کو منظرِ عام پر نہ لاتے تو علم و تحقیق پر یہ کتنا بڑا ظلم ہوتا اور کتنے واقعات سینوں اور سفینوں میں بس دفن ہو کر رہ جاتے !

مولانا ابوالکلام آزاد کی ذہانت اور جودت کے اعتراف کے باوجود ایک ناقد اظہارِ رائے کر سکتا ہے کہ ترجمہ پر مولانا موصوف نے جو مقالہ تحریر فرمایا ہے اس میں جذبات کا جوش زیادہ اور تحقیق کم ہے - اب یہ تنقید ان کے کسی عقیدت مند کو بری لگتی ہے تو بیچارہ ناقد کیا کرے - مولانا کے نظریہ "وحدتِ ادیان" سے اختلاف کیا جا سکتا ہے -

مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے وطن - خاندانی حالات اور تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں ایسی باتوں کی نسبت کیوں ضروری سمجھی ہے - جو اگر بالکل حذف کر دی جائیں تو بھی ان کی شخصیت اور وقار میں کوئی کمی نہیں آ سکتی - مثلاً مسٹر مہادیو دیسائی نے جو مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے حالات انگریزی میں قلمبند کئے ہیں - اس میں لکھا ہے کہ: "نواب یوسف علی خاں والی رام پور مولانا کے والد مولوی خیرالدین صاحب کے مرید تھے۔" حالانکہ نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور شیعہ تھے اور شیعہ صاحبان کے یہاں پیری مریدی کا سلسلہ نہیں پایا جاتا ! اس قسم کی تعلیوں پر کوئی گرفت کرتا ہے - تو عقیدت مندانِ آزاد چیں بہ جبیں ہوتے ہیں — !

"غبارِ خاطر" میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو اپنی موسیقی دانی کا ذکر چند صفحوں میں کیا ہے - کیا اس سے اُن کے علم و فضل میں اضافہ ہوتا ہے ؟ شاید "امامت" و "اجتہاد" کو یہ باتیں زیب بھی نہ دیں -

"عربی دانی" میں نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا ایک قول مولانا ابوالکلام آزاد کی عربی دانی کے بارے میں نقل کر دیا تھا - اس پر بعض اخباروں نے مولانا کی حمایت میں اچھی خاصی معرکہ آرائی کے سامان پیدا کر دیئے - جولائی کے "فاران" میں "مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمہ قرآن کی چند جھلکیاں" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے - اب مولانا محمد ناظم ندوی شیخ الجامعہ بہاولپور کے ایک غیر مطبوعہ[1] مضمون کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے -

"مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں عربی کے بہت سے اشعار بھی لکھے ہیں - مگر ان کا ترجمہ کہیں نہیں لکھا ہے - میری تلاش میں صرف ایک جگہ ایک شعر کا ترجمہ دیا ہے - اور وہ بھی غلط ہے - اور یہ ترجمہ غلط اس لئے ہے کہ انہوں نے لفظ غلط پڑھا ہے اور اس غلط لفظ پڑھنے سے شعر بھی وزن سے ساقط ہو جائے گا -

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ایک شعر ہے کہ ہجرت کے وقت مدینہ منورہ کی

---

[1] اس مضمون کا ایک جملہ یہ بھی ہے :-
"صرف و نحو، ادب و لغات اور خاصیت ابواب کی معرفت کے قفل کو انشا پردازی اور ذہانت کا جادو نہیں کھول سکتا۔"

آب و ہوا اہل مکہ کو ناموافق تھی۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت بلالؓ بیمار پڑ گئے۔ اُس وقت بیماری کی حالت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی زبان مبارک پر یہ شعر جاری تھا ؎

کل امرئ مصبح فی اھلہ والموت ادنی من شراک نعلہ

اس کا ترجمہ مولانا یہ فرماتے ہیں:-

"ہر آدمی کے لئے صبح اس کے گھر میں ہونے والی ہے اور موت تو اس کی جوتیوں کے تسمے سے بھی قریب تر ہے"۔ (ص ۲۶۷ طبع ثانی لاہور)

خط کشیدہ عبارت پر نظر ڈالی جائے۔ یہ ترجمہ صحیح جب ہو سکتا ہے جب لفظ "مُصبح" کو باب افعال سے پڑھا جائے اور اصبح۔ مصبح سے اسم فاعل مانا جائے مگر اس حالت میں اولاً شعر وزن سے ساقط ہو جائے گا اور ثانیاً دونوں مصرعوں میں کوئی ہم آہنگی باقی نہ رہیگی۔ صحیح تلفظ "مُصَبَّح" باب تفعیل کا مفعول ہے۔ تصبیح کے معنی صبح کے وقت ڈاکہ ڈالنے کے ہیں۔ مصبح وہ شخص ہے جس پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر شخص کو موت آنے والی ہے اور خود اس کے اہل و عیال کے سامنے اور اس کے گھر میں موت کا ڈاکہ اس پر پڑنے والا ہے!

اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے گھر والوں میں ہر صبح کو خیریت اور سلامتی کی دعا دی جاتی ہے۔ حالانکہ انسان کی فنا کا یہ حال ہے کہ موت اس سے اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔ یہ شعر بخاری میں موجود ہے۔ شروح بخاری میں اس کا مطلب دیکھا جا سکتا ہے اور اس سے صواب و خطا کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

اسی تذکرہ میں (ص ۲۱۹ طبع ثانی) ایک اور شعر عربی کا لکھا گیا ہے ؎

ستحلم لیلیٰ انی دین تداینت وای غریم فی التقاضی غریمھا

گو اس شعر کا ترجمہ مولانا (آزاد) نے نہیں دیا۔ مگر جس موقع پر اس کو پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ لفظاً "دین" کو نہ صحیح پڑھ سکے اور نہ اس کا مطلب سمجھ سکے۔ انہوں نے اس کو "دِین" بکسر الاول پڑھا ہے۔ جس کے معنی یہاں مذہب کے سمجھے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے تذکرہ میں اس موقع پر یہ شعر لکھا ہے کہ یونانی فلسفہ و حکمت میں انہماک و توغل سے قدیم فلاسفہ و متکلمین جس طرح گمراہ ہو گئے۔ اس طرح موجودہ فلسفہ اور سائنس کی تعلیم سے اس زمانے کے نئے تعلیم یافتہ بھٹک گئے۔ یہ موقع اس کا ہے کہ شعر میں مولانا نے اس کو دِین پڑھا ہے۔ جس کے معنی مذہب کے ہیں۔ اس بات کا قطعی ثبوت کہ مولانا نے اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں غلطی کی ہے ان کی تفسیر جلد اول سے ظاہر ہے۔ "مالک یوم الدین" کے تحت میں دین کی تحقیق میں اپنا یہ پسندیدہ شعر دوبارہ تحریر فرماتے ہیں۔ حالانکہ اس لفظ کا تلفظ شعر میں "دَین" ہے۔ جس کے معنی قرض کے ہیں۔ جس کے ثبوت کے لئے اس شعر میں تقاضی (تقاضا کرنا) اور تداین (قرض کا معاملہ کرنا) اور غریم (قرضدار اور قرضخواہ) کے لفظ ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس شعر کو دِین (بکسر الاول بمعنی جزائے عمل) کی لغوی تحقیق کے ضمن میں وہی شخص پیش کر سکتا ہے۔ جس کی عربی دانی تمام تر ناقص ہو۔ اگر یہ لفظ دِین ہوتا تو "تداینت" کے بجائے تدینت ہوتا۔ جس کے معنی مذہب اختیار کرنے کے ہیں۔ ایک شعر کا تعلق تفسیر سے ہے اور دوسرے کا حدیث سے!

ارشد تھانوی

آخری انقلاب

یہی دنیا تھی ، انسانوں کے حیوانی خصائل تھے
شریفانہ خصوصیات سب مفقود تھیں اُن میں
جرائم کوش و بد اندیش و فتنہ ساز و مفسد تھے
جفا کرنا تھا فخر سرمایۂ عز و وقار اُن کا
نہ ہمدردی کا شمّہ تھا نہ پاسِ رحم بالکل تھا
بنا کر بھائیوں کو اپنے وہ حلقہ بگوش اپنا
غلامانہ تسلط میں۔ نشانِ حریت گم تھا
پئے اغراضِ نفسانی، جب کپسے گرتے تھے
برائے نام بھی عزت نہیں کرتے تھے عورت کی
خبر گیراں نہ بیواؤں کا تھا کوئی نہ پرساں تھا
تذلل کی کی تعبد کی یہ شدت تھی یہ کثرت تھی
کہیں طاری تھی ہیبت حادثاتِ ناگہانی کی
کہیں اجرام پجتے تھے فضائے آسمانی کے
ہر اک فرعون خصلت مرکزِ الحاد بنتا تھا
وہ آنکھ اور کان رکھتے پر بھی اندھے اور بہرے تھے
پنپنے ہی نہ پاتے تھے کبھی ذہنی تباہی سے

قساوت کے وہ حامل تھے، شقاوت پر وہ مائل تھے
کمینہ پن کی پوری طاقتیں موجود تھیں اُن میں
معائب ہی محاسن تھے، ذمائم ہی محامد تھے
یہی تھا امتیاز اُن کا، یہی تھا افتخار اُن کا
نہ اُن کو قتل و خونریزی میں مطلق کچھ تامل تھا
دکھاتے تھے تعدی میں انھیں جوش و خروش اپنا
تکبر تھا، تشدد تھا۔ تبختر تھا، تحکم تھا
بقدرِ قوت و طاقت جو کر سکتے تھے کرتے تھے
کھلونا تھی فقط وہ مرد کے جذباتِ عشرت کی
یتیموں کا اسیروں کا خدا ہی بس نگہباں تھا
شجر کی بھی عبادت تھی حجر کی بھی عبادت تھی
پرستش تھی ہوا کی آگ کی ، مٹی کی پانی کی
ربوبیت کے چرچے تھے کہیں انسانِ فانی کے
کوئی نمرود بنتا تھا کوئی شداد بنتا تھا
دماغ و قلب پر بیٹھے ہوئے اک اک کے پہرے تھے
غرض تھے ہر طرح محروم نعمائے الٰہی سے

یہ حالت تھی کہ گونجی حق کی اک آواز دنیا میں
ہوئی ذاتِ محمدؐ غلغلہ انداز دنیا میں

یہ وہ انسانِ کامل تھے یہ وہ انسانِ اعظم تھے
خدا کا لے کے آئے تھے وہ پیغام دنیا میں
نہ ان میں کوئی اعلیٰ ہے نہ افضل ہے نہ برتر ہے
فقط کردار کی پاکیزگی وجہ بلندی ہے
فقیر بے نوا ہے یا امیر ذی حشم کوئی

جو عالم کے لئے رحمت تھے، اکرام مجسم تھے
کہ ہیں تخلیق میں یکساں یہ خاص و عام دنیا میں
بنی آدم کا ہر ہر فرد رتبہ میں برابر ہے
یہی دنیا و عقبیٰ میں سبیلِ ارجمندی ہے
حقوقِ آدمیت میں زیادہ ہے نہ کم کوئی

رئیس محترم ہے بادشاہ معظم ہے — غریبوں کی طرح وہ بھی فقط اک ابن آدم ہے
خدا ہی سب کا مالک ہے خدا ہی سب کا والی ہے — سزاوار پرستش صرف اسی کی ذات عالی ہے
کرم ہے عام اس کا اور بخشش عام ہے اسکی — بلا تخصیص سب پر بارش اکرام ہے اس کی
یہ موجودات جو سب گرد و پیش اور زیر و بالا ہیں — نہ ان میں ہی کچھ ادنیٰ ہیں نہ ان میں ہی کچھ اعلیٰ ہیں
یہ مخلوق خدا ہیں اور پابند مشیت ہیں — نہ موضوع تنفر ہیں نہ موضوع عقیدت ہیں

یہ وہ پیغام تھا۔ جس سے جہاں میں انقلاب آیا
نئے سرے سے عروس آدمیت پر شباب آیا

ضمیر و رائے نے اظہار کی آزادیاں پائیں — قبول و رد و استفسار کی آزادیاں پائیں
حقائق کو نہیں پروا براہین و دلائل کی — صداقت نے اڑا دیں دھجیاں نادیدہ باطل کی
شرف انسان نے پایا اخوت جو نا موس نفرت سے — ہوا وہ کارفرما اپنی پوری استطاعت سے
دلوں میں روشنی پیدا ہوئی ایمان و ایقان کی — ضیا باری لگیں کرنے شعاعیں علم و عرفاں کی
ہوئی بالیدگی روحوں میں بھی جسموں میں بھی پیدا — تنوع ہو گیا افکار کی رسموں میں بھی پیدا
ملی ہر علم و فن کو عزت و ترتیب عالم میں — ترقی بالغرض کرنے لگی تہذیب عالم میں
فضاؤں سے جہالت کی گھٹائیں چھٹ گئیں آخر — جکڑنے والی زنجیروں کی کڑیاں کٹ گئیں آخر
دیانت نے جگہ پائی فروغ آدمیت میں — ریاست میں حکومت میں سیاست میں عدالت میں

محمد مصطفیٰ ﷺ نے زیست کو تابندگی بخشی
عمل ہی کو نہیں خود علم کو بھی زندگی بخشی

مظہر القادری

ابتدا — انتہا

مرد مومن را محمد ابتداست

مرد مومن را محمد انتہاست

بنگر ایں ہیئت پیمانہ فروش — جام در دست و مصلا بر دوش
آہ از سینۂ مینا برخاست — ساقی بادہ مگر پنبہ بگوش

دین و دنیا بہم آمیختہ شیخ
بر لبش آیت و بت در آغوش

رُوحِ انتخاب

"حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنے مقصد کی تبلیغ کے لئے پہلے کن لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں اور کس طرح مخاطب کرتے ہیں؟"

سوال کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو انبیاء کی بعثت ان کی پوری قوم کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن کیا وہ آغاز کار ہی میں پوری قوم کو مخاطب کرتے ہیں یا شروع شروع میں ان کا تخاطب قوم کے کسی خاص طبقہ سے ہی ہوتا ہے؟ اگر کسی خاص طبقہ سے ہی ہوتا ہے تو وہ کونسا طبقہ ہے؟ عامۃ الناس کا یا ان لوگوں کا جو عامۃ الناس کی قیادت و رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں؟

سوال کے دوسرے جزو کا منشا یہ ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر نبی کی قوم۔ شروع شروع میں اس کی دعوت سے بیگانہ بلکہ اس کی شدید مخالف رہی ہے۔ پھر کیا انہوں نے سب کو منکر و کافر سمجھ کر اپنی دعوت کا آغاز "اے کافرو! ایمان لاؤ!"۔ "اے مشرکو! اللہ کو ایک مانو!" سے کیا یا ان کا طرز خطاب کچھ اور رہا؟

یہ دونوں سوال بہت اہم ہیں۔ ان کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے دعوت کے نقطۂ آغاز کو متعین کرنے میں بھی غلطیاں کی ہیں اور بہتیرے اپنا اور اپنے مخاطبوں کی صحیح پوزیشن سمجھنے میں بھی افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یا تو یہ ہوا کہ ساری دعوت ایک غلط نقطہ سے شروع ہونے کی وجہ سے بے اثر رہ گئی یا داعی اور مدعو کا صحیح موقف متعین نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک فتنہ کی شکل اختیار کر لی اور اصلاح کی بجائے اس سے بڑے بڑے فسادات اٹھ کھڑے ہوئے!

انبیاء کا خطاب وقت کے لیڈروں سے

اس فصل میں ہم سوال کے پہلے حصے کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ اس تاریخ کی روشنی میں جو قرآن نے پیش کی ہے۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سب سے پہلے قوم کے ارباب اقتدار کو مخاطب کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا۔ پھر اس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار کی باگ تھی۔ اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے ہوئے بیٹھا تھا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰهِیْمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۔ (بقرہ)	تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں کج بحثی کی محض اس غرور کے سبب سے کہ خدا نے اس کو سلطنت دے رکھی تھی!

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں:۔

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤی اَنْ تَزَكّٰی وَاَهْدِیَكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَخْشٰی ۔	فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے اور اس سے کہو۔ کیا تجھ میں کچھ اس بات کی رغبت ہے کہ تو پاکیزگی حاصل کرے اور میں تجھے تیرے رب کی راہ سجھاؤں تو تو اس سے ڈرے۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہ اعظم بنوخذ نصر کو دعوت دی۔ یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی۔ اسی طرح نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، لوط علیہ السلام

شعیب علیہ السلام۔ سب کی دعوتیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ ان میں سے ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے ارباب اقتدار اور متکبرین کو جھنجھوڑا اور ان کے افکار و نظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اور آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ لوگ عرب کی مذہبی اور پدرسرانہ (PATRIARCHICAL) حکومت کے ارباب حل و عقد تھے۔ اور ان کے واسطے سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا کو دعوت دینے کے لئے بھی آپ نے "امت وسط" کو جو طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ آپ نے متعدد سلاطین عالم کو نامے لکھے اور اسلام کو پہلے ان کے سامنے پیش کیا۔ اور ان سے مطالبہ کیا کہ "اسلام لاؤ۔ سلامت رہوگے۔ ورنہ تمہاری اور تمہارے زیردستوں دونوں کی گمراہی کی ذمہ داری تم پر رہے گی"

یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ بعد میں امت کے ارباب حل و عقد دعوت عام کے لئے اسی طریقے کی پیروی کریں۔ اور خلافت راشدہ کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی طریقے پر تبلیغ عام کی ذمہ داری ادا کی جو ان پر شہداء اللہ علی الناس کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔!

حضرت مسیح کا خطاب

یہ ایک امر واقعہ ہے جس سے کوئی شخص جس نے انبیاء کی تاریخ پڑھی ہو۔ انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ساتھ ہی اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن کے بام و در پر آفتاب ہدایت کی کرنیں سب سے پہلے پڑتی ہیں۔ تقدیر کی نیرنگی سے۔ قبول ہدایت میں سب سے پیچھے وہی رہتے ہیں۔ حبش کے بلالؓ۔ روم کے صہیبؓ۔ فارس کے سلمانؓ اور مدینہ کے کسان دور دور سے آتے ہیں اور داخل اسلام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن قریش کے لیڈر۔ ابولہب۔ ابوجہل۔ امیہ بن خلف وغیرہ اور طائف کے اشراف۔ جن کے سامنے خدا کا رسول شب و روز دعوت حق بلند کرتا ہے۔ اس برکت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے اگر فیض پاتے بھی ہیں تو وہ غریب عوام جن کی طرف ابھی دعوت کا خطاب براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہے جو لوگ ترتیب دعوت میں آگے ہیں وہ قبول دعوت میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور جو ترتیب دعوت میں پیچھے ہوتے ہیں وہ قبول دعوت میں آگے ہو جاتے ہیں۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ بات پوری ہو کے رہتی ہے۔!

"کتنے ہیں جو آگے ہیں۔ وہ پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے ہیں جو پیچھے ہیں وہ آگے ہو جائیں گے"

لیکن اس واقعہ کے باوجود حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنی دعوت کی ترتیب نہیں بدلتے اور عامۃ الناس کو اس وقت تک براہ راست مخاطب نہیں کرتے۔ جب تک وقت کے کارفرما عناصر اور لیڈر حضرات اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ان کو مایوس نہ کر دیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی بعثت کے بعد برابر علمائے یہود کے جمود پر ضربیں لگاتے رہے۔ لیکن ایک عرصہ کی جدوجہد کے بعد بھی جب ان کے کبر و غرور اور پندار سیادت کی چٹان نہ ٹوٹی تو وہ ان کو چھوڑ کر جھیل کے کنارے کے ماہی گیروں کے پاس چلے گئے۔ اور ان کو دعوت دی کہ:۔

"اے مچھلیوں کے پکڑنے والو! آؤ میں تمہیں آدمیوں کا پکڑنے والا بنا دوں"

اور اللہ نے انہی کے اندر سے ان کو ایسے اہل ایمان دیئے جو ان کے حواری کہلائے۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ	جب عیسیٰ نے ان کی (علمائے یہود) کی طرف سے
أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ	کفر پر اصرار کو بھانپ لیا تو (عام لوگوں کو مخاطب کر کے)
نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ	کہا کون اللہ کی طرف بڑھنے میں میرا مددگار ہوتا ہے
بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (آل عمران۔ ۸۲)	حواریوں نے کہا۔ ہم اللہ کے مددگار ہیں۔

ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہیئے کہ ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔!

اس آیت میں اُن کی اس دعوتِ عام کی طرف اشارہ ہے۔ جو انہوں نے اس وقت بلند کی جب وہ وقت کے علماء اور لیڈروں کے قبولِ حق کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے اپنی دعوت غربا اور عوام کے سامنے پیش کی اور ایسے درد کے ساتھ پیش کی کہ جس دعوت سے یروشلم کے پشتینی دیندار و زاہد نہ پسیجے۔ مگر اس نے دریا کے کنارے کے ملاحوں کے دلوں کو موم کر دیا۔ اور بالآخر انہی کے اندر سے دعوتِ حق کے وہ خادم پیدا ہوئے جنہوں نے بڑی بڑی زہرہ گداز آزمائشوں کا مقابلہ کر کے اس کو دنیا میں غالب اور فتحمند کیا۔ سورۂ صف میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا انصار اللہ
کما قال عیسی ابن مریم للحواریین من
انصاری الی اللہ قال الحواریون نحن
انصار اللہ فاٰمنت طائفۃ من بنی
اسرائیل وکفرت طائفۃ فایدنا الذین
اٰمنوا علی عدوھم فاصبحوا
ظاھرین

اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو جس طرح کہ
عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی
راہ میں میرا مددگار بنتا ہے۔ تو حواریوں نے کہا
ہم اللہ کے مددگار بنتے ہیں۔ تو ایک گروہ بنی اسرائیل
میں سے ایمان لایا (حواریوں کا گروہ) اور ایک گروہ
نے کفر کیا (علماء و سادات کے گروہ نے) پس ہم نے
مدد کی ان لوگوں کی جو ایمان لائے ان کے خلاف جو اُن
کے دشمن تھے پس وہ لوگ غالب ہو گئے۔

... ...

حضرت مسیح علیہ السلام نے ہدایت و ضلالت کے باب میں تقدیر کی اس نیرنگی پر کہ آگے بڑھنے والے پیچھے رہ جائیں اور پیچھے والے آگے نکل جائیں۔ نہایت مؤثر اور بصیرت افروز تمثیلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن بحث بالکل دوسرے گوشہ میں نکل جائے گی اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یہاں صرف اس حقیقت کو ہم سامنے لانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ قبولِ دعوت میں عموماً سبقت عام لوگ ہی کرتے ہیں جو ترتیبِ دعوت میں مؤخر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حضرات انبیاء کرام جب تک وقت کے ذہین اور کارفرما عناصر سے مایوس نہیں ہو جاتے۔ اس وقت تک عامۃ الناس کو براہِ راست مخاطب نہیں کرتے ہیں۔

آنحضرت صلعم کا خطاب

غور کر کے دیکھئے تو بعینہٖ یہی صورت حال آپ کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی نظر آئے گی۔ آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق قریش کو دعوت دی۔ جو سارے عرب کے مذہبی و سیاسی پیشوا تھے۔ اور ان کے سرداروں میں سے ایک ایک کے سامنے اللہ کے دین کو پیش کیا۔ جب اُن کی طرف سے نفرت اور مخالفت کا مظاہرہ ہوا تو آپ نے ان کے قبولِ اسلام کے لئے دعائیں بھی کیں۔ ان میں سے بعض بعض کیلئے جو قوم میں خاص اہمیت رکھتے تھے آپ نے تعیین کے ساتھ نام لے کر بھی دعا فرمائی۔ مثلاً منقول ہے کہ آپ نے دعا فرمائی:-

"اے اللہ! عمر یا ابوجہل کے اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت دے۔"

ان لوگوں کے قبولِ اسلام کا شوق آپ پر اس قدر غالب تھا کہ اس جوش میں آپ کو اپنے ضروری آرام کا خیال رہتا نہ اپنے مرتبہ اور عظمت کا۔ بلکہ بسا اوقات۔ انہماک آپ پر اس قدر غالب ہو جاتا کہ ان مسلمانوں کی تربیت کے لئے بھی آپ کے پاس وقت نہ بچتا جو نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو چکے ہوتے اور تربیت کے محتاج ہوتے۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود آپ بعثت کے بعد ایک مدت تک انہی لوگوں کے ساتھ مشغول رہے۔ اور ان کے ہر قسم کے طعن و طنز۔ تحقیر و استہزاء اور عناد و خلاف کو برداشت کرتے رہے۔ لیکن اس چیز کی ایک حد تھی۔ جس کے بعد ان لوگوں کو زیادہ اہمیت دینا اور ان کے پیچھے پیچھے رہنا خود دعوت کے وقار کے خلاف تھا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس حد پر پہنچنے کے بعد آپ کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا اور صرف ان لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا گیا جو ایمان لا چکے تھے یا جن سے توقع تھی کہ اُن کو کوئی نصیحت کی جائے گی

توچونکہ وہ لیڈری کے مخصوص امراض سے پاک ہیں اس وجہ سے سنیں گے اور مانیں گے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر آپ کو منکرین سے اعراض کا حکم دیا گیا ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُومٍ وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ۔ (ذاریات - ۵۴-۵۵)

پس ان منکرین سے اعراض کرو اب تم کو کوئی ملامت نہیں ہے (کیونکہ تم نے اپنا حق ادا کر دیا) اور نصیحت کرو ان لوگوں کو جو داخل اسلام ہو چکے ہیں، کیونکہ نصیحت اہل ایمان کو نفع پہنچاتی ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَىٰ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّىٰ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَىٰ وَهُوَ يَخْشَىٰ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ مَرْفُوعَةٍ مُطَهَّرَةٍ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ۔

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس بات کے سبب سے کہ اس کے پاس اندھا آیا اور تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ پاکی حاصل کرے۔ یا یاد دہانی حاصل کرے تو یاد دہانی اسے نفع پہنچائے۔ لیکن وہ جو بے پروائی کرتا ہے۔ تو اس کے تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ اگر وہ پاکی حاصل کرے تو تم پر اس کا الزام نہیں ہے۔ اور وہ جو تمہارے پاس ذوق و شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے۔ اس سے تم غفلت برتتے ہو۔ ہرگز نہیں (ان منکرین کی اس قدر پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے) یہ تو ایک یاد دہانی ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس کو حاصل کرے، بلند اور پاک صحیفوں میں، گرامی قدر اور وفادار منشیوں کے ہاتھ میں۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ۔ (الحجر - ۸۸)

اور ان کفار کی جن جماعتوں کو جس مال و متاع سے ہم نے بہرہ ور کر رکھا ہے۔ اس کی طرف نظر نہ اٹھاؤ۔ اور ان کی بدبختی پر غم نہ کرو۔ اور اہل ایمان پر شفقت اپنے بازو پھیلاؤ۔

دعوت کی راہ کی ایک مشکل

یہ حق و باطل دونوں کی ملاوٹ دعوت و اصلاح کے کام کو بہت مشکل اور دیر طلب بنا دیتی ہے۔ اگر مقابلہ صرف باطل سے ہو تو اس کو آسانی سے رد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں حق و باطل دونوں ملے جلے ہوئے ہوں، اور باطل کی حمایت کیلئے حق کو سپر کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہو۔ وہاں حق کی حمایت میں کوئی فیصلہ کن قدم کرنے سے پہلے داعیان حق کو ایک جد و عظیم اس مقصد کے لئے کرنا پڑتا ہے کہ وہ لوگوں پر یہ آشکارا کر سکیں کہ زیر بحث نظام میں اگر کچھ اجزاء حق کے ہیں تو وہ حق کی خاطر نہیں ہیں بلکہ باطل کی خدمت کے لئے ہیں۔ انبیائے کرام کو اور ان لوگوں کو جو دنیا کو راہ راست کی دعوت دیتے ہیں بالعموم ایسے ہی فاسد العقیدہ لوگوں سے کشمکش کرنی پڑتی ہے جو خدا کے دین اور اپنے نفس کی خواہشوں میں مصالحت کر کے ایک نیا نظام کھڑا کرتے ہیں اور اس کو پرانے نظام کا نام دے لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنے باطل کی حفاظت کے لئے چونکہ حق کو سپر بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان پر پوری آزادی کے ساتھ بیک دفعہ ضرب نہیں لگائی جا سکتی، بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اعمال و معتقدات میں سے حق کے اجزاء کو الگ اور باطل کے اجزاء کو الگ کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ ان کا ہر باطل حق بن کر رچ چکا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی جدائی ان کو نہایت شاق گزرتی ہے کہ وہ ان میں سے ایک ایک پر مورچے قائم کرتے ہیں اور اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑتے جب تک اس کی حمایت سے بالکل ہی مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ کام بڑا دیر طلب ہے اس میں بڑی دیدہ ریزی بڑے صبر اور بڑے حلم کی ضرورت پڑتی ہے اور ساتھ ہی بے لاگ حق پرستی بھی اس راہ میں مطلوب ہوتی ہے کیونکہ

جن لوگوں کے متعلق آدمی کا خیال یہ ہو کہ ان کے انکار کے ساتھ اقرار بھی شامل ہے۔ قدرتی طور پر ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ نرمی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس نرمی کا بڑا فائدہ باطل کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ حق کو۔

تبلیغ کے شرائط

شہادت علی الناس یا تبلیغ عام کی یہ ذمہ داری صرف اتنے سے ادا نہیں ہو سکتی کہ دنیا میں مسلمان نامی ایک گروہ موجود ہے خواہ وہ شہادت علی الناس کا یہ فرض انجام دے یا نہ دے۔ اور نہ ان اُلٹی سیدھی تدبیروں ہی سے ادا ہو سکتی ہے جن پر ہم پہلے تنقید کر کے بتا چکے ہیں۔ کہ ان تدبیروں سے نہ صرف یہ کہ دعوت حق کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ اُلٹا اُن سے شدید نقصان پہنچا۔ یہ ایک نہایت اہم فریضۂ رسالت کی ادائیگی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو ان شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے۔ جن شرائط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو انجام دینے کا حکم دیا ہے۔ اور جن شرائط کے ساتھ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے اس کو انجام دیا ہے۔ یہاں ہم ان بعض ضروری شرطوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ جو اس فرض کی ادائیگی کے لئے ناگزیر ہیں!

پہلی شرط

اس شہادت کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم جس دین حق کے شاہد ہیں۔ پہلے صدق دل کے ساتھ اس پر خود ایمان لائیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جس حق کی دعوت دیتے تھے پہلے اس پر خود ایمان لاتے تھے۔ اپنے آپ کو اس حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔	رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اتاری گئی اور اہل ایمان۔

اس حق پر ایمان لانے کے بعد جو چیزیں اس کے خلاف ہوئیں۔ خواہ وہ آباؤ اجداد کا دین ہو۔ خواہ قوم و قبیلہ کی عصبیت ہو۔ خواہ اپنا شخصی اور جماعتی مفاد ہو۔ سب سے دست بردار ہونے کے لئے انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا۔ اور ان سارے خطرات میں جو اس ایمان کے سبب سے پیش آئے "انا اول المومنین اور انا اول المسلمین" (میں پہلا مومن ہوں۔ میں پہلا مسلم ہوں) کہتے ہوئے انہوں نے خود چھلانگ لگائی۔ یہ نہیں ہوا کہ خود تو اس سے کنارے رہے ہوں۔ اور دوسروں کو اس بات کی دعوت دی ہو کہ تمہاری نجات اگر ہے تو بس اسی میں ہے کہ اس میں چھلانگ لگا دو۔

دوسری شرط

دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی جس حق پر ایمان لایا ہے اس کی زبان سے شہادت دے۔ جو شخص ایک حق پر ایمان لایا ہے اگر اس کو ظاہر کر سکنے کے باوجود ظاہر نہیں کرتا تو وہ "گونگا شیطان ہے" اور قیامت کے دن اس پر حق کو چھپانے کا وہی جرم عائد ہو گا جو یہود پر عائد ہوا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔ ...	اور یاد کرو جبکہ اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم کتاب الٰہی کو پوری وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرو گے اور اس کو چھپاؤ گے نہیں۔

اس معاملہ میں مصلحت بینی جو کچھ بھی ہونی چاہیئے۔ وہ در اصل حق کی خاطر ہونی چاہیئے کہ اس کا اظہار صحیح طریق پر۔ صحیح محل میں صحیح مخاطب کے سامنے ہو۔ تاکہ دعوت حق کا تخم بارآور ہو۔ اگر آدمی حق کو بالکل نظر انداز کر کے مجرد اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر

ایک امرِ حق کے اظہار سے جی چُراتا ہے یا اس سے غفلت برتتا ہے تو صرف بعض مستثنیٰ حالات ہی میں اس کی اجازت ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کی جان کے لئے کوئی واقعی خطرہ ہو اور وہ اس امر کو محسوس کرتا ہو کہ اس وقت حق کی خدمت کے نقطۂ نظر سے بھی زیادہ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی جان بچا لے جائے۔ اس طرح کے کسی واقعی خطرے کے بغیر اگر کوئی شخص اظہارِ حق سے جی چُراتا ہے تو یا تو وہ منافق ہے یا کم از کم بے غیرت اور بے حمیت ہے!

تیسری شرط

تیسری شرط یہ ہے کہ یہ شہادت عمل سے بھی دی جائے۔ صرف قول ہی سے نہ دی جائے۔ اسلام میں وہ شہادت معتبر نہیں ہے جس کے ساتھ عمل کی تائید و توثیق موجود نہ ہو۔ بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور آپ کے سامنے بسا اوقات قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ یہ لوگ منافق اور جھوٹے ہیں۔ اور اس کے ثبوت میں ان کے ان اعمال و اقوال کو اُن کے سامنے رکھ دیا۔ جن سے صاف اسلام اور مسلمانوں کی بدخواہی اور حق دشمنی نمایاں تھی۔ جو شخص ایک امرِ حق مانتا ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ اس کا عمل بھی اس کے موافق ہو۔ ورنہ وہ ان علمائے یہود کے نقشِ قدم کا پیرو ہے جن کو قرآن نے ملامت کی ہے۔ کہ تم دوسروں کو تو خدا کے ساتھ وفاداری کی دعوت دیتے ہو لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ جس آدمی یا جس گروہ کا رویّہ اس کی دعوت کے خلاف ہے۔ وہ درحقیقت اپنی دعوت کی تردید کے دلائل خود پیش کرتا ہے۔ اور عمل کی دلیل چونکہ قول کی دلیل سے زیادہ قوی ہے اس وجہ سے خود اس کا رویّہ اس کے دعوے کے خلاف ایسی حجت ہے کہ اس کے بعد اس کی تردید کے لئے کسی اور حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مسلمان اگر اللہ کی دین کے شاہد ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس پر ایمان بھی لائیں۔ اس کی دعوت بھی دیں۔ اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اسی پر عمل بھی کریں۔ ورنہ اس شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا ہے۔ زندگی کے عملی معاملات میں اس دین سے منحرف رہنا اور زبان سے اس کے حق ہونے کی شہادت دینا خلق کے اوپر اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے ایک بالکل ہی لغو حرکت ہے۔ ایسے بے عمل واعظوں کے وعظوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ اگر اپنی مخلوق کو مجرم ٹھہرائے تو اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ خود مسلمانوں پر اس دین کی حجت پوری طرح تمام ہو جائے گی۔ اور قیامت کے دن وہ اپنے ہی اقراروں پر پکڑے جائیں گے۔

عملی معاملات میں دین سے انحراف کی جو شکلیں جائز ہیں ان کو قرآن نے خود بیان کر دیا ہے اور ساتھ ہی ان کا علاج بھی بتا دیا ہے! اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ جذبات یا شہوات کے غلبے سے آدمی کا کوئی قدم حق کے خلاف اٹھ جائے اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فوراً توبہ کرے دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی حق سے انحراف پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کی تلافی کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس چیز سے نکلنے کے لئے جد و جہد کرے اگر توبہ اور اصلاح کی جد و جہد کے بجائے آدمی اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے اور جس حالتِ اضطرار میں گرفتار ہو گیا ہے اسی کو دین و مذہب قرار دے بیٹھے۔ تو شہادت علی الناس کے جس منصب پر وہ مامور کیا گیا تھا بالعمل پر اس کی اس قناعت نے اس سے اسے خود بخود ہٹا دیا!

چوتھی شرط

چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ شہادت ہر قسم کی قومی و گروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر دی جائے۔ نہ کسی قوم کی دشمنی ہمیں اس حق سے منحرف کر سکے جس کے ہم داعی ہیں اور نہ کسی قوم کی حمایت و حمیت کا جذبہ اس سے ہمیں منحرف کر سکے۔ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں ہمیں جس طرح بے لاگ ہونا چاہیئے اس کی تعلیم قرآن نے ان الفاظ میں دی ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ	اے ایمان والو اللہ کیلئے حق کی شہادت دینے والے بنو اور کسی قوم کی عداوت
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا (الآیہ)	تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے ہٹ جاؤ۔

ور اپنے دوستوں اور عزیزوں کے مقابل میں جس طرح بے لوث ہونا چاہیئے۔ اس کی تعلیم اس طرح دی ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔

اے ایمان والو حق کے برپا کرنے والے بنو اللہ کے لئے گواہی دیتے ہوئے اگرچہ یہ تمہارے اور تمہارے والدین اور اقربا کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

پانچویں شرط

پانچویں شرط یہ ہے کہ اس پورے حق کی شہادت دی جائے جو خدا کی طرف سے اترا ہے۔ کسی ملامت یا مخالفت کے اندیشے سے اس میں سے کوئی چیز کم نہ کی جائے۔ جن چیزوں کی شہادت انفرادی زندگی سے تعلق رکھتی ہے ان کی شہادت افراد اپنی انفرادی زندگیوں میں دیں۔ نماز ہر شخص پڑھے۔ روزہ ہر شخص رکھے۔ زکوٰۃ ہر صاحب مال دے۔ حج ہر صاحب استطاعت کرے۔ نیکی، دیانت داری، راست بازی اور پاکبازی کی زندگی ہر مسلمان اختیار کرے۔ البتہ جن چیزوں کی شہادت کیلئے اجتماعی زندگی شرط ہے اس کیلئے افراد کا فرض ہے کہ جماعتی زندگی پیدا کرنے کیلئے جدوجہد کریں اور جب وہ وجود میں آجائے تو اس کی شہادت دیں۔ مثلاً معاشرت، معیشت کا اجتماعی نظام اور ملک کا سیاسی نظم ونسق افراد کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک جماعت کی قوت درکار ہے۔ اس وجہ سے اس سلسلہ میں سب سے مقدم ضرورت ایک صالح جماعت کے قیام کی ہے۔ اس جماعت کے قیام کے بعد اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں بھی اس حق کی شہادت واجب ہو جائیگی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترا ہے۔ ذیل میں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے دین کی بغیر کسی کمی بیشی کے دعوت کی تاکید کی گئی ہے:۔

يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ (مائدہ)

اے رسول جو (حق) تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے اس (پورے حق) کی تبلیغ کرو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کے فرض رسالت کو ادا نہیں کیا۔ (اور مخالفوں کی پروا نہ کرو) اللہ لوگوں کے شر سے تمہاری حفاظت کرے گا۔

اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (احزاب ۳۹)

جو اللہ کے حکموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے۔

وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَدَعْ اَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ (احزاب ۴۸)

اور کافروں اور منافقوں کی بات پر دھیان نہ کر۔ ان کی ایذا رسانیوں سے درگزر کر اور اللہ پر بھروسہ کر۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ۔ (الشوریٰ)

پس اسی راہ کی دعوت دے اور اسی پر جما رہ اور ان کی بدعتوں کی پیروی نہ کر اور کہہ دے کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے اس پر ایمان لایا ہوں۔

چھٹی شرط

چھٹی شرط یہ ہے کہ جب ضرورت داعی ہو۔ اللہ کے دین کی شہادت جان دے کر دی جائے۔ یہ شہادت کا سب سے اونچا مرتبہ ہے اسی وجہ سے ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لئے جہاد کیا اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کے حق ہونے کی گواہی تلواروں کی چھاؤں میں بھی دی۔ ان کو شہید کہا گیا ہے۔ اور غور کیجئے تو ان لوگوں کے سوا نہ اس لقب کا کوئی اور مستحق ہو سکتا ہے اور نہ اس لقب کے سوا کوئی اور لقب ان کیلئے موزوں ہو سکتا ہے۔ اس امت پر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو پورا کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی محنت کا اللہ کے ہاں اجر بھی پائے گا۔ لیکن جنہوں نے اس راہ میں اپنا پورا سرمایہ زندگی لگا دیا اور اپنا سر دے کر اس حق کی گواہی دی درحقیقت وہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان کو شہید کا لقب ملے کیونکہ ایک چیز کے حق ہونے کی اس سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ آدمی اس کی حمایت و نصرت کی راہ میں اپنا سر کٹا دے۔ بس جو شخص دو پہ بازی جیت گیا اس نے وہ شہادت دے دی جس کے بعد شہادت کا کوئی اور درجہ باقی نہ رہا۔

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

تماشائی کو ایک خاتون کا خط وصول ہوا کہ میں آپ کا آٹوگراف چاہتی ہوں۔ تماشائی نے جواب دیا کہ یہ آٹوگراف انگریزوں کی بدعت ہے۔ آپ اس جھگڑے میں نہ پڑیئے۔ اس پر خاتون موصوفہ نے لکھا کہ آپ کا آٹوگراف تو مجھے اس طرح مل گیا۔ اس پر تماشائی کو ایک لطیفہ یاد آگیا:۔

کسی شہر میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ عالم باعمل بھی تھے اور خوش اوقات بھی۔ ان کی نیکو کاری اور پاکبازی کی دور دور شہرت تھی۔ ایک شخص جسے سٹہ کھیلنے کا شوق تھا اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہاتھ جوڑ کر بولا کہ حضرت! میں بہت پریشان ہوں۔ آمدنی کم ہے اور خرچ زیادہ ہے۔ بارہ آدمیوں کے کنبہ کا بار تنہا میری ہی اکیلی جان پر ہے۔ میں آپ کی خدمت میں یہ امید لے کر حاضر ہوا ہوں کہ مجھے سٹہ بتا دیجئے۔ آپ صاحب کشف و کرامت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی بزرگی اور صفائی قلب دی ہے۔ آپ سٹہ بتا دیں گے تو میرے دلدر دور ہو جائیں گے ——— اس پر اُن بزرگ نے اس آدمی کو بہت ڈانٹا ڈپٹا کہ کم بخت! اپنے ساتھ میری آخرت بھی برباد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سٹہ تو کھلا ہوا جوا ہے اور جوا ہمارے دین میں قطعاً حرام ہے اس بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں ——!

مگر وہ شخص برابر اصرار کرتا رہا کہ یہ کام تو حضور پُر نور کو کرنا ہی ہوگا۔ میں اپنی مراد لئے بغیر آستانۂ اقدس سے ٹلوں گا نہیں۔ میں فقیر ہوں اور اڑیل فقیر ہوں۔ بزرگ کو اس پر جلال آگیا اور انہوں نے اپنے مرید کو جو اشارہ کیا تو اس نے جوتے مار کر یا یوں کہیئے اس شخص کی تاجپوشی کر کے مکان سے نکال باہر کیا۔

دس بارہ دن کے بعد وہی شخص مٹھائی کی ٹوکری لئے ہوئے جس پر پھولوں کے ہار لپٹے تھے انہی بزرگ کی خدمت میں پھر حاضر ہوا۔ اور مٹھائی کی ٹوکری اُن کے سامنے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ رکھ دی۔

یہ کیا ہے؟ بزرگ نے پوچھا۔

مٹھائی ہے حضور! اس شخص نے جواب دیا۔

کس بات کی مٹھائی؟ بزرگ نے دریافت کیا۔

اس کے جواب میں وہ شخص اُن بزرگ سے مخاطب ہوا:۔

حضور! آپ نے جو سٹہ بتایا تھا۔ یہ اسی کے شکرانہ کی مٹھائی ہے۔ (میں نے..... میں نے..... سٹہ بتایا تھا.......

لاحول ولاقوۃ! بزرگ حیرت آمیز انداز میں بولے) جی حضور! آپ ایسے لوگ اپنے کو چھپائے رکھتے ہیں مگر سورج کہیں بدلیوں میں چھپا کرتا ہے۔ پھول اپنی خوشبو کو چھپانا چاہے تو بھی نہیں چھپا سکتا۔ آپ کے مرید نے اس دن آپ کے حکم سے دس جوتے اس غلام کے مار دیئے تھے۔ بس مجھے "رموز" مل گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر دس نمبر پر روپے لگا دیئے اور کامیاب ہوا۔ اسی کے شکرانے کی یہ

شیرینی لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی ایسی ہی توجہ میرے حال پر رہی تو چند دن میں "فقیر خاں" سے "دولت مند" ہو جاؤں گا۔

اس معاملہ میں ان بزرگ اور تماشائی کے ستارے ملتے جلتے نکلے!

سندھ کی نئی وزارت جو بنی ہے یا یوں سمجھئے کہ "تالیف" فرمائی گئی ہے اس میں ۱۱ وزیر شامل کئے گئے ہیں۔ ایک مولوی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ وزیروں کی تعداد "جفت" نہیں "طاق" ہونی چاہیئے تھی۔ کہ "طاق" اعداد میں برکت ہوتی ہے۔ جفت اعداد کی بے برکتی کہیں آگے چلکر اپنا اثر نہ دکھلائے۔ تماشائی عرض کرتا ہے کہ اگر کسی قسم کی "بے برکتی" اور "نحوست" نے اپنا اثر دکھایا تو اس کے توڑ کیلئے گورنر صاحب بہادر جو موجود ہیں۔ اس وقت ان کے خصوصی اختیارات آڑے آئیں گے۔

فضل حق صاحب کا صوبہ (مشرقی پاکستان) سندھ سے مردم شماری میں کم و بیش آٹھ گنا بڑا تھا۔ انہوں نے اپنی کابینہ کے لئے بیس وزیر تجویز فرمائے تھے۔ سندھ میں ان کی دیکھا دیکھی بارہ وزراء لئے گئے۔ اور وہ دن دور نہیں جبکہ دوسروں کی ناخوشی اور بگڑ جانے کے ڈر سے صوبجاتی اسمبلیوں کے سارے کے سارے ممبر ہی وزیر ہوا کریں گے۔ اس طرح "حزب مخالف" کا قضیہ بھی جاتا رہیگا۔ اب رہا یہ سوال کہ محکموں کی تقسیم اتنے بہت سے وزیروں میں کیسے ہوگی؟ اندیشہ ہے کہ کہیں پورٹ فولیو کی تقسیم پر آپس میں نہ چل جائے۔

اس دشواری کو بھی آسان بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً "زراعت" ایک محکمہ ہے، اس کے کئی محکمے بنا کر کام تقسیم کر دیا جائے گا۔

وزیر آبپاشی نہری ——— وزیر آبپاشی چاہی ——— وزیر درختان جامن و شیشم ——— وزیر زمین غیر مزروعہ

——— وزیر زمین مزروعہ ——— وزیر افزائش نسل چوپایان ———

دیکھا آپ نے کس آسانی سے اور خوش اسلوبی کیساتھ ایک محکمہ کے کئی محکمے بن گئے۔ آدمی کرنے پر آئے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں کوئی چیز "ناممکن" نہیں۔ ہر ممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے "بدھی" کی ضرورت ہے!

یہ تجویز تو نہایت معقول ہے، کیا کہنے آپ کی فراست اور آئین جہانبانی کے۔ لیکن حضرت! اتنے بہت سے وزیروں، ان کے سیکرٹریوں اور عملہ کی تنخواہ اور دوسرے اخراجات کا بار کون اٹھائے گا۔ "بار کون اٹھائے گا" کی بھی ایک ہی رہی! حکومت کا بجٹ جو بناتے ہیں اور صوبہ کے آمد و خرچ پر جن کا اختیار ہے وہی اس بار کے اٹھانے کی تدبیر نکالیں گے۔ ترقی کی اسکیموں پر جو روپیہ صرف ہوتا ہے وہ "مد" آخر کس کام آئے گی؟ اور اس پر عوام نے جو احتجاج کیا؟ ——— عوام کے احتجاج کو اس کان سن کر اس کان اڑا دیا جائیگا ایسے موقعوں پر حکومت جان بوجھ کر بہری بن جایا کرتی ہے ——— بہری ——— یعنی گراں گوش۔ ثقل سماعت کی مریض! اس "بہرے پن" کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عوام چند دن چیخ کر، چلا کر اور شور مچا کر رہ جاتے ہیں۔ اور احتجاج اگر زیادہ شدت اختیار کرتا ہوا دکھائی دے تو حکومت کے پاس طرح طرح کے آرڈی ننس اور ایکٹ جو موجود ہیں۔ کسی کو نظر بند کیا۔ کسی کو جیلخانہ بھیج دیا۔ کسی پر پابندی لگادی کہ نہ کہیں تقریر کرو اور نہ کسی اخبار میں کوئی بیان چھپواؤ!

طاقت اور ڈپلومیسی ——— یہ دو چیزیں ہیں جو ہر احتجاج اور عوامی مطالبہ کو دبا سکتی ہیں بلکہ اس کا رخ بدل سکتی ہیں۔

بہت دنوں سے یہ مصرعہ سنتے آرہے تھے ؎

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا!

مگر اس کا مفہوم کراچی کے انگریزی معاصر "ڈان" نے اس خوبی کے ساتھ سمجھایا کہ کوئی الجھن ہی باقی نہیں رہی۔ "ڈان" پر چند ماہ پیشتر

جب حکومت کا عتاب نازل ہوا تھا یہاں تک کہ اس کے نمائندوں پر "ڈیوڑھی مبارک" تک بند کردی گئی تھی۔ اس وقت "ڈان" نے، اللہ، رسول، قرآن اور اسلام کے نام پر اس زور کیساتھ دہائی دی کہ زمین کی فضائیں کانپ کانپ گئیں۔ چند دنوں تک وہ علمائے کرام کے بیان، دینی جماعتوں کی کارروائیاں اور مذہبی مضامین چھاپتا رہا۔ دین دار طبقہ خوش تھا کہ اس حادثہ نے "ڈان" کی آنکھیں کھول دیں اور یہ حادثہ اس کے لئے تازیانۂ عبرت ثابت ہوا ــــ مگر چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ "ڈان" کی ذہنیت اور فطرت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ مذہبیت کا لبادہ تو چند دن کیلئے مصلحتاً زیب تن فرمایا گیا تھا۔ اور جب کام نکل گیا اور حالات بدل گئے تو وہ لبادہ ہی نوچ کر پھینک دیا گیا اب "ڈان" کی وہی روش ہے جو اس سے پہلے تھی۔ اس دور کی یادگار، اقبال کا یہ شعر ؎

باطل سے دبنے والے اے آسماں! نہیں ہم ــــ سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

مزور رہ گیا ہے۔ اب تو ڈان میں رقص کی ایسی عریاں تصویریں بھی چھپتی ہیں، جس میں ایک مرد ایک عورت کو آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

شاہ ظفر کا ایک شعر ہے ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا ــــ جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

مگر اس زمانے میں جنہیں طیش میں خوفِ خدا اور عیش میں یادِ خدا نہ رہے۔ وہی "بڑے آدمی" کہلاتے ہیں۔

پاکستان جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ وہاں دودھ، دہی، گھی اور تیل میں ملاوٹ کون کرتا ہے؟ سودا کم کون تولتا ہے؟ جھوٹ کون بولتا ہے؟ دھوکا کون دیتا ہے؟ رشوتیں کون لیتا ہے؟ چور بازاری کون کرتا ہے؟ جوا کون کھیلتا ہے؟ شرابیں کون پیتا ہے؟ یہ کس کی عورتیں ہیں جو سربازار بے حیائی اور بے باکی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں؟ سینما ہال، ناچ گھر اور شراب خانے کس کے دم سے آباد ہیں؟ روزے میں سگریٹ کے دھوئیں کون اُڑاتا اور پان کے بیڑے کون چباتا ہے۔؟ ــــ اتنا کچھ کرنے کے بعد اللہ میاں سے یہ شکوہ کیا جاتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ اب تک حل نہیں ہوا؟ ہندوستان نے نہروں کا پانی کاٹ لیا؟ پاکستان کے روپے کی قیمت گرتی چلی جا رہی ہے؟ امریکہ کے سامنے پاکستان کو دستِ سوال دراز کرنا پڑا؟ ــــ جی! یہ شکوہ شکایت "بہ اندازِ عبدیت" کس منہ سے! یہ کرتوت قہر و عتاب کے مستحق ہیں یا فضل و کرم کے! لوگ چاہتے ہیں کہ وہ خود تو نہ بدلیں مگر خدا کی سنت بدل جائے۔ اگر خدانخواستہ ہمارے اعمال و افعال کا یہی عالم رہا تو وہ سب کچھ ہوگا جو دوسری نافرمان اور باغی قوموں کے ساتھ پیش آچکا ہے!

ایک شاعر جب دوسرے شاعر سے کہے کہ "بھئی! تم نے کوئی نئی غزل کہی ہو تو سناؤ"۔ تو سمجھ لیجئے کہ اس شاعر کا دل اپنا کلام سنانے کو چاہتا ہے اور یہ ــــ "شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را" والا مضمون ہے کہ جب وہ شاعر اپنی غزل سنالے گا تو یہ صاحب اپنی غزل ارشاد فرمائیں گے۔ کیونکہ پہلے شاعر صاحب اپنی غزل سنانے کے بعد اُن سے ضرور فرمائش کریں گے کہ آپ بھی کچھ سنائیے۔ اگر اسی اثنا میں اتفاق سے کوئی تیسرا شاعر آدھمکا تو پھر وہ ان دونوں سے کہیگا کہ کچھ سنایئے اور وہ دونوں اپنا کلام ضرور سنائیں گے۔ اور اس کے بعد تیسرے شاعر سے فرمائش کی جائیگی۔ اس طرح ایک اچھی خاصی بزمِ شعر و سخن منعقد ہو جائیگی۔ اس لئے کہ وہاں چائے کا دور بھی ضرور چلے گا۔ سگریٹ و پان کی تواضع بھی ہوگی کسی ایک کی طرف سے یا تینوں کے مشترکہ چندے سے!

شعر خوانی، چائے، سگریٹ اور پان جن لوگوں کو بے فکری کیساتھ میسر آجائیں ان سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا ہے اور یہ اسباب جمع نہ بھی ہوں تو بھی شاعر اپنی جگہ خود ایک "انجمن" ہے۔ وہ پھٹے کپڑے پہن کر بھی شہنشاہِ سخن ہے اور فاقے کرکے بھی انسانوں کی روح کو

غذا پہنچاتا ہے۔ شاعر بڑی چیز ہے!

کچھ شعرائے کرام ایسے بھی ہیں کہ مشاعرے میں اُن پر ہوٹنگ ہوتی ہے۔ لوگ سیٹیاں اور تالیاں بجا کر کہتے ہیں کہ "مقطع ارشاد ہو"۔ "بیٹھ جاؤ"۔ "دفع ہو"۔ مگر شاعر ہے کہ اسٹیج سے اُترنے کا نام نہیں لیتا ـــ علامہ اقبال۔ کاش! زندہ ہوتے تو ہم ان سے پوچھتے کہ اے "اسرارِ خودی" کے جاننے والے! للہ اس راز کو فاش کر ایسے عالم میں اُس شاعر کی "خودی" کہاں چلی جاتی ہے؟ شاید جواب ملتا کہ اُس شاعر پر "بے خودی" کا عالم طاری ہوتا ہے!

کوئی شک نہیں کہ مشاعروں میں کچھ لوگ بہ ارادہ کے کرتے ہیں کہ اچھا کلام ہو یا بُرا ہیں تو ہوٹنگ کرنی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تماشا دیکھنے کیلئے خود اپنے گھر میں آگ لگا سکتے ہیں ـــ مگر تماشائی عرض کرتا ہے کہ یہ بھی واقعہ ہے کہ خود "شاعر" بھی اپنے ناز و انداز اور طرزِ کلام سے مشاعروں میں "ہوٹنگ" کی فضا پیدا کر دیتے ہیں!

کوئی صاحب اس انداز سے ترنم لیتے ہیں کہ گویا ہر جان قبر میں اگر سُن لے تو اُٹھ اُٹھ بیٹھے ـــ دوسرے صاحب کی آواز پھٹے بانس کی طرح ہے مگر وہ ہیں کہ شعر پر شعر سنائے جاتے ہیں ــ وہ نہیں گنتے کہ سننے والوں کی سماعت پر کیا عالم گزر رہا ہوگا۔ تیسرے صاحب "تحت لفظ" اس کرب آمیز انداز سے پڑھ رہے ہیں، جیسے یہ درد زہ میں مبتلا ہیں۔ چوتھے صاحب ہر شعر پر "حضور"، "سرکار"، "بہاں"، "بندہ نواز" کی گرہ لگاتے جاتے ہیں۔ اور پانچویں صاحب اسٹیج پر پہنچ کر بیاض کی ورق گردانی کئے جا رہے ہیں، مگر غزل نہیں ملتی۔ چھٹے صاحب کا نام پکارا گیا تو اس حلیے کے ساتھ تشریف لائے کہ عجیب قسم کے سفید بالوں کی ٹوپی پہنے ہوئے ہیں۔ جیسے ان کے سر پر ٹوپی نہیں خرگوش رکھا ہوا ہے۔ پائجامہ کا ایک پائینچا چڑھا ہوا اور کُرتے کی آستین لٹکی ہوئی۔ آنکھوں میں وہ بیدلی جیسے ابھی ابھی کسی چنڈو خانے سے اُٹھ کر تشریف لائے ہیں ـــ جب یہ انداز ہوں تو بتایئے کہ سامعین اگر نہ ہنسیں تو اور کیا کریں!

ایک سیٹھ صاحب سے تماشائی کی ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے ـ دل کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ بڑی کمزوری اور پستی محسوس ہونے لگتی ہے۔ میں نے باہر آنا جانا بند کر دیا ہے۔ ٹیلیفون کے ذریعہ سونے چاندی کا سٹہ کھیلتا ہوں اور اللہ کے فضل سے نفع ہو جاتا ہے۔ "اللہ کے فضل" کا اس سے زیادہ برمحل استعمال شاید ہی کبھی دیکھنے اور سننے میں آیا ہو۔ یہی وہ "اللہ کے فضل" والی ذہنیت ہے جو تجوریوں پر "ہذا من فضل ربی" کندہ کراتی ہے۔

تماشائی کہتا ہے کہ ہم نے ایسے "شاہ صاحبوں" کو بھی دیکھا ہے جو طوائفوں کو تعویذ لکھ لکھ کر دیتے ہیں کہ ان کا دھندا خوب چلے اور نئے نئے طائرانِ دامِ زلف میں گرفتار رہیں!

اور ان بیچاری قسمت کی ماری طوائفوں اور کسبیوں کا ذکر چھوڑیئے سینما ہاؤس۔ تھیٹر ہال۔ آرٹ گیلریاں۔ مینا بازار اور نمائشیں جن میں دھڑلے سے قمار بازی ہوتی ہے۔ ان کا افتتاح قرآن کریم کی تلاوت سے ہوتا ہے!

قرآن کریم کی مظلومیت کیا ابھی تک اپنی آخری حد کو نہیں پہنچی؟

جس دن سے پاکستانی کھلاڑیوں کی کرکٹ ٹیم انگلستان گئی ہے۔ اور اس کی خبریں اخباروں میں چھپنے لگی ہیں۔ اُس دن سے کراچی کے گلی کوچوں میں جگہ جگہ گیند بلا کھیلا جا رہا ہے۔ لوگوں کے شوق کا کیا عالم ہے، کیا شغف اور وارفتگی ہے اور ان کرکٹ کے شوقینوں میں بچے اور جوان ہی نہیں زیادہ عمر کے آدمی بھی دیکھے گئے ہیں ـــ!

تماشائی سوچنے لگا کہ اگر یہ "بڑے آدمی" بدل جائیں اور اخبارات کسی نیک مقصد کی تبلیغ کو اپنا موضوع فکر بنالیں تو قوم کی حالت کتنی جلد سدھر سکتی ہے اور معاشرت کی کس قدر تیزی کے ساتھ اصلاح ہو سکتی ہے! مگر سوال یہ ہے کہ "بڑے آدمی" اپنے کو بدلنے کیوں لگے؟ وہ اپنے عیش و آرام کو کیوں چھوڑیں اور یہ قربانی کس مقصد کیلئے گوارا کریں جبکہ زندگی کا مقصد ہی "عیش و راحت" ہو!

اب رہے اخبارات تو اُن میں کچھ تو ایسے ہیں جو "بڑے آدمیوں" کی چشم و ابرو کو دیکھتے رہتے ہیں کہ اُدھر سے جو اشارہ ہو اس کے مطابق یہ اپنے اشہبِ خامہ کو مہمیز لگائیں اور جو اخبارات "آزاد پالیسی" رکھتے ہیں ان کے ساتھ بھی "مفادات" کا ایک طویل سلسلہ لگا ہوا ہے۔ کسی قربانی اور ایثار کی اُن میں ہمت نہیں پھر اظہارِ رائے میں بیباکی کہاں آسکتی ہے! اُن کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ حکومت پر تنقید بھی کردی تاکہ پبلک یہ سمجھتی رہے کہ یہ اخبارات حق بات کہنے میں کسی کی پروا نہیں کرتے اور پھر دوسرے دن "کسی" کا اشارہ پاکر کوئی اور سلسلہ بھی شروع کردیا۔ یہ اخبارات "توازن" کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے! ع

یا ما شراب خوردہ و زاہد نماز کرد!

والا معاملہ ہے!

اخبارات میں خبر آئی ہے کہ لاہور میں پنجابی کلچرل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ تماشائی عرض کرتا ہے کہ آخر انگریز کے زمانے میں پنجابی کلچر، سندھی کلچر اور بنگالی کلچر کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی گئی۔ پاکستان بننے کے بعد ہی ہر صوبہ میں اپنے "کلچر" کی حفاظت کا احساس کس نے اُبھارا ہے؟

جی ایم سید نے "سندھی کلچر" ہی نہیں "سندھی قومیت" کا فتنہ کھڑا کردیا ہے۔ خان عبدالغفار خان "پختونستان" کا تیشہ ہاتھ میں لئے پھرتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں "بنگلہ زبان" کا مسئلہ پس کی گانٹھ بنا ہوا ہے۔ پنجاب اس وبا سے اب تک بچا رہا مگر یار لوگوں نے وہاں بھی ان جراثیم کے انجکشن لگانے شروع کردیئے ہیں۔ "پنجابی کلچر" کی تحریک میں ایک وہ بزرگ بھی شریک ہیں جو اُوپر کے اشارے پر اسلامی دستور سازی کے خلاف طرح طرح کے شوشے اخباروں میں چھوڑتے رہتے ہیں۔ یہاں سے ان کو سبکدوشی ملی ہے تو لاہور میں "پنجابی کلچرل سوسائٹی" کا فتنہ برپا کیا ہے!

اگر صوبوں میں "کلچروں" اور "زبانوں" کے تحفظ کیلئے ایسی تحریکیں اُٹھتی رہیں تو پاکستان دیکھتے دیکھتے ٹکڑوں میں بٹ جائیگا اور اسکی سالمیت و وحدت کی بندھی ہوئی جھاڑو بکھر جائے گی۔ "اقامتِ دین" کی دعوت دینے والوں کے لئے حکومت کے پاس آرڈی ننس اور سیفٹی ایکٹ ہیں اور اس قسم کے فتنہ پردازوں سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں؟

(ایک خط!)

برادر عزیز! تمہارا خط ملا۔ خیریت اور حالات پڑھ کر اطمینان ہوا۔ تمہاری بھتیجی کی جس لڑکے سے نسبت کی ہے۔ وہ کسٹم میں ہے تو سَو روپے کا ملازم! مگر اُوپر سے ڈھائی سو تین سو روپے کی آمدنی ہو جاتی ہے! اس لئے اللہ کے فضل سے برخورداری ساجدہ آرام سے رہیگی۔ اور ہاں! مجھے بیس من شکر کا پرمٹ مل گیا ہے اور میں نے ساڑھے چار سو روپے میں یہ پرمٹ ایک سیٹھ کو دے دیا ہے۔ اس رقم میں سے ڈیڑھ سو روپیہ .... صاحب کو دینے ہوں گے۔ یہ صاحب بڑے سچے ہیں وعدے کے پکے ہیں۔ جو کچھ ان سے معاملہ ہو جاتا ہے اس پر قائم رہتے ہیں۔ ورنہ ان سے پہلے وہ .... صاحب تو پانسو روپے لیکر ڈکار گئے اور دھیلے برابر کام کرکے نہیں دیا۔

سُنا ہے کہ تم کسی فیکٹری کے الاٹمنٹ کے لئے کوشش کر رہے ہو۔ اس کے لئے اگر تمہیں سارٹیفکٹ وغیرہ کی ضرورت پڑے تو ...... خاں صاحب سے جاکر ملنا۔ وہ جیسا سارٹیفکٹ تم چاہو گے دے دیں گے۔ ہندوستان میں ہم کیا تھے؟ اس کی کون تصدیق کرتا پھرتا ہے۔ گزیٹڈ افیسر جو کچھ لکھ دے گا اسے ٹھیک مانا جائے گا۔ تم بار بار یہ کیا لکھتے ہو کہ ایمانداری بڑی چیز ہے۔ میں کب تمہیں بے ایمان بننے کی ترغیب دیتا ہوں۔ مگر بھائی! اس دُنیا میں پیٹ پالنے اور زندگی گزارنے کے لئے تھوڑی بہت اُونچ نیچ کرنی ہی پڑتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کام نہ نکلے! بس اتنا اشارہ کافی ہے...... اور ایسا ہی آخرت کا تمہیں خیال ہے تو فائدہ حاصل کرنے کے بعد توبہ کر لینا اور پکے ایماندار بن جانا!

تمہاری چھوٹی بھتیجی — عظمت نے ڈرامہ میں شاہزادے کا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا کہ پرنسپل صاحب نے اسے سنہری تمغہ انعام میں دیا۔ عظمت آج اپنی سہیلیوں کے ساتھ پک نک کے لئے گئی ہوئی ہے۔ بڑی ہونہار لڑکی ہے۔ اللہ نے چاہا تو خاندان کے نام کو اُونچا کرے گی!

چھوٹی بچی جھولا جھولتے میں:-

"میرے جوبن پہ آئی بہار"

گاتی جا رہی ہے اور تمہیں سلام لکھوا رہی ہے۔

تمہارا بڑا بھائی

کامل

ایک شخص کمپنی باغ میں گھومتے گھومتے ..... پھول توڑنے لگا۔ باغ کے رکھوالے سپاہی نے آواز دی کہ یہ — میونسپلٹی کے پھول ہیں — اس شخص نے جواب دیا۔ یہ پھول میونسپلٹی کے نہیں گلاب کے ہیں!

کہا جاتا ہے کہ مشہور شاعر غنیؔ کاشمیری جب اپنے مکان میں رہتا تھا تو دروازے مقفل کر دیا کرتا تھا۔ اور جب کہیں باہر جاتا تھا تو مکان کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ آپ زمانہ سے اُلٹی باتیں کرتے ہیں۔ کہ مکان میں رہتے ہیں تو کواڑ بند رکھتے ہیں۔ اور باہر تشریف لے جاتے ہیں تو مکان کو کھلا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔ شاعر نے جواب دیا۔ کہ دوستو! میرے گھر میں سب سے زیادہ قیمتی چیز خود میری ہی ذات ہے۔ اس لئے میں جب تک مکان میں رہتا ہوں اس کی حفاظت کے خیال سے مکان بند رکھتا ہوں۔ اور باہر جاتا ہوں تو مکان کھلا چھوڑ دیتا ہوں کہ اس میں ہے کیا جو کوئی چرائے گا

"اپوا" کی کچھ "مساعی" اُردو زبان کی حفاظت کیلئے میدان عمل میں آگئی ہیں۔ اقبالؔ نے کہا بھی تو تھا ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے!

تو یہ "بیگمات" دوشیزۂ اُردو کی بکھری زلفوں اور اُلجھے ہوئے گیسوؤں کو کنگھی چوٹی کرکے دیدہ زیب بنا دیں گی۔ اس لئے کہ بناؤ سنگھار کے فن میں یہ اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ سرمہ کی تحریر۔ لپ اسٹک کی دھاریاں۔ غازے کی رنگینی۔ پاؤڈر کی سپیدی۔ کے تمام اسرار و رموز ان کو معلوم ہیں۔ اُردو کی مشاطگی ان کے سپرد رہی تو دیکھنا اُردو کے نوک پلک درست کرکے کیا سے کیا بنا دیتی ہیں! مگر ایک ڈر لگتا ہے کہ کہیں کسی جلسہ کی صدارت یا کمیٹی کی ممبری کے لئے ان "خواتین کرام" میں چل نہ جائے۔

اگر کہیں چل گئی تو پھر اُردو کے ذکر بیان کی خیر ہے اور نہ دامن کی!

عورتیں جب قرآن کے ارشاد:

"اور اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھی رہو"

کو پس پشت ڈال کر لیسڈری کے میدان میں آجائیں تو پھر قوم کے ناموس و عزت کا اللہ ہی نگہبان ہے!

یہ لطیفہ نہیں، واقعہ ہے، ایک معتبر شخص اس کا راوی ہے کہ فضل الحق صاحب نے فرمایا "ہم کیا کریں ہماری بیوی نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے کہ تم "وزیر اعظم بنو"۔ اور فضل الحق صاحب نے بیوی کے کہنے پر اگر وہ زور شور سے الیکشن لڑا کر وزیر اعظم ہوگئے ---- مگر "تریا ہٹ" کا انجام بھی انہوں نے دیکھ لیا۔ جو شخص کسی "آئیڈیالوجی" کے لئے نہیں بلکہ صرف بیوی کو خوش کرنے کے لئے اتنی بڑی مہم کا بیڑا اٹھالے۔ اس کے دماغ سے کسی توازن اور معقولیت کی امید ہی رکھنا حماقت ہے! بعض اوقات بیوی کی دل دہی کتنی خطرناک شکل اختیار کرلیتی ہے!

تماشائی عالموں اور مولویوں کا دل سے احترام کرتا ہے اور جانتا ہے کہ مولویوں میں سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جہاں بُرے مولوی پائے جاتے ہیں وہاں اچھے مولویوں کا وجود بھی ملتا ہے۔ مگر جب کسی "مولوی" کو سرکار دربار میں تقرب حاصل کرنے کی چاٹ لگ جائے تو پھر اس کی "دراز نفسی" کا عالم نہ پوچھئے! ایسے مولوی کے کان دروازے کی آہٹ پر لگے رہتے ہیں۔ کہ اب کسی "بڑے صاحب" نے یاد فرمایا۔ اب کسی کی موٹر لینے کے لئے آئی۔ اب کوئی صاحب خود ملنے کے لئے تشریف لائے۔ تقرب کا یہ استسقا ہر لمحہ "العطش" کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس پیاس کے بجھانے کے لئے ہر وقت کسی "بڑے آدمی" کا ٹیلیفون۔ دعوتی رقعہ، پیام، سلام اور حضوری چاہیئے!

ان بڑے آدمیوں کو بھی اس قماش کے مولویوں کی بہرحال ضرورت رہتی ہے۔ وہ بھی اس قسم کے مولوی کی خاصی پذیرائی بلکہ دل دہی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان کے کام آتے ہیں اور یہ اُن کے کام آتا ہے۔ سیاست کی دنیا میں نقد سودا ہوتا ہے ؎

شیخ کو حاصل ہیں دو دو نسبتیں
خانقاہی بھی ہے درباری بھی ہے!

اعلان

مدرسہ امینیہ اسلامیہ کشمیری دروازہ دہلی میں حضرت مولانا مفتی محمد عبدالغنی صاحب شاہجہانپوری تشریف لے آئے ہیں۔ مولانا موصوف حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ کے خاص ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت مفتی اعظم نور اللہ مرقدہٗ کو آپ کی خداداد قابلیت، علمی تبحر اور تفقہ فی الدین پر کافی اعتماد تھا۔ مولانا موصوف ہی امسال دورۂ حدیث پڑھائیں گے اور افتا کی خدمت انجام دیں گے۔ مدرسہ امینیہ میں مکتب بھی جاری کردیا گیا ہے۔ جس میں بچوں کو دینیات قرآن شریف۔ حساب اور خوش نویسی کی مفت تعلیم دی جائے گی۔ اور منشی فاضل وغیرہ کی کلاسیں بھی جاری کردی گئی ہیں۔ مدرسہ کا انتظام حضرت مفتی اعظمؒ کے بڑے صاحبزادے مولوی حفیظ الرحمٰن واصف بہت عمدگی اور مستعدی سے کر رہے ہیں۔

(مولانا) احمد سعید۔ مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی۔

ہماری نظر میں

"مجدد الف ثانی نمبر"

مجدد الف ثانی نمبر ماہنامہ "بیّنات" ۔ مدیر اعلیٰ صاحبزادہ محمد فیض علی فیضی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات مجدد نمبر کی قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ ملنے کا پتہ ۔ دادووالی شریف ضلع گوجرانوالہ۔

ماہنامہ "بیّنات" ایک دینی پرچہ ہے ۔ جو سلامت روی کے ساتھ دین کی خدمت کر رہا ہے ۔ چند ماہ ہوئے کہ اس کا "مجدد الف ثانی نمبر" شائع ہوا ہے۔ جس میں بعض مضامین بلند پایہ ہیں۔ کچھ متوسط ہیں اور دو تین مضمون سطحی بھی ہیں۔ "مجدد نمبر" کا سب سے زیادہ مفید حصہ حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کے مکتوبات کے بعض اقتباسات کا ترجمہ ہے :۔

"بدعت" پر مجدد صاحب کا ارشاد کتنا بصیرت افروز ہے :۔

"بعض علماء نے کہا ہے کہ بدعات کی دو قسمیں ہیں۔ حسنہ و سیّئہ ۔ بدعت حسنہ اس نیک عمل کو کہتے ہیں جو رسول اکرم اور خلفاء راشدین کے زمانہ کے بعد پیدا ہوا ہو اور سنت کو ضائع نہ کرے اور بدعت سیئہ وہ ہے جو سنّت کو بھی ضائع کرے ۔ یہ فقیر ان بدعات میں سے کسی میں بھی کوئی حُسن و خوبی نہیں دیکھتا "

"سنّت اور بدعت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کا ہونا دوسرے کی نفی کو لازم آتا ہے۔ پس ایک کو زندہ کرنا دوسری کے مارنے کو لازم کرے گا۔ سنت کو زندہ کرنا بدعت کو فنا کرنے کا موجب ہے۔ اسی طرح بدعت کو زندہ کرنا سنّت کو فنا کرنا ہے۔ پس بدعت چاہے حسنہ ہو یا سیئہ سنّت کو ضرور ضائع کرتی ہے "

"کل قیامت کے دن شریعت کے متعلق بازپرس ہوگی۔ تصوف کی نسبت نہیں ہوگی۔ جنت کا داخلہ اور دوزخ سے بچنا شریعت پر موقوف ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے جو کائنات کا خلاصہ ہیں شریعت ہی کی دعوت دی ہے اور نجات کا مدار یہی قرار دیا ہے۔ پس افضل ترین نیکی یہی ہے کہ شریعت کے رواج میں سعی کی جائے "

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے حیرت ہے کہ اس روایت کو اپنے مکتوب میں نقل فرمایا ہے جس میں "تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ" کا ذکر ہے۔ حالانکہ حافظ ابن حجر اور چند حضرات کے علاوہ محدثین اور مفسرین کی اکثریت نے اس روایت کو بے اصل بتایا ہے۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب کے مقالہ "توضیح مجدد" کی یہ عبارت "چونکہ مجددیت نبوت کا اصل ظل ہے اس لئے امت محمدیہ کے مجددوں کو بھی وہی شان دی گئی جو انبیاء سابقین کو دی گئی" درست نہیں ہے۔ نبوت کے معاملہ میں "ظل" و "عکس" کی بحث خطرے سے خالی نہیں۔ اور مجددین کے متعلق یہ کہنا "ان کو بھی وہی شان دی گئی جو انبیاء سابقین کو دی گئی" بے جا مبالغہ ہے۔ کسی مجدد کی شان نبی کی شان کی برابری نہیں کر سکتی ۔ انبیاء کرام کے سامنے مجددین ایسے ہیں جیسے آفتاب کے آگے چراغ !

صاحبزادہ محمد فیض علی صاحب فیضی نے "مجدد نمبر" بڑی عقیدت اور محنت کیساتھ ترتیب دیا ہے اسکے پڑھنے سے دینی شغف بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی عزیمت اور استقامت کی جھلک پیدا فرمائے کہ ہم بھی باطل کے خلاف آواز بلند کر سکیں - اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پروا نہ کریں — !

سکون بخش

جی سنز کے بلب قلیل مدت میں تمام پاکستان میں پھیل گئے
آپ انہیں مکانوں، دفتروں اور فیکٹریوں میں ہر جگہ پائیں گے درحقیقت
ایک اعلیٰ درجہ کی چیز عوام کی خدمت کیلئے پیش کی گئی ہے۔ آپ بھی
جی سنز ہی استعمال کیجئے اس لئے کہ یہ بہترین ہیں

پاکستان میں بنے ہوئے

جی سنز الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ

RAHMAN PRINTING PRESS

فاران
کراچی
پاکستان

جلد ۶ ——— نمبر ۶

ماہنامہ

فاران

ستمبر ۱۹۵۴ء

ایڈیٹر:- ماہر القادری

چندہ سالانہ

۷ روپیہ (پاکستانی) فی پرچہ ۱۰/

۸ روپیہ (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱/

مقامِ اشاعت:- دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر (۱)

نظم و ترتیب

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

یہ مصرعہ ——— برعکس نہند نام زنگی کافور ——— برسوں سے سُن رکھا تھا مگر اس کے معنی کراچی
کے رسالہ "طلوعِ اسلام" کو دیکھنے کے بعد ٹھیک طور پر سمجھ میں آئے! اس رسالہ میں اللہ کے دین کے ساتھ جو دردناک مذاق کیا جا
ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت مطہرہ کا جس جس طرح مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور اسلام کی معروف قدریں جس دیدہ دلیری
کے ساتھ پامال کی جاتی ہیں وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے رواداری اور آزادیٔ رائے کے نام پر نظر انداز کر دیا جائے، ان لغو
اور اسلام دشمن کوششوں کو وہی شخص نظر انداز کر سکتا ہے جس کے دل میں دینی غیرت کی کوئی رمق باقی نہ رہی ہو!
ستم ظریفی کی کوئی حد ہے اس پر دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس رسالہ کے اُفق سے اسلام طلوع ہوتا ہے ——— اس دنیا میں مبالغہ آمیز یا
اور غلط بیانیاں بھی ہوتی ہیں مگر ایسی نہیں "زہر" دعویٰ کرنے لگے کہ میں تریاق ہوں، گدلا بدبودار اور بے مزہ پانی کہے کہ مجھے "آبِ حیات"
سمجھو! اندھیرے کو یہ زعم ہو کہ میں اُجالا ہوں اور ضلالت کی طرف سے یہ پروپیگنڈا کیا جائے کہ دنیا میں ہدایت کے چراغ میں نے روشن کئے
زمانہ کی پستی، سفلہ پروری ——— اور علم و دانش کی بیکسی کی کوئی انتہا ہے کہ مسٹر پرویز جیسا کم سواد شخص امامت کے خواب
دیکھ رہا ہے اور مسلمانوں کی پیشوائی اور قیادت کا دعویدار ہے:-

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

جو شخص عربی کی ایک سطر بھی شاید صحت کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا، وہ اس ہمہ دانی کا مدعی ہے کہ یہ جو ہزاروں لاکھوں فقہا، محدثین!
مفسرین گزرے ہیں، انھوں نے دین کو ٹھیک طرح سمجھا ہی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے اب تک حدیث
پردے میں دین کے خلاف سازشیں ہوتی رہی ہیں اور میں مسمی غلام احمد پرویز ساکن بٹالہ اس سازش کا پردہ چاک کرنے کیلئے
منظر عام پر آیا ہوں۔

بادشاہوں کے زمانہ میں جس طرح داستان گو اپنی چرب زبانی اور خوش بیانی کے زور پر طرح طرح کی داستانیں گھڑ گھڑ کر سنایا کرتے
…تھے، اُن کی کمائی کا یہی ذریعہ اور ان کی مقبولیت کا یہی سبب تھا ——— تو پرویز صاحب بٹالوی بھی داستان گوئی کا فرض انجام
…دے رہے ہیں اور ستم یہ ہے کہ اُن کی داستان گوئی اور افسانہ سرائی کی قوت نے اللہ کے دین کو موضوع بنا رکھا ہے!

… (۱۹۵۵ء) کا "طلوع اسلام" ہمارے سامنے ہے [illegible] اب اس حد تک پہونچ چکی ہے …

… [illegible] —

(۱) [illegible] ممنوع قرار دیدیا جائے، [illegible] سب سے پہلے تو مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے۔

(۵) ملک کے موجودہ ہنگامی حالات کے پیش نظر گورنر جنرل کو مستقل کردہ زیادہ سے زیادہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لیں!

ہم پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد صاحب سے پُر زور درخواست کریں گے کہ وہ اس نازک وقت میں اس جرأت و ہمت سے کام لیں جس سے انہیں فطرت نے فیضیاب کر رکھا ہے اگر وہ اس وقت ہمت کر کے آگے بڑھ آئے۔ جس طرح خواجہ ناظم الدین وزارت کی برطرفی میں قوم نے اُن کا پورا ساتھ دیا تھا اسی طرح اُن کے اس اقدام میں بھی قوت اُن کے ساتھ ہوگی۔

ہمیں نہیں معلوم کہ ہماری یہ فقیرانہ صدا محترم گورنر جنرل کے کانوں تک پہونچ سکے گی کہ نہیں، اس لئے قارئین طلوع اسلام سے گزارش کریں گے کہ اگر وہ اس علاج سے متفق ہوں جسے ہم نے تجویز کیا ہے تو وہ محترم گورنر جنرل سے بذریعہ تار یا خط) درخواست کریں کہ وہ طلوع اسلام کے پیش کردہ مشورہ پر غور کریں۔

بادشاہوں کے خوش کرنے کیلئے ابن الوقت قسم کے لوگوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ تاریخ کے اوراق ان داستانوں سے بہت کچھ سیاہ ہیں مگر حیرت …ہے کہ اس جمہوری دور میں بھی "طلوع اسلام" نام کا ایک لیسار سالہ موجود ہے جس نے تملق کا [illegible] کی یاد تازہ کردی ہے [illegible] …خاکوں میں پھر سے رنگ بھر دیا ہے۔

جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ گورنر جنرل اور گورنر اپنے خصوصی اختیارات ناگزیر حالات میں استعمال کریں یہ اختیارات جتنی کم شدت کے ساتھ کم …شدت کے لئے استعمال ہوں گے، اتنی ہی جمہوریت کی سطح کو آسودگی ملے گی۔ "طلوع اسلام" پاکستان کے گورنر جنرل کو مشورہ دیتا ہے کہ "وہ …زیادہ سے زیادہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لیں" اور پھر اس مشورت کو عملی جامہ پہنانے کیلئے نہ باقاعدہ ایک مہم بھی چلاتا ہے یعنی "طلوع اسلام" …کے پڑھنے والوں سے اپیل کرتا ہے کہ گورنر جنرل صاحب بہادر کی خدمت میں تار اور خط بھیجکر درخواست کریں کہ حضور زیادہ سے زیادہ اختیارات …کو کام میں لائیں اور ناظم الدین وزارت کو جس طرح حضور نے ٹھکانے لگایا تھا اسی طرح کے کرشمے ظہور میں آتے رہیں تو قدرت نے جس ہمت …وجرأت سے آپ کو فیضیاب کیا ہے وہ بیکار نہ جائے گی۔۔

اسی قسم کے خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں نے بادشاہوں اور امیروں کو بگاڑا تھا اور مدح ومناقب اور خوشامد کے ذریعہ اُن کی نفس کو غذا پہونچا کر آمریت اور مطلق العنانی کی فضا پیدا کردی تھی یہاں تک کہ بادشاہ سچ مچ "مالک رقاب امم" بن گئے تھے! طلوع اسلام چاہتا …ہے کہ پاکستان میں یہ تاریخ پھر دہرائی جائے! اور یہ وہ رسالہ ہے جو اس بات کا دعویدار ہے کہ پاکستان میں حکومت اس کے بنائے …ہوئے دستور وقانون کی بنیادوں پر قائم ہو، ان ملاؤں اور مولویوں کی دستور سازی میں اگر رائے لی گئی تو پاکستان کا دستور بازیچۂ اطفال …بن کر رہ جائے گا، پاکستان کا دستور "طلوع اسلام" مرتب کرے گا، اور اس خاکہ میں مسٹر پرویز کا خامۂ حقیقت رقم رنگ بھرے گا!

جس ادارے کی یہ ذہنیت اور طرز فکر ہو، اور جو اس انداز پر مسائل کو سوچتا ہو جو اس قسم کی نیازمندانہ ذہنیت اور شکست خوردہ دل ودماغ رکھتا ہو، حکومت تو بڑی چیز ہے کسی پرائمری اسکول کا نظم ونسق بھی کیا اُس کے مشوروں کے رحم وکرم پر چھوڑا جاسکتا ہے؟

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ یہ مشورے اُس گروہ کی طرف سے دیئے جا رہے ہیں جو طنز کیا کرتا ہے کہ فقہا بادشاہوں کے زیرِ اثر آ گئے تھے۔ . . .

۵۔ اتنی سی بڑھا پا کئی د..اں کی حکایت

بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ چھاج بولے تو بولے چھلنی بھی بولے جس میں بہتر چھید! جن لوگوں کی ساری عمر انگریزی کی غلامی کرتے گزری ہو اور جن کے افکار انگریزی سیاست کے سانچے میں ڈھلے ہوں، وہ اس سے بلند ہو کر سوچ بھی تو نہیں سکتے؟ جس نام نہاد مفسرِ قرآن اور نظامِ ربوبیت کے داعی کی زندگی انگریز کے دفتر کی "کلرکی" سے شروع ہو کر حکومتِ پاکستان کے اسسٹنٹ سکریٹری کی بلندی پر ختم ہوئی ہو وہ اونچا اڑا بھی تو آخر کہاں تک اڑے گا! افسروں اور عہدیداروں کی جنبشِ ابرو پر حرکت کرنے والا "مزاج" اور اپنی "جی حضوری" کی پرانی عادت کو چھوڑ کہاں سکتا ہے؟

مسٹر پرویز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے بعد سب سے زیادہ دشمنی اور عداوت جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات سے ہے! اس شخص کا بس چلے تو جماعتِ اسلامی کے نہ صرف رکن بلکہ ہر اس شخص کو جسے جماعتِ اسلامی کی ذرا سی بھی لگ گئی ہے، ریت میں زندہ گڑوا کر تیروں سے اڑوا دے! وہ تو اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودی کو بچا لیا ورنہ اگر خدانخواستہ مارشل لاء عدالت کے فیصلہ کی بنا پر انہیں سزائے موت دے دی جاتی تو دنیا میں سب سے زیادہ خوشی اسی پرویز کو ہوتی اور "طلوعِ اسلام" کے پڑھنے والوں سے اپیل کرتا کہ مودودی کی موت پر "یومِ نجات" منائیں۔ اس شخص کی دشمنی، سنگدلی، بے ضمیری اور قساوتِ قلبی اسی حد تک پہنچ چکی ہے!

"جماعتِ اسلامی" سے پرویز صاحب کی دشمنی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ جماعت کتاب اللہ کے ساتھ سنتِ رسول کو بھی دین میں حجت سمجھتی ہے اور اس کا پرزور مطالبہ ہے کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد کتاب و سنت ہونی چاہیئے اور اس مطالبہ کو دستور ساز اسمبلی نے مان بھی لیا ہے! پھر جماعتِ اسلامی یہ بھی کہتی ہے کہ اسلامی دستور سازی کی تفصیلات اور اس کے خدوخال میں خلافتِ راشدہ کی مثالیں اور ائمہ فقہاء کے فتووں کے نظائر بھی کام میں آئیں گے! اور مسٹر پرویز کا دعویٰ یہ ہے کہ پاکستان کا دستور صرف "قرآن" کی بنیاد پر مرتب ہونا چاہیئے، سنتِ رسول کی اگر پاکستان کی دستور سازی پر پرچھائیں بھی پڑ گئی تو یہ دستور (خاک بدہن گستاخ) ناپاک اور ناقابلِ عمل ہو کر رہ جائے گا!

فرض کر لیجئے کہ صرف تنہا "قرآن" ہی کو پاکستان کے دستور کا ماخذ قرار دے دیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنی بنیاد پر دستور سازی کا کام کون انجام دے گا؟ کیا علماء سے اس سلسلہ میں مشورہ لیا جائے گا؟ مگر پرویز صاحب کی نگاہ میں یہ تو تنگ نظر ملاؤں کا گروہ ہے جو عجمی سازشیوں (محدثینِ کرام) کے قدم بقدم چلتا ہے اور قرآنی بصیرت سے محروم ہے ———— تو اب لے دے کر بات یہاں آ کر ٹھہرتی ہے اور یہیں ٹھہرنی ہے تو اسے ٹھہرنا چاہیئے کہ پرویز صاحب جن سے بہتر قرآن کے معارف و غوامض کا جاننے والا آج تک پیدا نہیں ہوا، ان کو دستور سازی کا کام سپرد کیا جائے!

مسٹر پرویز جماعتِ اسلامی کو اپنے عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پاتے ہیں اس لئے اس کے درپئے آزار ہیں اور ان کے قلم کا سارا زور اور ان کی تمام فکری و ادبی توانائیاں جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں صرف ہو رہی ہیں، مگر دنیا کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ جماعتِ اسلامی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی ایک سنت کو بھی کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

جماعت اسلامی کے ارکان پھر بھی یہ رشتہ قبول کر سکتے ہیں کہ سنتِ رسولؐ سے دستبردار نہیں ہو سکتے کہ سنتِ رسولؐ ہی چھٹ گئی تو دین میں باقی کیا رہا؟ دوسری طرف مسٹر پرویز سنتِ رسولؐ کے مٹانے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ تدوینِ حدیث کو قرآن کریم کے خلاف بھی سازش سمجھتے ہیں!

مسٹر پرویز جو عرصے سے لیڈر بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور جنہوں نے اپنی قیادت میں ایک پارٹی کی بنیاد ڈال ہی دی ہے، جماعت اسلامی کو اپنے راستہ سے ہٹادینا چاہتے ہیں تاکہ اُن کی پارٹی کیلئے میدان صاف ہو جائے ——— اس سلسلے میں رسالہ "طلوعِ اسلام" کی ماہ جون کی اشاعت کا یہ اقتباس پڑھنے کے قابل ہے:-

"جماعتِ اسلامی کا ل چھ برس سے عوام میں حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کے شدید جذبات بھڑکاتی چلی آرہی ہے، نیز کمیٹی رپورٹ کے مطابق اُن کا منشا ہی یہ ہے کہ یہاں کی حکومت اُلٹ کر اس کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے، اُنہوں نے ہر طرف بددلی اور افسردہ خاطری پھیلا رکھی ہے، وہ لوگوں کو پاکستان کے مستقبل کی طرف سے مایوس کرتے چلے جارہے ہیں، لیکن نہ صرف یہ کہ حکومت نے اُن پر قانونی بندش عائد نہیں کی بلکہ انہیں اس قدر اہمیت دے رکھی ہے کہ گزشتہ سال فساداتِ پنجاب کے دوران میں اُن کے امیر کو گورنمنٹ ہاؤس بھی مدعو کیا جاتا ہے ———!"

پاکستان کی دستور یہ نے اس حقیقت کو دستوری طور پر مان لیا ہے کہ پاکستان کے دستور کا ماخذ کتاب و سنت ہوگا، اور پاکستان کی کثریت کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسول اللہ کو دین میں حجت سمجھتی ہے ——— مگر مسٹر پرویز سنتِ رسول اللہ کے خلاف مسلسل ہرزہ سرائی کر رہے ہیں اور اُن کی درشت تحریروں نے حامیانِ کتاب و سنت کے دلوں میں زخم ڈال دیئے ہیں اور اُنہوں نے اپنے مخصوص عقاید کی بنا پر مسلمانوں میں ایک نئے گروہ کی بنیاد بھی رکھ دی ہے اس طرح اُن کی تمام حرکتیں حقیقت میں منافرت پھیلانے کا موجب بنتی جا رہی ہیں ——— اگر مسلمانوں کی طرف سے مسٹر پرویز کی تحریر و تقریر اور اُن کی نقل و حرکت پر پابندی لگائے جانے کا مطالبہ کیا جاتا تو "طلوعِ اسلام" چیخ اُٹھتا کہ دیکھنا! یہ "مُلّا" کتنے تنگ نظر اور متعصب واقع ہوئے ہیں کہ فکر و نظر اور زبان و قلم پر پہرے لگانے کی حکومتوں کو ترکیبیں سجھاتے ہیں! انہی "مُلّاؤں" نے بادشاہوں کے دور میں آزادیٔ فکر کا گلا گھونٹ دیا تھا اور اب پاکستان میں بھی اُسی عہدِ استبداد کو واپس لانا چاہتے ہیں!

مگر یہ پہل "طلوعِ اسلام" اور اُس کی ٹولی کی طرف سے ہوئی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے کو متنور الفکر اور جمہوریت کا بڑا دلدادہ سمجھتے ہیں اور جو علمائے کرام پر طنز کرتے رہتے ہیں کہ یہ "لا اکراہ فی الدین ...." کے معنی سے واقف نہیں ہیں اور مرتد کو سزائے قتل دئے جانے کے قائل ہیں ——— "طلوعِ اسلام" کی اس شر انگیز اور خباثت میز عبارت کو اُس اقتباس کے ساتھ ملاکر پڑھیئے جس میں گورنر جنرل صاحب بہادر کو زیادہ سے زیادہ اختیارات ہاتھ میں لینے اور ملک کی تمام جماعتوں اور پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دینے کا مشورہ دیا گیا ہے! اور اس میں چال یہ ہے کہ "تمام جماعتوں اور پارٹیوں" کے پردے میں "حقیقت" "جماعتِ اسلامی" کو نشانہ وار ہدف بنانا مقصود ہے، کیونکہ ڈائریکٹ ایکشن کے بعد "مجلسِ احرار" پر عجیب سکوت چھایا ہوا ہے، مسلم لیگ ایک عرصے سے نزع کے عالم میں ہے، رہی جناح عوامی لیگ تو اُس

کی صفوں میں بُری طرح انتشار پھیل چکا ہے، اب لے دے کے "جماعتِ اسلامی" ہی تنہا وہ جماعت باقی رہ جاتی ہے جو فعال ہے، منظم ہے لوگوں میں اعتماد اور اثر و نفوذ رکھتی ہے!

رسالہ "طلوعِ اسلام" جس کے کرتا دھرتا پرویز صاحب ہیں اُس نے جماعتِ اسلامی کے ممنوع قرار دیئے جانے کا مشورہ حکومتِ پاکستان کو کچھ یوں ہی از راہِ تفریح و تفنن ہی نہیں دیا، یہ کسی "پلان" کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ مسٹر پرویز اپنے سرکاری عہدے کی بنا پر مزاجِ شاہانہ کو بہت کچھ پہچان گئے ہیں اور اب تک جماعتِ اسلامی پر جو حکومت کی جانب سے عتاب نازل ہوتا رہا ہے اور طرح طرح کی افتادیں پڑتی رہی ہیں کیا عجب ہے کہ مسٹر پرویز اور اُن کے متاثرین اربابِ کار کی مشورت اس میں کسی نہ کسی حد تک شریکِ کار رہی ہو! ایک سنگدل دشمن اور بے ضمیر مخالف سے ہر بُرائی کی توقع کی جاسکتی ہے!

جماعتِ اسلامی کے ارکان قید و بند کی مصیبتوں میں ڈالے گئے ہیں، اُس کے امیر کو موت کی سزا تک سُنائی گئی ہے اور پھر یہ سزا چودہ سال کی قید بامشقت میں تبدیل کر دی گئی، جماعت اسلامی کے بیت المال کی رقم حکومت نے ضبط کی، اُس کے بعض ممتاز افراد کی زباں بندی تک کی نوبت آچکی ہے، سرکاری دفتروں سے جماعت کے ارکان چُن چُن کر علیحدہ کیے گئے ہیں دوسرے سرکاری محکموں میں جماعت کے لٹریچر پر تدغن ہے ——— تو حکومتِ پاکستان جماعتِ اسلامی کے ساتھ جو ناروا سلوک کرتی رہی ہے، کیا اس سے مسٹر پرویز کے کلیجہ میں ٹھنڈک نہیں پڑی کہ ان کی آتشِ انتقام "ہل من مزید" کا مطالبہ کر رہی ہے، جماعتِ اسلامی کے خلاف کونسا حربہ ہے جو استعمال نہیں کیا گیا، ہاں! اُسے اب تک ممنوع نہیں قرار دیا گیا، تو مسٹر پرویز جیسے مُشیر اور حکومت کے ہوا خواہ اور جی حضوری سلامت ہیں تو کیا عجب ہے کہ یہ نوبت بھی آجائے!

مسٹر پرویز اور اُن کے حوارئین سے ہم کچھ نہیں کہتے کہ یہ لوگ بصیرت و بصارت کے ساتھ احساسِ شرافت اور انسانی ہمدردی سے بھی محروم ہو چکے ہیں اور بغض و عداوت نے انہیں اُس درجہ تک پہونچا دیا ہے جہاں کسی کی بھلائی بُرائی نظر آتی ہے ——— مگر ہم پاکستان کے عوام و خواص سے دریافت کرتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کی سات سالہ زندگی ان کے سامنے ہے! جماعتِ اسلامی نے اسلامی دستور سازی کے لئے بے شک رائے عامہ کو منظم کیا ہے، اس تنظیم اور جد و جہد کا نام اگر "نفرت و بغاوت" ہے تو جماعت کو اس جُرم کا اقرار ہے اور اس جُرم کی سزا وہ بھگت بھی رہی ہے، جماعتِ اسلامی نے جو کردار سازی کا کام کیا ہے کہ ہزاروں انسانوں کو کمیونزم، مذبذب و تشکیک، بے دینی، مذہب زدگی اور بے راہ روی کی فوق سے نکال کر ایمان و یقین پاکبازی اور احساسِ ذمہ داری کی فضا میں پہونچا دیا ہے، تو یہ اُس کا کارنامہ کیا عتاب کا مستحق ہے یا تحسین کا سزاوار ہے! جماعتِ اسلامی نے "خدمتِ خلق" کے لئے جگہ جگہ گشتی دواخانوں کا جو انتظام کیا ہے جس سے ہزاروں نادار مریض فائدہ اٹھا رہے ہیں تو کیا ان دواخانوں میں وہ "نفرت و بغاوت" کا کوئی محلول پلا دیتی ہے کہ جس کے اثر سے لوگوں میں باغیانہ جذبات اُبھر آئیں۔

جماعتِ اسلامی نے الیکشن بھی لڑا ہے مگر اس قدر ایمان داری، ضبط و نظم اور امن و اخلاق کے ساتھ کہ جس کی مثال نہ صرف ہندوستان اور پاکستان بلکہ دنیائے سیاست کی تاریخ میں کم ہی ملے گی! جماعتِ اسلامی نے احتجاجی مظاہرے بھی کئے ہیں بڑے بڑے جلوس بھی نکالے ہیں مگر کسی ایک مقام پر ذرا سی بھی بے نظمی دیکھنے اور سُننے میں نہیں آئی! جس جماعت

کی امن پسندانہ جدوجہد، شریفانہ طرزِ عمل اور اخلاقی کردار کا یہ عالم ہو، اُس کو "طلوعِ سوم" ممنوع قرار دیئے جانے کا حکومت سے مطالبہ کرتا ہے ——— ضمیر بے حس اور دل سیاہ بھی ہو جاتے ہیں مگر اتنے نہیں کہ اخلاق و شرافت کا بالکل دیوالہ ہی نکل جائے!

"طلوعِ اسلام" کے اس جملہ کو پھر پڑھئے:-

"... ... اُنہیں اس قدر اہمیت دے رکھی ہے کہ گزشتہ سال فسادات پنجاب کے دوران میں اُن کے امیر کو گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کیا جاتا ہے ——"

"طلوعِ اسلام" اس جلن کے مارے مرا جاتا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو دعوت کے ذریعہ گورنمنٹ ہاؤس میں کیوں بلایا گیا اور اُن کو اتنی بڑی عزت کیوں دی گئی؟ یہ ہے پرویزی افکار کے اس ترجمان کا اوچھا پن اور کم ظرفی کا عالم! حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے گورنمنٹ ہاؤس میں بلائے جانے سے اُن کے شرف و وقار میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوا، بلکہ اُن کے جانے سے خود گورنمنٹ ہاؤس کی عزت دوبالا ہو گئی!

"طلوعِ اسلام" کی نوکرشاہی "ذہنیت" لوگوں کو اُن کی تنخواہوں، موٹروں، کوٹھیوں اور جاہ و منصب کی ترازو میں تولتی ہے، اور ہمارے پاس، ہم کے لئے بس ایک ہی پیمانہ ہے اور وہ قرآن کا دیا ہوا "تقویٰ" کا پیمانہ ہے، جو اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس کی کوئی عزت نہیں، اور جو صاحبِ تقویٰ ہے چاہے اُس کے پاس مُٹھی بھر جَو بھی نہ ہوں، وہ عزت و احترام کا مستحق ہے!

ابوالاعلیٰ مودودی جن کی عظیم شخصیت کو مجروح کرنے کے لئے "طلوعِ اسلام" نے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے، اُسے اگر اپنی آتشِ رشک و حسد کے لئے مزید ایندھن کی ضرورت ہے تو وہ مصر، الجزائر، عراق، شام، ٹیونس، انڈونیشیا، اور نجد و حجاز میں جا کر معلومات حاصل کرے کہ ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت وہاں کس قدر مقبول ہے، وہ اُن کے علمی وقار اور اسلامی کردار سے ان ممالک کے کار پرداز کتنے متاثر ہیں! اور اگر مسٹر پرویز اور اُن کے ہم ذہن جاہ و دولت ہی کو معیارِ عظمت سمجھتے ہیں تو اس خبر نے نہ جانے اُن کو کب تک انگاروں پر تڑپایا ہوگا جب سُلطان سعود شاہ نجد و حجاز نے پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیرِاعظم سے مولانا مودودی کی رہائی کے بارے میں گفتگو کی تھی!

مسٹر پرویز، "طلوعِ اسلام" کے صفحوں میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی پر جو جیسی گندگی اُچھال دیں اور اپنے ہم نشینوں کے سامنے جیسی چاہے تہمت جوڑ دیں مگر وہ تمام دُنیا کی آنکھوں میں دھول تو نہیں ڈال سکتے، یہ چند برگ ہائے خزاں دیدہ، در ذرۂ آدم، وہ اس کوہِ وقار سے ٹکرا کر کچھ اپنا ہی نقصان کر لیں گے اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے!

اور پھر چھوٹی اوی جماعت کے اس امیر پرویز بٹالوی کے احساسِ کمتری کا یہ حال ہے کہ جن خطوط پر جماعتِ اسلامی کام کر رہی ہے اُن کی یہ شخص نقل اُتارنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہ جو چند جُھلا اور سفہا کی حمایت پرویز صاحب کو حاصل ہو گئی ہے تو وہ اس زعم میں مُبتلا ہو گئے ہیں کہ میں بھی ہفتہ وار اجتماعوں میں تقریر کر کے اور اپنی کتابوں کے ترجمے عربی اور انگریزی میں چھپوا کر بین الاقوامی پوزیشن حاصل کر لوں گا، اس شخص نے ابوالاعلیٰ مودودی کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ رکھا ہے اور اُن کی ذات پر نہایت ہی رکیک اور سوقیہ حملے کرتا رہتا ہے ——— اس شخص کی نادانی اور سفاہت دیکھئے کہ جو شیش محل میں بیٹھ کر فولادی ستون پر پتھر پھینکتا ہو اور اپنی جگہ مطمئن ہو کہ اب کوئی دم میں وہ ستون گرا جاتا ہے!

مسٹر پرویز بھی سُن لیں اور وہ بھی جن کو یہ اپنا "ان داتا" سمجھتے ہیں اور جماعت اسلامی کے خلاف جنھیں ہمیشہ اُکساتے اور ورغلاتے رہتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے ارکان ایک معروف مقصد پر جمع ہوئے ہیں اور اس عزم و جرأت کے ساتھ جمع ہوئے ہیں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں جان چاہے ہماری جانیں کیوں نہ چلی جائیں مگر جو قدم خدا کی راہ میں اُٹھ گیا ہے وہ پھر لوٹ نہیں سکتا! جماعتِ اسلامی مُسلم لیگ کی طرح مفاد پرستوں کی کوئی ٹولی نہیں ہے، جماعتِ اسلامی کے سامنے "رضائے الٰہی" کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے اور انھوں نے اپنی جانوں کو اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے! پس وہ خدا کی راہ میں قُتلِ بن کر بھی اُٹھے تو بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں!

مسٹر پرویز اور اُن کے حواریین کذب و باطل کا جو گرد و غبار اُڑا رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے فضا کو مکدر بنا دے مگر سچائی کا سورج اس گرد و غبار میں زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکتا، وہ چمک کر رہے گا اور اس طرح چمکے گا کہ باطل کے اندھیرے کو پھر کہیں پناہ نہ مل سکے گی ــــ حبابوں کی نمود نے موجوں پر کبھی فتح نہیں پائی، حباب ٹوٹ کر ہی رہتے ہیں، کاغذ کی ناؤ آج تک کبھی پار نہیں لگی ــــ

ہزار فرعون، اور ایک ضربِ کلیم! تاریخ کا یہ مُبرم فیصلہ ہے!

ماہر القادری

ارشاداتِ عالیہ

(توحید، کتاب وسنّت توکّل اور تقدیر پر)

حضرت سیدنا عیسیٰ مسیح علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے مبلّغ اور توحید خالص کے داعی تھے، مگر اس تعصّد، غلط اندیشی اور گمراہی کی انتہا ہے کہ آپؑ کے اُمّتیوں نے خود مسیح کو "ابن اللہ" بنا ڈالا اور آپؑ کو اور آپؑ کی محترم والدہ حضرت مریم علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں شریک کردیا! عیسیٰ مسیح و مریم (علیہما السلام) کی الوہیت کے عقیدے تراش کر اس کج رائی اور غلط اندیشی کو شکار ہیں کہ اس طرح اُنھوں نے ان نفوس قدسیہ کی عقیدت اور محبت کا حق ادا کردیا، حالانکہ ان بدبختوں اور جاہلوں نے عقیدت کے پردے میں شدید دشمنی کا ثبوت دیا، اور حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ سے وہ باتیں منسوب کیں جو اُن کی تعلیمات کی عین ضد ہیں ——— عیسائیوں کے لئے کتنی رسوائی اور پشیمانی کا وہ دن ہوگا جب حضرت مسیح اپنے نالائق اور نافرمان اُمّتیوں سے بیزاری کا اظہار فرمائیں گے!

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کرام کی طرح حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی توحید خالص کے منادی اور داعی تھے، مگر مسلمانوں ہی میں کچھ ایسے "عاشقانِ رسول" (؟) بھی پیدا ہوگئے جو اس قسم کے :-

اللہ کے پتے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لوں گا محمدؐ سے

جاہلانہ اور مشرکانہ شعروں پر جھومتے ہیں! غضب خدا کا حضورؐ کو "احمد بے میم" کہتے ہیں اور اس عقیدت و محبت پر فخر کرتے ہیں کہ کیا نکتہ پیدا کیا ہے اور شریعت کا پردہ رکھ کر کس "سرِّ حقیقت" کی عقدہ کشائی فرمائی ہے!

قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی رازق ہے، دستگیر ہے اور مشکل کشا ہے وہی فریاد رس ہے اور مصیبتوں کا دُور کرنے والا ہے مگر اُن مسلمانوں کی شوخیِ عقیدت کو کیا کہئے جنہوں نے قرآن کی اس تعلیم کے علی الرغم بندوں کو "مشکل کشا" "بندہ نواز" "دستگیر" اور "غریب نواز" بنالیا ہے! بزرگوں کے ناموں کی دہائی دی جاتی ہے، مصیبت کے وقت اُن کو پکارا جاتا ہے،

کھیتوں کی پیداوار اور مویشیوں میں اُن کے نام کے حصے مقرر کئے جاتے ہیں، اور لطف یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کی اس طرح دھجیاں اڑانے کے بعد لوگ مطمئن ہیں کہ "توحید" کے عقیدہ پر ذرا سی بھی آنچ نہیں آئی اور اولیاء کرام کی محبت و عقیدت کا اس طرح ٹھیک ٹھیک حق ادا ہوگیا۔

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اس گمراہ کن عقیدت کا سب سے زیادہ نشانہ بنی ہوئی ہے، مسجدوں میں "صلوٰۃ غوثیہ" پڑھی جاتی ہے اور نماز پڑھنے کے بعد سات قدم بغداد کی طرف منہ کر کے چلا جاتا ہے، اٹھتے بیٹھتے "یا غوث" کہا جاتا ہے، "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کے نعرے لگائے جاتے ہیں، "گیارھویں شریف" نماز روزہ کی طرح دین کا ایک رکن بن کر رہ گئی ہے، نماز قضا ہو سکتی ہے اور روزہ چھوڑا جا سکتا ہے مگر "گیارھویں" کی فاتحہ ناغہ نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ خفا ہو جائے تو ہو جائے مگر "پیر دستگیر" خفا نہ ہونے پائیں!

حالانکہ حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات و مواعظ اس پر گواہ ہیں کہ آپ نے شرک و بدعت کے خلاف جہاد کیا ہے اور توحید کو خوب نکھار کر پیش فرمایا ہے! بغداد میں شیخ کی خانقاہ قرآنی تعلیم کی سب سے بڑی درس گاہ تھی، آپ کے وعظ کی مجلسیں اتنی شاندار ہوتی تھیں کہ اس کی مثال علم و عرفان کی تاریخ میں کم ہی ملے گی، وعظ کی ان مجلسوں میں حضرت شیخ قدس سرہٗ جاہلانہ عقائد کا بڑی شدت کے ساتھ رد فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کی زبان میں تاثیر دی تھی، دوزخ کے عذاب اور آخرت کے محاسبہ کا اس قدر خلوص و درد کے ساتھ ذکر فرماتے کہ لوگ چیخنے لگتے اور خشیتِ الٰہی کے آنسوؤں سے حاضرینِ محفل کی ڈاڑھیاں بھیگ جاتیں! سو دو سو نہیں ہزاروں فاسقوں فاجروں بدعتیوں اور فاسد عقیدہ رکھنے والوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر توبہ کی ہے، کوئی شک نہیں کہ "محی الدین" کا لقب آپ کو زیب دیتا تھا، آپ تجدید و احیائے دین کے منصب پر فائز تھے اور اس فرض کو شیخ نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا۔

حضرت شیخ قدس سرہٗ کی خودداری اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ عباسی خلیفہ آپ کے یہاں حاضر ہوتا تھا، آپ اُس کے دربار میں نہ جاتے تھے، خلیفہ کی آمد کی خبر آتی تو شیخ خانقاہ سے اُٹھ کر اندر چلے جاتے تاکہ خلیفہ کی تعظیم نہ کرنی پڑے، جب بادشاہ آ چکتا تو آپ تشریف لاتے اور خود بادشاہ کو تعظیم کیلئے اُٹھنا پڑتا! اللہ تعالیٰ نے حُسنِ سیرت کے ساتھ حُسنِ صورت بھی عطا فرمایا تھا، لوگوں کے دل آپ کی طرف کھنچتے تھے، شیخ نے اپنے دور میں رسول اللہ صلی کی نیابت کا فرض انجام دیا۔

کوئی شک نہیں کہ آپ کی ذات سے کرامات بھی ظہور میں آئیں مگر آپ کی سب سے بڑی کرامت خود آپ کی سیرت اور زندگی تھی، سر تا بقدم اتباعِ سنت! شریعت کے حدود کے سب سے بڑے محافظ! خدا کے خوف سے راتوں کو رونے والے! صدقِ مقال اور اکلِ حلال کی جیتی

بھاگتی تصویر! حق بات کہنے میں انتہائی جری اور بے باک!

"قادریت" نہ کوئی نئی شریعت ہے، نہ کوئی جداگانہ اصول ہے اور نہ حکمت و معرفت کا جدید فلسفہ ہے! "قادریت" اگر کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو وہ "کتاب و سنت" کی نسبت ہے اور یہی نسبت اور تعلق سب سے قوی تعلق ہے: عقیدت کے غلو نے پچھلی اُمتوں کو تباہ کیا تھا اور یہی چیز مسلمانوں میں بھی عود کر آئی ہے! اس گمراہی کے خلاف کھل کر آواز بلند کرنے کی ضرورت ہے اور اس جدوجہد میں "وہابی" کی طنز گوارا کر لینی چاہیے!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز کے مواعظ کے اقتباسات ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں، شیخ کے وابستگان اور عام لوگ اس آئینہ میں اپنے چہرے کو دیکھیں کہ عقائد میں کہاں کہاں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے، شیخ کی اصل تعلیمات کیا تھیں اور اُن سے کیا کیا باتیں منسوب کر دی گئیں (م-ق)

افسوس تجھ پر کہ زبان تیری تقویٰ پکارتی ہے اور تیرا دل فاجر بن رہا ہے، تیری زبان شکر کرتی ہے اور تیرا قلب شکوہ اور اعتراض کر رہا ہے۔۔۔ افسوس تجھ پر تو دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کا بندہ ہے اور اطاعت کرتا ہے اُس کے ماسویٰ کی، اگر تو واقعی اُس کا بندہ ہوتا تو اُس کے لئے عداوت اختیار کرتا اور اُسی کے لئے محبت سچے مومن اپنے شیطان اور اپنی خواہش کی اطاعت نہیں کیا کرتا وہ شیطان کو جانتا ہی نہیں اُس کی اطاعت تو کیا کرے گا۔

تو دُنیا میں رہنے اور یہاں کے مزے اُڑانے کے لئے پیدا نہیں ہوا حق تعالیٰ کی ناراضی کی جس حالت میں تو ہے اُس کو بدل! تو نے اللہ کی اطاعت میں صرف لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ لینے پر قناعت کر لی ہے حالانکہ جب تک اس کے ساتھ دوسری چیز (یعنی عمل) کو نہ ملائے گا یہ تجھ کو نافع نہ ہوگا، ایمان مجموعہ ہے قول کا اور عمل کا، ایمان نہ مقبول ہوگا اور نہ مفید جب کہ تو معصیتوں، لغزشوں اور حق تعالیٰ کی مخالفت کا مرتکب ہوگا اور اُس پر اڑا رہے، اگر نماز، روزہ اور صدقہ اور نیکوکاریاں چھوڑے گا تو وحدانیت و رسالت کی محض گواہی کیا نفع دے گی؟ جب تو نے لا الٰہ الا اللہ کہا کہ کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے تو (توحید کا) مدعی بن گیا، اب کہا جائے گا بتا کوئی تیرا گواہ بھی ہے؟ وہ گواہ کیا ہے؟ حکم کا ماننا، ممنوعات سے باز رہنا، مصیبتوں پہ صبر کرنا اور تقدیر کے آگے گردن جھکانا یہ اس دعوے کے گواہ ہیں اور یہ بھی حق تعالیٰ کے لئے اخلاص کے بغیر مقبول نہ ہوں گے کیونکہ قول قبول نہیں ہوتا بلا عمل کے اور کوئی عمل قبول نہیں ہوتا بغیر اخلاص اور سنت کی موافقت کے!

تجھ پر افسوس ہے کہ تیری زبان مسلمان ہے مگر قلب مسلمان نہیں، تیرا قول مسلمان ہے مگر فعل مسلمان نہیں! تو اپنی جلوت میں مسلمان ہے مگر خلوت میں مسلمان نہیں! کیا تجھے معلوم نہیں کہ جب تو نماز پڑھے گا، روزہ بھی رکھے گا اور سارے نیک کام کرے گا مگر ان اعمال سے اللہ تعالیٰ کی ذات مقصود نہ سمجھے گا تو تو منافق ہے اور اللہ عزوجل سے دور ہے!

توبہ کر اور توبہ پر قائم رہ کیونکہ شان توبہ کرنے میں نہیں بلکہ توبہ پر قائم رہنے میں ہے، شان درخت لگانے میں نہیں شان تو درخت کے جمنے اور شاخوں کے پھوٹنے اور پھل لانے میں ہے — عمل کر اور اخلاص کے ساتھ کر، تیرا عمل وہی مقبول ہوگا جس سے تو ذات حق کو مقصود سمجھے گا نہ کہ وہ جس سے مخلوق مقصود ہو، تجھ پر افسوس ہے کہ عمل تو مخلوق کے لئے کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ حق

تعالیٰ اس کو قبول فرمائے ـــــــــ اعمال کی بنیاد توحید اور اخلاص پر ہے پس جس کے پاس توحید اور اخلاص نہ ہو اُس کے پاس کوئی عمل نہیں، مضبوط کر اپنے عمل کی بنیاد کو، توحید اور اخلاص کے ذریعہ !

صاحبو ! میرا کہنا مانو کہ میں اللہ تعالیٰ کا داعی ہوں کہ تم کو بلاتا ہوں اس کے دروازے اور اُس کی اطاعت کی طرف، اپنے نفس کی طرف نہیں بلاتا ! منافق شخص مخلوق کو اللہ کی طرف نہیں بلایا کرتا وہ اپنے نفس کی طرف بلایا کرتا ہے وہ طالب ہوتا ہے دولت کا اور لوگوں میں مقبولیت کا اور وہ طالب ہوتا ہے دُنیا کا !

تجھ پر افسوس کہ تو حافظ قرآن بنتا ہے اور اُس پر عمل نہیں کرتا پھر حفظ کیوں کرتا ہے ؟ لوگوں کو حکم دیتا ہے اور خود نہیں کرتا دوسروں کو منع کرتا ہے مگر خود باز نہیں آتا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ غصہ دلانے والی بڑی بات اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ تم کہو ایسی بات جو خود نہ کرو تم کیوں کہتے ہو (وہ بات) جس کی خود مخالفت کرتے ہو !

تجھے کبھی فلاح نہ ہوگی جب تک جھوٹے معبودوں کو (دل سے) نکالے گا نہیں اسباب کو قطع نہ کرے گا اور نفع و نقصان کے متعلق مخلوق کو دیکھنا چھوڑے گا نہیں، تم بظاہر تندرست ہو مگر حقیقت میں بیمار ہو، تونگر ہو مگر مفلس ہو، زندہ ہو مگر مردہ، موجود ہو مگر معدوم !

. . . . . تم میں سے ہر شخص کے پاس یک ہی قلب ہے پھر اس سے دُنیا اور آخرت دونوں کے ساتھ کس طرح محبت کر سکتا ہے ؟ اس میں خالق و مخلوق دونوں کیونکر جمع ہو سکتے ہیں ؟ یہ بات ایک قلب کے لئے ایک حالت میں کس طرح حاصل ہو جاتی ہے ؟ یہ صریح جھوٹ ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جھوٹ ایمان سے مغایر ہے، ہر برتن سے وہی چھلکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے، تیرے اعمال تیرے عقاید کی دلیلیں ہیں، وہ تیرا ظاہر تیرے باطن کی علامت ہے اور اسی لئے ایک بزرگ نے فرمایا، "تیرا ظاہر عنوان ہے تیرے باطن کا"

صاحبو ! اللہ کو پہچانو اور اُس سے جاہل نہ رہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اُس کی معصیت نہ کرو اُس کی موافقت کرو مخالفت نہ کرو اُس کی قضا پر راضی رہو اور اُس سے منازعت نہ کرو . . . . وہی ہے پیدا کرنے والا، رزق دینے والا، سب سے پہلے سب کے بعد اور ظاہر و باطن وہی ہے، قدیم اور اول دائم اور ابد ہی ! کر سکنے والا کہ جو کچھ بھی چاہے اور جو کچھ کرے اُس سے باز پرس نہ ہو اور لوگوں سے باز پرس ہوگی، وہی ہے تونگر بنانے والا، وہی ہے فقیر بنانے والا، وہی ہے نفع پہنچانے والا، زندہ کرنے والا، مارنے والا، سزا دینے والا، وہی ڈر کے قابل ہے اور وہی اُمید کے لائق ہے، اُس سے ڈرو اُس کے سوا کسی سے نہ ڈرو، اُس سے آرزو رکھو اور کسی سے آرزو مت رکھو . . .

. . . . . جو چیز شریعت کے دائرے سے باہر ہے اُس کی ہمیں ضرورت نہیں . . . . . اپنے تمام معاملات میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کمربستہ ہو جاؤ آپ کے حکم اور ممانعت اور اتباع کے تحت میں رہو !

اے حق تعالیٰ سے اور اُس کے صدیق بندوں سے اعراض کرنے والے ! اور مخلوق کو شریک خدا بنا کر اُن پر متوجہ ہونے والے ! یہ مخلوق پر تیری توجہ کب تک رہے گی ؟ وہ تجھے کیا نفع دے سکتے ہیں ! نہ اُن کے ہاتھ میں نقصان ہے نہ نفع ! نہ عطا ہے نہ منع ! نفع و نقصان کے متعلق تو اُن میں اور جمادات میں کچھ فرق نہیں ہے ! بادشاہ ایک ہی ہے، نقصان پہنچانے والا ایک ہی ہے، نفع پہنچانے والا ایک ہی ہے، حرکت دینے والا وہی ایک، سکون دینے والا وہی ایک ! مُسلّط کرنے والا وہی ایک، مُسخّر کرنے والا وہی ایک ! معطی اور مانع وہی، خالق اور رازق وہی رب وہی ایک !

صاحبو ! افسوس ہے کہ تم سیر ہو کر کھاتے ہو حالانکہ تمہارے پڑوسی بھوکے ہیں اور پھر دعویٰ یہ ہے کہ ہم مومن ہیں ! تمہارا ایمان ہرگز صحیح نہیں ـــــــــ ہر حقیقت جس کی شریعت شہادت نہ دے زندقہ ہے ـــــــــ حق تعالیٰ کے معاملات میں مخلوق کی موافقت مت کر، ٹوٹ جانے جیسے ٹوٹتا ہو اور جُڑ جائے جیسے جُڑتا ہو ! حق تعالیٰ کی موافقت کرنا اُس کے نیکوکار اور موافقت کرنے والے بندوں

ے سیکھو! علم تو عمل کے لئے بنایا گیا ہے نہ کہ حفظ کرنے اور مخلوق پر پیش کرنے کے لئے! علم سیکھو اور عمل کرو اُس کے بعد دوسروں کو پڑھائیو! جب تو عالم بن کر عامل بن جائے گا تو اگر خاموش بھی رہے گا تو تیرا علم کلام کرے گا اور عمل کی زبان سے کلام کرے گا! ——— عمل بن بلا گفتگو کے، اخلاص بن بغیر ریاء کے، اور توحید بن بلا شرک کے! گمنامی بن بلا شہرت کے، خلوص بن بلا جلوت کے! اور باطن بن بلا ظاہر کے!

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مومن کے خوف اور اُمید کو اگر وزن کیا جائے تو یقیناً دونوں برابر نکلیں گے"
ایک بزرگ سے روایت ہے کہ میں نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو اُن کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور اُن سے پوچھا کہ حق تعالےٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے ایک پاؤں پل صراط پر رکھا اور دوسرا جنت میں (کہ عبور میں دیر نہ لگی اور یہ ثمرہ تھا اُن کے خوف و رجا میں مساوات رکھنے کا) اُن پر اللہ کا سلام نازل ہو کہ واقعی وہ بڑے نقیہ، بڑے زاہد و متقی تھے، علم بھی سیکھا اور اُس پر عمل بھی کیا، علم کا حق علم کو دیا اور عمل کا حق عمل کو دیا، اس میں اخلاص برت کر! پس حق تعالےٰ نے اُن کو خوشنودی بخشی کیونکہ انھوں نے اسی کو اپنا مقصود بنایا تھا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشنودی عطا کی کہ انھوں نے حضورؐ کی متابعت کی، اللہ کی رحمت ہو اُن پر اور تمام صالحین پر اور اُن کے ساتھ ہم پر بھی! ہر وہ شخص جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے اور اپنے ایک ہاتھ سے آپکی شریعت اور دوسرے ہاتھ سے آپؐ کی کتاب (قرآن) کو جو آپؐ پر نازل ہوئی تھی نہ تھامے اور آپؐ کے چلے ہوئے راستہ میں حق تعالیٰ کی طرف نہ چلے وہ ہلاک ہو اور پھر ہو، گمراہ ہو اور پھر ہو اور پھر بھی (قرآن و سنت) حق تعالیٰ کی طرف ہدایت کرنے والی ہیں!

تجھ پر افسوس ہے کہ نماز میں کھڑا ہو کر اللہ اکبر کہتا ہے (کہ اللہ سب سے بڑا ہے) حالانکہ تو اپنے قول میں جھوٹا ہے کیونکہ مخلوق تیرے قلب میں سب سے بڑی ہے، اللہ سے توبہ کر اور کوئی نیکی اُس کے سوا اور کسی کے لئے مت کر ———!

اے اہل ناس! دُنیا ختم ہو رہی ہے اور عمریں ختم ہو رہی ہیں اور آخرت تمہارے قریب آ لگی اور تمہیں اس کی متعلق فکر نہیں! بلکہ تمہاری فکر دُنیا اور اُس کے بٹورنے کے لئے ہے! ——— جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے آپؐ نے فرمایا کہ علم پکارتا ہے عمل کو پس اگر وہ اُس کی تعمیل کرتا ہے فبہا ورنہ وہ چل دیتا ہے، اُس کی برکت چل دیتی ہے اور صرف پڑھنا پڑھانا باقی رہ جاتا ہے، پوست رہ جاتا ہے اور مغز جاتا رہتا ہے! اے علم سیکھ کر عمل کو چھوڑنے والو! کوئی تم میں شعر گوئی کا ماہر ہے اور کوئی عبارت آرائی اور فصاحت و بلاغت میں یکتا ہے اور اُس کے پاس نہ عمل ہے نہ اخلاص! اگر تیرا قلب مہذب ہو جاتا تو تیرے اعضا بھی مہذب بن جاتے کیونکہ وہ اعضاء کا بادشاہ ہے، بادشاہ مہذب بنتا ہے تو رعیت بھی مہذب بنتی ہے علم چھلکا ہے اور عمل گری ہے، چھلکے کی حفاظت اس لئے کی جاتی ہے کہ گری محفوظ رہے اور گری کی حفاظت اس لئے کی جاتی ہے کہ اُس میں سے روغن نکالا جائے، تو جب چھلکے میں گری نہ رہی تو خالی چھلکے کا کیا بنایا جائے اور جب گری میں روغن نہ رہا تو (سوکھی) گری کو لیکر کیا کیا جائے، علم جاتا رہا! اس لئے کہ جب عمل ہی جاتا رہا تو گویا علم ہی جاتا رہا، عمل کے بغیر اس کا پڑھنا پڑھانا اور حفظ کرنا تجھے کیا نفع دے سکتا ہے؟

ظاہر و باطن دونوں کے شرک سے پرہیز کرو، شرک ظاہر تو بتوں کی پرستش کرنا ہے اور شرک باطن مخلوق پر بھروسا کرنا اور نفع و نقصان میں اُن پر نگاہ ڈالنا ہے، آدمیوں میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے ہاتھ میں دُنیا ہوتی ہے اور وہ اُس کو محبوب نہیں سمجھتے وہ دُنیا کے مالک ہوتے ہیں اور دُنیا اُن کی مالک نہیں ہوتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دُنیا اُن کے پیچھے دوڑتی ہے وہ دُنیا کے پیچھے نہیں دوڑتے وہ دُنیا کو خدمت گار بنا کر رکھتے ہیں دُنیا اُن کو خادم نہیں بناتی ———!

اے مسکین! اپنے نفس پر رو! تیرا بچہ مر جاتا ہے تو تجھ پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے اور تیرا دین مرتا ہے تو تجھ کو پروا بھی نہیں ہوتی

اور نہ تو اس پر روتا ہے ——— یہ عقل اور زندگانی دونوں چیزیں راس المال ہیں مگر تو ان سے تجارت کرنا اچھا نہیں سمجھتا، وہ
علم جس پر عمل نہ ہو اور وہ عقل جس سے نفع نہ ہو اور وہ زندگی جو ندہ نہ ہو یہ تینوں ایسے ہیں جیسے وہ مکان جس میں رہائش نہ ہو وہ
خزانہ جس کا پتہ نشان نہ ملے، اور وہ کھانا جو کھایا نہ جائے ——— یہ دنیا ایک بازار ہے تھوڑی دیر کے بعد یہاں کوئی باقی نہ
رہے گا، رات کے آجانے پر سب بازار والے یہاں سے چلے جائیں گے، کوشش کرو کہ اس بازار میں تم خرید و فروخت نہ کرو
مگر ایسی چیز کی جو کل کو آخرت کے بازار میں تم کو نفع دے کیونکہ پرکھنے والا (یعنی اللہ تعالیٰ) بڑا دانا بینا ہے (اس کے سامنے کھوٹا
سکہ چل جانے کی ہرگز توقع نہ رکھو) حق تعالیٰ کی توحید اور عمل میں اخلاص ہی وہاں چلنے والا (سکہ) ہے اور وہی تمہارے پاس کم ہے!

اے غافل اے نادان! ہوشیار ہو تو دنیا کے لئے نہیں بنایا گیا تو آخرت کے لئے بنایا گیا ہے، اے اس چیز سے غافل جس
کے بغیر چارہ نہیں. تو نے اپنی فکر خواہشات و لذات اور دینار پر دینار جوڑنا ہی قرار دے لیا اور اپنے اعضاء کو لہو و لعب میں
مشغول کر دیا، اگر کوئی یاد دلانے والا تجھ کو آخرت اور موت یاد دلاتا ہے تو تو کہتا ہے کہ میرا عیش مکدر کر دیا اور ادھر ادھر سر مٹکانے
لگتا ہے، موت کا ڈرانے والا تیرے پاس آیا اور وہ بالوں کی سپیدی ہے (جو موت کی اطلاع دیتی ہے) اور تو اسے یا تو (قینچی سے)
کاٹ دیتا ہے یا (خضاب کی) سیاہی سے اس کو متغیر کر دیتا ہے، جب تیری اجل آجائے گی اس وقت کیا کرے گا؟ جب تیرے
پاس ملک الموت اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئیں گے تو ان کو تو کس چیز سے واپس کرے گا؟ جب تیرا رزق ختم اور تیری مدت تمام
ہو جائے گی تب کونسی چال چلے گا؟ اس ہوس کو چھوڑ دنیا کی بنا تو کام پر ہے جب یہاں کام کرے گا تب اجرت پائے گا اور اگر کام نہ
کرے گا تو کچھ بھی نہ ملے گا یہ تو اعمال اور مصیبتوں کا گھر ہے یہ مشقت کا گھر ہے اور آخرت راحت کا گھر ہے! مومن چونکہ یہاں اپنے نفس
کو مشقت میں ڈالتا ہے پس ضرور ہے کہ راحت پائے لیکن تو نے راحت میں جلدی مچائی (کہ دنیا ہی میں آرام کیا) اور توبہ میں ٹال
ٹول کی، اور دنوں مہینوں بلکہ برسوں سے آج کل کرتا رہتا ہے، تیری زندگی ختم ہو رہی ہے، عنقریب تو پشیمان ہوگا کہ نصیحت کیوں نہ مان لی
اور متنبہ کیوں نہ ہوا ——— تجھ پر افسوس کہ تیری زندگانی کی چھت کا شہتیر ٹوٹ چکا (اور عنقریب گرا چاہتا ہے مگر تجھے ہوش
نہیں آتا) اے مغرور! تیری زندگی کی دیواریں گرتی جا رہی ہیں، یہ گھر جس میں تو آباد ہے ویران ہوا چاہتا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے گھر
میں جانا ہے، آخرت کا گھر طلب کر اور اس کی طرف اپنا قدم بڑھا، کونسا قدم؟ وہ قدم اعمال صالحہ ہیں!

تو لا الٰہ الا اللہ کس طرح کہتا ہے حالانکہ تیرے قلب میں کیا کچھ معبود بھرے ہوئے ہیں، اللہ کے سوا ہر چیز جس پر تو اعتماد
اور تکیہ کرے وہ تیرا بت ہے، قلب کے شرک ہوتے ہوئے زبان کی توحید کچھ مفید نہ ہوگی، دل کی گندگی کے ساتھ جسم کی پاکی تجھے کچھ
نفع نہ دے گی! صاحب توحید اپنے شیطانوں کو لاغر بنا دیتا ہے اور مشرک کو اس کا شیطان لاغر بنا دیتا ہے،
یہ وہ زمانہ ہے کہ ایک انجیر کے بدلے دین بیچ دیا جاتا ہے یہ زمانہ طول امل اور قوت حرص کا ہے، تو کوشش کر کہ ان لوگوں میں
سے نہ بنے، جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اور ہم متوجہ ہوئے ان کے اعمال کی طرف جو انہوں نے کئے تھے پس ان کو پراگندہ
غبار بنا دیا" ہر وہ عمل جس سے مقصود حق تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا ہو پس وہ پراگندہ غبار ہے!

لوگو! اتباع کرو، بدعتی مت بنو، موافقت کرو مخالفت نہ کرو، تابعدار بنو نافرمان نہ بنو، مخلص بنو، مشرک مت بنو، حق تعالیٰ
کے موحد بنو اور اس کے دروازے سے مت ٹلو! اسی سے مانگو اور کسی سے نہ مانگو! اسی سے مدد چاہو اور غیر سے مدد نہ چاہو. اسی
پر بھروسہ کرو اور کسی دوسرے پر بھروسہ مت کرو!
اللہ کے دین میں کسی بدعت اور کسی ایجاد کو دخل نہ دے جو اس میں موجود نہ تھی، دو منصف گواہوں (یعنی قرآن و حدیث)

کا اتباع کر کہ وہ دونوں تجھ کو تیرے رب تک پہنچا دیں گے! اگر تو بدعتی ہوا تو تیرے دونوں گمراہ عقل اور خواہشِ نفس ہوں گے جو لامحالہ تجھ کو دوزخ تک پہنچا کر چھوڑیں گے ——— عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "نیک عمل وہ ہے جس پر تعریف کئے جانے کی محبت نہ ہو" اے آخرت کے اعتبار سے بے وقوف دیوانے اور دُنیا کے اعتبار سے عقلمند! یہ عقل تم کو مفید نہ ہوگی، ایمان کی تحصیل میں کوشش کر وہ ایمان حاصل ہو جائے گا، توبہ اور معذرت کر اور نادم ہو، وہ اپنی آنکھوں کے آنسو اپنے رخساروں پر بہا کہ حق تعالیٰ کے خوف سے رونا معصیتوں کی آگ کو بجھاتا ہے اور حق تعالیٰ کے غضب کی آگ کو ٹھنڈا کرتا ہے، جب تو اپنے دل سے توبہ کرے گا تو بے شک سچی توبہ کا نور چہرہ پر دمک اُٹھے گا!

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو پسند ہو کہ سب سے زیادہ باعزت بنے تو اُس کو لازم ہے کہ اللہ کا خوف پیدا کرے اور جس کو پسند ہو کہ سب سے زیادہ زور آور بنے تو اُس کو لازم ہے کہ حق تعالیٰ پر بھروسہ رکھے اور جس کو پسند ہو کہ سب سے زیادہ تونگر بنے تو اُس کو لازم ہے کہ اپنے ہاتھ کی چیزوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کی چیزوں پر اعتماد رکھے، جو شخص دُنیا اور آخرت میں عزت چاہتا ہے تو اُس کو لازم ہے کہ حق تعالیٰ کا ڈر رکھے کیونکہ اُس نے فرمایا ہے کہ بے شک خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے ——— عزت اُس کا خوف رکھنے میں ہے اور ذلت اُس کی نافرمانی میں ہے!

اے منافق! تو دُنیا اور مخلوق کا بندہ ہے کہ اُن کے دکھانے کے لئے عمل کرتا ہے اور حق تعالیٰ کا اپنی طرف نظر کرنا بھولا ہوا ہے، تو ظاہر کرتا ہے کہ آخرت کے لئے عمل کر رہا ہے حالانکہ تیرا سارا عمل اور سارا قصد دُنیا کے لئے ہے! اور یہی نفاق در نفاق ہے کہ اپنے منافق ہونے سے اپنے نفس کو باخبر نہ کیا، حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ بندہ جب کسی آخرت کے عمل سے بنا سنورتا ہے اور وہ عمل اُس کا مقصود و مطلوب نہیں ہوتا (بلکہ مقصود دُنیا ہوتی ہے) تو آسمانوں میں اس کے نام اور نسب سمیت اُس پر لعنت کی جاتی ہے (کہ فلاں ابنِ فلاں پر خدا کی پھٹکار ہے)

اے وہ شخص! جو عمر کے لحاظ سے بوڑھا ہو گیا اور طبیعت کے اعتبار سے بچہ بنا ہوا ہے تو اس بدخصلت دُنیا کے پیچھے اپنی طبیعت کے بچپن کی وجہ سے کب تک دوڑتا رہے گا، تو نے اسی کو اپنا فکر و مقصود بنا لیا، کیا تجھے معلوم نہیں کہ فکر و مقصود وہی ہے جو تجھ کو چین سے نہ بیٹھنے دے اور اُسی کا بندہ ہے جس کے ہاتھ میں تیری باگ ہو! اگر تیری باگ دُنیا کے ہاتھ میں ہے تو تو اُسی کا بندہ ہے تو اگر تیری باگ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو تب تو خدا کا بندہ ہے! اور اگر تیری باگ نفس کے ہاتھ میں ہے تو اپنے نفس کا بندہ ہے! — اگر تیری باگ مخلوق کے ہاتھ میں ہے تو تو اُن کا بندہ ہے! پس دیکھ لے کہ اپنی باگ کس کے حوالے کرتا ہے! تم میں غالب اور کثرت سے تو وہی لوگ ہیں جو طالبِ دُنیا ہیں، اور کم ہیں وہ لوگ جو آخرت کو چاہتے ہیں اور شاذ و نادر ہیں وہ لوگ جو دُنیا اور آخرت کے پروردگار کی ذات کے طالب ہیں!

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے جہالت کے ساتھ عبادت کی تو وہ جتنی اصلاح کرے گا اُس سے زیادہ بگاڑ کرے گا، جاہل کی عبادت کچھ بھی نہیں بلکہ وہ سرتاپا بگاڑ اور ظلمت میں ڈوبی ہوئی ہے! اور علم بھی بغیر عمل کے مفید نہیں ہوتا اور عمل اخلاص کے بغیر فائدہ نہیں دیتا، جو بھی عمل اخلاص کے بغیر ہوگا وہ نہ مفید ہوگا اور نہ مقبول! جب تو صاحبِ علم ہوگا مگر عمل نہ کرے گا تو یہ علم تجھ پر حجت بنے گا! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جاہل پر ایک بار عذاب ہوگا اور عالم پر دس مرتبہ!

تو حق تعالیٰ کے مقابلہ میں جعل کرتا ہے (کہ صورت زاہدوں کی سی بنا رکھی ہے) حالانکہ وہ جانتا ہے جو کچھ تیری خلوت اور تیری جلوت اور اور تیرے قلب کے اندر ہے اس کے نزدیک خلوت و جلوت اور پردہ سب برابر ہیں ——— نیک کام کی ترغیب دینا اور خلافِ شرع امر سے روکنا میرے نزدیک خلوت خانوں کے ہزار عابدوں سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے ———

تجھ پر افسوس، ان حضرات کے راستہ کا تو کیونکر مدعی بنتا ہے حالانکہ اپنے نفس اور دوسری مخلوق کو شریکِ خدا بنائے ہوئے ہے جب تک سطحِ زمین پر ایک شخص بھی ایسا رہا ہے جس کا تیرے دل میں خوف یا اس سے کسی قسم کی توقع ہو تو تیرے لئے ایمان (کامل) نہیں اور جب تک دُنیا میں ایک چیز بھی ایسی ہو جس کو تو اپنی مراد بنائے تو تیرے لئے زہد (تام) نہیں!

صاحبزادے! تو اپنے نفس کا واعظ خود ہی بن اور نہ میری حاجت رکھ اور نہ کسی دوسرے کی! میرا وعظ تو تیری ظاہری حالت کی بنا پر ہوگا اور تیرا اپنا وعظ تیری باطنی حالت کی بنا پر ہوگا! موت کو ہر وقت یاد رکھنے اور تعلقات و اسباب کو منقطع کر دینے سے اپنے نفس کو وعظ سنا، رب الارباب سے علاقہ رکھ جو پیدا کرنے والا با عظمت اور واقف کار ہے، اُسی کی رحمت کے دامن سے لگ جا اور اُسی کی شفقت سے وابستہ ہو جا!

اپنے دین کو شاہان و سلاطین اور مالداروں کے انجیر (جیسے حقیر مال منال) اور حرام نوالہ کے عوض مت فروخت کر، جب تو اپنا دین بیچ کر کھائے گا تو تیرا دل سیاہ ہو جائے گا اور سیاہ کیوں نہ ہو تو مخلوق کی پرستش کر رہا ہے اے بدنصیب! اگر تیرے قلب میں نور ہوتا تو ضرور فرق کرتا حرام اور مشتبہ اور حلال کے درمیان!

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس کام کو ترک کرے جو اُس کو مفید نہ ہو، جس شخص کا اسلام حسین اور مستحکم ہوتا ہے وہ مفید کاموں پر متوجہ اور غیر مفید سے روگرداں ہوا کرتا ہے کیونکہ غیر مفید کاموں میں لگنا اہلِ باطل اور اہلِ ہوس کا کام ہے، اپنے آقا کی خوشنودی سے محروم ہے وہ شخص جو اس کی تعمیل نہ کرے جس کا وہ حکم فرمائے! اور جس کا اس نے حکم نہیں دیا اُس میں مشغول رہے یہی اصل محرومیت، اصل موت اور اصل مردودیت ہے — — اس کام میں لگو جس کے کرنے کا تم کو حکم ہوا ہے اور اُس سے باز رہو جس کی ممانعت کی گئی ہے!

اُن (اللہ والوں) کے نزدیک بجز خدائے برتر و بزرگ کے نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ قدرت والا اس کے سوا، نہ کوئی دینے والا ہے نہ کوئی روکنے والا ہے نہ فائدہ یا نقصان پہنچانے والا، نہ جلانے اور مارنے والا — — افسوس تو سانپوں کو کس طرح چھو رہا ہے اور اُلٹ پلٹ رہا ہے حالانکہ نہ تجھ کو سانپ پکڑنے والے کا منتر معلوم ہے اور نہ تو نے تریاق کھا رکھا ہے تو خود اندھا ہے پھر لوگوں کی آنکھوں کا علاج کیا کرے گا، تو گونگا ہے لوگوں کو تعلیم کس طرح دے گا؟ جاہل ہے پھر دین کو درست کیونکر کرسکے گا! جو شخص دربان نہ ہو وہ لوگوں کو شاہی دروازے تک کیونکر پیش کر سکتا ہے؟ تو ذاتِ حق اُس کی قدرت، اُس کے قرب اور مخلوق کے متعلق اُس کی سیاست (اور حکمت) سے ناواقف ہے، یہ نہ میری عقل و ضبط کے احاطہ میں آسکتا ہے نہ تمھاری عقل و ضبط اس کا احاطہ کر سکتی ہے اس کی حقیقت تو بجز خدا کے کسی کو معلوم نہیں (لہٰذا یہاں عقل کو دخل نہیں صرف اطاعت ہے) کہ سنو اور مان لو (یعنی سمعنا و اطعنا)!

اے مردہ دلو! میرے پاس تمھارا بیٹھنا کس کام کا، اے دُنیا اور بادشاہوں کے بندو! تم پر افسوس کہ اگر گیہوں کے ایک دانہ کی قیمت ڈھائی روپیہ ہو جائے تو بھی صاحبِ ایمان کو پروا نہیں ہوتی اور نہ اُس کی قوتِ یقین اور اپنے رب پر بھروسا رکھنے کی وجہ سے اُس کو نہ اپنی معاش کی فکر لاحق ہوتی ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ رزق خدا کے ذمہ ہے وہ ضرور پہنچائیگا۔

اے دُنیا کے بندو! اور اے آخرت کے بندو! تم اللہ تعالیٰ اور اُس کی دُنیا و آخرت سے ناواقف ہو تم (انسان نہیں بلکہ) دیو رہو ... . جب دُنیا ہی بغیر مشقت کے حاصل نہیں ہوتی تو قربِ حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے، کہاں تو اور کہاں وہ جن کی کثرتِ عبادت کا وصف حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ وہ رات کو بہت ہی کم سوتے

ہیں اور اس شب بیداری پر بھی) علی الصباح استغفار کیا کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ !

اے خدا پر اعتراض کرنے والے بے فائدہ بکواس مت کر تقدیر کو نہ کوئی رد کرنے والا رد کر سکتا ہے اور نہ کوئی روکنے والا روک سکتا ہے شانِ تسلیم اختیار کر کہ پوری راحت حاصل ہو یہ رات اور دن (جو یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں) کیا اُن کا روک دینا تیرے امکان میں ہے؟۔ جب رات آتی ہے تو آہی جاتی ہے خواہ تو راضی ہو یا ناراض! اور یہی حال دن کا ہے کہ دونوں تیری خواہش کے خلاف بھی آتے ہی رہتے ہیں یہی حال قضاء و قدر کا ہے، خواہ تیرے نفع کے متعلق ہو یا نقصان کے جب شبِ افلاس آئے تو اُس کو منظور کر اور روزِ تونگری کو رخصت کر دے اور جب بیماری کی رات آئے تو اس کو تسلیم کر اور روزِ عافیت کو الوداع کہہ دے اور جب کردرات کی شب آئے تو اُس کو قبول کر اور مرغوبات کے دن کو رخصت کر دے، امراض و اسقام اور افلاس و تہی دستی کی شب کا فراخ دلی کے ساتھ استقبال کر اور حق تعالی کے قضاء و قدر میں کسی شے کو بھی (ناگواری) یا اضطراب یا شکوہ کر کے رد نہ کر ورنہ ہلاک ہو جائے گا اور تیرا ایمان جاتا رہے گا' اور تیرا قلب مکدر بن جائے گا اور تیرا باطن مُردہ ہو جائے گا۔ حق تعالی نے اپنی ایک کتاب میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں ہوں اللہ کے بجز کوئی معبود نہیں جو شخص میری قضاء و قدر کے سامنے سر جھکائے اور میری دی ہوئی تکلیف پر صبر اور میرے احسانات پر شکر کرے میں اُس کو اپنے نزدیک "صدیق" درج کروں گا اور جو میری قضاء و قدر پر سر نہ جھکائے اور میری دی ہوئی تکلیف پر صبر نہ کرے اور میرے احسانات کا شکر ادا نہ کرے تو اُس کو چاہیئے کہ میرے علاوہ دوسرا پروردگار تلاش کر لے!

اگر صبر نہ ہو تو تنگ دستی مصیبت اور ایک عذاب ہے اور اگر صبر ہو تو کرامت و عزت ہے، بندۂ مومن مصیبت کے اندر قربِ حق اور مناجات کے مزے لیا کرتا ہے! ــــــــ صاحبو! خدا کی نعمتوں پر خدا کے شکر گزار بنو اور اُن کو دوسروں کی طرف منسوب نہ کرو کیا تم نے سُنا نہیں وہ فرماتا ہے کہ جو نعمت بھی تمھارے پاس ہے وہ اللہ کی دی ہوئی ہے،

مومن اپنی کمائی سببِ معاش کے ذریعے سے کھاتا ہے اور جانتا ہے (کہ یہ سبب اور روزی) اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب قوی الایمان بن جاتا ہے تو توکل کے ذریعہ روزی کھاتا ہے اُس کو بھی اللہ ہی کی طرف سے سمجھتا ہے اور پہلے خیال سے سرِ مو تبدیلی نہیں ہوتی، اگر وہ ہزار برس دجلہ پر بیٹھا رہے (کہ روزی پہونچنے کی بظاہر کوئی صورت نہ ہو) تب بھی اُس کا قلب حق تعالی کے ساتھ وابستہ رہیگا۔

یہ آخری زمانہ ہے یہ زمانہ نفاق ہے کہ ہر وقت خود ستائی ہے اور ہر وقت کفرِ ربوبیت ہے، خود ستائی تجھ کو نگاہِ خداوندی سے گرا دے گی یہ دونوں (یعنی خود ستائی اور کفرانِ نعمت) قربِ حق کی ضد ہیں اور اُس سے کہہ دو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے منافق (کی علامت یہ ہے) کہ جب وعدہ کرتا ہے، اُس کے خلاف کرتا ہے اور جب بات کہتا ہے تو جھوٹ کہتا ہے اور جب اُس کے پاس کوئی شے امانت رکھی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے۔

جب تو نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو تیرا قلب طرح طرح کے وسوسوں، خرید و فروخت اور خورد و نوش اور نکاح میں لگا رہتا ہے' ایک شخص نے پوچھا اس کا علاج کیا ہے! حضرتِ شیخ جیلانیؒ نے فرمایا کہ اپنے لقمہ کو حرام اور شبہ سے بچانا اور دوسرا علاج نفس کا خلاف کرنا اُن امور کے ارتکاب سے بچنا جن کا وہ تجھ کو حکم کرتا رہتا ہے۔

اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک صحیح النسب وہ ہے جو تقوی رکھتا ہو، کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ کی آل میں کون داخل ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

ہر متقی شخص محمدؐ کی آل ہے!

اخلاص مومن کے لئے بمنزلہ زمین کے ہے اور اعمال اُس کی دیواریں ہیں اور تعمیر و تبدیل دیواروں میں ہوا کرتا ہے نہ کہ زمین میں! تعمیر کی بنیاد تقویٰ پر ہونی چاہیئے ——— (حدیث میں آیا ہے) جس کے دو دن مساوی ہوں (کہ ترقی نہ کرے) تو وہ بڑے خسارے میں ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے بہ پے گر رہی ہیں اور اُس کی بنیاد بکھری جاتی ہے اے باشندگانِ زمین! آؤ جو گر گیا ہے اُس کو مضبوط کر دیں اور جو ڈھے گیا ہے اُسے درست بنا دیں۔ یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی (سب ہی کو مل جل کر کام کرنا چاہیئے)!

زین العابدین شمس
(دانا پور)

علم و فن، تہذیب و تمدن اور ایجاد و اختراع میں مسلمانوں کا حصہ!

ارباب خبر اور اہل علم جانتے ہیں

کہ مسلمانوں نے دنیا کی تہذیب و تمدن کو آگے بڑھانے میں کیا پارٹ انجام دیا ہے! ایک وہ زمانہ بھی گزرا ہے جب مسلمانوں کی سلطنت (مشرق میں) چین سے لیکر (مغرب میں) اسپین تک پھیلی ہوئی تھی! مسلمانوں نے جن ملکوں سے تعلقات بڑھائے اور رسم و رسوا قایم کئے اُن سے کچھ حاصل بھی کیا اور اُن کو کچھ دیا بھی! مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ دنیا کی تہذیب و تمدن پر مسلمانوں کا قرض ابھی تک باقی ہے اور "مدنیت" کو آگے بڑھانے، سنوارنے اور ترقی دینے میں مسلمانوں کا بہت کچھ ہاتھ ہے۔

اسلامی تہذیب کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر بلا پرشاد لکھتے ہیں:۔

> "اس میں شبہ نہیں کہ تہذیب عالم کی تاریخ میں اسلامی تہذیب کا بہت ہی قابل قدر مقام ہے۔ دنیا پر اسلامی تہذیب کا بڑا احسان ہے۔ کیونکہ جب یورپ میں ظلمت طاری تھی اس وقت عربوں نے قدیم علم و سائنس کو محفوظ رکھا اور اس کو ترقی دی۔ یونان اور ہندوستان سے انہوں نے کئی کتابوں کی واقفیت حاصل کی اور انہیں یورپ میں پھیلایا۔ یورپ میں جو نئی بیداری آئی اس میں اُن کے اس کام سے بڑی مدد ملی"

مسلمانوں کی تہذیب سے متعلق اسی قسم کا خیال یورپ کا ایک مشہور تاریخ داں، H. A. DAVIES. M. A پیش کرتا ہے:۔

> "During the five centuries following the death of Mohammad his followers evolved a civilization much superior to any thing which existed in Europe at the time."

"حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد پانسو سال کی مدت میں آپ کے ماننے والوں نے ایک ایسی تہذیب کو پیش کیا جو اس وقت کی یورپ کی تہذیب سے بہت زیادہ بلند اور اعلیٰ تھی"

یہی مصنف اپنی کتاب "AN OUT LINE HISTORY OF THE WORLD"

میں آگے چل کر پروفیسر بلا پرشاد کے اس خیال سے کہ "اسلامی تہذیب کا دنیا پر بڑا احسان ہے" اتفاق کرتا ہے:۔

"The scientific world owes a great deal to Mohamedans."

"دنیائے سائنس پر مسلمانوں کا بہت بڑا احسان ہے۔۔۔"

مغربی مفکرین نے اس کا بار بار اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں تہذیب و تمدن کی شمع کو مسلمانوں نے روشن کیا! صرف ایک شہر قرطبہ اس قدر جامعیت اور مرکزیت رکھتا تھا کہ کسی کو فلسفہ، نجوم، ہیئت، موسیقی، ادب اور سنگ تراشی سیکھنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ اس مقصد کے حصول کے لئے قرطبہ جانے کے لئے مجبور تھا۔

مسلمانوں نے روم کی پرانی سڑکوں کی مرمت کرائی اور بہت سی نئی نئی سڑکیں تعمیر کیں۔ نالوں اور نہروں کو بنوایا۔ کبوتروں کو اڑا کر نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کیا۔ مسلمانوں نے پہلے پہل ڈاک کا رواج ڈالا۔ انہوں نے بہت سی یونیورسٹیوں کی بنیاد رکھی قرطبہ اور قاہرہ کی یونیورسٹیاں خاص طور سے مشہور ہیں۔ قاہرہ کی یونیورسٹی میں بارہ ہزار طلباء تھے۔ یونیورسٹیوں کے ساتھ کتب خانوں کا قیام بھی ضروری قرار دیا گیا۔

مسلمان بادشاہوں اور امیروں کے کتب خانے کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر تھے ہر شخص یہ کوشش کرتا تھا کہ اس کے کتب خانے میں ایسی نادر کتابیں جمع ہو جائیں کہ دوسرے کتب خانوں میں اُن کی نظیر نہ مل سکے! اگر مسلمانوں کو علم و فن کی ترویج اور کتابوں کی جمع و تدوین کا اتنا شوق نہ ہوتا تو یونان کا علمی ذخیرہ کبھی کا برباد ہو گیا ہوتا اور مشہور فلسفیوں کے افکار و اقوال کا شاید ایک ورق بھی نہ مل سکتا۔

خلیفہ منصور نے اپنے عہدِ حکومت میں ہندوستان سے پنڈتوں کو بلایا اور سنسکرت کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا، ان کتابوں میں زنگل، مدی، ذکیسل اور برآہمہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ایک طرف تو عربی ادب میں الف لیلہ و لیلہ جیسی کتاب پائی جاتی ہے جو اُس زمانہ کے انسانی رجحانات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے اور جس کا ترجمہ یورپ کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے —— دوسری طرف مسلمانوں کے پیش کئے ہوئے ادب میں گلستان بوستان جیسی بلند پایہ اخلاقی کتابیں ملتی ہیں جن کی اور جن کی تازگی آج تک قائم ہے —— ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ "چیستان" بن کر رہ جاتا اگر اُسے فارابی، ابن سینا اور ابن رشد جیسے باکمال شارحین میسر نہ آتے اور حقیقت تو یہ ہے ان فلسفیوں سے ہر ایک خود اپنے وقت کا ارسطو اور افلاطون تھا۔

تاریخ کو "فن" کس نے بنایا؟ اور اُسے سائنٹفک طرز پر کس نے مدون کیا! ابن خلدون نے جس کے احسان کو کوئی مورخ بھلا نہیں سکتا! —— علم ہیئت کو مسلمانوں ہی نے ترقی دی اور اس عمارت کی خشتِ اوّل "المجسطی" کا عربی زبان میں پہلا ترجمہ ہے! کواکب و نجوم اور مہر و مہ کی گردش جانچنے کے لئے مسلمان بادشاہوں نے بڑی بڑی رصدگاہیں قائم کیں! خاص طور سے قرطبہ، اشبیلیہ اور قاہرہ علم ہیئت کے مراکز مانے گئے!

کوئی شک نہیں کہ ریاضی کا صفر (ZERO) بھارت ورش کی متاع گراں بہا ہے مگر مسلمانوں نے اسے یورپ سے منتقل کیا۔ —— "الجبرا" نام ہی پکار رہا ہے کہ یہ "عربی نژاد" ہوں —— یہ جو آج کل کی گھڑیوں پر گنتی کی لکھاوٹ ([illegible]) پائی جاتی ہے اس کے موجد مسلمان عرب ہی ہیں اس کو آج بھی "Arabic Numeral" کہتے ہیں۔

یورپ پر ایک وہ دورِ جاہلیت بھی گزرا ہے کہ کلیسا نے ذیان کے ذریعہ مریضوں کے علاج معالجہ کو ممنوع قرار دیدیا تھا بس سارا دارومدار جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں پر تھا یا پھر "نیم حکیم خطرۂ جان" جیسے طبیب اور عطائی حکیم پائے جاتے تھے، اُس وقت مسلمانوں

میں بو علی سینا اور رازی جیسے یگانۂ روزگار طبیب پیدا ہوئے جنہوں نے ادویہ کے خواص اور علم العلاج پر کتابیں لکھیں اور یونانی طب کو از سرِ نو زندگی بخشی! مسلمان طبیبوں نے "علم ابدان" پر بھی خاص توجہ کی، اور علم الجراحت میں بڑی دیدہ وری سے کام لیا، اس کے علاوہ "ANNESTHETIC" کا استعمال بھی وہ جانتے تھے!

مسلمان حکومتوں کے قائم کئے ہوئے شفاخانے مریضوں کے آرام و آسائش کے لحاظ سے شاید آج کے شفاخانوں سے بھی بعض باتوں میں بڑھ چڑھ کر تھے، عام مریضوں کو پرندوں کا شوربہ اور یخنی تک دی جاتی تھی اور جب مریض اچھا ہو کر شفاخانہ سے جانے لگتا تھا تو اُسے کچھ رقم بھی ملتی تھی تاکہ وہ اپنے گھر جا کر اچھا کھا سکے اور معاش کی فکر اُسے پھر سے بیمار نہ ڈال دے۔

علم کیمیا (Chemistry) کی تخلیق و احیاء میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ ہے! عربوں نے بھاپ کے ذریعہ عرق کشید کیا اور رنگ بنانے کی ترکیب معلوم کی! انہوں نے الکحل، سوڈیم نائٹریٹ، سلفر، پوٹاشیم اور نائٹرک ایسڈ کا بھی پتہ لگایا، گندھک، تیزاب اور شورہ بھی مسلمانوں کی دماغی کاوشوں کے نتائج ہیں ـــــــ جابر کو یورپ نے "بابائے علم کیمیا" (Father of Chemistry) تسلیم کیا اور حقیقت میں وہ تھا بھی اسی لقب کا مستحق!

آج کا دور مشینی دور ہے مگر اس فن کی بنیاد مسلمان صدیوں سال قبل ڈال چکے تھے، گھڑی اور اُس کا پنڈولم مسلمانوں کی ایجاد ہے، مسلمانوں کی بنائی ہوئی گھڑی میں گھنٹہ کا پتہ لگتا تھا، منٹ اور سیکنڈ کا نہیں! مسلمانوں نے ایک قطب نما کمپاس بھی بنایا تھا جس کے ذریعہ بحری سفر میں جہازوں کی سمت معلوم ہوتی تھی۔

فن کاغذ سازی کے سب سے پہلے موجد چینی ہیں لیکن یورپ میں یہ فن مسلمانوں کے ذریعہ سے آیا ـــــــ دستکاری کی بہت سی صنعتوں (رنگ سازی، نقاشی، دھات کے برتنوں اور زیوروں پر مینا کاری) کو مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ ترقی دی بلکہ اُن میں طرح طرح کی ایجادیں اور اضافے کئے!

مسٹر ووڈن کریمر لکھتے ہیں:-

> "مسلمانوں کے ابتدائی دور کا عربی جہاز عیسائی ممالک کے لئے نمونہ بنا، جس کی مدد سے عیسائی ممالک نے جہاز بنانا سیکھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جنوبی یورپ میں جہازرانی کے بعض محاورے جو آج بھی استعمال ہوتے ہیں عربی زبان کے ہیں۔"

موسیٰ ابن نصیر نے بحری فوج کی باقاعدہ تنظیم کی اور جہاز بنانے کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم کیا، جہازرانی میں مسلمان عرب ہی یورپ کے اُستاد ہیں!

یہ مضمون اس لئے نہیں لکھا گیا ہے کہ مسلمانوں میں "پدرم سلطان بود" کا نشہ اور تیز ہو جائے، یہ حقیقت میں عبرت کے ورق ہیں کہ ہمارے اسلاف تمدن و تہذیب، ایجاد و اختراع اور علم و فن کے امام تھے اور ہم "طفلِ مکتب" بھی نہیں رہے! اس غفلت کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑ رہا ہے! قانونِ قدرت مسلم اور کافر کی محنت اور عرق ریزی میں کوئی امتیاز نہیں کرتا! جو محنت کرے گا مقصد کو حاصل کرے گا!

ضرورت ہے کہ مسلمان جو "خیر امم" سے تعلق رکھتے ہیں اور دُنیا کی سیادت اور امامت کے حقدار ہیں تسخیر کائنات کا فرض انجام دیکر دُنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں! یورپ نے فساد پھیلانے اور اپنی ہوس کاری کیلئے کائنات کو مسخر کیا ہے، اہلِ ایمان اس سے امن و اخلاق اور پاکیزگی و نیکوکاری کی اشاعت کا کام لیں!

ڈاکٹر محمد افضال حسین قاضی
(ایم اے، پی ایچ، ڈی)

تعلیم میں اِسلامی رنگ.....!

تعلیم میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم کا مقصد، تعلیم کا مواد، تعلیم کا طریق کار سب کے سب اُس کے لئے مناسب اور موزوں ہوں ——— تعلیم کے مقصد کا تعین ایک ایسی لازمی شے ہے جس کے بغیر کوئی تعلیم بارآور نہیں ہو سکتی اور موجودہ دورِ تعلیم کا سارا نقص یہی ہے کہ اُنیسویں صدی میں تعلیم کا صحیح مقصد متعین نہیں کیا گیا اور نہ تعلیم کو اُس کے مناسب اور مفید بنایا گیا، تعلیم کا مقصد حقیقت میں وہی ہے جو زندگی کا مقصد ہے اور چونکہ مغرب کی گزشتہ صدی اپنا اصل مقصود دریافت نہ کر سکی لہذا ساری دُنیا کی نئی تعلیم بے مقصد رہی اور اس کی وجہ سے زندگی اور تعلیم کے درمیان ایک طرح اجنبیت اور مغائرت پیدا ہو گئی ہے! اسی کے سبب ہمارا ادب، ہمارا فن، فلسفہ، ہماری سائنس نہ صرف یہ کہ زندگی سے غیر مربوط ہیں بلکہ ایک دوسرے سے اجنبی بھی ہیں!

تعلیم میں مقصد کی کمی کو دور کرنے کے لئے روس کے اشتراکی طریقۂ تعلیم نے اور جرمنی کے نازی اصولِ تعلیم نے ایک خاص کوشش کی جس سے متاثر ہو کر جمہوری نظامِ تعلیم والوں نے بھی تعلیم کا ایک مقصد متعین کرنے کی طرف قدم بڑھایا، چنانچہ برطانیہ میں ناروڈ رپورٹ (۱۹۴۱) میں اس کا اظہار کیا گیا کہ "تعلیم نیکی اور جمالیاتی مقاصد کی ابدی اور عالمگیر کارفرمائی کے ماننے پر مجبور ہے، یہ اقدار بیشتر لوگوں کے لئے مذہب سے حاصل ہوتی ہیں جن کو عیسائیوں کے لئے مسیحیت نے متعین کر دیا ہے ——— ان خیالات کا اعادہ ۱۹۴۳ء میں سر چارلس گرانٹ رابرٹس نے کیا ہے اُن کا بیان ہے کہ صرف وہی علم ترقی پانے کا حق رکھتا ہے جس کے روابط اور تاثرات دوسرے علوم سے معلوم ہوں اور جس کا مجموعی مواد ہماری تہذیب کے مقاصد سے مربوط کر دیا گیا ہو اور جو ہماری زندگی کی روحانی تعبیر کو پورا کرنے کی کوشش کر سکے!

اسلام نے بھی علم اور علماء کی رہنمائی مقاصد کے ذریعہ کی ہے چنانچہ ہر صحیح اہلِ علم کی تعریف کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ وہ لوگ تخلیقِ کائنات پر غور و فکر کرتے ہیں اور پھر اپنے نتائج کو زندگی اور کائنات کے مقصد پر منطبق کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ یہ زندگی اور کائنات بے مقصد، باطل یا بے حقیقت نہیں! وہ علم جو اسلام نے فرض قرار دیا ہے اُس کی تشریح امام غزالیؒ نے علم معاملہ کے نام سے کی ہے یعنی وہ علم جس میں اعتقاد ——— کرنا اور نہ کرنا شامل ہوں ——— چنانچہ ظاہر ہے کہ علم کو زندگی سے ربط دینے کی ضرورت اسلام نے پوری طرح واضح کر دی ہے اور اُس کا مقصد بھی بتا دیا ہے!

دوسرا سوال موادِ تعلیم کا ہے، افسوس ہے کہ نئے نئے طریقہائے تعلیم کی تلاش و تجسس نے گزشتہ صدی کے بیشتر ماہرین تعلیم کو موادِ تعلیم پر اصرار کرنے سے باز رکھا، چنانچہ روسو، پسٹالوزی، اور فروبل نے طریقۂ تعلیم پر جتنا زور دیا، اتنی موادِ تعلیم پر توجہ مبذول نہیں کرائی، غالباً اس سلسلہ میں ہربرٹ اسپنسر نے سب سے زیادہ موادِ تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا، اس نے یہ بات

بیان کی کہ تعلیم ساری زندگی کے لئے ایک تیاری ہے اور اس نے علوم کی اقسام زندگی کو سامنے رکھ کر مرتب کیں۔ علماء اسلام امام غزالیؒ نے علوم کی اقسام زندگی اور دیگر علوم کے ربط و ضبط کی نسبت سے مرتب کی ہیں ——— انہوں نے ان علوم کے علاوہ جو انبیاء کرام سے حاصل ہوتے ہیں دوسرے علوم کی قسمیں بھی بیان فرمائی ہیں اور ان کا زندگی پر اثر واضح کیا ہے، چنانچہ طب اور فلسفہ (جس میں اس دور کے علماء سائنس کو بھی شامل کرتے تھے) فرض کفایہ قرار دیتے ہیں یعنی جن کی ترقی اور تحصیل سوسائٹی پر فرض ہے، انہوں نے حساب یا ریاضی کے دقائق یا لیسرنج کو بہتر اور مفید قرار دیا ہے اور زبان کو علوم کا مقدمہ یا آلۂ کار بتایا ہے۔ علوم شرعی میں اُن کے نزدیک قرآن، حدیث، اجماع اور آثار صحابہ وغیرہ شامل ہیں۔

گزشتہ تین سو سال سے ہمارے قومی تعلیم کے نظام میں صرف علوم شرعی شامل رہے، یوں علماء نے اپنی جگہ منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ میں کافی نظر پیدا کی مگر عام قومی نظام صرف زبان اور علوم شرعی کے سطحی اسباق اور سرسری تعلیم تک محدود رہا، اس کے نتیجہ میں موادِ تعلیم زندگی سے غیر مربوط ہوگیا اسی کی وجہ ہے پرانی تعلیم کے ادارے نئے فلسفہ، نئی سائنس اور نئے ادبی محرکات سے دور رہے اور نئی تعلیم مذہب، روحانیت، قرآن اور سیرت سے قطعاً اجنبی رہی!

صحیح تعلیم کے لئے یہ ضروری ہے کہ جہاں وہ زندگی کے مادی مسائل و مراحل سے مربوط ہو وہاں وہ زندگی روحانی اور اعلیٰ حقیقی مسائل و مقاصد کے علوم سے بھی آراستہ کی جائے نئے موادِ تعلیم کی ترتیب ایک بڑا اور وضاحت طلب مسئلہ ہے، میرے خیال میں اس مسئلہ کی اہمیت گزشتہ صدیوں میں جدید اور قدیم طرز تعلیم میں برابر نظر انداز کی گئی ہے، جس کے نتیجہ میں دونوں اقسام تعلیم میں ایک بنیادی نقص واقع ہوگیا۔

حکماء یونان اور اُس کے بعد حکماء اسلام نے تعلیم کے ضروری اجزاء میں الٰہیات یا دینی تعلیم کے ساتھ فلسفہ کو لازم قرار دیا تھا جس کی بابت میں بھی امام غزالیؒ کا بیان پیش کر چکا ہوں اُن کے نزدیک فلسفہ کی تعلیم فرض کفایہ یا سوشل فریضہ ہے!

فلسفہ اپنے اوّلین دور میں ان تمام علوم کا حامل اور ترجمان تھا جن میں آجکل سوشل، طبعی اور قدرتی سائنس کا شمار ہوتا ہے، اور بدقسمتی سے تین سو سال سے سائنس بطور ایک جداگانہ علم بلکہ اسلوب علم کے ترقی پانے لگی ہے، اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ دست مشاہدات اور تجربات کے آلات مثلاً خوردبین، دوربین، بجلی، مقناطیسی شعاع اور ریڈیائی حرکت نے ایک سربمہر اور وسیع منظر انسان کے سامنے کھول دیا جس کی جانب راست حسی تجربہ اور تحقیق کی ضرورت تھی اور دوسرے یہ کہ بدقسمتی سے اس دور کے ابتدا ہی سے مذہب اور سائنس کا اختلاف شروع ہوگیا، چنانچہ تین سو سال سے سائنس اور جماعتی علوم مثلاً معاشیات، ادب، الٰہیات اور مذہب نہ صرف علیحدہ علیحدہ ہوگئے بلکہ اُن کے اسالیب بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں!

رسل، میکڈوگل، وائٹ ہیڈ، ہیچ، جی ویلز وغیرہ نے مختلف سائنسوں مثلاً ریاضی، نیچرل سائنس اور طبعی سائنس کو دیگر علوم اجتماعی سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے ——— بہرحال علوم کی بنیادی وحدت اور فلسفہ کو جملہ علوم یا اسالیب علم سے مربوط کرنے کی ضرورت واضح ہو چکی ہے چنانچہ ہمیں اس امر کی ناگزیر ضرورت ہے کہ نہ صرف نیا فلسفہ بلکہ نیا موادِ تعلیم بھی علوم کے تنوع کا حامل نہ ہو بلکہ اس میں مختلف اسالیب (DISCRIPTION) اور طریقۂ نئے تعلیم (Meaning) کا باہم دگر امتزاج ہو، اگر ہم اس مقصد کو حاصل کرسکے تو موجودہ علم جس میں علم ادیان اور علم ابدان دونوں شامل ہوں حاصل ہو سکے گا اور حق کی معرفت جس کے لئے مخلوق کی معرفت پر غور کرنے کے لئے ہمیں راغب اور متوجہ کیا گیا ہے حاصل ہوسکے گی!

ہمیں تعلیم کو اسلامی رنگ دینے کے سلسلہ میں طریقۂ تعلیم کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ہمارا قدیم طریقۂ تعلیم جس کا محور عالم دین

اور جس کی فضا مسجد و خانقاہ تھی بد قسمتی سے بالکل ترک کر دیا گیا، اب ہماری دینی تعلیم میں صرف نصاب پُرانا رہ گیا ہے جس میں علوم دینی کے علاوہ یونانی فلسفہ اور دوسرے پُرانے علوم طبعی ریاضی، ہیئت وغیرہ شامل ہیں ——— نئی تعلیم میں اُستاد کی حیثیت بہت معمولی ہے، نیا مدرسہ... ایک محدود اور بے فیض سا ادارہ ہے اور نئے طریقہ تعلیم میں علوم اور اُن کے اسالیب اور طریقہ ہائے تحصیل کا ایک مسلسل تصادم موجود ہے اور ہماری ساری کی ساری نئی تعلیم کسی یقین اور مقصد سے ہم آہنگ نہیں چنانچہ ہمیں اپنے اساتذہ کی تربیت مدرسہ کی فضا، تعلیم کا طریقہ، تربیت کے اُصول اسلام کے متعین کردہ مقصد حیات، اس کے نظامِ اخلاق اور اُس کے بنائے ہوئے طرز فکر سے ہم آہنگ کرنے ہیں، اس اُصول کے پیش نظر ہمارے لئے لازم ہے کہ تعلیم کا مقصد فرد و جماعت کی روحانی اور اخلاقی سربلندی قرار دیں، اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں سارا موادِ تعلیم اور طریقہ تعلیم بدلنا ہوگا، اس تعلیم کا مفہوم یہی نہیں ہوگا کہ ہم صرف علوم دینیہ اور پُرانی الٰہیات کو پڑھیں بلکہ ہم مذہب، سائنس، معاشیات، ادب اور فلسفہ کا ایک ایسا نظام بنائیں گے جس میں ہمارے روحانی اور اخلاقی مقاصد کے حصول کے لئے موجودہ مادی علوم کی تعلیم مفید مطلب ثابت ہوگی اور ہماری صحیح روحانی اور اخلاقی ترقی کے نتیجہ میں لازمی طور پر مادی اور دُنیادی ترقی رونما اور حاصل ہوگی۔

اب یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے لئے بلکہ دُنیا بھر کے لئے یہ بات ناگزیر ہو گئی ہے کہ علم کی بنیاد روحانی قدروں پر رکھی جائے ورنہ علم کا رُخ مردم کشی کی طرف پھر جانا ناگزیر ہے!

ان اصول کے بیان کرنے کے بعد ان کو عملی طور پر برتنے کا رُلانے کا سوال ہے، کیونکہ اصول جب تک عملی طور پر برتے نہ جائیں ان سے کاربرآری نہیں ہوتی، اس ضمن میں دو مختصر تجاویز ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:—

۱— تعلیم دینے کا مفہوم صرف درسیات کے پڑھانے کا نہ پہلے تھا اور نہ اب ہونا چاہیئے، بد قسمتی سے ہمارے ملک میں حکومت یا تعلیمی ادارے ہمیں تک محدود رہ جاتے ہیں لیکن تعلیم بالخصوص اس دور اجتماعیات میں ساری زندگی اور سارے وجود یعنی قلب، ذہن اور نفس کی تربیت پر مشتمل ہونی چاہیئے۔

مُسلمانوں کا خاص طرز زندگی تو اس پر مجبور کرتا ہے کہ ہر فرد کی تربیت ہر شعبہ حیات اور ہر ایک نفسیاتی اور طبعی میلان میں جاری ساری ہونی چاہیئے یعنی مسلمان بچہ کے اخلاق، جذباتی اور عقلی تصورات، محرکات بلکہ ذہنی انداز (Attitude) بھی تربیت پذیر ہونے چاہئیں! ہر موجودہ آئیڈیولاجیکل نظام اجتماعیت مثلاً اشتراکیت، فسطائیت اور شہنشاہیت نے تو اس اصول پر عمل پیرائی ابتدا ہی سے شروع کر دی تھی، جمہوری نظام والوں نے ایک نام نہاد انفرادی آزادی کے نام پر ساری ترتیب ہی کو منتق مقصد پر قایم رکھا یہاں تک کہ خود جمہوریت بلکہ انسانیت کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی! چنانچہ اب یہ ناگزیر ہے کہ جو اصول زندگی بھی قائم رکھنا ہے اُس کے نمونے تو ضروری پیش کرنے اور باقی رکھنے چاہئیں ——— الغرض یہ کہ مسلمان بچہ کی تربیت جس میں سیرت، کردار، ذہنی تصورات، جذبات اور اُمنگیں شامل ہیں ایک خاص روحانی اور اخلاقی انداز پر ہونی چاہیئے!

دوسرا بڑا مسئلہ اُستاد کا ہے، اُستاد نہ صرف علم کا اُستاد ہے بلکہ ساری زندگی کا مُرتب اور ذمہ دار ہے ——— اور اتنا ہی نہیں کہ صرف نظام تعلیم ہی اُستاد کے گرد گھومتا ہے بلکہ حقیقت میں ہر قوم کا سارا نظام اجتماعیات صرف اُستاد پر منحصر ہے، پاکستان میں اُستاد کی اور بھی خاص اہمیت ہے ...... اس لئے ہمیں اساتذہ کو ثانوی کے شروع ہی سے منتخب کر کے ان کی خاص فنی اور جماعتی تربیت شروع کر دینی چاہیئے یہ کوئی دشوار چیز نہیں...... ہمیں کم سے کم دو کروڑ بچوں کی لازمی تعلیم کا انتظام کرنا ہے اور اُن کے لئے کئی لاکھ اساتذہ درکار ہیں ——— چنانچہ اساتذہ کے لئے ایک خاص نظامِ تعلیم و تربیت ترتیب دے کر اُن کی ٹریننگ کا انتظام ابتدا ہی سے ضروری ہے!

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں
(ایم-اے، پی ایچ، ڈی)

ادب اور دین

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث عرصے سے چلی آرہی ہے اور دونوں
نظریے اپنے اپنے دلائل کے ساتھ اپنی اپنی جگہ قائم ہیں بلکہ جو لوگ ادب برائے ادب کے قائل ہیں وہ بھی اپنے نظریے کی
حمایت میں ہر ادبی شہ پارے کو اُس کے مصنف یا اُس کے عہد کی زندگی کا آئینہ دار سمجھتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے۔ کیونکہ
زندگی کی قدریں ہمیشہ بدلتی رہی ہیں۔ جو چیز آج ہماری زندگی کے لئے مفید ہے وہ کل مفید نہ تھی اور جو کام کل ہمارے لئے
ضروری تھا وہ آج ضروری نہیں ہے۔ ایام جاہلیت میں عربوں کا جو ادب تھا وہ بھی اُن کی زندگی کا آئینہ دار تھا اور آج جو
ادب ہے وہ بھی زندگی سے متاثر ہے۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ "الشعر دیوان العرب" یعنی عرب کی شاعری ہیں وہاں
کا پورا دفتر نظر آتا ہے۔ وہاں کی تاریخ، جغرافیہ، معاشرت، خیالات و جذبات وغیرہ سب کا دفتر اس میں موجود ہے۔ عربوں
کی زندگی جس قسم کی تھی وہ اُن کے ادب میں کہاں نہیں ہے؟ رزم و بزم اور مدح و ذم کے جذبات کے علاوہ بہادری و بلند
حوصلگی، عزم و ارادہ، اخلاق و کردار وغیرہ کی اعلیٰ قدریں بھی اُن کی شاعری میں موجود ہیں۔ وہ زندگی کے لئے لکھتے تھے یا زندگی خود بخود
اُن کی تحریر میں آجاتی تھی یہ الگ سوال ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص غایت یا مقصد کے لئے لکھتے تھے یا محض
اپنے جذبات کی ترجمانی کر دیتے تھے؟ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے حقیقی جذبات بیان کئے ہیں، جو دیکھا ہے وہ لکھا ہے اور جس طرح
ضروری ہے ویسی ہی سنائی ہے۔ اُن کی زندگی اُنھی حقائق کی آئینہ دار تھی جو اُن کی شاعری میں موجود ہیں۔ پھر عہد عباسیہ میں جب عجمیت نے زور پکڑا تو حقیقت
پر تصنع اور تکلف کا غلبہ ہوا۔ لیکن اس زمانے کی زندگی کا جو کچھ اقتضاء تھا اُس کے لحاظ سے وہ شاعری بھی ادب برائے زندگی
کی حدود میں داخل سمجھی جائے گی۔ رودکی کے اشعار جو امیر نصر بن احمد کو بخارا جانے پر مجبور کر سکتے تھے اور

ع بوئے جوئے مولیاں آید ہمی

کے نغموں سے عزم و ارادے کے جذبات پیدا کر سکتے تھے تو وہ بھی کسی مقصد کے لئے کہے گئے تھے۔ اسی لئے نظامی عروضی نے
کہا ہے "شاعری صناعتے ست کہ ... ... امور عظام را در نظام عالم سبب شود۔" چناں چہ "امور عظام" کے لئے

ے "زندگی" سے ڈاکٹر صاحب کی غالباً یہاں یہ مراد ہے کہ زندگی کی مادی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں، مثلاً شہروں میں جہاں بجلی کی روشنی
آسانی سے مل سکتی ہے وہاں مٹی کے چراغ جلانے کی کون زحمت اٹھائے گا۔ ریلوں، موٹروں، لاریوں اور ہوائی جہازوں نے "گھوڑے"
کی اب اتنی اہمیت باقی نہیں رکھی جتنی اب سے دو سو سال قبل تھی ــــــ مگر جہاں تک زندگی کی اخلاقی قدروں کا تعلق ہے وہ دائمی
ہیں اور تغیر نا آشنا۔ سچائی، عصمت، پاکبازی، ایفاء عہد، سخاوت، عدل ... یہ وہ چند اخلاقی قدریں ہیں جو ہر دور میں ایک ہی اہمیت
رکھتی ہیں ــــــ یہ انسانوں کی اپنی کمزوری اور غلط اندیشی ہے جو وہ ان اخلاقی قدروں کو بدلتا ہوا محسوس کرتے ہیں مگر واقعتاً ایسا نہیں ہے!
اگر کوئی بیمار جس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو شہد میں تلخی محسوس کرتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شہد میں تلخی آگئی ہے بلکہ یہ اس مرد بیمار کے ذائقہ کا قصور ہے!
(م-ق)

اگر شاعری کی جائے تو وہ شاعری کیوں کر محض برائے ادب کہی جا سکتی ہے؟ - لیکن زندگی کی اقدار بدلتی رہتی ہیں اور کبھی یہ نام نیک کے لئے بھی واقف ہو جاتا ہے جیسا کہ راوندی نے راحت الصدور کے مقدمے میں کہا ہے کہ "بہ ہر دورے نام نیک از آں کس باز ماند کہ عدل ورزید و مجالست و موانست و مخالطت نیکاں گزید و باشعراء و ندمائے فاضل نشست کہ ذکر باقی و صیت سائر از ایشاں باز ماند" - اسی طرح محمد عوفی نے "لباب الالباب" کے باب دوم میں کہا ہے کہ "شعر را معنی علم است یعنی دانش یعنی دانستن کہ ارباب فطنت بداں چیزے فہم کنند و ادراک ایں طبقہ بداں محیط شود و معنی شاعر عالم بود یعنی داناکہ معانی دقیق را ادراک کند و معنی دقیق آں کہ فکرت او در زیر پردۂ ضمیر، خیال بازیہائے لطیف نماید و علم عمومی دارد و شعر خصوصی . . . ." لیکن یہی محمد عوفی آگے چل کر کہتا ہے کہ "پس شعر شریف ترین انواع فضل آمد خود از راہ معنی گوئی آب حیات است کہ بعد از فوات ذات، سبب بقائے اسم است . . . ." بہر حال یہ تمام ادب کسی نہ کسی غایت کے لئے تھا اور رشید الدین وطواط کی حدائق السحر اور شمس الدین رازی کی المعجم فی معائیر اشعار العجم بھی باوجود ادب برائے ادب ہونے کے ادب برائے حیات بھی بنا دی گئی تھیں۔ یہی حال ادب کے دوسرے اصناف کا ہے۔ قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، بلکہ ہزل اور ہجو بھی برائے زندگی لکھی گئی ہے اور تمام اصناف میں حیات کے لئے کوئی نہ کوئی غایت اور مقصد موجود ہے —— یہ اور بات ہے کہ یہی مقصد کبھی ذریعہ اور کبھی سبب بن جاتا ہے۔ پھر مقصد بھی ایک مقصد بن کر رہ جاتا ہے —— لیکن اب مارکس اور لینن کے نظریے کے مطابق ادب کو زندگی کی طرح ایک جدلیاتی اور نامیاتی حقیقت مانتے ہوئے اُسے زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے - اور مختلف اہل قلم اپنی تنقید، شاعری، افسانے اور ڈرامے اسی نظریے کے مطابق پیش کر رہے ہیں —— فرائڈ کی Psychoanalysis میں حقیقت نگاری کے ایک ایسے تصور سے درک پیدا کرنے کی کوشش ہے جو ہمارے نزدیک ناقص ہے۔ اسی لئے محض روحانی اور جنسی بے باکی میں زندگی کے حقائق نظر آتے ہیں اور زندگی محض حیوانی اور شہوانی اخلاق سے متعلق ہو جاتی ہے - لیکن ہمارا مقصد[1] یہ نہیں ہے کہ ہم اُن پر اعتراض کریں اور انھیں بُرا بھلا کہیں بلکہ ایسے تصورات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن بقول میر کے :-

ع ۔ شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں

ہم اگر موجودہ سماجی بندشوں اور معاشرتی قیود سے ہٹ کر کسی نئے نظام کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو اُس کی خوبیوں کو اخذ کرنا اور اُن کو اپنے ادب اور اپنی زندگی میں داخل کرنا بُرا نہیں ہے۔ بلکہ مفید ہے - دقیانوسی خیالات (جن کی کوئی اصل نہ ہو) یا جہالت اور اوہام پرستی کس کو پسند ہے اور کون پسند کرے گا؟ ترقی پسند مصنف اگر روشن خیال ادیب اور فن کار بننا چاہتا ہے تو اُسے کون بُرا کہے گا؟ بے جا قسم کی سرمایہ داری اور ملوکیت کے خلاف ہمارے ادیب اگر لکھتے ہیں تو انھیں کب سراہا نہیں جاتا؟ - لیکن عرض کرنا صرف یہ ہے کہ بے راہ روی اور حقیقت نگاری کے ناقص تصور سے فرائڈ کے سامنے سجدہ کرنا یا لینن کی اُمت میں داخل ہونا زندگی نہیں ہے۔ ترقی پسند مصنفین نے اب بہت کچھ سنبھلنے کی اُمید ظاہر کی ہے۔ سیاسی شوریدہ سری اور انقطاع نے انھیں بہت کچھ سبق دیا ہے۔ اب وہ حکومت یا معاشرے سے متصادم نہیں ہونا چاہتے اس لئے اپنے منشور میں یوں بھی فرماتے ہیں کہ "ترقی پسند ادب کی تحریک، ہمارے ماضی کے ادب کی بہترین روایات کا ایک تسلسل ہے جو اس زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو گیا ہے"

---

[1] مگر ایک وہ ناقد جو اخلاقی قدروں کی اہمیت محسوس کرتا ہو وہ اس قسم کے ادب پر جو بد اخلاقی اور فحاشی کی ترجمانی کرتا ہے، ضرور تنقید کرے گا - (م - ق)

اسی لئے انھوں نے اب یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ہر وہ شخص جو ادب کی حیات افروز اقدار کا قائل ہے ہماری انجمن کا ممبر بن سکتا ہے۔ چناں چہ سرسید اور حالی کی کوششوں کو خاص طور پر سراہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی زندگی اور اُس کے تقاضوں کی ترجمانی کی اور اپنے عقائد اور خیالات کے مطابق اُس زندگی کو بہتر صورت میں دیکھنے کی کوشش کی۔

آج کل کی شاعری میں رجعیت، فطرت پرستی، سماجی اصلاح، سیاسی حقوق، جمہوریت، اشتمالیت وغیرہ پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں اگر دوسروں کے سکھائے ہوئے نظریے کے مطابق بیان کی جائیں اور اپنے ماحول کی ضرورت پر نظر نہ رکھی جائے تو بیکار ثابت ہوکر رہ جائیں گی۔ لیکن یہی چیزیں اگر ہم اپنی زندگی کے تقاضوں کے مطابق پیش کریں تاکہ اُن پر عمل بھی ہوسکے تو انھیں کون برا کہے گا؟ معاشی مساوات کون نہیں چاہتا؟ روٹی کون نہیں کھاتا؟ خانہ آبادی کس کو ناپسند ہے؟ لیکن ہمارے یہاں نسبتیں کی قدار مختلف ہیں۔ ہم لینن اور فرائڈ کی اُمت میں داخل ہونے پر فخر محسوس نہیں کرتے۔ کیوں کہ ہمارے نزدیک قول سے زیادہ فعل کی وقعت ہے۔ نظریے سے زیادہ نظر کی تلاش ہے اور بصارت سے زیادہ بصیرت اہم ہے۔ ہمارے نزدیک ٹالسٹائی، رسکن اور شیکسپیر کا وہ ادب جو نیکی اور صداقت کا آئینہ دار ہے ہمارے لئے نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے ہمیں دوسرے سے اچھی باتیں سیکھنے میں گریز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہم دوسروں کی فکر سے بھی متاثر ہونا بُرا نہیں سمجھتے لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ افلاطون، لاک، ہیوم، شوپہار وغیرہ کی زندگی اور عمل کو اپنے لئے نمونہ سمجھیں۔

پاکستان بننے سے پہلے ہم نے کیا کیا نعرے لگائے؟ کیسی کیسی قربانیاں دیں؟ مشرقی پنجاب، بہار اور سی پی میں مسلمانوں نے کیا کیا مصیبتیں اُٹھائیں؟ یہ سب باتیں تاریخ میں یا سفینوں سے زیادہ سینوں میں محفوظ ہیں۔ تاہم اس بات سے کس کو انکار ہے کہ پوری قوم ایک اسلامی حکومت کا مطالبہ کر رہی تھی جس کے لئے دعوے یہی تھے کہ ہماری فکر، ہماری تہذیب، ہمارا لباس، ہمارا کردار اور ہمارا معاشرہ بالکل الگ ہے۔ اور ہم اسی کے لئے ایک علٰحدہ حکومت اور مملکت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ واقعی یہ مطالبہ بہت مبارک تھا۔ ہمارے ادباء اور شعراء "انقلاب، جمہوریت، معاشی و معاشرتی اصلاح، سیاسی حقوق، عمل، اتحاد وغیرہ کے نغمے الاپ رہے تھے، غریب اور مزدور کی حمایت کر رہے تھے، معاشی اور سیاسی بُرائیوں پر کڑی تنقید کر رہے تھے لیکن جونہی پاکستان بنا اور کفر و باطل کی تلوار کے سایے سے ہٹے، اُسی وقت ہم نے اپنے اُن مطالبات کو خیرباد کہہ دیا۔ اب ہم دین کو اُسی معنی میں سمجھنا چاہتے ہیں جس معنی میں بعض انگریزی اخبار سمجھتے یا سمجھاتے ہیں۔ یا بعض انگریزی داں طبقے جس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب ہم دین اور قرآن کو وہی معنی دیتے ہیں جو ہمارے مقصد کے مطابق ہوتے ہیں قرآن کے صریح احکامات میں نئی تاویل پیدا کردیتے ہیں اور حدیث کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتے۔ یعنی بقول اقبال کے

ع خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اگر قرآن اور اسلام پر عمل کرنا رجعت پسندی یا دقیانوسیت ہے تو کوئی اس سے بہتر اور مکمل نظامِ زندگی پیش کیا جائے۔ کوئی ایسا ادب پیش کیا جائے جو اسلامی ادب کے مقابلے میں زندگی سے زیادہ قریب ہو۔ زندگی کے ہر موڑ پر وہ رہبری کرسکے اور شمع ہدایت کا کام دے سکے۔ تاہم اسلامی روایات پر عمل کرنے اور عمل کرانے والے حضرات کو بھی اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھنا چاہیے اور اپنی زندگی اور ادب کو بطور نمونے کے پیش کرنا چاہیئے۔ بات ذرا کڑوی ہے لیکن کہنے کو جی چاہتا ہے یعنی یہ کہ ہمارے بعض بڑے بڑے علماء جو اتحاد، اخوت اور محبت کی تعلیم دیتے ہیں وہ خود کبھی متحد ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ چناں چہ اُن کے آپس کے اختلافات کا لوگوں پر اچھا اثر نہیں پڑتا اور "اسوۂ حسنہ" کی پابندی نہ ہونے سے اچھے

نتائج مرتب نہیں ہوتے۔ اسی لئے لوگوں میں دین سے بیزاری پیدا ہوتی جارہی ہے۔ تاہم ہماری جماعتوں میں ایسے لوگ زیادہ ہیں جو دین سے کم واقف ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو محض فیشن کی خاطر اسلام سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ کیوں کہ آج کل قابلیت کے اظہار کے لئے یہ بات ضروری سمجھی جاتی ہے کہ اپنے ہم چشموں میں کسی قابل آدمی کو برا کہا جائے اور اگر خود کو اور بھی زیادہ قابل ظاہر کرنا ہے تو اسلام اور خدا پر اعتراضات کیے جائیں۔ چناں چہ اسلام اور اسلامی ادب پر اعتراضات کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو خود کو مغرب زدہ ظاہر تو کرتے ہیں لیکن مغربی ادب بلکہ انگریزی سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔ چناں چہ اپنے تجربے کی بنا پر عرض کیا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ درجوں کے اکثر وہ طلبہ جو ہر روز اپنے چہرے کو رگڑ رگڑ کر "آب دار" بناتے ہیں اور وہ طالبات جو ہر روز نیا لباس پہننا زیبائش سے زیادہ اہم سمجھتی ہیں صحیح انگریزی میں ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتیں۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے ضرور ہیں جو مغربی علوم اور مغربی ادب سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اُس میں مہارت بھی رکھتے ہیں۔ ایسے حضرات سے ہمارے ادب کو فروغ حاصل ہوا ہے اور ہو سکتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے "ارض القرآن" میں صحیح فرمایا ہے کہ قرآن اور اسلام کی بدولت بہ کثرت علوم و فنون کی راہیں کھلیں۔ خود قرآن کو سمجھنے کے لئے تاریخ، آثار قدیمہ، جغرافیہ، منطق، فلسفہ، صحف سماوی، تجوید، قرأت وغیرہ کتنے علوم کو سمجھنا مقدم ہوتا ہے۔ پھر قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ اصول قرآن، اصول حدیث، اصول فقہ سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اسلام اور مسلمانوں کا دامن جب دور دراز ملکوں سے ہوا تو وہاں کے علوم و فنون بھی مباحث میں داخل ہوئے۔ اور ہمارے علماء نے اپنی تصانیف سے نہ صرف کتابوں کو زینت بخشی بلکہ ادب کو بھی فروغ پہنچایا۔ اب بھی ہم اسلام سے اپنے ادب کو مالا مال کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لئے تقسیم ہند والے ہنگامے بہت کچھ مواد پیش کر سکتے ہیں۔ مہاجرین کی مصیبتیں اور مصیبتوں کے باوجود بھلائیوں سے بے نیازی اور عبرت حاصل کرنے سے غفلت، اغوا شدہ مسلمان بچیاں اور عورتیں جن کا خیال کرنے سے دل ہل جاتے ہیں، معصوم بچے جن کے سینوں میں بھالے گھونپے گئے اور دیواروں میں ٹھونک دیئے گئے، مقتول مسلمان جن کے لاشے بے گور و کفن پڑے رہے، یا اُن کے ٹکڑے درختوں سے آویزاں کئے گئے، ریل گاڑیوں کے خون آلودہ ڈبے وغیرہ بے شمار موضوعات ہیں جو اسلامی ادب کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اور نثر و نظم کے مختلف اصناف کے لئے کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی اخلاق، اُن کے فضائل اور نتائج بھی بہت مفید ہیں۔ اعلیٰ علمی کاموں کے لئے مولانا شبلی کا Heroes of Islam والا سلسلہ بے شمار تصانیف کے لئے کار آمد ہے۔ واقعی ہمارے لئے شرم کی بات ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خاص آل و اصحاب کے متعلق بھی تحقیقی تصانیف نہ ہونے کے برابر ہیں۔ قرآن کی آیات اور احادیث کا تاریخی تطابق، پھر سنین کی ترتیب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع سیرت اور اسی تاریخی ترتیب سے دوسرے بزرگوں کی سیرتیں بڑے اہم موضوع ہیں۔ مختصر افسانوں کے لئے (جن میں صرف ایک دو نکات پر پوری عمارت کھڑی کی جاتی ہے) انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے حالات بہت کچھ مدد دے سکتے ہیں۔ اسلامی تصوف جسے "احسان" سے تعبیر کیا جاتا ہے دماغوں سے زیادہ دلوں میں اُتارا جا سکتا ہے۔ ناولوں کے لئے شرر کی طرح نیم تاریخی روایات لینے میں ہرج نہیں۔ ڈراموں میں ہمارے اسلاف کی معرکہ آرائیاں اور صحیح صحیح تاریخی مکالمے بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ داستانوں میں بھی حقیقی واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں گو کہ اب یہ موضوع رواج میں نہیں ہے۔ گل و بلبل، ساقی اور پیمانے کی جگہ نہ صرف شراب معرفت بلکہ مجازی مے بھی چھلکائی جا سکتی ہے۔ فرضی معشوق کی جگہ محبوبِ خدا کی غلامی پر بھی فخر کیا جا سکتا ہے۔ اور غزلوں میں اسی عشق کی زیادہ ضرورت ہے۔ اقبال نے جس طرح متعدد اسلامی تعلیمات کو پیش کیا ہے دوسرے شعراء بھی اپنے رنگ میں ان تعلیمات کو تشبیہات و استعارات کے ساتھ سمجھا سکتے ہیں۔ جمہوریت اور معاشی مساوات کے لئے لینن کے بجائے اسلام کی تقلید کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے نظریے

شاعرانہ انداز میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ہمارے عام معاملات اور سماجی حالات پر اسلامی نظر سے بھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے اور اپنے ماحول کو اسی رنگ میں رنگا جاسکتا ہے۔ تنقید نگاری بھی اسلامی نقطۂ نگاہ سے کی جاسکتی ہے اور وہ ہماری زندگی کے لئے ایک نہایت کارآمد چیز بن سکتی ہے۔ ہمارے سماجی حالات کی برائیاں بھی بیان کی جاسکتی ہیں اور غفلت سے چونکایا بھی جاسکتا ہے۔ بہرحال زندگی کے متعلق بے شمار موضوعات ایسے مل سکتے ہیں جن پر اسلامی نظر ڈالی جاسکتی ہے اور اس میں یہ انفرادی شان نہیں ہے، تو ہمیں یاد رکھنا چاہئیے کہ:۔

ہوتی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اقبال

عبدالحمید عتیق فکری

اخلاق، تمدّن اور معاشرت کو مذہب نے سنوارا!

ماضی کی کڑیاں تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں ان ہی کڑیوں کے مل جانے سے انسان پچھلے تاریخی واقعات کو سمجھتا ہے۔ انسان کچھ تو قدیم معلومات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کچھ اپنے زمانہ کے حالات سے۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح مسائل معاشرت ۔ ۔ ۔ تہذیب و تمدن اور علم و سائنس کی ارتقائی تنظیم میں کافی مدد ملتی ہے۔ ۔ ۔ ہمارے پاس صرف تاریخ ایسی چیز ہے جس سے ہم انسانی سوسائٹی کے معاشرے کے ابتدائی حالات سے لیکر موجودہ دور کے ترقی یافتہ معاشرے کا سراغ لگا سکتے ہیں اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں جس سے ہم تہذیب انسانی کا کھوج لگا سکیں۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ نظریات میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ اگر پہلے زمانہ کے لوگ کسی چیز کی بنیاد نہ رکھ جاتے تو آج ہم اتنی بڑی عمارت کبھی بھی کھڑی نہ کر سکتے ہمیں اُن لوگوں کا ممنون ہونا چاہئے نہ کہ اُن پر پھبتیاں کسیں یہ ہماری ناانصافی ہے۔ ۔ ۔ یہ سچ ہے کہ آج سے دو ڈھائی ہزار سال پیشتر کے لوگوں نے اس بات کی کوشش کی ہوگی کہ کائنات کی معلومات کا مکمل خاکہ دنیا کے سامنے پیش کر دیں لیکن یہ ناممکن تھا۔ ۔ ۔ اور آج بھی ناممکن ہے وقت کے تقاضے انسان کو کسی نہ کسی جزیہ میں تبدیلی کرنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ سارے معاشرے یا سماج کی کلی پوزیشن ہی تبدیل کر کے رکھ دی جائے۔ ۔ ۔ ۔

کیونکہ سماج رفتہ رفتہ جب کسی چیز کو وجود میں لاتی ہے تو کہیں صدیوں میں جا کر اُس کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے پھر صدیوں بعد اُس کے نقش و نگار میں موزونیت پیدا ہوتی ہے اسی طرح برابر سلسلہ جاری رہتا ہے کہیں جا کر اُس نصب العین کی قدریں اُبھرتی ہیں۔ ۔ ۔ یہی فطرت کا قانون ہے اور اسی کے تحت انسانی سوسائٹی کا کارخانہ چل رہا ہے۔ ۔ ۔

مگر جو لوگ یکسر سماج کے پورے نظام کو بدلنا چاہتے ہیں وہ اُس کی جگہ بالکل نئے نظم و ضبط کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں تو یہ قانونِ فطرت کے اور انسان کی موروثی اور فطری جبلت کے خلاف ہے، وہ انسان کی تمدنی اور معاشرتی تاریخ کا منہ چڑاتا ہے۔ ۔ ۔ اگر انسان اپنی نوعی حیثیت سے کچھ اور بن گیا ہے اور اب انسان انسان ہی نہیں رہا جو کھاتا پیتا سوتا جاگتا اور شادی بیاہ کرتا تھا تو یقیناً معاشرے کا نظام ہی بدل دینا چاہیئے۔ ۔ ۔ اور اگر انسان واقعی وہی انسان ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے کا انسان تھا اور اُنہی چیزوں کا حامل ہے تو پھر موجودہ بے راہ روی انسانی سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی انسانی سوسائٹی کے وہی اُصول جن کی گود میں بنی نوع انسان نے ہزاروں برس پرورش پا کر اس جوانی کے عالم کو پایا کیوں نہ اُن اُصولوں کا احترام کیا جائے اور

اور انہی اصولوں پر سوسائٹی کے قصر کی تعمیر برابر جاری رہے آج کی دنیا کا بھی اگر جائزہ لیا جائے تو بھی وہ مذہب ہی کے نام سے آباد ہے ۔۔۔۔۔ جس خدا اور مذہب کو یورپ اور سوویٹ روس کے مفکرین (نعوذ باللہ) دفن کرنے تک کی منزلوں سے گزر چکے ہیں ۔۔۔۔ اپنا کام نکالنے کے لئے بنی نوع انسان کو اسی خدا اور مذہب کا نام سُنا سُنا کر اغوا کر رہے ہیں، بخارا کی جس مسجد میں لینن کا بُت برسوں نصب رہا اُس میں اب مذہب کا درس کیوں دیا جا رہا ہے جس خدا کو (نعوذ باللہ) دفن کر چکے تھے اور جس مذہب کی بنیادیں تک اکھیڑ دی تھیں آج اس کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی یہ سب کچھ آخر کیا ہے؟ جب جرمنی کی فوجیں ماسکو کے چشموں تک پیش قدمی کر چلیں تو اسٹالن نے مذہبی آزادی کا اعلان کر دیا اور مسجدوں اور گرجاؤں کے دروازے کھول دیئے تب پندرہ لاکھ مسلمان میدان جنگ میں روس کی طرف سے لڑنے کو نکلے اور ہٹلر کو شکست پہ شکست اٹھانی پڑی۔

ہر مضطرب کو اُس کی طرف التفات ہے
آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

چند برس کے بجاریوں اور ذہنی انتشار کے مریضوں کی شعبدہ بازی سے متاثر ہو کر مذہب کو بدنام کیا جا رہا ہے کیا آج تک انسانی سوسائٹی جس راستہ پر چل کر موجودہ منزل تک پہنچی ہے وہ دہریت اور لامذہبیت کی کارفرمائی ہے ۔۔۔ یا دنیا میں جس قدر بھی حکومتیں قائم ہوئیں اور تہذیبیں پروان چڑھیں اور انقلاب آئے کیا یہ سب مادہ پرستی کا ظہور ہے! ۔۔۔ اس عالم ارضی میں بڑے بڑے تمدنوں کی جو بنیادیں رکھی گئیں اور وہ پھلے پھولے یہ سب مارکسی نظریات کی کرشمہ سازیاں تھیں اگر مادہ پرستی سے کرۂ ارضی کی معاشرتی اور تمدنی بنیادیں مستحکم ہوئی ہوتیں تو آج سے ڈھائی ہزار سال پیشتر ہوگئی ہوتیں اور دیمقراطیس جیسے مادہ پرست کا نظریہ کبھی کا انسانی سوسائٹی کے ذہن پر چھا گیا ہوتا اور آج دنیا کبھی خدا اور مذہب کا نام نہ لیتی مگر یہ نہ ہوا ۔۔۔ اور اس کی جگہ ہمیشہ خدا اور مذہب کے نظریے کے تحت انسانی سوسائٹی پھلی پھولی ۔۔۔ تاریخی اوراق کھلے بندوں کہہ رہے ہیں کہ مادیت ہمیشہ دنیا میں ناکام رہی ۔۔۔۔ اور اخلاقیات و معاشرت کے جتنے معلّم ہوئے اُن کی سیرت کی تکمیل میں ہمیشہ خدا اور مذہب کے عقیدہ کو دخل رہا ہے بے شعور مادہ اُن کی فطرت پہ اثر ڈالنے والا نہ تھا۔

اخلاقیات اور عمرانیات کے ماہرین کی اکثریت بھی اسی طرف گئی ہے بلکہ ان میں سے جو بھی مادی خیالات کے حامل تھے انھوں نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے اُن کا کہنا ہے کہ ۔۔۔ تاریخ عالم کے مطالعہ سے یہ ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان نے لاکھوں برس میں جا کر اخلاقی اور معاشرتی ارتقاء کا زمانہ پایا ہے ۔۔۔ اور آج بھی اپنی طرف سے اخلاقی اور معاشرتی قدروں کو اجاگر کرنے کیلئے انسان اپنی جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے ہے ۔۔۔ حیوانی دور سے گزر کر جب انسان نے مدنیت کا جامہ پہنا تو سب سے پہلے اُس کو مذہب ہی نے اپنی آغوش میں لیا ۔۔۔ ہمیں کوئی ایسا گروہ یا قبیلہ نظر نہیں آتا جس نے مذہب کے بغیر اخلاق و معاشرت کے اصولوں کو واضح طور پر سمجھا ہو اور اجتماعی قدروں کو اپنے اندر جذب کر سکا ہو ۔۔۔ یقیناً انسان ابتدائی دور میں میکانی علت و معلول کے مفہوم سے کلیتاً ناواقف تھا مگر مذہب سے شناسا تھا

علمائے عمرانیات نے بھی تسلیم کیا ہے کہ تنظیم قبائل اور تفریق نسلی میں اور خصوصاً معاشرتی ارتقاء میں جو غیر معمولی اہمیت مذہب کو حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ۔۔۔ بعض نے تو اس قدر زور دیا ہے کہ غیر متمدن قوموں کے معاشرتی اتحاد کا سب سے بڑا عنصر مذہب ہی تھا ۔۔۔ اگر اصول تحقیق کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے سوچا جائے تو بھی ہمیں مجبوراً کہنا پڑے گا کہ مذہب نے معاشرتی رسم و آئین اور نظم و ضبط کی نشوونما میں کافی سے زیادہ مدد کی ہے اور ابتدائی معاشرت کی بنیادیں تو یقیناً مذہب کے اخلاقی قوانین

کے تحت استوار ہوئی ہیں مگر ایک گروہ فلاسفہ کا اس بات پر مُصر ہے کہ مذہب کے بغیر بھی معاشرتی اور اخلاقی نظام مکمل ہو سکتا ہے لیکن تجربہ اور تحقیق سے یہ بات ثابت اور واضح ہو چکی ہے اور تاریخ اس حقیقت کو واضح کر چکی ہے کہ مذہب ہی کی بدولت تمام اقوام عالم تہذیب و تمدن اور معاشرت و اخلاق کے اصولوں سے واقف ہوتی ہیں اس سلسلہ میں فرینک ڈبلیو بلیک مارکی کی "جادی عمرانیات" پڑھنے کے لائق ہے۔

صاحب موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں آج معاشرت کی تاریخی نشوونما کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے بلکہ انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ دامن معاشرت ہر زمانہ میں مذہب کے عنصر سے لبریز رہا ہے بلکہ یہاں تک ماننا پڑے گا کہ مذہب کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے اور اس کے اثرات سے فائدہ پہنچتا رہا ہے جماعتوں اور قوموں کی نشوونما اور ترقی میں بھی مدد ملتی رہی ہے اور ثانوی صورت میں معاشرت کے باہمی اتحاد میں تقویت پہنچتی رہی۔ ۔ ۔ ۔ اور اسی مذہب نے قوموں اور جماعتوں یہاں تک کہ معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کر دی۔ ۔ ۔ ۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ گو مذہب کی عملی ارتقائی صورت مسخ ہوتی رہی۔ ۔ ۔ ۔ اور اپنے توحیدی مرکز سے ہٹ کر توہمات میں ڈوب گیا۔ معاشرے کو اس لئے تقویت پہنچی کہ مذہب کا تعلق یقین و عمل سے تھا کیونکہ جب معاشرے میں مذہبی قوانین داخل ہوئے تو انہیں یقین کے ساتھ قبول کیا گیا اور ان پر عمل ہونے لگا۔ ۔ ۔ ۔ علمائے عمرانیات کی اس بارے میں رائے ہے کہ مذہبی اثرات نے تہذیب و تمدن کی نشوونما میں کہاں تک اثر کیا۔ ۔ ۔ ۔ اگر تہذیب و تمدن کے ابتدائی دَور کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ وحشی قوموں نے مذہب کی آغوش میں جگہ پا کر معاشرت کی راہ منظم کو پایا۔ ۔ ۔ ۔ چاہے وہ مذہب الہامی تھا یا توہماتی بہرحال معاشرتی نظام کی ابتدا مذہب سے ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ غیر متمدن قوموں کے سادہ ذہن مذہب کے اخلاقی نظام سے متاثر ہو کر زندگی کے دن مذہبی قانون پر گزارنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ گو بعد میں انسان اپنی خود مختاری کے جذبہ کے تحت اور ہوائے نفس کے چکر میں آ کر مذہب سے انحراف کرنے لگا۔ مگر انسان کو یقین کا درجہ بغیر مذہب کے حاصل نہیں ہوا تھا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک انسان یقین کا درجہ نہیں پا لیتا اس کے ذہن میں اُن کا عنصر تقویت نہیں پاتا۔ ۔ ۔ ۔ مفکرین عمرانیات کا فیصلہ ہے کہ یقین کے بغیر معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم ناممکن ہے۔ ۔ ۔ اور تنظیم جب پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے جب معاشرتی اور اجتماعی قوانین کو یقین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہو اور یہ چیز مذہب کے علاوہ کہیں نہیں ملتی!

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ معاشرے کیلئے اجتماعی زندگی ضروری ہے اور اجتماعی زندگی کی بنیاد مذہب ہی ڈالتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ جیسے عبادت۔ ۔ ۔ ۔ رسومات۔ ۔ ۔ ۔ لین دین شادی بیاہ موت وغیرہ یہ سب اجتماعی زندگی کے ساتھ چلتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک مذہب ہی کائنات ارضی میں اپنا وجود رکھتا ہے جس سے زندگی کا ہر ایک شعبہ تکمیلی صورت اختیار کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ پروفیسر میکڈوگل ماہر نفسیات اپنی تصنیف معاشرتی نفسیات میں لکھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ زمین۔ ۔ ۔ ۔ آسمان۔ ۔ ۔ ۔ چاند سورج۔ ۔ ۔ ۔ آندھی طوفان، برق، بادل وغیرہ۔ ۔ ۔ ۔ غرض کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو دیکھ کر جب انسان حیران رہ جاتا ہے تو آخر یقین کے ذریعہ جو اُسے مذہب نے عطا کیا ہے ایک اَن دیکھی قوت کا تصور کر کے تسکین حاصل کرتا ہے اور معاشرتی جدوجہد میں حصہ لیتا ہے اور بڑے سے بڑے اور مشکل سے مشکل کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

اس لئے آج کوئی ایسا خطۂ ارضی نہیں جہاں مذہب کا وجود نہ پایا جاتا ہو۔ ۔ ۔ ۔ یہی ایک ثبوت مذہب اور معاشرے کی ابتدائی کڑی ہے! دوسرے مذہب کا داخلی اثر بھی افراد پر ہوتا ہے پہلے تو مذہب کی بدولت فرد کو ایک نصب العین حاصل ہوتا ہے پھر اسے اپنی قوت کے لئے ایک راہِ عمل نظر آتی ہے پھر اس کے دل میں ایک معین منزل تک پہنچنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

ایک اور مغربی مفکر (بکلی) کی رائے ہے:۔

مذہب انسانی زندگی کے لئے ضروری چیز ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ جس بغیر روح کے وجود گل سڑ جاتا ہے اور تعفن پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح مذہب کے بغیر انسانی زندگی ناقص اور گمراہی کا محل بن جاتی ہے۔۔۔ اور معاشرے کا سارا ڈھانچہ کھوکھلا ہو جاتا ہے اسی لئے مذہب انسانی سوسائٹی کے لئے ضروری ہوا۔۔ ورنہ اس کے بغیر انسان اس مادی دنیا میں امن و امان کی زندگی میسر نہیں کر سکتا کیونکہ مذہب کے اندر جو عملی اور اخلاقی قوت پنہاں ہے جس پر انسانی معاشرے کا دارومدار ہے وہ کسی دوسرے نظام میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ مذہب کی بنیاد یقین و عمل پر ہے نہ کہ خالی فکر و نظر پر۔۔۔ اس کے علاوہ مذہب کی حیثیت ایک ایسی واجب ہستی کے تسلیم کرنے پر جو ساری کائنات کی خالق و مدبر ہے اور وہ تمام قوتیں جو اس کائنات میں کارفرما ہیں اسی خدا کے حکم کی محتاج ہیں اگر خدا چاہے تو آن کی آن میں سورج کی روشنی سلب کر سکتا ہے درخت کا ایک پتا بھی اس کے اشارے کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔۔۔

مگر یہ تصور مذہب ہی کے ذریعہ انسان میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک واجب الوجود ہستی صاحب امر ہے۔۔۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مذہب بنی نوع انسان کے بعد کی اختراع ہے یا اس کی فطرت میں یہ چیز داخل ہے۔ جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے تو ہمیں انسانی تاریخ کے ماہرین کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ تمام دنیا کے آثار قدیمہ سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ مذہب بھی بنی نوع انسان کی ابتدائی زندگی میں داخل تھا۔ اور تمام قوانین تمدنی اور اخلاقیات و معاشرت وغیرہ سب کچھ مذہب ہی کے دامن سے نکلے ہیں۔۔۔

مسٹر لیکی لکھتے ہیں۔ کہ مذہب انسان کی جبلت میں بلکہ سرشت و خمیر میں داخل ہے تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مذہب کے برگ و بار بارہا کاٹے گئے مگر اس کی جڑیں جوں کی توں قائم رہیں بلکہ میرے نزدیک تو مذہب کی حقانیت و صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ یہ جذبہ ہماری ہستی کا ویسا ہی جزو لاینفک ہے جیسے ہمارا جسم اور قویٰ۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں مذہب ہر زمانہ میں اخلاق کی چہار دیواری رہا ہے۔۔۔ مذہب جو بیک وقت عقیدہ بھی ہے اور نظم و ضبط بھی یاد رکھو کہ مذہب رضامندانہ اخلاق مندی ہے کہیں مذہب غائب ہوا تو اخلاق و معاشرے کی ساری عمارت خاک کا ڈھیر ہو کر رہ جائے گی۔

مسٹر سموئیل لکھتے ہیں :-

دنیائے انسانیت کو مذہب کی اشد ضرورت ہے انسان جانوروں کی طرح صرف مادی اور طبعی زندگی نہیں بسر کر سکتا، اس کے لئے روحانی سکینت کا سامان بھی از بس ضروری ہے کیونکہ روحانی جدوجہد انسان کے لئے فطری عمل ہے۔۔۔

الہامی کتابوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا معاشرتی اخلاقی معیار کتنا پست تھا اور مذہب نے اُن کی زندگی کی کس طرح کی۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ انسان نے الہامی مذہب کی صورت بگاڑ دی لیکن مذہب کی سچائی سے کسی کو انکار نہیں۔۔۔

پروفیسر میکڈوگل ایک جگہ معاشرتی نفسیات میں لکھتے ہیں :-

مذہب نے متعدد طریقوں سے معاشرتی تکمیل پر اثر ڈالا اور وہ تھا جس کے واسطے سے مذہبی مفہوم نے یہ اثر ڈالا ہے آپس میں ایسے غیر منفک ہیں اور انہوں نے اس طرح مل جل کر کام کیا ہے کہ ان کو متحد سمجھ لینا چاہئے۔

مارشل صاحب لکھتے ہیں کہ موجودہ نسل اپنے اسلاف کی تعریف پذیر یادگار ہے بلکہ گزشتہ عہد زرین کا خیال کہ انسان موجودہ دور کی عیش پرستیوں اور حماقتوں سے پاک تھا ایک بیہودہ تخیل ہے۔ دور کی غیر قانع فطرت کے لئے اپنے اندر تمدنی کشش رکھتا ہے اور روایات کے لحاظ سے یہ تخیل بالکل بے بنیاد ہی نہیں ہے۔ اگر نئے حالات اپنے ساتھ نئے خرابیاں لاتے ہیں تو ساتھ ہی ترقی کے بھی نئے مواقع پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً آج کے تاجرانہ اخلاق کا موازنہ اگر پرانے زمانہ کے اخلاق سے کرو تو فیصلہ

کرنے میں سخت زحمت پیش آئے گی کہ ہم درحقیقت ترقی کر رہے ہیں یا تنزل۔ اگر ایک طرف بعض حیثیت سے تو ہمارے افعال زیادہ قابل اعتبار اور معقول ہیں تو دوسری طرف بعض حیثیت سے یہی نظر آرہا ہے کہ ہم اگلے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ خود غرض اور بددیانت ہوگئے ہیں

ہینتزی جو فلسفہ اخلاقیات کا مشہور عالم ہے لکھتا ہے:

مذہب چونکہ محض جد وجہد اور کشمکش کی حدود سے بلند کرکے ہم کو حصول مقصد اور منزل اسی کے خیال تک پہنچا دیتا ہے اس لئے گویا ایک معنی میں ہمیں حیات اخلاق سے بھی ماوراء لیجاتا ہے لیکن مذہب صرف اشارہ وکنایہ سے کام نہیں لیتا بلکہ ایک متعین اذعان پیدا کر دیتا ہے اور اس قسم کے اذعان انسانی زندگی کی احتیاج میں داخل ہیں۔

علامہ اقبال اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں، کہ امریکہ میں ایک کتاب لکھی گئی جس کا عنوان تھا، "اگر مسیح شکاگو آئیں" ایک امریکی مصنف اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

مسٹر سٹیڈ کی کتاب سے جو ہمیں سبق حاصل کرتا ہے یہ ہے کہ اس وقت نوع انسان جن برائیوں میں مبتلا ہے وہ ایسی ہیں جن کا ازالہ صرف مذہبی تاثرات ہی کر سکتے ہیں۔ ان برائیوں کا ازالہ ایک بڑی حد تک ریاست کے سپرد کر دیا گیا تھا لیکن خود ریاست فساد انگیز سیاسی مشینوں میں دب گئی ہے یہ مشین ان برائیوں کے ازالہ کے قابل نہیں کردہ انسانوں کو تباہی اور خود ریاست کو انحطاط سے بچانے کے لئے بجز اس کے چارہ نہیں کہ شہریوں میں اجتماعی فرائض کا مذہبی احساس پیدا کیا جائے۔

"خطا و سزا"

ابوالبیان حماد
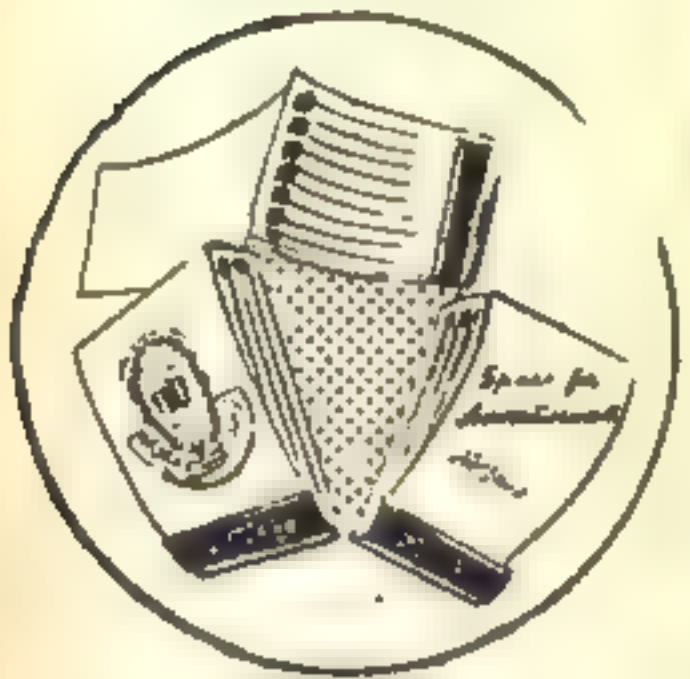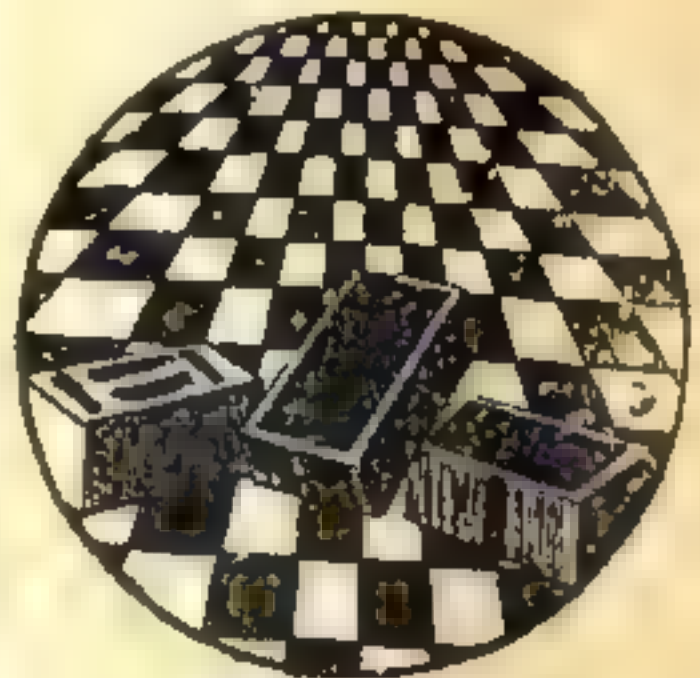
یاسمین و گلاب و نرگس کی
شامت آئی ہے آج کس کس کی

آدمی، آدمی کا حاکم ہو
اصل میں گانٹھ ہے یہی بس کی

بادشاہت اسی کو ہے زیبا
ہم نشیں کائنات ہے جس کی

تم نے مجھ کو قفس میں بند کیا
وہ خطا کیا سزا ہے یہ جس کی

کوئی ہلچل نظر نہیں آتی
ہے عجب کیفیت مدارس کی

وہ مجاہد کہاں گئے یارب
جن سے رونق تھی دیں کی مجلس کی

جانے دنیا کا حال کیا ہوگا
ہر گھڑی مجھ کو فکر ہے اس کی

اب مرے دیس کا خدا حافظ
ہر دیا آرہی ہے پیرس کی

ہے بظاہر گلاب کا لیبل
اور بوتل میں ہے فقط وسکی

ہاں وہ مسجد میں آ نہیں سکتے
اتنی مصروفیت ہے آفس کی

اور سب کچھ ہے جسم ملت میں
اور اگر ہے کمی تو لِس رِس کی

اپنا، اپنا خیال ہے سب کو
کون لیتا ہے اب خبر کس کی

کب سے مجھ کو تلاش ہے حماد
ایک ہمدرد اور مونس کی

جذبات

(انوار ظہوری (حیدرآبادی))

ضبط کی آخر حد ہوتی ہے
چھوٹ نہ جائے صبر کا دامن

کس کا شکوہ کیسی شکایت
آپ ہوئے ہم اپنے دشمن

کھیل رہے تھے ہم پھولوں سے
کانٹوں میں کیوں اُلجھا دامن

دیکھنے والے! داغ نہیں ہے
سینے میں خورشید ہے روشن

حالِ وطن انوار نہ پوچھو
خضر بنے پھرتے ہیں رہزن

محسوسات

ماہر القادری

اُن کے وعدوں سے دل بہل نہ سکے
دیر تک سلسلے یہ چل نہ سکے

یوں تو ہر قید توڑ دی ہم نے
دامِ اُمید سے نکل نہ سکے

تھے وفا ناشناس پروانے
شمع کے ساتھ ساتھ جل نہ سکے

نشتر!

ایک ہندی گمنام شاعر:-

یارم بہ خانہ آمد و جامِ شراب نیست		در حیرتم کہ صبح سیہ آفتاب نیست

فانی بدایونی:-

ز لطفِ دوست مرا نیمۂ نگاہ بس است		متاعِ خلد نہ جویم کہ رایگانِ من است

جگر مرادآبادی:-

کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد		طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

نفشی:-

غمِ دوراں میں کہاں بات غمِ جاناں کی		نظم ہے اپنی جگہ خوب مگر ہائے! غزل

روش صدیقی:-

سر میں اک سجدۂ بیتاب لئے جاتا ہوں		حاصلِ منبر و محراب لئے جاتا ہوں

خالد مینائی:-

مدت سے آرزو ہے کہ اے بوئے زلفِ یار		ہوتے مرے نصیب جو بادِ صبا کے ہیں

نیر جبلی:-

اُس سفینوں کو ڈوب جانے دو		جو ہواؤں کا رُخ بدل نہ سکے

صابر دہلوی

آؤ اور تکملۂ جوشِ جنوں کر جاؤ!		میرے ہاتھوں سے مرا چاک گریباں کیوں ہو

عبدالکریم ثمر:-

نوائے بلبل و قمری جہاں بارِ سماعت ہو		وہاں زاغوں کو آخر خوش نوا کہنا ہی پڑتا ہے

آرم لکھنوی

وہ یہ کہتے ہیں کہ جاب رستگاری ہو گئی		اے جنوں! زنجیر تو اور بھاری ہو گئی

یاور عباس

آپ میری طرف نظر نہ کریں		آپ پر ہے نظر ہزاروں کی

مکیش حیدرآبادی

گرتے گرتے اُن کا دامن تھام لے		گرنے والے لغزشوں سے کام لے

ریاض خیرآبادی

ہنگام نزع گریہ عجب بیکسی کا تھا
تم ہنس دیئے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

محمود فاروقی

ہاتھ

اس رات کلب میں اچھی خاصی رونق ہوگئی تھی کیپٹن بشارت کے لطیفے بیگم نذیر کی سنسنی خیز اطلاعات چند نئے غرارے اور نئے چہرے بلیرڈ، تاش، بیئر، وہسکی غرض سارے لوازمات جمع تھے لیکن ڈاکٹر میجر دہ معلوم کیوں اداس اداس تھا اس نے آج نہ تو بیگم نذیر کے ساتھ کوئی نئی لڑائی مول لی اور نہ کسی خاتون کا ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتایا بس چپ چاپ ایک دریچہ میں پیر لٹکائے بیٹھا رہا بجھا ہوا سگار اس کے منہ میں دبا ہوا تھا اور وہ آدھی آنکھیں میچے جانے کس سوچ میں غرق تھا۔

جس وقت دوسرے کمرے میں کسی بے سُرے ڈی نے "پیپی پیپی بانا لولو" گانا شروع کیا اور پیانو سے ایسی آوازیں نکلیں جیسے بہت ساری پاکستانی بلیاں انگریزی میں رونے لگی ہوں تو وہ بڑی بیزاری سے اٹھا اور کھڑکی ان نگ کر گیلری میں جا پہنچا گیلری میں نجمہ احسان ایئرپس ہلاتی ہوئی چلی آ رہی تھی وہ احسان فیملی سے بڑا گھبراتا تھا کیونکہ اس کا ہر فرد اپنے آپ کو بڑا جینیئس ([illegible]) بہت ہی سوپر ([illegible]) اور خطرناک حد تک انٹلکچوئل ([illegible]) سمجھتا تھا نجمہ احسان اور فیروزا احسان دونوں بہن بھائی اتنی تیز تیز بولتے تھے جیسے وہ بات نہیں کرتے بلکہ منہ سے ٹائپ کرتے ہوں۔

"ماؤں ماؤں" نجمہ احسان نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی اور پھر بغیر کسی مسودے کے زبانی ٹائپ شروع کر دیا۔

"وہ ڈاکٹر کہاں چلے کیا کوئی نیا تجربہ؟ حالانکہ ڈاکٹر میں آج تمہیں اچھی طرح یہ بتلا دینا چاہتی تھی کہ سماجی شعور معاشی تغیرات کا ذاتی پرتو ہیں ــ روایتی ـــــ" ڈاکٹر نے جلدی جلدی اپنی جیبیں ٹٹولیں اور چیونگم کی ایک ٹکیہ نکال کر نجمہ احسان کے منہ میں ڈال دی اور ایک لفظ کہے بغیر زینہ سے اتر گیا۔

نجمہ احسان ریلنگ پر جھکی ہوئی اس وقت تک ٹائپ کرتی رہی جب تک کہ اس نے اپنی نیلی ڈسیٹر کو اسٹارٹ نہیں کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد کلب کی سُرخ ٹائلوں والی عمارت کیکر کے جھنڈ میں چھپ گئی اور اس کی نیلی ڈسیٹر سڑک کے ڈھلوان پر بڑی تیزی سے گھوم گئی۔

بل کھاتی ہوئی مڑی روڈ پر اس کی ڈسیٹر کا سایہ آہستہ آہستہ پھسل رہا تھا رات روشن تھی لیکن نہایت ہی خاموش جنگل کی تُند خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آ رہی تھی اور رہ رہ کر اڑتے ہوئے کسی شپرک کی تیز سیٹی فضا میں پھیل جاتی، کبھی کوئی جیپ سن سے گزر جاتی اور پھر سناٹا گہرا ہو جاتا۔

اس نے ایک نظر دوسری خالی سیٹ پر ڈالی ـــــ اں نجمہ احسان ایک نیا تجربہ اور کوئی کتنی بار اس سیٹ پر بیٹھ چکی ہو اور . . . . مجھے کتنے ہی چیونگم کے پیکٹ خالی کرنے پڑے ہیں ـــــ لیکن لیکن آخر یہ سب کب تک ہوتا رہے گا سکون اور طمانیت کے پیچھے ہم کب تک دوڑتے رہیں گے چیونگم کے کتنے ہی پیکٹ خالی ہوگئے اور اس سیٹ پر کتنے ہی تجربے

پرانے ہو گئے تو ڈاکٹر میجر تمھاری زندگی کا روپ نکھر نہ سکا ایک اور نیا تجربہ نیا احساس! آخر کس طرح تھوڑا بہت قرار تو ملے۔

ٹو سیٹر یکساں رفتار سے پھسلتی جارہی تھی ہل فورٹ، گنگلسوے، جم خانہ، پلازہ، ڈریم لینڈ وہ ڈریم لینڈ سے بھی آگے نکل جاتی لیکن وہاں بس اسٹاپ پر ایک نیا تجربہ موجود تھا ——— ہش! یہ تو تیسرے درجہ کی ان لڑکیوں میں سے معلوم ہوتی ہے جو پلازہ اور ڈریم لینڈ کے شو ختم کرکے جھوٹ موٹ شہر جانے والی بس کا انتظار کرتی ہیں یہاں تک کہ لانبی لانبی سیٹیاں بجاتے ہوئے کوئی کیڈٹ ان کو اپنی موٹر سائکل پر بٹھا لیتا ہے۔ ڈاکٹر میجر نے ایک لمحے سوچا اگر اس کے پیر بریکوں کو دبا چکے تھے ٹو سیٹر بہت ہی ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ بس اسٹاپ پر رک گئی۔

"اگر آپ کو شہر چلنا ہے" اس نے نرمی سے دلی کے ساتھ جھک کر کار کا دروازہ کھول دیا۔

"اوہ شکریہ" لڑکی بڑی شوخی کے ساتھ خالی سیٹ پر آبیٹھی "دراصل صاحب یہ کمبخت بیس آدمی کو بڑا بے بس ... "

کس قدر گھٹا ہوا جملہ ہے لیکن یہ تو اس قدر گھٹی ہوئی نہیں دکھائی دیتی ٹو سیٹر دوبارہ چل پڑی ڈاکٹر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا البتہ اس کے ہاتھ میں ماچس تھما دی تاکہ وہ اس کا بجھا ہوا سگار جلا دے ——— جس وقت وہ سگار جلانے لگی تو ڈاکٹر نے دیکھا کہ اس کا بایاں ہاتھ سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا ہے۔

ہاتھ کو کیا ہوا ؟

کچھ نہیں بس ذرا سا جل گیا تھا

اور اب ؟ ڈاکٹر نے پوچھا

ٹھیک ہوتا جارہا ہے

سگریٹ پیو گی

نہیں !

باتیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں ختم ہو گئیں اور وہ چھوٹی سی نیلی ٹو سیٹر بڑی نرم روی کے ساتھ ڈاکٹر میجر وحید میڈیکل آفیسر پاک ملیشیا ہاسپٹل کے دو منزلہ "رین بسیرا" میں داخل ہو گئی۔

زندگی کی ایک اور بے کیف رات گزر گئی۔

اور جب اس کی آنکھ کھلی تو چاند بہت نیچے ڈھل چکا تھا اور پھیکی پھیکی چاندنی بستر پر پڑ رہی تھی دور افق پر ہلکی ہلکی سفید دھاریاں جھلکنے لگی تھیں۔ پیپل کے پتے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے، اور نیچے ڈھلاؤ پر دور دور تک سرخ چھتوں والے بنگلے پھیلے ہوئے تھے اور ان کی پشت پر ہوائی اڈہ کا بادنما لہرا رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کی سبز بتی ابھی تک جل رہی تھی پلیٹ فارم بالکل ہی خالی پڑا تھا اسٹیشن پر لگی ہوئی ہلالی جھنڈیوں کی سرسراہٹ صاف طور پر سنائی دے رہی تھی پٹری پر بہت دور ایک انجن مال کے ایک ڈبے کو بڑی تیزی سے کھینچے لئے جا رہا تھا۔

چاندنی کی پھیکی پھیکی روشنی، افق کی ہلکی ہلکی سفیدی، سرکتی ہوئی رات کے دھندلکے آپس میں کچھ اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے کائنات کے چہرے پر کسی نے سرمئی جالی ڈال دی ہو۔

پروں والے نرم تکیہ پر اس نے کہنی سے ٹیک لگا لی۔

کس قدر خوبصورت اور پُرسکون لیکن آہ روشنی کی پہلی کرن اس سارے طلسم کو درہم برہم کردے گی اور —— اور پھر تم فریدہ عثمانی یکہ وتنہا رہ جاؤ گی اور زندگی کا ایک اور پھیلتا ہوا دن ڈھل جائے گا —— مجھے دن نہیں چاہیئے خدایا مجھے روشنی کی ضرورت نہیں میرے خدا بس تو مجھے رنگ برنگے دھندلکے عطا کردے جن کے پیچھے کوئی صبح نہ ہو اور پھر ایک طویل ختم نہ ہونے والی رات مجھے چاروں طرف سے گھیرلے۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ بڑی دیر تک اپنی پلکیں جھپکاتی رہی، یہاں تک کہ مشرق کی آنکھ پوری طرح کھل گئی۔

پاس والا پلنگ خالی تھا اور چونگم کا ایک خالی پیکٹ سلوٹوں میں اُلجھا ہوا پڑا تھا۔

بہت ہی عجیب کس قدر نرالا، اس کے ہونٹ بڑی آہستگی سے ہلے چونگم کے پیکٹ کو دیکھتے ہوئے وہ رات کی باتوں کے متعلق سوچنے لگی —— عام آدمیوں سے یہ کس قدر مختلف ہے اس نے دوسروں کی طرح مجھ سے میرے حالات دریافت نہیں کئے جھوٹی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا میرے ناک نقشے کی کھوکھلی تعریفیں نہیں کیں بس دوسرے پلنگ پر بیٹھا شراب کے جام پر جام چڑھاتا گیا اور پھر بڑے ڈرامائی انداز میں اس نے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور آنکھیں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا تم ابھی بری نہیں ہو نازو! تمہارے جسم میں تمہاری معصومیت ابھی جاگ رہی ہے مگر آہ لوگ تمہیں جیتے جی مار ڈالیں گے۔ پھر تم جاگ نہیں سکو گی کبھی بھی نہیں! اس کے بعد وہ اپنے پلنگ پر بے سُدھ گر پڑا —— اور کتنی دیر تک وہ اپنے بستر پر تلملاتی رہی۔ اس کے جملے پھانس کی طرح اس کے ذہن میں چبھ رہے تھے اور تکیہ اس کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا اور وہ دوسرے پلنگ پر بے خبر سو رہا تھا۔ پھر جب رات کچھ اور بھیگ گئی تو وہ بجلی کے کوندے کی طرح بھاگ سے اٹھی اور ڈاکٹر کو جھنجوڑ دیا —— ڈاکٹر! تم سچ مچ سو رہے ہو یا الکحل نے تمہیں مدہوش و بے خبر بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر نے خمار آلود لہجے میں اس سے کہا —— جاؤ نازو! تم اپنے بستر پر سو جاؤ ... جاؤ! ڈاکٹر کے جواب میں گرفتگی اور بے کلی تھی اور اگر وہ شراب پیئے نہ ہوتا تو یہ جواب پاکیزگی اور نیکی کا ایک پیغام بھی تھا —— وہ اپنے پلنگ پر چلی گئی اور رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی!

فریدہ عثمانی نے ایک انگڑائی لی اور اٹھ کھڑی ہوئی جب وہ بڑے ہال میں سے گزر رہی تھی تو اُسے محسوس ہوا جیسے وہ دو منزلہ صاف ستھرے بنگلے کی تنہا مالک ہے اور ہر چیز اس کی اپنی ہے۔ ایک اونچی تپائی پر بڑا سا ہاتھی دانت کا جھولنے والا گھوڑا رکھا ہوا تھا اس نے دریچے سے ٹیک لگا کر اپنی انگلی سے گھوڑے کو چھوا اور وہ آگے پیچھے جھولنے لگا۔ کھیل بہت دلچسپ تھا اور وہ بڑے لطف کے ساتھ گھوڑے کو ٹھوکے دیتی رہی۔ اس بات سے بے پروا کہ رات گزر چکی ہے اور اس کے قیام کی مہلت بھی۔ اچانک اسے احساس ہوا جیسے وہ تنہا نہیں ہے، پلٹ کر اُس نے دیکھا

ارے آپ! فریدہ عثمانی کی پلکیں جھک گئیں میں تو ڈر گئی صبح بخیر ڈاکٹر میں سوچ رہی تھی مجھے اب لوٹ جانا چاہیئے۔

کوئی جواب نہ پا کر اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں وہ خاموش کھڑا ہوا بڑی محویت کے ساتھ اس کے ہاتھ کو تک رہا تھا جو ابھی تک ہاتھی دانت کے گھوڑے پر رکھا ہوا تھا۔

اس نے بے اختیار ہاتھ کھینچ لیا یہ تمہارا اپنا ہاتھ ہے؟ ڈاکٹر ہجر نے اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے دریافت کیا۔

میرا اپنا ہاتھ —— کیا ہاتھ بھی دوسروں کے ہوتے ہیں ڈاکٹر! وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

بالکل ویسے ہی بہت ہی شاید! ڈاکٹر بڑبڑا رہا تھا —— لیکن افسوس تمہارے دو ہاتھ ہیں کاش وہ صرف ایک ہی ہوتا صرف ایک ہی ہوتا؟

ہاں صرف ایک ہی ڈاکٹر نے اس کے کاندھے پر اپنی کہنی ٹیک دی وہ اپنا چہرہ اوپر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔
اگر تمہارا ایک ہی ہاتھ ہوتا تو معلوم ہے میں کیا کرتا: میں تم سے شادی کر لیتا! ڈاکٹر نے بہت ہی تیزی سے یہ جملہ ادا کیا اور پلٹ کر دوسری میز کی طرف چلا گیا۔
زبیدہ عثمانی کا چہرہ دفعتاً سفید پڑ گیا اور وہ اس طرح دریچے میں بیٹھ گئی جیسے اس کے جسم کی کمانیاں یک لخت ٹوٹ گئی ہوں۔
"شادی" اس کے منھ سے ایک سسکی سی نکل گئی۔
اپنا سگار جلا کر ڈاکٹر لوٹا اور اس پریشان لڑکی کے سامنے دونوں پیر پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔
ہاں شادی اگر تمہارا دوسرا ہاتھ نہ ہوتا "دوسرا ہاتھ نہ ہوتا" الفاظ اس کے گلے میں اٹک رہے تھے اور آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں پھر وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی صبح کی نرم نرم دھوپ میں اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور سانس تیز تیز چلنے لگا بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر بکھر گئی۔ اور اس نے ڈاکٹر کے گلے میں پڑے ہوئے اسکارف کو اپنے ہاتھ میں بھینچ لیا۔
آخر کیوں؟ ڈاکٹر! میرا ایک ہاتھ کیوں نہیں ہوتا اگر تم میرا مذاق اڑا رہے ہو تو سن لو تم بہت ہی کمینے اور ذلیل ہو۔
ڈاکٹر میجر نے اس کی تھوڑی چٹکی سے پکڑ کر اوپر اٹھائی مذاق نہیں نازو ———
نازو — نازو نہیں میرا نام زبیدہ ہے۔
اوہ کوئی فرق نہیں پڑتا رات شاید تم نے نازو ہی بتایا تھا خیر زبیدہ سہی ہاں تو زبیدہ یہ مذاق نہیں ہے۔ بلکہ میں نے جو کچھ کہا ہے پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا ہے۔
کہ آپ مجھ سے شادی کر لیتے! زبیدہ کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی۔
ہاں اگر تمہارا دوسرا ہاتھ نہ ہوتا — —ڈاکٹر نے جملہ مکمل کر دیا۔
کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر دونوں پلاسٹک کی اس مدور میز پر جا کر بیٹھ گئے جو ہال کے دوسرے سرے پر رکھی ہوئی تھی اور جس پر ابھی ملازم کافی کی ٹرے رکھ گیا تھا۔
ڈاکٹر کو دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی ابلتی ہوئی بات کو زبردستی روکے ہوئے ہے اور زبیدہ یوں معلوم دیتی تھی جیسے وہ کسی شدید ذہنی الجھن میں گرفتار ہے۔
وہ کچھ زیادہ دیر تک خاموشی کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکی اور اس نے کافی کی پیالی اٹھائی ——— ڈاکٹر کی نظر پھر ایک بار اس کے ہاتھ پر جم گئی وہ بے خیالی کے ساتھ کچھ دیر تک اسے تکتا رہا اور پھر کچھ اس طرح جیسے وہ کسی سے مخاطب نہیں بلکہ اپنے آپ کسی مناجات کو زیر لب دہرا رہا ہے کہنا شروع کیا۔
میں نے اس ہاتھ کو اس سے پہلے بھی دیکھا ہے۔
کہاں؟ وہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کی محویت کو دیکھ کر کہہ نہ سکی۔
دو مرتبہ، بہت عرصہ ہوا اور ایک عرصہ سے تو ہر روز صبح دیکھتا ہوں —
دو مرتبہ پہلے اور ہر روز صبح —— یہ کیا بکواس ہے —آخر میرے اللہ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں —— اس نے کافی کی پیالی میز پر ٹیک دی۔
ڈاکٹر میجر نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور اپنی دھن میں بولتا چلا گیا کچھ اس طرح جیسے وہ ایک عرصے سے یہ سب کچھ

کہنے کے لئے بے چین رہا ہے ——— اس نے اس کے نرم و نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

بالکل ایسا ہی فریدہ عثمانی کوئی بھی تو فرق نہیں لیکن آہ کاش یہ ایک ہوتا اور نازو تمہارا تو بایاں ہاتھ موجود ہے اگر وہ نہ ہوتا تو یقین مانو میں اس ہاتھ کو ہمیشہ کے لئے تھام لیتا۔ لیکن افسوس نہ تو یہ اس کا ہاتھ ہے اور نہ غالباً تم اس جیسی ہو۔

کیسی تھی وہ ؟ فریدہ نے بے اختیار سوال کیا۔

میں نے خود اس کو نہیں دیکھا میں نے تو صرف اس کا داہنا ہاتھ دیکھا تھا۔

کہاں ؟ فریدہ عثمانی نے اس کے تپتے ہوئے ہاتھوں میں سے اپنا ٹھنڈا برف جیسا ہاتھ کھینچ لیا۔

ڈاکٹر نے بوجھل پلکیں اٹھاکر اس کی طرف گہری نظریں ڈالیں اس وقت وہ بہت ہی معصوم اور بھولا بھالا نظر آرہا تھا ——— کافی کی پیالیاں ٹھنڈی ہورہی تھیں باہر صبح نکھر چکی تھی لیکن یہاں اندر پلاسٹک کی ارغوانی رنگ کی میز پر زندگی پُر اسرار اُلجھنوں میں پھنس گئی تھی۔

عرصہ ہوا میں نے وہ ہاتھ سب سے پہلی بار حیدرآباد میں دیکھا تھا۔

" حیدرآباد میں " وہ چونک پڑی لیکن بولی کچھ نہیں۔

ڈاکٹر اس کی طرف ٹکٹکی لگائے بولے جارہا تھا میں وہاں امتحان دینے گیا ہوا تھا جس کمرہ میں میں ٹھیرا تھا وہ ایک ایسی حویلی کا کمرہ تھا جو شاید کسی خاندانی جھگڑے کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم ہوئی تھی چنانچہ کمرہ کی درمیانی دیوار میں ایک بند دروازہ تھا جسے لوہے کی پتیاں جڑ کر اندر سے بند کردیا گیا تھا اور اس کی کنڈی میں ایک بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔ میزبانوں نے میرا میز اس دروازہ کے اندر لگادیا تھا۔ پہلی صبح جب میں پڑھنے کے لئے وہاں بیٹھا تو مجھے دوسری طرف سے قرآن پڑھنے کی بڑی سرور انگیز آواز سنائی دی آواز یقیناً کسی لڑکی کی تھی جو بڑے جذب و شوق کے ساتھ تلاوت کررہی تھی میں نہیں جانتا کہ اس کی تلاوت تجوید اور اصول قرأت کے مطابق تھی یا نہیں لیکن بلاشبہ وہ ایک اثر انگیز اور مسحور کن آواز تھی میں اتنا محو ہوا کہ مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ کب اس نے تلاوت ختم کردی۔ مجھے وہ سارا دن اپنے ایک دوست کے ہاں امتحان کی تیاری میں گزارنا پڑا۔ لیکن رہ رہ کر بار بار وہی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ دوسری صبح بھی یہی واقعہ پیش آیا وہی جادو بھرے بول میرے کانوں میں اتر رہا تھا اس وقت بے ساختہ میری نگاہیں دروازہ کا جائزہ لینے لگیں دروازہ نہایت ہی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور کہیں ذرا سی بھی درز نہیں تھی جس سے میں دوسری طرف دیکھ سکتا آخرکار ایک جگہ میری نظر ٹھٹک کر رہ گئی میز کی سطح کے مقابل دروازہ میں ایک گانٹھ سی تھی اور اس کے درمیانی حصہ میں مسامدار برادہ بھرا ہوا تھا میں نے بڑی امید و بیم کی حالت میں پرکار کی نوک سے اس کو کریدنا شروع کیا آہستہ آہستہ کافی برادہ نکل آیا اور میں خوشی سے اپنی کرسی پر تقریباً اچھل پڑا وہاں ایک چھوٹا سا سوراخ پیدا ہوگیا تھا جس میں سے ایک آنکھ بند کرکے دیکھا جاسکتا تھا۔ پہلے میں نے دوڑ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا اس کے بعد نہایت ہی آہستگی کے ساتھ اس سوراخ پر اپنی آنکھ لگادی پہلے تو میری نگاہ دھندلا گئی لیکن دوسرے ہی لمحہ میری نگاہ ایک مرکز پر جم گئی میری نظر کی زد میں سیاہ میز کا ایک مختصر سا حصہ تھا جس پر ایک نہایت ہی خوبصورت ہاتھ قرآن پاک کے سنہرے حاشیہ کو تھامے ہوئے تھا میری طرف ہاتھ کی پشت تھی جس کے وسط میں پانچ تل اس ترتیب سے اُبھرے ہوئے تھے کہ ہلال کی شکل بن گئی تھی گورے گورے نازک ہاتھ پر یہ سیاہ ہلال انتہائی خوشنما معلوم ہورہا تھا چند ہی منٹ بعد تلاوت ختم ہوگئی اور وہ ہاتھ نظر کے سامنے سے ہٹ گیا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس سوراخ میں سے کچھ اور دیکھ سکوں لیکن وہ اس قدر چھوٹا اور اندر سے ترچھا تھا کہ اس سے زیادہ اور

کچھ لفظ نہ سکا صرف کسی کی ہلکی سی چاپ سنائی دی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ تین مہینوں تک مسلسل میں اس ہاتھ کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ اس ہاتھ کا نقش میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا اور میری نگاہوں میں سما گیا۔ اب میرا امتحان شروع ہو چکا تھا اور کچھ ایسی صورت ہو گئی تھی کہ مجھے اپنے دوست کے ہاں منتقل ہو جانا پڑا۔ میں اس نظارہ سے محروم تو ہو چکا تھا لیکن میرا حال یہ ہو گیا تھا کہ مجھے ہر طرف وہ ہاتھ لہراتا ہوا دکھائی دیتا تھا امتحان ہال میں پرچوں پر جھکتے ہوئے اچانک یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی "والتین والزیتون" کی تلاوت کرنے لگا ہو اور کسی پُراسرار ہاتھ کی ٹھنڈی ٹھنڈی نازک انگلیاں میرے ذہن میں کچھ ٹٹول رہی ہوں میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ اس آواز کو سنتا اور انگلیوں کے خنک لمس کو محسوس کرتا رہتا اور اس وقت چونکتا جب کہ وقت ختم ہونے کی گھنٹی بج جاتی ہال سے باہر نکلتے ہوئے میں پختہ ارادہ کر لیتا کہ امتحان ختم ہوتے ہی حویلی کے پچھلے حصہ میں رہنے والوں کا پتہ چلاؤں گا۔ لیکن آہ! کہ امتحان ختم ہونے پر جب میں حویلی کے عقب کی سڑک پر گیا تو یہ دیکھ کر میری نظر پتھرا گئی کہ دروازہ بند تھا اور تالے پر سرکاری سیل لگی ہوئی تھی۔ اور نیلام کا ایک نوٹس دیوار پر آویزاں تھا۔

یہ وہ پہلا اتفاق تھا جبکہ میں نے اس ہاتھ کو دیکھا تھا۔

"اور دوسری مرتبہ" الفاظ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئے وہ ٹکٹکی لگائے ڈاکٹر کے چہرے کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اس کا سارا جسم بے حس ہو گیا ہے اور ساری جان ان دو ساکت پتلیوں میں کھنچ کر آ گئی ہے۔

"اور دوسری مرتبہ" ڈاکٹر نے بولنا شروع کیا اس کی آواز اور زیادہ گہری ہو گئی اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے۔ پیالیوں میں کافی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو رہی تھی اور سلسلہ سخن نہایت ہی گرم ہو چلا تھا ——— میں نے اس ہاتھ کو چند برسوں بعد دیکھا۔ ان دنوں میں ریلوے میں ڈاکٹر تھا اور حیدر آباد کی سرحد پر فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی میری ڈیوٹی واڑی جنکشن پر لگا دی گئی تھی ہر دوسرے تیسرے دن بمبئی سے آنے والا میل بڑے دردناک حادثوں کو لئے ہوئے آتا مجھے کتنے ہی زخمیوں کو دیکھنا اور لاشوں کا پنچ نامہ کرانا پڑتا ایک دن گاڑی اس حال میں پہنچی کہ وہ بالکل خالی کر دی گئی تھی ڈرائیور نے بتایا کہ فسادیوں نے سرحدی اسٹیشن پر تمام سواریوں کو اتار لیا۔ ڈبوں کے اندر یوں لگتا تھا جیسے پانی پت کی لڑائی لڑی گئی ہے۔ ہر ڈبہ میں خون بہہ رہا تھا فسٹ کلاس کے ایک ڈبہ کو کھول کر جونہی میں نے اندر قدم رکھا ٹارچ کی روشنی ایک ایسی خوفناک چیز پر پڑی کہ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ——— "نازو" ڈاکٹر نے فریدہ عثمانی کا ہاتھ تھام لیا وہ ایک ہاتھ تھا نازو کٹا ہوا نسوانی ہاتھ جس میں سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا خون کے دلدل میں ہتھیلی کے بل وہ ہاتھ پڑا ہوا تھا اور ۔ ۔ ۔ اور نازو اس کی پشت پر وہی سیاہ ہلال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "اُف" فریدہ عثمانی بڑے کرب کے ساتھ لرز گئی اور اس کا ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر اس طرح ٹک گیا جیسے وہ بے جان ہو ——— ڈاکٹر نے دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں گویا وہ اس وحشتناک منظر کو اپنے سامنے پا رہا ہو۔ کچھ دیر دونوں بڑی بے حسی کے ساتھ بیٹھے رہے ——— "اور ہاں! نازو" ڈاکٹر کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی اس ہاتھ کی پھیلی ہوئی انگلیوں کے سامنے ایک چھوٹا سا قرآن شریف پڑا ہوا تھا جس کا کنارہ سنہرا تھا ——— ڈاکٹر پھر کچھ دیر خاموش ہو گیا جیسے وہ اپنی بات کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو۔ "یوں معلوم ہوتا تھا نازو۔" اس کی ڈوبتی ہوئی آواز پھر ایک بار سنائی دی جیسے اس کو عین اس وقت قطع کر دیا گیا جبکہ وہ قرآن شریف اٹھانے کے لئے بلند ہو رہا تھا۔

"یہ دوسرا اتفاق" ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔

فریدہ عثمانی نے اپنے داہنے پہنچے کو سیدھے ہاتھ سے بڑی سختی کے ساتھ جکڑ لیا اور اس کے چہرے پر ایسے آثار پیدا ہو گئے گویا کوئی خود اس کا ہاتھ قطع کر رہا ہو۔

"بس کرو ڈاکٹر! اچانک وہ چیخی اور خود ہی اپنی آواز سے ڈر گئی جیسے وہ کسی اور کی اجنبی آواز تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں "بس نازو! اب تو صرف دو چار باتیں ہی رہ گئی ہیں آؤ وہ بھی بتا دوں۔" ڈاکٹر میجر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ بھی اس کے ساتھ اس طرح اٹھی جیسے وہ سحر زدہ معمول ہے اور اس کو اپنی حرکتوں پر قابو نہیں رہا ہے ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اس کے ساتھ ایک پرچھائیں کی طرح زینہ سے اترنے لگا۔

ڈاکٹر میجر رحیم نے نیچے پہونچ کر اپنی لیبارٹری کا دروازہ کھولا اور مختلف میزوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے وہ ایک جگہ جاکر ٹھیر گیا یہ ایک سیاہ میز تھی جس پر ایک سنہرے کناروں والا قرآن شریف رکھا ہوا تھا اور کوئی چیز ریشمی غلاف میں ڈھکی ہوئی رکھی تھی ہاتھ بڑھا کر اس نے وہ غلاف اتار لیا۔

"دیکھو نازو! یہ ہے وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک سربند مرتبان میں کیمیاوی محلول کے اندر ایک ہاتھ اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ اس کی انگلیاں اندر کی طرف مڑی ہوئی تھیں اور صرف انگشتِ شہادت سیدھی کھڑی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہے وہ ہاتھ اور وہ سیاہ ہلالی نشان۔ زبیدہ عثمانی نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اس کے بازو سے لگی ہوئی بے حس و حرکت اسی طرح کھڑی رہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا جس پر خون کی ایک بھی بوند نظر نہیں آرہی تھی دونوں متوحش آنکھیں سامنے اس طرح جمی ہوئی تھیں جیسے ان کی بصارت جاتی رہی تھی، پھر دفعتاً اس نے ایک جھرجھری لی، ایک دلدوز چیخ خاموش لیبارٹری میں گونج گئی اور وہ لڑکھڑا گئی ڈاکٹر نے فوراً ہی اسے اپنے بازوؤں پر سنبھال لیا اور نیچے پڑے ہوئے کوچ پر اس کے ٹھنڈے جسم کو لٹا دیا۔

"ڈر گئی بیچاری" ایک شال اس کے جسم پر ڈالتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ اس کا سیدھا ہاتھ لحاف سے باہر لٹک رہا تھا اس کو اس نے اپنے ہاتھ میں تھام لیا کاش! وہ پھر بڑبڑایا۔ کس قدر مشابہ بالکل اس کا جوڑ کاش تمہارا اپنا ہاتھ کٹا ہوا ہوتا اور تم نازو نہ بنتیں بلکہ صرف زبیدہ عثمانی ہی رہتیں، لیکن افسوس تم نازو ہو اور تمہارا ہاتھ موجود ہے۔

چند ایک مناسب تدابیر اختیار کرنے پر زبیدہ عثمانی نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور ڈاکٹر نے کسی دوا کی ایک خوراک اس کے حلق میں انڈیل دی۔

وہ اب بہت زیادہ پُرسکون معلوم ہو رہی تھی کوچ کے دستہ پر اپنا سر رکھ کر وہ ڈاکٹر کو بڑی نرم نگاہوں سے دیکھنے لگی جو اس کے قریب فرش پر دوزانو بیٹھا ہوا تھا "ڈر گئیں نازو اب تو ٹھیک ہو نا! مجھے معاف کرنا میں نے تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا"

زبیدہ عثمانی نے کوئی جواب نہیں دیا بس ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

"ڈاکٹر!" اس نے سرسراتے ہوئے لہجہ میں کہا اگر میرا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہوتا تو کیا تم ۔ ۔ ۔ ۔

"ہاں کیوں نہیں" ڈاکٹر نے جلدی سے جواب دیا۔

"اس صورت میں بھی کہ وہ اسی طرح ہلکے ہلکے بول رہی تھی میں نے گزشتہ رات ایک اجنبی خوابگاہ میں گزاری ہو اور اس سے قبل بھی چند دوسری خوابگاہوں میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ڈاکٹر خاموشی سے اسے تکتا رہ گیا جیسے وہ سخت مشکل میں پڑ گیا ہو پھر وہ اٹھ کر سیاہ میز کے قریب گیا اس پر اپنی دونوں ہتھیلیاں ٹیک دیں کبھی تو وہ اس کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا اور کبھی سنہرے حاشیہ والے قرآن کو! زبیدہ عثمانی کی طرف اس کی

پشت تھی اس کا دراز قد گہرے نارنجی لبادے میں قدرے سامنے کی طرف جھکا ہوا نہایت ہی دلکش معلوم ہو رہا تھا اور وہ بڑے کرب کے ساتھ اس کی طرف ٹکٹکی لگائے جواب کی منتظر تھی کچھ اس طرح جیسے اس نے کسی بہت بڑے داؤں پر اپنی پونجی لگا دی ہو اور بہت ہی جلد ہار جیت کا فیصلہ ہونے والا ہو ـــ ٹک ٹک لمحے گزرتے جا رہے تھے خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی اور اس کا دل بری طرح اُچھل رہا تھا۔

ڈاکٹر میجر اسی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا آخر کار اس کی مری ہوئی سی آواز آئی " نازو ! میں ایک عرصے جس کا انتظار کر رہا ہوں وہ شاید مجھے مل نہ سکے۔ مجھے ڈر ہے کہ میں تباہی کے جس کنارے پر پہونچ گیا ہوں وہاں ٹھہر نہ سکوں گا اور بہت ہی جلد لڑکھڑا کر گر جاؤں گا اور تم نازو ! تم ! اس کی آواز اونچی ہوتی گئی اور وہ اچانک اس کی طرف گھوم گیا، تمہارا تو دوسرا ہاتھ صحیح و سالم موجود ہے وہ تو کسی پاک صحیفہ کو پکڑتے ہوئے کانپا نہیں گیا اور تم تو صرف نازو ہو نازو ! لیکن تم صحیح معنوں میں فریدہ عثمانی بن سکو گی ؟ اوہ ! بولتی کیوں نہیں ہو بولو بولو ! کیا تم بھی فریدہ عثمانی بن سکتی ہو ـــ بولو ـــ میری سویٹ ڈارلنگ بولو ! ایک مات کھایا ہوا کھلاڑی دوسرے ہارتے ہوئے جواری کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ اوہ ! تم تو بالکل ہی خاموش ہو گئیں وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا لیکن وہ ان سب باتوں کو سُن نہیں سکی پہلے ہی چند لفظوں کے بعد اس کا سر کوچ کے دستے پر سے ڈھلک گیا تھا ڈاکٹر نے جھک کر اس کے دونوں بازو پکڑ لئے اور دیوانگی کے عالم میں اسے جھنجوڑ دیا سو گئی بیچاری ! قاہ ! قاہ ! اس نے ایک قہقہہ لگایا سوتی رہو معصوم لڑکی سوتی رہو قاہ قاہ !

وہ اسی طرح قہقہے لگاتے ہوئے الماری کے قریب گیا اور اس میں سے جام اور بوتل نکالے اور کرسی گھسیٹ کر ایک تپائی کے قریب بیٹھ گیا جام بھر کر اس نے ہونٹوں سے لگایا لیکن چکھے بغیر اس کو تپائی پر رکھ دیا اور اٹھ کر کالی میز کے قریب گیا اور بڑی عقیدت کے ساتھ اس نے ریشمین غلاف مرتبان پر ڈھک دیا اور ایک اخبار قرآن شریف پر ڈال دیا لوٹ کر اس نے دوبارہ پیالہ اٹھایا لیکن اس مرتبہ بھی ہونٹوں تک پہونچ کر اس کا ہاتھ رک گیا وہ دوبارہ گھوم کر کوچ کے قریب گیا ہاتھ میں جام لئے وہ دوزانو بیٹھ گیا پھر اس نے بڑی نرمی کے ساتھ فریدہ عثمانی کا منہ کھولا اور اس میں آہستہ آہستہ شراب انڈیل دی اور اس کا سیدھا لٹکتا ہوا ہاتھ بڑی احتیاط سے اس کے سینہ پر رکھ کر واپس لوٹ آیا۔

کمرہ میں پوری پوری خاموشی چھائی ہوئی تھی صرف تھوڑے تھوڑے وقفے سے بوتل کے کارک اُڑنے اور شراب پینے کی غٹاغٹ سنائی دیتی رہی کچھ دیر بعد اس کی کرسی کے اطراف کئی ایک خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں دو چار جام اوندھے گرے ہوئے تھے ایک جام اس کے لٹکے ہوئے ہاتھ میں جھول رہا تھا جس میں سے تھوڑا تھوڑا شراب فرش پر گرتا جا رہا تھا اور ڈاکٹر میجر رحیم فوج کا میڈیکل آفیسر کرسی پر سر ٹکائے مدہوش پڑا تھا۔ کئی گھنٹے بعد جب کہ باہر درختوں کے سائے کافی لانبے ہو گئے تھے اس کی آنکھ کھلی بڑی دیر تک تو وہ خالی خالی آنکھوں سے چھت کی طرف تکتا رہا اس کے بعد اچانک اس نے کوچ کی طرف نگاہ دوڑائی کوچ خالی پڑا تھا، لحاف بے ترتیبی سے لٹک رہا تھا۔

" اُف " اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے " بیچاری " وہ بڑبڑایا وہ چلی گئی اچھا ہوا لیکن آہ ! کاش وہ نہ جاتی، ممکن تھا اُلجھی ہوئی ڈور سلجھ جاتی، ممکن تھا کہ دھندلے شیشہ کی آب لوٹ آتی ممکن تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ مجھے سنبھال لیتے بہت کچھ ممکن تھا ڈاکٹر میجر بہت کچھ ممکن تھا اُف ! تم نے یہ کیا کیا اب یہ ویران زندگی کیسے گزرے گی

آخر کب تک میری ڈسیٹر کار سنسان راستوں پر بھٹکتی رہے گی میں کب تک یہ نئے نئے تجربے کئے جاؤں گا میں ان تجربوں سے تنگ آگیا ہوں تمہارا احسان بالکل ہی تنگ! آہ! اس کا ہاتھ کس قدر ملتا جلتا تھا ذرہ برابر بھی تو فرق نہیں تھا اُف! میں نے کسی پاکیزہ شباہت کو کھو دیا اوہ میرے خدا! یہ کونسی بدبختی ہے جو مجھے گھیر رہی ہے، اب کون سا ہاتھ ہے جو مجھے سہارا دے کوئی بھی تو نہیں کوئی بھی تو نہیں، اور یہ منحوس مردہ ہاتھ یہ بے حس و حرکت ہاتھ میری زندگی پر سانپ کے پھن کی طرح چھایا ہوا ہے آخر کب تک میں اس بے جان ہاتھ کا احترام کرتا رہوں اور کب تک انتظار کرتا رہوں اس نے زور سے ٹھوکر ماری سامنے رکھی ہوئی تپائی دور جا گری دو چار بوتلیں ٹکرا کر کھنکنا اٹھیں اور وہ ایک جنون کی حالت میں اُٹھ کھڑا ہوا تیزی سے سیاہ میز کے پاس جا کر مرتبان کو اٹھا لیا اس کے دونوں ہاتھ سر سے اوپر پہونچ گئے قریب تھا کہ وہ مرتبان کو نیچے پٹک دیتا لیکن اچانک اس کی نظر ایک عجیب سی چیز پر پڑی جو سفید پٹیوں میں لپٹی ہوئی وہاں سنہرے حاشیوں والے قرآن کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور اس نے گرتے ہوئے مرتبان کو بمشکل سینہ کے قریب سنبھال لیا۔ اس نے ہوئے سے مرتبان میز پر رکھ دیا اور بے اختیار اس پُراسرار چیز کو اٹھا لیا۔ اور ایک جھٹکے میں سفید پٹیوں کو علیحدہ کر دیا ——— .. ——— ڈاکٹر کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی ——— وہ ایک خوبصورت نسوانی ہاتھ تھا جس کی پشت پر ایک سیاہ ہلالی نشان بنا ہوا تھا۔

لیکن یہ کیا؟ ڈاکٹر ڈمبر نے ہاتھ کے پہنچے کے نیچے لگے ہوئے کلپوں کو کھینچ کر دیکھا اُف میرے خدا یہ تو مصنوعی ہاتھ ہے! دوسرے ہی لمحہ سارا معاملہ ڈاکٹر کے سمجھ میں آگیا اور وہ تیزی سے لپکتا ہوا نیچے دوڑا ہر طرف تنہائی اور خاموشی تھی اور پورٹیکو میں اس کی نیلی ڈسیٹر چپ چاپ کھڑی ہوئی تھی وہ اچھل کر سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ مگر جوں ہی اس کی نظر دوسری خالی سیٹ پر پڑی اس نے انجن کو دوبارہ بند کر دیا۔ اور پشت پر اپنا سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہاں خالی سیٹ پر چیونگم کا ایک مسلا ہوا خالی پیکٹ پڑا ہوا تھا!

روحِ انتخاب

ان پر افسوس ہے جو گھر سے گھر اور کھیت سے کھیت ملا دیتے ہیں یہاں تک کہ کچھ جگہ باقی نہ بچے اور ملک میں وہی اکیلے بسیں۔ رب الافواج نے میرے کان میں کہا یقیناً بہت سے گھر اُجڑ جائیں گے اور بڑے بڑے عالیشان اور خوبصورت مکان بھی بے چراغ ہوں گے ...... اُن پر افسوس جو صبح سویرے اُٹھتے ہیں تاکہ نشہ بازی کے درپے ہوں اور جو رات کو جاگتے ہیں جب تک شراب اُن کو بھڑکا نہ دے! اور اُن کے جشن کی محفلوں میں بربط، ستار اور دف اور مے اور شراب ہیں لیکن وہ خداوند کے کام کو نہیں سوچتے اور اُس کے ہاتھوں کی کاریگری پر غور نہیں کرتے! اس لئے میرے لوگ جہالت کے سبب سے اسیری میں جاتے ہیں۔ اُن کے بزرگ بھوکوں مرتے اور عوام پیاس سے جلتے ہیں! پس پاتال اپنی ہوس بڑھاتا ہے اور اپنا منہ بے انتہا پھاڑتا ہے اور اُن کے شریف اور عام لوگ اور غوغائی اور جو کوئی اُن میں فخر کرتا ہے اُس میں اُتر جائیں گے۔ اور چھوٹا آدمی جھکایا جائے گا اور بڑا آدمی پست ہوگا اور مغروروں کی آنکھیں نیچی ہو جائیں گی۔

اُن پر افسوس جو بدی کو نیکی اور نیکی کو بدی کہتے ہیں اور نور کی جگہ تاریکی کو اور تاریکی کی جگہ نور کو دیتے ہیں اور شیرینی کے بدلے تلخی اور تلخی کے بدلے شیرینی رکھ دیتے ہیں۔ اُن پر افسوس جو اپنی نظر میں دانشمند اور اپنی نگاہ میں صاحبِ امتیاز ہیں۔

اُن پر افسوس جو مے پینے میں زورآور اور شراب پلانے میں پہلوان ہیں۔ جو رشوت لیکر شریروں کو صادق اور صادقوں کو ناراست ٹھہراتے ہیں۔ پس جس طرح آگ بھوسے کو کھا جاتی ہے اور جلتا ہوا پھونس بیٹھ جاتا ہے اسی طرح اُن کی جڑ بوسیدہ ہوگی اور اُن کی کلی گرد کی طرح اُڑ جائے گی کیونکہ انہوں نے رب الافواج کی شریعت کو ترک کیا اور اسرائیل کے قدوس کے کلام کو حقیر جانا۔ (یسعیاہ)

مُبارک ہے وہ آدمی جو حکمت کو پاتا ہے اور وہ جو فہم حاصل کرتا ہے کیونکہ اُس کا حصول چاندی کے حصول سے اور اُس کا نفع کندن سے بہتر ہے، وہ مرجان سے زیادہ بیش بہا ہے ——— عداوت کو چھپانے والا دروغگو ہے اور تہمت لگانے والا احمق ہے، کلام کی کثرت خطا سے خالی نہیں لیکن ہونٹوں کو قابو میں رکھنے والا دانا ہے، سچے آدمی کی زبان خالص چاندی ہے ——— جو اپنے مال پر بھروسا کرتا ہے گر پڑے گا ——— جھگڑے کا شروع پانی کے پھوٹ نکلنے کی مانند ہے اس لئے لڑائی سے پہلے جھگڑے کو چھوڑ دو ——— احمق بیٹا اپنے باپ کے لئے غم اور اپنی ماں کے لئے تلخی ہے ——— جو مسکین کا نالہ سُنکر کان بند کر لیتا ہے (ایک دن) وہ نالہ کرے گا اور کوئی نہ سُنے گا ——— جو مسکینوں کو دیتا ہے محتاج نہ ہوگا لیکن جو آنکھ چُراتا ہے بہت ملعون ہوگا ——— جب شریر لوگ اقبالمند ہوتے ہیں تو بدی زیادہ ہوتی ہے لیکن سچے لوگ (صادقین) اُن کی تباہی دیکھیں گے ——— حاکم کی مہربانی کے طالب بہت ہیں لیکن فیصلہ خداوند کے ہاتھ میں ہے ——— شراب کی تلاش حاکموں کو زیبا نہیں مبادا وہ پی کر قوانین کو بھول جائیں اور کسی مظلوم کی حق تلفی

کریں ــــــ چھ چیزیں ہیں جن سے خداوند کو نفرت ہے بلکہ سات ہیں جن سے اُسے کراہت ہے، اونچی آنکھیں، جھوٹی زبان
بے گناہ کا خون بہانے والا ہاتھ، بُرے منصوبے باندھنے والا دل، شرارت کے لئے تیز رو پاؤں، جھوٹا گواہ جو دروغ گوئی کرتا
ہے، اور جو بھائیوں میں نفاق ڈالتا ہے ــــــ کیا ممکن ہے کہ آدمی اپنے سینے کے اندر آگ رکھے اور اُس کے کپڑے
نہ جلیں یا کوئی انگاروں پر چلے اور اُس کے پاؤں نہ جھلسیں وہ بھی ایسا ہے جو اپنی پڑوسی کی بیوی کے پاس جاتا ہے۔ (امثال)
زر دوست روپیہ سے آسودہ نہ ہوگا اور دولت کا چاہنے والا اُس کے بڑھنے سے سیر نہ ہوگا، یہ بھی بُطلان ہے ــــــ
جب مال کی فراوانی ہوتی ہے تو اُس کے کھانے والے بھی بہت ہو جاتے ہیں اور اُس کے مالک کے سوا اس کے کہ اسے اپنی
آنکھوں سے دیکھے اور کیا فائدہ ہے؟ محنتی کی نیند میٹھی ہے خواہ وہ تھوڑا کھائے خواہ بہت لیکن دولت کی فراوانی دولت مند کو
سونے نہیں دیتی ــــــ بُرے کام پر سزا کا حکم فوراً نہیں دیا جاتا اس لئے بنی آدم کا دل ان میں بدی پر بہ شدت مائل
ہے، اگرچہ گنہگار سو بار بُرائی کرے اور اُس کی عمر دراز ہو، تو بھی میں یقیناً جانتا ہوں کہ ان ہی کا بھلا ہوگا جو خدا ترس ہیں اور
اُس کے حُضور کانپتے ہیں لیکن گنہگار کا کبھی بھلا نہ ہوگا اور نہ وہ اپنے دنوں کو سایہ کی مانند بڑھائے گا اس لئے کہ وہ خدا کے حضور
کانپتا نہیں ــــــ خدا سے ڈر اور اُس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرضِ کلی یہی ہے کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ
چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو، خواہ بُری عدالت میں لائے گا۔ (واعظ)

خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا، اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔۔۔۔
خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جُدا
کیا اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی، اور صبح ہوئی۔ سو پہلا دن ہوا، اور خدا نے کہا کہ پانیوں
کے درمیان فضا ہو تاکہ پانی پانی سے جُدا ہو جائے، جس خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانی کو فضا کے اوپر کے پانی سے
جُدا کیا اور ایسا ہی ہوا، اور خدا نے فضا کو آسمان کہا اور شام ہوئی اور صبح ہوئی، سو دوسرا دن ہوا۔
اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کہ خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا، اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور
جو پانی جمع ہو گیا تھا اُس کو سمندر اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے ۞ اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں کو اور پھلدار
درختوں کو جو اپنی اپنی جنس موافق پھلیں اور جو زمین پر آپ ہی میں بیج رکھیں اُگائے اور ایسا ہی ہوا ۞ تب زمین نے گھاس
اور بوٹیوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق بیج رکھیں اور پھلدار درختوں کو جن کے بیج اُن کی جنس کے موافق اُن میں ہیں اُگایا
اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے ۞ اور شام ہوئی اور صبح ہوئی اور تیسرا دن ہوا۔
. . . . خدا نے دو بڑے نیر بنائے ایک نیرِ اکبر کہ دن پر حکم اور ایک نیرِ اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اُس نے
ستاروں کو بھی بنایا اور خدا نے اُن کو فلک پر رکھا کہ زمین پر روشنی ڈالیں۔ . . . . اور خدا نے کہا کہ پانی جانداروں
کو کثرت سے پیدا کریں اور پرندے زمین کے اوپر فضا میں اُڑیں ــــــ اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔
. . . . (پیدائش)

جو کوئی ربِ واحد کو چھوڑ کر کسی اور معبود کے آگے قربانی چڑھائے وہ بالکل نابود کر دیا جائے ۞ اور تو مسافر کو
نہ ستانا نہ اُس پر ستم کرنا اس لئے کہ تم بھی ملک مصر میں مسافر تھے ۞ تم کسی بیوہ یا یتیم لڑکے کو دُکھ نہ دینا ۞ اگر تو اُن
کو کسی طرح سے دُکھ دے اور وہ مجھ سے فریاد کریں تو میں ضرور اُن کی فریاد سنوں گا، اور میرا قہر بھڑکے گا اور

میں تم کو تلوار سے ماروں گا اور تمہاری بیویاں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے ۝

اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو کچھ قرض دے تو اُس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اُس سے سود لینا ۝ اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایہ کے کپڑے گرو بھی رکھ لے تو سورج ڈوبنے تک اُس کو واپس کر دینا ۝ کیونکہ فقط وہی اس کا ایک اوڑھنا ہے اُس کے جسم کا وہی لباس ہے پھر وہ کیا اوڑھ کر سوئے گا؟ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اُس کی سنوں گا کیونکہ میں مہربان ہوں ۝

تو جھوٹی بات نہ پھیلانا اور ناراست گواہ ہونے کے لئے شریروں کا ساتھ نہ دینا ۝ برائی کرنے کے لئے کسی بھیڑ کی پیروی نہ کرنا اور نہ کسی مقدمہ میں انصاف کا خون کرانے کے لئے بھیڑ کا منہ دیکھ کر کچھ کہنا اور نہ مقدمہ میں کنگال کی طرفداری کرنا ۝

تو اپنے کنگال لوگوں کے مقدمہ میں انصاف کا خون نہ کرنا ۝ جھوٹے معاملے سے دور رہنا اور بے گناہوں اور صادقوں کو قتل نہ کرنا کیونکہ میں شریر کو راست نہیں ٹھہراؤں گا، تو رشوت نہ لینا کیونکہ رشوت بیناؤں کو اندھا کر دیتی ہے اور صادقوں کی بات کو پلٹ دیتی ہے اور پردیسی پر ظلم نہ کرنا کیونکہ تم پردیسی کے دل کو جانتے ہو اس لئے کہ تم خود بھی ملک مصر میں پردیسی تھے ۝ (خروج)

اور اگر تیرا کوئی بھائی مفلس ہو جائے اور وہ تیرے سامنے تنگ دست ہو تو اسے سنبھالنا وہ پردیسی اور مسافر کی طرح تیرے ساتھ رہے تو اُس سے سود یا نفع مت لینا بلکہ اپنے خدا کا خوف رکھنا تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگی بسر کر سکے ۝ تو اپنا روپیہ اُسے سود پر مت دینا اور اپنا کھانا بھی اُسے نفع کے خیال سے نہ دینا ۝

تم اپنے لئے بت نہ بنانا اور نہ کوئی تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لئے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو اس لئے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں ۝ (احبار)

اگر تیرے درمیان تیری بستیوں میں جن کو خداوند تیرا خدا تجھ کو دے کہیں کوئی مرد یا عورت ملے جس نے ...... تیرے خدا کے حضور بدکاری کی ہو اور اُس کے عہد کو توڑا ہو ۝ اور جا کر اور معبودوں کی یا سورج یا چاند یا اجرام فلک میں سے کسی کی جس کا حکم میں نے تجھ کو نہیں دیا پوجا اور پرستش کی ہو اور یہ بات تجھے بتائی جائے اور تیرے سننے میں آئے تو تو جانفشانی سے تحقیقات کرنا اور اگر یہ ٹھیک ہو اور قطعی طور پر ثابت ہو جائے کہ اسرائیل میں ایسا مکروہ کام ہوا تو تو اُس مرد یا عورت کو جس نے یہ برا کام کیا ہو باہر اپنے پھاٹکوں پر نکال لے جانا اور اُن کو ایسا سنگسار کرنا کہ وہ مر جائیں ۝ جو واجب القتل ٹھہرے وہ دو یا تین آدمیوں کی گواہی سے مارا جائے فقط ایک ہی آدمی کی گواہی سے وہ مارا نہ جائے ۝ اُس کو قتل کرتے وقت گواہوں کے ہاتھ پہلے اُس پر اٹھیں اُس کے بعد باقی سب لوگوں کے ہاتھ ــــ یوں تو اپنے درمیان سے شرارت کو دفع کرنا ۝

جب تو اُس ملک میں جو خداوند تیرا خدا تجھ کو دیتا ہے پہنچ جائے تو وہاں کی قوموں کی طرح مکروہ کام کرنے نہ سیکھنا تجھ میں ہرگز کوئی ایسا نہ ہو جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو آگ میں چلوائے یا فال گیر یا شگون نکالنے والا یا افسوں گر یا جادوگر یا منتری یا جنات کا آشنا یا رمال یا ساحر ہو کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خداوند کے نزدیک مکروہ ہیں ...... ۝

تو اپنے تھیلے میں طرح طرح کے چھوٹے اور بڑے باٹ نہ رکھنا ۝ تو اپنے گھر میں طرح طرح کے چھوٹے اور بڑے پیمانے بھی نہ رکھنا ۝ تیرا باٹ اور پیمانہ پورا اور ٹھیک ہو تاکہ اُس ملک میں جسے خداوند تیرا خدا تجھ کو دیتا ہے تیری عمر دراز ہو ۝ اس لئے کہ وہ سب جو ایسے فریب کے کام کرتے ہیں خداوند تیرے خدا کے نزدیک مکروہ ہیں ۝

کان لگاؤ اے آسمانو! اور میں بولوں گا اور زمین میرے منہ کی باتیں سنے، میری تعلیم مینہ کی طرح برسے گی، میری تقریر شبنم کی مانند ٹپکے گی جیسے نرم گھاس پر پھوار پڑتی ہو اور سبزی پر جھڑیاں! کیونکہ میں خداوند کے نام کا اشتہار دوں گا، تم ہمارے

خدا کی تعظیم کرو وہ وہی چٹان ہے، اُس کی صنعت کامل ہے کیوں کہ اُس کی سب راہیں انصاف کی ہیں ٥

خداوند سینا سے آیا، اور شعیر سے اُن پر آشکار ہوا، وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا، اُس کے داہنے ہاتھ پر اُن کے لئے آتشیں شریعت تھی، وہ بے شک قوموں سے محبت رکھتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ٥ (استثناء)

جب خدا نے داؤد کو اُس کے سب دشمنوں اور ساؤل کے ہاتھ سے رہائی دی تو اُس نے خداوند کے حضور اس مضمون کا گیت سُنایا، وہ کہنے لگا:۔

خداوند! میری چٹان، میرا قلعہ اور میرا چھڑانے والا ہے ٥ خدا میری چٹان ہے میں اُسی پر بھروسا کروں گا، وہی میری سپر اور میری نجات کا سینگ ہے، میرا اونچا برج اور میری پناہ ہے، میرے نجات دینے والے تو ہی مجھے ظلم سے بچاتا ہے، میں خداوند کو جو ستائش کے لائق ہے پکاروں گا، یوں میں اپنے دشمنوں سے بچایا جاؤں گا کیوں کہ موت کی موجوں نے مجھے گھیرا، بے دینی کے سیلابوں نے مجھے ڈرایا! پاتال کی رسّیاں میرے چوگرد تھیں، موت کے پھندے مجھ پر آپڑے تھے اپنی مصیبتوں میں میں نے خدا کو پکارا، میں اپنے خدا کے حضور چلایا، اُس نے اپنی ہیکل سے میری آواز سُنی اور میری فریاد اُس کے کان میں پہونچی، تب زمین ہل گئی اور کانپ اُٹھی۔ ۔ ۔ ۔ ٥

خدا میرا مضبوط قلعہ ہے وہ اپنی راہ میں ہر کامل شخص کی راہ نمائی کرتا ہے وہ اُس کے پاؤں ہرنیوں کے سے بنادیتا ہے اور مجھے میری اونچی جگہوں میں قایم کرتا ہے، وہ میرے ہاتھوں کو جنگ کرنا سکھاتا ہے یہاں تک کہ میرے بازو پیتل کی کمان کو جھکا دیتے ہیں —— تو نے مجھ کو اپنی نجات کی سپر بخشی اور تیری نرمی نے مجھے بزرگ بنایا ہے تو نے میرے قدم کشادہ کردیئے اور میرے پاؤں نہیں پھسلے۔

اسرائیل کے خدا نے فرمایا:۔

ایک ہے جو صداقت سے لوگوں پر حکومت کرتا ہے، جو خدا کے خوف کے ساتھ حکومت کرتا ہے وہ صبح کی روشنی کی مانند ہوگا جب سورج نکلتا ہے ایسی صبح جس میں بادل نہ ہوں —— جب نرم نرم گھاس زمین میں سے بارش کے بعد کی صاف چمک کے باعث نکلتی ہے، میرا گھر تو یوں خدا کے سامنے ایسا ہے بھی نہیں، تو بھی اُس نے میرے ساتھ ایک دائمی عہد جس کی سب باتیں معین اور پائدار ہیں باندھا ہے کیوں کہ یہی میری ساری نجات اور ساری مُراد ہے گو وہ اُس کو بڑھاتا نہیں —— پر ناراست لوگ سب کے سب کانٹوں کی مانند ٹھیریں گے جو ہٹا دیئے جاتے ہیں کیوں کہ وہ ہاتھ سے پکڑے نہیں جاسکتے بلکہ جو آدمی اُن کو چھوتے ضرور ہے کہ وہ لوہے اور نیزہ کی چھڑ سے مسلح ہو! (سموئیل) ٥

اور خدا نے سلیمانؑ کو حکمت اور سمجھ بہت زیادہ اور دل کی وسعت بھی عنایت کی جیسی سمندر کے کنارے کی ریت ہوتی ہے اور سلیمانؑ کی حکمت سب اہلِ مشرق کی حکمت اور مصر کی ساری حکمت پر فوقیت رکھتی تھی، اس لئے کہ وہ سب آدمیوں سے ۔ ۔ ۔ زیادہ دانشمند تھا اور چوگرد کی سب قوموں میں اُس کی شہرت تھی۔ ۔ ۔ اور سب قوموں میں سے زمین کے سب بادشاہوں کی طرف سے جنہوں نے اُس کی حکمت کی شہرت سُنی تھی لوگ سلیمانؑ کی حکمت کو سُننے آئے تھے۔ (سلاطین)

کیا تو قادرِ مطلق کا بھید کمال کے ساتھ دریافت کرسکتا ہے؟ وہ آسمان کی طرح اونچا ہے، تو کیا کرسکتا ہے؟ وہ پاتال سے گہرا ہے تو کیا جان سکتا ہے! اُس کی ناپ زمین سے لمبی اور سمندر سے چوڑی ہے۔ ۔ ۔ خدا میں سمجھ اور قوت ہے، اُس کے پاس مصلحت اور دانائی ہے، دیکھو! وہ ڈھا دیتا ہے تو پھر بنتا نہیں، وہ آدمی کو بند کردیتا ہے تو پھر کھلتا نہیں، دیکھو! تو وہ مینہ کو روک لیتا ہے تو پانی سوکھ جاتا ہے، پھر جب وہ اُسے بھیجتا ہے تو وہ زمین کو اُلٹ دیتا ہے اُس میں طاقت اور تاثیر کی قوت ہے۔ ۔ ۔ وہ اُمرا پر حقارت برساتا ہے اور زور آوروں کے کمربند کھول ڈالتا ہے، وہ اندھیرے میں سے گہری باتوں کو آشکارا کرتا اور

موت کے سایہ کو بھی روشنی میں بدل دیتا ہے ○

مبارک ہے وہ آدمی جو شریروں کی صلاح پر نہیں چلتا اور خطاکاروں کی راہ میں کھڑا نہیں ہوتا اور ٹھٹھے بازوں کی مجلس میں نہیں بیٹھتا بلکہ خداوند کی شریعت میں اُس کی خوشنودی ہے۔ ۔ ۔ ۔ جب میں پکاروں تو مجھے جواب دے، اے میرے صداقت کے خدا! تنگی میں تو نے مجھے کشادگی بخشی، مجھ پر رحم کر اور میری دُعا سُن لے! ۔ ۔ ۔ ۔ آسمان خدا کا جلال ظاہر کرتا ہے اور فضا اس کی دست کاری دکھاتی ہے، دن سے دن بات کرتا ہے اور رات کو رات حکمت سکھاتی ہے۔ ۔ ۔ !

اے خدا! میں نے تجھ پر توکل کیا ہے، مجھے شرمندہ نہ ہونے دے، میرے دُشمن مجھ پر شادیانے نہ بجائیں بلکہ جو تیرے منتظر ہیں اُن میں کوئی بھی شرمندہ نہ ہوگا پر جو ناحق بے وفائی کرتے ہیں وہی شرمندہ ہوں گے ـــ اے خداوند! اپنی راہیں مجھے دکھا، اپنے راستے مجھے بتا دے، مجھے سچائی پر چلا اور تعلیم دے کیوں کہ تو میرا نجات دینے والا خدا ہے۔ ۔ ۔ !

خدا میری روشنی اور نجات ہے، مجھے کس کی دہشت؟ خداوند میری زندگی کا پشتہ ہے، مجھے کس کی ہیبت؟ خواہ میرے خلاف لشکر خیمہ زن ہوں میرا دل نہیں ڈرے گا، خواہ میرے مقابل میں جنگ برپا ہو تو بھی میں خاطر جمع رہوں گا۔ ۔ ۔ اے خداوند! میں تجھی کو پکاروں گا، اے میری چٹان! تو میری طرف سے کان بند نہ کر، ایسا نہ ہو کہ اگر تو میری طرف خاموش رہے، تو میں اُن کی مانند بن جاؤں جو پاتال میں جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اُن شریروں اور بدکاروں کے ساتھ گھسیٹ نہ لے جا جو اپنے ہمسایوں سے صلح کی باتیں کرتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں بدی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اے فرشتگان! خداوند کی، خداوند ہی کی تمجید و تعظیم کرو خدا کی ایسی تمجید کرو جو اُس کے نام کے شایاں ہے، پاک آرائش کے ساتھ خدا کو سجدہ کرو، خداوند کی آواز بادلوں پر ہے، خدائے ذوالجلال گرجتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ خداوند کی آواز میں قدرت ہے، خدا کی آواز میں جلال ہے۔ ۔ ۔ !

اے خدا! میں تیری تمجید کروں گا کیوں کہ تو نے مجھے سرفراز کیا ہے، اور میرے دشمنوں کو مجھ پر خوش ہونے نہ دیا، اے خداوند میرے خدا! میں نے تجھ سے فریاد کی اور تو نے مجھے شفا بخشی، اے خداوند! تو میری جان کو پاتال سے نکال لایا ہے۔ ۔ ۔ ۔ خدا کی ستائش کرو! اے اُس کے مقدسو! اور اُس کے قدس کو یاد کر کے شکر گزاری کرو کیوں کہ اُس کا قہر دم بھر کا ہے اور اُس کا کرم عمر بھر کا! رات کو شاید رونا پڑے، پر صبح کو خوشی کی نوبت آتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اے خداوند! سچائی کے خدا! تو نے میرا فدیہ دیا ہے، مجھے اُن سے نفرت ہے جو جھوٹے معبودوں کو مانتے ہیں، میرا توکل خداوند ہی پر ہے۔ ۔ ۔ ۔

مبارک ہے وہ جس کی خطا بخشی گئی اور جس کا گناہ ڈھانکا گیا، مبارک ہے وہ آدمی جس کی بدکاری کو خداوند حساب میں نہیں لاتا ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے ہرنی پانی کے نالوں کو ترستی ہے، ویسے ہی اے خدا! میری روح تیرے لئے ترستی ہے، میری روح خدا کی، زندہ خدا کی پیاسی ہے، میں کب جا کر خدا کے حضور حاضر ہوں گا۔ ۔ ۔ ۔ !

خدا ہماری پناہ اور قوت ہے، مصیبت میں مستعد مددگار ـــ اس لئے ہم کو کچھ خوف نہیں، خواہ زمین اُلٹ جائے اور پہاڑ سمندر کی تہ میں ڈال دیئے جائیں، خواہ اُس کا پانی شور مچائے اور موج زن ہو اور پہاڑ اُس کی طغیانی سے ہل جائیں۔ ۔ ۔ ۔ میرا توکل خدا پر ہے میں ڈرنے کا نہیں، انسان میرا کیا کر سکتا ہے؟ اے خدا! تیری منتیں مجھ پر ہیں!

اے بزرگو! کیا تم درحقیقت راست گوئی کرتے ہو؟ اے بنی آدم! کیا تم ٹھیک عدالت کرتے ہو؟ بلکہ تم تو دل ہی دل میں شرارت کرتے ہو اور زمین پر اپنے ہاتھوں سے ظلم پھیلاتے ہو، شریر پیدائش ہی سے کجروی اختیار کرتے ہیں، وہ پیدا ہوتے ہی جھوٹ بول کر گمراہ ہو جاتے ہیں، اُن کا زہر سانپ کا زہر ہے، وہ بہرے افعی کی مانند ہیں جو کان بند کر لیتا ہے، جو منتر پڑھنے والوں

کی آواز ہی نہیں سنتا خواہ وہ کتنی ہی ہوشیاری سے منتر پڑھیں اے خدا! اُن کے دانت اُن کے مُنہ ہی میں توڑ دے، اے خداوند! ببر کے بچوں کی ڈاڑھیں توڑ ڈال وہ گھل کر بہتے پانی کی مانند ہو جائیں' جب وہ اپنے تیر چلائیں تو وہ گویا کند پیکان ہوں' وہ ایسے ہو جائیں جیسے گھونگا جو گل کر فنا ہو جاتا ہے اور جیسے عورت کا اسقاط جس نے سورج کو دیکھا ہی نہیں! اس سے پہلے کہ تمہاری ہانڈیوں کو کانٹوں کی آنچ آنے لگے وہ ہرے اور جلتے دونوں کو یکساں بگولے سے اُڑا لے جائے گا، صادق انتقام کو دیکھ کر خوش ہو گا وہ شریر کے خون سے اپنے پاؤں کو تر کرے گا، تب لوگ کہیں گے یقیناً مردِ حق کے لئے اجر ہے' بے شک خدا ہے جو زمین پر عدالت کرتا ہے۔

اے خدا! تو آسمان پر سرفراز ہو، تیرا جلال ساری زمین پر ہو! اُنھوں نے میرے پاؤں کے لئے جال لگایا ہے، میری جان عاجز آ گئی اُنھوں نے میرے آگے گڑھا کھودا، وہ خود اُس میں گر پڑے' میرا دل قایم ہے، اے خدا! میرا دل قایم ہے! میں گاؤں گا بلکہ میں مدح سرائی کروں گا، اے میری شوکت! بیدار ہو، اے بربط اور ستار جاگو! میں خود صبح سویرے جاگ اُٹھوں گا، اے خداوند! میں لوگوں میں تیرا شکر کروں گا، میں امتوں میں تیری مدح سرائی کروں گا، کیوں کہ تیری شفقت آسمان کے اور تیری سچائی افلاک کے برابر بلند۔۔۔۔ ! (زبور)

سچے ہونٹ ہمیشہ تک قایم رہیں گے لیکن جھوٹی زبان صرف دم بھر کی ہے —— ہوشیار آدمی علم کو چھپاتا ہے لیکن احمق دل حماقت کی منادی کرتا ہے —— نیک عورت اپنے شوہر کے لئے تاج ہے —— صداقت کے ساتھ تھوڑا سا مال بے انصافی کی بڑی آمدنی سے بہتر ہے۔۔۔۔۔ مسکینوں کے ساتھ فروتن بننا متکبروں کے ساتھ لوٹ کا مال تقسیم کرنے سے بہتر ہے۔۔۔ ۔۔ جو نیکی کے بدلے میں بدی کرتا ہے اُس کے گھر سے بدی ہرگز جُدا نہ ہوگی —— لکڑی نہ ہونے سے آگ بجھ جاتی ہے —— جہاں غیبت گو نہیں وہاں جھگڑا موقوف ہو جاتا ہے۔۔۔۔ جو گڑھا کھودتا ہے آپ ہی اُس میں گرے گا اور جو پتھر ڈھلکاتا ہے وہ پلٹ کر اسی پر پڑے گا۔۔۔۔۔۔ (امثال)

عیب جوئی نہ کرو کہ تمھاری بھی عیب جوئی نہ کی جائے، کیوں کہ جس طرح تم عیب جوئی کرتے ہو اُسی طرح تمھاری بھی عیب جوئی کی جائے گی اور جس پیمانہ سے تم ناپتے ہو اُسی سے تمھارے واسطے ناپا جائے گا، تو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنے آنکھ کے شہتیر پر غور نہیں کرتا! اور جب کہ تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تو اپنے بھائی سے کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ لا تیری آنکھ سے میں تنکا نکال دوں! اے ریاکار! پہلے اپنی آنکھ سے تو شہتیر نکال پھر اپنے بھائی کی آنکھ میں سے تنکے کو اچھی طرح دیکھ کر نکال سکے گا! پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو، ایسا نہ ہو کہ وہ اُن کو پاؤں تلے روندیں اور پلٹ کر تم کو چیر پھاڑیں! مانگو تو تم کو دیا جائے گا، ڈھونڈو تو پاؤ گے، دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمھارے واسطے کھولا جائے گا کیونکہ جو مانگتا ہے اُسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اُس کے واسطے کھولا جائے گا، تم میں کونسا ایسا آدمی ہے کہ اگر اُس کا بیٹا اُس سے روٹی مانگے تو وہ اُسے پتھر دے، یا اگر مچھلی مانگے تو اُسے سانپ دے! پس جب کہ تم بُرے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمھارے باپ جو آسمان پر ہے، اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دیگا' پس جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمھارے ساتھ کریں وہی تم بھی اُن کے ساتھ کرو کیوں کہ توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے۔

تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کرنا ۞ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا۔۔۔۔۔ خبردار! اپنی راستبازی کے کام آدمیوں کے سامنے دکھانے کے لئے نہ کرو۔۔۔۔ پس جب تو خیرات کرے تو اپنے آگے نرسنگا نہ بجوا، جیسا ریاکار عبادت خانوں اور کوچوں میں کرتے

ہیں تاکہ لوگ اُن کی بڑائی کریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تو خیرات کرے، تو جو تیرا داہنا ہاتھ کرتا ہے اُسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے۔ ۔ ۔ ۔ اور جب تم دعا کرو تو ریاکاروں کی مانند نہ ہو کیوں کہ وہ عبادت خانوں میں اور بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہو کر دُعا کرنا پسند کرتے ہیں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے بلکہ جب تو دُعا کرے تو اپنی کوٹھری میں جا اور دروازہ بند کر کے اپنے (یعنی خدا) سے جو پوشیدگی میں ہے دُعا کر!

اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اُداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ اُن کو روزہ دار جانیں میں تم سے سچ کہتا ہوں وہ اپنا اجر پا چکے بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو بلکہ آدمی نہیں تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے۔ ۔ ۔ ۔ اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو، جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، کیوں کہ جہاں تیرا مال ہے وہاں دل بھی لگا رہے گا، بدن کا چراغ آنکھ ہے، پس اگر تیری آنکھ درست ہو تو تیرا سارا بدن روشن ہوگا، اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے تاریکی ہو تو تاریکی کیسی بڑی ہوگی! کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا کیوں کہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت! یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا! تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔

تم زمین کے نمک ہو لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا؟ پھر وہ کسی کام کا نہیں سوا اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پیروں کے نیچے روندا جائے۔ ۔ ۔ ۔ فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن اُن کے سے کام نہ کرو کیوں کہ وہ کہتے ہیں کرتے نہیں! وہ ایسے بھاری بوجھ جن کو اُٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ اُن کو اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے! وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں، اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں، اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے "ربی" کہلانا پسند کرتے ہیں۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! افسوس کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو کیوں کہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو ——— تم پر افسوس کہ تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھتے ہو اور دکھاوے کے لئے نماز کو طول دیتے ہو، تمہیں زیادہ سزا ہوگی! ——— اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اُسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔ ——— اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ پودینہ، سولف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے، اے اندھے راہ بتانے والو! جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو!

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو! (متی)

(کتاب مقدس ——— یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ)

ہماری نظر میں

جواہر القرآن

"جواہر القرآن" مرتبہ :- قاضی عبدالرزاق ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت ڈیڑھ روپیہ
ملنے کا پتہ :- مدینہ دارالاشاعت محمد اسٹریٹ آؤٹ رم روڈ، کراچی !

اس کتاب کو جناب قاضی عبدالرزاق صاحب نے مرتب فرمایا ہے وہ اُنھوں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ مختلف قرآنی تراجم و تفاسیر کے اقتباسات سلیقہ کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں جن کا مطالعہ یقیناً فایدہ بخش اور ذہن و فکر کو قرآن کی طرف متوجہ کرنے والا ہے! سب سے زیادہ اقتباسات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "تفہیم القرآن" سے کئے ہیں!

قرآن پاک میں حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کو جو "سجدہ" سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اس سلسلہ میں یہ عبارت جو "المسلمون" کے کسی مضمون کا ترجمہ ہے کتنی بصیرت افروز ہے :-

"(حضرت آدم علیہ السلام) کے اس قصہ میں ملائکہ کا ذکر ہے کیوں کہ پہلے وہی تھے جو ابو البشر آدم علیہ السلام سے قریب ہوئے جبکہ اللہ عزوجل نے اس میں اپنی روح پھونکنے کے وقت اُن کو سجدہ کرنے کا حکم دیا" اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ سجدے عبادت اور بندگی کے لئے نہ تھے کیوں کہ ایسا سجدہ، اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سجدہ عزت تعظیم اور اُنس کا تھا، اور یہ ضروری نہیں کہ جس طرح ہم اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں اس طرح انھوں آدمؑ کے لئے اپنی پیشانیوں کو زمین پر رکھا ہو، سجدہ کی بہت سی صورتیں ہیں اور وہ مخلوق کی مختلف قسموں کی وجہ سے جُدا جُدا قسم کے ہیں، اللہ تعالیٰ کا اس کے متعلق ارشاد ہے ... ... "والنجم والشجر یسجدان" "ستارے اور درخت دونوں سجدہ کرتے ہیں" اور حضرت یوسفؑ اپنے باپ سے اپنے خواب کا حال بیان کرتے ہیں "انی رایت احد عشر کوکباً والشمس والقمر رایتھم لی ساجدین" ___ "میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو اپنے لئے سجدہ کرتے دیکھا" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وللّٰہ یسجد ما فی السمٰوٰت وما فی الارض من دابۃ والملائکۃ وھم لا یستکبرون" ۔ "اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے، مویشیوں سے اور فرشتوں سے اور وہ تکبر نہیں کرتے" یہ بات ظاہر ہے کہ مویشیوں کا سجدہ فرشتوں کے سجدے کی طرح نہیں اور اُن کا سجدہ درختوں کی طرح نہیں اور اسی طرح ... ... یہاں تک کہ لغت میں سجدہ کے معنیٰ پستی، اور تواضع (نیاز) کے پائے جاتے ہیں ___ "صاحب المنیر" کہتا ہے کہ ___ "یسجد البعیر خفض راسہ عند رکوبہ وکل شئ ذل فقد سجد"

"اونٹ کے سجدے کے معنیٰ ہیں کہ سواری کے وقت اس نے سر جھکایا اور ہر چیز جو پست ہوئی تو (گویا) اُس نے سجدہ کیا۔ ... پس وہ سجدہ تھا تعظیم اور محبت کا اور اپنے پہلو کو جھکا دینے کا اور اس کے فضیلت کے اقرار کرنے کا! ___ قرطبی نے جامع میں کہا ہے ___ بعض حضرات نے کہا ہے "کہ وہ آج والا عادی سجدہ نہ تھا جو زمین

پر پیشانی رکھنے کا ہے لیکن وہ لغت میں باقی ہے اور اُس سے مُراد جُھکنا اور تابعداری کرنا ہے یعنی آدمؑ کے لئے جُھکو اور اُس کی فضیلت کا اقرار کرو!

ملکہ حیات بخشی بیگم

"ملکہ حیات بخشی بیگم" از :- نصیر الدین ہاشمی، ضخامت ۴۵ صفحات، قیمت بارہ آنہ ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدرآباد دکن!

جناب نصیر الدین ہاشمی دکن کے مشہور ادیب ہیں جن کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اپنے وطن سے انہیں غیر معمولی محبت ہے اس لئے دکن پر انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے!

اس کتابچہ میں انہوں نے ملکہ حیات بخشی بیگم کی زندگی کے حالات قلم بند فرمائے ہیں! حیات بخشی بیگم کے شوہر سلطان محمد کے انتقال کے جب اُس کا بیٹا سلطان عبداللہ ۱۰۳۵ھ ہجری میں تخت نشین ہوا، تو اس کمسن بادشاہ کی عمر صرف بارہ سال کی تھی، اس کمسنی میں حکومت کی دیکھ بھال ناممکن تھی، اس لئے حکومت کی زمام حیات بخشی بیگم اور بادشاہ کی دادی آغا خانم نے سنبھالی۔

ملکہ حیات بخشی بیگم نے (۱) قصبہ حیات نگر (۲) مسجد اور مدرسہ حیات نگر (۳) ماساب کا تالاب (۴) مسجد قطب عالم متصل فتح دروازہ (۵) مسجد واقع دولت خانہ عالی اور (۶) علم نعل صاحب اپنی یادگاریں چھوڑیں! یہ ملکہ دکن کی تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے ——— کتاب ہر چند کہ مختصر ہے مگر معلومات آفریں ہے اور انداز بیان سلیس و سادہ ہے۔

دھندلے خاکے

"دھندلے خاکے" از :- من موہن چترویدی، ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت غیر مجلد ایک روپیہ، مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ :- نیشنل بک ڈپو، چارکمان حیدرآباد دکن!

یہ کتاب ایک نوخیز افسانہ نگار ——— من موہن چترویدی ——— کے دس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے! یہ اُن کی ابتدائی کوشش ہے اس لئے نومشقی کی خامیاں پائی جاتی ہیں مگر آثار بتا رہے ہیں کہ مشق و تجربہ کے بعد ——— من موہن چترویدی ——— افسانہ نگاری میں نام پیدا کرے گا اور آج کا گمنام، کل کا "مشہور" افسانہ نگار ہوگا۔

افسانہ نگاری کی تحریر کا صرف ایک اقتباس :-

"اس بستی میں ایک نل تھا، یہاں رہنے والوں کے آنسو تو سوکھ چکے تھے مگر نل آنسو بہا رہا تھا جس طرح بڑی حویلی والے چار چار دانے بھک منگوں میں بانٹتے ہیں اسی طرح فیاضی یہ نل بھی کر رہا تھا اُس نل سے چار گھونٹ پانی حاصل کرنے کے لئے ایک ایسی بھیڑ لگی ہوئی تھی جیسے امرت بٹ رہا ہو۔ ..."

(صفحہ ۳۹)" اور پرندے اپنے گھونسلوں میں جا رہے تھے" "میں" کا نہیں "کو" کا محل تھا، (صفحہ ۵۹) "کوئی چار بجے چاہتے ہوں گے" ——— "کوئی چار بجا چاہتے ہوں گے" لکھنا تھا ——— (صفحہ ۸۳) "یا سورج کے گھورتے جیسے کسی کی آنکھیں مُندی جاتی ہیں" "کے" نے جملہ میں جھول پیدا کر دیا ———

کئی افسانوں کا پلاٹ ایک دوسرے سے کافی ملتا جلتا ہے ——— ایک دو جگہ خدا پر بھی طنز کی ہے، جو خدا پرستوں کے لئے "تکلیف دہ" ہے ——— ہوس کو محبت سے تعبیر کیا گیا ہے! ——— کاش! افسانہ نگار کا قلم اخلاق کی طرف مڑ جائے ——— ورنہ صرف ہوا و ہوس کے واقعات کو افسانوں کے قالب میں ڈھالنے سے قوم، ملک اور سماج کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اُلٹا نقصان ہے،

---

[1] [illegible] [2] صفحہ ۲۲ پر "تلاطم" کا املاء "طلاطم" دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ غلطی اس قدر عام ہوتی جا رہی ہے،

گھنشیام اور رقیہ کی آشنائی جس افسانہ میں دکھائی گئی ہے اُسے پڑھ کر مسلمانوں کو تکلیف ہوگی، افسانہ نگار کو ان نزاکتوں کا خیال رکھنا چاہیئے!

"کرنے کا کام" "کرنے کا کام" یعنی "اصلاح و ترقی اقوام کا ایک اچھوتا پروگرام" از :— مولانا عبدالغفار لکھوکے ضخامت ۳۸۰ صفحات، قیمت قسم اوّل (کاغذ سفید) پانچ روپے! قسم دوم چار روپے، ——

ملنے کا پتہ :— ناظم جامع محمدیہ اوکاڑہ ضلع منٹگمری (پاکستان)

یہ کتاب مولانا عبدالغفار صاحب لکھوکے نے قوم کی اصلاح اور تزکیہ و تطہیر کے نیک جذبہ کے ساتھ لکھی ہے! صاحب موصوف کا اصل پروگرام یہ ہے کہ ہر قصبہ، گاؤں یا شہر کے محلوں میں، اقامتِ دین کے لئے "جمیعۃ الصالحین" کے نام سے ایک انجمن قائم کی جائے جو امام نماز، نائب نماز، موذن، خطیب و مدرس اور چند مقتدیوں پر مشتمل ہو، ان کی اسکیم یہ ہے کہ مساجد کو اصلاحِ معاشرت کا مرکز بنایا جائے اور وہیں سے یہ کام شروع ہو!

اسی پروگرام کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے، مُصنف نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ جمیعۃ الصالحین کے ارکان کی زندگیاں کیسی ہونی چاہئیں اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے! پوری کتاب انھی مباحث پر پھیلی ہوئی ہے اور صاحبِ تصنیف نے نفس کی اُن چھپی ہوئی چوریوں کی ایک ایک کر کے نشان دہی کی ہے جو مسلمانوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں اور جن کی اصلاح بہت ضروری ہے!

اقامتِ صلوٰۃ پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ مسلمانوں کی نماز ہی اگر درست ہو جائے تو مسلمان قوم کے نہ جانے کتنے بہت سے مفاسد کا سدِّ باب ہو سکتا ہے! نماز کے سلسلہ میں مُصنف نے جو تفصیلات دی ہیں، وہ اس قدر جزئیات کے ساتھ دوسری کتابوں میں یکجا نہیں ملیں گی، تعدیل ارکان کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہاں تک بتایا ہے کہ نماز میں ٹخنوں، ہتھیلیوں، کندھوں اور کہنیوں کو کس طرح رکھیں!

مولانا عبدالغفار صاحب ملّت کی فلاح اور اصلاح کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ نشست و برخاست، خورد و نوش، سکوت و کلام، معیشت و معاشرت اور سیاست و عبادت غرض ہر شعبہ میں مُسلمان کتاب و سنت کا مظہر بن جائیں! مصنف کا جذبہ یقیناً مستحقِ ستائش ہے اور اس نیک کام کا انہیں اجر بھی ملے گا لیکن اس کو کیا کیجیے کہ اُن کو قدرت نے انشا پرداز نہیں بنایا۔ . . . ان کی تحریر کا یہ رنگ ہے :-

—— "جملہ داعیین الی اللہ علی الخصوص ان میں کے سب سے بڑے ماہر اصول و قواعد اصلاح و تذکیر سب سے زیادہ واجب لاقتدا و سب سے زیادہ شاد کام و ماہر اور سب سے زیادہ ارحم و اشفق امم، سب سے زیادہ دور اندیش و راست رو نے (حقیقت میں مصرحہ تیر دل سے مسلح ہو کر) علی العموم اصلاح و تذکیر عالم کا محاذِ اوّل ہوی کو بنا یا، محاذ دوم جسے سر کرنے کے لئے اس نے اپنی سرپرستی میں اور ہوی کو ساتھ لیکر جمیعۃ الصلحین کے فرائض انجام دے"...... (صفحہ ۴۵)

—— "چنانچہ قرنِ اولیٰ کے علمبرداران اصلاح و ترقی عالم کے ہماری نسبت تعدادی، مادی اور عسکری وغیرہ ہر حیثیت میں ایک فئۃ قلیلہ و مستضعفہ، نیز درسی و اکتسابی علوم و فنون کی طرف سے یکسر بے بہرہ و تہی مایہ ہونے، تہذیب و تمدن کے نام تک نہ جاننے، نشر و اشاعت کے کم سے کم اور معمولی سے معمولی بلکہ نہ ہونے کے برابر ذرائع رکھنے اپنی دعوت و نصب العین کو دنیا میں پیش کرنے اور اس سے لبیک کہلوانے کی راہ میں حد و گمان سے بڑھ کر مہیب دنیاوی

تسخیر رکاوٹوں اور قدم قدم بلکہ سانس سانس پر نہایت شگاف قسم کی اور پہاڑوں سے عظیم و شدید نادیدہ و ناشنیدہ مصیبتوں سے دوچار ہونے کے باوجود ــــــ" (صفحہ ۸۹)

ــــــ "علم برداران اصلاح و تذکیر خلاق اپنے تحریر و تصنیف، درس و خطابت، قرأت و تلاوت بحث و مناظرہ، فقہ و اجتہاد و موشگافی و دقیق النظری وغیرہا اوصاف و محاسن کے لحاظ سے جنھیں کہ ہم اصلاح و تذکیر سر کرنے کے سلسلہ میں آلات و وسائل سے زیادہ کی حیثیت حاصل نہیں بلاشبہ ایک بحر ذخار اور یگانہ روزگار ہیں لیکن فکر و بے چینی، استقامت، نصب العین طریق کار کا ذاتی نمونہ عمل وغیرہا اس حقیقی زادِ راہ و ساز و سامان سے جو کسی شخص و قوم کو سر تا سر کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ب، ت یعنی اساس و قدم اوّلین کا حکم رکھتا ہے یکسر ہیچمدار و بے بضاعت پائے جاتے ہیں۔" (ص)

پوری کتاب کا یہی رنگ ہے اور اس صنعتِ خاص (؟) میں یہ پہلی کتاب ہے جو ہماری نظر سے گزری۔۔۔
۔۔۔۔ اس پر مصنف کا دعویٰ یہ ہے :-

"اس کتاب کو (جو اس حد تک کہ اصلاح و ترقی عالم کے لئے طریقِ عمل سمجھانے اور یہ غرض پورا کرنے کے لئے مبسوط و مدلل اور سیر حاصل ہونے کا تعلق ہے غالباً دُنیا کی پہلی اور آخری کوشش ہوگی) !

یہ "غالباً" بھی صاحب تصنیف نے از رو تواضع و انکسار فرمایا ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب نگارش کے اعتبار سے دُنیا کی یقیناً پہلی اور آخری کوشش ہے! یہ طرزِ تحریر آج تک کسے نصیب ہوا ہے!
تخیل چاہے کتنی ہی پاکیزہ اور اصلاح و ترقی کا جذبہ کیسا ہی شدید اور نیت کتنی ہی مخلصانہ کیوں نہ ہو ــــ ــــ مگر کہنے والا جو کچھ کہنا، ظاہر کرنا اور سمجھانا چاہتا ہے اُس پر بھی تو قدرت رکھتا ہو!
مولانا عبدالغفار صاحب اکوکے کی خدمت میں ہم عرض کریں گے کہ وہ، اگر اپنے پروگرام کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا ناگزیر سمجھتے ہیں تو اپنے خیالات کی ترجمانی کے لئے کسی مشاق انشاپرداز کی خدمات حاصل کریں اور خود یہ زحمت برداشت نہ فرمائیں کہ اس طرح دینی دعوت ایک "مضحکہ" اور اچھا خاصہ تماشا بن کر رہ جائے گی!

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

جلد ۶ ———— نمبر ۷

ماہنامہ

فاران

کراچی — پاکستان

اکتوبر ۱۹۵۴ء

ایڈیٹر: ماہر القادری

چندہ سالانہ

پانچ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸/

آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱/

مقام اشاعت

دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی نمبر۱

نظم و ترتیب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

کسان کسی زمین میں بیج ڈالنے سے پہلے زمین کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر زمین کا انتخاب نہ کرے اور بنجر و پتھریلی زمین میں یونہی بیج بکھیر دے تو اس کی یہ تخم ریزی ضائع جائے گی اور اس کے بوئے ہوئے بیج برگ و بار نہ لا سکیں گے۔ اور اگر چند بیج اُگ بھی آئے تو وہ چند پودے اول تو بہت ہی کمزور اور خزاں رسیدہ ہوں گے اور وہ بڑھ کر پودے بن بھی گئے تو چند پودوں کا نام فصل ہے اور نہ گنے چنے خوشوں اور بالیوں کو کھیت کہہ سکتے ہیں۔ زمین کسی وجہ سے زیادہ زرخیز نہیں ہوتی تو کاشتکار پانی کے ذریعہ اسے نرم کرتا ہے، ہل جوتتا ہے اور کھاد ڈالتا ہے تاکہ زمین زیادہ سے زیادہ روئیدگی کے قابل ہو جائے۔

زمین کے انتخاب کے بعد تخم ریزی کی باری آتی ہے۔ اگر بیج ناقص ہوں، انہیں گھن لگا ہوا ہو تو پھر اچھی سے اچھی زمین بھی ایسے ناقص بیج کو اُگا نہیں سکتی اور اُگائے گی بھی تو کلے ٹھٹھرے ہوئے ہوں گے۔ اس لئے کسان کو ایسے بیج مہیا کرنے پڑتے ہیں جو ہر اعتبار سے صحیح سالم اور بے عیب ہوں۔

کسان زمین میں بیج ڈال کر مطمئن اور بے فکر نہیں ہو جاتا کہ اس نے بیج تو بو ہی دیا ہے، زمین زرخیز ہے، پودے خود بخود اُگ آئیں گے اور شبنم کی نمی اور سورج کی گرمی سے پودے آپ ہی آپ نشوونما پاتے رہیں گے یہاں تک کہ فصل تیار ہو جائے گی۔ اور وہ کھلیان سے غلے کا ڈھیر اپنے گھر لے کر جائے گا۔ اگر وہ تخم ریزی کے بعد بے فکر ہو جائے اور صرف قدرتی اسباب و وسائل پر بھروسہ کرے اور خود کچھ نہ کرے تو اس کے بوئے ہوئے بیج سے جو فصل اُگے گی وہ اگرچہ اُگ رہی ہیں، محنت و مشقت نہ ہونے کے سبب بہت کچھ برباد ہو جائے گی، اور شاید بعض حالات میں پودے خوشے بھی نہ لا سکیں۔ بس وہ ایک فصل بے حاصل ہو کر رہ جائے گی۔

کسان تخم ریزی کرنے کے بعد بھی اس کی فکر میں رہتا ہے کہ تمام توجہات کا مرکز اس کی کھیتی ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا رہتا ہے، پانی نہ ملے تو کھیتی سوکھ جائے، پھر وہ اس کا بھی دھیان رکھتا ہے کہ بیج بوئے ہوئے کھیت میں ان کے علاوہ دوسری قسم کے برگ، پودے اور گھاس پات

کھیتوں میں نہ اُگ آئیں۔ جب بھی وہ اس قسم کی گھاس اور پودوں کو سر نکالتا ہوا دیکھتا ہے تو انھیں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ اگر وہ اس قسم کے غیر جنس کے پودوں، جھاڑ جھنکار اور سبزۂ بیگانہ کو اپنی فصل کے ساتھ پھلنے پھولنے دے تو وہ خوراک جو تنہا اس کی فصل کو ملنی چاہیے وہ اس بیکار قسم کے پودوں اور گھاس میں بٹ جائے گی۔ اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس قسم کی گھاس، بیلیں اور جھاڑ جھنکار پوری فصل پر چھا جاتی ہیں اور اس طرح فصل کی بڑھوار ماری جاتی ہے۔

جب فصل بڑھنے لگتی ہے تو کسان کھیت کے چاروں طرف باڑھ کھڑی کر دیتا ہے تاکہ ڈھور ڈنگر اس کھیت کو چرنے سے باز رہیں۔ پھر وہ کھیت میں مچان باندھ کر فصل کی نگرانی کرتا ہے۔ چوروں اور اُچکوں سے اپنی فصل کو بچاتا ہے، وہ کڑی نگرانی نہ کرے تو بعض شریر لوگ فصل پکنے سے پہلے ہی کچی فصل کو کاٹ کر لے جائیں یا گدر بالیوں کو توڑ کر ہضم کر جائیں۔

کسان کو ہر خطرے سے بچاؤ کے لئے پیش بندی کرنی پڑتی ہے۔ جاڑے کی شدت ہوتی ہے تو وہ خدا سے دعا کرتا رہتا ہے کہ کہیں اس فصل کو پالا نہ مار جائے یا کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹڈیاں اس کے کھیت کو چٹ کر جائیں۔ پرندوں سے فصل کے خوشے بچانے کے لئے وہ فلاخن لے کر کھیت کے ارد گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ جہاں کوئی پرندہ کھیت کے کسی گوشے پر منڈلاتا نظر آیا اور اس نے گوپھن میں غلّہ رکھ کر بس داغ ہی تو دیا۔ جب وہ تن کچھ کر چکتا ہے تو فصل پک کر تیار ہوتی ہے اور وہ اسے کاٹ کر کھلیان میں لے جاتا ہے۔ اور پھر کھلیان کے بعد آخری مرحلہ بالیوں سے دانے نکال کر غلّہ کو گھر لے جانے کا ہے۔

کسان کھیتوں کی پیداوار اور فصل کا حاصل پانے کی خوشی کے لئے کیسی کیسی مشقتیں اٹھاتا ہے۔ کیا کیا پاپڑ بیلتا ہے اور کیسے کیسے جتن کرتا ہے۔ جاڑا ہو گرمی ہو برسات ہو اسے اپنے کام سے کام! سخت جاڑے میں ٹھٹرن کا یہ عالم ہے کہ کسان کے دانت سے دانت بج رہے ہیں مگر وہ اپنے کام میں مصروف ہے۔ جھلسا دینے والی لُو چل رہی ہے لیکن یہ شخص کھیت میں کام کر رہا ہے، بارش ہو رہی ہے اور یہ بندۂ خدا بھیگتا جاتا ہے اور کھیت کی مینڈ درست کرتا جاتا ہے۔ اپنی کھیتی کے لئے اس نے ہر عیش و آرام کو تج دیا ہے، ضرورت پڑتی ہے تو قرض لے کر اور اپنا پیٹ کاٹ کر کھیتی پر روپیہ پیسہ لگاتا ہے۔ زیادہ پائدار اور طویل عیش و مسرت کے لئے اس نے کم پائدار مسرتوں کو چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ قربان کر دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

الدنیا مزرعۃ الآخرۃ　　:.　　دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

جو کوئی رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو صادق و مصدوق سمجھتا ہے اور جس نے حضورؐ کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے کہ اس معدن صدق کے ہونٹوں سے ایک حرف بھی خلاف واقعہ نہیں نکلا، وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ حق و صداقت تو دنیا کے اس سب سے بڑے انسان کے جلو میں رہا کرتے تھے۔ ان سے زیادہ سچے انسان پر آج تک آفتاب طلوع ہی نہیں ہوا، اور ان کی صداقت کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ حنظل کو ہاتھ میں لے کر اسے شیریں کہہ دیتے تو خدا کی قسم ان کی صداقت پر شہادت دینے کے لئے حنظل اپنے ذائقہ کو بدل کر شیریں ہو جاتا۔ اس یقین و عقیدت اور اعتقاد کے بعد اس آدمی کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھے اور اس کے جو تنے بونے سینچنے اور پروان چڑھانے کے لئے اپنی ساری توانائی کو صرف کر دے۔

ہاں! وہ حضرات سب سے زیادہ ذہین لوگ جنھوں نے مسیلمہ کذاب کا مزاج پایا ہے اور جنھوں نے قرآن کی تحریف معنوی، سنت کی مخالفت اور دین کو مسخ کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے، اور جو آخرت کو "مستقبل" کہہ کر آخرت سے جو ایمانی تصورات وابستہ ہیں ان کا انکار کرتے ہیں، ان سے ہمارا خطاب نہیں ہے، ہمارے مخاطب وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے بعد رسول اللہ کی سنت

کو دین میں حجت سمجھتے ہیں۔

آخرت کی یہ فصل جس زمین میں بوئی جاتی ہے، اس کا نام "ایمان" ہے! تو ایک انسان جو دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتا ہے اس کا فرض ہے کہ پہلے وہ اس کھیتی کے لیے زمین (ایمان) کا انتخاب کرے! جب زمین کا انتخاب ہو جائے تو پھر اس میں اخلاص عمل کے بیج بو دے اور پھر اس فصل کے پکنے اور اس کھیتی کے تیار ہونے تک ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے غافل نہ رہے!

آخرت کی اس کھیتی میں مشرکانہ وسوسوں اور بدعتوں کے جھاڑ جھنکاڑ اول تو اگنے ہی نہیں چاہئیں اور اگر سوئے اتفاق سے ان کی پرچھائیں بھی کہیں دکھائی دے جائے تو اس کا استیصال ضروری ہے، آخرت کی کھیتی میں ایمان و اسلام کی خالص فصل اگنی چاہیے۔ دوسرے افکار و عقائد اور تصورات کے خار و خس کے لیے اس میں گنجائش کہاں! اسلام کی فصل کے پودے صحبت ناجنس سے پناہ مانگتے ہیں۔

یہ کھیتی آپ کی پیشانی کے پسینہ کے ساتھ آپ کی آنکھوں کے آنسوؤں سے بھی سیراب ہوگی ——— اور یہ آنسو خشیت الٰہی کے آنسو ہوں گے۔ یہ فصل آپ کے جذبۂ عمل کی گرمی سے پکے گی اور آپ کو زندگی کی ہر ساعت اس کھیتی کی دیکھ بھال اور سینچنے کے لیے وقف کر دینی ہوگی! دنیا میں طرح طرح کے کھیل تماشے اور ناچ گانے ہوتے ہوں گے مگر آپ اپنے کام میں لگے رہیں گے! آپ کو ان تفریحات کے لیے فرصت ہی کہاں مل سکے گی!

اس فصل کو چرنے اور اسے نقصان پہنچانے کے لیے انسانوں کے بھیس میں طرح طرح کے جانور آئیں گے، خود آپ کے نفس کی خواہش پرندے بن کر اس فصل کے دانے چگنا چاہیں گی، شیطان اور اس کے چیلے چانٹے جو اس فصل کے سب سے بڑے دشمن ہیں اس پر شب خون ماریں گے اور بسا اوقات ایک دردمند، خیر اندیش، مشفق ناصح کی حیثیت سے اس کے اجاڑنے کی تدبیریں سجھائیں گے!

جس کسان کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کی فصل کا حاصل اور اس کے کھیتوں کی پیداوار زیادہ سے زیادہ ایک سال تک اس کے کام آ سکتی ہے لیکن صرف ایک سال کی راحت و فراغت کے لیے وہ کیسی کیسی تکلیفیں اٹھاتا اور مصیبتیں جھیلتا ہے! مگر آخرت کی کھیتی ہمیشہ رہنے والی ہے اس کے ایک تنکے کو بھی زوال نہیں! یہ مسرت اور راحت دوامی اور ابدی ہے، یہ وہ صبح عشرت ہے کہ جس کی شام نہیں یہ خوشی کا وہ آفتاب ہے جو طلوع ہونے کے بعد پھر غروب نہیں ہو سکتا ——— تو اس دائمی مسرت اور ابدی عیش و آرام کے لیے آپ کو کسان کے مقابلہ میں کس قدر ایثار، محنت اور دلسوزی سے کام کرنا ہوگا اس کا اندازہ آپ خود ہی لگا لیجیے! کسان کی اگر ایک رات بے خواب رہی تھی تو آپ کی کم سے کم ایک ہزار راتیں جاگتے گزرنی چاہییں! کسان کے ماتھے سے پسینہ ٹپکا تھا تو آپ کی شہ رگ کا خون بھی اگر اس کھیتی کی سیرابی میں کام آ جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں!

جب حکومت کے سپاہی، اور پیادے اور زمیندار کے کارندے جبر و زیادتی پر اتر آتے تھے تو بیچارہ کسان نرم بھی پڑ جاتا تھا اور وہ اس کی فصل سے کچھ خوشے یا کھلیان سے تھوڑا بہت غلہ اور چارہ لے جاتے تھے مگر آپ کی کھیتی ایسی نہیں ہے کہ اس کے ایک خوشے کا نقصان بھی گوارا کر لیا جائے۔ آپ جابروں اور غاصبوں کے سامنے اگر جھک گئے تو پھر آپ نے اپنی فصل کو تباہ کر لیا جس کی تلافی ممکن نہیں۔ آپ کو جبر و تشدد کا مقابلہ اپنی عزیمت اور جوش ایمانی سے کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کشمکش میں آپ کی جان چلی جائے۔ مگر جان کو تو ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے، وہ اگر آخرت کی کھیتی کی حفاظت کرتے ہوئے چلی جائے تو یہ آپ کی جان کی خوش نصیبی ہے اس طرح تو آخرت کی کھیتی جس کے پکنے کے لیے آپ کو برسوں کا انتظار کرنا ہوگا اسی لمحہ جب اللہ کے راستہ میں آپ کی جان جا رہی ہوگی پک کر تیار ہو جائے گی۔

کسان کو یہ حق دیتی تھا کہ اگر اس کی یہ فصل اس کی کسی غفلت اور کوتاہی کے سبب برباد بھی ہو گئی تو بہت سے سیٹھ ساہوکار اور مہاجن موجود ہیں جن سے وہ غلہ اور روپیہ پیسہ ادھار لے سکتا ہے اور اس طرح دوبارہ کام چلانے لگا، مگر آپ کی آخرت کی کھیتی خدانخواستہ اجڑ گئی تو آپ کو ایسے مہاجن اور ساہوکار کہاں ملیں گے جو آپ کے اس نقصان کی تلافی کر دیں۔ آسمان و زمین کی تمام دولت دے کر بھی کوئی اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت ہی کو ترس آجائے۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی نے اس دنیا میں ببول لگائے ہوں اور آخرت میں اسے انار کے دانے اور انگور کے خوشے ملیں،

گندم از گندم بروید جو ز جو !
از مکافاتِ عمل غافل مشو !

دنیا میں جو کچھ بویا جائے گا، وہی عقبیٰ میں بونے والا کاٹے گا، کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کی کوئی حد و انتہا نہیں مگر سہ

اللہ کے احکام کی محکم ہے ترازو !

وہ جو حافظ شیرازی نے کہا ہے :-

بہ زیر دلق مرقع کمندہا دارند !
دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں !

اس دنیا میں کچھ ایسی حلیہ و وضع قطع اور ذہنیت کے لوگ بھی آپ کو ملیں گے جو دیکھنے میں ایسے معلوم ہوں گے کہ آخرت کی کھیتی کے بہت بڑے تجربہ کار ماہر فن ہیں، اور ان سے پوچھ پوچھ کر ہی اس کھیتی کی غور و پرداخت کرنی چاہئے۔ مگر یہ وہ لوگ ہیں جو ہم سے اور آپ سے پہلے بہت سوں کی آخرت کی کھیتی اجاڑ چکے ہیں۔ بادشاہوں اور امیروں کے یہاں تقرب حاصل کرنے کے لئے ان حضرات نے کیا کچھ نہیں کیا! اکبر اعظم کی آخرت کو انہی نے بگاڑا تھا! پس ان صاحبانِ جبہ و دستار سے ہوشیار رہیئے، ان کی چالیں بڑی باریک اور پر پیچ ہوتی ہیں، اقبال نے یوں ہی نہیں کہہ دیا تھا:

بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں ،
لرز اٹھتا ہے آوازِ اذاں سے

یہاں بہت سے بھیڑیئے بکریوں کی کھال اوڑھے ہوئے ہیں؛ اور ان میں جو اچھے ہیں وہ یقیناً لائقِ احترام ہیں،

آخرت کی کھیتی کمانے والے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ ریا کار، جھوٹا اور دغاباز نہیں ہوتا! اس کا دل خشیتِ الٰہی سے ہر وقت کانپتا رہتا ہے، اس میں کبر و رعونت کی جگہ تواضع اور انکسار پایا جاتا ہے، وہ دنیا میں فتنہ و فساد برپا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی ذات امن و عافیت کی ضامن ہوتی ہے۔ حرکت و عمل میں بجلی سے زیادہ تیز اور پھرتیلا، عزیمت و استقامت کا یہ عالم کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائیں تو ہل جائیں مگر اس شخص کے پائے استقامت میں جنبش پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور مٹی اور پتھر کی طرح سرافگندہ، بے جان اور بے حرکت! خدا کے خوف کے سوا ہر خوف سے بے نیاز! تقدیر پر ایمان کہ جو کچھ اللہ چاہے گا وہی ہوگا۔ اور تدبیر سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں!

آخرت کی کھیتی کا ہر خوشہ اللہ کے نام کی تسبیح و تہلیل چاہتا ہے! اور اس کھیت کا ہر گوشہ اس قابل ہے کہ سجدوں سے معمور کر دیا جائے مگر اس کھیتی کو اجاڑنے کے لئے، اگر کچھ شریر آئیں تو اس کا رکھوالا یہ نہیں کرتا کہ شریروں، مفسدوں اور ظالموں کو آتا دیکھ کر نماز کی نیت کر کے کھڑا ہو جائے یا چلہ میں بیٹھ کر تسبیح گھمانے لگے اور ان لوگوں کو کھلی چھٹی دیدے کہ وہ آخرت کی کھیتی کے جس حصہ کو چاہیں اجاڑ دیں اور اس

نفس کو تہ و بالا کر دیں   وہ ان مفسدوں اور لٹیروں کے منصوبے پورے نہ ہونے دے گا، جلتی ریت پر لٹا کر اس کے جسم کو گرم
پتھروں سے داغا جائے گا تب بھی وہ آخرت کی کھیتی کی حفاظت سے دست بردار نہ ہوگا بلکہ وہ تو اس بات کی جد و جہد کرے گا کہ آخرت
کی کھیتی اُجاڑنے والوں کا زور ٹوٹ جائے۔

کشتِ آخرت کے سینچنے والے کو ایک لمحہ کی فرصت بھی میسر نہیں آتی۔ اس کا توکل راہبوں اور جوگیوں کا توکل نہیں ہے جو ہاتھ پاؤں
توڑ کر کسی پہاڑ کی گپھا یا جنگل کے کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اس کھیتی کی دیکھ بھال اور غور و پرداخت کے لئے کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے اور
توکل یہ ہے کہ ہر ممکن سعی اور جد و جہد کے بعد اس کے نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کا توکل ثابت نہیں سیارہ ہے!

اس پھلواری کے سب سے بڑے چمن بند نے کیا کیا تھا؟ مکہ کی پہاڑیوں پر چڑھ کر ایمان و عمل کی دعوت دی، مکہ کی زمین بنجر نظر آئی
تو طائف کا رخ کیا، اور وہاں پتھر کھا کھا کر جسم کے خون سے اس کھیتی کو سینچا۔ حج کے زمانے میں مدینے سے آنے والوں کو بستی سے باہر جا کر
اللہ کا پیغام سنایا۔ مکہ میں حالات نازک تر ہو گئے تو اس کھیتی کو سینچنے کے لئے پیارے وطن کو چھوڑ دیا! مدینہ کو ہجرت حضورؐ نے اس لئے نہیں فرمائی
تھی کہ وہاں گوشۂ عافیت میسر آ جائے گا اور زندگی آرام اور راحت کے ساتھ بسر ہوگی۔ مدینہ پہنچ کر طرح طرح کی کشمکشوں سے دوچار ہونا پڑا اور آخرت
کی کھیتی اُجاڑنے والوں سے جنگ کے میدانوں میں مقابلہ کی نوبت تک آ گئی!

ایک مقدس انسان ہے جس کی ذات قدسی صفات میں گوناگوں خصوصیتیں جمع ہو گئی ہیں۔ وہ اپنے کپڑے بھی دھو لیتا ہے اور اپنے
جوتے بھی خود ہی گانٹھ لیتا ہے، سادگی اور تواضع کا یہ عالم ہے۔

ع ہاتھ کا تکیہ خاک کا بستر صلی اللہ علیہ وسلم

رات کو خدا کے حضور اشکباری کرتا ہے اور دن میں قوموں کی قیادت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ قبیلوں کے وفود کو شرفِ باریابی بخشتا ہے
اور بادشاہوں کے نام فرمان بھیجتا ہے، جب اس تک یہ خبر پہنچتی ہے کہ عیسائیوں کی حکومت حجاز پر یلغار کرنے کی تیاری میں مصروف ہے تو
دشمن کی نقل و حرکت سے پہلے ہی تیس ہزار کی جرار فوج لیکر وہ تبوک جا پہنچتا ہے، اور اس کی یہ جرأت بے باکی عزیمت اور جذبۂ سرفروشی دشمن
کے منصوبے کو خاک میں ملا دیتے ہیں!

خدا کے اس آخری پیغمبر اور صداقت و خلوص کے پیکر کو غنیمت کا مال تقسیم کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا اور اس عالم میں جب کہ وہ دوسروں
کو سیم و زر کے ڈھیر بانٹ رہا تھا خود اس کی پیاری چہیتی بیٹی کے سر پر پیوند لگا ہوا دوپٹہ تھا۔ حدیبیہ میں کافروں سے صلح کا عہد و پیمان بھی کرتا ہے
اور عرفات میں خطبہ بھی دیتا ہے، اہل حبش کے وفد کے شربت اور کھانے پینے کا انتظام خود کرتا ہے: اس کی جرأت، بہادری اور استقامت کا
یہ عالم ہے کہ گھمسان لڑائی میں جب کہ بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں، وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا، اور کسی کا کیا ذکر؟ خود حضرت
علی مرتضیٰؓ کا بیان ہے کہ جب غزوات میں گھمسان کا رن پڑتا تھا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ ڈھونڈتے تھے!

آخرت کی کھیتی اور دین و ایمان کے مالک کا یہ رکھوالا مجرموں پر حد بھی جاری فرماتا ہے! بازاروں میں جا کر یہ بھی دیکھتا ہے کہ کہیں لوگ
چیزوں کے تولنے میں کمی بیشی تو نہیں کرتے۔ اس کی بصیرت اور فراست کا عالم یہ ہے کہ زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل سے لیکر
چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ تک کی لوگوں کو تعلیم دیتا ہے، وہ یہ تک بتاتا ہے کہ پانی کتنے گھونٹ میں پینا، اور کھانا کھاتے میں انگلیوں کو
کس طرح رکھنا چاہیئے! (اس پر درود و سلام ہو اور ہماری جانیں اس پر قربان ہوں)۔

صحابہ کرام نے بھی آخرت کی کھیتی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں پر سینچا اور اس کی حفاظت کی! ان بزرگوں
کی یہ کوشش رہی کہ رسول اللہ کی سنت سے بال برابر بھی اِدھر سے اُدھر نہ ہوں! اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ کتاب و سنت اس پر گواہ

ہیں کہ "اقامت دین" کی جد و جہد ہی آخرت کی کھیتی کو سیراب اور شاداب کرتی ہے۔ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا وہ زندگی کے ہر شعبہ پر اسلام کے غلبہ کے لئے جد و جہد کرے گا اور اس کی کوشش صرف خود نماز پڑھنے اور دوسروں سے پڑھوانے تک ہی محدود نہ رہ جائے گی۔ اسلام اپنی فطرت کے اعتبار سے بے حد وسیع اور لامحدود ہے اُسے صرف مسجدوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت سیدنا ابراہیم اور حضرت سیدنا موسیٰ (علیہما السلام) سے بڑھ کر آخرت کی کھیتی کا رکھوالا اور کون ہو سکتا ہے مگر خدا کے ان سچے نبیوں نے بادشاہوں کے درباروں میں جا کر ان کی جھوٹی خدائی کو چیلنج دیا ہے!

آخرت کی کھیتی کے رکھوالے یہ چاہتے ہیں ـــــ آج بھی چاہتے ہیں اور ہمیشہ چاہتے رہیں گے کہ جس طرح مسجدوں میں لوگ خدا کے احکام پر رکوع و سجود کرتے ہیں، اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ کفر و جاہلیت کے دستور کے سائے میں نمازیں پڑھ کر مطمئن ہو جانا اور حالات بدلنے کے لئے جد و جہد نہ کرنا بلکہ اسلامی انقلاب کے داعیوں پر دنیاداری اور سیاست بازی کی پھبتیاں کسنا، خود آخرت کی کھیتی کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہے۔

کچھ لوگ "الا اللہ" کی ضربیں لگا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اعلائے کلمۃ الحق کا فرض پورا ہو گیا اور کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک قوت کے ساتھ امر و معروف کو قائم نہ کیا جائے گا اور منکرات کو مٹایا نہ جائے گا اللہ کا کلمہ پوری طرح بلند نہ ہو سکا! بس "آخرت کی کھیتی" کو اگر سینچنا اور پروان چڑھانا ہے تو اسی طرح سینچو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور کے صحابہ نے اسے سینچا تھا!

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِين

ماہر القادری

ناصر رام ایم اے

رحمۃ اللعالمین کا سلوک دشمنوں کے ساتھ

آج جب ہم انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھتے ہیں یا ان کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ مرنجان مرنج حضرات جن کا وجود سراپا خیر ہی خیر تھا، لوگوں نے ان کی مخالفت کیسے کی، اور ان کی تعلیم جو تمام تر صداقتوں پر مبنی ہے، جن کے سامنے اسے پیش کیا گیا تھا، انھوں نے اسے قبول کرنے سے کیوں انکار کر دیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے زمانے میں ان کی سخت مخالفت ہوئی۔ انھیں جھٹلایا گیا۔ انھیں گالیاں دی گئیں۔ انھیں ایذا پہنچائی گئی۔ یہاں تک کہ ان میں سے بیشتر اپنے ہم وطنوں کی چیرہ دستیوں سے نالاں و پریشان ترک وطن پر مجبور ہوئے، حتیٰ کہ " دیار غیر " ہی میں " رفیق اعلیٰ " نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ قرآن نے اسی بات کو قاعدۂ کلیہ کے طور پر بیان کیا ہے۔

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (الحجر: ۱۱) — اور ان کی طرف کوئی رسول نہیں آیا جس کا انھوں نے تمسخر نہ اڑایا ہو۔

اور اسی حقیقت کی طرف ورقہ بن نوفل نے اشارہ کیا تھا، جب حضرت خدیجہؓ نزول وحی کے آغاز میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لیکر ان کے پاس گئی ہیں، تو ورقہ نے کہا[1] " وہ آپ کی تکذیب کریں گے اور آپ کو ایذا دیں گے، اور آپ کو جلاوطن کر دیں گے اور آپ سے جنگ کریں گے "! پھر کہا[2] " اے کاش، میں اس وقت تک زندہ رہتا جب کہ آپ کی قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی "۔ اس پر آپ نے تعجب سے پوچھا " کیا وہ مجھے وطن سے نکال دیں گے "، تو ورقہ نے جواب دیا " جو چیز (نبوت) آپ لائے ہیں۔ جو شخص بھی اسے لایا ہے اس کے ساتھ دشمنی کی گئی ہے "۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟

ہر ایک زمانے کے مسائل مختلف، ملکوں کے حالات مختلف، قوموں کی روایات اور عادات مختلف۔ اس لئے لازم تھا کہ انبیاء کی مخالفت کے اسباب بھی مختلف ہوتے۔ اگر ہم فرداً فرداً ہر ایک نبی کی مخالفت کی وجوہ پر بحث کرنا چاہیں، تو یہ مشکل کام ہے۔ لیکن اتفاق سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت میں یہ تمام عناصر ایسے جمع ہو گئے ہیں کہ اگر ہم ان کے مخالفین اور مکذبین کے حالات تفصیل سے جان لیں، تو ہمیں دوسرے نبیوں کے مخالفوں کے حالات معلوم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

اس مقالے کا مقصود اسی موضوع پر گفتگو کرنا ہے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ الْعَظِيمِ ۔

---

[1] ابن ہشام (۱: ۲۵۴)۔

[2] بخاری، کتاب الوحی (باب بدء الوحی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت تین گروہوں نے کی:

۱. مشرکین
۲. یہود
۳. منافقین۔

ان تینوں کی مخالفت کے اسباب بھی الگ الگ تھے اور طریقے بھی الگ الگ۔

۱۔ مشرکین

ان گنتی کے چند آدمیوں کو چھوڑ کر جو یا تو یہودی اور عیسائی ہو گئے تھے، یا اپنی فطرت کی آواز سے مجبور ہو کر دین حق کی تلاش میں سرگرداں تھے، عرب کے تمام اصلی باشندے مشرک تھے۔ یہ لوگ دہریے نہیں تھے۔ بلکہ ان کے ہاں ایک خدا کا تصور موجود تھا۔ اللہ کا لفظ قدیم عربی زبان میں ملتا ہے۔ اور وہ اسے بطور علم استعمال کرتے تھے لیکن عملی طور پر اس اعتقاد کا ان کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی اثر نہیں تھا کیونکہ اس کے باوجود وہ بتوں کو پوجتے اور انہیں اپنا معبود اور حاجت روا سمجھتے تھے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اگر وہ کوئی فعل خدا کے نام پر کرتے تو اس کے لئے بھی کسی نہ کسی بت ہی کا آسرا لیتے۔ مثلاً جب عبد المطلب نے اپنا ایک بیٹا اللہ کے نام پر قربان کرنے کی نذر مانی، تو وقت آنے پر وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے عبد اللہ (والد حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کو خانۂ کعبہ کے سب سے بڑے بت ہبل پر بھینٹ چڑھانے کے لئے لے گئے[1]۔

اور اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ یہ بت تو تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ تو وہ جواب دیتے کہ

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر ۳۹ : ۳)

ہم ان (بتوں) کو تھوڑی پوجتے ہیں۔ (ہمارا مقصد) سوائے اس کے (کوئی) نہیں، کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں!

تمام مشرک قومیں اپنی بت پرستی کی یہی توجیہ کرتی آئی ہیں اور آج بھی کرتی ہیں۔

وحیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پہلی وحی ہی میں (۱) خدا اور (۲) خدا کے خالق کائنات ہونے اور (۳) انسان کی بے بسی اور جہالت اور (۴) وحی الٰہی کے تمام علوم انسانی کا منبع ہونے کا اقرار تھا (سورۂ علق) لیکن تین برس تک اس کا اظہار نہیں کیا گیا۔ تبلیغ بہت احتیاط اور راز داری سے صرف ان حلقوں تک محدود رہی جن پر کامل اعتماد تھا یعنی اقربا تک۔ تین برس کے بعد حکم ہوا[2]:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر)

اور جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اس کا کھلم کھلا اعلان کر دیجئے۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء)

اور اپنے خاندان کے قریبی لوگوں کو (ان کے اعمال کے انجام سے) متنبہ کیجئے۔

تو آپ نے اعلانیہ تبلیغ شروع کر دی۔

---

[1] ابن ہشام (۱ . ۱۶۰ - ۱۶۴)

[2] ابن ہشام (۱ . ۲۸۰ - ۲۸۱) نیز طبری (۳ ، ۱۱۶)

ابتدائی تعلیم اسلام

اس ابتدائی زمانے کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے:-

۱- خدا ہی معبود ہے۔

۱- خدا ایک ہے۔ وہی سب کا خالق اور آمر ہے۔ انسان سرکش ہے، جو اپنے آپ کو خدا سے بے نیاز خیال کرتا ہے۔ حالانکہ اسے اسی کے پاس لوٹ کے جانا ہے۔ (علق ۹۶ ، ۱-۸)

۲- اگر خدا کوئی نہیں، تو کافر یہ بتائیں کہ آخر یہ آسمان اور زمین کیسے بن گئے، اور زمین میں پہاڑ کیسے قائم ہو گئے، اور آسمان سے پانی کیسے برستا ہے۔ (الغاشیہ ۸۸ ، ۱۷-۲۰)

۳- یہ لوگ کھاتے کہاں سے ہیں؟ ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں، اور ہم ہی زمین سے یہ کھانے کی چیزیں بھی اگاتے ہیں۔ غلہ اور زیتون اور کھجوریں اور پھل ترکاریاں جو ان کے اور ان کے ڈھور ڈنگروں کے کام آتی ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ ان کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ (عبس ۸۰ ، ۱-۳۲)

۴- خدا ہی نے ان لوگوں کو بھی پیدا کیا اور وہی ہر طرح کی نباتات بھی اگاتا ہے۔ ہر چیز اپنے اپنے اصول کے مطابق کام کر رہی ہے۔ کامیابی البتہ اسی کو ہے، جو نیکی کے کام کرتا ہے اور خدا کی بزرگی کا اقرار کرتا ہوا اسی کی پرستش کرتا ہے۔ (الاعلیٰ ۸۷ ، ۱-۹)

۵- ہم نے انسان کو دیکھنے کو آنکھیں دی ہیں، کہ وہ خیر و شر میں تمیز کر سکے۔ کیا وہ اندھے ہیں، جو اتنا تک نہیں دیکھ سکتے کہ ان بتوں سے انہیں کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اور اگر وہ خود نہیں سمجھ سکتے تو ہم نے انسان کو زبان بھی تو دی ہے، وہ کسی اور ہی سے ان کے متعلق پوچھ لیں۔ (البلد ۹۰ ، ۱-۱۱)

۲- یتیم اور مسکین کی امداد کرو۔

۶- جو شخص خیرات کرتا اور خدا کا تقویٰ اختیار کرے، خدا بھی اس کے لئے سہولت کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے بالعکس جو بخیل ہے اور اپنے آپ کو خدائی عنایتوں سے مستغنی خیال کرتا ہے، خدا بھی اس کے لئے مشکلیں پیدا کر دیگا۔ اور قیامت کے دن اس کی دولت اس کے کسی کام نہیں آئے گی۔ (واللیل ۹۲ ، ۵-۱۱)

۷- لعنت ہو اس پر جو دوسروں پر نکتہ چینی کرتا ہے اور جو مال و دولت جمع کرنے کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کیا وہ اس وہم میں ہے کہ یہ دولت ہمیشہ اسکے پاس رہیگی۔ نہیں بلکہ وہ تباہی کے غار میں جا رہا ہے۔ جس سے کوئی بچا نہیں سکے گا۔ (الھمزہ ۱۰۴)

۸- تم نہ یتیم کا اکرام کرتے ہو، نہ بھوکے مسکین کو کھانا کھلاتے ہو، جو کچھ تمہیں ملتا ہے اسے ہڑپ کر جاتے ہو، اور مال جمع کرنے میں لگے ہو۔ تمہیں ہوش اس دن آئے گا، جب جہنم منہ پھاڑے سامنے کھڑی ہوگی۔ لیکن اس دن پچھتانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ (الفجر ۸۹ ، ۱۷-۲۶)

۹- یہی ہے وہ، جو خدائے بزرگ کو نہیں مانتا تھا، اور غریب کو کھانا نہیں کھلاتا تھا! اچھا تو آج اس کا یار و مددگار بھی کوئی نہیں۔ اور نہ کھانا تو جھوٹ اور دھوون سے اس کی تواضع کرو۔ یہی ہے گنہگاروں کی خوراک ہے۔ (الحاقہ ۶۹ ، ۳۳-۳۷)

۳ - آخرت اور یوم حساب برحق ہے:

۱۰ - اور انھیں بتا دے کہ آخر انھیں لوٹ کر ہمارے ہی پاس آنا ہے اور ہمیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے - اس دن ان کافروں کو سخت مشکل پیش آئے گی - (المدثر ۷۴ : ۱۰-۸)

۱۱ - جس دن وہ ہمارے سامنے آئیں گے ، ان کے تمام بھید کھل جائیں گے - اس دن نہ بت ان کے کام آئیں گے نہ ان کی اپنی شیخیاں - (الطارق ۸۶ : ۱۰-۱)

۱۲ - اور جس دن یہ آسمان ان پر پھٹ پڑیگا یہ کیا کریں گے - (الانشقاق ۸۴ : ۲-۱)

۱۳ - تمہارا کام انھیں آگاہ کر دینا ہے - بس تم انھیں بتا دو - باقی ہم خود ان سے سمجھ لیں گے جب وہ موت کے بعد ہمارے پاس آئیں گے ، انھیں عذاب کیلئے تیار رہنا چاہیئے - (الغاشیہ ۸۸ : ۲۰-۱۷)

۱۴ - عذاب جس کا ہم ان کافروں سے وعدہ کرتے ہیں ، وہ ٹل نہیں سکتا - (الذاریات ۵۱ : ۲۰-)

یہ نہایت ابتدائی زمانے کی وحی ہے[1] - اس میں چار باتوں پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے - (۱) بت پرستی فعل عبث ہے - (۲) عبادت کے لائق خالق کل اللہ تعالیٰ ہے (۳) مال جمع کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اس سے یتیموں اور مسکینوں کی خدمت کی جائے - اور (۴) کافروں کا انجام خطرناک ہوگا۔

مخالفتِ قریش کے اسباب

ظاہر ہے کہ اس تعلیم کا تعلق براہ راست ان حالات سے ہونا چاہیئے جو بعثتِ نبوی کے وقت قریش میں موجود تھے - اور اسی میں اس مخالفت کا راز بھی پوشیدہ ہے جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنا کرنا پڑا - مختصراً اس کے کئی اسباب تھے ، مذہبی ، اخلاقی ، سماجی ، سیاسی -

۱ - مذہبی | خدائے واحد کی عبادت کی دعوت اور بت پرستی کی مذمت لازم و ملزوم چیزیں تھیں - اور بت پرستی کی مذمت میں ان کے آباء و اجداد کی مذمت مضمر تھی - جو ان سے پہلے یہی فعل کرتے رہے تھے - مشرکین کو اس پر بہت برافروختہ ہوئے کہ ہمارے بتوں کی اہانت کی جاتی ہے - پھر ستم بالائے ستم یہ کہ نہ صرف ہمیں ہی احمق اور دوزخ کا ایندھن کہا جاتا ہے ، بلکہ ہمارے بزرگوں کو بھی انھیں خطابات سے نوازا جا رہا ہے -

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ لغو سے لغو بات کو بھی آسانی سے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتی - اس میں کوئی استثنا نہیں - یہ اصول زندگی کے ہر شعبے پر یکساں حاوی ہے - اور اگر اس فعل پر دس بیس برس بھی گذر گئے ہوں تو پھر اس کی حیثیت مسلمات کی ہو جاتی ۔ اس صورت میں دنیا جہان کے اصول اور قانون غلط ہو سکتے ہیں - لیکن اس کی صداقت اور معقولیت سے متعلق خفیف سا شبہہ بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا - یہاں بھی یہی ہوا - دس بیس برس چھوڑ ، عرب ان بتوں کو صدیوں سے پوجتے چلے آ رہے تھے - قدرتاً وہ اس نئی آواز پر چونکے - لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں انھوں نے اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں کی اور زیادہ سے زیادہ اسے استہزاء اور تمسخر کا نشانہ بنایا[2] -

---

[1] ان سورہ و آیت کے لئے سیوطی کی دو کتابوں ، لباب المنقول فی اسباب النزول اور الاتقان فی علوم القرآن پر اعتماد کیا گیا ہے -

[2] طبری (۳ : ۱۱۸۰) عروہ بن زبیر کا خط عبد الملک بن مروان کے نام -

جب غریب و مسکین مسلمان ان کے پاس سے گذرتے، تو وہ کہتے اَهٰٓؤُلَاۤءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (الانعام ۶: ۵۴) کیا یہی ہیں وہ، جنہیں خدا نے ہم میں سے اپنی نعمتوں کیلئے انتخاب کرلیا ہے؟ لیکن جب تبلیغ وسیع ہونے لگی اور بعض بڑے گھروں کے نوجوان اور غلام حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ پانی سر سے گذرتا جا رہا ہے، اور اب مزید بے اعتنائی سے کام نہیں چلیگا تو وہ جارحانہ مخالفت پر اتر آئے۔

۲۔ اخلاقی | قریش مکہ کی زندگی کا انحصار تجارت پر تھا۔ قومی روایات بے شک سخاوت، مہمان نوازی، زیردست کی حمایت اور دوسرے اخلاق عالیہ کی تعریف سے پر تھیں، لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، ان کی حیثیت بیشتر افسانوں سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی، سرمایہ داری کی تمام خصوصیتیں اور خرابیاں بہت نمایاں ہو چلی تھیں۔ جوں جوں بعض خاندانوں اور افراد کے ہاتھ میں تجارت سے حاصل شدہ دولت جمع ہوتی جاری تھی اسی نسبت سے ان کے اخلاق میں کمی آرہی تھی۔ سُود کا دور دورہ تھا، بُخل کا مرض عام تھا، ظلم کی فراوانی تھی، عزیبوں اور یتیموں کا مال ہضم کر جانے میں کسی کو عار نہیں محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ حلف الفضول کا معاہدہ بھی اسی صورت حال کا ردعمل تھا۔

المسعودی[1] نے حلف الفضول کی بنیاد کا واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ جاہلیت میں ایک یمنی تاجر نے عاص بن وائل کے ہاتھ کچھ مال بیچا۔ عاص نے قیمت چکانے میں لیت و لعل سے کام لیا، تو تاجر نے ہجو لکھ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ زبیر بن عبدالمطلب نے جب یہ شعر سُنے تو ان کا دل جلا اور انھیں بہت غیرت آئی۔ انھوں نے بنو ہاشم، المطلب، اسد، زہرہ اور تیم کے بعض دردمند افراد کو اپنے ساتھ ملایا، اور یہ لوگ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے اور یہاں حلف الفضول کی بنیاد رکھی گئی۔ ان لوگوں نے قسم کھائی کہ ہم ہر ایک ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کا ساتھ دیں گے، خواہ وہ اپنا ہو یا پرایا، تاوقتیکہ اس کا حق اسے نہ دلا دیں[2]۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس ابتدائی اجتماع میں شریک تھے۔ چنانچہ یہ روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جب قسمیں لی گئی ہیں، تو میں موجود تھا، اور مجھے سُرخ اونٹوں کے مقابلہ میں یہ زیادہ پسند ہے اور اگر آج اسلام میں بھی کوئی مجھے اس حلف کا واسطہ دے کر مدد کے لئے پکارے، تو میں لبیک کہوں گا[3]۔

قریش کی اس اخلاقی گراوٹ کی شہادت ایک اور جگہ سے بھی ملتی ہے۔

ہجرت حبشہ کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کو واپس لانے کے لئے اپنے سفیر نجاشی کے دربار میں بھیجے تو، نجاشی نے مسلمانوں سے ان کے نئے دین کا حال پوچھا۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفر بن ابی طالب (حضرت علی کے بھائی) نے تقریر کی۔ اس میں انھوں نے اپنی قوم کی ماقبل اسلام زندگی اور اسلامی تعلیم کا حال بیان کیا۔ اس میں فرماتے ہیں[4]

"بادشاہ سلامت! ہم ایک جاہل قوم تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے۔ بُرے کام کرتے تھے، اپنوں کا گلا کاٹتے تھے، اور ہمسائیگی کا حق ادا نہیں کرتے تھے۔ ہمارے زبردست زیردستوں کو کھائے جا رہے تھے۔ یہ ہمارا حال تھا کہ خدا نے ہماری طرف ہمیں میں سے، ایک رسول بھیجا۔ جن کے خاندان اور صداقت اور امانت اور نیکی کے ہم گواہ ہیں۔ انھوں نے ہمیں دعوت دی کہ ایک خدا کو مانو اور اسی کی عبادت کرو، اس کے علاوہ پتھروں اور بتوں کو جنہیں ہم اور ہمارے باپ دادا پوجتے آرہے تھے، چھوڑ دو۔ انھوں نے ہمیں حکم دیا کہ سچ بولو، امانت

---

[1] مروج الذہب (۲: ۱۴۳)

[2] ابن ہشام (۱: ۱۴۱)

[3] ابن ہشام (۱: ۱۴۲)

[4] ایضاً (۱: ۳۵۹ - ۳۶۰)

[نیز امتاع الاسماع مقریزی (جزو اول) صفحہ]

ادا کرو۔ بڑوں سے سلوک کرو۔ ہمسایوں سے نیکی سے پیش آؤ۔ دوسروں کے خون سے ہاتھ آلودہ نہ کرو۔ انھوں نے ہمیں بُرے کاموں، جھوٹ اور یتیموں کے مال کھانے۔ اور باعصمت عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا۔"

یہ ہے نقشہ اس وقت کی اخلاقی حالت کا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

اس سے جب قرآن نے بار بار لوگوں کو بھوکوں کو کھانا کھلانے اور یتیموں کا کام کرنے پر زور دیا، تو چور کی ڈاڑھی میں تنکا، جن لوگوں میں یہ عیب تھے، وہ تلملا اٹھے۔ انھوں نے اس تعلیم میں نہ صرف اپنی ہتک ہی کا سامان دیکھا، بلکہ خیال کیا کہ اس دعوت کا مدعا یہ ہے کہ ہم اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی یوں بے دریغ ان بے کار لوگوں پر خرچ کر کرکے مفلس و قلاش ہو جائیں۔ گویا مخالفت کی وجہ نہ صرف اخلاقی تھی بلکہ اقتصادی بھی۔

۳۔ سماجی | عرب کا سماجی نظام قبیلوں کی بنیاد پر قائم تھا۔ ہر ایک قبیلہ ایک وحدت تھی اور قبیلے کا ہر ایک شخص قبیلے اور قبیلے کے تمام افراد کے اعمال کے لئے ذمہ دار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک فرد نیکی بدی، اچھائی برائی غرض ہر حال میں اپنے قبیلے کے لئے کٹ مرنے اور جان دینے کے لئے تیار رہتا۔ لیکن اس کی اپنی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان میں سے ہر ایک مطلبی تھا، مخزومی تھا، سہمی تھا وقس علی ہذا۔ فرد کی ذاتی حیثیت قبیلہ سے علیحدہ بمنزلہ صفر تھی اور اس کا فرض تھا کہ وہ ہر صورت میں قبیلے کا ساتھ دے۔ یہ بہت بڑا عیب بلکہ جرم تھا کہ کوئی شخص قبیلے کے سوادِ اعظم کے خلاف کوئی حرکت کرے۔ ایسی آزادانہ روش کا ہمیشہ ایک ہی نتیجہ ہوتا کہ وہ شخص قبیلہ سے خارج کر دیا جاتا۔ اور اس کے بعد جہاں اس کے سینگ سمائے چلا جاتا اور کسی دوسرے قبیلے سے دوستانہ تعلقات پیدا کر کے ان کی پناہ میں زندگی بسر کرتا۔ کیونکہ اسے بہرحال کسی کا ہو کے رہنا پڑتا تھا۔ بطور فرد اس کا سماج میں کوئی مقام نہیں تھا۔ اگر وہ کسی قبیلے کی حمایت میں نہیں ہوتا، تو اس کا خون حلال تھا اور اس کا مال خوانِ یغما۔

ان کا یہ نظریہ نہ صرف سماجی تھا، بلکہ مذہبی بھی، کیونکہ وہ کسی حیات بعد الممات کے قائل ہی نہیں تھے۔ قبیلے کی ہر حالت میں تائید کرنا اور سردارِ قبیلہ کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کر دینا، یہی ان کا دین تھا اور یہی ان کی دنیا۔

اسلامی تعلیم اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام ہر ایک فرد کی شخصی زندگی پر زور دیتا اور اسے اپنے اعمال کیلئے ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (فاطر ۳۵: ۱۸، زمر ۳۹: ۷) جو کرے گا وہی بھرے گا۔ اگر کسی نے گناہ کیا ہے تو اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ نہ اس کا قبیلہ اس کے کام آسکتا ہے نہ اس کے بھائی بند۔

جب مکے کے نوجوان اپنا آبائی مذہب چھوڑ چھوڑ کر مسلمان ہونا شروع ہو گئے۔ تو گویا قبیلوں کی ان مضبوط دیواروں میں رخنے پیدا ہونے لگے۔ دوسرے لفظوں میں ہر ایک قبیلے کی اتنی تلواریں اور اتنے شہسوار کم ہو گئے۔ ان کے بڑے بوڑھوں کو معلوم ہو گیا کہ آج سے یہ جوان قبیلے کی طرف سے تلوار نہیں اٹھائیں گے نہ کسی دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر ہو کر میدان میں نکلیں گے۔

۴۔ سیاسی | ممکن ہے کہ شروع میں لوگ اسلام کے پیغام کی سیاسی اہمیت سے متعلق پورے طور پر خبردار نہ ہوئے ہوں۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک کسی مغالطہ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ کہ اس کی کامیابی ان کی سرداریوں اور ریاستوں کے جانے کو مستلزم ہے۔ ہر وہ

شخص جو اسلام کا جوا اپنی گردن میں ڈال لیتا تھا، وہ نہ صرف قبیلے اور قبیلے کے رئیس کی ایک تلوار کم کر دیتا تھا بلکہ وہ اسلام اور داعیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت میں بھی اتنا ہی اضافہ کر دیتا تھا۔ اس لئے عمائد مکہ اور رؤسائے عرب کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اگر یہ کاروبار اسی طرح جاری رہا، تو کوئی دن جاتا ہے، کہ ہمیں بھی طوعاً و کرہاً محمد (صلعم) کی سیادت قبول کرنا پڑے گی۔

مکہ کی آبادی قریش کی قوم پر مشتمل تھی جو اگرچہ ایک ہی جد اعلیٰ فہر بن مالک کی اولاد تھے (جس کے عرف قریش کی نسبت سے یہ قریشی کہلائے) لیکن ان کی آپس میں سخت دشمنیاں تھیں۔ مثلاً فہر کے دو بیٹے تھے عدی اور مرہ۔ ان دونوں کی اولاد، جو بنو عدی اور بنی مرہ کہلائی، آپس میں ایک دوسرے کی سخت مخالف تھی۔ مرہ کے دو بیٹے تھے، کلاب اور یقظہ۔ کلاب کی اولاد میں قصی اور زہرہ ہوئے اور یقظہ کا بیٹا مخزوم تھا۔ بنو زہرہ اور بنو قصی ایک طرف تھے اور بنو مخزوم دوسری طرف، اور دونوں گروہ ایک دوسرے کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ قصی بہت صاحب اقتدار اور معاملہ فہم شخص تھا۔ اس نے اپنی اولوالعزمی، حزم و احتیاط اور زور بازو سے قریش کے منتشر شیرازے کو پھر یکجا کر دیا، اور قوم نے بھی اسے گویا اپنا رئیس کل تسلیم کر لیا۔ جس کا وہ ہر طرح مستحق تھا۔ قصی کے بعد قوم کی باگ ڈور اس کے بیٹے عبد مناف کے ہاتھ میں آئی۔ یہ بھی باپ کی طرح قابل اور صاحب الرائے شخص تھا۔ اس کے سامنے کسی کو آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے دو بیٹوں ہاشم اور عبد شمس کی اولاد میں پھر چشمک ہو گئی۔ بنو عبد شمس ہمیشہ اس تاک میں رہتے کہ کسی طرح بنو ہاشم کو نیچا دکھائیں۔ ہاشم کا بیٹا عبد المطلب (شیبہ) بھی قابل اور امیر شخص تھا، اس لئے اس کے جیتے جی ان کی دال نہیں گلی۔ لیکن اس کے بعد تنزل کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مقابلے میں عبد شمس کا پوتا حرب بن امیہ سردار قوم تسلیم کر لیا گیا۔ عبد المطلب کی وفات پر اس کے بیٹے ابو طالب (حضرت علیؓ کے والد۔ ان کا اصلی نام عبد مناف تھا) بنو ہاشم کے سردار ہوئے۔ یہ گو شریف النفس اور عالی حوصلہ تھے، لیکن نادار۔ اس لئے خاندان کی عظمت و وقار کا پہلا سا رنگ نہ رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی ابو طالب کے بھتیجے تھے۔ جب تک عبد المطلب زندہ رہے، وہ اپنے اس یتیم پوتے کی دلدہی کرتے رہے۔ لیکن ان کی آنکھ بند ہوئی تو آپ کی تربیت اور پرورش، ابو طالب کے ذمے ہو گئی۔ لازمی طور پر ان خاندانی جھگڑوں اور رقابتوں کا حصہ رسدی آپ کو بھی بھگتنا پڑا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مخالفت دو شخصوں ـــــ ابو سفیان اور ابو جہل ـــــ نے کی۔ ابو سفیان کا اصلی نام صخر تھا۔ یہ اسی حرب بن امیہ بن عبد شمس کا بیٹا تھا جو بنو ہاشم کا سب سے بڑا حریف تھا۔ ابو جہل مخزومی تھا، جو مرہ بن کعب کے پوتے مخزوم کی اولاد سے تھا۔ مخزوم کے مرنے کے بعد اس کے خاندان کی ریاست ولید بن مغیرہ (مشہور سپہ سالار اسلام خالد بن ولید کے والد) کے حصے میں آئی۔ جب ولید فوت ہوا، تو بنو مخزوم کی سرداری اس کے بھتیجے ابو جہل بن ہشام کو ملی۔ ولید سال خوردہ اور نسبتاً شریف اور بردبار طبیعت کا آدمی تھا۔ ابو جہل عمر میں جوان تھا اور اس کے مقابلے میں مزاج کا بہت گرم اور سخت گیر۔ اس کا اصلی نام عمرو تھا اور کنیت ابو الحکم تھی۔ اس کی قابلیت اور معاملہ فہمی میں کوئی شبہ نہیں۔ مکہ کی قومی پارلیمنٹ (دار الندوہ) کا یہ اصول تھا کہ ۴۰ برس سے کم عمر کا کوئی شخص اس کا رکن نہیں بن سکتا تھا۔ ابو الحکم عمرو بن ہشام (ابو جہل) کی سیاسی سوجھ بوجھ اور دانشمندی کا یہ کھلا ثبوت ہے کہ اسے بطور استثنا ۳۰ برس ہی کی عمر میں دار الندوہ کا رکن بنا لیا گیا تھا۔ بنو مخزوم ایک مدت سے قریش کے دوسرے خاندانوں پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ لیکن قصی اور عبد مناف اور ہاشم اور عبد المطلب کے ہوتے انہیں ابھرنے کا موقع نہیں ملا۔ جب عبد المطلب کے بعد بنو ہاشم کمزور ہونے لگے تو نہ صرف بنو امیہ ہی اپنی عظمت کے خواب دیکھنے لگے، بلکہ بنو مخزوم کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔

ان دنوں اگر کوئی شخص سردار قوم بننا چاہتا تو اس کے لئے لازم تھا کہ وہ مہمان نواز اور سخی، فیاض اور فراخ حوصلہ ہو، سامانہ

حج کے موقع پر تمام ملک سمٹ کے مکہ میں جمع ہو جاتا تھا۔ دوسرے اوقات میں بھی لوگ میلوں ٹھیلوں میں جمع ہوتے رہتے تھے۔ جو شخص بھی ہر دلعزیزی حاصل کرنا چاہتا، ان ایام میں مہمانوں کی آؤ بھگت اور خاطر و تواضع میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا، یہی لوگ واپس جاکے اس کے گیت گاتے، شعراء ان کی مدح میں قصیدے لکھتے، زائر اس کی ضیافتوں کے افسانے سناتے، تاجر اس کی داد و دہش کے قصے بیان کرتے اور اس شخص کی شہرت آناً فاناً ملک کے کونے کونے میں پھیل جاتی۔

اگرچہ بنو مخزوم، قریش کی سرداری حاصل کرنے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے تھے، لیکن حرب بن امیہ بڑے دبدبے کا آدمی تھا۔ اس کی زندگی تک انھیں اپنی کامیابی کا کوئی خاص امید نہیں بندھی۔ لیکن اس کے بعد اس کا بیٹا ابو سفیان بہت بودا شخص نکلا۔ اگرچہ وہ بنو عبد شمس کا سردار تو تسلیم کر لیا گیا، لیکن اس میں نہ اپنے باپ کا حوصلہ تھا نہ دل و دماغ۔ نہ وہ قابلیت تھی نہ معاملہ فہمی۔ اب بنو مخزوم آگے بڑھے۔ پہلے ولید بن مغیرہ اور اس کے بعد ابو جہل بحیثیت مجموعی قوم قریش کے رئیس مان لئے گئے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوائے نبوت کیا تو کسی نے ابو جہل سے پوچھا، "ابو الحکم! کچھ سنا تم نے، محمد کیا کہتا ہے۔ کیا رائے ہے تمھاری اس کے متعلق؟" ابو جہل نے جو جواب دیا، اس میں گویا اس نے قبائلی رقابتوں اور جوڑ توڑ کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ کہنے لگا[1]

"بھائی سنا کیا ہے۔ ہم نے بنو عبد مناف سے حصولِ شرف کے میدان میں دوڑ لگائی۔ انھوں نے مہمانداریاں کیں، تو ہم نے بھی کیں، انھوں نے لوگوں کا بوجھ ہلکا کیا، تو ہم نے بھی کیا۔ انھوں نے ناداروں کو مال و دولت بخشا، تو ہم نے بھی بخشا۔ یہاں تک کہ اس دوڑ میں ہم نے ان کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا (اور قریب تھا کہ ہم ان سے آگے نکل جائیں) کہ اب انھیں یہ سوجھی ہے کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہو گیا ہے، اور اسے آسمان سے وحی آتی ہے۔ ہم نہیں جانتے ایسی باتوں کو، خدا کی قسم ہم کبھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے، نہ اسے مانیں گے۔"

گویا ابو جہل کے خیال میں بنو عبد مناف کے ایک فرد نے یہ نبوت کا دعویٰ، اپنی خاندانی عظمت کو برقرار رکھنے اور دوسرے حریف خاندانوں کو نیچا دکھانے کے لئے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ کیسے ان پر ایمان لے آتے۔

غرض کہ آپؐ کی سب سے زیادہ مخالفت انہی اسباب سے ہوئی۔ لوگوں نے مذہبی بنیاد پر مخالفت کی کہ ہمارے بتوں کی مذمت کرتے ہیں، اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ اور دوزخ کا ایندھن سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اس لئے مخالفت کی کہ وہ ان کے مظالم پر ان کو لعنت ملامت کرتے ہیں اور انھیں کمزوروں کی امداد اور خیرات کی تلقین کرتے ہیں۔ انھوں نے اس لئے مخالفت کی کہ انھیں اس میں اپنی سرداری، اور ریاست کا خاتمہ نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے اس لئے مخالفت کی کہ وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے حریف بنو ہاشم کے ایک جوان کے سامنے اپنی اکڑی ہوئی گردنیں خم کر دیں[2]

---

[1] ابن ہشام (۱: ۳۳۷ - ۳۳۸)

[2] اگرچہ مولانا شبلی مرحوم نے بعض اور اسباب بھی بیان کئے ہیں (سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۲۱۳ تا صفحہ ۲۱۹) لیکن در اصل یہ بعد کی باتیں ہیں۔ آغاز میں مخالفت کے یہی اسباب تھے۔

یہی وہ دلائل ہیں جو قریش کے وفد نے بار بار ابوطالب کے سامنے پیش کئے تھے۔

شروع میں عمائد قوم نے آنحضرت کے دعوے اور تبلیغ کو درخورِ اعتنا خیال نہیں کیا[1] لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ معاملہ زیادہ سنجیدہ صورت اختیار کرتا جا رہا ہے، تو ان کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ مشورے کرنے لگے کہ اس بڑھتے سیلاب کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ آخر یہ صلاح ٹھیری کہ قوم کے سرکردہ لوگ ابوطالب کے پاس جائیں کہ وہ آپ کے ولی اور مربّی تھے۔ ابوطالب نے انھیں سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدستور اپنی تبلیغ میں مشغول رہے۔ جس سے لوگ اور بھی زیادہ آپ کے پاس آنے جانے لگے۔ لازماً شورش بڑھ ہی جانی تھی۔ اب تو قریش کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ وہ دوبارہ وفد لے کر ابوطالب کے پاس آئے اور دھمکی دی کہ اگر آپ محمدؐ کو بند نہیں کر سکتے تو پھر ہم خود اس سے نبٹ لیں گے، اور اگر آپ ہمارے مزاحم ہوں گے تو آپ سے بھی، حتیٰ کہ ہم دونوں فریقوں میں سے ایک کا خاتمہ ہو جائے۔ اب کے بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تو انھوں نے ایک اور کوشش کی اور یہ تجویز پیش کی کہ ہم قریش کا ایک وجیہ، شریف نوجوان دینے کو تیار ہیں آپ اسے بیٹا بنا لیں اور محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ہم اس سے اس کے کرتوتوں کا بدلہ لے سکیں۔ ابوطالب نے صاف جواب دیدیا کہ یہ تو نہیں ہوگا۔ اس پر یہ لوگ اٹھ کے چلے آئے کہ ہم نے اپنی سی کوشش کر لی کہ کسی طرح یہ معاملہ صلح صفائی سے طے ہو جائے لیکن تم کوئی بات ماننے پر تیار نہیں۔ اس کے بعد کھلم کھلا مخالفت شروع ہو گئی۔

مسلمانوں پر سختی

قریش نے پہلے تو یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک قبیلہ اپنے یہاں کے مسلمانوں پر سختی کرے اور انھیں اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرے۔ ابوجہل نے ایذا رسانی کے علاوہ نفسیاتی ہتھیاروں سے بھی کام لیا۔ جب اسے معلوم ہوتا کہ کوئی ایسا شخص مسلمان ہو گیا ہے جو خود بھی صاحبِ عزت ہے اور اس کی پشت پر اس کا قبیلہ بھی طاقتور ہے تو وہ اسے تمسخر و استہزا کا نشانہ بناتا اور اس سے کہتا کہ ہم تمھاری بے عقلی کا ڈھنڈورا پیٹیں گے اور تمھیں ذلیل کریں گے کہ تم نے اپنے باپ دادا کا دین ترک کر دیا۔ حالانکہ وہ تم سے بہتر آدمی تھے۔ اگر وہ شخص تاجر ہوتا تو اسے دھمکی دیتا کہ ہم دیکھیں گے۔ تم کیسے اپنا مال یہاں بیچتے ہو۔ اگر تمھاری ساری پونجی نہ ڈوب گئی تو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اور اگر وہ شخص کمزور اور بے اثر ہوتا تو اسے زد و کوب کرتا اور دوسروں کو بھی اس کے مارنے پر اکساتا[2]۔ یہی وجہ ہے کہ جسمانی تکلیف غریبوں اور بیشتر غلاموں کے حصہ میں آئی، یا ان لوگوں کے جن کے قبیلوں نے ان کے قبولِ اسلام کی وجہ سے ان کا مقاطعہ کر دیا تھا۔

خبابؓ بن الارتؓ، بلالؓ بن رباحؓ، ابوفکیہہ یسارؓ، عمارؓ بن یاسرؓ، صہیبؓ رومی اور متعدد لونڈیاں انھیں مسکینوں میں سے تھیں جن پر ان کے مالکوں نے من مانے مظالم توڑے۔ ان کے حالات پڑھ پڑھ کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ لیکن آفریں ہے ان پر کہ ان میں سے کسی کے پاؤں جادۂ صداقت سے نہ ڈگمگائے۔ ان میں سے بیشتر کو حضرت ابوبکرؓ یا دوسرے صاحبِ مال مسلمانوں نے خرید کر آزاد کر دیا۔ لیکن جو بچ رہے وہ مدتوں یہ سختیاں جھیلتے رہے۔

بے شک ان غریبوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ یہ اپنے مالکوں کی ملکیت تھی اور وہ مختار تھے کہ ان سے جیسا سلوک چاہیں کریں۔

عہ[1] طبری (۳ ، ۱۱۸۰) عروہ بن زبیر کا خط خلیفہ عبدالملک بن مروان اموی کے نام

عہ[2] ابن ہشام (۱۰۳ - ۱۲۲)

ہمارے آباؤ اجداد جو مر چکے ہیں زندہ ہو جائیں۔ جب کوئی بات نہ بنی تو آخر قریش میں سے ایک بولا، ہم نے حجت پوری کر دی، اب ہم تمھیں نہیں چھوڑیں گے حتیٰ کہ یا ہم تمھیں ختم کر دیں یا تم ہمیں ختم کر دو۔

اس کے بعد قریش نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایذا پہنچانی شروع کی۔ ایک دن خانہ کعبہ کے قریب آن پڑتا اور آپؐ کی گردن میں چادر ڈال کے کھینچنے لگے، قریب تھا کہ گلا گھوٹ دیں کہ حضرت ابوبکرؓ آپہنچے وہ ان کے بیچ پڑے تو وہ آپ کو چھوڑ کر چل دیئے۔ اسی طرح خود ابوبکرؓ کو ایک دن قریش نے مارا پیٹا اور ان کی ڈاڑھی نوچ لی۔ جب آپؐ جدھر نکل جاتے لوگ دق کرتے، گالیاں دیتے، راہ میں کانٹے بچھا دیتے۔ آپؐ کے گھر کے سامنے غلاظت اور گندگی ڈال دیتے۔

غرض مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا۔ وہ کسی جگہ مخالفین کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں تھے۔ نہ گھروں میں چین تھا نہ باہر آرام۔ غریب مسلمان آآ کے آپؐ سے شکایت کرتے اور آپ انھیں صبر کی تلقین فرماتے[1]۔

ہجرتِ حبشہ

لیکن یہ صورت حال ایسی تھی کہ زیادہ دیر تک اسے برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آخر آپؐ نے مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ اس ہجرت کے متعدد اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ جیسے کہ اصلی اور بنیادی سبب یہی تھا کہ قریش مسلمانوں پر اتنی سختیاں اور ظلم کرتے تھے کہ وہ ان کی حد برداشت سے بڑھ گئیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جن غریبوں اور بے کسوں پر واقعی ظلم ہو رہے تھے اور جن کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تھا، وہ تو گئے نہیں، وہ گئے جو مختلف قبیلوں کے وہ صاحب اثر حضرات جن میں سے بیشتر سے متعلق تاریخ میں کہیں ذکر نہیں کہ ان پر بھی کوئی سختی کی گئی تھی۔ اس کے باوجود ان کا وطن چھوڑ کر پردیس میں چلا جانا سمجھ میں نہیں آتا[2]۔ بعض مغربی مصنفوں نے بہت دور از کار اسباب بیان کیے ہیں۔ لیکن ایک بات بہت معقول نظر آتی ہے اور قرائن سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔

---

[2] لیکن یہ حضرات صاحب ثروت بھی تھے اور ذی وجاہت بھی تھے مگر ان کو خود ان کے قبیلے والے ستاتے تھے اور طرح طرح سے تنگ کرتے تھے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما سے انھیں حبشہ کی جانب ہجرت کرنی پڑی۔

حضرت عثمان بن عفان مسلمانوں میں غالباً سب سے زیادہ دولت مند تھے۔ مگر انھی عثمان کو ان کے چچا حکم بن ابو العاص نے ایک بار رسی سے باندھ کر زدوکوب کیا اور دوسرے عزیزوں اور رشتہ داروں نے بھی بڑی سرد مہری کا سلوک کیا ـــــ حضرت زبیر بن عوام پر ان کے چچا نوفل بن خویلد نے تو ظلم و ستم کی انتہا کر دی، وہ ظالم حضرت زبیر کو چٹائی میں لپیٹ کر باندھ دیتا اور ان کی ناک میں دھواں دیتا جس کے اثر سے آپ کا دم گھٹنے لگتا ـــــ حضرت مصعب بن عمیر کو ان کے والدین نے زنجیروں میں جکڑ دیا اور وہ ایک مدت تک قید و بند کے مصائب برداشت کرتے رہے ـــــ حضرت خالد بن سعید کو ان کے گھر والوں نے قید کر کے کھانا پینا تک بند کر دیا، اور تین دنوں تک تاکید کر دی کہ ان سے کوئی بولے نہیں اور نہ ان کی مدد کرے آخر ایک دن موقع پا کر قید سے نکل بھاگے۔ چند دن مکے کے نواح میں چھپے رہے اور مہاجرین کا دوسرا قافلہ حبشہ جانے لگا تو اس کے ساتھ یہ بھی چلے گئے ـــــ حضرت سلمہ بن ہشام کو ان کے بھائی ابو جہل نے ستایا اور تذلیل و تحقیر کی حد کر دی:
ایسوں کے اسی ظلم و ستم، دل آزاری، توہین و تذلیل اور طرح طرح کی زیادتیوں کے سبب ان حضرات نے حبشہ کو ہجرت کی۔ (م۔ق)

---

[1] صحیح بخاری (علامات النبوۃ فی الاسلام)، کتاب مناقب الانصار (باب ما لقی النبی صلعم واصحابہ من المشرکین بمکہ)

بے شبہ قریش مرتدوں کو کوشش کر رہے تھے کہ جیسے بھی بنے، ان مٹھی بھر مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے ان کے آبائی دین پر واپس لے آئیں۔ چنانچہ جب وہ ابوطالب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سمجھوتہ کرنے میں ناکام رہے، تو انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ہر ایک قبیلہ اپنے ہاں کے مسلمانوں کو ایذا پہنچائے، اور انھیں مرتد کرنے کی کوشش کرے جیسا کہ عروہ بن زبیر نے اپنے خط میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کو لکھا تھا[1] وہ لکھتے ہیں۔ "قریش کے سرکردہ لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ وہ کس طرح اپنی اولاد اور بھائی بندوں کو دین اسلام اور رسول خدا کی پیروی سے ورغلا سکتے ہیں" ابوجہل کے تمسخر کا بھی یہی مقصود تھا کہ ان لوگوں کو شرم دلائی جائے۔ کہ تم نے اپنے باپ دادا کے مسلک کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ وہ تم سے اچھے اور بڑے لوگ تھے۔ بوند بوند پانی سے پتھر میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی طور پہ بتدریج ان ترغیبات کا یہ اثر ہو سکتا تھا کہ کمزور طبیعتیں ارتداد پر آمادہ ہو جائیں۔ اسلام نئی نئی چیز تھی۔ ابھی اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ ان ابتدائی مسلمانوں کا ماحول یکسر ان کے معتقدات کے خلاف تھا، اور قومی روایات کا زبردست اثر بھی دن رات ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ قدرتی طور پہ یہ لوگ سخت آزمائش (فتنہ) میں مبتلا تھے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان حضرات کو حبشہ جانے کی اجازت دی ہے تو آپ کے ذہن میں یہ بات ہو کہ ان کے اس زہریلی اور مخالف فضا سے نکل جانے ہی میں عافیت ہے۔

لیکن قریش کو ان کا برگوشۂ عافیت بھی نہ بھایا۔ انھوں نے یہاں بھی ان کا پیچھا کیا۔ یہ بھی کچھ واضح نہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ ان ایام میں مکہ میں جو نظام حکومت قائم تھا (بشرطیکہ ہم اسے حکومت کہہ سکیں)[2] اس کی رو سے یہ مہاجرین کسی طرح مفرور قرار نہیں دیئے جا سکتے تھے۔ انھوں نے کوئی قابل گرفت فعل نہیں کیا تھا۔ اور وہ کسی طرح بھی فراری مجرم نہیں تھے۔ اس لئے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کا کیوں تعاقب کیا گیا۔

بہر حال قریش نے دو آدمیوں کو سفیر بنا کے نجاشی حبشہ کے دربار میں بھیجا۔ دونوں سفیر اپنے ساتھ بہت تحفے تحائف لے گئے تھے۔ حبشہ میں خاندان شاہی اور اہل ملک عیسائیت پر قائم تھے۔ سفیروں نے دربار شاہی میں حاضری سے پہلے پادریوں کو ساتھ ملانے کی کوشش کی، ہر ایک کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا، اور ان سے درخواست کی کہ "جب ہم ان مسلمانوں کے بارے میں بادشاہ سلامت سے بات چیت کریں تو آپ بھی یہ مشورہ دیں کہ انھیں ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ وہ ان سے کوئی پوچھ گچھ نہ کریں۔ ان کی قوم ان کے متعلق بہتر جانتی ہے۔"

پادریوں نے ان کی تائید کی حامی بھر لی۔ تو انھوں نے نجاشی کی خدمت میں تحفے پیش کئے۔ اور مسلمانوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن ان کی ایک نہ چلی اور نجاشی نے ان مظلوموں کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اور تحفے بھی لوٹا دیئے۔ غرض دونوں سفیر خالی ہاتھ مکہ واپس آ گئے[4]۔

---

[1] طبری (ج ۳: ۱۱۸۰ - ۱۱۸۱)

[2] بخاری (کتاب الایمان)

[3] ان تفصیلات کیلئے دیکھئے "عہد نبوی میں نظام حکمرانی" از ڈاکٹر محمد حمید اللہ (باب دوم) جہاں انھوں نے مختلف ماخذ سے مواد جمع کر کے بعثت نبوی کے وقت مکہ کی حکومت (تفصیل سے بیان کر دی ہے)

[4] ابن ہشام ۱: ۲۵۶ - ۲۶۳، ابن سعد ۱: ۱۳۶ - ۱۳۹، الاستیعاب ۱: ۱۰۱

ان سفارت کی واپسی کے تھوڑے ہی دن بعد حضرت عمر بن خطاب نے اسلام قبول کیا۔ قریش جو اپنی تمام کوششوں کی ناکامی سے پہلے ہی پیچ و تاب کھا رہے تھے، اب وہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے بالکل ہی جھلا اٹھے، جو چند مسلمان مکہ میں رہ گئے تھے، اب ان کا جینا محال ہو گیا۔ اوروں کو تو چھوڑیئے۔

یہ بار بار کی ناکامی قریش کے لئے باعث عبرت ہو سکتی تھی۔ اگر ان کی بصیرت اور بصارت برقرار ہوتی، تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ ضرور اس تحریک کی پشت پر کوئی ایسی ہستی ہے، جو ان سے زیادہ طاقتور اور ان سے زیادہ باتدبیر ہے۔ لیکن عبرت تو درکنار، ان متواتر ناکامیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ جس سے ان کی آتش غضب بجھنے کے بجائے اور بھڑک اٹھی اب انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس "فتنہ" کی جڑ کاٹ دی جائے۔

شعبِ ابی طالب

وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن ان کی راہ میں آپ کا خاندان حائل تھا، جو ہر مخالفت کے وقت آپ کے آڑے آ جاتا تھا۔ آخر ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کا مقاطعہ کیا جائے، تاکہ وہ تنگ آ کر یا تو آنحضرت صلعم کو ان کے حوالے کر دیں یا انھیں اپنے سے الگ کر کے کہیں باہر بھیج دیں۔ چنانچہ تمام عمائد قریش جمع ہوئے اور ایک صحیفہ لکھا گیا عـــه جس کی شرطیں یہ تھیں:

(۱) بنو ہاشم اور بنو مطلب سے نکاح کا رشتہ نہ کیا جائے۔ نہ کوئی انھیں لڑکی دے، نہ ان کی لڑکی لے۔

(۲) ان سے لین دین کا تعلق نہ رکھا جائے۔ نہ ان کے ہاتھ کوئی چیز بیچی جائے، نہ ان سے خریدی جائے۔

اس صحیفہ پر سب نے دستخط اور مہریں کر دیں، اور مزید تاکید کے لئے اسے خانۂ کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا۔ تاکہ سب کو ان کے عزم کا علم ہو جائے۔ کہ آج سے آپ کا خاندان قریش سے خارج ہے اور کوئی ان سے روٹی بیٹی کا تعلق رکھنے کا روادار نہیں۔

بنو ہاشم نے باہمی مشورہ سے اپنی خاندانی جائے پناہ پہاڑی درے (شعب ابی طالب) میں یکجا ہونے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ وقت پڑنے پر وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کر سکیں۔ اور منتشر ہونے کی صورت میں قریش کی طرف سے جو خطرہ تھا، اس سے بھی محفوظ ہو جائیں۔ ابولہب کے سوائے سارا خاندان یہاں جمع ہو گیا۔ انھوں نے دو تین برس ایسی مصیبت میں یہاں گزارے کہ بسا اوقات درختوں کے پتے کھا کھا کر بسر کی۔ آخر خدا نے مخالفوں ہی میں سے بعض رحم دل لوگ پیدا کئے، انھوں نے اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ابوجہل کی مخالفت کے باوجود صحیفہ کو علی الاعلان چاک کر دیا۔ اور بنو ہاشم کو اپنی حفاظت میں درے سے باہر نکال لائے۔

اس کے تھوڑے ہی دن بعد ابو طالب اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ ان دونوں نے شروع سے ہر مشکل کے وقت آپ کا ساتھ دیا تھا اور ہر موقع پر دشمنوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو کر آپ کی حمایت کی تھی۔ ابو طالب کے بعد بنو ہاشم کی سرداری ان کے چھوٹے بھائی ابولہب کے حصہ میں آئی۔ اس کی مخالفت ظاہر تھی۔ اب قریش نے نڈر ہو کر ظلم و تعدی میں اور اضافہ کر دیا۔ باہر آتے جاتے آپ سے ہنسی مذاق کرتے۔ اسی طرح ایک دن ایک شقی نے آپ کے سر پر خاک ڈال دی۔

سفرِ طائف

جب آپ نے دیکھا کہ قریش کسی طرح مخالفت سے باز نہیں آتے۔ تو آپ نے خیال کیا کہ شاید طائف میں خدا کسی سعید روح کو قبول اسلام کی سعادت نصیب کرے۔ طائف قوم ثقیف کی بستی تھی۔ اور یہ لوگ بڑے امیر اور صاحب

عـــه ابن ہشام (۱: ۳۷۵-۳۷۶) نیز امتاع الاسماع (۱: ۲۵)

وجاہت تھے۔ خاص طور پر عمرو بن عمیر کے تین بیٹے (عبدیالیل اور مسعود اور حبیب) بہت بارسوخ تھے، آپؐ انھیں کے پاس تشریف لے گئے۔ انھوں نے بھی آپ کی تلقین کو مذاق میں اڑا دیا۔ آپ مایوس ہو کر وہاں سے واپس ہوئے تو انھوں نے شہر کے بدمعاش اور غلام آپ کے پیچھے لگا دیئے۔ پہلے تو انھوں نے تالیاں بجاتے، آوازے کسنے اور گالیاں دینے پر اکتفا کی۔ پھر بعد میں گھیر کر پتھر مارنے لگے۔ آپ کے پاؤں پر اتنے پتھر پڑے کہ آپ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں اور بڑی مشکل سے آپ جان بچا کر وہاں سے نکلے۔ اور راہ میں ایک کافر امیر کے باغ میں پناہ لی۔

مکہ اور طائف بڑے شہر تھے، ملک بھر کی تجارت یہاں کے باشندوں کے ہاتھ میں تھی۔ قرآن میں ولید بن مغیرہ مخزومی کا قول نقل ہوا ہے۔ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (زخرف ۴۳: ۳۱) اور وہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن اترنا ہی تھا تو ان دو شہروں کے کسی بڑے آدمی پر اترتا۔ تو یہ دو بڑے شہر ہی مکہ اور طائف تھے۔ آنحضرت صلعم نے دس گیارہ برس سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح یہاں کے لوگ پیغام خداوندی کو قبول کر کے دنیا و آخرت کی نعمتوں کے حقدار بن جائیں۔ لیکن ان مالداروں لوگوں نے اپنی طاقت اور اپنی دولت اور جتھے کے غرور کے نشے میں آپؐ کی تمام کوششوں کو ٹھکرا دیا۔ آپؐ کو اور آپ کے مٹھی بھر پیروؤں کو ہر ممکن ایذا دی، حتیٰ کہ ان میں سے بیشتر تنگ آ کر ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔

اس کے بعد آپ نے قبائل کی طرف توجہ کی۔ جب سال کے مختلف حصوں میں لوگ حج کے لئے یا کسی میلے میں شریک ہونے کو آتے، تو آپ ان کے ڈیروں میں تشریف لے جاتے۔ اور ان کے سامنے اسلام پیش کرتے لیکن آگے آگے آپؐ ہوتے اور پیچھے پیچھے آپ کا چچا ابولہب۔ جب آپؐ دعوت ختم کر چکتے، تو وہ کہتا :[۱]

"لوگو! یہ شخص تمھیں لات و عزیٰ کی پرستش سے دست بردار ہونے کو کہتا ہے اور
ایک بدعتی دین اور گمراہی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ خبردار اس کی باتوں میں نہ آنا۔"

سال بھر آپ قبائل کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس میں کچھ کامیابیاں بھی ہوئیں، لیکن بحیثیت مجموعی لوگوں نے بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا۔ وجہ ظاہر ہے۔ مکہ سارے جزیرۃ العرب کی ناک تھا۔ مال و دولت اور تعلیم میں یہاں کے باشندے کہیں بڑھے ہوئے تھے، اور تمام بیرونی لوگ بہت حد تک ان کے دست نگر۔ اس کے علاوہ حرم کعبہ بھی یہاں تھا، جہاں تمام قبائل حج کے ایام میں جمع ہوتے تھے۔ انہی دنوں میں تجارتی میلے بھی لگتے تھے، جن پر ان کی معیشت کا انحصار تھا۔ جب خود مکہ کے امرا اور رؤسا نے آپ کی دعوت قبول نہ کی، تو یہ بیچارے اسے مان کر انھیں ناراض کرنے کی کیسے جرأت کر سکتے تھے۔

غرض جب ان نام نہاد بڑے لوگوں نے اپنے متواتر اقوال و افعال سے ثابت کر دیا کہ وہ ہدایت قبول کرنے پر تیار نہیں تو مشیت خداوندی نے فیصلہ کیا کہ اب اسے اس کے صحیح قدر دانوں تک پہنچایا جائے۔

ہجرت مدینہ | دسویں سال نبوت کے موسم حج میں آپ حسب معمول قبائل کے ڈیروں کا چکر لگا رہے تھے کہ آپ کا سامنا مدینہ کے قبیلہ خزرج کے چند آدمیوں سے ہو گیا۔ آپ نے انھیں اسلام پر ایمان لانے کی دعوت دی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ اگلے برس اور بارہ شخص آئے اور وہ بھی بیعت کر کے واپس گئے۔ اس سے اگلے حج پر ۷۳ شخصوں نے بیعت کی۔ جب رفتہ رفتہ مدینے میں

---

[۱] ابن ہشام (۲: ۶۵)

جو چند نفوس بکنے پا رہ گئے تھے وہ اتنے کمزور اور بے اثر تھے کہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ لیکن قریش نے یہاں بھی مسلمانوں کا تعاقب کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے مدینہ کے رئیس خزرج عبداللہ بن ابی بن سلول کو خط لکھا کہ تم نے ہمارے مفرور کو پناہ دی ہے۔ اب یا تو اسے قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ خدا کی قسم ہم مدینہ پر حملہ کرکے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ مردوں کو قتل کر دیں گے اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیں گے[1]

اس کے بعد انھوں نے پیچھے بعد دیگرے تین زبردست حملے کئے تاکہ مسلمانوں کا قلع قمع کر دیں۔ پہلے بدر کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ یہ جگہ مکہ سے دو سو اور دو سو میل اور مدینہ سے کوئی اسی میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے دو برس بعد احد کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ یہ جگہ مدینہ سے دو ڈھائی میل دور شمال میں ہے۔ تیسری لڑائی میں مدینہ کی دیواروں کے نیچے ہوئی۔ مسلمان شہر میں محصور رہے۔ اور انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے شہر کے شمال کی طرف ایک خندق کھود دی تھی ہر معرکے میں مشرکوں کا لشکر پہلے سے زیادہ ہوتا گیا۔

میں نے یہ فاصلے اور جغرافیائی نشان دہی اس لئے کی ہے کہ بعض مغربی مصنفوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تھا۔ اگر یہ صورت ہوتی، تو لڑائیاں مکے سے قریب کے مقامات پر ہوتیں۔ نہ کہ مدینہ کے نواح اور اردگرد کے علاقے میں، جو ظاہر کرتا ہے کہ مکے کے لوگ بار بار چڑھائی کرکے آتے اور مسلمانوں کو ہر بار اپنے دفاع کے لئے لڑنا پڑا۔

لیکن مکے والے ہر مرتبہ بے نیل مرام واپس گئے۔ مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اور مشرکوں کی طاقت بتدریج گھٹتی گئی۔ آخر وہ دن آیا کہ ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کر دی۔ یہ پیش قدمی اس سرعت اور رازداری سے ہوئی کہ جب تک اسلامی لشکر مکے سے ایک منزل کے فاصلے پر نہیں پہنچ گیا، قریش کو اس کی بو تک نہیں لگی۔ قدرتی طور پر وہ اس کے لئے قطعی تیار نہیں تھے۔ اور اب ان کے لئے اس کے سوائے نجات کی کوئی صورت نہیں تھی کہ مقابلہ کئے بغیر ہتھیار ڈال دیں۔ چنانچہ یہی انھوں نے کیا۔

فتح مکہ آج ان تمام گذشتہ مظالم کے بدلے لینے کا دن تھا۔ اور میں نے یہ تمام واقعات اس تفصیل سے جو بیان کئے ہیں، تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ جن دنوں قریش کے ہاتھ میں طاقت تھی، جہاں تک ان کا بس چلا انھوں نے مسلمانوں پر سختی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انھیں ہر طرح ایذا دی۔ ہر جگہ ان کا پیچھا کیا۔ بار بار وہ اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ اور ان سب کارروائیوں کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمان ایک خدا کے کیوں پرستار ہیں۔ اور وہ بھی کیوں ان کی طرح بت پرستی پر قائم نہیں رہتے۔

لیکن حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ دشمنوں سے بدلہ لینے کے لئے نہیں بلکہ دنیا کو رحمت خداوندی کا نمونہ دکھانے کے لئے آئے تھے۔ فرمایا[2]

"جو شخص مقابلہ نہیں کرے گا، اور ہتھیار ڈال دیگا، یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ گزیں ہو جائے گا، یا اپنا دروازہ بند کرکے اندر بیٹھ رہیگا، یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائیگا، اس سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔"

جب دربار عام ہوا، تو قریش سے دریافت فرمایا: کہو تم سے کیا سلوک کیا جائے؟ کسی نے کہا[3]

---

[1] [illegible]

حیرا: اخ کریم وابن اخ کریم ۔ اچھا سلوک کرو کہ شریف بھائی ہو اور شریف بھتیجے

یہ سننا تھا کہ ارشاد ہوا ۔ لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء ۔ اچھا آج تم پر کوئی الزام نہیں جہاں چاہو جاؤ تم آزاد ہو۔

پھر اسی پر بس نہیں کی ۔

فتح مکہ کے بعد ہی حنین، اوطاس اور طائف کے معرکے پیش آئے جن میں مشہور قبیلہ ہوازن کو شکست ہوئی ۔ ہزیمت خوردہ فوج سمٹ کر طائف میں قلعہ بند ہو گئی ۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور انھیں محصور کر لیا ۔ یہ وہی طائف ہے جو ثقیف کا مرکز تھا اور جہاں سے آپ آج سے دس بارہ برس پہلے لہولہان ہو کر مشکل سے جان بچا کے نکلے تھے ۔ جب آنحضرت صلعم نے دیکھا کہ محاصرہ طول پکڑ رہا ہے تو آپ نے فوجوں کو اٹھ جانے کا حکم دیا ۔ اور دعا فرمائی ۔ اللھم اھد ثقیفا وائت بھم ۔ خدایا ثقیف کو اسلام قبول کرنے کی ہدایت فرما اور ان کو میرے پاس لے آ ۔

اس کے بعد ہوازن کے معرکے کا مال غنیمت تقسیم فرمایا ۔ تو سب سے زیادہ حصہ قریش کے انھیں لوگوں کو عطا ہوا جو کل تک سب سے بڑے دشمن تھے ۔ بڑے بڑے رئیسوں میں سے کسی کو سو اونٹ سے کم نہیں ملے ۔ ابوسفیان کو سو، ان کے بیٹے معاویہ کو سو، حکیم بن حزام کو سو ۔ ایسے ہی کتنے کتنے دوسرے اصحاب کو سو سو اونٹ ملے ۔ ان سے اتر کر بہت سے دوسرے تھے جنھیں پچاس پچاس ملے ۔ یہ سب تالیف قلوب کے لئے کیا گیا ۔ تاکہ یہ حدیث العہد لوگ یہ خیال نہ کریں کہ چونکہ ہم نے کسی زمانے میں مسلمانوں پر سختیاں کی تھیں ۔ اور آخر تک اسلام کے مخالف رہے اس لئے ہمارے حقوق ان لوگوں سے کم ہیں جو ہم سے پہلے اسلام لائے ۔

کیا کسی فاتح نے رحم دلی اور درگذر، بردباری اور شفقت، چشم پوشی اور عفو کی ایسی شاندار مثال پیش کی ہے ۔ ان مکیوں میں سے کس کا دامن بے داغ تھا ۔ انھوں نے ضعیف مسلمانوں کو پیٹا ۔ اپنے غلاموں پر جو اسلام لائے، ایسے ایسے عذاب توڑے کہ آج ان کے پڑھنے سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ جب یہ لوگ جان بچانے کی خاطر حبشہ گئے تو وہاں تک ان کا تعاقب کیا اور کوشش کی کہ کسی طرح پھر انھیں واپس مکہ لے آئیں اور تختۂ مشق بنائیں ۔ بقیہ لوگوں نے مدینہ میں پناہ لی، تو وہاں ان کا پیچھا کیا ۔ متواتر حملے کئے ۔ سازشیں کرکے اردگرد سے فوجیں چڑھا لائے ۔ خدا نے اسلام کا بول بالا کیا اور ان کی تمام کوششیں اکارت گئیں ۔ لیکن جب خدا نے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان پر فتح نصیب کی اور ان کے جان و مال مسلمانوں کے اختیار میں دے دیئے تو آپ نے ان ظلموں کا بدلہ لینا تو درکنار ان کا ذکر تک نہیں کیا ۔ اور فرمایا تو یہ کہ لا تثریب علیکم الیوم ۔ جاؤ تمھیں کھلی چھٹی ہے ۔ آج تم سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی ۔ بلکہ اسی پر اکتفا نہیں کی ۔ انھی کل کے دشمنوں کے گھر مال غنیمت سے بھر دیئے ۔ یہ تھی شان رحمۃ للعالمین کی ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

خاصیت، علت غائی، غرض ہر ایک چیز الگ الگ ہے۔ جو شخص اشیاء کے کسی خاص طبقے کا ماہر ہے، اور اس نے
اس کی صفات کا غائر مطالعہ کیا ہے، وہ اسے ایک نظر میں دوسرے طبقوں سے علیحدہ کر لے گا۔ نظاہر بین نظریں ان کی
امتیازی خاصیتوں سے ناواقف ہونے کے باعث اسے دوسرے طبقوں سے شناخت نہیں کر سکیں گی۔ لیکن اگر ماہر
فن بھی اسی غلطی کا ارتکاب کرے، اور ان میں آپس میں تمیز نہ کر سکے، تو یہ اس کی ناواقفیت اور عدم ماہری کا ثبوت ہوگا اور اس
سے ثابت ہوگا کہ اس نے دراصل موضوع کا مطالعہ اس دقت نظر اور غور و خوض سے نہیں کیا جس کا وہ دعویدار ہے۔

مثال کے طور پر آبنوس کی لکڑی لیجئے۔ اگر آپ نے ایک مرتبہ آبنوس کی ساری شکل اور اس کی خصوصیات اور اس کی تمام
وجوہ سے متعلق تحقیق کر لی ہے، اور آپ کو معلوم ہو گیا ہے، کہ آبنوس کیا چیز ہے تو ناممکن ہے کہ اس کے بعد آپ کبھی دھوکا کھائیں
جب بھی آبنوس کی بنی ہوئی کوئی چیز آپ کے سامنے لائے گی آپ معاً اسے پہچان لیں گے اور فوراً اس کا اعلان کریں گے
کہ یہ آبنوس ہے، اس کے برعکس اگر کوئی شخص آپ کے سامنے کوئی دوسری لکڑی پیش کر کے آپ کو قائل کرنا چاہے کہ یہ آبنوس
ہے، تو ناممکن ہے کہ آپ دھوکے میں آ جائیں۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ کسی فن کا ماہر بھی جب اس فن کی اصل یا فرع میں غلطی کرتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا علم ناقص
ہے، اور جتنے علم کا وہ دعویدار ہے، واقعی اتنے کا وہ حامل نہیں۔

یہی حال ان قوموں کا ہے جو وقتاً فوقتاً نبیوں کی تکذیب اور مخالفت کرتی آئی ہیں۔ جس شخص نے کسی نبی کو صحیح طور پر سمجھ
کر مانا ہے، اگر اس کے سامنے کوئی دوسرا نبی آئے گا، ناممکن ہے کہ وہ اس کی صداقت پر ایمان نہ لے آئے۔ جو قوم
ایک نبی پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہوئے کسی دوسرے سچے نبی سے منحرف ہو جاتی ہے، تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے،
جو کسی صنف اشیاء کا ماہر کہلاتے ہوئے بھی اس کے فرد کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس نے انبیاء کے طبقے کی
خصوصیات کا صحیح صحیح مطالعہ کیا تھا، نہ اس نے اشیاء کے اس خاص طبقے کی ماہیت کا، یہی سبب ہے کہ وہ اس نبی کی شناخت
سے محروم رہا، اور یہ اس طبقے کی اس چیز کو اس کی ٹھیک جگہ پر نہ رکھ سکا۔ گویا دونوں کا علم ناقص ہے۔ پس جب اس نے
ایک نبی کی تکذیب کی، تو گویا اس نے تمام طبقہ انبیاء کی تکذیب کی۔

یہی وجہ تھی کہ جب قوم عاد نے حضرت ہودؑ کی تکذیب کی اور ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تو اسے تمام رسولوں کی
تکذیب کہا گیا۔ کیونکہ اس سے ثابت ہوا کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے؟ نبی کی خصوصیات کیا ہیں؟ ایک
عام شخص اور نبی میں مابہ الامتیاز کیا ہے؟

دیکھئے یہود میں کتنے نبی آئے۔ قرآن کہتا ہے، وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ (۲:۸۷) اور ہم نے حضرت موسیٰ کے بعد
ان کی طرف پے در پے رسول بھیجے۔ لیکن انہی کی طرف جب حضرت مسیح ناصری علیہ السلام آئے، تو ان کی اکثریت ان کی شناخت
اور ان پر ایمان لانے سے محروم رہ گئی۔ اس کی وجہ یہی تھی، کہ ان کا حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد کے نبیوں پر ایمان محض
رسمی اور آبائی تقلید کا نتیجہ تھا۔ نہ کہ ان کے اپنے غور و فکر اور انشراح صدر کا۔ چنانچہ جب یہ دستے کے خدا کا بنایا ہوا ان کے
سامنے آیا تو وہ اسے پہچان نہ سکے اس سے ثابت ہوا کہ جن انبیاء پر وہ ایمان کے دعویدار تھے اگر وہ بھی ان کے زمانے میں مبعوث
ہوئے ہوتے، تو وہ ان کو بھی نہ پہچان سکتے۔ اور ان پر بھی ایمان نہ لاتے اور ان کی بھی تکذیب کرتے۔ گویا ان کی ایک نبی (حضرت
مسیح) کی تکذیب نے ثابت کر دیا کہ وہ سارے نبیوں کے مکذب ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اگرچہ ان کے زمانے کے یہود ایک نبی کے بیتابی سے منتظر تھے۔ آثار بھی اسی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ آنے والا آ رہا ہے۔ ان کی اپنی الہامی کتب اور روایت کی پیش گوئیاں بھی ان کے معتقدات اور توقعات کی تائید کر رہی تھیں۔ لیکن جب آنے والا سچ مچ آن پہنچا اور اس نے ان سے ایمان کا مطالبہ کیا تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ جو بار بار قرآن میں پرانے نبیوں کا ذکر آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے تمہاری طرف داؤد اور سلیمان اور ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب اور اسمٰعیل اور الیسع اور ذکریا اور یحییٰ علیہم السلام آ چکے ہیں تم مانتے ہو کہ یہ سب انبیاء برحق تھے، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھو۔ وہ بھی اسی منہاج نبوت پر آئے ہیں، جس پر یہ بزرگ آئے تھے۔

مشرکین مکہ کسی حد تک معذور تھے۔ کیونکہ ان کے ہاں نبوت کا کوئی خاص تصور تھا ہی نہیں۔ انھیں معلوم ہی نہیں تھا، کہ دراصل میں نبی کس کو کہتے ہیں، اور اس کی کیا خصوصیات ہیں۔ اسلئے اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے قاصر رہ گئے، تو کسی حد تک معذور بھی سمجھے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہود یہ عذر نہیں پیش کر سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کی طرف انبیاء و رسل کا تانتا لگا رہا۔ یکے بعد دیگرے اتنے نبی ان کی طرف مبعوث ہوئے، کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے، کہ ہم نہیں جانتے، نبی کا امتیازی نشان کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا حضرت رسول کریم صلعم کو قبول کرنے سے انکار کر دینا یہی ثابت کرتا ہے، کہ جن انبیاء کو وہ مانتے تھے، یہ بھی اس لئے نہیں تھا، کہ انھوں نے ان کی صداقت کو کسی اصول پر پرکھ لیا تھا، بلکہ محض اس لئے کہ ان کے آباء و اجداد ان کو مانتے چلے آ رہے تھے، چونکہ وہ سچے نبی کی علامتیں نہیں جانتے تھے، اس لئے جب ایک سچا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پاس آیا، تو وہ اسے شناخت کرنے سے محروم رہ گئے۔

معاہدۂ مدینہ

لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آغاز میں انھوں نے آپ کی مخالفت بھی نہیں کی۔

مدینہ میں یہود کے تین مشہور قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ آگے ان کے بہت سے بطن تھے۔ آنحضرت صلعم نے مدینہ پہنچنے کے بعد انتظامی امور کو یکساں اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ایک معاہدہ لکھا جسے ہم مدینہ کی حکومت کا دستورِ اساسی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں مہاجرین اور مدینہ کے انصار اور یہودی قبائل کے حقوق و فرائض ان کی رضامندی اور اتفاق کے بعد تفصیل سے لکھ دیئے گئے تھے۔ تاکہ بعد میں کسی طرح کی غلط فہمی نہ رہے[۵]

یہ دستاویز اچھی خاصی لمبی ہے۔ ہم اس کے صرف اس حصے کا ترجمہ یہاں لکھتے ہیں، جو یہود کے بارے میں تھیں اور جن کا ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق ہے۔

(۱) یہود، مومنوں کے ساتھ ایک سیاسی قوم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہود (بے شک) اپنے دین پر (رہیں) اور مسلمان اپنے دین پر، ان کے موالی بھی اور وہ خود بھی۔ ہاں اگر کوئی ظلم یا عہد شکنی کرے تو اس کا وبال بھی اس کی ذات یا خاندان کے سوائے کسی اور پر نہیں پڑے گا۔

---

[۵] یہ معاہدہ پوری تفصیل سے ابن ہشام میں نقل ہوا ہے (۲: ۱۴۷ - ۱۵۰) اردو میں جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ دیکھئے ان کی کتاب "عہد نبوی میں نظام حکمرانی" (باب: دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور)

(۲) یہود اس وقت تک مومنوں کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے، جب تک کہ وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔
(۳) ان میں سے کوئی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر (فوج کشی کیلئے) نہیں نکلے گا۔
(۴) یہود پر ان کے خرچ کا بار ہوگا، اور مسلمانوں پر ان کے خرچ کا۔
(۵) اور جو کوئی اس معاہدے والوں سے جنگ کرے تو وہ (یہود اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور فیصلہ کرنے کے لئے ان میں باہمی مشورہ ہوگا۔ اور بھلائی اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔
(۶) اگر اس معاہدے والوں کے درمیان آپس میں کوئی قتل یا جھگڑا ہو جائے، جس سے فساد پھیلنے کا اندیشہ ہو تو اس کا فیصلہ خدائے عزّوجل اور رسولِ خدا (صلعم) کے سامنے پیش کیا جائے گا۔
(۷) قریش مکّہ کو کسی صورت پناہ نہیں دی جائے گی، اور نہ کسی ایسے شخص کو جو انھیں مدد دے۔
(۸) مدینہ پر حملہ کی صورت میں یہود اور مسلمان ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔
مختصراً ان شرائط سے مندرجہ ذیل اصول مستنبط ہوتے ہیں۔
(الف) یہود نے بھی مسلمانوں کی طرح حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سیاسی حاکم، اور مقدموں اور قضیوں کی صورت میں ان کے فیصلوں کو واجب العمل تسلیم کر لیا تھا (۱، ۳، ۶)
(ب) یہود کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی (۱) لیکن وہ مسلمانوں کے دشمنوں کو نہ بلاواسطہ مدد دے سکتے تھے نہ بالواسطہ (۷)
(ج) مدینہ پر حملے کی صورت میں ان کا فرض تھا کہ وہ دفاع کے مشورے میں شامل ہوں (۵) اور مسلمانوں کے ساتھ شانہ بشانہ دشمن سے لڑیں (۸) اپنا فوجی خرچ وہ خود برداشت کریں گے (۴) اور جب تک جنگ جاری رہے گی وہ اس خرچ کے لئے خود ذمہ دار ہوں گے (۲)

ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ یہود کی پوری رضامندی اور تصدیق کے بغیر نافذ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شروع میں نہ صرف انھوں نے مخالفت نہیں کی، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک سیاسی وحدت بننے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔ (جسے معاہدہ میں امّت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے) لیکن جلد ہی ان کی آنکھیں پھر گئیں، اور وہ طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔

مخالفتِ یہود کے اسباب واقعہ یہ ہے کہ یہود مدینہ کے عربوں سے علم و فضل، مال و دولت، نظم و نسق، تنظیم و قوت، غرض ہر پہلو سے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ مدینہ کے دونوں بڑے قبیلوں اوس اور خزرج۔ کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ اور اس طرح روایتی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول کے مطابق وہاں کے گویا حکمراں تھے۔ عرب لوگ ضرورت کے وقت انہی سے قرض بھی لیتے اور اس طرح بھی یہود کا ہاتھ اونچا رہتا۔ جب تباہ حال اور مفلس و قلاش مہاجر وہاں پہنچے، تو انھوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ یہی خیال کیا کہ گویا ان کی "رعایا" میں اور اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ گویا یہ مسلمان بھی کسی عنوان ان کے حریف نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انھوں نے آپ کے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھا کر انھیں بھی اپنی مقاصد و عزائم کی کامیابی کے لئے استعمال کرنے کا تہیہ کر لیا، اور اسی لئے وہ فوراً آنحضرت کے ساتھ مل گئے۔ لیکن جلد ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ انھوں نے اپنی بساط سے زیادہ بڑی ذمہ داری اٹھا لی ہے۔ نہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان کے آلۂ کار بننے کو تیار ہیں، نہ عام مسلمان بھاڑے کے ٹٹو ہیں، یہیں سے ان کی مخالفت شروع ہوئی۔

۱۔ بنو قینقاع یہ قبیلہ شہر کے وسطی حصے میں مصلیٰ کے جوار میں رہتا تھا۔ ان کے پاس اپنی دو گڑھیاں تھیں۔ بلحاظ پیشہ یہ زمیندار نہیں بلکہ کاریگر لوگ تھے، زیادہ تر سناری کا کام کرتے تھے اور ان کا اپنا خاص بازار تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ شہر کی تجارت بہت حد تک ان کے ہاتھ میں تھی۔ تینوں قبیلوں میں سے یہ سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ اور انہیں اپنی طاقت کا گھمنڈ بھی تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے انہیں نے نقضِ عہد کیا۔

غزوۂ بدر کے بعد ([illegible]) ایک دن آنحضرت صلعم نے ان سے بات چیت کی، تو وہ کچھ گستاخی سے پیش آئے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا۔ "خدا سے ڈرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی اس کے انتقام کا غصہ اسی طرح نازل ہو جیسا قریش پر (بدر میں) نازل ہوا ہے۔ میں تمہارے بھلے کی کہتا ہوں تم مسلمان ہو جاؤ۔ تم خوب جانتے ہو۔ میں خدا کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔ یہ تمہاری کتاب میں موجود ہے، اور اللہ تم سے اس کا وعدہ کر چکا ہے۔" تو انھوں نے شوخی سے جواب دیا۔ "تم ہمیں اپنے برابر کا جوڑ نہ سمجھو۔ کہیں دھوکے میں نہ رہنا۔ (بدر میں) تمہارا مقابلہ ان لوگوں سے ہوا جنھیں فنِ جنگ سے متعلق کوئی واقفیت نہیں تھی جس سے تمہارا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ خدا کی قسم اگر ہمارے ساتھ لڑائی کی نوبت آئی، تو ہم تمہیں بتا دیں گے کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔"[1]

یہ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا تھا۔ اس طرح پھوٹ نکلا کہ ایک دن ایک نقاب پوش مسلمان عورت کچھ بیچنے کو بنو قینقاع کے بازارِ صرافہ میں آئی۔ سودا بیچنے کے بعد وہ ایک سنار کی دوکان پر گئی اور جا کے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ جب یہودی نے اس سے نقاب اٹھا دینے کو کہا تو اس شریفہ نے اس سے انکار کر دیا۔ اس پر اس نے چپکے سے اس عورت کی چادر کا کونا اس کی پشت کی طرف باندھ دیا۔ جب وہ اٹھی تو چادر گر کے علیحدہ ہو گئی۔ جب یوں وہ بے پردہ ہوئی، تو وہ سب یہودی اس پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اور اس کا مذاق اڑانے لگے۔ اور عورت نے دہائی مچائی۔ اس پر قریب سے ایک مسلمان جھپٹا اور اس نے اس سنار کو قتل کر دیا۔ بازار یہودیوں کا تھا، انھوں نے بڑھ کے اس اکیلے مسلمان کو گھیر لیا، اور اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ مسلمانوں کو جب واقعہ کا علم ہوا، تو ان کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور انھوں نے اپنی قوم کو یہودیوں کے خلاف مدد کیلئے پکارا۔ اس طرح معاملہ بڑھ گیا۔[2]

جب کھلم کھلا لڑائی شروع ہوئی، تو آنحضرت صلعم نے ان کی گڑھی کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا۔ آخر یہود اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اب انھیں سخت سزا ملنی چاہئے تھی۔ کیونکہ انھوں نے خود بنائے فساد قائم کی تھی۔ معاہدہ کی رو سے "یہود اور مسلمان ایک امت ہیں"۔ اس لئے ان کا فرض تھا کہ مسلمان عورت کی بے حرمتی کے مجرم نہ بنتے۔ اور اگر ان کے کسی فرد نے اس فعلِ شنیع کا ارتکاب کیا تھا، تو اسے لعنت ملامت کرتے، نہ کہ اس بیچاری کو سرِ بازار اپنی ہنسی مذاق کا تختۂ مشق بناتے اور رسوا کرتے۔ اور جب اس مسلمان نے یہودی سنار کو قتل کیا تھا، تو یہ معاملہ بھی حسب قرارداد فیصلہ کے لئے آنحضرتؐ کے سامنے پیش ہونا چاہئے تھا۔ اس کی بجائے انھوں نے خود ہی اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود آپؐ نے ان کی یہ شرط قبول کر لی کہ مسلمان بے شک ان کے مال اسباب پر قبضہ کر لیں لیکن ان کے کسی آدمی کی جان پر آنچ نہیں آئے گی۔[3]

[illegible] ابن ہشام ([illegible]) امتاع الاسماع ([illegible])

[1] ابن ہشام ([illegible])

[2] طبقات ابن سعد ([illegible] ۱۹)

انصار کے قبیلہ خزرج کا رئیس عبداللہ بن اُبی بن سلول مسلمان تھا۔ یہ قبیلہ بنو قینقاع کا حلیف تھا یعنی ان میں دوستی اور امداد کا معاہدہ تھا۔ جب عبداللہ کو خبر ملی کہ بنو قینقاع نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو وہ آنحضرت صلعم کے پاس آیا اور ان سے درخواست کی بنو قینقاع ہمارے حلیف ہیں۔ اس لئے ان سے نرمی کا سلوک کیا جائے۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق آپ چاہتے تھے کہ بنو قینقاع کو اس کی عہد شکنی اور دشمنی کی قرار واقعی سزا دی جائے۔ لیکن عبداللہ کے اصرار کی بنا پر فرمایا۔ "جاؤ تمہاری خاطر انھیں چھوڑتا ہوں"[1] لیکن [illegible] سے اس کی تغلیط ہوتی ہے۔ یوں بھی جب انھوں نے اس شرط پر اطاعت قبول کی تھی کہ [illegible] اہل و عیال کی جانیں محفوظ رہیں گی، تو اس کے بعد کوئی اور سزا انھیں کیسے دی جا سکتی تھی۔

بالآخر یہ سات سو آدمی مدینہ چھوڑ کر فلسطین کی طرف نکل گئے۔ جاتے وقت انہیں [illegible] ایک ایک [illegible] ساز و سامان ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

۲۔ **بنو نضیر** | قبیلہ بنو نضیر مدینہ کی بستی سے باہر جنوب مشرق میں بستے تھے۔ یہ لوگ [illegible] تھے۔ [illegible] کے علاوہ ساہوکارہ اور تجارت کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ قریش کے ساتھ ان کے بھی [illegible] تعلقات تھے۔

بنو نضیر کا واقعہ، حادثہ بئر معونہ کا تتمہ تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس حادثہ کو مختصر بیان کیا جائے۔

سنہ ۴ھ میں قبیلہ بنی عامر کا ایک شخص ابوبراء عامر بن مالک بن جعفر خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا۔ حسب معمول آپ نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس نے نہ اسے قبول کیا نہ رد، بلکہ کہا کہ آپ کچھ آدمی میرے ساتھ بھیج دیں۔ وہ ہمارے قبیلے کو تبلیغ کریں تو مجھے امید ہے کہ وہ آپ کی تعلیم مان لے۔ آپ نے فرمایا مجھے اہل نجد کی طرف سے ڈر لگتا ہے۔ ابو براء نے جواب دیا کہ میں ان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ آپ ضرور انہیں بھیج دیجئے، تاکہ وہ لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچا سکیں۔[2]

اس پر آپ نے حضرت منذر بن عمرو کو ستر آدمی دے کر اس کے ساتھ کر دیا۔ ان میں سے بیشتر [illegible] قراء قرآن تھے۔ یہ بنو عامر کے علاقے میں مقام بئر معونہ میں پہنچے تو انھوں نے حرام بن ملحان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دے کر رئیس قبیلہ عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ عامر بن طفیل سخت مخالف اسلام تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے اس شرط پر اسلام قبول کرنے کی پیشکش کی تھی کہ صحرا کے آپ مالک رہیں اور شہروں کا میں، اور آپ کی وفات کے بعد مجھے اپنا جانشین نامزد کر دیں۔ اگر ان باتوں سے کوئی منظور نہ ہو تو میں قبیلہ غطفان کو ساتھ لے کر آپ پر چڑھائی کر دوں گا۔[3] حرام بن ملحان اس کے پاس پہنچے اور خط اس کے حوالے کیا [illegible] اس نے خط کو دیکھا پڑھا تک نہیں اور حرام کو قتل کر دیا اور

---

[1] ابن ہشام (ج ۲ ص ۵۲)

[2] ابن ہشام (ج ۳ ص ۱۹۳ - ۱۹۴)

[3] بخاری، کتاب المغازی۔ باب غزوہ الرجیع و رعل و ذکوان و بئر معونہ

اردگرد کے قبائل کو جمع کر کے ان درویشوں کو گھیر لیا اور انھیں تہ تیغ کر دیا۔ صرف دو شخص خوش قسمتی سے بچ نکلے۔ ان میں سے ایک حضرت عمرو بن امیہ ضمری تھے۔ یہ واپس مدینہ آ رہے تھے کہ انھیں راستے میں بنو عامر کے دو شخص ملے۔ اس قبیلے کی غداری کا زخم ابھی تازہ تھا جس میں ان کے تمام رفقا شہید ہوئے تھے۔ انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور انتقام میں ان دونوں کو قتل کر دیا۔ حالانکہ ان دونوں کے پاس حضرت رسول کریم صلعم کا خط اور راہداری موجود تھے۔ لیکن حضرت عمرو بن امیہ کو اس کا علم نہیں تھا۔ جب وہ آپ کی خدمت میں پہنچے اور واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نے دو بے گناہوں کو قتل کیا ہے۔ اب ان کا خون بہا ادا کرنا پڑے گا۔[1]

بنو عامر، یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر کے حلیف بھی تھے اور حضرت رسول کریم صلعم کے ساتھ معاہدے کی رو سے بھی یہود پر خون بہا کی رقم کا حصہ دینا فرض تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر آپؐ نے بنو نضیر سے مطالبہ کیا کہ فدیہ پورا کرنے کے لئے حصہ رسدی رقم دیجئے۔ انھوں نے ادائی کا وعدہ کیا۔ اور معاہدہ کی موجودگی میں انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ٹال مٹول سے کام لیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض صحابہ کی معیت میں ان کی بستی میں بات چیت کرنے اور روپیہ لینے کے لئے تشریف لے گئے۔ تو انھیں شرارت کی سوجھی۔ کسی نے کہا یہ اچھا موقع ہے۔ آؤ مکان کی چھت پر سے پتھر کی سل ان پر گرا کے انھیں ہلاک کر دیں۔ آپؐ کو ان کی بدنیتی کا علم ہو گیا، لیکن آپ نے اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ اگر یہود کو معلوم ہو گیا کہ ان کا راز فاش ہو گیا ہے تو ممکن ہے کہ وہ بے دھڑک کھلم کھلا لڑائی پر اتر آئیں۔ آدھر آپ بھی چند صحابہ کے ساتھ گویا شیر کے کچھار میں گھس گئے تھے۔ حالت جتنی خطرناک تھی وہ ظاہر تھی۔ اس لئے آپؐ اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ اور خود اکیلے چپکے سے واپس چلے آئے تاکہ یہود کو یہی خیال ہو کہ ابھی تمام مسلمان آپ کے بیت دہیں موجود ہیں۔ جب آپؐ دیر تک واپس نہ آئے تو آپ کے ساتھی بھی مدینہ لوٹ آئے۔[2]

لیکن اس غداری کے باوجود ان کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا گیا۔ بنو نضیر، قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ اس لئے آنحضرت صلعم نے محمد بن مسلمہ اوسی کو یہ پیغام دے کر ان کے پاس بھیجا کہ سارا قبیلہ دس دن کے اندر اندر مدینہ سے نکل جائے۔ جائداد منقولہ وہ ساتھ لے جا سکتے ہیں اور سال بہ سال آ کے اپنے نخلستانوں کی فصل جمع کرنے کی انھیں اجازت ہوگی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ہمارے حلیف اوس کسی طرح ہمیں مدد دینے کو تیار نہیں تو وہ ان شرطوں پر جانے کو تیار ہو گئے۔ لیکن رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اور اس کے دوستوں نے انھیں شہ دی کہ حوصلہ نہ ہارنا۔ تم نکلو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے، اور ہم تمہارے بارے میں کسی کی نہیں مانیں گے۔ اور اگر تم سے کوئی لڑائی کرے گا تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ (سورہ الحشر ۵۹: ۱۱)[3] اگرچہ بنو نضیر کے زیادہ سمجھدار طبقے نے پھر بھی یہی مشورہ دیا کہ آنحضرت صلعم کی پیش کردہ شرطوں پر صلح کر لی جائے۔ لیکن رئیس قبیلہ حیی بن اخطب نے اس توقع پر کہ ان کے بھائی بند بنو قریظہ ضرور ان کی کمک کو پہنچ جائیں گے، مقابلے کا فیصلہ کر لیا۔ اور قلعہ بند ہو کے بیٹھ گیا۔

---

[1] ابن ہشام (ج ۲، ۱۹۴-۱۹۵)

[2] ایضاً (ج ۲، ۱۹۹-۲۰۰) نیز بخاری (کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر)

[3] قرآن کی سورۂ حشر اسی واقعے سے متعلق ہے۔

لیکن ان منافقوں اور بنی قریظہ کی کیا جرأت تھی کہ وہ کھلے میدان میں مسلمانوں کے خلاف نکل آتے۔ بنو نضیر نے کافی انتظار کیا کہ شاید یہ لوگ کچھ مدد کریں۔ لیکن جب اس طرف سے بالکل مایوسی ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمیں جان کی امان دی جائے، تو ہم یہاں سے نکل جانے پر تیار ہیں، آپ نے یہ منظور فرما لیا اور اتنی اجازت دی کہ ہر شخص ایک اونٹ کا بوجھ سامان ساتھ لے جا سکتا ہے۔ ذرا ان لوگوں کے کرتوت خیال میں رہیں، اور پھر یہ فیاضانہ سلوک۔

بنو نضیر مدینہ سے نکل کر خیبر چلے گئے۔ جو شرطیں ان سے کی گئی تھیں ان کا اس حد تک پاس کیا گیا کہ انھوں نے مکانوں کے دروازوں کی چوکھٹیں تک اکھاڑ کے اونٹوں پر بار کر لیں۔ لیکن کسی نے ان سے تعرض نہیں کیا۔ سامان سے لدے ہوئے چھ سو اونٹ ان کے ساتھ تھے۔ دف اور مزامیر بجاتے، ناچتے کودتے یہ لوگ اس طرح گئے، جیسے وہ وطن سے نہیں نکلے بلکہ جشن منانے جا رہے ہیں[1]

اسی موقع پر ایک اور ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اسلام کی رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔

مدینہ کے مشرکوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ اگر کسی کے اولاد نہیں ہوتی تھی یا کوئی اور مشکل درپیش آ جاتی تو وہ بطور تفاؤل یہ منت مانا کرتیں، اولاد ہو جانے یا مصیبت سے نجات پانے کی صورت میں بچہ یہودی مذہب کا پیرو بنا دوں گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ کی یہودی آبادی میں کتنے ایسے بچے جوان تھے جن کے والدین اب مسلمان ہو چکے تھے۔ جب بنو نضیر کو مدینہ سے نکلنے کی اجازت دی گئی تو وہ ان نو یہودیوں کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اس پر ان کے مسلمان والدین مانع ہوئے کہ ہم اپنی اولاد کو نہیں جانے دیں گے۔ جب یہ قضیہ آنحضرت صلعم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے فرمایا: دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" آیت اسی موقع پر نازل ہوئی (سنن ابی داؤد۔ کتاب الجہاد) یوں بھی ذمیں معاہدہ کی رو سے یہود کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی اور اگرچہ انھوں نے ہر موقع پر اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی، ناممکن تھا کہ آپ بھی مسلمانوں کی طرف سے عہد شکنی کو روا رکھتے چنانچہ یہ تمام بچے اور نوجوان بھی ان کے ساتھ چلے گئے[2]

۴۔ بنو قریظہ اب مدینے میں یہودیوں کا یہی ایک منظم قبیلہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ بنو نضیر کے قریبی رشتہ دار اور دو شاخوں، بنو کعب اور بنو عمرو پر مشتمل تھے۔ ان کی سکونت شہر کے باہر جنوب کی طرف تھی، ان کا عام پیشہ کاشتکاری تھا۔ اور یہ زرعی پیداوار کی تجارت سے بہت خوشحال تھے۔ گرچہ یہ بھی دوسرے قبیلوں کی طرح شروع سے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دشمن تھے، لیکن انھوں نے کھلے بندوں اس کا اظہار نہیں کیا۔ جب دوسرے دونوں قبیلے مدینہ سے نکل گئے، تو جلد ہی انھوں نے بھی اپنی شامت اعمال سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ ان کا انجام ان کے بھائی بندوں سے بہت زیادہ عبرت ناک ہوا۔

بنو نضیر کے جو لوگ خیبر میں جا آباد ہوئے تھے، ان میں ان کے رؤسا حیی بن اخطب اور سلام بن ابی حقیق اور اس کا بھتیجا کنانہ بن الربیع بھی تھے۔ یہ اپنی قوم کے بہت معزز لوگ تھے۔ جب یہ خیبر پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور انھیں سردار قوم تسلیم کر لیا۔ لیکن اس عزت افزائی سے ان کے دل کی جلن کم نہیں ہوئی۔ انھیں اپنی بے عزتی اور جلاوطنی کا بہت غم و غصہ تھا، اور وہ مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ چنانچہ حیی بن اخطب نے ہر جگہ پہنچ کے آگ لگا دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۵ھ میں سارا عرب کیل کانٹے سے لیس ہو کر مدینہ پر چڑھ آیا۔ اس جمعیت کا اندازہ دس ہزار سے چوبیس ہزار تک کیا گیا ہے۔ اگر کم از کم تعداد

---

[1] ابن ہشام (ج ۲ ص ۲۱۱) امتاع الاسماع (۱۔۱۸۱-۱۸۲)

[2] سنن ابی داؤد (کتاب الجہاد، باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام)

دس ہزار بھی صحیح مانی جائے تو خطرے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے چھوٹے بڑوں کی تعداد تین ہزار سے متجاوز نہیں تھی۔ یہی جنگ احزاب یا جنگ خندق کہلاتی ہے۔ اس جنگ کے تفصیلی حالات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حضرت ام المومنین ام سلمہؓ کے قول کے مطابق اس سے زیادہ پریشانی اور تنگی کے ایام آپ پر نہیں گذرے۔[1]

لیکن عرب فوج سے بھی زیادہ خطرہ یہود بنی قریظہ کی طرف سے تھا۔ ہوا یہ کہ جب قریش یہ ٹڈی دل لے کر آ گئے تو حیی بن اخطب نے بنو قریظہ کی بستی میں جا کر انھیں ورغلانے کی کوشش کی۔ اس نے سردار قبیلہ کعب بن اسد سے کہا کہ اب موقع ہے کہ حملہ آوروں کے ساتھ مل کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دو۔ پہلے تو کعب نے انکار کیا۔ اور معاہدے کا عذر پیش کیا کہ آج تک محمد (صلعم) کی طرف سے کوئی عہد شکنی نہیں ہوئی ہم کیسے اس کے خلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن جب حیی بن اخطب نے سبز باغ دکھائے کہ کیسا معاہدہ اور کہاں کے مسلمان تمام عرب امنڈ کر ان کے خلاف جمع ہو گیا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی نام لیوا تک باقی نہیں رہے گا۔ اس حالت میں کون تم سے معاہدے کی خلاف ورزی سے متعلق باز پرس کرنے والا ہو گا۔ ایسا اچھا موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ حملہ آوروں کی مدد کرو اور مسلمانوں کا ہمیشہ کے لئے سر کچل دو۔ کعب اس کے بھرے میں آ گیا اور مدد کرنے کی ہامی بھر لی۔ آنحضرت صلعم کو پتہ لگا تو آپ نے بعض صحابہ کو حقیقت حال دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ ان لوگوں نے جا کے کعب کو رسول اللہ کے ساتھ معاہدہ کی یاد دلائی تو اس نے تمرد سے جواب دیا "ہم نہیں جانتے کون رسول ہے۔ نہ محمد اور ہمارے درمیان کوئی عہد ہے نہ معاہدہ"۔[2]

اس سے خطرہ جتنا بڑھ گیا اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک یہ گھر کے بھیدی تھے۔ ان کی بستی شہر کے جنوب میں تھی اور یہ مسلمانوں کی پشت تھی۔ اس لئے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ خدا معلوم کب یہ اس جانب سے حملہ کر دیں، یا اور کچھ نہیں تو عورتوں اور بچوں ہی کو ہراساں کرنے لگیں۔ چنانچہ ایک دن ایسا ہوا بھی۔

آپ نے عورتوں کو حفاظت کے خیال سے اسی طرف ایک گڑھی میں بھیج دیا تھا۔ جو بنو قریظہ کی بستی کے قریب تھی۔ یہودیوں نے مسلمانوں کی توجہ اور طاقت دشمنوں کی طرف سے ہٹانے کے لئے اس پر حملہ کی تجویز کی، اور سب سے پہلے ایک آدمی کو قراولی کے لئے بھیجا کہ کس طرف سے پیش قدمی کی جا سکتی ہے۔ عورتوں میں حضرت رسول کریم صلعم کی پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبد المطلب بھی تھیں۔ انھوں نے جب اس یہودی کو مشتبہ حالت میں چکر کاٹتے دیکھا تو اپنے محافظ حضرت حسانؓ بن ثابت (مشہور شاعر) سے کہا کہ دیکھتے کیا ہو اتر کے اس شخص کو قتل کر ڈالو ورنہ یہ واپس جا کے دوسروں کو چڑھا لائے گا۔ حضرت حسانؓ کسی مرض کے باعث لڑنے بھڑنے سے معذور تھے۔ انھوں نے یہی عذر پیش کیا اس پر حضرت صفیہؓ خود کمر کس کے اٹھیں اور نیچے جا کے ایسے زور سے لٹھ اس کے سر پہ مارا کہ وہ وہیں چت ہو گیا پھر اس کی لاش گھسیٹ کے دیوار پر سے اس طرف پھینک دی، جدھر یہودیوں کی آبادی تھی۔ ان لوگوں نے لاش دیکھ کے خیال کیا کہ ہو نہ ہو اندر حفاظت کے لئے کافی سپاہ موجود ہے۔ اور اس طرح وہ ڈر کے مارے اپنے خطرناک ارادوں سے باز رہے۔[3]

---

[1] امتاع الاسماع (ج ۱، ۲۳۱)

[2] ابن ہشام (ج ۲، ۲۳۱-۲۳۲)، امتاع الاسماع (ج ۱، ۲۲۵-۲۲۶)

[3] ابن ہشام (ج ۲، ۲۳۹)

تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ حملہ آوروں میں باہم نفاق و بے اتفاقی پیدا ہو گئی اور تنگ بھگ ایک مہینے کے بعد وہ بے نیل مرام محاصرہ اٹھا کے واپس چلے گئے۔

جس دن اس مصیبت سے نجات ملی' اسی دن حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے خلاف پیش قدمی کر دی' اور ان کی گڑھی کا محاصرہ کر لیا۔ اس موقع پر کعب بن اسد نے اپنی قوم کو خطاب کیا کہ دوستو میں تمہارے سامنے تین باتیں پیش کرتا ہوں' ان میں سے جو چاہو' انتخاب کر لو۔ اول' ہم اس شخص (صلعم) کی تصدیق کریں' تم نے دیکھ لیا کہ وہ سچا نبی ہے' اور تمہاری کتاب میں اس کا ذکر موجود ہے۔ بنو قریظہ نے اس سے انکار کر دیا' کہا کہ ہم تورات کو چھوڑ کر کسی اور کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس پر کعب نے کہا کہ اچھا آؤ' جوہر کریں' یعنی اپنی بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں اور تلواریں سونت کر باہر نکل پڑیں۔ پھر جو فیصلہ خدا ہمارے اور محمد (صلعم) کے درمیان کر دے۔ اگر ہلاک بھی ہو گئے تو یہ غم تو نہیں ہو گا کہ ہائے ہمارے پیچھے ہماری آل و اولاد کا کیا حشر ہو گا۔ اور اگر جیت گئے' تو بیویاں اور اولاد پھر مل جائیں گی۔ اس پر لوگوں نے جواب دیا کہ ان مسکینوں کو بے گناہ قتل کر ڈالیں' تو ان کے بعد ہمارا جینے کا لطف کیا ہو گا۔ اب کعب نے تیسری بات پیش کی۔ اور کہا' کہ آج سبت کی رات ہے' آج مسلمان ہماری طرف سے مطمئن ہونگے۔ اور رات کے اندھیرے میں ان پر جا پڑیں۔ ممکن ہے ہمیں فتح نصیب ہو۔ کہنے لگے' تو کیا ہم اپنے ہاتھوں سبت کی بے حرمتی کریں۔ ہم سے تو یہ نہیں ہو گا۔ کعب نے جل کے کہا کہ تم میں سے کسی کی عقل ٹھکانے نہیں رہی۔ اب جو چاہو کرو۔[1]

غرض یہود نے مقابلہ کیا۔ ایک مہینے کے بعد درخواست کی کہ سعدؓ بن معاذ جو فیصلہ کریں' ہمیں منظور ہے۔ سعدؓ قبیلہ اوس کے رئیس تھے' اور یہ قبیلہ بنو قریظہ کا حلیف تھا۔ انھیں یقیناً یہی خیال ہو گا کہ سعدؓ ہمارے ساتھ نرمی کا سلوک کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط قبول کر لی۔ اور محاصرہ اٹھا لیا۔[2]

بنو قریظہ کا قصور ایسا نہیں تھا کہ اسے آسانی سے معاف کر دیا جاتا۔ ان کے ساتھ بنو نضیر کے خارج البلد ہونے کے زمانے میں پہلے معاہدے کی تجدید ہو چکی تھی' اور اس کی ایک شرط یہ تھی' کہ وہ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں' مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ اور دشمنوں کے مقابلے میں ہر ممکن امداد کریں گے۔ مدد تو درکنار انھوں نے الٹا غزوۂ خندق میں ہر طرح سرکشی اور غداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ پھر اسی معاہدے کی دوسری شرط یہ تھی کہ ہر ایک فریق کو اپنے مذہب کی پوری آزادی ہو گی۔ یہی سبب تھا کہ جب بھی آنحضرت صلعم کے سامنے کسی یہودی کا مقدمہ پیش ہوتا تو آپ تورات کی رو سے فیصلہ کرتے۔

سعدؓ نے سب سے پہلے تو یہود اور حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرار لیا کہ میں جو فیصلہ بھی کروں وہ دونوں فریقوں کو منظور ہو گا۔ اس کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ تورات کی تعلیم کے مطابق یہود کے سب بالغ مرد (مقاتل) قتل کر دیئے جائیں۔ اور ان کی عورتیں اور بچے قیدی بنائے جائیں اور ان کے اموال غنیمت میں محسوب ہو کر فوج پر تقسیم کر دیئے جائیں۔ تورات کا حکم ہے۔[3]

---

[1] ابن ہشام (۳: ۲۲۲ - ۲۲۸) امتاع الاسماع (۱: ۲۲۳ - ۲۴۴)

[2] بخاری (کتاب المغازی باب غزوۂ بنی قریظہ) نیز مسلم (کتاب الجہاد و السیر)

[3] کتاب استثناء (۲۰: ۱۰ - ۱۴)۔

"جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا۔ اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لئے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گذار بن کر تیری خدمت کریں۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو تو اس کا محاصرہ کرنا۔ اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا۔ لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے پاس رکھ لینا۔ اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھ کو دی ہو کھانا۔"

جو لوگ تلوار کے گھاٹ اتارے گئے، ان کی تعداد چار سو سے سات سو تک بیان ہوئی ہے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ اس نے پتھر کی سل گرا کر ایک مسلمان (خلاد بن سوید) کو قتل کیا تھا۔ اس کی پاداش میں وہ قتل ہوئی۔ حیی بن اخطب بھی ابھی تک بنو قریظہ ہی کے ساتھ ٹھیرا ہوا تھا۔ وہ بھی گرفتار ہو کر کیفر کردار کو پہنچا۔

اس فیصلہ کی سختی پر اعتراض دو وجوہ سے نہیں ہو سکتا۔ اول اس لئے کہ یہ ان کی اپنی کتاب کے مطابق تھا۔ دوسرے اس لئے کہ یہ ان کے اپنے انتخاب کردہ شخص نے دیا تھا۔ اور اسی وجہ سے خود یہود نے بھی اس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا۔

اسٹینلے لین پول نے اس واقعہ سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، غالباً اسے یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ کہتا ہے:[1]

"بے شک یہ بہت سخت اور خونی فیصلہ تھا، جو کلیسا کی (بارہویں تیرہویں صدی عیسوی) کی البی جینسیس فرقہ کے خلاف بھیجی ہوئی کسی فوج کے جرنیلوں کے یا آگسٹینی عہد کی تطہیری کارروائیوں کے شایان شان تھا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ان لوگوں کا قصور حکومت کے خلاف عین جنگ کے دوران میں انتہائی بغاوت کا حکم رکھتا تھا، اور جن لوگوں نے (لارڈ) ولنگٹن کی کوچ کا حال پڑھا ہے کہ پیچھے اس کی رہگزر کا نشان درختوں پر لٹکے ہوئے گھوڑوں اور بیڑوں کی لٹکی ہوئی لاشوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ انہیں ان باغی یہودی فرقے کے کھڑے گھاٹ قتل پر کوئی تعجب نہیں ہوگا۔"

لیکن اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ مدینہ میں کوئی یہودی رہا ہی نہیں تھا۔ مثلاً بنو قینقاع کا سنہ ۲ھ میں اخراج ہوا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے سنہ ۳ھ میں جنگ احد کے موقع پر قریش کے خلاف مدد پیش کی تھی۔[2] ہم بنو قینقاع کو خیبر کی لڑائی میں بھی لڑتے دیکھتے ہیں، اور اس موقع پر فتح کے بعد انہیں انعام دیا گیا تھا۔[3] اور یہ تو مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی ہے، تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن تھی۔[4] گویا نہ صرف یہودی مدینہ میں موجود تھے بلکہ انہیں کھلے بندوں تجارت اور کاروبار کرنے کی اجازت تھی۔ ان واقعات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

---

[1] SELECTIONS FROM THE KORAN (S. LANE POOLE) INTRO P.63

[2] ابن سعد (۲، ۱ - ۲۲)

[3] بیہقی (۹، ۵۲)، رفاعہ بن زید بن التابوت (بنو قینقاع) کا انتقال مدینہ میں غزوہ بنو مصطلق کے بعد ہوا (صحیح مسلم)

[4] بخاری (کتاب الرہن)

...ان قبیلوں کے مدینہ سے انہی لوگوں کو خارج البلاد کیا گیا ہوگا جن کے خلاف جرم ثابت ہو گیا تھا۔ اور تمام لوگ شہر بدر نہیں کیے گئے تھے۔

خیبر

اب ارض مدینہ بے شک یہود کے خطرہ سے محفوظ ہو گئی، لیکن یہاں سے نکل کر یہ لوگ خیبر میں جمع ہو گئے تھے جو مدینہ سے تقریباً سو میل کے فاصلہ پر شمال میں واقع ہے۔ جب تک وہاں سے وہ اپنی ریشہ دوانیوں میں آباد تھے، مسلمانوں کو چین کی نیند نہیں نصیب ہو سکتی تھی۔ غزوۂ خندق نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ لوگ مستقل خطرہ کا باعث ہیں، لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ آپ مدینہ کو غیر محفوظ چھوڑ کر فوج خیبر پر حملہ کے لئے بھیج دیتے، کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں غیر حاضری میں قریش اور ان کے حلفاء مدینہ پر نہ چڑھ دوڑیں۔ اس لئے سب سے پہلے آپؐ نے دونوں فریقوں کو الگ کرنے کی تجویز کی۔ صلح حدیبیہ اسی پیش بینی کا ثمرہ تھا۔ ۶ھ میں آپؐ نے مکہ پہنچ کے قریش سے وہ صلح معاہدہ طے کر لیا، جس کی رو سے کم از کم دس برس کے لئے قریش کے خطرہ کا سد باب ہو گیا۔[1] یہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی دور اندیشی، جنگی حکمت عملی اور حزم و احتیاط کی اتنی بڑی کامیابی تھی، کہ قرآن نے بجا طور پر "فتح المبین" کا نام دیا (الفتح ۴۸: ۱)

اس طرف سے مطمئن ہو کر آپ نے خیبر کا رخ کیا۔ یہاں یہود اپنے روایتی حلیفوں، غطفان کے ساتھ کیل کانٹے سے لیس ہو کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ آپؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسلامی لشکر کا پڑاؤ خیبر اور غطفان کے بیچوں بیچ میں ڈالا کہ غطفان یہودیوں کو کمک نہ پہنچا سکیں۔ چنانچہ غطفان جب خیبریوں کی مدد کیلئے نکلے اور دیکھا کہ خود ان کا اپنا گھر اسلامی لشکر کی زد پر ہے، تو انھوں نے واپس چلے جانے ہی میں عافیت دیکھی۔[2]

خیبر کا معرکہ کم و بیش ایک مہینے میں ختم ہوا۔ ان کے تمام بڑے بڑے رئیس اور سرغنے میدان جنگ میں کام آئے، باقی یہودیوں کو بدستور خیبر ہی میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ زمین نصف بٹائی پر انہی کے حوالے کی گئی۔ فصل کے موقع پر آپؐ کسی کو مدینہ سے بھیج دیتے، اور وہ مرکزی بیت المال کا حصہ وصول کر کے لے آتا۔ اسی معرکے کے بعد حیی بن اخطب کی صاحبزادی، ام المومنین حضرت صفیہؓ منکوحۂ نبوت میں داخل ہوئیں۔

یہیں خیبر میں ایک یہودی عورت نے آپ کو زہر دینے کی کوشش کی۔ قبیلہ بنو نضیر کے رئیس سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت الحارث نے آپؐ کے اور آپؐ کے اصحاب کے لئے ایک پوری بھنی ہوئی بکری کا گوشت بھیجا۔ بھیجنے سے پہلے اس نے دریافت کیا کہ کونسا حصہ آپؐ کو زیادہ مرغوب ہے۔ تو اسے بتایا گیا کہ دست تو اگرچہ پوری بکری ہی مسموم تھی، اس نے اس حصہ میں خاص طور پر زیادہ زہر بھرا۔ جب گوشت آپ کے پاس پہنچا تو آپؐ نے دست میں سے ایک لقمہ لیا، اور پھر یہ کہہ کے ہاتھ کھینچ لیا کہ اس میں زہر ہے۔ اس عورت کو بلا کر دریافت کیا گیا، تو اس نے اعتراف کیا اور کہنے لگی کہ میری قوم آپ سے متعلق باتیں کرتی تھی میں نے سوچا کہ اگر آپ محض بادشاہ ہیں، تو ہمیں آپ سے نجات مل جائے گی، لیکن اگر واقعی نبی ہیں، تو خدا آپ کو مطلع کر دے گا۔ اس پر آپؐ نے اسے معاف کر دیا۔ لیکن جب دو تین دن بعد آپ کے ایک صحابی جنہوں نے وہ گوشت کھایا تھا، زہر کے اثر سے فوت ہو گئے۔ تو زینب قصاص میں قتل کر دی گئی۔ روایت ہے کہ آپ کی وفات میں بھی اس زہر خورانی کی تاثیر تھی۔[3]

---

[1] ابن ہشام (۳: ۲۲۱-۲۳۰)، بخاری (کتاب المغازی، کتاب التفسیر سورۂ فتح)، مسلم (کتاب الجہاد و السیر)

[2] طبری (۳: ۱۵۷۵)، — [3] ابن ہشام (۳: ۳۵۲-۳۵۳)، امتاع الاسماع (۱: ۳۲۳)

یہ ہے داستان، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہود سے سلوک کی۔ انھیں مکمل آزادی دی گئی۔ انھیں برابر کے سیاسی حقوق حاصل تھے۔ انھیں کسی طرح کا خراج یا لگان نہیں دینا پڑتا تھا۔ اس پر بھی ان لوگوں نے قدم قدم پر عہدشکنی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے باوجود انھیں اجازت دی گئی کہ اپنا سارا مال ومتاع لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں۔ یہ سزا بھی صرف انھیں دی گئی۔ جن کا قصور روزِ روشن کی طرح ثابت ہوگیا۔ یہ نہیں کہ قصور ایک کا ہو اور اس کے ساتھ دوسرے بھی مستوجب سزا قرار دیئے جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ بنو قینقاع اور بنو نضیر سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اور وہ بے غل وغش مدینہ چھوڑ کر خیبر میں جا بسے۔ بلکہ ان دونوں قبیلوں کے ساتھ نرمی کی گئی۔ ورنہ وہ اس سے زیادہ سزا کے مستحق تھے۔ بنو قریظہ نے زیادہ تمرّد سے کام لیا۔ دورانِ جنگ کے زمانے میں غداری کا ارتکاب کیا۔ اس کے باوجود اگر وہ اپنا معاملہ رحمۃ اللعالمین کے ہاتھ میں چھوڑ دیتے، تو کون جانتا ہے کہ فیصلہ کیا ہوتا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست پر زیادہ اعتماد کیا۔ اور اس دوست نے خود انہی کے اپنے قانون کے مطابق فیصلہ کردیا۔

۳۔ مُنافقین

نفاق کے مادہ (ن ف ق) کے معنی ہیں، ایک طرف سے داخل ہونا اور دوسری طرف سے نکل جانا۔ اسی لئے سُرنگ کو نفق کہتے ہیں۔ کہ اس میں انسان ایک سمت سے گھستا اور دوسری جانب نکل جاتا ہے۔ چونکہ منافق کا ایمان بھی عارضی ہوتا ہے، کہ وہ مومنوں کی جماعت میں بیٹھتا ہے تو اپنے ایمان کا اعلان کرنے لگتا ہے۔ لیکن جونہی اپنے حاشیہ نشینوں میں پہنچا، فوراً اس سے انکار کردیتا ہے۔ اس لئے گویا ایمان اس میں ٹھیرتا نہیں، بلکہ ابھی اندر گھسا اور ابھی نکل گیا۔ اسی لئے اسے منافق کہتے ہیں۔

نفاق ایک بیماری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں منافقوں کا ذکر کیا ہے، وہاں اکثر فرمایا ہے "فی قلوبہم مرض"۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اوّل شک دوم بزدلی۔ بلکہ بعض مترجموں نے تو قرآن کے ان مقامات پر مرض کے معنی ہی شک کئے ہیں، منافق کو شک اپنے اعتقاد کی صداقت میں ہوتا ہے۔ اور بزدلی اپنے خیالات کے اظہار میں۔ کہ کہیں واقعی یہ عقیدہ درست ہی نہ ہو کہیں اپنے شکوک کے اظہار سے نکو بھی بنوں، اور اس کی کامیابی کی صورت میں اس کے فوائد سے بھی محروم رہ جاؤں۔

اسلام جب تک مکّہ میں رہا، وہاں نفاق کی کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ ان دنوں اسلام قبول کرنا اور اسکا اعلان کرنا تلوار کی دھار پر قدم رکھنے سے کم نہیں تھا۔ اس لئے یہاں شک اور بزدلی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ نفاق سے بھی یہود کی طرح مدینہ ہی میں واسطہ پڑا۔

عبداللہ بن اُبی

ہوا یہ کہ مدینہ میں اوس اور خزرج دونوں قبیلے طویل خانہ جنگی اور نااتفاقی سے تنگ آکے اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ ایک ہاتھ پر جمع ہوجائیں۔ اور آئندہ اپنے تمام امور میں اس کی زیرِ ہدایت کام کریں اور تمام اختلافات میں اس کے فیصلہ کے پابند رہیں۔ اس امر کے لئے انھوں نے قبیلہ خزرج کے ایک رئیس عبداللہ بن اُبی بن سَلول کا انتخاب کیا۔ اور اس کی تاجپوشی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

انہی ایام میں مکّہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ پہنچ گئے۔ اور دونوں قبیلوں کے اکابر نے اپنی گردنیں آپؐ کے سامنے خم کردیں۔ اس طرح عبداللہ بن ابی کی وہ تاجپوشی کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ پھر اس کے دل کی یہ گرہ کبھی نہ کھلی کہ اگر محمد (صلعم) نہ آتے، تو میں آج قوم کا بادشاہ ہوتا۔ اس کی نظروں میں آپؐ گویا (نعوذ باللہ) غاصب تھے۔

چنانچہ شروع میں اس نے اسلام بھی قبول نہیں کیا بلکہ وہ اس انتظار میں رہا کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس زمانے میں اس کا رویہ، مسلمانوں اور خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت گستاخانہ رہا۔ مثال میں صرف ایک واقعہ بیان کر دینا کافی ہوگا۔

ایک دن آپؐ قبیلہ اوس کے رئیس سعد بن عبادہ کی عیادت کو تشریف لے جا رہے تھے۔ راہ میں ایک جگہ عبداللہ بن اُبی اپنے بعض دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آپؐ نے مناسب خیال نہ فرمایا کہ یوں پاس سے گذر جائیں۔ اس لئے سواری سے نیچے اترے اور سلام کر کے ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حسب عادت آپؐ نے قرآن کا کچھ حصہ تلاوت فرمایا۔ اور نصیحت کی عبداللہ بُت کی طرح ساکت و صامت سنتا رہا۔ جب آپؐ ختم کر چکے تو کہنے لگا۔

"حضرت! جو آپ کہتے ہیں، اگر یہ سچ ہے تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہو سکتی، لیکن آپ مہربانی کر کے اپنے گھر میں بیٹھے رہئے اور جو کوئی آپ کے پاس آئے۔ اُسے ہی یہ وعظ سنائیے اور اگر کوئی نہ آئے تو اس کی سمع خراشی نہ کیجیے، نہ اس کے پاس جائیے۔ جو سے سننا نہیں چاہتا۔"

اس پر آپؐ اٹھ کے چلے آئے۔ جب سعد بن عبادہ کے ہاں پہنچے تو انھوں نے آپ کے چہرے پر ملال کے آثار دیکھ کر سبب دریافت کیا۔ جس پر آپؐ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ سعدؓ نے جواب دیا۔ حضور اس غریب سے نرمی کا سلوک کریں خدا کی قسم! آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کی تاجپوشی کرنے والے تھے۔ وہ سوچتا ہے۔ آپؐ نے اس کی بادشاہی چھین لی ہے[1]

جب خدا نے مسلمانوں کو بدر کے میدان میں قریش مکہ پر نمایاں فتح نصیب کی، تو اب عبداللہ، وہ اس کے ساتھیوں کے لئے مزید تاخیر باعث نقصان ہو سکتی تھی، اسلئے انھوں نے مجبوراً بیعت کر لی۔ لیکن یہ ایمان نہیں، مصلحت تھی۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہا، جب بھی اس کا بس چلا، وہ مخالفت کرنے اور راستے میں روڑا اٹکانے سے کبھی نہیں چوکا۔

منافقوں کی ریشہ دوانیاں | بدر کا معرکہ ۲ھ میں ہوا تھا۔ اس سے اگلے برس اُحد کی خونی لڑائی ہوئی۔ چونکہ قریش بدر کی شکست کا داغ دھونے اور اپنے مقتولوں کا انتقام لینا چاہتے تھے، اس لئے وہ اس لڑائی میں پوری قوت کے ساتھ بڑے زور شور سے آئے تھے۔ خود آنحضرت صلعم کا خیال یہ تھا کہ شہر بند ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی نے بھی یہی صلاح دی تھی لیکن بعض جوشیلے جوانوں نے کہ ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم یوں گھروں میں گھس کر بیٹھ رہیں، زور لگایا کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ آخر ان اصحاب کے مشورے کے مطابق آپؐ نے شہر سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ایک ہزار کی جمعیت لے کے روانہ ہوئے۔ قریش کا لشکر تین ہزار پر مشتمل تھا۔ جب آپ مدینہ سے نکلے اور نصف مسافت طے کر کے شوط میں پہنچے تو عبداللہ اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ آپ نے ہمارے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جائیں۔ بعض لوگوں نے اسے سمجھایا بھی، کہ دیکھو اس نازک وقت میں اپنی قوم اور رسولؐ اللہ کی قوت نہ گھٹاؤ۔ دشمن سامنے کھڑا ہے اور موقع بہت خطرناک ہے۔ لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ یوں یہ لوگ عین مصیبت کے وقت غداری کر کے واپس چلے آئے[2]۔

---

[1] ابن ہشام (۲: ۲۲۳ - ۲۲۸) نیز دیکھیے طبقات ابن سعد (۳: ۲ - ۱۰) امتاع الاسماع (۱: ۲۰۳)

[2] ابن ہشام (۳: ۶۰) امتاع الاسماع (۱: ۱۲۰)

اُحد میں مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔ بعض اکابر صحابہؓ شہید ہوئے بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بہت سخت زخمی ہوئے تھے۔ بہت دن سے عبداللہ کا یہ دستور تھا کہ جب آپؐ جمعہ کے خطبے کے بعد بیٹھ جاتے تو وہ اٹھتا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا، لوگو! یہ خدا کے رسول ہیں، جن کے باعث خداوند تعالیٰ نے تمھیں معزز کیا ہے، تمھیں ہر طرح ان کی مدد کرنا اور قوت بڑھانا چاہیئے۔ جب اُحد کے بعد بھی جمعہ کے دن وہ اسی طرح لوگوں سے خطاب کرنے کو اٹھا، تو کسی نے اس کا دامن کھینچ کے اسے نیچے بٹھا دیا، کہ اے دشمنِ خدا! تمھارا کیا منہ ہے کہ تم ہمیں نصیحت کرو۔ کیا تمھیں یاد نہیں رہا کہ تم نے کس غداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس پر وہ غصہ میں بھرا ہوا مسجد سے نکل گیا۔ دروازے پر کسی نے پوچھا۔ یہ کہاں جا رہے ہو تم۔ تو کہنے لگا۔ میں تو ان کی حمایت کے لیے کھڑا ہوا تھا، لیکن ان کے ساتھیوں نے میری جنگ کی جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہو۔ اس شخص نے اس سے کہا۔ آؤ واپس چلو! رسول کریم صلعم تمھارے لیے دعائے مغفرت کریں گے، تو کہنے لگا۔ میں نہیں جاتا، نہ مجھے ان کی دعا کی ضرورت ہے[عـه]

پھر ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب غزوہ اُحد کے بعد یہود بنو نضیر کا واقعہ پیش آیا تو یہ عبداللہ بن اُبی اور مالک بن نوفل اور اس کے دوسرے حواری ہی تھے جنھوں نے انھیں کہلا بھیجا کہ بالکل نہ گھبرانا ہم دل و جان سے تمھارے ساتھ ہیں اور ہر طرح تمھاری مدد کریں گے۔ انہی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا کہ یہ معاملہ طول کھینچ گیا۔ اور بنو نضیر نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔

سنہ ۵ھ میں غزوہ خندق ہوا تھا۔ خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح کھدائی اور مٹی اٹھانے میں حصہ لیا تھا۔ اس موقع پر بھی منافقوں نے پیٹھ دکھائی۔ یہ بہت سردی کا زمانہ تھا۔ بھوکے پیاسے محنت کا کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن مسلمان صبر و استقلال سے رات دن کام پر جتے رہے۔ اگر ان میں سے کسی کو ایسی ہی مجبوری پیش آ جاتی کہ اسے غیر حاضر ہونے کی ضرورت ہوتی، تو وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اجازت مانگتا۔ لیکن منافقوں کا رویہ اس سے مختلف تھا۔ وہ کام چور تھے۔ جب چاہتے کھسک جاتے اور اس طرح کام میں ہرج کرتے (النور ۲۴، ۶۲ - ۶۳)

جنگ کے زمانے میں، بلکہ کسی مصیبت اور سختی کے زمانے میں بھی، جب کہ ہر ایک کے لیے استقلال اور یکسوئی کی اشد ضرورت ہو، اس سے زیادہ خطرناک کوئی بات نہیں ہوتی اگر کوئی شخص ایسی باتیں کرنا شروع کر دے، جس سے لوگوں میں بد دلی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ حالات خواہ کسی قدر مخالف ہوں اور کامیابی بظاہر کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو، جب تک انسان حوصلہ نہیں ہارتا اور مقابلے پر ڈٹا رہتا ہے۔ یہ بالکل امکان ہے کہ وہ ان سب حالات پر قابو پا کر فتح و نصرت سے ہمکنار ہو جائے۔ یہی سبب ہے کہ جنگ کے ایام میں اگر کوئی شخص جھوٹی افواہیں پھیلائے تو اسے غداری کے جرم کی سزا ملتی ہے۔

جنگ کے دوران میں بھی منافقوں نے ہر طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ قرآن کے الفاظ ہیں:۔ "جب دشمن بلندی سے اور پستی سے چل پڑے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگے اور کلیجہ منہ کو آنے لگے" (الاحزاب ۳۳، ۱۰) "تو اس وقت منافق کانا پھوسیاں کرنے لگے"۔ یہ ہم سے وعدہ کیا کرتے تھے کہ ہمیں کسریٰ و قیصر کے خزانے ملیں گے۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ ہیبت کے مارے جان نکل جاتے ہیں تو یقین نہیں کہ واپس آنا بھی نصیب ہوگا یا نہیں[عـه]

عـه ابن ہشام (۳ - ۱۱۲)

عـه ابن ہشام (۳ - ۲۲۲) امتاع الاسماع (۱ : ۲۲۰)

پھر اس پر مستزاد یہ کہ جب دشمن کا دباؤ زیادہ ہوا تو ان لوگوں نے آ آ کے کہنا شروع کیا کہ ہمارے مکان غیر محفوظ ہیں اور دشمن کی زد پر ہیں، ہمیں اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لئے جانے کی اجازت دی جائے جیسا کہ قرآن نے بھی کہا ہے، یہ محض بہانہ تھا، در اصل وہ فرار کرنا چاہتے تھے۔ (۱۳۰۳۳) ان کا مقصد نہ صرف مسلمانوں کی طاقت ہی میں کمی کرنا تھا، بلکہ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح عوام میں بددلی پھیلے۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ نے انھیں جانے کی اجازت دیدی۔

نہ صرف یہی، بلکہ جب خدا نے مسلمانوں کو اس مصیبت سے نجات دی، اور دشمن خود بخود محاصرہ اٹھا کے چلے گئے، تو اس کے بعد بھی آپؐ نے ان سے زیادہ بازپرس نہیں کی۔

سنہ ۵ھ میں بنو مصطلق کے خلاف مہم کی گئی تھی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنفس نفیس اس میں شامل ہوئے تھے۔ اسلامی فوج نے مریسیع کے چشمے پر ڈیرے ڈالے تھے۔ وہاں ایک دن کسی انصاری اور مہاجر کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ عبد اللہ بن ابی نے غضبناک ہو کر کہا، ان لوگوں نے تو ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ذرا ہم مدینہ پہنچ لیں تو ہم ان ذلیلوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے۔ پھر اپنے آدمیوں سے کہنے لگا۔ یہ ساری مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے، تمہیں نے انہیں اپنے گھروں میں رکھا، اپنے اموال میں انھیں حصہ دار بنایا، نہ تم انھیں منہ لگاتے، نہ اس حال کو پہنچتے۔

یہ خبر حضرت رسول اللہ صلعم کو پہنچی، کہ عبد اللہ بن ابی کہہ رہا ہے کہ ہم مدینہ واپس جائیں گے تو معزز لوگ ذلیلوں کو وہاں سے نکال دیں گے اور اس سے اس کی مراد مسلمانوں سے ہے۔ تو حضرت عمر فاروقؓ نے درخواست کی کہ عبد اللہ کے قتل کا حکم صادر فرمایئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ عمرؓ! کیا تم چاہتے ہو کہ لوگ کہنے لگیں کہ محمد (صلعم) اپنے اصحاب کو قتل کرا رہے ہیں، نہیں، یہ تو مجھ سے نہیں ہو گا۔

لیکن جب عبد اللہ اور اس کے رفقاء کو معلوم ہوا کہ خبر آنحضرت صلعم تک پہنچ گئی ہے، تو وہ خود حاضر خدمت ہوئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ واقعی کیا بات ہوئی ہے۔ تو عبد اللہ فوراً قسمیں کھانے لگا کہ حاشا، ہم نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ آپؐ نے اس کی قسم مان کے معاملہ ختم کر دیا۔ اور آگے کوچ کا حکم دے دیا۔ لیکن جیسا کہ قرآن نے تصدیق کی ہے۔ (المنافقون ۶۳: ۸) یہ امر واقعہ ہے کہ عبد اللہ نے یہ بات کہی تھی۔ اور وہ جھوٹی قسم کھا گیا۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا ہے کہ منافق کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ "جب بھی بات کرے جھوٹ بولے"۔ (متفق علیہ)[۱]

جب یہ خبر عام ہوئی، تو عبد اللہ بن ابی کا بیٹا (اس کا نام بھی عبد اللہ تھا) دربار نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں نے سنا ہے آپ میرے والد کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، مجھے ڈر ہے کہ ممکن ہے کسی اور کے انھیں قتل کرنے پر میں اپنا غصہ قابو میں نہ رکھ سکوں اس لئے درخواست کرتا ہوں کہ یہ حکم مجھے دیا جائے۔ تو میں ان کا سر کاٹ کے خدمت میں حاضر کر دوں۔ آپؐ نے اس کا اطمینان کر دیا۔ اور فرمایا، جب تک تمہارے والد ہمارے ساتھ ہیں، ہم ہمیشہ ان سے نرمی کا سلوک کریں گے[۲]

اسی غزوہ بنی مصطلق سے مراجعت پر وہ واقعہ پیش آیا جو افک کی بنیاد بن گیا۔ اس افسوسناک بہتان کے پھیلانے میں بھی انھیں لوگوں کا ہاتھ تھا۔ بعض سادہ لوح مسلمان بھی ان کے دھوکے میں آ گئے اور نادانی سے ان کے ساتھ مل گئے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شروع انہی منافقوں نے کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلعم نے انھیں معاف کر دیا (بخاری کتاب مغازی و کتاب التفسیر)

---

[۱] نیز اس سلسلہ میں دیکھئے بخاری (کتاب التفسیر سورہ المنافقون) مسلم (کتاب صفات المنافقین و احکامہم) نیز ابن ہشام (۲: ۲۹۰۔۲۹۲)

[۲] ابن ہشام (۲: ۲۹۳)

فتح مکہ کے بعد (۹ھ میں) آپ نے روم کے خلاف تیاری کا حکم دیا۔ جس کا نتیجہ غزوۂ تبوک کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ دن بہت عسرت کے تھے۔ ملک میں کال تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا اور رستہ بھی دور کا تھا۔ عام طور پر آپ کا یہ دستور تھا کہ کسی جنگی مہم پر نکلتے تو رازداری کے خیال سے منزلِ مقصود کا نام نہیں لیتے تھے۔ لیکن چونکہ تبوک دور کی جگہ تھی اور اس کے لئے زیادہ اور خاص زادِ راہ کی ضرورت تھی' اس لئے آپ نے صراحت سے اعلان کر دیا کہ ہم تبوک جا رہے ہیں' تاکہ لوگ مناسب انتظام کر کے روانہ ہوں۔ اس جنگ میں بھی منافقوں نے حسبِ معمول قدم قدم پر روڑے اٹکائے۔

انھوں نے بددلی پھیلانے سے آغاز کیا۔ کہنے لگے کہ گرمی کا موسم ہے۔ اس زمانے میں کون سفر کرے' پہلے ہی تنگی ترشی سے گذر ہو رہی ہے' کھانے کو ملتا نہیں' سفر کے لئے سامان کہاں سے مہیا کیا جائے۔ اور آخر اس دور دراز مہم پر جانے کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ عام طور پر ایک یہودی سُوَیلم کے مکان پر جمع ہوتے اور یہاں بیٹھ کر لوگوں کو ورغلانے کے منصوبے کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ خبریں آپ تک بھی پہنچیں۔ آپ نے حسبِ عادت ان لوگوں سے تو درگذر کیا' لیکن حکم دیا کہ سویلم کا گھر جلا دیا جائے تاکہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ان کا اڈہ جاتا رہے[1]۔

اس کے بعد انھوں نے عذر پیش کرنے شروع کئے' اور قسمیں کھانے لگے کہ ہم مہم کے ساتھ جانے سے معذور ہیں۔ آپ نے خوشی سے انھیں پیچھے ٹھیر جانے کی اجازت دے دی[2]۔

جب لشکر روانہ ہوا تو عبداللہ بن ابی اور اس کے کچھ دوست بھی اس کے ساتھ نکلے۔ لیکن یہ ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ پہلی منزل ثنیۃ الوداع تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں تک عموماً دوست' رشتہ دار وغیرہ مشایعت کے لئے آتے اور الوداع کہہ کر واپس چلے جایا کرتے تھے۔ پہلے تو منافقین نے اپنا پڑاؤ ہی عام لشکر سے علیحدہ ہٹ کر پہاڑی کے دامن میں ایک جگہ ذباب نامی میں ڈالا۔ ممکن ہے اس سے بھی انکی غرض یہ ہو کہ مسلمانوں کو اپنا لشکر کم دکھائی دے' اور اس طرح انکے دلوں میں خوف وہراس پیدا ہو۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ مسلمان ایسے کچے دلے تو تھے نہیں کہ وہ ان چالوں سے حوصلہ ہار بیٹھتے۔ لیکن منافقوں نے اسی پر بس نہیں کی' اگلے دن جب کوچ ہوا' تو یہ لوگ چپکے سے مدینہ واپس آگئے۔ اور مہم پر گئے ہی نہیں۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک سے واپس تشریف لائے' تو بھی آپ نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

عبداللہ بن اُبَی کی موت معلوم ہوتا ہے' اس کے بعد جلد ہی عبداللہ بن اُبَی کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا کہ اسکا نام بھی عبداللہ تھا' بہت مخلص اور فدائی مسلمان تھا۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا' اور درخواست کی کہ میرے باپ کے کفن کے لئے حضور اپنا کرتا عنایت فرمائیں۔ آپ نے خوشی سے یہ درخواست منظور فرمائی اور اپنا کرتا دے دیا[3]۔ اس کے بعد عبداللہ نے آکے عرض کی کہ حضور اسکے جنازے کی نماز پڑھا دیں۔ آپ نے یہ بھی منظور فرمایا۔

---

[1] ۔ ابن ہشام (۴ و ۱۹۰) ۔ [2] ۔ یہ سب حالات قرآن (سورہ توبہ ۹ ۔ ۱۰۰ ۔ ۲۰۹) میں پوری تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

[3] ۔ اس موقع پر غالباً ایک واقعہ کا بیان بے محل نہیں ہوگا۔

غزوۂ بدر میں قریش کے اکثر سردار شکست کھا کر بھاگ گئے اور کئی اسیر ہوئے۔ ان قیدیوں میں حضرت رسول کریم صلعم کے چچا حضرت عباس بھی تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ قیدیوں سے اچھا سلوک کیا جائے۔ مسلمانوں نے اس حکم کی تعمیل کیسے کی' اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے خود بھوکے رہ رہ کے ان لوگوں کو کھانا کھلایا۔ حضرت عباس کے بدن پر کپڑا نہیں تھا۔ چونکہ وہ بلند وبالا اور بڑے تن وتوش کے آدمی تھے۔ اس لئے کسی کا کرتا ان کے جسم پر پورا نہیں اترتا تھا۔ مگر عبداللہ بن ابی نے اپنا کرتا دیا۔ وہ بھی لمبا تڑنگا شخص تھا۔ اب حضور نے اس احسان کا بدلہ یوں چکایا' کہ عبداللہ کے کفن کے لئے اپنا کرتا مرحمت فرمایا۔ (بخاری کتاب الجہاد والسیر' کتاب الکسوۃ للاساری' نیز کتاب تفسیر القرآن سورۂ توبہ) مسلم (کتاب المنافقین واحکامہم) نیز ابن سعد (۴ - ۱۰ - ۷)

جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ آپؐ عبد اللہ کی نمازِ جنازہ پڑھانے جا رہے ہیں، تو وہ مانع ہوئے۔ کہنے لگے، حضور آپ اس منافق کے جنازے کی نماز پڑھانا چاہتے ہیں۔ حضور کو یاد نہیں رہا، فلاں موقع پہ اس نے یوں کہا اور فلاں پہ یوں۔ اور اس کے کرتوتوں سے ہمیں کیا کیا تکلیف اور ایذا نہیں پہنچیں۔ آپؐ نے مسکرا کر فرمایا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ

(توبہ ۹: ۸۰)

آپ (چاہیں تو) ان کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں یا (چاہیں تو) دعائے مغفرت نہ مانگیں۔ لیکن (خواہ) آپ ان کے لئے ستر مرتبہ بھی دعائے مغفرت مانگیں، اللہ انہیں معاف نہیں کرنے کا

پس اگر ستر سے زیادہ مرتبہ دعا مانگنے سے خداوند تعالیٰ اس کی مغفرت کر دے، تو میں اس پر تیار ہوں، اور آپؐ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد حکم نازل ہوا کہ آپ کسی منافق کی نمازِ جنازہ نہ پڑھائیں۔ (توبہ ۹: ۸۴)

اگر منافق اس کے بعد بھی موجود رہے، لیکن عبد اللہ بن ابی کی وفات کے ساتھ ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی، اور ان کی قوت میں بہت کمی آ گئی۔ عبد اللہ ذاتی عداوت کے باعث اس تحریک کا دل و دماغ بن گیا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا، طرح طرح کی سازشیں کرتا رہا۔ دوسرے منافقوں کے لئے بھی وہ گویا نقطۂ مرکزی تھا۔ کہ وہ جب چاہتے اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن اس کے اٹھ جانے سے ان کی سرگرمیوں میں خود بخود کمی آ گئی۔ اور آہستہ آہستہ ان کا شیرازہ بکھر گیا۔

یہ لوگ آستین کے سانپ تھے۔ کیونکہ وہ بظاہر مسلمان تھے۔ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ نمازیں پڑھتے، ان کے مشوروں میں شریک ہوتے۔ اور اس طرح ان کے تمام رازوں سے واقف رہتے۔ لیکن جب بھی چاہتے ڈنک مارنے سے دریغ نہ کرتے۔ آپ کو ان کی کارگذاریوں کا پورا علم تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا۔ اور جیسا کہ وعدہ فرمایا تھا، ان کے مرنے سے آخری دم تک نرمی کا سلوک کیا۔

ہم نے ان صفحات میں رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ سلوک بیان کیا ہے۔ یہ بیرونی بھی تھے اور اندرونی بھی۔ مکے کے مشرک اور مدینہ کے یہودی آپ کے پیروؤں کے حلقے سے باہر تھے۔ اور منافق گھر کے بھیدی۔ لیکن ہر ایک کے ساتھ آپؐ کا معاملہ یکساں رحم و کرم کا رہا۔ اور جب تک خود کسی نے مغفرت کا دروازہ اپنے آپ پہ بند نہیں کر لیا آپؐ نے ہمیشہ درگذر سے کام لیا۔ کیا کسی بادشاہ یا نبی نے ایسی مثال پیش کی ہے؟ ؎

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

عــه ابن ہشام (۴: ۱۹۰) نیز بخاری (کتاب الجنائز و کتاب التفسیر سورۂ توبہ) مسلم (کتاب فضائل الصحابہؓ) امتاع الاسماع (۱: ۴۹۶)

کتابیات

۱ - قرآن حکیم

۲ - السیرۃ النبویہ (ابن ہشام) چار حصے - مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی (قاہرہ ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء)

۳ - کتاب الطبقات الکبیر (ابن سعد) نو حصے - (لائیڈن، ۱۹۰۵ء)

۴ - امتاع الاسماع (مقریزی) (قاہرہ، ۱۹۴۱ء) اس کا صرف پہلا حصہ شائع ہوا ہے۔

۵ - تاریخ الرسل والملوک (طبری) پندرہ حصے (لائیڈن ۱۸۷۵ء / ۱۹۰۱ء) اس کے تیسرے حصہ میں سیرۃ النبویہ ہے۔

۶ - کتاب الاصنام (کلبی) (قاہرہ ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء)

۷ - معجم البلدان (یاقوت حموی)

۸ - مروج الذہب (مسعودی) (پیرس، ۱۸۶۱ء، ۱۸۹۷ء)

۹ - سیرۃ النبی (شبلی) طبع پنجم

۱۰ - عہد نبوی میں نظام حکمرانی (ڈاکٹر محمد حمید اللہ) (حیدرآباد دکن طبع دوم)

۱۱ - رسول اکرم صلعم کی سیاسی زندگی (ڈاکٹر محمد حمید اللہ) (لاہور)

۱۲ - صحاح ستہ

۱۳ انسائیکلو پیڈیا اسلام - چار حصے (لائیڈن، ۱۹۱۳ء)

ادارۂ "فاران"

محاکمہ

مولانا امتیاز علی خاں عرشی رام پوری کا طویل مقالہ ـــــــ "نہج البلاغۃ کا استناد" ماہ مئی ۱۹۵۵ء کے "فاران" میں شائع ہو چکا ہے، فاضل مقالہ نگار نے شروع میں جب اس مضمون کا ایک حصہ ہمارے یہاں بھیجا تھا۔ تو اس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ صاحب موصوف "استناد" کے علاوہ نہج کے مضامین اور اصل عبارت سے بھی بحث کریں گے۔ کہ "آیا یہ خطبات "روایت بالمعنی" ہیں یا "روایت باللفظ" ہیں، اور کیا پوری کی پوری کتاب حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے ارشاد کیے ہوئے خطبات اور اقوال پر مشتمل ہے۔ یا اس میں کچھ حصہ الحاقی اور اضافی بھی ہے؟

جناب عرشی صاحب کا جب بقیہ مضمون وصول ہوا، تو اس میں نہج البلاغۃ کے صرف استناد سے بحث تھی، اور ہم نے اسے ایک مبحث اور تاریخی مقالہ کی حیثیت سے جُوں کا تُوں "فاران" میں شائع کر دیا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد مجلۂ "تاریخ و سیاسیات" (انجمن ترقی اُردو پاکستان) میں جناب محمود احمد عباسی صاحب کا ایک مقالہ ـــ "نہج البلاغۃ تاریخ کی روشنی میں ـــــــ نظر سے گذرا!

جس طرح عرشی صاحب نے "نہج کے استناد" میں بڑی محنت، کاوش اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اسی طرح محمود احمد عباسی صاحب نے بھی اپنے مقالہ میں تجسس، ژرف نگاہی اور وسعت مطالعہ کو صرف کیا ہے!

جناب عباسی صاحب کی رائے یہ ہے کہ خطبوں کے علاوہ جو "کتب و مراسلات صاحب نہج البلاغۃ نے حضرت علیؓ سے منسوب کئے ہیں، باعتبار مضامین و مطالب اکثر و بیشتر الحاقی ہیں"۔ اور اس کے لیے انھوں نے ثبوت، دلائل اور براہین فراہم کئے ہیں۔ اگر ہم ان دلائل کا تھوڑا تھوڑا حصہ بھی یہاں نقل کریں تو یہ اقتباسات ایک طویل مضمون کی صورت اختیار کر لیں گے، اس لئے ہم جستہ جستہ اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

"جو کلام، خطبے اور مراسلے صاحب "نہج" نے حضرت علی سے منسوب کئے ہیں ان میں ایسی لفظی اور مضامین پائے جاتے ہیں جنھیں حضرت ممدوح رضی اللہ عنہ سے منسوب کرنا دشواری سے خالی نہیں۔ ان میں کثرت یا تو نسبی تعلّیاں در نسل و قبیلہ پر فخر و مباہات ہے یا اپنی ذات اور خاندان کی مدح سرائی ہے، تفاخر علی النسب میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ "اللہ نے اوّل ہم (بنی ہاشم) کو بنایا اور بعد میں دوسروں کو ـــــــ یا پھر دوسرے صحابہ اور اپنے بعض محترم معاصرین کی مذمت ہے، جن (یعنی اس قسم کے اقوال) کو کسی طرح بھی علیؓ جیسے بزرگ صحابی اور اعلیٰ شخصیت سے نسبت نہیں دی جا سکتی ـــــ"

ـــــــ "جامع کتاب "الشریف رضی" چوتھی صدی ہجری کے بالکل آخر کا مصنف ہے اور یہ مجموعہ اس نے اپنی وفات سے جو ۴۰۶ھ میں ہوئی تھی چند سال پہلے تقریباً ۴۰۰ھ میں مرتب کیا تھا، گویا حضرت علیؓ کی وفات سے تین سو ساٹھ برس بعد، باایں ہمہ روایت کی کوئی سند نہیں پیش کی جس سے ان کی تاریخی صحت اور سلسلۂ رواۃ معلوم ہو جائے ـــــــ"

ـــــــ "ابو مخنف نے (جو شیعانِ علی میں سے ہے) سلیمان بن راشد الازدی کی سند سے حضرت علیؓ کے ایک خطبہ کے

خطبے نقل کئے ہیں جن میں حضرات شیخین کی خلافت کے بارے میں یہ کہا ہے کہ "جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا اور انھوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو! ان دونوں کی سیرتیں "احسن" تھیں، اور انھوں نے عدل و انصاف سے امت کے ساتھ عمل کیا۔ (طبری)۔۔۔۔۔ اسی طرح ابو مخنف نے۔ حضرت علیؓ کا ایک مکتوب نقل کیا ہے جو قیس بن سعد انصاری کو حکومت مصر پر مقرر کرتے ہوئے اہل مصر کے نام لکھا تھا۔ یہ مکتوب قیس مذکور کے بھائی سہل بن سعد کی سند سے نقل ہوا ہے "اس میں حضرت علیؓ نے ان حضرات (ابوبکرؓ و عمرؓ) کو "امیرین صالحین" کے الفاظ سے یاد کیا، ان کی سیرتوں کو "احسن" بتایا اور کہا کہ انھوں نے کتاب و سنت پر عمل کیا، اور سنت سے تجاوز نہیں کیا [1]۔۔۔۔۔ اس کے مقابلہ میں "نہج البلاغۃ" کے مؤلف نے جو خطبے حضرت علیؓ سے منسوب کئے ہیں ان میں انہی حضرات شیخین پر سب و شتم سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔۔۔۔۔"

بعض قدیم تصانیف "البیان والتبیین" (ابن خلدون متوفی ۲۵۵ ہجری) و "الکامل" (المبرد متوفی ۲۸۵ ہجری) و "العقد الفرید" (ابن عبدربہ متوفی ۳۲۸ ہجری) نیز تاریخ الملوک والامم (ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ ہجری) وغیرہ میں حضرت علیؓ کا کلام، خطبے اور مراسلے درج ہیں، جن کی زبان سادہ، اسلوب بیان بے تکلف ہے۔ ان سب سے بعض کو صاحب نہج البلاغۃ نے بھی اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا ہے، صرف انہی کے مقابلے سے اصلی اور وضعی کلام کا امتیاز بآسانی ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔"

نہج البلاغۃ کی عربی باوجود فصاحت کے بناوٹی ہے [2]۔ ان میں متعدد ایسے الفاظ اور علم کلام کی ایسی مصطلحات استعمال ہوئی ہیں، جو صاف بتاتی ہیں کہ یہ صدر اول کا کلام نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے، ذیل کے چند الفاظ جو "کلام العرب" (اصل عربی زبان) یعنی جاہلیہ در عصر اول و ثانی کی عربی زبان کے الفاظ نہیں بلکہ تیسری چوتھی صدی ہجری میں مستعمل ہوئے اور لغت میں "مولدہ" کہلاتے ہیں۔ مثلاً:-

ھماھم ۔۔۔۔۔ کیفیۃ ۔۔۔۔۔ ازلیۃ ۔۔۔۔۔ تلاش و تلاشت ۔۔۔۔۔ کیف ۔۔۔۔۔ اور این ۔۔۔۔۔!

"مندرجہ بالا معرب اور اصطلاحی الفاظ کی ان چند مثالوں کے علاوہ مختلف لفظی صنائع خطبات میں بکثرت موجود ہیں۔ اول تو اس قسم کی لفظی صنعت عصر جاہلی اور صدر الاسلام کی زبان میں نہیں پائی جاتی، دوسرے یہ کہ خطبات اور تقریروں کی زبان میں اس کی موجودگی قطعی دلیل اس بات کی ہے کہ یہ خطبے تقریری نہیں بلکہ تحریری ہیں جو فصحائے شیعہ نے بعد میں ادبی قابلیت کے جوہر دکھانے اور اپنے مخصوص عقائد کو حضرت علی کی زبان سے ادا کرانے کے لئے لکھے ہیں۔۔۔۔۔"

مقالہ نگار نے آگے چل کر لکھا ہے کہ مور (الطاؤس) چیونٹی (النملہ) اور ٹڈی (الجرادہ) پر جو تقریریں حضرت علی سے منسوب کی گئی ہیں وہ چوتھی صدی ہجری کا انداز بیان ہے!

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت (واقعہ قتل) اور اپنی بیعت خلافت پر حضرت علی کی زبان سے نہج البلاغۃ میں جو مسرت آمیز الفاظ ملتے ہیں وہ علیؓ کے شایانِ شان نہیں ہیں!

---

[1] طبری، جلد ۵، صفحہ ۲۲۷، سطر ۲، اس فقرے کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ قبضہ اللہ عزوجل صلوات اللہ علیہ و رحمۃ و برکاتہ ثم ان المسلمین استخلفوا بہ امیرین صالحین عملا بالکتاب والسنۃ واحسنا السیرۃ ولم یعدوا السنۃ ثم توفاھم اللہ عزوجل رضی اللہ عنھما۔

[2] مضمون نگار کے کہنے کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تکلف اور آورد پائی جاتی ہے (م۔ق)

قرآن پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے صاف کہلوادیا گیا: "میرے پاس نہ خدا کے خزانے ہیں، نہ غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی گئی ہے۔ (قل. لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول انی ملک، ان اتبع الا ما یوحیٰ الی) مگر صاحب نہج البلاغہ نے حضرت علی کو نہ صرف غیب داں بتادیا بلکہ متعدد خطبوں میں انھی کی زبان سے گویا اسکا اظہار و اعلان بھی کرا دیا۔

"واللہ لو شئت ان اخبر کل رجل منکم بمخرجہ وموبجہ وجمیع شانہ لفعلت" قسم خدا کی اگر میں چاہوں تو ہر انسان کو اس کے مخرج، اس کی منزل اور اس کے تمام حالات کی خبر دے سکتا ہوں ——— !

نیز کشف الظنون البدایہ والنہایہ وغیرہ میں نہج البلاغہ کی تالیف شریف الرضی ہی سے منسوب کی گئی ہے، دوسرے محققین کی رائے ہے کہ یہ مجموعہ کسی ایک دو اشخاص کی موضوعات سے نہیں بلکہ نصیری شیعہ کے مقالات اور ان کے عقائد کا مجموعہ ہے[1]۔ بہرحال من جملہ اور جدتوں کے یہ کتاب بھی ایک ایسے دور کی یادگار ہے جب بغداد میں بنی بویہ کا جو شیعیت میں غلو رکھتے تھے عمل دخل ہوتا تھا۔ اور انھوں نے اپنے عہد میرا مرائی میں جو ۳۳۴ ہجری سے تقریباً ۴۴۷ ہجری تک رہا اپنے فرقے کے مراسم و معتقدات کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں خاص ایجادات کیں اور یہ امور انجام دیئے۔!

چنانچہ جسٹس امیر علی کہتے ہیں کہ معزالدولہ شیعہ تھا اور اسی نے کربلا کے حادثہ قتل کی یادگار کے طور سے ۱۰ محرم کو ماتم کا دن مقرر کیا (۲) معزالدولہ نے ماتم کا یہ ضابطہ بنایا تھا (الف) بازار بند ہوں (ب) عورتیں ماتمی لباس (جو موٹے کپڑے کا ہوتا تھا) پہنیں (ج) بازاروں میں چہرے کھلے ہوئے منہ پیٹتی سینہ کوبی کرتی ہوئی جائیں۔ (د) حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب کی شہادت پر بین کریں ——— عید غدیر کے جشن کی بنیاد بھی اسی نے ڈالی (ہ) اور فضائلِ صحابہ کو مساجد میں بھی بہ آواز بلند بیان کرنے کی ممانعت کردی ——— "

حرفِ آخر

جس طرح مولانا عرشی رامپوری کے مقالہ (نہج البلاغہ کا استناد) پر گفتگو ہو سکتی ہے، اسی طرح مولوی محمود عباسی صاحب کے اس مضمون پر جس کے چند اقتباسات اوپر نقل کئے گئے ہیں جرح و تنقید کی جاسکتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کی پیش کی ہوئی کسی دلیل کو جنبش ہی نہیں دی جاسکتی۔

حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و محامدسن کر جو دل بیچ و تاب محسوس کرے وہ انتہائی بد توفیق اور کم ظرف ہے۔ ہم خود حضرت علیؓ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جمل اور صفین کی جنگوں میں حق کا جھکاؤ علیؓ کی طرف تھا۔ مگر "نہج البلاغہ" کے سلسلے میں بحث عقائد و فضائل کی نہیں بلکہ استناد روایت اور انتساب کی صحت اور عدم صحت کی بحث ہے، جو تاریخی نوعیت رکھتی ہے۔ اگر تحقیق و تدقیق کی تمام ضروری شرطیں ادا کرنے کے بعد، پوری نیک نیتی کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جائے کہ نہج البلاغہ کا فلاں خطبہ یا مکتوب الحاقی ہے، تو اس سے حضرت علیؓ کے شرف میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی بالکل اسی طرح جس طرح ناقدین حدیث نے بعض ایسی حدیثوں کو جن میں بڑی حکمت کی باتیں پائی جاتی ہیں مگر ان کو اسناد و درایت کی عدم صحت کے سبب جعلی اور وضعی قرار دیا ہے۔

حضرت علیؓ کے نام سے جو ان کی شاعری کا دیوان منسوب ہے وہ خود جعلی اور الحاقی ہے۔ اس سے نہج البلاغہ کی پوزیشن

---

[1] اسلام ... الثانی صفحہ ۲۳۲

اور مشکوک ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نام سے بھی ایک منظوم دعا بعض کتابوں میں نظر سے گذری یہ بھی الحاقی ہے۔

ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ بعض چیزیں غلط نسبتوں کے ساتھ مشہور ہو جاتی ہیں، مثلاً ملا معین واعظ کا دیوان حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہو گیا ــــ کسی شاعر کا "محی" تخلص تھا اس کے دیوان کو یار لوگوں نے " دیوان غوث الاعظم " کا نام دیدیا، اور یہ دیوان اسی نام سے چھپا ہوا ملتا ہے۔

ہم نے مولینا مسعود عالم ندوی مرحوم سے جو عربی ادب میں خاص بصیرت رکھتے تھے " نہج البلاغۃ کے بارے میں دریافت کیا تو مرحوم نے فرمایا کہ نہج البلاغۃ میں کچھ حصّہ الحاقی بھی ہے۔ اور علامہ عبد العزیز المیمن جو عربی ادب میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ نہج البلاغۃ کا بہت زیادہ حصّہ الحاقی ہے۔

یہ بات بہرحال یقینی ہے کہ پوری کی پوری "نہج البلاغۃ" کی نسبت حضرت علیؓ کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ اس میں الحاق اور اضافے ضرور ہوئے ہیں ــــ "کچھ" یا "بہت کچھ" بس یہ مسئلہ غور طلب ہے، اور یہ کام اہل تحقیق اور ارباب معانی و تاریخ کا ہے کہ وہ اس پر ریسرچ کریں اور اپنی تحقیق کے نتائج دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔
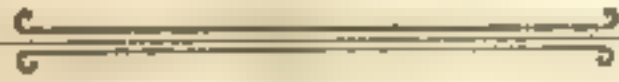
نغمۂ حرم

محترم مدیر فاران کی یہ غزل سرزمین حجاز سے موصول ہوئی ہے جو ان دنوں زیارت حرمین کی سعادت سے ہمکنار ہیں غزل کے تیور اس جذب دروں کی غمازی کر رہے ہیں جو موصوف کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ (ادارہ)

شوقِ طلب ہے راہبر جوشِ جنوں ہے پاسباں!
سوئے مدینۃ النبیؐ کون ہے یہ رواں دواں

ان کا خیال ان کی یاد انکا ہی ذکر و داستاں!
شکر خدا کہ اب نہیں ایک نفس بھی رائیگاں

فکر و خیال ہم عناں، قول و عمل ہیں یک زباں!
اب کوئی فاصلہ نہیں قلب و نظر کے درمیاں

جبکہ سفینۂ عرب[^1] ہونے عرب سوار ہاں!
عشق نے مرحبا کہا شوق نے لیں جو چٹکیاں

خاکِ حجاز پر نثار ایک نہیں ہزار بار
لالہ و سرو و نسترن، ماہ و نجوم و کہکشاں

آج دبی دبی سی ہے چینِ جبینِ روزگار!
آج رکی رکی سی ہے گردشِ ہفت آسماں

زندگی آج تک تو تھی رنج و خوشی کی سلسلہ
اب ہے بہ فیضِ قربِ دوست حاصلِ عمرِ جاوداں

ذاتِ نبیؐ پہ ختم ہے کون و مکاں کا ہر شرف!
آپ رسول جزو و کل آپ امام انس و جاں

محو ہے گوشِ کائنات گونج رہی ہیں شش جہات
جیسے لبِ بلالؓ پر صبح کو نغمۂ اذاں

نازشِ انتخاب ہے اس کی نگاہِ انتخاب
شاخِ حرم کو چن لیا جس نے برائے آشیاں

حالِ تباہ دیکھ کر ان کو بھی پیار آ گیا
تجھ پہ خدا کی رحمتیں اے مرے قلبِ ناتواں

ماہر القادری

[^1]: عرب جہاز کا نام

روحِ انتخاب

کچھ مدت ہوئی کہ اسلام کے متعلق مسٹر جارج برنارڈ شا کے خیالات جرائد میں شائع ہوئے تھے۔ حال میں جب انھوں نے مشرق کا سفر کیا تو اس کے دوران میں سنگاپور کے عربی اخبار "الہدیٰ" کا نامہ نگار ان سے ملا اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے پھر ایک مرتبہ اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آزادی اور دستوری و ذہنی حریت کا دین ہے۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے مسیحیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کسی مذہب کا نظامِ اجتماعی اتنا مکمل نہیں ہے جتنا اسلام کا نظام ہے۔ دنیائے اسلام کا تنزل اسلام سے دور ہٹ جانے کی بدولت ہے۔ مسلمان جب صرف اسلام کی بنیادوں پر جدوجہد کریں گے تو عالمِ اسلامی کا خواب ا بیداری سے بدل جائے گا۔

ان خیالات کے سننے کے بعد نامہ نگار نے سوال کیا کہ جب آپ اسلام کو اچھا سمجھتے ہیں تو پھر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو فطری پر ان بیانات کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک سلیم الطبع آدمی کے لئے کسی چیز کے اعترافِ قبح اور اس کو ترک کر دینے اور کسی چیز کے اعترافِ حسن اور اس کو قبول و تسلیم کر لینے میں کوئی حدِ فاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن مسٹر شا نے جو کچھ جواب دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قبولِ اسلام کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور ایسا نہ کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں ہے، بلکہ صرف اس چیز کی کمی ہے جس کو شرحِ صدر کہتے ہیں۔

ایک مسٹر شا ہی پر موقوف نہیں ہے بہت سے اہلِ فکر و نظر پہلے بھی گذر چکے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جنھوں نے اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اس کے دنیوی یا دینی یا دونوں حیثیتوں سے مفید ہونے کا اقرار کیا، اس کی تہذیب اس کے نظامِ اجتماعی، اس کی علمی صداقت، اور اس کی عملی قوت کی پوری تسلیم کی مگر جب ایمان لانے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے کا سوال سامنے آیا تو کسی چیز نے ان کو قدم آگے بڑھانے سے روک دیا، وہ اسلام کی سرحد پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔

برعکس اس کے بہت سے آدمی ایسے بھی ہو گذرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسلام کی مخالفت اور اس کی دشمنی میں صرف کر دیا، لیکن اسی مخالفت کے سلسلہ میں اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے حقیقتِ اسلام ان پر منکشف ہو گئی اور اس انکشاف کے بعد کوئی چیز ان کو ایمان لانے سے نہ روک سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا راز بھی ایک عجیب راز ہے۔ ایک ہی بات ہے جو ہزاروں آدمیوں کے سامنے لائی جاتی ہے، مگر کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ کوئی توجہ کرتا ہے لیکن وہ اس کے پردۂ گوش پر سے اُچٹ کر چلی جاتی ہے، کوئی اس کو سنتا اور سمجھتا ہے مگر مانتا نہیں، کوئی اس کی تعریف و تحسین کرتا ہے مگر قبول و تسلیم نہیں کرتا۔ اور کسی کے دل میں وہ گھر کر جاتی ہے اور وہ اس کی صداقت پر ایمان لے آتا ہے۔

ہمارا شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص کو بازار میں پٹ کر گزرتے ہوئے سینکڑوں آدمی دیکھتے ہیں۔ بعض اس کو ایک معمولی واقعہ سمجھ کر یوں ہی بس دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ بہتوں کے دل میں رحم آتا ہے مگر افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بہت سے اس کا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اللہ کے بندے ایسے نکلتے ہیں جو بڑھ کر اسے اٹھاتے ہیں، اس سے ہمدردی کرتے ہیں اور اس کو مدد پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ ایک مجرم کو پابزنجیر جاتے ہوئے بہت سے آدمی دیکھتے ہیں، کوئی اس کی طرف التفات ہی نہیں کرتا، کوئی اس پر حقارت کی نظر ڈالتا ہے، کوئی اس پر ترس کھاتا ہے، کوئی اس کی ہنسی اڑاتا ہے، کوئی اس کے انجام پر خوش ہوتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ جیسا کیا ویسا بھرا اور کوئی اس کے انجام سے عبرت حاصل کرتا ہے اور جرم سے بچنے کی کوشش کرنے کا دل میں پختہ عزم کرتا ہے۔

یہ تو مختلف لوگوں کی مختلف نفسی کیفیات و تاثرات ہیں جن کا اختلاف دنیا کا عجیب مشاہدہ ہے۔ لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی شخص کے تاثر اور اس پر ایک ہی چیز کے اثر کی نوعیت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ وہی ایک بات ہے جس کو ایک شخص ہزاروں مرتبہ سنتا ہے اور نہیں مانتا، مگر ایک ایسا موقع آتا ہے کہ یہی بات اس کے دل کا بند کھل جاتا ہے، جو بات کان کے پردے ہی سے ٹکرا کر رہ جاتی تھی وہ سیدھی دل تک پہنچ جاتی ہے۔ اور وہ خود حیران ہوتا ہے کہ یہی بات میں پہلے بھی بارہا سن چکا ہوں، پھر آج یہ کیا ماجرا ہو گیا کہ یہ خود بخود دل میں اتری چلی جا رہی ہے۔ ایک ہی شخص کو بارہا آفت رسیدہ آدمیوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے اور وہ ان کی طرف التفات بھی نہیں کرتا۔ لیکن ایک موقع پر کسی شخص کی مصیبت دیکھ کر دفعتاً اس کا دل بھر آتا ہے، قلب کا پردہ چاک چاک ہو جاتا ہے، اور وہ سب سے زیادہ ہمدرد، رحیم اور نرم دل بن جاتا ہے۔ ایک شخص کو اپنی عمر میں بے شمار عبرتناک مناظر دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے، کبھی وہ ان کو تماشا سمجھ کر دیکھتا ہے، کبھی ایک حسرت و افسوس کی نگاہ ڈالتا ہے اور کبھی ایک معمولی نظر سے اس پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ دل پر ایک مستقل نقش بیٹھ جاتا ہے۔

یہی حال ہدایت و ضلالت کا بھی ہے۔ وہی ایک قرآن تھا، وہی اس کی تعلیم تھی، وہی ایک اس کو سنانے والی زبان تھی۔ ابوجہل اور ابولہب تمام عمر اس کو سنتے رہے، مگر کبھی وہ ان کے کانوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدیجۃ الکبریٰ، ابوبکرؓ اور علی بن ابی طالب نے سنا اور پہلے ہی لمحہ میں اس پر ایمان لے آئے، چیز ان کے کان سے دل میں پہنچنے تک کا شائبہ بھی گزرتا۔ عمرؓ بن الخطاب نے بیسیوں مرتبہ اس کو سنا اور صرف یہی نہیں کہ تسلیم نہ کیا بلکہ جوں جوں سنتے تھے مخالف اور دشمن ہوتے چلے گئے۔ لیکن ایک مرتبہ انہی کانوں نے اس چیز کو سنا تو کان اور دل کے درمیان جتنی مضبوط دیواریں چنی ہوئی تھیں یکایک منہدم ہو گئیں اور اس چیز نے ان کے دل میں ایسا اثر کیا کہ ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔

ہر چند نفسی نقطۂ نظر سے اس اختلافِ کیفیت اور اختلافِ اثر و تاثر کی بہت سی توجیہیں کی جا سکتی ہیں۔ اور وہ سب اپنی اپنی جگہ درست بھی ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو چیز چشم و گوش اور دل و دماغ کے درمیان کہیں ایک مستقل حجاب بن جاتی ہے، کہیں ایک مدت تک حجاب بنی رہتی ہے اور ایک خاص موقع پر خود بخود چاک ہو جاتی ہے، کہیں سرے سے حجاب بنتی ہی نہیں، کہیں کسی بات کے لئے حجاب بنتی ہے اور کسی بات کے لئے نہیں بنتی، وہ بالکل انسان کے ارادہ و اختیار کے تابع نہیں ہے بلکہ فطری و جبلی طور پر خود بخود انسان

میں پیدا ہوتی ہے۔

یہی نکتہ ہے جس کو قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ۔ (الانعام ۱۲۵)

اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اسکا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ کرتا اور ایسا بھینچتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھا جا رہا ہے۔ یہ طریقہ ہے جس کے ایمان نہ لانے والوں پر اللہ کیطرف سے ناپاکی مسلط کیجاتی ہے۔

ایک اور موقع پر اس کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ :۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ (النحل ۹۳)

اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

پھر اس ہدایت کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے کہ :۔

قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ۔ (الرعد: ۲۷)

ان سے کہو کہ اللہ جسکو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور وہ اپنی طرف آنیکا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اسکی طرف رجوع کرتا ہے۔

اور ضلالت کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے کہ :۔

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا۔ (بنی اسرائیل ۴۵)

جب تم نے قرآن پڑھا تو ہم نے تمہارے اور آخرت کا یقین نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک گاڑھا پردہ ڈال دیا اور ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیئے کہ قرآن نہ سمجھ سکیں اور انکے کانوں میں گرانی پیدا کر دی۔

ان آیات میں اس فطری کیفیت کو جو ایک حق بات کو سُن کر اسے قبول کر لینے کے لئے اضطراری طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو آخر کار انسان کو ایمان کی طرف کھینچ لاتی ہے، خدائی ہدایت اور اس کے پیدا کرنے کو "شرح صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس ہدایت کے برعکس انسان کے دل میں حق سے انکار اور اعراض کرنے پر آمادگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلط کی ہوئی گمراہی قرار دیا گیا ہے۔ اور "شرح صدر" کے مقابل جو انقباضی کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے اسے "ضیق صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر اس "ہدایت و ضلالت" اور "شرح صدر و ضیق صدر" کے پیدا ہونے کا سبب یہ بتایا ہے کہ انسان جب ایک مرتبہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس کو خود بخود وہ راستہ دکھائی دینے لگتا ہے جو اسے سیدھا خدا کی جانب لے جاتا ہے۔ اور جو شخص سرے سے یہ احساس ہی نہیں رکھتا کہ اسے کبھی خدا کے حضور میں حاضر ہونا اور اپنے قلب و جوارح کے افعال کا حساب دینا ہے، اس کو لاکھ کوئی شخص کلمۂ حق سُنائے اور وعظ و تلقین کرے، کوئی بات اس کے دل میں نہیں اترتی، اور وہ کسی طرح راہ راست پر نہیں آتا۔

یہاں پھر دو باتیں مل گئی ہیں جن کو الگ الگ سمجھ لینے سے قرآن مجید کے وہ مقامات بآسانی حل ہوجاتے ہیں جن میں یہ مضمون مختلف پیرایوں سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک طرف ہدایت و شرح صدر، اور ضلالت و ضیق صدر کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔ دوسری طرف اس ہدایت و شرح صدر کے عطا کرنے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ انسان خدا کی طرف رجوع اور توجہ کرے، اور ضلالت و ضیق صدر کے مسلط کر دینے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ گمراہ شخص خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اس کے سامنے مسئول و جواب دہ ہونے کا احساس نہیں رکھتا۔

ان دونوں چیزوں کے باہمی تعلق کو یوں سمجھو کہ انسان کی فطرت میں خدا نے ایک ایسی قوت رکھدی ہے جو اس کو حق و باطل کے امتیاز، اور صحیح اور غلط کا فرق سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے حق کی طرف بڑھنے اور باطل سے احتراز کرنے پر مائل کرتی ہے۔ یہی قوت وہ فطری ہدایت ہے جسے خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور جس کی طرف ارشادِ خداوندی فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے خلاف ایک اور قوت بھی انسان میں کام کر رہی ہے جو اس کو برائی کی طرف کھینچتی ہے۔ غلطی اور کج روی کی طرف مائل کرتی ہے، اور جھوٹ اور باطل کو اس کے سامنے مزین کر کے پیش کرتی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بہت سی خارجی اور داخلی قوتیں ایسی ہیں جن میں سے بعض ہدایت کی قوت کو مدد پہنچانے والی ہوتی ہیں اور بعض ضلالت کی قوت کو۔ اکتسابِ علم اور اسکے مختلف مدارج۔ تربیت اور اس کی مختلف کیفیات، سوسائٹی اور اس کے مختلف احوال یہ وہ چیزیں ہیں جو باہر سے اس پر اثر انداز ہوتی ہیں، اور ترازو کے دونوں پلڑوں میں سے کسی ایک میں اپنا وزن ڈالتی رہتی ہیں اور انسان کا اپنے اختیارِ تمیزی، اپنے فہم و فراست، اپنی عقل و بصیرت، اپنے ذرائع اکتسابِ علم سے صحیح یا غلط کام لینا اور اپنی قوتِ فیصلہ کو بجا یا بیجا استعمال کرنا، یہ وہ چیز ہے جو خود اس کے ارادے کے تابع ہے اور جس سے وہ ہدایت و ضلالت کی متضاد قوتوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی ہدایت اور اس کی مسلط کی ہوئی ضلالت دونوں غیر محسوس طور پر اپنا عمل کرتی رہتی ہیں۔ ہدایت کی قوت اسے راہِ راست کی طرف لطیف اشارے کیا کرتی ہے اور ضلالت کی قوت اسے باطل کے مرغ پر رجھائے جاتی ہے مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلط اثرات سے متأثر ہو کر اور خود اپنی اختیاری قوتوں کو غلط طریقے سے استعمال کر کے ضلالت کے پھندے میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ہدایت کی پکار پر کان ہی نہیں دھرتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہوتا ہے اور اس دوران میں کچھ بیرونی اثرات اور کچھ خود اس کی اپنی عقل و بصیرت دونوں مل جل کر اسے گمراہی سے بیزار کر دیتے ہیں۔ اور اس وقت ہدایت کی وہی روشنی جو پہلے مدھم تھی دفعۃً تیز ہو کر اس کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت تک انسان ہدایت اور ضلالت کے درمیان مذبذب رہتا ہے کبھی ادھر کھنچتا ہے کبھی اُدھر۔ قوتِ فیصلہ اتنی قوی نہیں ہوتی کہ بالکل کسی ایک طرف کا ہو جائے۔ بعض بدقسمت اسی تذبذب کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں بعض کا آخری فیصلہ ضلالت کے حق میں ہوتا ہے، اور بعض ایک طویل کشمکش کے بعد ہدایتِ الٰہی کا اشارہ پا لیتے ہیں مگر سب سے زیادہ خوش قسمت وہ سلیم الفطرت، صحیح القلب اور صدید النظر لوگ ہوتے ہیں جو خدا کی دی ہوئی عقل اس کی عطا کی ہوئی آنکھوں، اس کے بخشے ہوئے کانوں اور اس کی ودیعت کی

ہوئی قوتوں سے ٹھیک ٹھیک کام لیتے ہیں۔ مشاہدات اور تجربات سے درست نتائج اخذ کرتے ہیں۔ آیات الٰہی کو دیکھ کر ان سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں۔ باطل کی زینت ان کو رجھانے میں ناکام ہوتی ہے۔ جھوٹ کا فریب انکو اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتا ضلالت کی گمراہیوں کو دیکھتے ہی وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آدمی کے چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ پھر نہی وہ حق کی طرف رجوع کرتے اور اس کی طلب میں آگے بڑھتے ہیں، حق ان کے استقبال کو آتا ہے، ہدایت کا نور ان کے سامنے چمکنے لگتا ہے اور حق کو حق سمجھ لینے اور باطل کو باطل جان لینے کے بعد پھر دنیا کی کوئی قوت ان کو راہ راست سے ہٹانے اور گمراہی کی طرف لگانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

ایک اور بات بھی اس سلسلہ میں قابل بیان ہے اور ضرورت ہے کہ مسلمان اس کو ذہن نشین کرلیں۔ عام طور پر جب غیر مسلم مشاہیر کی جانب سے اسلام کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار ہوتا ہے تو مسلمان بڑے فخر سے ان خیالات کو شہرت دیتے ہیں۔ گویا ان کا اسلام کو اچھا سمجھنا اسلام کے لئے کوئی سارٹیفکٹ ہے۔ لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اسلام کی صداقت وحقانیت اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی اس کا اعتراف کرے۔ جس طرح آفتاب کا روشن ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کو روشن کہے۔ اور جس طرح آگ کا گرم اور پانی کا سیال ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کی گرمی اور اس کے سیلان کو تسلیم کرے۔ اسی طرح اسلام کا برحق ہونا اس کا حاجتمند نہیں کہ کوئی اس کے برحق ہونے کو مان لے۔ خصوصاً ایسے لوگوں کی تحسین اور مدح تو کوئی بھی وقعت نہیں رکھتی جن کے دل ان کی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے اور جو خود اپنے اعراض وانکار سے اپنی مدح وتحسین کی تکذیب کرتے ہیں۔ اگر حقیقت میں وہ اسلام کی خوبی کے معترف ہوتے تو اس پر ایمان لے آتے۔ لیکن جب انھوں نے زبانی اعتراف کے باوجود ایمان لانے سے انکار کردیا تو اہل عقل کی نگاہ میں ان کی حیثیت بالکل اس شخص کی سی ہے جو طبیب کی صداقت کو تسلیم کرے، اس کے تجویز کردہ نسخہ کی صحت کا اعتراف کرے، مگر اپنی بیماری کا علاج کسی عطائی طبیب سے کرائے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی بڑے سے بڑے غیر مسلم کا اعتراف بھی اسلام کے لئے قابل فخر نہیں ہے۔ اسلام کے لئے ایک ہی فخر کافی ہے اور وہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ اور رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا کا فخر ہے۔

(تفہیمات ــــ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(بقیہ "ہماری نظر میں") ـــــ رسول کی وفات پا گئے، تو ابوبکر تلوار سے قلم کردونگا ـــــ [illegible] مصنف کہتے ہیں کہ یہ واقعہ حدیث سے متعلق ہے۔ دونوں کتابیں اپنے موضوع پر خوب ہیں مگر بعض آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ اور ان کی تاویل و تشریح محل غور ہے ـــــ :

ہماری نظر میں

بیان المختار "بیان المختار" (فی اردو متن) بنار ارسل لاخبار۔ از :- مولینٰ عنایت اللہ اثری وزیر آبادی۔ ضخامت ۱۰ ۱۴ صفحات، قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ:- ناظم انجمن اہل حدیث گجرات۔ (پنجاب)

یہ کتاب اپنے موضوع پر کم سے کم اردو زبان میں پہلی کتاب ہے، فاضل مصنف نے ان اعتراضات کو رفع ۔ ان مشکلات کو دور کیا ہے، جو احادیث اور بعض قرآنی آیات کے سمجھنے میں واقع ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں، مولینٰ یت اللہ اثری کا مطالعہ بہت وسیع ہے، روایات کے علاوہ لغت و معانی پر بھی ان کی نظر ہے، پھر احادیث و قرآن ے بارے میں ان کا ذہن صاف ہے۔ تاویل تطبیق کے فن سے بھی وہ واقف ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے تاب و سنت پر ایسا یقین رکھتے ہیں، جسے کوئی وسوسہ جنبش نہیں دے سکتا۔ انہی خصوصیات کی جلوہ گری اس کتاب ملتی ہے۔

(۲) "القول المختار" (فی اردو فی) النبی المختار"۔ از :- مولینٰا عنایت اللہ اثری۔ ضخامت ۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصولڈاک)

اس کتاب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث کی جن میں بظاہر اشکال نظر آتا ہے، تاویل و تشریح کی گئی ہے۔ ویسے فاضل مصنف نے کوئی شبہ نہیں بڑی محنت و کاوش [illegible] تحقیق سے کام لیا ہے، جس کا اجر اللہ تعالیٰ انہیں دارین میں عطا فرمائے گا۔!

(صفحہ ۳۰) "لیکے" کو "جھکے" لکھا ہے　　(صفحہ ۸۰) "اب میں آیات کریمات بمعہ ٹھیک مطلب ذیل میں درج کرتا ہوں" بمعہ ٹھیک مطلب" کا پستھوں کی زبان ہے

(صفحہ ۱۰۵) "ماکنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذاً لارتاب المبطلون" کی یہ ترجمانی۔

قرآن مجید کے نزول سے پہلے تو نہ کوئی عربی کتاب دیکھ کر پڑھ سکتا تھا اور نہ اسے لکھ سکتا تھا مگر ہاں! اب اس کے نزول کے ہمارے فضل و کرم سے تو پڑھنے لگا ہے، اور لکھنے بھی لگا ہے" درست نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے نزول کے بعد بھی "اُمّی" رہے!۔ "من قبلہ" سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہ حضور نزول قرآن کے بعد پڑھنے لکھنے لگے تھے، غلط ہے۔ اگر کوئی دیانت دار شخص کسی سرکاری عہدے پر مامور ہو، اور لوگ اس کی دیانت پر الزام لگائیں اور وہ کہے۔ "کیا تم نے مجھے اس ملازمت سے پہلے بددیانتی کرتے دیکھا تھا" تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ملازمت کے بعد بددیانتی کرنے لگا۔!

یہ جو مشہور ہے کہ حضور کی وفات پر عمر فاروق رضی اللہ عنہ تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے! یعنی وہ کہتے تھے کہ جو کوئی یہ کہے گا

"آہنگ"

نتیجہ: ابن فیض اعظمی!

میں اپنے بتکدے کا خود ہوں اک صنم پار

کہ دست فکر نے پیکر مرا تراشا ہے

سرود و شعر کے جانچے میں مجھکو ڈھالا ہے

جمال و مستی و جذب و سرور بخشا ہے

میں اپنے چرخ کا ہوں ایک لالہ گوں تارا

مرا وطن ہے فضائے سحاب و سبزہ و کشت

مری نگاہ میں جنت کی صبح ہوتی رہی

مرے نفس میں ہوئے بہار سوتی رہی

شراب شوق تو خود میرے پاؤں دھوتی رہی

مرا مقام نہ مسجد نہ بتکدہ نہ کنشت

مرے قلم کا ہے اک رشحہ "مہر رکنا باد"

مری فضا سے برستی ہے شبنم تخییل

ہیں میرے شانوں پہ آوارہ گیسوئے جبریل

کہیں ہیں نطق کلیم اور کہیں ہیں سوزِ خلیل

میں اک وجود ثریا سوادِ عرش نہاد

یہ رنگِ گل یہ شگوفہ یہ خوشۂ پرویں

چراغ نسترن و یاسمن یہ سرو و گلاب

شفق یہ قوسِ قزح یہ سفینۂ زرناب

لگے ہیں اس میں بھلا کون سے پر سرخاب

کہ ان سے بڑھ کے ہی خود یہ ہی فکر شوخ [illegible]

وہ قطرہ ہوں جو ہے در اصل میکدہ انجام

اک آفتاب ہوں میں پیرہن میں ذرے کے

لہو کی موج سبک ہوں جگر میں لالے کے

میں نکہتوں کا ہوں ارمان دل میں غنچے کے

مرے نفس سے ہی روشن سوادِ شیشہ [illegible]

حجاب ساز میں "آہنگ" بن کے رہتا ہوں

ضمیر کوکب و مہتاب میں نہاں ہوں میں

زمانہ راز ہے اور اس کا رازداں ہوں میں

ہوں ایک شاعرِ مفلس گر جواں ہوں میں

گلی کے چہرے پہ اک رنگ بن کے [illegible]

ماہنامہ
فاران
ماہر القادری

جلد ۶ نمبر ۸

ماہنامہ

فاران

نومبر ۱۹۵۴ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ر
آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱ر

مقام اشاعت

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ - کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

میں تین مہینے پاکستان سے باہر رہا مگر اللہ تعالےٰ کے فضل سے "فاران" پابندی کے ساتھ شائع ہوا، اور اس وضع داری کے ساتھ شائع ہوا کہ "فاران" کے قدر دانوں نے میری غیر حاضری کو محسوس نہیں کیا، تمام ستائش، خواہ سفر ہو یا حضر ہر طرح کی حمد وستائش اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہی کو زیبا ہے، کہ اس کی مشیت اور حکم کے بغیر نہ تو اسباب جمع ہو سکتے ہیں اور نہ کسی سبب سے نتیجہ کا ظہور ہو سکتا ہے!

تین مہینے کی یہ مدّت اس طرح بسر ہوئی کہ دنیا کے حالات اور واقعات سے قریب قریب بے خبری ہی رہی، کئی کئی ہفتے ایسے گذرے ہیں کہ اخبار کی صورت تک دیکھنی نصیب نہیں ہوئی، حجاز میں کبھی کبھار بعض لوگوں کی زبانی تھوڑی بہت خبروں کی بھنک کان میں پڑ جاتی تھی ——— مگر اب کراچی میں آکر یہ محسوس ہوا کہ حجاز کی پرسکون دُنیا سے نکل کر میں ایک ایسی دُنیا میں آگیا جہاں سیاست کا مدّ وجزر ہے، شور و شغب کے ہنگامے ہیں، اور زندگیاں عجیب کشمکش سے گذر رہی ہیں، یہ باتیں عام طور پر تو لوگوں کیلئے موجب تشویش ہوا کرتی ہیں، مگر علامہ اقبالؒ کا نظریہ کس قدر حوصلہ افزا ہے:

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں ؛ وہ آشیاں کہ نہیں جس کی گھات میں صیّاد

باہر کے ملکوں کی خبروں میں سب سے زیادہ تشویشناک خبر یہ ہے کہ جمال ناصر نے مسلمانانِ مصر کی واحد نمائندہ جماعت "اخوان المسلمین" پر "بزن" بول دیا ہے، اور اس دینی جماعت کو کچلنے کے لئے ہر سازش

ہر طرح کی منافقت اور ہر قسم کی زیادتی اور جبر و شقاوت کام میں لائی جا رہی ہے۔ "اخوان المسلمین" کے کتنے اکابر ہیں جن کی "قومیت" (NATIONALITY) ضبط کر کے ان کو دیس نکالا دیدیا ہے۔ اخوان کی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے، اور نہ جانے کتنے خدا کے نیک بندے صرف "اسلام دوستی" کے جرم میں قید و بند کے مصائب سے دوچار ہیں۔ سرکاری دفتروں اور خاص طور سے فوج اور پولیس سے چن چن کر اُن لوگوں کو نکالا جا رہا ہے جو "اخوان" سے ذرا سی بھی ہمدردی رکھتے ہیں۔ "اخوان" کے مرشدِ عام جناب حسن الہضیبی کی گرفتاری کے لئے ایک لاکھ مصری پونڈ کا گرانقدر انعام مقرر کیا گیا ہے، اور کئی بار ان کی گرفتاری کی جھوٹی خبریں بھی اخباروں میں چھپوائی گئی ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کیا مصر پر اسلام کا پرچم اسی دن کے لئے لہرایا تھا کہ یہاں یہودیوں اور نصرانیوں کے لئے آزادی ہوگی، بدکاروں، شراب خواروں، قمار بازوں اور رقاصاؤں کو عیش سامانیوں کے مواقع میسر ہوں گے ——— مگر اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں پر وادیٔ نیل تنگ کر دی جائے گی۔ فاسقوں اور فاجروں کی گردنوں پر سنہری ہار پہنائے ہوں گے، لیکن نیکوکاروں اور پاکبازوں کو طوق و سلاسل میں جکڑوا دیا جائے گا ——— تاریخ کے ورق بدلتے رہتے ہیں، لیکن اتنے بھی نہیں کہ حقائق کے چہرے بالکل مسخ کر دیئے جائیں اور شرافت اور کمینگی میں کوئی حد فاصل ہی باقی نہ رہے۔

شاہ فاروق (بر عکس نہند نام زنگی کافور) کے عہد نامسعود میں بھی "اخوان المسلمین" پر جور و ظلم کے اتنے پہاڑ توڑے گئے کہ کوئی دوسری مفاد پرست جماعت ہوتی تو ہمت ہار جاتی اور میدان سے بھاگ کھڑی ہوتی، مگر "اخوان" کو ہزار آفریں کہ انھوں نے لرزہ بر اندام مصائب اور خوفناک شدائد کا مقابلہ صبر و استقامت سے کیا۔ اس صبر و استقامت سے جس کی توقع اہل ایمان ہی سے کی جاسکتی ہے، صبر و رضا کا یہی وہ مقام بلند ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی "معیت" کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ کی معیت میسر ہو، اس کے مقابلہ میں اگر ابر کی ساری بجلیاں، زمین کے تمام زلزلے اور سمندروں کے تمام پرشور طوفان بھی آجائیں تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

مصر کے اس معزول بادشاہ کے دورِ فرمانروائی کا سب سے زیادہ سیاہ کارنامہ یہ ہے کہ "اخوان المسلمین" کے بانی حضرت حسن البنا کو انتہائی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا ——— ظلم اس غلط اندیشی میں مبتلا تھا کہ حسن البنا شہید کے بعد "اخوان المسلمین" کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ مگر اخوان کی ہمت و جرأت اور عزیمت وارادہ نے ایک لمحے کے لئے بھی ظلم و ستم کی اس غلط اندیشی کو "واقعہ" نہیں بننے دیا، حضرت حسن البنا کی شہادت نے اُن کے حوصلوں کو اور بلند کر دیا، اور ہر "اخوان" یہ محسوس کرنے لگا کہ شہید قائد کی ذمہ داری اب اُس کے کاندھوں پر منتقل ہوگئی ہے، اس کا کام رُکنے کے بجائے اور آگے بڑھ گیا، "اخوان" منتشر ہونے کے بجائے اور زیادہ منظم ہوگئے، اور شہید مظلوم کے خون نے اس جماعت کو نئی زندگی عطا کی!

شاہ فاروق جو مصر کے تاج و تخت کا مالک تھا، اُسے سب سے زیادہ اُس فرعون کے انجام سے عبرت حاصل کرنی چاہئے تھی جس کی سطوت ایک ضرب کلیمی کی بھی تاب نہ لاسکی تھی ——— مگر اُس ظالم اور عیاش کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ گئے تھے، اُس کا ضمیر بے حس ہوگیا تھا اور اُس کی انسانیت درندگی کا قالب اختیار کر چکی تھی، اس لئے وہ عبرت حاصل کرنے کے بجائے اور مغرور ہوگیا ——— آخر جب ظلم کا پیالہ بھر چکا اور قدرت کی طرف سے دی ہوئی مہلت ختم ہو چکی تو پھر انتقام کے ایک ذرا سے جھٹکے نے مصر کا

ہز مجسٹی اٹلی کا ایک معمولی شہری بن کر رہ گیا۔

شاہ مصر کی جلاوطنی کے بعد جنرل نجیب کی شخصیت منظرِ عام پر آئی ہے، نجیب ایک شریف انسان ہیں، اور چاہے وہ اقامتِ دین کے پورے تقاضوں سے باخبر نہ ہوں مگر اسلام پسند عناصر سے کد نہیں رکھتے، توقع تھی کہ ان کے دورِ حکومت میں عہدِ ملوکیت کی بڑی حد تک تلافی ہو جائے گی، مگر جمال ناصر کی سازشوں نے جنرل نجیب کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا، یہاں تک کہ نجیب کی سادگی اور شرافت پر جمال ناصر کی عیاری، منافقت، خود غرضی، اور سازش غالب آگئی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جنرل نجیب کے تمام اختیارات سلب کر لئے گئے ہیں اصل طاقت جمال ناصر کے ہاتھ میں ہے ——— اور اس ڈرامہ کا سب سے زیادہ عجیب و غریب سین بلکہ پس منظر یہ ہے کہ جمال ناصر سے مصری عوام بھی بیزار ہیں اور فوج کا بڑا حصہ اُس کا حامی نہیں ہے، مگر اس شخص کی سازش کا یہ کمال ہے کہ عوام و خواص کی اس بیزاری کے باوجود اقتدار کی کرسی کو وہ ہتھیائے ہوئے ہے، لیکن کاغذ کی یہ ناؤ اللہ نے چاہا تو زیادہ دن تک نہ چل سکے گی، سازش کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے!

جمال ناصر مغرب زدہ دل و دماغ رکھتا ہے اور اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ حکومت و اقتدار کا بھوکا ہے! مصر میں "اخوان" سب سے زیادہ طاقتور اور مقبول ہیں، جمال ناصر کو اُن کی ذات سے، اُن کے رجحانات سے اور ان کی تحریک سے بڑا خطرہ ہے، اس لئے کہ جہاں "اسلام" آئے گا وہاں سازش، جاہ پرستی، ہوسِ اقتدار اور لذتِ عیش و عشرت کو جگہ چھوڑ دینی پڑے گی! جمال ناصر جب یہودیوں کے خلاف "اخوان" کی فوجی طاقت، [illegible] اور سرفروشی کے مناظر بھی دیکھ چکے ہیں، اس لئے جمال کو سب سے بڑا خطرہ "اخوان" ہی کی تنظیم میں نظر آیا، مصر کی اس پر اسرار شخصیت نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس جماعت کو خریدا بھی نہیں جا سکتا۔ لوگ بے لچک کردار اور اعلیٰ سیرت رکھتے ہیں، لہٰذا آئین و اخلاق اور انصاف و دستور کے میدان میں انہیں شکست نہیں دی جا سکتی ——— اس لئے جمال ناصر نے وہی حربے استعمال کئے جو اس خالص ذہنیت اور سازشی دماغ کے لوگ استعمال کیا کرتے ہیں۔

جمال ناصر نے مصر میں جابرانہ آمریت قائم کر رکھی ہے، وہ ہٹلر، موسولینی اور اسٹالن کے قدم بہ قدم چل کر اپنے مخالفین کو مٹانے اور کچلنے پر تُلا ہوا ہے، ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ "اخوان" کو بدنام کرنے کیلئے ایسی ایسی باتیں جوڑی جا رہی ہیں جو انہیں دماغوں کی اختراع و ایجاد ہو سکتی ہیں، جو خوفِ خدا اور آخرت کی باز پرس سے بے پروا ہوں!

جمال ناصر بھی سُن لیں اور دُنیوی حکومتوں میں جہاں جہاں اس ذہنیت کے اہلِ اقتدار پائے جاتے ہیں وہ بھی گوش رکھیں کہ جو جماعتیں اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں، اُن کو ستایا اور دبایا جا سکتا ہے مگر مٹایا نہیں جا سکتا، حق پرستوں کی مظلومیت کو دیکھ کر صاحبانِ سیاست بڑے بول نہ بولیں اور اکڑ کر نہ چلیں، حالات سدا ایک ہی جیسے نہ رہیں گے، وقت آئے گا اور ضرور آئے گا جب سچائی اور نیکی کو اُس کا حصّہ، اور جھوٹ اور سازش کو اُس کا حصّہ ملے گا!

"اخوان المسلمین" اپنے کو تنہا نہ سمجھیں، ہر قلبِ مومن اُن کے ساتھ ہے، اور اُن کے پاؤں میں جو کانٹا بھی لگتا ہے اس کی کھٹک ہم اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں کہ دین کا رشتہ سب رشتوں سے زیادہ مضبوط ہے!

ماہر القادری

ماہر القادری

کراچی سے مکّہ تک

مکہ مدینہ کی محبت یوں سمجھئے مجھے گھٹی میں پلائی گئی تھی، ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے ان مقدس ناموں سے کان اچھی طرح آشنا بلکہ مانوس تھے، والد مرحوم کس ذوق و شوق کے ساتھ امیر مینائی کا یہ شعر جھوم جھوم کر پڑھا کرتے تھے ؎

مدینہ جاؤں پھر آؤں مدینہ پھر جاؤں!
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے!

خود اُن کی نعتیہ شاعری میں مدینہ منورہ کی حاضری کا کتنا شدید اشتیاق پایا جاتا ہے ؎

الٰہی وہ دن کونسا ہو کہیں سب
مدینے ظریفؔ اندنوں جا رہے ہیں!

وہ مدینہ والے کی محبت اور مدینہ کا شوق دل و نگاہ میں لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے، کیا عجب کہ والد مرحوم کے برزخ اور مدینہ کی فضا میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص ربط پیدا فرما دیا ہو!

یہ تو جہ گنہگار کے گھر کا رنگ تھا اور باہر کا یہ عالم کہ گاؤں کے گلی کوچوں میں، فقیروں کی صداؤں میں بھی تذکرہ سننے میں آیا۔

دکھا دے یا الٰہی وہ مدینہ کیسی بستی ہے
جہاں پر رات دن مولا تری رحمت برستی ہے

خدا شاہد ہے اور میری آشفتہ مزاجیاں اس کی گواہ ہیں کہ زندگی ہر طرح کے مرحلوں سے گذری، مگر کسی عالم میں بھی دل مکہ مدینہ کی یاد سے خالی نہیں رہا!

گذشتہ سال زیارت حرمین شریفین کے لئے درخواست دی تھی، مگر قسمت نے یاوری نہیں کی، یا یوں سمجھئے کہ اُدھر سے طلبی نہیں ہوئی، اور شاید "زبانِ راز" میں فرمایا گیا ؎

نالہ ہے بلبلِ آشفتہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں ذرا اور اسے تھام ابھی

اس سال پھر اللہ کے بھروسے پر درخواست دیدی اور سرکاری طور پر منظوری مل گئی! منظوری ملتے ہی سفر کی تیاریاں اور اس کے منصوبے شروع ہو گئے!

یہ شعر ہزاروں بار سنا اور پڑھا تھا ؎

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

مگر نفس کی آرام طلبی اور دراز دستیوں کی بدولت اس شعر کی معنویت سے پشیمان ہونا پڑا، کھانے پینے کی ایک ایک

چیز کا سامان کیا اور جزئیات کا اس قدر اہتمام کیا کہ اچار کے مرتبانوں سے لے کر بھنے ہوئے چنوں کی پوٹلی تک ساتھ لی گئی، جو لوگ پہلے حج کر چکے تھے ان کے پاس جا جا کر پوچھا کہ کیا چیز ساتھ لیں کیا نہ لیں! ہر شخص نے اپنے تجربہ کی روشنی میں مشورہ دیا! اتنے بہت سے مشوروں کو ذہن میں رکھ کر سفر کا جو سامان کیا جائے اس کا پھیلاؤ جتنا بھی ہو کم ہے۔

کراچی کے حاجی کیمپ میں جب بھی آنا جانا ہوتا تھا تو حاجیوں کے اضطراب اور انتظار کی حالت اور جہاز راں کمپنی کے ٹکٹ گھر پر ان کی بھیڑ دیکھ کر دل گھبراتا تھا کہ یہی معاملہ میرے ساتھ پیش آنے والا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی ربوبیت کے قربان جائیے کہ اس نے میری کمزوری، گھبراہٹ اور سیماب وشی کو دیکھ کر اس مرحلے کو اس طرح آسان فرمایا کہ چند گھنٹوں میں دنوں کا کام پورا ہو گیا۔

حج کے دفتر سے جو اطلاع نامہ ملا تھا اس میں ساتویں جہاز" کا اندراج تھا اور یہ ساتواں جہاز **"سفینۂ عرب"** تھا، شروع میں معلوم ہوا کہ سفینۂ عرب ۱۵ جولائی کو روانہ ہوگا، پھر اطلاع ملی کہ روانگی کی تاریخ ایک دن مقدم کر دی گئی، اور آخری اطلاع یہ تھی کہ اب ۱۳ جولائی کو جہاز چھوٹے گا! اسلئے بہت سے کام جلد جلد سمیٹنے پڑے!

سب سے اہم کام یہ ہے کہ اگست، ستمبر اور اکتوبر یعنی اکٹھے تین مہینے کے "فاران" کے پرچے تیار ہو رہے ہیں ان کی کاپیاں دیکھی ہیں مضامین کی ترتیب ابھی تک ہو ہی رہی ہے اور دو پرچوں کے "نقش اول" قریب قریب ایک ہی ساتھ لکھ کر دیئے ہیں! زندگی اتنی زیادہ مصروف شاید ہی کبھی رہی ہو ــــ اور ضروری باتیں کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہو پاتیں، کام میں کام نکلتا آتا ہے، روانگی سے ایک دن پہلے تک کپڑے سلے ہیں اور بازار سے چیزیں خریدی گئی ہیں!

سفر کا ابھی آغاز نہیں ہوا کہ رحمتوں کی بارش شروع ہو گئی، روانگی سے ایک دن قبل میرے چھوٹے بھائی مسرور کو اللہ تعالیٰ نے سچ مچ چاند سا بیٹا عطا فرمایا، سرخ و سپید رنگت، کشادہ پیشانی کہ جسے دیکھ کر بے اختیار ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

پڑھنے کو جی چاہے۔

جہاز ۱۳ جولائی کو چھوٹنے گا، اور ہم ایک دن پہلے ہی اپنے مکان سے جیکب لائن چلے گئے! میرے ہم زلف بابو عبدالکریم خاں نے اصرار کر کے اپنے یہاں بلا لیا، شب میں ان کے یہاں دعوت ہے، مگر میں ایک دوسری جگہ مدعو ہوں بابو عبدالکریم خاں کے گھر کے لوگ قدرے برہمی کے انداز میں مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ جب کبھی ہمارے یہاں دعوت ہوتی ہے تو آپ، دیدہ کر اس دن نہیں آتے اور کسی دوسری جگہ دعوت میں چلے جاتے ہیں۔

؎ دن گنے جاتے تھے جس دن کیلئے

بیجئے وہ دن بھی آ گیا! عزیزی محمد نعیم دکٹوریہ میں تمام سامان لے کر صبح سات بجے کے قریب کیماڑی روانہ ہو گئے ڈیک کے مسافروں کو بندرگاہ بہت پہلے پہنچنا ہوتا ہے، اس لئے ہم بھی ساڑھے آٹھ بجے جیکب لائن سے چل دیئے! راستہ میں "فاران" کے دفتر پہنچ کر موٹر کار رکوائی گئی اوپر جا کر بیت اپنی بڑی بہن کو وداعی سلام کیا اور مسرور کے نومولود بچے کو جس پر زندگی کی ابھی صرف تین صبحیں بھی طلوع نہیں ہوئیں، پیار کیا! رخصت و وداع کا یہ منظر چند منٹ میں ختم ہو گیا، اور میں اپنی بیوہ بہن کی آنکھوں میں آنسو چھوڑ کر چلا آیا!

بندرگاہ پر انسانوں کا ایک ہجوم ہے' اور ان کے دوست عزیز آتے چلے جارہے ہیں' سپاہی شیڈ کے دروازوں پر کھڑے ہیں' ہر کسی کو آنے نہیں دیتے، یہاں اندر آنے کے لئے بس سفارش سے کام چلتا ہے، جو بیچارے اندر نہیں آسکے وہ کٹہرے اور لوہے کی سلاخوں سے اپنے عزیزوں کو جھانک رہے ہیں۔

شہر میں آج سب سے زیادہ بکری پھول کے ہاروں اور گجروں کی ہو رہی ہے، دوست عزیز عازمین حج کو محبت و عقیدت کے ساتھ ہار پھول پہنا رہے ہیں! حج کمیٹی کی طرف سے برف کے پانی کا معقول انتظام ہے، اور شیڈ سے جہاز پر جانے کے لئے جو راستہ طے کرنا پڑتا ہے اس پر حج کمیٹی والوں نے شامیانہ بھی نصب کرا دیا ہے!

پولیس میں پاسپورٹ کا اندراج' سامان کی تلاشی، حج نوٹوں کی جانچ پڑتال اور ڈاکٹری معائنہ یہ مرحلے کافی وقت لیتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے ان مرحلوں کو بھی مجھ عاصی پر آسان بنا دیا، ذرا سی بھی زحمت نہیں ہوئی۔

جہاز پر چڑھنے کا وقت قریب آتا جا رہا ہے، میں عزیزوں اور دوستوں کے ہجوم میں بیٹھا ہوں' ہار اور پھول کے تحفے بھی کچھ لوگ اپنے ساتھ لائے ہیں! میں اس عالم میں بھی "فاران" کی ترتیب و اشاعت کے سلسلہ میں اپنے چھوٹے بھائی مسرور کو ضروری باتیں نوٹ کرا رہا ہوں! عادت یہ ہے کہ جب کسی سے کوئی بات کہنی ہوتی ہے تو بار بار تاکید کرتا ہوں اور پھر بھی مجھے بے اطمینانی سی رہتی ہے کہ میری بات کی اہمیت سننے والے نے پوری طرح محسوس کی بھی یا نہیں!

بھائی کو قوت بازو کہا جاتا ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر بھائی قوت بازو نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مسرور سچ مچ میرا" قوت بازو" ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مساعدت فرمائے (آمین)

سفینۂ عرب میں!

چار بج چکے ہیں، قلی عازمین حج کا سامان لے کر جہاز کی طرف تیز تیز جا رہے ہیں' ہمارا قلی بھی جہاز پر سامان لے جا کر سیڑھی پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں، ہر مسافر جہاز پر سب سے پہلے پہونچ جانا چاہتا ہے، جلدی اس لئے ہے کہ ڈیک پر اچھی جگہ ملے اور جو جگہ پہلے سے گھیری جا چکی ہے وہ کہیں چھن نہ جائے، نفسا نفسی کا عالم ہے، حرم کے سفر میں بھی خود غرضی کا جذبہ فنا نہیں ہوا' خود تکلیف اٹھا کر دوسرے کو آرام پہونچانا اور ایثار کرنا کبھی مسلمان کی خصوصیت تھی مگر اب اس کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔

ہم بھی ڈیک کے دوسرے حصہ میں ایک جگہ پر کھریا سے (RESERVED) لکھوا چکے تھے، قلیوں نے اسی جگہ ہمارا سامان پھیلا دیا! ہم نے ڈیک کا ٹکٹ کیوں لیا! اس لئے کہ ہر کوئی اپنی جیب کی وسعت اور اپنی جمع پونجی دیکھ کر ہی معاملت کرتا ہے آرام اور آسائش دنیا میں کون نہیں چاہتا مگر اس کے لئے اسباب کی فراہمی بھی تو ضروری ہے! مگر اس حالت میں ہم قطعاً دل گرفتہ نہ تھے اور اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر بھیج رہے تھے کہ اس نے اپنے کرم سے سفر حج کی توفیق تو بخشی، اگر ڈیک سے کوئی اور نچلا درجہ ہوتا تو اس میں بھی سفر کرنا ہمارے لئے سعادت و مسرت کا باعث ہوتا! یہ ٹھاٹ باٹ دکھانے کا نہیں اللہ کی راہ میں فقیر محتاج اور عاجز و ذلیل بن کر جانے کا موقعہ ہے! یہاں تزک و احتشام کا تصور بھی معصیت ہے!

مگر سو جان سے قربان جایئے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے کہ اس نے ہماری طلب اور خواہش کے بغیر ہی

راحت کا سامان پیدا کر دیا، منزلِ بدوست میں قدم رکھتے ہی میزبانی شروع ہو گئی ——— ہوا یہ کہ جب ہم ڈیک پر اپنا سامان جما چکے اور پردے کے لئے چادریں تان چکے تو جو لوگ ہمیں چھوڑنے کے لئے آئے تھے اور ساحل پر کھڑے تھے ان سے رخصت ہونے کے لئے جہاز کے عرشہ پر آنا پڑا۔ اتنے میں پان اسلامک اسٹیم شپ کمپنی کے انجنیئر ظفر احمد صاحب نے مجھے دیکھ کر اوپر بلایا، وہاں اس کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر جناب عبدالحمید اسمٰعیل صاحب بھی موجود تھے، وہ دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور بڑی محبت کے ساتھ ملے، جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں ڈیک میں سفر کر رہا ہوں تو فرمانے لگے کہ آپ نے مجھ سے اس بات کا تذکرہ کیوں نہیں کیا، میں نے کہا کہ مکہ مدینہ کے سفر میں کچھ سختی بھی تو برداشت کرنی چاہئے۔ تھوڑی دیر تامل کے بعد جہاز کے ایک افسر کو حکم دیا کہ ان کے لئے کیبن میں انتظام کیا جائے، چنانچہ آن کی آن میں میرے نام کا کارڈ فرسٹ کلاس کے ٹوپ کی کیبن پر لگ گیا، اور ذرا سی دیر میں نیچے سے سامان اوپر آ گیا اور ہم بھی اس کیبن میں آ گئے! یوں سمجھئے کہ پلک جھپکاتے فرش نشین، فلک نشین بن گئے!

مجھ سے بڑھ کر ناشکرا اور کافر نعمت کوئی بھی نہ ہو گا اگر میں یہ وسوسہ بھی دل میں لاؤں کہ یہ جو کچھ آسانیاں میرے لئے پیدا ہو رہی ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ادب، صحافت اور شاعری کی وجہ سے مجھے کچھ لوگ جانتے ہیں حالانکہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، ورنہ میں کیا اور میری شہرت کیا! ایاز قدرِ خود بشناس! من آنم کہ من دانم! خاک کا حقیر ذرہ آفتابِ جہاں تاب کے احسان کو بھول کر اپنی تھوڑی سی نمود پر اترانے لگے تو اس سے بڑا کم ظرف کون ہو گا!

شام ہوتی جا رہی تھی اور لوگ بے تابی کے ساتھ جہاز کی حرکت کے منتظر تھے۔ کنارے سے سیڑھیاں ہٹ دی گئی تھیں، بس جہاز کے لنگر کھولے جانے کی دیر تھی، سات بجے کے قریب جہاز حرکت میں آ گیا، یارانِ ساحل اور اہلِ سفینہ دونوں طرف سے دستیاں، ٹوپیاں اور ہاتھ ہلنے لگے اور تھوڑی دیر میں "سفینۂ عرب" کراچی کے ساحل سے دور ہو گیا!

نمازِ مغرب کے بعد کھانا کھایا پھر عشاء کی نماز پڑھی، رات کے دس بجے ہیں، اور اب ہم ہیں، جہاز ہے، پانی ہے، اور آسمان ہے، اور ہے....... آگے خدا کا نام ہے!

موجیں کافی تند و تیز ہیں، جہاز کو ہلکے ہلکے ہچکولے لگ رہے ہیں! میری بیوی اور ان کی بڑی بہن (جنہیں میں آپاجان کہتا ہوں) سفر میں ساتھ ہیں: یہ واقعہ ہے کہ حجاز کے اس مبارک اور مقدس سفر میں میری اہلیہ کا ذوق، شوق اور اصرار بہت کچھ شریکِ کار رہا ہے، میرے دبے ہوئے شوق کو انہوں نے ابھارا ہے، اسی مقدس سفر کی تمنا میں نہ جانے کتنی راتوں کے دامن ان کے آنسوؤں سے بھیگے ہیں! اس دعائے نیم شبی اور گریۂ سحری کا اثر بھی انہوں نے دیکھ لیا کہ ہم اللہ کے راستہ میں ایک دوسرے کے ردیف ہیں!

میں نے اب سے اکیس سال پہلے ۱۹۳۳ء میں عراق کا سفر بحری جہاز کے ذریعہ کیا، وہ جولائی یا اگست کا مہینہ تھا، شط العرب آنے تک کئی دن شدید دورانِ سر رہا۔ لوگوں نے اور ڈرایا تھا کہ جولائی کا وسط ہے سمندر بہت گرم ہے، جہاز ہچکولے کھاتا ہوا جائے گا ——— راستہ میں جہاز کو کسی طوفان سے دوچار ہونا تو نہیں پڑا مگر ہوا مخالف ملی اور سمندر تند بلکہ کف در دہاں! اس لئے بہت سے مسافروں کی طبیعت خراب ہو گئی۔ میرے ساتھ کی مستورات بھی امتلاء اور دورانِ سر میں مبتلا ہیں، مگر اللہ کے فضل سے (SEA SICKNESS) کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا، تھوڑی سی بے کیفی اور سرگرانی جو ہے، تو وہ مجھے موٹر کار کے سو دو سو میل کے سفر میں بھی ہو جایا کرتی ہے!

موجیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہیں، ہوا تیز بھی ہے اور مخالف بھی، اس لیے جہاز کی رفتار سست ہو گئی ہے۔
کیبن میں جنبش کا زیادہ احساس نہیں ہوتا مگر برآمدے میں بعض وقت چلنے میں پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں، لیکن جہاز کے ملازم
اس زندگی کے عادی ہیں ان پر کوئی اثر نہیں، وہ جہاز پر اس طرح دوڑتے پھر رہے ہیں جس طرح شہر کے گلی کوچوں میں لوگ
چلتے پھرتے ہیں!

سمندر جس کی نہ تھاہ ملتی ہے اور نہ اور چھور دکھائی دیتا ہے، اس میں جہاز ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں
رکھتا، سمندر کی ایک پرشور موج اسے تہ و بالا کر سکتی ہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے جو جہاز کو تیرا رہی ہے اور موجوں
کو اس طرح تھام رکھا ہے کہ وہ بلند تو ہوتی ہیں مگر جہاز کو نقصان نہیں پہونچا سکتیں، سائنس کی معجز نمائیاں، بجا، بجا، برحق،
لیکن سائنس کی یہ کرشمہ سازیاں کس کی قدرت کا ظہور ہیں؟ سائنس نے خود تو کسی چیز کو پیدا نہیں کیا، اللہ تعالیٰ کی خلق
کی ہوئی قوتوں سے سائنس کام لیتی ہے! سائنس کا کام "ایجاد" ہے تخلیق نہیں ہے، سائنس داں صرف موجد
ہیں خالق نہیں ہیں! اور سب سے زیادہ سامنے کی بات یہ ہے کہ یہ سائنس داں جو طرح طرح کی ایجادیں کرتے رہتے
ہیں، وہ خود تو پیدا نہیں ہو گئے، ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، بس شکر و حمد کی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور تمام
عناصر اور قوتوں کا سررشتہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے! اس عالم اسباب اور جہان کون و فساد میں سب سے
بڑی حماقت، بے دانشی اور جہالت خدا کا انکار ہے۔

جہاز میں میٹھا پانی دن رات میں تین وقت وقفہ وقفہ سے آتا ہے مسافر میٹھا پانی بھر کر نہ رکھیں تو تکلیف ہو، ہمسفر
بیمار ہیں اس لئے بالٹی اور صراحی میں میٹھا پانی بھرنے کا فرض مجھے انجام دینا پڑتا ہے، اور میں جو گھریلو ذمہ داریوں سے ہمیشہ
بچتا رہا ہوں، سفر حجاز کی برکت سے اس ذمہ داری کو محسوس کر رہا ہوں!

"سفینۂ عرب" میں جہاز کے عملہ سمیت تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمی سفر کر رہے ہیں یوں سمجھئے کہ جہاز میں ایک چھوٹی
سی کالونی آباد ہے، بے کیفی، طبیعت کی گرانی اور سمندری بیماری کے سبب مسافر معمول سے بہت کم کھانا کھاتے ہیں،
اس سے کھانا کافی بچ جاتا ہے، جسے سمندر میں پھینک دینا پڑتا ہے، مچھلیوں کی خوب لہر بہر رہتی ہے، اگر مچھلیاں شعور
رکھتیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتیں کہ یا اللہ العالمین! تیرے یہ انسان بندے بڑی سے بڑی تعداد میں جلد جلد
بحری سفر کیا کریں اور راستہ میں بیمار ہو جایا کریں!

سفینۂ عرب والوں نے ڈیک کے مسافروں کے لئے حتی المقدور آرام پہونچانے کا اہتمام کیا ہے مگر ڈیک پھر ڈیک
ہے! ریل گاڑیوں کے فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ میں جو تفاوت ہے، اس سے ڈیک کے مسافروں کی تنگ حالی
کا اندازہ کیا جا سکتا ہے پھر ریل میں دو ڈیڑھ دن سے زیادہ کا سفر نہیں ہوتا، اور یہاں تو آٹھ نو دن انہیں تہ خانوں
میں رہنا ہے، بعض لوگ صفائی ستھرائی کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے، اس پر لطف یہ کہ چھوٹے بچوں کو ساتھ لے آئے
ہیں، اس لئے ڈیک کے نچلے حصوں کی ہوا متعفن ہو گئی ہے! حکومت پاکستان کا یہ کام تھا کہ وہ حجاج کے لئے زیادہ
سے زیادہ وسیع، وزنی اور کشادہ و آرام دہ جہازوں کا انتظام کرتی، دو برس میں اگر ایک جہاز بھی بنوایا جاتا تو اب
تک کم سے کم تین جہاز تیار ہو چکے ہوتے ——— لیکن یہاں ان باتوں کی طرف توجہ کی فرصت کسے ہے۔ ہاں!

۱؎ طریق کا حج میں لانا شرعاً درست ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

ریس کورس، کرکٹ اور ٹینس کے شاندار اسٹیڈیم کی تعمیر کے منصوبے تیار ہوتے رہتے ہیں!

بنگالی مسلمانوں کی خاصی تعداد ہماری ہمسفر ہے۔ ٹخنہ بند اونچے کرتے اور چہروں پر ڈاڑھیاں۔ دینی شغف ان کے بشرے سے نمایاں ہے، ان میں ایسے بوڑھے بھی ہیں جو لکڑی ٹیک ٹیک کر چلتے ہیں، مگر حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ نبوی کا شوق کشاں کشاں لئے جا رہا ہے۔ بنگالیوں کے ساتھ کم سے کم زادِ سفر اور مختصر سے مختصر سامان ہے، کسی کسی کے پاس تو بس ایک چادر ہے جس میں پہننے کے کپڑے لپٹے ہوئے ہیں، پانی کے لئے کوئی برتن تک ساتھ نہیں ہے!

خوشا! راہی کہ سامانے نہ گیرد

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے توکل پر چل پڑے ہیں، ان کی بے سروسامانی قابلِ صد ہزار رشک ہے، خدا کے جن نیک اور برگزیدہ بندوں نے مصر و شام کو فتح کیا تھا، اور مدائن و نینوا کے تخت الٹ دیئے تھے، وہ بھی اپنی آسائش اور آرام کے لئے کم سے کم سامان رکھتے تھے۔ اور ایک ہم نفس کے بندے اور خواہشوں کے غلام ہیں کہ زیادہ سے زیادہ سامان فراہم ہو جانے کے بعد بھی نفس "هل من مزيد" کا نعرہ لگاتا ہے! ہر چند کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت اسلام کا شعار نہیں ہے مگر بہت زیادہ ٹھاٹ باٹ اور پُرتکلف زندگی بھی اسلام کو پسند نہیں ہے! اسلام کی تاریخ میں وہ دن سب سے زیادہ منحوس تھا جس دن عرب کی سادگی کو عجمی تکلف نے دبا لیا!

جہاز میں نیچے باقاعدہ مسجد بھی بنی ہوئی ہے، مگر ایک تو نمازیوں کی کثرت ہے دوسرے بعض لوگوں نے مسجد کو خوابگاہ بنا رکھا ہے، اس لئے اوپر کے درجہ کے مسافروں نے برآمدے میں جماعت کا انتظام کیا ہے۔ نمازیوں کی سب سے زیادہ تعداد مغرب کی نماز میں ہوتی ہے۔ جڑنولہ (ضلع لائلپور) کے مدرسۂ عربیہ کے صدر مدرس مولینا محمد فضل امین جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں نماز پڑھاتے ہیں اور فجر کی نماز کے بعد وعظ بھی فرماتے ہیں۔ ان کا انداز وعظ و تذکیر بہت ہی سیدھا سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ اس تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سننے والوں کے دل دین کی ہر بات کا اثر قبول کرنے کے لئے پہلے سے تیار ہیں!

تبلیغی جماعت کے ایک نوجوان رکن جو غالباً بنگال سے تبلیغی وفد کے ساتھ آئے ہیں، کبھی کبھی نماز کے بعد دین کی باتیں بیان کرتے رہتے ہیں، زبانی بھی اور کتاب پڑھ کر بھی! بڑا نورانی اور پاکیزہ چہرہ ہے اس صالح نوجوان کا! وعظ و تقریر کی مشق نہیں ہے مگر "از دل خیزد بر دل ریزد" کا عالم طاری ہو جاتا ہے، خلوص، بے نفسی اور مقصد سے عشق ہو تو تتلاتی ہوئی زبان سے نکلے ہوئے جملے دلوں میں اترتے اور گھر کرتے چلے جاتے ہیں، اور یہ نہ ہو اور صرف نمود و نمائش مقصود ہو تو فصاحت کے دریا بہا دینے سے بھی کچھ نہیں ہوتا! محفل میں تھوڑی دیر کے لئے واہ واہ تو ضرور ہو جاتی ہے اور "اللہ اکبر" اور "زندہ باد" کے نعرے بھی فضا میں بلند ہو جاتے ہیں، مگر ادھر جلسہ برخاست ہوا اور اُدھر حاضرین کی یہ حالت ہو گئی جیسے انھوں نے کچھ سنا ہی نہ تھا۔

تبلیغی جماعت کے اس صالح نوجوان نے ایک بار یہ بھی کہا، کہ ہم دنیا نہیں چاہتے، مال و زر نہیں چاہتے، حکومت نہیں چاہتے ......" میں نے اس وقت ٹوکنا مناسب نہ سمجھا، وعظ کے بعد الگ لے جا کر میں نے اس سے کہا کہ آپ کی تبلیغی جماعت کے رکن رکین مولانا ابوالحسن علی میاں نے لکھا ہے کہ اقامتِ دین کے لئے حکومت حاصل کرنا بھی دین ہی کا کام ہے ــــــ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد عرب میں ایک اسلامی حکومت

چھوڑی تھی اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ نے بادشاہوں کے دربار میں جاکر ان کے باطل اقتدار کو چیلنج کیا تھا۔ اس پر ان صاحب نے فرمایا کہ ہم بھی یہی چاہتے ہیں اور یہی کرنے کا کام ہے!

بہاول پور کے ایک جج صاحب بھی اسی جہاز میں ہیں، دینی شغف رکھتے ہیں، اہلِ خلوص اور صاحبِ ایثار بھی ہیں، چکر، متلی، اور دردِ سر کا کوئی مریض آتا ہے تو خوشی سے مفت دوا دیتے ہیں ___ مگر افسوس ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں ان غلط فہمیوں کا شکار ہیں، جو دیوبند کے بعض علماء کے فتووں اور مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق" کی تحریروں نے پھیلا رکھی ہیں، میں نے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی تو بات بڑھنے لگی، میں نے آخر میں عرض کیا کہ آپ ان عالموں کے فتووں پر نہ جائیے اگر تحقیق مقصود ہے تو مولانا مودودی کی کتابیں خود پڑھیے، اگر ان میں آپ کو بے دینی کی باتیں نظر آئیں تو ان کتابوں کو بے تکلف جلا دیجئے، اور ان میں دین کی باتیں ہوں تو پھر اپنی رائے بدل دیجئے۔ ورنہ اس بدگمانی اور سوءِ ظنی پر آپ سے مواخذہ ہوگا۔

حسنِ اتفاق ہے کہ مشہور شاعر جناب اسد ملتانی اپنے دو بھائیوں کے ساتھ رفیقِ سفر ہیں، اسد ملتانی حکومت پاکستان میں اسسٹنٹ سکریٹری بھی ہیں مگر ہم جیسے خاک نشینوں کو ان کے اس سرکاری عہدے میں ذرا بھی کشش نہیں! ہمارے لئے وجہ کشش ان کے اسلامی افکار اور ان کی سادگی کردار ہے! اسد ملتانی علامہ اقبال کے فیض یافتہ ہیں، شاعر ہیں اور بلند پایہ شاعر ہیں، ایک زمانہ میں ان کی شاعری کا یہ رنگ بھی تھا:

رہیں نہ رند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

مگر اب ان کی شاعری سو فیصدی مقصدیت رکھتی ہے، اسد ملتانی کی شاعری حالی، اکبر اور اقبال کے سلسلۂ افکار کی ایک کڑی ہے!

اسد ملتانی میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ واضح فکر اور سلجھا ہوا دماغ رکھتے ہیں۔ بات خوب جچی تلی کہتے ہیں، مطالعہ بھی خاصہ وسیع ہے۔ یہ جو ان کا کلام رسالہ "طلوعِ اسلام" میں پابندی کے ساتھ چھپتا رہتا ہے، تو اس سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسد صاحب "منکرینِ حدیث" کی ٹولی میں شامل ہیں، میرے دریافت کرنے پر انھوں نے بار بار کہا کہ ___ "میں کتاب و سنت کو دین کی اساس اور سنت کو دین میں حجت سمجھتا ہوں!"

انھوں نے اس سفر میں کئی نظمیں کہی ہیں ___ ایک نظم کا مطلع ہے:

نظر کو عشق کے پاک آنسوؤں سے صاف کرے
کوئی جو آنکھ کا رخ جانبِ غلاف کرے

سمندر کے تموج سے متاثر ہو کر وہ ایک نظم لکھ رہے ہیں، جس کا ایک شعر ہے:

نہاں ہے دستِ قدرت اور عیاں ہیں مظہر تمام اسکے
دکھاتا ہے تموج میں ہواؤں کا اثر پانی!!!!

میں نے پوری نظم سنانے کی فرمائش کی تو بولے کہ میں شعر قلمبند کرتا جاتا ہوں، اس کے بعد نظرِ ثانی کر کے نوک پلک درست کرتا ہوں اور شعروں کو ترتیب کے ساتھ لکھتا ہوں کہ کونسا شعر نظم میں کس نمبر پر ہونا چاہیئے، جب یہ مراحل

گذر سکتے ہیں تو نظم سنانے کے قابل ہوتی ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ دو شاعر یکجا ہوں اور شعر و شاعری کا ذکر نہ چھڑے، اسعد صاحب نے خواجہ عزیزالحسن مجذوب مرحوم کے چند شعر سنائے:۔

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ + یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے

قدرِ مجذوب کی خدامِ خدا سے پوچھو + شہرتِ عام تو اک قسم کی رسوائی ہے

حسنِ سیرت، حسنِ صورت، حسنِ صوت + ہے غرض مجذوب کی ہر طرح موت

احمق پھپھوندوی کا یہ شعر بھی انہیں کی زبانی سنا:۔

ہے رقیبوں کے محلہ میں ہمارا بھی مکان
اس طرف بھی آنکلئے گا ادھر جاتے ہوئے!

سفرِ حجاز میں اس قسم کی شعر و شاعری کے تذکرے مناسب نہیں اور ہم اس معاملہ میں احتیاط بھی برت رہے ہیں، لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ " چور چوری سے جائے گا ہیرا پھیری سے تھوڑی ہی جائے گا" تو برسہا برس کی پڑی ہوئی عادت اپنے اظہار کے حیلے ڈھونڈتی رہتی ہے!

میں نے کراچی سے چلنے سے چند دن پہلے ایک نعتیہ غزل شروع کی تھی جس کا ایک مطلع ہے:۔

ان کا خیال' ان کی یاد' ان کا ہی ذکر و داستاں
شکرِ خدا کہ اب نہیں ایک نفس بھی رائیگاں

یہ غزل جہاز میں پوری کی دس گیارہ شعر ہوگئے!

جہاز میں چند زائرینِ حرم کا بالائی منزل کے ہال میں جمع ہوتا ہے جہاں نعت خوانی کی محفل گرم ہوتی ہے، مجھے بھی اس میں اصرار کرکے بلایا گیا' عشقِ رسولؐ اپنی جگہ ایمان بلکہ ایمان کی جان لیکن ایسے شعر جس میں حضورؐ سے استمداد اور استعانت چاہی جائے اور حضورؐ سے استغاثہ کیا جائے' خود حضورؐ کی تعلیم کی عین ضد ہے، مگر کیا قیامت ہے کہ آپؐ کے بعض امتی عقیدت و محبت کے ان مبالغوں میں الجھ کر رہ گئے' ایسی باتوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مقدس کو کس قدر اذیت ہوتی ہوگی!

اس محفل میں جب صلوٰۃ و سلام کے لئے لوگ کھڑے ہوگئے تو میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا، شاید وہ لوگ اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ ہم "عاشقانِ رسولؐ" ہیں یہ "وہابی" ہے کہاں سے آگیا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ ولادت کے وقت "قیام" کھلی ہوئی بدعت ہے جس کی کوئی اصل نہیں قرآن پاک میں سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت کا ذکر کس تفصیل کے ساتھ موجود ہے، اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ آپ کی ولادت معجزے کے طور پر واقع ہوئی ہے۔ مگر حضورؐ یا آپؐ کے صحابہ ان آیتوں کو پڑھتے وقت کبھی تعظیم کے لئے کھڑے نہیں ہوتے!

میں ایک زمانہ میں ان بدعات میں مبتلا رہا ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا کہ اس چکّر سے مجھے جلد نکال دیا۔ عقیدۂ توحید کے نکھارنے میں قرآن و حدیث اور سیرت و آثار کے بعد سب سے زیادہ کام مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی کتابوں نے کیا۔

اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و احسان ہے کہ جس درجہ میں ہم ہیں وہاں لادینی باتوں کی جگہ زیادہ تر دین کی باتوں کا ذکر رہتا ہے، ان میں خدا کے وہ عبادت گذار بندے بھی ہیں جو پانچوں وقت کی نماز کے علاوہ تہجد اور اشراق بھی پڑھتے ہیں! جہاز میں کوئی حج کے مسائل کی کتاب پڑھ رہا ہے، کوئی نوافل میں مشغول ہے، کسی کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور لب پر خدا و رسول کا نام! ہر کسی میں دین کا ایک خاص ولولہ پایا جاتا ہے کاش! یہ ولولہ عارضی نہ ہو، بلکہ فطرت، عادت اور سیرت بن جائے! تبلیغی جماعت والے اس نوجوان کی یہ نصیحت کتنی بر وقت اور مناسب تھی:۔

"دوستو! اور بزرگو! نماز کی طرح حج بھی ایک فریضہ ہے، حج ادا کرنے کے بعد یہ فریضہ اتر جائے گا۔ مگر حج کے بعد جب تم اپنے گھروں کو لوٹو تو یہ عہد کرکے لوٹو کہ اب ہماری زندگیاں اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حضورؐ کی سنت کے مطابق بسر ہوں گی! اپنی زندگیوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق بنالو۔"

ان اچھے لوگوں میں سب سے زیادہ سست اور ناکارہ میں ہی ہوں، برسہا برس کی غفلت اور بُری عادتوں کا خمار اُترتے اُترتے ہی اُترے گا، اس مقدس سفر کے لئے جو ذوق شوق اور والہانہ شیفتگی چاہیئے وہ ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ پہلے کے مقابلہ میں حالت بہتر ہے، مگر نماز میں جتنا دل لگنا چاہیئے، اتنا دل نہیں لگ رہا ہے! مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے مضامین زیر مطالعہ ہیں، ان میں حج کے مناسک بھی ہیں اور ضروری تفصیلات بھی ہیں! دعائیں ابھی تک یاد نہیں ہوئیں! شعر و افسانہ سے غیر معمولی شغف رکھنے کے نقصانات کا احساس اب ہوا!

"سفینۂ عرب" چلا جا رہا ہے، عدن پر بھی نہیں ٹھہرا، جہاز کا کپتان انگریز ہے، اور چیف آفیسر ایک جرمن ہے، جو بڑی مستعدی اور فرض شناسی کے ساتھ دیکھ بھال کرتا رہتا ہے، اسے سب سے زیادہ فکر جہاز کی صفائی اور ستھرائی کی ہے، سنا ہے کہ رات میں تین چار گھنٹہ سے زیادہ نہیں سوتا! اگر جہاز روز نہ دھویا جائے اور صفائی پر پوری توجہ نہ دی جائے تو عازمین حجاز کا یہ ہجوم اسے نہ جانے کیا بنا دے، اور کتنی بیماریاں پھوٹ نکلیں!

مسٹر نور خاں جہاز کے پرسر (PERSER) ہیں، وہ مسافروں کی دیکھ بھال کے لئے گھومتے رہتے ہیں۔ صبح و شام میرے کیبن میں آکر حال پوچھتے ہیں، اور بڑی محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں!

ہمارے ساتھ جو پھل تھے، وہ اب ختم ہو رہے ہیں، بیچاروں نے چھ دن تک تو رفاقت کی، اب سفر بھی دو رات اور ڈیڑھ دن کا رہ گیا ہے! کراچی جب ہم واپس ہوں گے، تو آم کی فصل ختم ہو چکی ہوگی، میں نے سیچے کینٹین سے ایک چھوٹا سا آم آٹھ آنے میں مول لے کر کھایا، تبرک کی طرح!

کراچی سے جدہ دو ہزار ایک سو پچہتر ناٹ[عہ] ہے اور کل ۱۰ / جولائی کے صبح ساڑھے سات بجے تک "سفینۂ عرب" ایک ہزار دو سو اکیس ناٹ طے کر چکا ہے! کراچی میں اس وقت ساڑھے نو بجے کا وقت ہوگا! عدن سے شب میں ساڑھے تین بجے کے قریب جہاز گذرا، پہلے لائٹ ہاؤس اور ایک پہاڑی دکھائی دی اور پھر ساحل کے برقی قمقموں کی روشنی! پانچ دن اور چھ راتوں کے بعد زمین کے کچھ آثار نظر آئے، تو دل بے اختیار مچلنے لگا! سمندر میں جب کوئی جہاز آتا جاتا نظر آتا ہے تو خوشی سی ہوتی ہے، شائد اس لئے کہ ذرا سی دیر کے لئے منظر بدل سا جاتا ہے۔

جب تک سمندر گرم اور موجیں بپھری ہوئی تھیں تو لوگ برآمدے میں اس شوق اور اطمینان کے ساتھ نہیں بیٹھتے تھے، جس طرح اب بیٹھتے ہیں، سمندر میں جب سے سکون ہے تو مسافروں میں بھی عجیب چہل پہل نظر آ رہی ہے، بچے عرشہ پر کھیلتے پھر رہے ہیں۔ اور لوگ برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھ کر سمندر کے نظارے میں مصروف ہیں! اگر کوئی سمندر کو اس نظر سے دیکھے کہ یہ "آیت من آیات اللہ" ہے تو یہ نظارہ اپنی جگہ عبادت سے کم نہیں!

ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے، جہاز کے اس دینی ماحول اور مذہبی فضا کا یہ اثر ہے کہ یہاں کے حجام تک پر بھی رنگ چڑھا ہوا ہے، اس نے جس ذوق شوق کے ساتھ اللہ رسول کا ذکر کیا، اس سے میں بہت متأثر ہوا، میں نے جب کہا کہ ڈاڑھی مونڈنے کے بجائے میرا خط بنا دے، تو خوش ہو کر میرے لئے دعائیں کرنے لگا!

آج جولائی کی اُنیس تاریخ ہے۔ اس وقت شام کے چار بجے ہیں، میں کیبن میں بیٹھا ہوا ڈائری لکھ رہا ہوں، بیوی اپنی بڑی بہن کے ساتھ مناسک حج کی کتابیں لے کر ڈیک والی عورتوں کے پاس گئی ہیں، مقصد یہ ہے کہ ناواقف عورتوں کو چھوٹی چھوٹی دعائیں اور حج کے ضروری مسائل یاد ہو جائیں۔

باب المندب اور کامران گذر چکے ہیں، اب ہم بحر قلزم (RED SEA) میں ہیں، یمن کی پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں، موسم غیر متوقع طور پر خوشگوار ہے، اور "سفینۂ عرب" بادِ بہاری کی طرح محو خرام ہے، اب تک کی یہ اطلاع ہے کہ پرسوں دوپہر کو دس گیارہ بجے جہاز جدہ پہونچ جائے گا، یلملم کل کسی وقت آئے گا اور ہم سب احرام پہن لیں گے!

جہاز بھی چل رہا ہے اور وقت بھی! مگر جہاز تو کیا، بجلی بھی وقت کی گردِ پا کو نہیں پہونچ سکتی، پلک جھپکی، اور جگ بیت گئے! لیجئے اکیس تاریخ بھی آگئی، دس بجے کے قریب جہاز نے سیٹی بھی دیدی، یہ اس بات کا اعلان ہے کہ شام کے پانچ بجے تک میٹھے پانی کے نل کھلے رہیں گے، اس عرصہ میں لوگ اطمینان سے نہا دھو کر تیار ہو جائیں، "یلملم" سے رات کو دس بجے گذرنا ہوگا، اور پاکستان سے حج بیت اللہ جانے والوں کی وہی میقات ہے۔

اس عالم میں دو شعر ہوئے ہیں:-

شکر صد شکر کہ احرام کی تیاری ہے + اب کوئی دم میں پہنچتے ہیں یلملم کے قریب
دل کا جو حال ہے میں کس سے کہوں کیسے کہوں + جیسے خورشید جہاں تاب ہو شبنم کے قریب

جناب اسد ملتانی نے بھی فارسی کی ایک غزل شروع کر دی ہے! تین شعر مجھے سنائے:-

---

عہ "ناٹ" تقریباً سوا میل کے برابر ہوتا ہے۔

در بارگاہِ شاہ چو درویش می روم! + نازم بر ایں نیاز کہ از خویش می روم
یا جذبِ التفاتِ کسے می برد مرا! + یا از دو فورِ جوشِ طلب پیش می روم
یا پرتوِ جمالِ خستہ بر دلم اسد
ہمراہ دوستانِ صفا کیش می روم!

اسد صاحب نے اقبال کے چند شعر بھی سنائے ۔

از کلیدِ دین درِ دنیا کشاد + ہم چو او بطنِ اُمِ گیتی نہ زاد!
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش + تختِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
روزِ ہیجا تیغِ او آہن گداز + دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمین تیغِ او + قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغِ او!!

عشقِ رسولؐ اور مقصدی شاعری کا یہ وہ مقام ہے، جہاں اقبال کا کوئی حریف نہیں ۔

موسم بدل رہا ہے، گرمی شروع ہو گئی ہے، لوگ ذوق شوق کے ساتھ نہا دھو رہے ہیں ۔ بہت لوگوں نے ابھی سے احرام پہن لئے ہیں، میرا یہ عزم ہے کہ پانچ بجے کے قریب غسل کروں اور عشاء کی نماز کے بعد احرام باندھوں کہ یہی وقت یلملم کے محاذ سے گذرنے کا ہوگا ۔ کل ان شاء اللہ اس وقت جدہ میں ہوں گے ۔ اور اس کے بعد انوارِ رحمت کے آغوش میں!

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ موسم بدل رہا ہے ۔ گرمی شروع ہو گئی ہے، مگر خود جہاز والے حیران ہیں کہ عدن کے بعد اتنا اچھا موسم کئی سال سے نہیں رہا ۔ سمندر میں کہیں نہ کہیں طوفان سے دوچار ہونے کی توقع تھی، اس سے اللہ تعالیٰ نے بچا دیا ۔ عدن کے بعد سخت گرمی شروع ہو جانی چاہیئے تھی، اس کی بھی نوبت نہیں آئی نہ جانے اس جہاز میں اللہ تعالیٰ کے کتنے مقبول بندے سفر کر رہے ہیں کہ جن کے طفیل ہم جیسے گنہگاروں اور نافرمانوں کو بھی نوازا جا رہا ہے، جس نے بھی کہا ٹھیک کہا :۔

؎ بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

عشاء کی نماز کے قریب میں نے بھی سلے ہوئے کپڑے اتار کر احرام پہن لیا ۔ عشاء کی نماز سب لوگوں نے اسی فقیرانہ لباس میں پڑھی ۔ ادھر امام نے سلام پھیرا اور اُدھر "لبیک اللھم لبیک " کی پُرجوش صداؤں سے سمندر کی فضا میں گونج سی پیدا ہو گئی ۔ کسی کی پچھلی زندگی چاہے کیسی ہی رہی ہو مگر اب تو ہر شخص اللہ تعالیٰ کی محبت میں سر سے پیر تک ڈوبا ہوا ہے ۔ سب کے سروں میں ایک ہی سودا سمایا ہوا ہے ۔ ایک ہی تمنا جو سب کو کشاں کشاں لیئے جا رہی ہے ۔ یک رنگی کی انتہا ہے کہ سارے قافلہ والوں کا لباس بھی ایک ہی جیسا ہے ۔

۲۲ جولائی کی صبح اس طرح طلوع ہوئی کہ حجاز کی پہاڑیوں کو سورج کی کرنیں چوم رہی تھیں ۔ عام سیاحوں کیلئے ان بے برگ و گیاہ پہاڑیوں میں کوئی دلچسپی نہیں، مگر ایک مسلمان کے لئے ان میں سب کچھ ہے ۔ کشش، محبت، عقیدت اور جاذبیت و تقدس کے جتنے عنوان ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب ان چٹانوں اور سنگ پاروں

میں پائے جاتے ہیں۔

صبح کا ناشتہ ہو چکا ہے، جہاز کے سب مسافر خوشی خوشی اپنا سامان باندھ رہے ہیں، بس اب کچھ دیر بعد جدہ کا بندرگاہ آیا ہی چاہتا ہے۔ جن کو زندگی میں پہلی بار اس سفر کی سعادت نصیب ہوئی ہے ان کے شوق کا کچھ اور ہی عالم ہے۔

دوپہر کا کھانا وقت سے قبل ہی دیدیا گیا، دس بجے سے پہلے پہلے ہم کھا پی کر فارغ ہو گئے، جہاز والوں نے بڑی بھلمنسابت کا ثبوت دیا ورنہ بندرگاہ سے اترتے ہی کھانے کے لئے دوڑنا پڑتا اور یہ ذرا سی بات اس سفر کا ایک خاصہ مشکل مرحلہ بن جاتی۔

جدہ بھی آگیا، جہاز نظر آرہے ہیں اور لائٹ ہاؤس کی قطاریں بھی! جہاں سمندر میں چٹانیں اگی ہیں وہاں پانی اُتھلا ہے اس لئے اُس جگہ خطرے سے بچنے کے لئے لائٹ ہاؤس بنا دیئے گئے ہیں! جہاز کے ملازمین نے ساحل پر مسافروں کو اُتارنے کے لئے سیڑھیاں تیار کر رکھی ہیں، جدہ کے ساحل سے ایک دُخانی کشتی بہت تیزی کے ساتھ دوڑتی ہوئی چلی آرہی ہے، جہاز کے قریب لانچ آکر رُکی اور اس میں سے ایک بھاری بھرکم عرب لنگی ہوئی سیڑھیوں پر جلد جلد چڑھ کر "سفینۂ عرب" میں آگیا۔ یہ پائلٹ ہے ابندرگاہ تک، جہاز کو یہی شخص لے کر جائے گا، کپتان کی ذمہ داری تھوڑی دیر کے لئے ختم ہوگئی۔

گیارہ بج چکے ہیں، توقع ہے کہ اب کوئی دم میں جدہ کے ساحل پر پہونچ جاتے ہیں، مگر جہاز تھوڑی دُور چل کر رُک گیا، مسافروں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، کوئی کہتا ہے کہ کسٹم والوں نے جہاز کو رُکوایا ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ سعودی حکومت کے ڈاکٹر کے حکم سے یہ ہوا ہے، مگر ایک جہاز کے افسر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بندرگاہ پر ایک وقت میں دو جہاز سے زیادہ لنگر انداز نہیں ہو سکتے، حاجیوں کے کئی جہاز دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے کھڑے ہیں، اُن جہازوں کے مسافر اتر جائیں گے تو کہیں جاکر "سفینۂ عرب" کی باری آئے گی!

انتظار کا یہ وقت بھی کسی نہ کسی طرح گذر ہی گیا، تین بجے ہمارا جہاز ساحل پر جا کر لگا، اور کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد ہم جہاز سے اُتر کر موٹر بس میں سوار ہو گئے! سرزمین حجاز پر پہلا قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ ہم مسافر اور غریب الوطن کا ہے کو ہیں اللہ تعالیٰ نے مدت کے بعد اپنے اصلی وطن میں ہم آوارگان غربت کو پہونچا دیا ہے، یہاں کی ایک ایک چیز پر تنقیدی نہیں محبت آمیز نگاہیں پڑ رہی ہیں۔

جدہ میں

ساحل پر عرب قلیوں کا ہجوم ہے، ان کی عربی بول چال میں کتنی نغمگی اور دل کشی ہے، اپنی غفلت اور جہالت پر افسوس ہو رہا ہے کہ جس زبان کا سیکھنا ہمارے لئے سب سے زیادہ ضروری تھا اس پر سب سے کم توجہ دی گئی نہ دینے کے برابر! پورٹ پر موٹریں قطار در قطار کھڑی ہیں، بعض معلمین اور ان کے کارندے بھی آگئے ہیں، پاکستانی سفارت خانہ کا عملہ بھی اپنی حکومت کے حاجیوں کی پیشوائی کے لئے موجود ہے!

موٹر بس نے ایک بہت بڑے شیڈ کے قریب جاکر اُتار دیا، یہاں پاسپورٹ کی دیکھ بھال

ہوئی، حجاج کی دور تک لائن لگی ہوئی ہے۔ مگر یہ کام ذرا سی دیر میں ہو گیا، سعودی حکومت کے عمال کو بڑی پھرتی، تیزی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ کام کرتا ہوا پایا! اس کے بعد معلمین کے نام پوچھے گئے اور پاسپورٹ لے لئے گئے۔

اب ہم ایک ایسے چوڑے شیڈ میں آ گئے جس کا رقبہ دو ڈھائی فرلانگ سے کم نہ ہوگا، سامان رکھنے اور بیٹھنے کے لئے لانبے لانبے چبوترے، بجلی کے پنکھے، خوبصورت سائبان، صاف ستھرا فرش، میٹھے پانی کے نل!

بندرگاہ سے مسافروں کا سامان لاریوں میں آ رہا ہے، اور قلی اتار اتار کر فرش پر ڈالتے جاتے ہیں، اس انبار میں اپنے اپنے سامان کا تلاش کرنا خاصہ صبر آزما مرحلہ ہے! مگر اس مرحلے کو بھی ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے آسان بنا دیا، قلی نے سامان کے کئی عدد تو خود ہی ڈھونڈ کر ہمارے پاس پہونچا دیئے، باقی سامان بھی تھوڑی دیر میں آ گیا، بعض لوگوں کے ٹرنک اور کنستر سامان میں دب کر پچک گئے، کسی کے ڈبہ سے گھی بھی ٹپکنے لگا، مگر اللہ کے فضل سے ہمارا سامان صحیح سلامت اور ثابت تھا!

اب سامان کی دیکھ بھال شروع ہوئی، کسٹم والوں نے ہمارے ٹرنکوں اور کنستروں کو دیکھا، مگر بڑی خوش اخلاقی اور نرمی کے ساتھ! کراچی میں لوگوں نے ہمیں ڈرا دیا تھا کہ جدہ کے بندرگاہ پر کسٹم والے اس طرح بے ترتیبی کے ساتھ کھول کر دیکھتے ہیں کہ سارا سامان تتر بتر ہو جاتا ہے، مگر ہمیں تو شائستگی اور خوش خلاقی ہی کا تجربہ ہوا!

یہاں سے ہم "مدینۃ الحجاج" میں پہونچے، پندرہ بیس منٹ میں موٹر بس نے وہاں پہونچا دیا، عام طور پر مشہور ہے کہ قیامت میں لوگ اپنی ماؤں کے نام سے پکارے جائیں گے، اسی طرح حج کے موقعہ پر حجاج کا تعارف ان کے وکیلوں کے ناموں سے ہوتا ہے، موٹر بس رکی ہی تھی کہ وکیلوں کے نام پکارے اور دریافت کئے جانے لگے، ہم نے "عبدالہادی سکندر" کہا، اور اس کے بعد ہمیں ایک شخص قیام گاہ پر لے کر چلا گیا، ہر حاجی کے لئے وکیل کا نام بتانا ضروری ہے، جس شخص کا کوئی وکیل نہیں ہوتا اس کا وکیل خود حکومت مقرر کر دیتی ہے، بہرحال حج میں کسی نہ کسی کی "وکالت" ناگزیر ہے، وکیل سے کسی صورت مفر نہیں۔

جدہ میں زائرین کی قیام کے لئے بہت سی بارکیں بنی ہوئی ہیں، انھیں بارکوں کو "مدینۃ الحجاج" کہتے ہیں، بجلی کی روشنی کا انتظام ہے، مگر پنکھے نہیں ہیں، میٹھے پانی کے بہت سے نل لگے ہوئے ہیں، بیت الخلاء بھی کافی تعداد میں ہیں، اور ان کی جلد جلد صفائی ہوتی رہتی ہے، ہمیں جس بارک میں جگہ ملی اس میں کم و بیش پچاس دوسرے لوگ بھی ہیں، اور وہ بھی مع سامان کے! ہمارا سامان ایک طرف کونے میں جما ہوا ہے، اب کی بار ہمارا سامان کسٹم آفس سے جو لاریوں کے ذریعہ مدینۃ الحجاج آیا ہے تو المونیم کے دو تین برتن پچک گئے ہیں اور ہمیں ذرا سا بھی شکوہ نہیں ہے، سیکڑوں ٹرنکوں اور بے شمار کنستروں اور بوریوں کے اتارنے چڑھانے اور لانے لے جانے میں المونیم کے برتن اگر پچک جائیں تو یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے بلکہ یہ تو مقام شکر ہے کہ اس ہنگامہ میں کوئی عدد گم نہیں ہوا۔

جدہ کی جس بارک میں چوبیس گھنٹہ ہمیں قیام کرنا ہے، اس میں جگہ کم ہے، اور مسافر زیادہ ہیں، دروازے تک جانے کے لئے راستہ تک نہیں چھوڑا، جس کو جہاں جگہ ملی بس بستر جما کر دراز ہو گیا، یہاں ہمارے رفیق سفر

زیادہ تر بنگالی مسلمان ہیں!

مدینۃ الحجاج میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہے، جو مسافر کل آچکے ہیں وہ آج جا رہے ہیں، ان کی لاریاں تیار کھڑی ہیں سامان چڑھایا جا رہا ہے، "سفینۂ عرب" سے جو ڈیڑھ ہزار کے قریب زائرین آئے ہیں، انھوں نے ان بارکوں میں اچھی خاصی بستی بسادی ہے، دوسرے ملکوں کے زائرین بھی آرہے ہیں، سب سے زیادہ تعداد سوڈانی مسلمانوں کی آئی ہے، ان کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی اور وہ اس لئے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے خادم خاص حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ان کی رنگت ملتی ہوئی ہے، عقیدت اور محبت میں "نسبتوں" کو بہت کچھ دخل ہے،

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

بارکوں کے سامنے جو راستہ ہے اس پر بھی زائرین نے سفری پلنگ، چٹائیاں اور بستر جمالئے ہیں، ہر کوئی آرام، کھلی ہوئی فضا اور ہوا چاہتا ہے۔ شب میں کھانا بازار سے مول لیا، اور وہ اس طرح کہ روٹیاں نان بائی کے یہاں سے اور سالن ایک ہوٹل سے خریدا، میں برتن ساتھ نہیں لے گیا تھا، مگر ہوٹل والے نے مجھ پر اعتبار کیا اور سالن کے ساتھ برتن دے دیا، جسے میں نے کھانا کھانے کے بعد واپس کر دیا۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

کراچی میں اسٹیٹ بینک سے جب "حج نوٹ" ملے تھے تو کہا گیا تھا کہ سو روپے کے شاید بچانوے چھیانوے ریال ملیں گے، مگر یہاں سو کے ایک سو سات ریال ملے، ریال یہاں کا چاندی کا سکہ ہے ہمارے سو روپیہ کے قریب برابر ہے، ایک ریال میں بائیس قرش ہوتے ہیں، چونی (ربع ریال) اور "نصفی" (نصف ریال) بھی ہوتی ہے، سب سے چھوٹا سکہ "حلل" ہے، جسے یہاں کا پیسہ سمجھئے!

یہاں چائے خانوں کے سامنے تخت دار بنچیں سی پڑی رہتی ہیں، جنہیں "کرسی القہوہ" کہتے ہیں، یہ کھجور کی رسی سے بنی ہوئی ہوتی ہیں، ان پر بیٹھ کر حقہ اور قہوہ بھی پیتے ہیں، اور سونے کے کام بھی آتی ہیں، یہ بڑی آرام دہ چیز ہے، ہم نے رات کو سونے کے لئے تین کرسیاں "تین ریال" میں کرایہ پر لیں، رات کو خوب نیند آئی، جیسے کوئی گھوڑے بیچ کر سوتا ہے! ہم باہر سو رہے ہیں اور سامان بارک میں رکھا ہے، مگر سامان کی طرف سے بے فکری ہے کہ یہ سعودی حکومت ہے، جہاں شرعی سزائیں نافذ ہیں، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اس لئے یہاں چوریاں شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں، چوروں اور اچکوں کے وہ ہمدرد جو "قطع ید" پر وحشیانہ سزا کی پھبتی کسا کرتے ہیں ذرا یہاں آکر دیکھیں، یہ شرعی حدود کی برکت ہے کہ سعودی حکومت میں رات کے وقت ایک بڑھیا سونا اچھالتی پھرتی ہے اور اسے کوئی آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔

صبح کی نماز اسی "کرسی القہوہ" پر پڑھی، سرزمینِ حجاز پر یہ پہلی صبح طلوع ہوئی ہے، دن خوب چڑھ گیا تو ناشتہ کی فکر ہوئی، ہوٹل سے جا کر ایک ریال میں ایک "مُطبّق" مول لیا، یہ عرب کی خاص چیز ہے یوں سمجھئے کہ میدے کا پراٹھا سا ہوتا ہے، جس میں انڈے ڈال کر گھی سے سینکتے ہیں، "مطبق" نمکین اور میٹھا دونوں طرح کا ہوتا ہے، میٹھے مطبق میں کیلے کی چھلی ہوئی پھلیوں کے ٹکڑے بھی ڈالتے ہیں، یہ فرائی پان پر گھی سے سینکا جاتا ہے اور کافی لذیذ

ہوتا ہے۔

حجاج کے ٹھہرنے کی جو بارکیں بنی ہیں ان کے قریب ہی ایک شاندار مسجد تعمیر ہو رہی ہے، مسجد قریب قریب بن چکی ہے، صرف فرش اور مینار بننا باقی ہے۔ کیا عجب ہے کہ ہمارے جدہ کی واپسی تک تعمیر مکمل ہو جائے!

"مدینۃ الحجاج" کے آس پاس بہت سے ہوٹل، قہوہ خانے اور ریسٹوران ہیں، دھڑا دھڑ بکری ہو رہی ہے۔ ہوٹل والوں کی چاندی ہی چاندی ہے، چیزوں کی منہ مانگی قیمت ملتی ہے، حیل حجت کا موقع ہی نہیں ——— میں گذشتہ سال بیمار ہو کر جب جناح ہسپتال میں داخل ہوا تھا تو چائے اور دودھ گرم کرنے کے لئے ایک چولھا (STOVE) خرید لیا تھا، یہی چولھا اس سفر میں ساتھ لے لیا، مگر جدہ میں یہ دشواری پیش آئی کہ اسپرٹ نہیں ملتی، چولھا جلے تو کیسے جلے، اور زبان کا چٹخارہ بار بار شوق کو ابھار رہا ہے کہ دوپہر کا سالن "خانہ ساز" ہونا چاہئے، میں رُبع ریال کی لکڑی بھی مول لے آیا، بہت سے بہت سیر بھر ہوں گی، مگر اتنے میں ایک دوکاندار نے ہماری بے چارگی پر ترس کھا کر اپنے اسٹوو پر دال کی دیگچی چڑھا دی!

ایک صاحب سے جدہ شہر میں ملنا تھا وہاں جانے کے لئے بڑی سڑک پر پہونچا تو کرایہ کی ایک خالی ٹیکسی شہر کی طرف جاتی ہوئی نظر آئی، میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکا، رُک گئی، اور تقریباً چار آنہ (رُبع ریال) میں مجھے جدہ شہر پہونچا دیا، شہر کا کچھ حصہ گھوم پھر کر بھی دیکھا، بازار سامان سے پٹے ہوئے ہیں، ریشمین قالینوں کو دیکھ کر جی للچایا، ایک دوکان پر قالین کی قیمت بھی پوچھی ——— "ستین ریال ———" دوکاندار نے جواب دیا ——— میں کچھ کہے بغیر وہاں سے چلدیا، حج سے فارغ ہو کر صحیح اندازہ ہوگا کہ ہمارے پاس کتنی رقم بچی ہے اور اس میں کیا کیا چیز مول لی جاسکتی ہے، ابھی خرید و فروخت کا موقع کہاں ہے اشد یہ ضرورت کی چیز بیکہ کرمہ میں خریدی جائیں گی، چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں۔

جدہ کا بازار مُسقّف ہے، دوکانیں پرانے انداز کی بنی ہوئی ہیں، مگر ان میں سامان جدید ترین ہے، بازار کے قریب جدہ کے کسی امیر کبیر کا ایک مکان نظر آیا، بہت اونچا، وسیع اور خوبصورت! لکڑی کا کام زیادہ تھا اندر کا حال نہیں معلوم کہ کیا ٹھاٹ باٹ ہیں، مگر دور سے تو یہ قصر دکھائی دیتا ہے! اس ڈزائن کے مکانات ہندوستان اور پاکستان میں کہیں نہیں بنتے!

جدہ میں جو نئی عمارتیں بن رہی ہیں وہ اپنی دیدہ زیبی، جدت اور تنوع کے اعتبار سے دیدنی ہیں، بعض عمارتیں تو کلکتہ، بمبئی اور کراچی کی اچھی عمارتوں کو آئینہ دکھاتی ہیں، مغربی تمدن بڑی تیزی کے ساتھ لباس، موٹر، ریڈیو، سامان آرائش، موٹروں اور کارخانوں کے ذریعہ اپنے قدم جماتا جا رہا ہے دیکھئے یہ ڈرامہ کیا سین دکھاتا ہے! عرب کی سادگی پر مغربیت نے خدانخواستہ فتح پالی تو یہ سودا بہت مہنگا پڑے گا، اور یہ بڑے ٹوٹے کی تجارت ہوگی، صورت یہ ہے کہ امریکہ والے کروڑں روپیہ جو پیٹرول کی قیمت ادا کرتے ہیں، اس قیمت سے کافی حصہ کا سامان بھی یہاں بھیج دیتے ہیں، فیشن کی کونسی چیز ہے جو حجاز میں نہیں ملتی، اس فتنہ کی روک تھام نہ ہوئی تو عرب اسی طرح سر بکچہ کر دیں گے

جس طرح وہ انگریزوں سے دوستی اور ترکوں سے بغاوت کرکے آج تک رو رہے ہیں۔

عصر کی نماز کے بعد مکہ مکرمہ جانے کے لئے ہم لاریوں میں بیٹھ گئے! صبح تک یہ اطلاع تھی، کہ مغرب کی نماز ان شاء اللہ حرم میں پڑھیں گے، مگر یہاں تو روانگی بر مغرب ہوئی، اور مدینۃ الحجاج سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر جاکر موٹر بس رک گئی۔ یہاں پیٹرول کمپنی کی طرف سے چیکنگ ہوتی ہے! مغرب کی نماز کمپنی کی اسی عمارت میں سب لوگوں نے باجماعت ادا کی۔

جب ہماری لاری "مدینۃ الحجاج" کے بڑے دروازے سے گذری تھی تو سعودی حکومت کے ایک افسر نے پائیدان پر چڑھ کر مسافروں سے پوچھا کہ آپ لوگوں کا سامان آگیا! کسی کو کوئی شکایت تو نہیں ہے؟ اس اتنی سی پرسش حال پر لوگوں کی کیسی ڈھارس بندھی ہے!

لاری میں ایک نوعمر بنگالی ہمارا ہمسفر ہے پست قد، دبلا پتلا، مسیں بھیگ رہی ہیں، عربوں کا سا لباس پہن رکھا ہے، اور بشرے سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنے کو مسافروں میں سب سے زیادہ ہوشیار، عقلمند، اور ذہین سمجھتا ہے، دخل در معقولات کی عادت ہے! اسی شخص کی وجہ سے پاسپورٹوں کے شمار کرنے میں گڑبڑ ہوگئی اور ایک گھنٹہ اسی کام میں لگ گیا، پیٹرول کمپنی کے قریب لاری جاکر رکی تو جلدی سے اتر کر کمپنی کے دفتر میں جا پہونچا۔ ہمارے معلم مولوی عبدالہادی سکندر کے صاحبزادے عبدالباقی صاحب کہہ رہے ہیں کہ یہ شخص عربی کا ایک لفظ نہیں جانتا اور عربی لباس پہن رکھا ہے، مجھے ڈر ہے کہ اپنی دخل در معقولات کی عادت کے سبب یہ کہیں پکڑا نہ جائے! اس کی حرکتیں دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کہا بھائی خدا کے لئے ہمارے حال پر رحم کر، ہمیں مکہ پہنچ جانے دے، اپنی ہوشیاری پھر کسی اور دن جتا لینا!

مکہ مکرمہ میں

مغرب کے بعد جدہ سے روانہ ہو پائے، اب ہم رات کو کسی وقت جاکر مکہ مکرمہ پہونچیں گے، مکہ میں دن کے وقت داخلہ افضل ہے، مگر ہم بس کے ہاتھوں بے بس ہیں، جدہ کی عمارتوں کا سلسلہ بھی کئی میل تک چلا گیا ہے، سڑک بہت اچھی ہے تھوڑی تھوڑی دور پر مکہ معظمہ سے موٹر کاریں اور لاریاں آتی ہوئی ملیں، سب لوگ بلند آواز سے تلبیہ پڑھ رہے ہیں، ہر کسی پر ذوق و شوق کا عالم طاری ہے۔ تقریباً سوا گھنٹہ کی مسافت پر جاکر "بحرہ" کی بستی آئی اور لاری روک دی گئی، یہاں قعباقی نذر کا بہت بڑا چائے خانہ ہے نصف گھنٹہ تک لاری رکی رہی ڈرائیور اور دوسرے مسافروں نے چائے، برف کا پانی، اور کوکا کولا پیا کسی کسی نے کھجوریں بھی مول لیں! راستہ میں یہ سستانا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا، ہر مسافر کی یہ تمنا تھی کہ جلد سے جلد مکہ مکرمہ پہونچ جائے، مگر رزق کے دانہ دانہ کی طرح وقت کے ایک ایک دقیقہ پر بھی آمد و رفت اور سفر و قیام کی مہر لگی ہوتی ہے کوئی چاہے کتنا ہی بے چین اور مضطرب کیوں نہ ہو وقت سے پہلے کوئی کام ہو نہیں سکتا۔

موٹر بس چلنے سے پہلے ایک تقریر فرمائی گئی کہ ڈرائیور صاحب آپ سب لوگوں کو حج کی مبارکباد دیتے ہیں اور اپنا حق مانگتے ہیں، مسافروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، آخر کار یہی طے پایا کہ سب لوگ کچھ نہ کچھ دے کر پاپ کاٹ دیں، اس طرح غالباً کئی ریال ڈرائیور کو مل گئے۔

اب ہم مکہ مکرمہ سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں، تمام لوگ احرام پہنے ہوئے ہیں اور بڑے ذوق شوق کے عالم میں تلبیہ پڑھ رہے ہیں:۔

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ

(میں حاضر ہوں اے اللہ: تیرے حضور میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، ساری تعریفیں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں، اور ملک اور بادشاہت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں)

لیجئے حدود حرم سے بھی کچھ آگے نکل آئے۔ تلبیہ پڑھتے میں آنکھیں بھی زبانِ اشک سے لے میں لے ملا رہی ہیں، مکہ کے قریب کے میدان اور پہاڑیوں کو دیکھ کر بار بار یہ خیال آرہا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ادھر سے ضرور گذرے ہوں گے کیا عجب ہے ان وادیوں میں سرکار نے بکریاں بھی چرائی ہوں، نہ جانے اس سرزمین کے کون کون سے قطعے ہیں جو حضورؐ کی پابوسی کے شرف کو اپنی جبینوں اور سینوں میں محفوظ کئے ہوئے ہیں۔

مکہ کی آبادی آگئی، رات کا وقت ہے، ایسے میں جو ٹیلہ، جو پہاڑی اور جو مکان بھی نظر آتا ہے، عقیدت کہتی ہے کہ اُسے دل میں اُتار لیجئے، یہ لندن اور پیرس نہیں، مکہ مکرمہ ہے، یہ بلد امین ہے، ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام دونوں باپ بیٹوں نے اسی مقدس سرزمین پر کعبہ کی بنیادیں اُٹھائی تھیں، اور اس پاک اور مبارک شہر کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ یہ انسانیت کے محسن اعظمؐ دنیا کے سب سے بڑے آدمی اور نبیوں کے خاتم محمد عربی (فداہ ابی وامی) کا مولد ومنشا رہے! زمانہ کی قدر ناشناسی اور دنیا کی غفلت کے ہاتھوں انسانی مجد وشرف کی تاریخ یا تو لوگوں نے بھلا دی تھی یا پھر اُسے مسخ کر دیا تھا ــــــ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ انسانیت کی تاریخ کا پہلا ورق اسی سرزمین پر مرتب ہوا، اسی شہر سے حق کی وہ آواز بلند ہوئی جس نے باطل کے جسم میں تھرتھری پیدا کردی۔ یہ تاریخی شہر نہیں بلکہ خود "تاریخ ساز" شہر ہے، اس شہر پر تاریخ کا ذرہ برابر بھی احسان نہیں ہے، بلکہ خود تاریخ پر اس شہر کا احسان ہے، تاریخ اس شہر کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے، اگر تاریخ سے "مکہ" کو نکال دیا جائے تو پھر تاریخ میں رہ کیا جائے گا!

مکہ مکرمہ کی آبادی میں دس بجے پہونچ گئے، مگر معلّمین کے مکانوں پر زائرین کے سامان اُتارے جانے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے تو رات کے تین بج گئے، سب کے بعد ہمارا نمبر آیا، جلد جلد وضو کرکے عشاء کی نماز معلّم کے مکان پر پڑھی، عجلت اس بات کی تھی کہ حرم شریف میں جلد سے جلد حاضری ہوجائے!

مطوف آگے آگے ہے اور ہم حرم شریف کی طرف جا رہے ہیں:۔

پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود!
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

"باب السلام" سے داخل ہوا اور بیت اللہ پر نگاہ پڑتے ہی زبان پر تکبیر جاری ہوگئی:۔

"اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر"!

جلال وہیبت اور جبروت و اُبہت کا سامنا ہے، ایک عالمِ گو مگو اور ایک کیفیتِ بے نام ہے جو طاری ہوتی چلی جارہی ہے!

محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی بارگاہ میں
اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

یا اللہ میں کہاں آگیا! یہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں! مجھ سا پلید اور حرمِ مقدس میں! مجھ سا خطا کار، گناہگار اور معصیت سرشت اُس مقام پر جہاں ہر زمانہ کے اتقیاء و صلحاء، پاکبازوں اور نیکوکاروں نے سجدے اور طواف کئے ہیں! یہ پیروں سے نہیں سر کے بل چلنے کا مقام ہے، یہاں کا جتنا بھی احترام کیا جائے تھوڑا ہے، ہمہ شما کا کیا ذکر ہے اللہ کے جس گھر کا خود حضور سید المرسلین خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طواف کیا ہو، جہاں حضورؐ نے نمازیں پڑھی ہوں، اور رو رو کر دعائیں مانگی ہوں، وہاں مجھ جیسے نابکار کی حاضری ایک معجزے سے کم نہیں، اور اللہ تعالیٰ جب فضل فرماتا ہے، تو ایسے معجزے ظہور میں آتے رہتے ہیں!

کہاں بلایا گیا ہوں ———— العظمۃ للہ!

کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

اور

اک اک قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیئے

جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو نصیب اسی طرح جاگا کرتے ہیں اور حقیر ذرّوں کو درخشانی اور ذلیل خاروخس کو رعنائی دی جاتی ہے۔ داتا جب دینے پر آئے تو آگے کون روک سکتا ہے، اس کی جود و عطا ہم دنیا والوں کے قانون اور ضابطہ کی پابند نہیں ہے! کون کہہ سکتا ہے کہ اس شہنشاہِ حقیقی کے دربار سے کس کو کیا دے کر نوازا جاتا ہے، جو انسان نفس اور روح کی ماہیت کو نہ سمجھ سکا اور خود اپنے جذبات اور محسوسات کا تجزیہ نہ کر سکا وہ اللہ تعالیٰ کے اسرار کی پرچھائیں کو بھی بھلا پا سکتا ہے! بندے کا کام صرف سمع و اطاعت ہے، اسرار و غیوب کے حجابات اٹھانے کی فکر میں لگے رہنا بندے کا منصب ہی نہیں ہے!

اب ہم اس مقام (بیت اللہ) کا طواف کر رہے ہیں، جس کی طرف ساری عمر نمازیں پڑھی ہیں اور بچپن میں کعبہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر قسمیں بھی کھائی ہیں، خوش قسمتی سے وقت ایسا ملا کہ شمع کے گرد پروانوں کا بہت زیادہ ہجوم نہیں ہے، اس لئے حجرِ اسود کے چومنے کا موقعہ بھی تھوڑی سی جد وجہد کے بعد مل گیا، حجرِ اسود پر نگاہ پڑتے ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ کا وہ قول یاد آگیا کہ "اے اسود تو بس ایک پتھر ہے، تو نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع! میں تجھے اس لئے چومتا ہوں کہ حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چومتے ہوئے دیکھا ہے۔" ———— اسلام کا یہی وہ مقامِ توحید ہے جہاں دوسرے مذاہب گردِ منزل اور غبارِ راہ نظر آتے ہیں! توحید کے معاملہ میں اسلام جذب و شوق کے کسی تقاضے کے لئے ذرا سی بھی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہے! غلط کہتے ہیں جو بھی کہتے ہیں کہ عشق شریعت کے حدود توڑ دیتا ہے، اس قسم کا عشق سنیاسیوں اور بیراگیوں کے یہاں مقبول ہو سکتا ہے، مگر اسلام میں ٹھکرا دینے کے قابل ہے!

یہ رکنِ عراقی ہے، یہ رکنِ شامی اور رکنِ یمانی ہے، یہ حطیم ہے یہ میزابِ رحمت ہے، یہ مقامِ ابراہیم ہے، یہ بابِ کعبہ ہے، یہ ملتزم ہے ———— یا اللہ کیا کروں کیا نہ کروں، مجھ سے تو کسی ایک مقامِ تجلی کی تعظیم کا تھوڑا سا حق بھی ادا نہیں ہو رہا ہے، یہاں تو ہر بُنِ مُو کو سراپا محویت و استغراق ہو جانا چاہیئے تھا۔ خدانخواستہ میں منافق تو نہیں ہو گیا؟ اے میرے پتھر دل خدا کے لئے نرم ہو جا، پگھل اور اِتنا پگھل کہ غلافِ کعبہ پر تیرے خون کی سُرخی نظر آنے لگے، ارے کمبخت! اس سے زیادہ خشیت و تواضع اور توجہ الی اللہ کی گھڑی اور کب آئے گی، اے غفلت کوش اور غفلت شعار! یہاں بھی اگر بیدار نہ ہوا تو پھر تیرے لئے بدتر موت ہے!

اے میرے دل خدا کے لئے چونک! اور دل چونکنے لگا، اے میری آنکھو! اللہ کا واسطہ دیتا ہوں آج آنسو بہانے میں کمی نہ کرنا، اور آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے، ملتزم پر پہونچ کر اللہ کا فضل ہے کہ آنکھوں نے دل کا بہت کچھ غبار دھو دیا، ان لمحوں کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی! دُعا نہیں دُعائیں کیں، دیر تک، بہت دیر تک، ملتزم سے چمٹ کر، غلافِ کعبہ کے سایہ میں، توبہ استغفار، عفو و رحمت کی طلب، آئندہ اچھی زندگی گذارنے کا عہد و پیمان، اپنے لئے اور ماں باپ کی مغفرت کے لئے، عزیزوں اور دوستوں کے لئے، اسلام کی عزت و شوکت کے لئے دُعائیں ———— ! کیا عجب ہے کہ اللہ کی رحمت میرے بھکاریوں جیسے عجز و تذلل اور مجرموں جیسی ندامت و بدحواسی کو دیکھ کر مسکرا دی ہو۔

ملتزم کے بعد حطیم میں پہونچ کر میزابِ رحمت کے سایہ میں دُعا کی، پھر چاہِ زمزم پر آئے اور خوب سیر ہو کر زمزم پیا اور سر پر بھی ڈالا، علمِ نافع اور رزقِ واسع کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور درخواست کی، یہاں سے چل کر مسعیٰ پہونچے، صفا اور مروہ کے درمیان لوگ بڑے ذوق شوق کے ساتھ سعی کر رہے تھے!

"اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰہِ"

یہ وہی "صفا" ہے، جس پر چڑھ کر حضور نے قریش کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تھی، اسی صفا اور مروہ کے درمیان حضرت ہاجرہ اپنے اکلوتے بچے اسمٰعیل (علیہ الصّلوٰۃ والسلام) کے لئے پانی کی تلاش میں سات مرتبہ آئی گئیں، اُن کی یہ سعیٔ اضطراب اللہ تعالیٰ کو پسند آ گئی، یہاں تک کہ وہ حج کے ارکان میں شامل کر لی گئی!

صفا اور مروہ کے درمیان سات بار سعی کرنے کے بعد، مروہ کے قریب ہی ایک ریسٹوران میں لوہے کی کرسیوں پر بیٹھ گئے، پیاس بھی تھی اور تکان بھی، ہم نے وہاں خنک و شیریں شربت پیا، ہوٹل والے سے زیادہ یہاں کے حجام مصروف تھے، سروں کا حلق و قصر کرانے والوں کا ہجوم تھا، مگر مطوف کی کوشش سے میری باری جلد آ گئی! والد مرحوم بچپن میں میرے سر کے تمام بال منڈوا دیا کرتے تھے! چودہ پندرہ سال کی عمر تک یہی صورت رہی کہ مہینہ میں ایک بار مجھے سر گھٹانا پڑتا! پھر میں نے ہائی اسکول میں دوسرے طلباء کی دیکھا دیکھی انگریزی بال رکھ لئے! اور وہ اس تدریج کے ساتھ کہ سب سے پہلے میں نے کنپٹیوں سے کچھ اوپر تک انگریزی انداز میں بال ترشوائے، میں نے دیکھا کہ والد مرحوم نے مجھے نہیں ٹوکا تو پھر میں نے پورے سر کے بالوں کو "فرنگی" بنا دیا، تقریباً تیس سال کے بعد حج کی بدولت اس "افرنگیت" سے جسے میں اپنے سر پر لئے پھرتا تھا نجات ملی! مسعیٰ سے چلے تو حرم شریف سامنے تھا، صبح کی نماز کے لئے لوگ تیاریاں کر رہے تھے، ہم نے بابِ الجہاد پر تازہ وضو کر کے صبح کی نماز حرم میں ادا کی۔

سید محمد حسنی

حسن البنّاؒ عہدِ طفولیت میں!

"حسن البناؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں: ہند و پاک کے علمی و دینی حلقے کسی نہ کسی حد تک ان کے نام و کام سے واقف ہیں، اگرچہ یہ واقفیت بہت ناقص اور مجمل ہے، بعض حالات کی بنا پر مجھے ان کی محبوب و دلکش شخصیت کا کچھ تفصیل سے مطالعہ کا موقع ملا اس سلسلہ میں ایک مضمون "فاران" میں شائع ہوا، لیکن جب ان کے عہد طفولیت پر نگاہ گئی تو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی دعوتی زندگی سے زیادہ حیرت انگیز، عبرت خیز اور سبق آموز ہے۔ اس سلسلہ میں چند سطریں حاضر ہیں: امید ہے کہ دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہونگی۔" م حسنی

حسن البنا کا خاندان مصر کے ایک قصبہ "محمودیہ" میں آباد تھا، اس زمانہ میں مصر پر تصوف کا اثر بہت تھا، جگہ جگہ صوفیہ اور مشائخ پھیلے ہوئے تھے۔ اور اپنے مخصوص طریقوں پر تزکیہ و تربیت کا کام انجام دے رہے تھے، یہ لوگ اکثر اپنی نیتوں میں مخلص تھے لیکن مادیت کے اس بحران سے بالکل بے خبر اور وقت کے تقاضوں سے ناواقف، حسن البنا کی عمر ۸ برس کی تھی جب وہ ایک معمولی مکتب "مدرسۃ الرشاد الدینیہ" میں داخل ہوئے، جہاں ان کو اچھے مشفق اور دیندار استاد ملے، یہاں انھوں نے ۵ سال تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ۱۲ سال کی عمر میں ایک دوسرے ابتدائی مدرسہ "مدرسۃ الاعدادیہ" میں نام لکھایا، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حسن البنا کی دعوتی زندگی کی خشت اوّل اسی مدرسہ میں رکھی گئی، یہاں انہوں نے طلبار کی ایک انجمن بنائی جس کا نام تھا "جمعیۃ الاخلاق الدینیہ" اسکا مقصد یہ تھا کہ نماز کی تلقین کرے، جو نماز نہ پڑھے اس پر جرمانہ لگائے، گالی بکنے پر جرمانہ وصول کیا جائے۔ اس جماعت کے اوّل و آخر اور روح رواں حسن البنا تھے، ان کی دینی غیرت و حمیت اور حق گوئی و جرأت اسی روز ظاہر ہوگئی جب دریائے نیل کا ایک اسٹیمر بندرگاہ پر آکر رکا، اس پر ایک برہنہ اسٹیچو تھا، قریب ہی مرد و عورت پانی بھر رہے تھے، اس وقت ان سے بالکل نہ رہا گیا، اور انہوں نے کسی طرح کوشش کرکے یہ اسٹیچو وہاں

سے ہٹوا دیا، یہ یاد رہے کہ یہ حسن البنّا کی طالب علمی کا زمانہ ہے اور ان کی عمر زیادہ سے زیادہ ۱۲ سال ہے۔
اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے حسن البنّا کی عجیب و غریب شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

محلہ کی مسجد میں جیسا عام طور قاعدہ ہے، بڑوں کے پیچھے بچوں کی صف ہوتی تھی، واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن ایک صاحب نے انتظام کے لئے اور مسجد کی صفائی کے خیال سے لڑکوں کو ڈانٹا ڈپٹا اور تنبیہ کی جس پر کچھ لڑکے برداشتہ خاطر ہو کر بھاگ گئے اور بچوں کی یہ صف منتشر ہو گئی، حسن البنّا کو اس بات سے بہت رنج ہوا اور غصہ آیا، انہوں نے ان صاحب کو ایک خط لکھا اور اس میں ـــــ یہ آیت لکھ دی (ولا تطرد الذین یدعون ربہم بالغداة والعشی یریدون وجہہ ما علیک من حسابہم من شیئ وما من حسابک علیہم من شیئ فتطردہم فتکون من الظالمین)۔ تم کیوں نکالتے اور بھگاتے ہو ان لوگوں کو جو دعا کرتے ہیں اپنے رب سے صبح اور شام، نہ تم کو ان کا کچھ جواب دینا ہے، اور نہ ان کو تمہارا کچھ حساب دینا ہے کہ تم ان کو نکالو اور ظالموں میں سے ہو جاؤ۔

اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد اس سے وسیع دائرہ میں ایک دوسری جماعت کا قیام عمل میں آیا جو ۶ ماہ سے زیادہ تک سرگرم عمل رہی، اس کے بعد یہ مدرسہ بعض اسباب کی بنا پر ٹوٹ گیا۔ اور حسن البنّا ایک دوسرے مدرسہ میں منتقل ہو گئے۔ جو ایک دوسرے قصبہ میں واقع تھا، یہاں ان کو سلسلہ "حصافیہ" میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ یہ ایک تصوف کا سلسلہ تھا، غالباً ایسا ہی جیسا ہندوستان میں نقشبندیہ، چشتیہ وغیرہ سلسلے ہوتے ہیں۔ ان کی آئندہ زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں اس کا بڑا ہاتھ ہے، یہاں ان کا صبح و شام آنا جانا رہتا تھا رفتہ رفتہ وہ اس سلسلہ کے بہت سرگرم اور معتمد رکن بن گئے اور بہت تیزی سے ایک صاف شفاف روحانیت، ایک طاقتور یقین، ایک پرکیف ایمان ان کی زندگی پر چھانے لگا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۰ برس سے زاید نہ تھی اور تعلیمی مدت قریب الختم تھی، اسی دوران میں ۱۹۱۹ء میں مصری ہنگامہ ہوا اور دوسری قومی تحریکیں شروع ہوئیں، وہ اس میں بھی وہ گرمجوشی سے شریک ہوئے۔

ان کی قوت حافظہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ زمانہ تعلیم میں انہوں نے کئی کتابیں حفظ کر لی تھیں، اپنے خود نوشت روزنامچہ میں لکھتے ہیں[۲]

"..... میں نے ان دنوں کئی فنون اور مختلف علوم کی کتابیں یاد کر لیں۔ ملحۃ الأعراب للحریری، ألفیہ بن مالک، یاقوتیہ فی المصطلح، جوہرۃ فی التوحید، رحبیۃ فی المیراث پوری کی پوری حفظ تھیں۔ متن السلم فی المنطق کا کچھ حصہ، قدوری کا بڑا حصہ، الغایۃ والتقریب لابی شجاع فی الشافعیہ، منظومۃ ابن عامر فی المالکیۃ کا ایک حصہ یاد تھا، اس کے علاوہ الشاطبیۃ بھی یاد کرنے کی کوشش کی تھی، شروع کا کچھ حصہ یاد کیا، تھوڑا بہت ابھی تک یاد ہے۔"

احیاء العلوم ان کے مطالعہ کی کتاب تھی جس کا ان پر بڑا اثر بھی تھا ایک جگہ لکھتے ہیں:

"امام غزالی کا ترتیب علوم و معارف کا طریقہ میرے اوپر بہت زیادہ اثر انداز تھا، اس زمانہ میں علم و تعلم وسند وغیرہ کے متعلق میری مستقل رائے تھی جو احیاء العلوم کے مطالعہ کا نتیجہ تھی۔"

---

[۱] مذاکرات حسن البنّا۔ ص ۱۶۔۱۷
[۲] مذاکرات حسن البنّا بقلم

حسن البنا جس وقت اپنے وطن سے قاہرہ پہونچے اس وقت ان کی عمر ۱۶ برس کی تھی وہاں انھوں نے
داخلہ کا امتحان دیا اور پورے مدرسہ میں اوّل آئے ، وہ دارالعلوم قاہرہ میں داخل ہوگئے اب ان کی زندگی کا
دور شروع ہو رہا تھا ، وہاں انہوں نے جس ذوق وشوق اور محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کی اس کے بیان کرنے کی کوئی
خاص ضرورت نہیں ، اسکے علاوہ وہ ہر ہفتہ بعد نماز جمعہ شیخ حصافی کی خدمت میں حاضر ہوتے ، اکثر ان کے خلیف
علی آفندی غالب کے یہاں بھی آتے جاتے رہتے ۔ چھٹیوں میں جب اپنے وطن "محمودیہ" واپس ہوتے تو تفریح
اور گھریلو مشاغل کے بجائے ان کا وقت زیادہ تر سلسلۂ حصافیہ کے دوستوں کے ساتھ گذرتا ، اسی دوران میں ان کا خاند
بعض حالات کی بنا پر قاہرہ منتقل ہوگیا ۔

لیکن تصوف وطریقت سے اتنے گہرے تعلق کے باوجود اس سلسلہ کی بعض خامیاں اور کمزور و قابل اصلاح
پہلو برابر ان کی نظر میں رہتے اور ان کو اس سے مغلوب ہونے سے باز رکھتے ۔ اپنے روزنامچہ میں ایک موقع پر
لکھتے ہیں :-

"ذکر وعبادت سے اتنی گہری دلچسپی ، تصوف میں اتنے استغراق اور اوراد و وظائف کے اتنے
اہتمام کے باوجود ہم کو علم وادب سے ہمیشہ عشق رہا ۔ ہم کو اہل طریقت کی یہ بات اچھی نہیں معلوم
ہوتی تھی کہ وہ احکام شریعت کی خلاف ورزی کریں ، ہم ایسے مرید تھے جو فکر ورائے میں
آزاد تھے ، اور ہم اس بارہ میں مخلص تھے "

حقیقت یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں بہت متوازن اور معتدل رائے رکھتے تھے ، نہ وہ ان لوگوں میں تھے جو تزکیہ
نفس اور احسان کی ضرورت واہمیت کے سرے سے منکر ہوں اور نہ ان لوگوں میں تھے جو اس بارے میں فتوے کا
لیتے ہیں ، اور اس سلسلہ میں کسی معقول اصلاح اور کسی کلمۂ تنقید سننے کو تیار نہیں ہوتے ۔

قاہرہ میں اس وقت ایک دینی جماعت تھی جو "جمعیۃ مکارم اخلاق الاسلامیۃ" کے نام سے مشہور تھی ۔
اس میں شریک ہونے لگے ۔

قاہرہ کی عام زندگی جس رُخ پر جارہی تھی ، اس سے قدرتی طور پر حسن البنا کو اذیت ہوئی ، دیہات کی س
معاشرت سے یہاں کی پُر تکلف ومتنوع زندگی کا کوئی مقابلہ نہیں تھا ، قاہرہ میں ان کو بالکل نئی زندگی سے سابقہ پڑا جس
دیہات میں رہ کر بہت کم واقف تھے ۔

انھوں نے ازہر اور دارالعلوم کے طلباء کو جمع کیا اور ان کو تقریر کی مشق کے لئے آمادہ کیا ۔ ان کا پروگرام یہ تھا ک
پہلے مساجد میں تقریریں کی جائیں ، اس کے بعد قہوہ خانوں میں اور جب مشق کافی ہو جائے تو عام مقامات پر ، انہو
نے ایک انجمن کی بھی بنیاد ڈالی جو دیہاتوں میں کام کرے ، وہ دیہات میں دینی کام کرنے کو زیادہ مفید سمجھتے تھے ، او
اس سے ان کو زیادہ فائدہ کی توقع تھی ۔ چنانچہ اپنے اس انتخاب کے اسباب بیان کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں :-

"میرا خیال ہے کہ اس طبقہ میں دوسرے لوگوں کی بہ نسبت دین کی عظمت اور قبول کی صلاحیت
ہے ، جو بات ہم پیش کریں گے وہ ان کے لئے نئی ہوگی ، پھر ہم اس کو اچھے عنوان کے ساتھ سامنے
لائیں گے ، ہم کوئی ایسی بات نہ چھیڑیں گے جس سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگے ، دل نشین انداز

میں گفتگو کریں گے، اور ان کا کم سے کم وقت لیں گے۔"

...س کے بعد اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع ہوئی، اور پہلی مرتبہ حسن البنّا نے ایک رات میں ...ش تقریریں کیں، یہ تقریریں پانچ منٹ دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں، لیکن جادو کا اثر رکھتی تھیں، یہ ...لحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ حسن البنّا کے شباب کا زمانہ ہے، لوگوں پر ان کی تقریروں کا کیا اثر ہوا، یہ خود حسن البنّا ...ی زبان سے سنئے:۔

"لوگ پہلے تو متردد ہوتے اور شک کرتے لیکن اس کے بعد شوق سے سنتے، اور یہی نہیں بلکہ مزید تقریروں کا مطالبہ کرتے جب ہم لوگ رخصت ہونے لگتے تو چائے وغیرہ پیش کرتے اور قسم دے دے کر اصرار کرتے، لیکن ہم لوگ معذرت کر کے واپس ہو جاتے، جس کا ان لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔"[1]

ایک آگ تھی جو حسن البنّا شہید کے سینے میں سلگ رہی تھی، اور ابھی تک مستور تھی، لیکن کبھی کبھی بھڑک ...ٹھتی تھی، ایک درد تھا جو تکلیف دہ بھی تھا اور مسرت انگیز بھی، وہ اس عمر میں بھی لعلک باخع نفسک حتیٰ یکونوا مومنین، کے اولین مصداق تھے، اور اس آیت کا سچا نمونہ تھے، جب ان کی نگاہ ان نوجوانوں کی طرف جاتی جو یورپ کے فلسفہ اور طرزِ معاشرت کو قبول کرنے کے لئے پر تول رہے تھے، اور اس پسماندہ طبقہ پر پڑتی جو تعلیم و تربیت سے ...بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اپنے ملک و قوم بلکہ اپنی ذات کے مسائل سے بھی ناواقف تھا تو ان کی قلبی و روحانی اذیت کی کوئی حد نہ رہتی۔

اب انھوں نے، علامہ رشید رضا، محب الدین الخطیب، عبدالعزیز الخولی اور محمد ... حسین جیسے دردمند علماء کے پاس آنا جانا شروع کر دیا، جہاں ان کو بڑا سکون حاصل ہوتا۔

ان کی اس غیر معمولی کیفیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ رمضان میں ان کو ۱۱-۱۲ راتوں کو بالکل نیند نہیں آئی اور اسی فکر میں ساری رات کٹ گئی۔[2]

اب ان کا پیمانۂ صبر چھلکنے لگا، اور ان کو یقین ہو گیا کہ ایک جری قدم (BOLD STEP) اُٹھائے بغیر کام نہیں چل سکتا، اس سلسلہ میں انھوں نے ایک متصوف بزرگ شیخ یوسف دجوی سے ملاقات کی، شیخ دجوی سے جو باتیں ہوئیں ان سے ہم کو اس زمانہ کے صوفیہ و مشائخ کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور ساتھ ہی حسن البنّا کی تصوف دوستی کے باوجود صاف گوئی اور بیباکی کی داد دینی پڑتی ہے۔ خود حسن البنّا کی زبان سے سنئے:۔

"جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو شیخ نے بھی اپنے رنج و الم کا اظہار کیا اور اس کے برے نتائج پر افسوس کیا، انھوں نے کہا کہ جامعہ ازہر نے اس طوفان کو روکنے کی کوشش کی وہ ناکام رہا، اس کے بعد جماعت نہضۃ الاسلام پر گفتگو آئی اور دوسری باتیں ہوتی رہیں، اس وقت شیخ نے جو گفتگو کی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ان کوششوں سے فائدہ کی کوئی امید نہیں، آدمی اپنے دین کو بچائے اور اپنا تحفظ کرے، وہ اس شعر کو بھی پڑھا کرتے تھے:۔

---

[1] مذاکرات حسن البنّا ص ۵۹ — [2] ایضاً

وما ابالی اذا نفسی تطا وعنی
علی النجاۃ لمن قدمات او هلکا ! [۱]

حسن البنّا کا تعلیمی سال ختم ہوگیا، اور ان کو اسماعیلیہ کے ایک مدرسہ میں مدرس نامزد کیا گیا، وہ قاہرہ میں جب رہے عام زندگی سے الگ نہیں رہے، ان کے تعلیمی مشاغل اور تصوف [۲] کی دلچسپیاں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے غافل نہ کرسکیں۔ اس کے برخلاف نئے عزم کے ساتھ اسلام کے احیاء کی ضرورت کا احساس شدید تر ہوگیا۔ قاہرہ میں ان کے مشاغل اور معروفیات اتنی گوناگوں ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے، جہاں وہ اپنے سلسلے کے بزرگ علی آفندی غالب کی صحبت میں بیٹھتے ہیں، وہاں وہ سید محب الدین الخطیب سے بھی تعلق رکھتے ہیں، رشید رضا جیسے عالم کے ساتھ بھی ان کے تعلقات ہیں، اور شیخ دجوی جیسے صوفی وزاہد کے یہاں بھی ان کی آمد و رفت ہے، جس طرح وہ فرید وجدی بک کے یہاں تشریف لے جاتے ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ مصر کے سب سے بڑے ادارہ نشر و اشاعت دار المعارف میں نظر آتے ہیں، دوسرے لمحہ مسجد میں مصروف دعا بھی دیکھے جاسکتے ہیں !

یہ بیداری، حاضر دماغی، تنوع، جامعیت، جو ایک داعی، مصلح اور دینی رہنما کے لئے بہت ضروری ہوتی ہے، ان کی ذات کے لئے بہت مفید اور اہم ثابت ہوئی، اور یہ خصوصیت روز افزوں مشاغل کے باوجود ان کے آخری ایام تک قائم رہی، اور کوئی شبہ نہیں کہ ان کی حیرت انگیز کامیابیوں میں اس کا بڑا حصہ ہے۔

---

[۱] (ترجمہ) اگر میرا نفس مجھے نجات کے راستہ کی طرف لیجاتا ہے تو پھر مجھے کیا پرواہ کہ کون مرتا ہے اور کون جیتا ہے۔

[۲] جو تصوف حسن البنّا جیسے مجاہد پیدا کرسکتا ہے اس سے کہ بہت بڑی محرومی اور بد توفیقی ہے، البتہ ہمیں اس تصوف کی افادیت بہت مشتبہ نظر آتی ہے جس کا سلسلہ حسین بن منصور حلاج تک جاکر پہونچتا ہے۔ (م۔ ق)

خریدار صاحبان

خط و کتابت میں اپنے خریداری نمبر کا حوالہ دے کر (جو پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے) ادارۂ فاران کو زحمت سے بچائیں۔
نوازش کا پیشگی شکریہ!

(مینجر)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم۔اے
پی۔ ایچ۔ ڈی

غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ

قرآن مجید کے اکیسویں پارے (یا تیسویں سورت) میں حسب ذیل ارشاد ہوا ہے:

> "رحمان و رحیم خدا کے نام سے۔ الف لام میم۔ رومی مغلوب ہوگئے قریبی علاقے میں اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد جلد غالب ہوجائینگے۔ چند ہی سال میں۔ اللہ ہی کے لئے ہے حکم پہلے بھی بعد بھی! اور اس دن مؤمن خوش ہو جائیں گے۔ اللہ کی نصرت کے باعث! وہ جسے چاہتا ہے نصرت دیتا ہے اور وہ غلبے والا ہے اور رحم والا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ لیکن لوگوں کی اکثریت (یہ) نہیں جانتی۔ وہ دنیوی زندگی کی ظاہری حالت کا علم رکھتے ہیں اور آخرت سے وہ غفلت برتتے ہیں...... الخ (سورۂ روم، آیت ۱تا۷)

ہمارے نوجوان تاریخ پڑھتے ہیں، انھیں قرآن مجید سے کم دلچسپی ہے! اور جو قرآن مجید کی تلاوت رکھتے ہیں انہیں تاریخ کے مطالعہ کا شوق نہیں۔ الا ماشاءاللہ۔ شائد ان آیات کی تفسیر تو نہیں، مختصر سی تفصیل بے محل نہ ہوگی۔

دو لفظ "روم"۔ اٹلی کا موجودہ پایۂ تخت روم ابتداءً چند مفرور پناہ گزینوں کا گاؤں تھا، رفتہ رفتہ ایک شہری مملکت بنا، پھر ایک بڑی شہنشاہی کا دار السلطنت۔ اس رومی سلطنت کے قبضے میں نہ صرف انگلستان، فرانس، اٹلی وغیرہ بہت سے ملک تھے، بلکہ افریقہ میں مصر اور ایشیاء میں ترکی و شام بھی۔ کئی اتار چڑھاؤ کے بعد چوتھی صدی عیسوی میں اس نے عیسائیت قبول کی پھر جلد ہی انتظامی اغراض سے سلطنت کے دو صدر مقام مقرر کئے، روم اور قسطنطنیہ، اس پر زیادہ دن نہ گذرے کہ یورپی علاقوں میں جرمن اور دیگر وحشی قبیلوں نے تاخت وتاراج شروع کی اور پایۂ تخت روم تک پر قبضہ کرلیا، قسطنطنیہ اس اثناء میں خود مختار بن گیا تھا۔ وہ امتیاز کے لئے روم کو مغربی رومی سلطنت کا اور قسطنطنیہ کو مشرقی رومی سلطنت کا صدر مقام کہا جانے لگا۔ چونکہ شہنشاہ قسطنطین کے زمانہ میں نام کی تبدیلی سے قبل قسطنطنیہ کو "بیزنطیہ" کہتے تھے اس لئے اس مشرقی رومی سلطنت کو "بیزنطینی سلطنت" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح "روم" سے یہی

مشرقی رومی سلطنت (یا بیزنطینی سلطنت) کے عیسائی لوگ مراد ہیں، اور شہر قسطنطنیہ کو قرون متوسطہ کے اختتام تک سرکاری طور پر "جدید روم" سے موسوم کیا جاتا رہا۔ چونکہ مندرجہ ذیل تفصیل میں کئی بار قدیم روم کا بھی ذکر آتا ہے اس لئے غلط مبحث سے بچنے کے لئے ہم یہاں "بیزنطینی سلطنت" کا لفظ استعمال کریں گے، جو قرآن مجید کے "الروم" کا مترادف ہے۔

بیزنطینی سلطنت کی مختصر سرگذشت

رومی لوگ ساری دنیا کی حکومت کے مدعی تھے، کرۂ ارض کو "رومی کرہ" سے موسوم کرتے تھے، اور ان کے بے شمار معبودوں میں ایک رومی سلطنت بھی تھی، جس کی باضابطہ پوجا ہوا کرتی تھی۔ لیکن ان کا اقتدار اصل میں دنیا کے ایک محدود علاقے پر تھا۔ اس کا صدر مقام روم تھا۔

شہنشاہ تیوڈوسی نے سیاسی پریشانیوں سے اپنا پایۂ تخت بیزنطیہ میں منتقل کیا۔ جب ۳۹۵ء میں اس کی وفات ہوئی تو خانہ جنگی نے سلطنت کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ہمیں مشرقی حصہ سے بحث ہے جسے بعد میں بیزنطینی سلطنت کہنے لگے۔

اعلان خود مختاری کے بعد سے ۵۰۰ء تک یعنی قریباً ایک صدی تک اسے اپنی آزادی منوانے کے لئے مسلسل برسرِ کارزار رہنا پڑا۔ جھگڑے اصل میں فوجی افسروں کی آپس کی رقابت کے باعث تھے اور سرکاری فوج کوئی قومی فوج نہ تھی بلکہ صرف بھاڑے کے ٹٹوؤں پر مشتمل تھی۔ ان میں قوط (GUTH) عنصر زیادہ نمایاں تھا، جو یورپ کے وحشی باشندوں کا ایک قبیلہ تھا۔

بیزنطینی سلطنت کی مغربی سرحد اس وقت دریائے ڈانیوب تک چلی گئی تھی۔ وہاں اسے ترکستانی خانہ (HUMS) سے سابقہ پڑا جو آتیلا کی سرداری میں یورپ میں گھس آئے تھے اور آتیلا کو خراج دے کر ہی ادھر امن حاصل کیا جا سکا تھا۔

مشرقی سرحد پر ایران تھا۔ پانچویں صدی عیسوی کے اختتام تک اس سے تعلقات خوشگوار رہے بلکہ بارہا ایران اور بیزنطینیہ آپس میں تعاون کر کے مشترک طور پر ایک مشترک دشمن سے مقابلہ کرتے تھے جو وسط ایشیا سے نکل کر کوہ قاف کے دروں میں سے گذرتے ہوئے دونوں سلطنتوں پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس تعاون کی جگہ بدمزگی کا آغاز ہمارے مغربی بھائیوں ہی سے ہوا۔ شہنشاہ انسطاس نے ۴۹۲ء میں عادتی رقم کی ادائی سے انکار کیا تو جلد ہی ۵۰۲ء میں ایران سے جنگ چھڑی اور تین سال تک جاری رہی، پھر دب کر شہنشاہ قباذ سے صلح کرنی پڑی۔ ۵۴۰ء میں حکمران کینہ دین نے شام و فلسطین تک تاخت کی اور انسطاس ہی کو دبنا پڑا۔

اس اثنا میں مغربی سرحد پر بھی پریشانی سے سابقہ رہا اور ایک بڑا بحری بیڑہ جو قرطاجہ (تونس، شمالی افریقہ) پر حملہ کرنے بھیجا گیا تھا، تباہ و برباد ہو گیا۔

دو مزید مصیبتیں تھیں۔ جاگیردار رعایا پر ظلم و تشدد کرنے لگے اور مرکز میں شنوائی نہ ہوئی۔ دوسرے مذہبی جنون روز افزوں تھا۔ نہ صرف غیر سرکاری مذہبوں (یہودیت اور بت پرستی) پر بے وجہ ظالمانہ دست درازی ہوتی رہی بلکہ خود سرکاری مذہب (عیسائیت) فرقہ پرستیوں کا شکار تھا۔ اور ہر فرقہ نہ صرف دوسروں کو کافر کہتا تھا، بلکہ جب بھی موقعہ ملتا دوسروں پر جبر اور خون خرابے سے دریغ نہ کرتا تھا۔ جھگڑا زیادہ تر اس عقیدے کے متعلق تھا کہ آیا

حضرت مسیح میں صرف ایک طبیعت (خدائی) تھی یا بوقت واحد دو طبیعتیں (خدائی و انسانی) تھیں۔

شہنشاہ انسطاس نے سرکاری مصارف گھٹانے اور رعایا پر سے محصول بھی کم کئے جس سے جلد ہی سرکاری خزانہ لبریز ہوگیا لیکن مذہبی جنون اسے بھی تھا۔ یک طبیعتی فرقے سے تعلق کے باعث وہ دیگر فرقوں پر شدید ظلم و ستم ڈھاتا رہا۔ اور خانہ جنگیوں نیز بیرونی جنگوں کے زمانہ میں اس نے ۵۱۸ء میں دنیا کو خیر باد کہا۔ خواجہ سرا وزیر نے وارثوں کو محروم کرکے ایک جاگیردار یوستین (JUSTIN) کو تخت نشین کیا۔ جو دو طبیعتی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر بے تعصبی اس میں بھی نہ تھی۔

اس نے پوپ سے پینگ بڑھائی مگر آریائی فرقے پر مظالم آغاز کئے۔ قوط اور دیگر جرمن قبائل اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک آریائی سردار تیودوریک نے پوپ کو مجبور کیا کہ قسطنطنیہ جاکر شہنشاہ کے احکام کو منسوخ کرائے۔ پوپ نے تعمیل کی مگر ناکام واپس آیا۔ تو تیودوریک نے پوپ کو قید خانہ بھیج دیا اور وہیں اسے جان دینی پڑی۔ اور جلد ہی شہنشاہ یوستین بھی ۵۲۷ء میں دنیا سے چل بسا۔

اب اس کا بھتیجا یوستینیان (JUSTINIAN) تخت پر آیا۔ اس کا اڑتالیس سالہ دورِ حکومت گرم و سرد ہر چیز سے لبریز ہے۔ یہ عالم و فاضل مانا جاتا ہے، علم دوست بھی تھا، انتظامی صلاحیتیں بھی تھیں، دینداری بھی بہت تھی۔ لیکن کوشش یہ کرتا رہا کہ فرقہ واریت گھٹے اور سب عیسائیوں میں اتحادِ رائے ہوجائے۔ اس اتحاد آرائی کی سعی میں اپنے علم و فضل سے وہ مصالحت کی نئی نئی تجویزیں پیدا کرتا رہا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ مصالحت عقائد کی ان سرکاری تجویزوں کو بزورِ حکومت سب سے منوانے کی کوشش کی تو ان سے نئے فرقے ہی پیدا ہوگئے اور مذہبی جبر و ستم کسی طرح گھٹ نہ سکا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ شہنشاہ نے ایک بدنام رقاصہ کو اپنا دل دے دیا۔ اس دلنواز تیودورا کا تعلق یک طبیعتی فرقے سے تھا۔ تیودورا سیاسیات میں بڑی دخیل رہی اور مورخ حیران رہ جاتا ہے کہ شہنشاہ چند پادریوں کو معزول کرتا ہے اور جلاوطن کرتا ہے۔ یہ ملکہ کے محل میں پناہ گزیں رہ کر پوری آزادی سے اپنی جماعت کی قیادت کرتے رہتے ہیں۔ شہنشاہ نے یک طبیعتی فرقے کے علاوہ نسطوریوں پر بھی شدید مظالم کئے جس سے وہ ملک چھوڑ کر ایران میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوتے رہے۔

قطع کلام ہی سہی ! یہ یاد دلانا ہے کہ تخت نشین ہونے کے چند ماہ بعد ہی یوستینیان نے تدوینِ قانون کا ایک کمیشن مامور کیا اور پرانے رومی قوانین و نظائر وغیرہ کا پہلا ملخص دو سال بعد کوڈ کے نام سے تیار ہوگیا۔ سرکاری ترمیموں وغیرہ کے باعث تدوین کا کام جاری رہا اور جلد ہی دوسرا مجموعہ پانڈیکٹ کے نام سے، اور پھر تیسرا انسٹی ٹیوٹ کے نام سے شائع ہوا۔ ان مجموعہ ہائے قوانین کی بجا دھوم ہے، لیکن ان کی تدوین انسانیت کو ایک مبارزت (چیلنج) بھی تھی کہ اس سے بہتر قانون ممکن نہیں۔ اور اس نے انسانی دماغوں کو مرعوب اور معطل کر دیا۔ اس مبارزت کو عرب کے ایک کملی والے (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبول کیا اور آپ کے بیان کردہ اصولوں کے اطلاق و توسیع سے فقہ کے نام سے دنیا میں جو نیا نظامِ قانون قائم ہوا، ناطرفدار مبصروں کی نظر میں، اس کے سامنے یوستینیان کے مجموعے پھیکے ہی ثابت ہوتے ہیں۔

پایۂ تخت کی سرکس کے مقابلوں میں ایک مرتبہ جھگڑا بڑھا تو نہ صرف سپہ سالار کا گھر بلکہ شاہی محل اور صدر گرجا بھی جل گئے۔ بادشاہ شہر چھوڑ کر ایشیا میں بھاگ جانا چاہتا تھا، ملکہ نے ہمت بندھائی اور بڑی بے رحمی سے ہنگامے فرو ہوئے۔ یوستینیان نے صدر گرجا دوبارہ تعمیر کیا۔ پانچ سال کے بعد سے آیا صوفیہ کے نام سے عبادت کے لئے کھولا گیا۔ شان و شوکت کے لحاظ سے یہ اپنے

زمانے میں عجوبۂ روزگار سمجھا جاتا تھا۔ سلطان محمد فاتح نے اسے تثلیث کی جگہ توحید کی عبادت گاہ بننے کی سعادت عطا کی، مرمت کے لئے چند ٹھیکریوں کی ضرورت تھی اور کمال اتاترک کو، جو عیاشیوں اور فضول خرچیوں میں اس کی گنجائش نظر نہ آئی تو قارونستان (امریکہ) پر نظر گئی، وہاں سے اس شرط پر خیرات ملی کہ وہاں آئندہ خدا کا نام نہ لیا جائے۔ فی الحال آیا صوفیہ نے میوزیم کی صورت اختیار کر لی ہے۔

حکمرانوں کی جوع الارضی مشہور ہی ہے، ابھی یوستی نیان کو تخت پر آئے چند ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ علاقہ قفقاز کے اقتدار کے سلسلہ میں ایران سے جھگڑا شروع ہو گیا تین چار سال جنگ جاری رہی اور ایران میں اباحیت و مزدکیت کے بر جبر زور پر جاری رہنے کے باعث ملک غیر متحد تھا۔ اور آخر ۵۳۱ء میں نوشیرواں تخت پر آیا۔ اس نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی۔ اور یوستی نیان کو یہی غنیمت معلوم ہوا اور دونوں نے "دائمی" امن کا معاہدہ کیا۔

یوستی نیان نے اس معاہدہ پر تکیہ نہ کیا بلکہ فرزانگی سے ایک طرف قفقازی سرداروں سے حلیفی کی طرح ڈالی تو دوسری نجاشی حبش سے بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شام و فلسطین کے عرب باشندوں کو، یک غسانی سردار حارث بن جبلہ کی سرداری میں ایک نیم مختار سلطنت عطا کر کے اس کا پابند کیا کہ عرب سے ہونے والے بدوی حملوں کا سدباب کریں۔ غسانی عرب یک طبیعی فرقے کے عیسائی تھے غسانیوں نے بصریٰ (فلسطین) کو اپنا صدر مقام بنایا جہاں سارے عرب کے تاجر آنے لگے۔ خود رسول کریمؐ بھی نوعمری میں وہاں تشریف لے گئے تھے۔ چونکہ ایرانیوں کے حیرہ (کوفہ) پر لخمی عربوں کی حکومت تسلیم کر کے ان سے بیزنطینی جنگوں میں ہمیشہ فائدہ اٹھایا تھا، اس لئے غسانی سلطنت ایک طرح اس کا جواب بھی تھی تاکہ عربوں کو عربوں ہی سے لڑایا جائے۔

ادھر سے فراغت ہوئی تو یوستی نیان نے یورپ فتح کرنے کی کوشش شروع کی، مگر گھر میں مذہبی خانہ جنگیوں کے باعث رعایا کے دل کسی اور طرف لگے ہوئے تھے، ملکہ تیودورا کے اثر کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ اس کے اشارہ سے پوپ سلویریوس تک کو معزول کر دیا گیا جس پر الزام یہ تھا کہ وہ قوطیوں سے سازش کر کے اٹلی سے بیزنطینیوں کو نکالنا چاہتا تھا۔ اٹلی میں قوطیوں سے جنگ جاری رہی، ان لوگوں نے نوشیرواں کو اکسایا، اس نے بھی موقع دیکھ کر شام پر حملہ کر دیا اور انطاکیہ پر قبضہ کیا۔ یہ جنگ چھوٹے پیمانے پر کئی سال جاری رہی آخر ۵۶۲ء میں پچاس سال کے لئے دونوں "بڑوں" نے صلح کا معاہدہ کیا۔ قوطیوں سے جنگ جاری رہی، ایک مرتبہ پورا اٹلی ہاتھ سے نکل گیا، اور بڑی تباہیوں کے بعد دوبارہ اس پر قبضہ ہوا۔ پھر اسپین سے جنگ چھڑی، اس اثنا میں ڈانیوبی سرحد سے غفلت برتی گئی، تو ترکستانی خان، سلاف در بلغار ادھر چھانے لگے اور بحیرہ آدریاتیک سے لے کر قسطنطنیہ تک تباہی پھیل گئی۔ اس وقت سرکاری خزانہ خالی تھا، مگر مذہبی جنون کم نہ ہوا اور حسب سابق شہنشاہ آئے دن مختلف مذہبی عقیدوں کی سرپرستی کرتا رہا، مالگذاری کے مظالم بھی بڑھ گئے۔ ملکہ تیودورا ۵۴۸ء میں مر چکی تھی، آخر بیاسی سال کی عمر میں ۵۶۵ء میں یوستی نیان نے بھی جان، جان آفریں کے سپرد کی تو رعایا نے اطمینان کا سانس لیا کہ شاید اب نت نئی آئے دن کی راج ہٹ سے نجات ملے گی۔

اب یوستی نیان کا بھتیجا یوستین تخت پر بیٹھا، اس کے پانچ سال بعد ۵۷۰ء میں مکہ معظمہ کو نبی آخر الزماںؐ کی ولادت گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ ۵۷۴ء میں یوستین کا دماغ چل گیا اس نے ایک قابل فوجی افسر طبیریوس کو اولاً قیصر (یعنی نائب السلطنت) کا پھر آگسٹوس کا شاہانہ خطاب عطا کیا تھا۔ اس لئے ۵۷۸ء میں وہی جانشین بنا، اس نے ملک کی مالی حالت

کسی قدر درست کی، چار ہی سال بعد وہ چل بسا۔ اس نے موریق (MAURICE) کو قیصر اور اگسٹوس کے خطاب اپنی زندگی میں دے کر ولی عہد بنا دیا تھا۔ اب وہی تخت پر بیٹھا۔

موریق کنجوس بھی تھا اور فوج میں بھی کلیدی عہدوں کے لئے اقربانوازی کرتا رہا۔ اس طرح فوج میں نااہل لوگ شامل ہوگئے، دوسری طرف پوپ نے، جو اب تک اپنے کو بیزنطینی رعیت سمجھتا تھا، یہ ادعا شروع کیا کہ مذہبی معاملوں میں (جن میں گرجا کے پادریوں کا تقرر بھی شامل ہے) اقتدار اسے اور صرف اسے حاصل ہے۔ اس طرح پوپ سے بھی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوگیا۔ مغربی سرحدوں کا امن وہاں کے وحشی قبائل کے سرداروں کو وظیفہ (بلکہ خراج) دے کر حاصل ہوا تھا، کنجوسی سے جنون میں تخفیف مصارف کی کلہاڑی ان وظائف پر چلی نتیجہ ظاہر ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان مغربی بھاڑے کے ٹٹوؤں کی جگہ فوج میں آرمینیا اور قفقاز کے لوگوں کو بھرتی کرنے کی تجویز میں بیزنطینی سرحد کو ان علاقوں تک پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ اس پر ایران سے جھگڑا شروع ہوگیا۔ اور پچاس سالہ امن کا معاہدہ دس ہی سال بعد موریق نے چاک کردیا۔ یہ جنگ پچاس سال تک چلتی رہی۔ اور غزوۂ حدیبیہ کے زمانے میں ختم ہوسکی۔ اسی جنگ کے وہ دو اجزاء ہیں جن کا سرعنوان پر درج کردہ آیات قرآنی میں ذکر ہوا ہے۔

آغاز جنگ

جنگ کا خطرہ دیکھ کر دونوں "بڑوں" نے اپنے زیر اثر نیز اپنے ہمسایہ حکمرانوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ایک سفارتی جنگ شروع کی تھی۔ یوستین (JUSTIN) نے مغربی ترکوں کے خاقان سے صلح کرلی تھی۔ خاقان کا علاقہ چین سے ماوراء النہر تک پھیلا ہوا تھا۔ اور یہ ایران کا مخالف تھا۔ یوستین نے ایران کی آرمینی رعایا سے بھی ساز باز کرلی جو ایرانی صوبہ داروں سے نالاں تھے۔ پھر ۵۷۲ء میں یوستین نے اس خراج کی ادائیگی سے انکار کیا جو حسب معاہدہ وہ ایران کو دینے کا پابند تھا۔ نوشیرواں نے بیزنطینی سرحد کے سب سے اہم قلعہ "دارا" پر بہ آسانی قبضہ کرلیا۔ شہنشاہ یوستین بیمار تھا اس لئے عارضی صلح کرلی گئی پھر مزید فوجیں اکٹھی کی گئیں۔ نوشیرواں بھی سمجھ گیا۔ اور اچانک بیزنطینی آرمینیا پر حملہ کیا۔ جنگ کا پلہ کبھی ادھر اور کبھی ادھر جھکتا رہا۔ ۵۷۹ء میں نوشیرواں کی وفات پر ہرمز اور اس کے بعد پرویز بادشاہ بنے اور جنگ برابر جاری رہی۔ اور ۵۸۲ء میں موریق تخت پر آیا اور بلا کنجوسی سے عین جنگ کے زمانہ میں سپاہیوں کی تنخواہ کم کردی۔ انھوں نے بغاوت کردی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ عین اس فیصلہ کن زمانے میں ایران میں بھی خانہ جنگی شروع ہوئی اور ایک سردار بہرام (چوبین) نے کچھ اتنا سر اٹھایا کہ پرویز کو سوائے اس کے کچھ نہ سوجھی کہ بھاگ کر ۵۹۰ء بیزنطینی علاقے میں پناہ لے۔ موریق نے اس کی آؤ بھگت کی بلکہ اپنی بیٹی بھی اس کو بیاہ دی۔ پھر اپنی فوج بھی اس کے سپرد کی۔ پرویز نے اس کی مدد سے اپنا تخت واپس حاصل کرلیا اور اظہار شکر گزاری میں بہت سا علاقہ بیزنطینیوں کے سپرد کردیا۔ موریق کو ایران کی طرف سے اطمینان ہوا تو یورپ کی طرف نئے سرے سے توجہ کی۔ مگر یہ بعد از وقت ثابت ہوا۔ بیرونی تباہیوں کے وقت اندرونی خانہ جنگیاں بھی پھوٹ پڑتی ہیں چنانچہ فوقاس (PHOCAS) نے بغاوت کی اور موریق کو قتل کرکے تخت پر آیا۔ اور آٹھ سالہ حکومت میں موریق کے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے علاقوں کے نکلنے شروع ہوگئے۔ شہنشاہ ایران تاک میں تھا کہ مجبوراً جو علاقے "اظہار شکر گزاری میں" سپرد کرنے پڑے تھے ان کو واپس حاصل کرے، اس نے اپنے محسن موریق کی موت کو بہانہ بنایا اور خون کے انتقام کے لئے جنگ شروع کردی، اور ۶۰۴ء میں مکرر سرحدی قلعہ دارا پر قبضہ کرلیا۔ پھر شاہین نامی افسر کی سرداری میں بیزنطینی آرمینیا پر حملہ کیا۔

اور ارضِ روم پر قبضہ کرلیا۔ دوسرے افسر شہر براز نے ماردین، آمد اور ادیسہ پر قبضہ کرلیا۔ اور ۶۱۰ء میں (بعثت نبوی کے سال) بحیرۂ باسفورس پر خلقیدون (CHALCEDON) تک پہونچ گیا۔ ان حالات میں بھی احمق شہنشاہ فوقاس کو سوجھی تو یہی سوجھی کہ شام و مصر میں عیسائی فرقہ بندی میں مذاہبی تشدد کے شعلے بھڑکائے۔ سب سے شام میں بغاوت ہوئی یہودیوں نے بھی اس میں حصہ لیا، اور انطاکیہ کے بطریرک انستاس کو جان سے مار ڈالا۔ اس زمانہ میں افریقی فوج کا سردار ہرقل مصر سے فوجیں لے کر قسطنطنیہ آتا ہے اور فوقاس کو قتل کرکے خود تخت پر بیٹھتا ہے۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ

فوقاس (PHOCAS) کے زوال سے صورت حال نہ سنبھلی۔ ۶۱۱ء میں ایرانی سپہ سالار شہر براز نے انطاکیہ پر قبضہ کیا۔ ۶۱۳ء میں ایرانی شام میں گھس گئے اور دوسرے ۶۱۴ء کو بیت المقدس پر (جسے قرآن مجید نے ادنی الارض، قریبی علاقہ کا نام دیا ہے) قبضہ کرلیا۔ یہاں سے وہ نہ صرف باشندوں کو بلکہ بطریرک (صدر پادری) کو بھی قید کرلے گئے۔ اور ستم یہ کیا کہ وہ اصل صلیب جس پر شبیہ مسیح کو سولی پر لٹکایا گیا تھا اور جس کی عیسائیوں میں نہایت عزت و حرمت تھی، اسے بھی لے گئے۔ ۶۱۷ء میں شاہین نے خلقیدون پر قبضہ کرلیا، ادھر ہرقل نے مسیح کی التجا کی تو خط کا کوئی جواب تک نہ دیا گیا۔ جلدی ہی (۶۱۸ء تا ۶۱۹ء) مصر اور اسکندریہ پر بھی ایرانی قبضہ کیا ہوا کہ قسطنطنیہ کا غلہ کا راستہ بند ہوگیا۔ عین اسی زمانہ میں اسپین بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اور ڈانیوبی سرحد میں آوار اور سلاف اودھم مچانے لگے۔ آوار تو نئے خاقان کی سرداری میں جون ۶۱۹ء میں قسطنطنیہ تک پہونچ گئے اور چاہا کہ ہرقل کو کسی بہانے شہر سے باہر بلا کر قید کرلیں۔

وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ

ہرقل (۶۱۰ء میں) اسی سال تخت پر بیٹھا تھا جس میں بعثت نبوی ہوئی تھی۔ اور غلبت الروم کا واقعہ بھی اسلام کی مظلومیت اور قبل ہجرت زمانے سے ہمعصری کا تعلق رکھتا ہے۔ ہرقل کو کیا معلوم ہوگا کہ دور دراز مکہ میں بھی نہ صرف اس کے دوست تھے بلکہ پورے ایقان کے ساتھ دعویٰ کررہے تھے۔ کہ چند ہی سال میں رومی اپنی مغلوبیت کے بعد پھر غالب آجائیں گے۔ یہ ہمدردی محض اس لئے تھی کہ ہرقل کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تھوڑی بہت نسبت تھی اور وہ تثلیث کی الجھنوں کے باوجود اللہ کو ایک مانتا تھا۔ وہ آتش پرستی یا نیکی اور بدی کے دو الگ الگ خدا ماننے کو تیار نہ تھا۔ رسول عربی پر آئی ہوئی وحی کی اساس پر ابوبکر صدیق نے بت پرستانِ مکہ سے شرط باندھی کہ نو سال کے اندر کایا پلٹ ہوجائے گی۔ اور وہ واقعہ ۶۲۴ء میں پیش بھی آگیا۔

یہ کیسے ہوا؟ اس عالم اسباب میں ہرقل ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہا۔ اس نے بچے کھچے علاقے میں امن و نظم قائم کیا۔ فوج کی نئی تنظیم کی۔ اسے بہ کثرت مشق کرا کر کام کی تربیت دیتا رہا۔ اس نے ایک مقدس جنگ کی تیاری کا اعلان کیا۔ اور تین ہی سال بعد ۶۲۲ء میں (سالِ ہجرت) اس نے ایشیائے کوچک سے آرمینیا تک کا راستہ پہلے ہی حملہ میں صاف کرلیا۔ اور آذربائجان پہونچ کر قریب تھا کہ خود شہنشاہ ایران خسرو پرویز کو قید کرلے۔

آرمینیا فوجی بھرتی کا علاقہ تھا۔ چنانچہ بیزنطینی فوج میں آرمینی اب آسانی سے بھرتی کئے جانے لگے۔ ۶۲۳ء میں اور دوسرے سال

اس نے بحیرہ وان کے پاس شہر براز کو تین مرتبہ شکست دی۔ ۶۲۵ء میں (غزوہ احد کے سال) ہرقل کو کچھ پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ خسرو پرویز نے آوار قوم سے صلح کرلینے کے بعد بڑی کوشش کی کہ ہرقل کے خطرے سے نجات حاصل کرے اور چاہا کہ قسطنطنیہ پر ٹوٹ پڑے۔ شہر براز کا خلقیدون پر قبضہ تھا۔ شاہین برابر ہرقل کے پیچھے جا رہا تھا اور ایسے وقت میں آوار قسطنطنیہ کا محاصرہ کرنے آ پہنچے۔ پھر قسمت آزمائی کرنے کے بعد خان آوار یہ سمجھ کر کہ انگور ابھی کھٹے ہیں، واپس چلا گیا۔

ہرقل قسطنطنیہ کے محاصرے سے پریشان نہ ہوا اور اپنے بھائی تھیوڈور کو شاہین سے مقابلہ کرنے کے لئے چھوڑ کر خود شمال کی طرف چلا گیا۔ اور خزر کے ترکوں سے حلیفی کرلی (کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے) پھر ایران پر حملہ کرنے کے لئے وادی دجلہ میں اتر پڑا۔ یہ دسمبر ۶۲۷ء کا واقعہ ہے۔ تین ماہ بعد فروری ۶۲۸ء میں (غزوۂ حدیبیہ کے سال) اس نے نینوا کے کھنڈروں کے پاس پرویز کی فوجوں کو ایک ایسی شکست فاش دی کہ تخت کیانی لرز گیا۔ اور ہرقل پایۂ تخت مدائن سے چند میل تک آگیا۔

پرویز کو اس کے اپنے بیٹے شیرویہ نے جان سے مار ڈالا اور فوراً صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ مورخ گبن کے مطابق ماہ مارچ ۶۲۸ء مطابق ذیقعدہ ۶ھ میں، اور مورخ بریہیئے (BREHIER) کے مطابق ۳ اپریل ۶۲۸ء مطابق ۲۲ ذیقعدہ ۶ھ کو صلح نامہ طے ہوگیا، جس کے تحت آرمینیا، مصر، شام وغیرہ کا تخلیہ کرنا تھا۔

ہرقل نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ادیسہ سے پیدل بیت المقدس جاکر وہاں گرجا میں اصل صلیب واپس کی اور ستمبر ۶۲۹ء میں مذہبی عید کے وقت سے وہاں سر نیاز جھکایا۔ جیسا کہ مورخ نقفور (NICEPHORE) کا بیان ہے۔ اور پھر اس کے بعد پایۂ تخت قسطنطنیہ گیا۔

ادھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرط جیت کر قریش سے بہت سے اونٹ حاصل کئے۔ نقل کردہ آیات قرآنی کو پھر پڑھیے اور سوچئے کہ لوگوں کی اکثریت دنیوی زندگی کے ظاہر کو دیکھتی ہے اور آخرت سے بھی غفلت برتتی ہے اور "اعدادالہم" سے بھی۔ حالانکہ دنیا عالم اسباب ہے۔

اے از لبِ صادقت شنیدہ
نادیدہ خدا، خدائے دیدہ

اے مثلِ تو در جہاں نگاہے
یزداں دگرے نہ آفریدہ

اے آنکہ بہ امتزاجِ کامل
در جملہ صفات برگزیدہ

تو ہمہ تو حسنِ ذات واز تو
یک شمہ بہ دیگراں رسیدہ

اے بے ہمہ خلق و با ہمہ خلق
اے از ہمہ خلق برگزیدہ

آں خیر کہ بود در زمانت
بعد از تو زمانہ ہم نہ دیدہ

در عشق و وفا یکے مثالش
نے دیدہ و نے ز کس شنیدہ

امروز ببیں کہ مردماں را
کارے بہ ہلاکتے رسیدہ

مشرق ہمہ پُر ز فتنہ و شر
مغرب ہمہ مست و سر کشیدہ

اے آنکہ ز شوقِ بے نہایت
حق را ہمہ آشکار دیدہ

طے کردہ ہزار ہا حجابات
تا سدرہ بہ ساعتے رسیدہ

وز سدرہ بہ منتہائے قوسین
با عظمتِ خاص رہ بریدہ

اے آنکہ درونِ پردہ راز
از خویش بہ خویشتن رسیدہ

کے عقل تواں رسد بہ پایاں
ہم عشق ہنوز نارسیدہ

لولاک لما خلقت الافلاک
در مدحِ تو جانِ ہر قصیدہ

اے اسمِ تو حرزِ جانِ عشاق
اے ذکرِ تو نورِ قلب و دیدہ

اے بر تو نثار شرمِ عصیاں
اے بر تو فدا دلِ تپیدہ

یک گوشۂ چشمِ التفاتے
بر امتیانِ غم رسیدہ

رحمت بہ اشارۂ تو رقصاں
جنت بہ نگاہست آرمیدہ

استادہ بہ پیش بارگاہست
پیرے بہ رخ آستیں کشیدہ

شاید جگرِ حزیں ہمیں است
از بارِ گنہ کمر خمیدہ

زائرِ حرم حمید صدیقی

مقدس یاد

حبذا، حبذا نسیمِ شمال — مرحبا، مرحبا، تعال تعال!
یاد آ ہی گیا تجھے آخر — ایک ہجراں زدہ شکستہ حال
تیرے آنے سے آ گئی جاں میں جان — شدتِ غم سے جی بہت تھا نڈھال
یاد ایامِ دل فروز کہ جب — دولتِ دید سے تھے مالا مال
اب بھی آتی ہے کیا نسیمِ حرم؟ — "ذوالحلیفہ" میں بہرِ استقبال
ساکنانِ مدینہ، کیسے ہیں؟ — خادمانِ حرم کا ہے کیا حال؟
ہم جوارِ درِ حبیبِ خدا — خوبرو، خوشجمال، نیک خصال
اُن کے عز و شرف کا کیا کہنا — دولتِ قرب سے ہیں مالا مال
کتنے اچھے ہیں سا کنانِ حرم — حُسن و خوبی میں آپ اپنی مثال
تنگ دستی کے باوجود کبھی — نہیں کرتے درازِ دستِ سوال
نذر کر لیتے ہیں قبول، مگر — خواہ اک قرش ہو کہ ایک ریال
پاک باطن، غریب تکرونی — جن میں ہوتے ہیں بعض صاحبِ حال
دیکھ کر جن کو یاد آتے ہیں — سیدالعاشقین جناب بلالؓ
صبح کے وقت، کیا نماز کے بعد — اب بھی پڑھتے ہیں "سورۂ انفال"؟

ہو گئے جو گدائے کوئے حبیب — ہیں وہی خوش نصیب و خوش اقبال
قابلِ رشک ہے، وہ خوش قسمت — جس کو حاصل ہو حاضری ہر سال
اللہ اللہ تھے کبھی ہم بھی — محو نظارۂ حریمِ جمال
عید نظارہ تھا نظر کیلئے — قبۂ نور کے کلس کا ہلال
درِ اقدس کی جالیوں کی طرف — دیکھ لے آنکھ بھر کے کس کی مجال
یاد آتی ہے صبح و شامِ حرم — پڑھتے ہیں "یا الغفور لا تصال"
آج تک ہیں نگاہ و دل پہ محیط — جلوہ ہائے دیارِ حُسن و جمال
عینِ بیداری حقیقت کو — کیسے سمجھیں ہم آہ خواب و خیال
اُن کی شانِ کرم کا صدقہ ہے — کیا غمِ ہجر، کیا نشاطِ وصال
آج ہیں وقفِ انتظار آنکھیں — آج گویا نظر نظر ہے سوال
شوقِ دیدار میں ہیں محوِ سکوت — جراَتِ عرضِ حال بھی ہے محال
اپنے ہاتھوں ہوئے ہیں خود برباد — اپنے قدموں سے خود ہوئے پامال
کب نظر آئے گا وہ نورِ سحر — جائیگی کب یہ شامِ رنج و ملال
تو رہے برقرار درِ حبیب — شادم از سوزِ ہجر در ہمہ حال

برق سی دل پہ گر گئی ہے حمیدؔ
جب مدینے کا آ گیا ہے خیال

گنبدِ خضرا

اسد ملتانی

یہ جو ہیں دونوں جہاں میری نظر کے سامنے
میں کھڑا ہوں روضۂ خیر البشرؐ کے سامنے

جھلملانے لگ گئیں روضے کی زرّیں جالیاں
اک نیا منظر ہے میری چشمِ تر کے سامنے

اڑ گئی میرے گناہوں کی سیاہی اُڑ گئی!
ظلمتِ شب جس طرح نورِ سحر کے سامنے

مانگتا ہوں جس قدر ملتا ہے کچھ اس سے سوا
ہر دُعا شرمندہ رہتی ہے اثر کے سامنے

اک جگہ پر دونوں محوِ استراحت ہی نہیں
گھر بھی ہے صدیقؓ کا حضرتؐ کے گھر کے سامنے

تو نے کار آمد بنایا زندگی اور موت کو
مقصد ایسا رکھ دیا نوعِ بشر کے سامنے

میں اسدؔ صحنِ حرم میں بیٹھتا ہوں اس جگہ
ہو جہاں سے گنبدِ خضرا نظر کے سامنے

نغمۂ حرم

ماہر القادری

حرم میں اذانِ سحر اللہ اللہ
کہ میں وجد میں بحر و بر اللہ اللہ

یہ ہر طوف یہ ملتزم پر دعائیں
یقینِ قبول و اثر اللہ اللہ

یہ میزابِ رحمت وہ رکنِ یمانی
مقاماتِ اہلِ خبر اللہ اللہ

تجلّی میں دھوئے ہوئے سنگریزے
یہاں کے نجوم و قمر اللہ اللہ

مقامِ براہیم پر یہ نمازیں
یہ ہر سجدہ معراجِ سر اللہ اللہ

تصور بھی ہے ایک زندہ حقیقت
تخیل بھی ہے معتبر اللہ اللہ

دھڑکتے ہوئے دل کا لے کر سہارا
مناجات با چشمِ تر اللہ اللہ

جلالِ الٰہی کی تابندگی میں
جھلکتے ہوئے بام و در اللہ اللہ

وہ کعبہ جسے دیکھ لینا عبادت!
مسلسل ہے پیشِ نظر اللہ اللہ

دو غزلیں

(قابل اجمیری)

تمہیں جو میرے غم دل سے آگہی ہو جائے
جگر میں پھول کھلیں آنکھ شبنمی ہو جائے

سیاہ خانۂ دل میں ہے ظلمتوں کا ہجوم!
چراغ شوق جلاؤ کہ روشنی ہو جائے

خوشا یہ دیر و حرم کی تجلیاں لیکن
وہ کیا کرے کہ جسے اپنی آگہی ہو جائے

طلوع صبح پہ ہوتی ہے اور بھی نمناک
وہ آنکھ جسکی ستاروں سے دوستی ہو جائے

یہی ہے دل کی ہلاکت یہی ہے عشق کی موت
نگاہ دوست پہ اظہار بیکسی ہو جائے

زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے
خدا کرے کہ تمہیں مجھسے دشمنی ہو جائے

اجل بھی اسکی بلندی کو چھو نہیں سکتی
وہ زندگی جسے احسان زندگی ہو جائے

اجل کی گود میں قابل ہوئی ہے عمر تمام
عجب نہیں جو مری موت زندگی ہو جائے

(محمد علی خاں اثر رامپوری)

اتنا تو یاد ہے کہ اٹھی تھی نظر کہیں
پھر اس کے بعد پائی نہ اپنی خبر کہیں

جلووں کو دیکھتا تو ہوں مڑ مڑ کے بار بار
پھر سوچتا ہوں ہو نہ فریب نظر کہیں

تم نے نقاب رخ کو الٹ تو دیا، مگر
پھر رک نہ جائے گردش شمس و قمر کہیں

الفت کا ذکر میں تو نہ چھیڑوں گا خود، مگر
کہدے نہ دل کا راز مری چشم تر کہیں

بھٹکیں نہ کیسے قافلے ہر موڑ پر اثر!!!
منزل کہیں ہے راہ کہیں، راہبر کہیں

محسوسات

عزیز حاصل پوری۔

کتنا سوز آفریں ہے دل کا ساز | پتھروں کو بھی کر رہا ہے گداز
کس ادا سے ہیں وہ نوا پرداز | اک زمانہ ہے گوش بر آواز
نالۂ عندلیب میں ہے نہاں | کون سمجھے اسکوتِ گل کا راز
دل طلبگار ہے حقیقت کا! | چشمِ غفلت مگر اسیرِ مجاز
جس نظر پر تھا اعتمادِ نظر | وہ نظر کر گئی نظر انداز
آخر اپنا لیا مجھے بھی عزیزؔ | کس بلا کے ہیں وہ زمانہ ساز

رشید ارشد۔

کیسے لگے اب نیّا پار | سو گئے سارے کھیون ہار
راہیں بھی ہیں گو پُر خار | چھالوں کو بھی ہے اصرار
تاج و تخت امانت ہیں | تم نے سمجھا ہے بیوپار
کر نہ سکے حق کو مرعوب | قیدِ قفس اور تختۂ دار
چارہ گردں کا رونا کیا | اچھے ہوں گے خود بیمار
ارشدؔ دل کس کس کو دے | ایک انار اور سو بیمار

فضلی۔

اور ہو طوق گراں، اور ہو زنجیر گراں | ناز برداری آشفتہ سراں اور سہی
اور لے پھول مہک اور چہک اے بلبل | اک ذرا خاطرِ خونیں جگراں اور سہی

حیدر دہلوی۔

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بود و باش اچھی | بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی
ابھی ماحول معیارِ سخن میں پست ہے حیدرؔ | یکایک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

حکیم آزاد انصاری۔

شاید تمھیں ہنوز یہ الف ظ یاد ہوں | تجھ سے دغا کرے تو خدا سے دغا کرے

عباس میرٹھی۔

مری نگاہ کی تصویر کوئی لے لیتا | اٹھا رہا ہے زمانہ اس آستاں سے مجھے

سید ابوالاعلیٰ مودودی

انسانی کوتاہیاں

انسانی عجز کا کمال دیکھئے کہ جتنے نظامِ تمدن خود انسان نے وضع کئے ہیں۔ ان میں سے ایک میں بھی فطرت کی ان معلوم و معروف ہدایات ... پر بہ تمام و کمال اور بہ حسن تناسب ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کے مقتضیات سے ناواقف نہیں ہے ... اس سے خود اپنی ذہنی کیفیات اور جسمانی خصوصیات بھی چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ آج تک وہ کوئی ایسا معتدل نظامِ تمدن وضع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جس کے اصول و مناہج میں پورے توازن کے ساتھ ان سب مقتضیات ... خصوصیات اور سب مصالح و مقاصد کی رعایت کی گئی ہو۔

نارسائی کی حقیقی علت

اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اس کی نظر کسی معاملے کے تمام پہلوؤں پر من حیث الکل حاوی نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ کوئی پہلو سب سے زیادہ اپیل کرتا ہے اور اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھر جب وہ ایک طرف مائل ہو جاتا ہے تو دوسرے اطراف یا تو اس کی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہو جاتے ہیں ... وہ قصداً ان کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ زندگی کے جزئی اور انفرادی معاملات تک میں انسان کی یہ کمزوری نمایاں نظر آتی ہے، پھر بھلا کیسے ممکن ہے کہ تمدن و تہذیب کے وسیع تر مسائل۔ جن میں سے ہر ایک اپنے اندر بے شمار جلی و خفی گوشے رکھتا ہے۔ اس کمزوری کے اثر سے محفوظ رہ جائیں۔ علم و عقل کی دولت سے انسان کو سرفراز تو ضرور کیا گیا ہے۔ اور عموماً زندگی کے معاملات میں خالص عقلیت اس کی رہنما نہیں ہوتی۔ جذبات اور رجحانات پہلے اس کو ایک رُخ پر موڑ دیتے ہیں۔ پھر جب وہ اس خاص رُخ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، تب عقل سے استدلال کرتا ہے اور علم سے مدد لیتا ہے۔ اس حالت میں، اگر خود اس کا علم اس کو معاملے کے دوسرے رُخ دکھائے اور اس کی اپنی عقل اس کی یک رُخی پر متنبہ کرے تب بھی وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا بلکہ علم و عقل کو مجبور کرتا ہے کہ اس کے رجحان کی تائید میں دلائل اور تاویلات فراہم کریں —!

چند نمایاں مثالیں

معاشرت کے جس مسئلہ سے اس وقت ہم بحث کر رہے ہیں۔ اس میں انسان کی یہی یک رُخی اپنی افراط و تفریط کی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے —!

ایک گروہ اخلاق اور روحانیت کے پہلو کی طرف جُھکا اور اس میں یہاں تک غلو کر گیا کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق ہی کو سرے سے ایک قابلِ نفرت چیز قرار دے بیٹھا۔ یہ بے اعتنائی ہم کو بودھ مت، مسیحیت اور بعض ہندو مذاہب میں نظر آتی ہے، اور اسی کا اثر ہے کہ اب تک دُنیا کے ایک بڑے حصہ میں صنفی تعلق کو بجائے خود ایک بدی سمجھا جاتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ ازدواج کے دائرے میں ہو یا اس سے باہر۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

یہ کہ رہبانیت کی غیر فطری اور غیر مطمئن زندگی کو اخلاق اور طہارتِ نفس کا نصب العین سمجھا گیا۔

نوعِ انسانی کے بہت سے افراد نے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو فطرت سے انحراف بلکہ جنگ میں ضائع کر دیا

اور جو لوگ فطرت کے اقتضاء سے باز رہے بھی تو اس طرح جیسے کوئی شخص مجبوراً اپنی کسی گندی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلق نہ تو زوجین کے درمیان محبت اور تعاون کا تعلق بن سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی صالح اور ترقی پذیر تمدن وجود میں آسکتا ہے یہی نہیں بلکہ نظامِ معاشرت میں عورت کے مرتبہ کو گرانے کی ذمہ داری بھی بڑی حد تک اسی نام نہاد اخلاقی تصور پر ہے۔ رہبانیت کے پرستاروں نے صنفی کشش کو شیطانی وسوسہ اور اس کشش کی محرک یعنی عورت کو شیطان کا ایجنٹ قرار دیا۔ اور اس کو ایک ایسا ناپاک وجود ٹھہرایا جس سے نفرت کرنا ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو طہارتِ نفس چاہتا ہو۔ بودھ اور ہندو لٹریچر میں عورت کا یہی تصور غالب ہے۔ اور جو نظامِ معاشرت اس تصور کے ماتحت مرتب کیا گیا ہو۔ اس میں عورت کا مرتبہ جیسا کچھ ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے!

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے انسان کے داعیاتِ جسمانی کی رعایت کی توجہ میں اتنا غلو کیا کہ فطرت انسانی تو درکنار۔ فطرت حیوانی کے مقتضیات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ مغربی تمدن میں یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہو چکی ہے کہ اب چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اس کے قانون میں زنا کوئی جرم ہی نہیں ہے۔ جرم اگر ہے تو جبر و اکراہ ہے۔ یا کسی دوسرے کے قانونی حق میں مداخلت۔ ان دونوں میں سے کسی جرم کی شرکت نہ ہو تو زنا (یعنی صنفی تعلقات کا انتشار) بجائے خود کوئی قابلِ تعزیر جرم، حتیٰ کہ کوئی قابلِ شرم اخلاقی عیب بھی نہیں۔

یہاں تک تو وہ کم از کم حیوانی فطرت کی حد میں تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے صنفی تعلق کے جوانی مقصد یعنی تناسل اور بقائے نوع کو بھی نظر انداز کر دیا اور اسے محض جسمانی لطف و لذت کا ذریعہ بنا لیا۔ یہاں پہنچ کر وہی انسان جو احسنِ تقویم پر پیدا کیا گیا تھا، اسفل سافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنی انسانی فطرت سے انحراف کرکے حیوانات کا سا منتشر صنفی تعلق اختیار کرتا ہے جو کسی تمدن کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ پھر وہ اپنی حیوانی فطرت سے بھی انحراف کرتا ہے اور اس تعلق کے فطری نتیجہ۔ یعنی اولاد کی پیدائش کو بھی روک دیتا ہے۔ تاکہ دنیا میں اس کی نوع کو باقی رکھنے والی نسلیں وجود ہی میں نہ آنے پائیں!

ایک جماعت نے خاندان کی اہمیت کو محسوس کیا تو اس کی تنظیم اس قدر بندشوں کے ساتھ کی کہ ایک فرد کو جکڑ کر رکھ دیا۔ اور حقوق و فرائض میں کوئی توازن ہی باقی نہ رکھا۔ اس کی ایک نمایاں مثال ہندوؤں کا خاندانی نظام ہے۔ اس میں عورت کے لئے ارادے اور عمل کی کوئی آزادی نہیں۔ تمدن اور معیشت میں اس کا کوئی حق نہیں۔ وہ لڑکی ہے تو لونڈی ہے۔ بیوی ہے تو لونڈی ہے۔ ماں ہے تو لونڈی ہے۔ بیوہ ہے تو لونڈی سے بھی بدتر زندہ درگور ہے۔ اس کے حصّے میں صرف فرائض ہی فرائض ہیں۔ حقوق کے خانہ میں ایک عظیم الشان صفر کے سوا کچھ نہیں۔

اس نظامِ معاشرت میں عورت کو ابتدا ہی سے ایک بے زبان جانور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ اس میں سرے سے اپنی خودی کا کوئی شعور پیدا ہی نہ ہو۔ بلاشبہ اس طریقہ سے خاندان کی بنیادوں کو بہت مضبوط کر دیا گیا۔ اور عورت کی بغاوت کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ لیکن جماعت کے پورے نصف حصّے کو ذلیل اور پست کرکے اس نظامِ معاشرت نے درحقیقت اپنی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت اور بڑی خطرناک صورت پیدا کر دی۔ جس کے نتائج کو اب خود ہندو بھی محسوس کر رہے ہیں۔

ایک دوسری جماعت نے عورت کے مرتبہ کو بلند کرنے کی کوشش کی اور اس کو ارادہ و عمل کی آزادی بخشی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ خاندان کا شیرازہ ہی درہم برہم کر دیا۔ بیوی ہے تو آزاد۔ بیٹی ہے تو آزاد۔ بیٹا ہے تو آزاد۔ خاندان کا درحقیقت کوئی سردھرا نہیں۔ کسی کو کسی پر اقتدار نہیں۔ بیوی سے شوہر نہیں پوچھ سکتا کہ تو نے رات کہاں بسر کی۔ بیٹی سے باپ نہیں پوچھ سکتا کہ تو کس سے ملتی ہے۔ اور کہاں جاتی ہے۔ زوجین درحقیقت دو برابر کے دوست ہیں۔ جو مساوی شرائط کے ساتھ مل کر ایک گھر بناتے اور ...

یت اس ایسوسی ایشن میں محض چھوٹے ارکان کی سی ہے۔ مزاج اور طبائع کی ایک ادنیٰ ناموافقت اس بنے ہوئے گھر کو ہر وقت بگاڑ سکتی
کیونکہ اطاعت کا ضروری عنصر جو ہر نظم کو برقرار رکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ اس جماعت میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ مغربی
شرت ہے۔ وہی مغربی معاشرت جس کے علمبرداروں کو اصول تمدن و عمران میں پیغمبری کا دعویٰ ہے۔ ان کی پیغمبری کا صحیح حال آپکو
نا ہو تو یورپ اور امریکہ کی کسی عدالتِ نکاح و طلاق یا کسی عدالت جرائم اطفال کی روداد اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ابھی حال میں
ستان کے ہوم آفس سے جرائم کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سن لڑکوں اور لڑکیوں میں
م کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اور اس کی خاص وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خاندان کا ڈسپلن بہت کمزور ہو گیا
ملاحظہ ہو: (Blue book of crime statistic for 1924

انسان اور خصوصاً عورت کی فطرت میں شرم و حیا کا جو مادہ رکھا گیا ہے۔ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور عملاً لباس اور
معاشرت کے اندر اس کی صحیح ترجمانی کرنے میں تو کسی انسانی تمدن کو کامیابی نہیں ہوئی۔ شرم و حیا کو انسان اور خاص کر عورت
بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے۔ مگر لباس و معاشرت میں اس کا ظہور کسی عقلی طریقہ اور کسی ہموار ضابطہ کی صورت میں نہیں
ستر عورت کے صحیح حدود متعین کرنے، اور یکسانی کے ساتھ ان کو ملحوظ رکھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ مردوں اور عورتوں کے
س اور ان کے آداب و اطوار میں حیاداری کی صورتیں کسی اصول کے تحت مقرر نہیں کی گئیں۔ معاشرت میں مرد اور مرد۔ عورت اور عورت
اور عورت کے درمیان کشف و حجاب کی مناسب اور معقول حد بندی کی ہی نہیں گئی۔

تہذیب و شائستگی اور اخلاقِ عامہ کے نقطۂ نظر سے یہ معاملہ جتنا اہم تھا۔ اتنا ہی اس کے ساتھ تغافل برتا گیا۔ اس کو
تو رسم و رواج پر چھوڑ دیا گیا۔ حالانکہ رسم و رواج اجتماعی حالات کے ساتھ بدل جانے والی چیز ہے۔ اور کچھ افراد کے ذاتی رجحان
انتخاب پر منحصر کر دیا گیا۔ حالانکہ نہ جذبۂ شرم و حیا کے اعتبار سے تمام اشخاص یکساں ہیں اور نہ ہر شخص ذہنی سلامت ذوق
صحیح قوتِ انتخاب رکھتا ہے کہ اپنے اس جذبے کے لحاظ سے خود کوئی مناسب طریقہ اختیار کر سکے۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مختلف جماعتوں کے لباس اور معاشرت میں حیاداری اور بے حیائی کی عجیب آمیزش نظر آتی ہے۔ جس میں
ئی عقلی مناسبت، کوئی یکسانی۔ کوئی ہمواری۔ کسی اصول کی پابندی نہیں پائی جاتی۔ مشرقی ممالک میں تو یہ چیز صرف بے ڈھنگے پن
تک محدود رہی۔ لیکن مغربی قوموں کے لباس اور معاشرت میں جب بے حیائی کا عنصر زیادہ بڑھا تو انہوں نے سرے سے شرم
حیا کی جڑ ہی کاٹ دی۔ ان کا جدید نظریہ یہ ہے کہ:-

" شرم و حیا دراصل کوئی فطری جذبہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ محض لباس پہننے کی عادت نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ ستر عورت اور
حیاداری کا کوئی تعلق اخلاق اور شائستگی سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ درحقیقت انسان کے داعیاتِ صنفی کو تحریک دینے والے
اسباب میں سے ایک سبب ہے۔"

اسی فلسفۂ بے حیائی کی عملی تفسیریں ہیں یہ نیم عریاں لباس۔ وہ جسمانی حسن کے مقابلے۔ وہ برہنہ ناچ۔ وہ ننگی تصویریں۔
وہ اسٹیج پر فاحشانہ مظاہرے۔ وہ برہنگی کی روز افزوں تحریک۔ وہ حیوانیتِ محضہ کی طرف انسان کی واپسی۔

یہی بے اعتدالی اس مسئلہ کے دوسرے اطراف میں بھی نظر آتی ہے۔

جن لوگوں نے اخلاق اور عصمت کو اہمیت دی۔ انہوں نے عورت کی حفاظت ایک جاندار، ذی عقل، ذی روح وجود کی حیثیت
سے نہیں کی۔ بلکہ ایک بے جان زیور۔ ایک قیمتی پتھر کی طرح کی۔ اور اس کی تعلیم و تربیت کے سوال کو نظرانداز کر دیا۔ حالانکہ تہذیب

تمدن کی بہتری کے لئے یہ سوال عورت کے حق میں بھی اتنا ہی اہم تھا، جتنا مرد کے لئے تھا۔ برخلاف اس کے جنہوں نے تعلیم و تربیت کی اہمیت کو محسوس کیا انہوں نے اخلاق اور عصمت کی اہمیت کو نظر انداز کرکے ایک دوسری حیثیت سے تمدن و تہذیب کی تباہی کا سامان مہیا کر دیا۔

جن لوگوں نے فطرت کی تقسیم عمل کا لحاظ کیا۔ انہوں نے تمدن و معاشرت کی خدمات میں سے صرف خانہ داری اور تربیت اطفال کی ذمہ داریاں عورت پر عائد کیں اور مرد پر رزق مہیا کرنے کا بار ڈالا۔ لیکن اس تقسیم میں وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ انہوں نے عورت سے تمام معاشی حقوق سلب کر لئے۔ وراثت میں اس کو کسی قسم کا حق نہ دیا۔ ملکیت کے تمام حقوق مرد کی طرف منتقل کر دیئے۔ اور اس طرح معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے دست و پا کرکے عورت اور مرد کے درمیان درحقیقت لونڈی اور آقا کا تعلق قائم کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ، تھا۔ جس نے اس بے انصافی کی تلافی کرنی چاہی اور عورت کو اس کے معاشی و تمدنی حقوق دلانے کا ارادہ کیا۔ مگر یہ لوگ ایک دوسری غلطی کے مرتکب ہو گئے۔ ان کے دماغوں پر مادیت کا غلبہ تھا۔ اس لئے انہوں نے عورت کو معاشی و تمدنی غلامی سے نجات دلانے کے معنی یہ سمجھے کہ اس کو بھی مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا فرد بنا دیا جائے۔ اور تمدن کی ساری ذمہ داریوں کے سنبھالنے میں مرد کے ساتھ برابر کا شریک کیا جائے۔ مادیت کے نقطۂ نظر سے اس طریقے میں بڑی جاذبیت تھی۔ کیونکہ اس سے نہ صرف مرد کا بار ہلکا ہو گیا بلکہ کسب معیشت میں عورت کے شریک ہو جانے سے دولت کے حصول اور اسباب عیش کی فراہمی میں قریب قریب دوچند کا اضافہ بھی ہو گیا۔ مزید برآں قوم کی معاشی اور عمرانی مشین کو چلانے کے لئے پہلے کے مقابلے میں دوگنے ہاتھ اور دوگنے دماغ مہیا ہو گئے۔ جس سے یکایک تمدن کے ارتقاء کی رفتار تیز ہو گئی۔ لیکن مادی اور معاشی پہلو کی طرف اس قدر حد سے زائد مائل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پہلو جو درحقیقت اپنی اہمیت میں اس ایک پہلو سے کچھ کم نہ تھے۔ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اور بہت سے پہلوؤں کو انہوں نے جانتے بوجھتے نظر انداز کر دیا۔

انہوں نے قانونِ فطرت کو جاننے کے باوجود قصداً اس کی خلاف ورزی کی۔ جس پر خود ان کی اپنی سائنٹفک تحقیقات شہادت دے رہی ہیں۔

انہوں نے عورت کے ساتھ انصاف کرنے کا دعویٰ کیا۔ مگر درحقیقت بے انصافی کے مرتکب ہوئے جس پر خود ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات گواہ ہیں۔

انہوں نے عورت کو مساوات دینے کا ارادہ کیا۔ مگر درحقیقت نا مساوات قائم کر بیٹھے۔ جس کا ثبوت خود ان کے اپنے علوم و فنون فراہم کر رہے ہیں۔

انہوں نے تمدن و تہذیب کی اصلاح کرنی چاہی۔ مگر درحقیقت اس کی تخریب کے نہایت خوفناک اسباب پیدا کر دیئے جن کی تفصیلات خود انہی کے بیان کردہ واقعات اور خود ان کے اپنے فراہم کردہ اعداد و شمار سے ہم کو معلوم ہوتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ وہ ان حقائق سے بے خبر نہیں ہیں۔ مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے لئے قانون بنانے میں تمام مصلحتوں کی معتدل اور متناسب رعایت ملحوظ نہیں رکھ سکتا۔ ہوائے نفس اس کو افراط کے کسی ایک رُخ پر بہا لے جاتی ہے۔ اور جب وہ بہہ جاتا ہے تو بہت سی مصلحتیں اس کی نظر سے چھپ جاتی ہیں۔ اور بہت سی مصلحتوں اور حقیقتوں کے دیکھنے اور جاننے کے باوجود وہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اس قصدی و ارادی اندھے پن کا ثبوت ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے کہ خود ایک ایسے ہی اندھے کی شہادت پیش کر دیں۔ روس کا ایک ممتاز سائنسدان انتون نیملاف جو سو فیصدی کمیونسٹ

ہے اپنی کتاب The Biological Tragedy of Woman میں سائنس کے تجربات اور مشاہدات سے خود ہی عورت اور مرد کی فطری نامساوات ثابت کرنے پر تقریباً دو تہائی صفحے سیاہ کرتا ہے۔ مگر پھر خود ہی اس تمام سائنٹفک تحقیق کے بعد لکھتا ہے:-

"آجکل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو تمام تمدن میں محدود حقوق دئیے جائیں تو کم سے کم آدمی اس کی تائید کریں گے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکا نہ دینا چاہیئے۔ کہ مساوات مرد و زن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی جتنی سوویٹ روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گئے۔ مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے۔"

نہ صرف خاندان میں بلکہ سوسائٹی میں بھی۔

"اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل، نہایت گہرا تخیل، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجے کے ہیں۔ بلکہ اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ سوویٹ طبقوں میں بھی جما ہوا ہے۔ اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر ان کے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبے سے گرا ہوا سمجھیں گی۔ بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کریں گی۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنٹسٹ، کسی مصنف، کسی طالب علم، کسی تاجر، یا کسی سو فیصدی کمیونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلدی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ عورت کو وہ اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانۂ حال کے کسی ناول کو پڑھیں۔ خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو یقیناً اس میں ہم کو کہیں کہیں ایسی عبارتیں ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائیں گی۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورت واقعی سے ٹکرا جاتے ہیں۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے۔ اور دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔"

ایک اقتباس اور دیکھ لیجئے۔ پھر نتیجہ آپ خود نکال لیں گے:-

"سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمال میں صنفی انتشار کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت پُرخطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ ہر ممکن طریقے سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں۔ میں ہزاروں ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی نہ صرف ناواقف لوگوں میں بلکہ طبقۂ عمال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے۔"

ان عبارتوں کی شہادت کیسی کھلی ہوئی شہادت ہے۔ ایک طرف یہ اعتراف ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان فطرت نے خود ہی مساوات نہیں رکھی۔ عملی زندگی میں بھی مساوات قائم کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ اور جس حد تک فطرت سے لڑ کر اس قسم کی مساوات قائم کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فواحش کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا۔ جس سے سوسائٹی کا سارا نظام خطرے میں پڑ گیا۔

دوسری طرف یہ دعویٰ ہے کہ نظامِ اجتماعی میں عورت کے حقوق پر کسی قسم کی حد بندیاں نہ ہونی چاہئیں۔ اور اگر ایسا کیا جائے گا تو ہم اس کی مخالفت کریں گے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہوگا کہ انسان ــــ جاہل نہیں بلکہ عالم۔ عاقل۔ نہایت باخبر انسان بھی ــــ اپنے نفس کے رجحانات کا اتنا غلام ہوتا ہے کہ خود اپنی تحقیق کو جھٹلاتا ہے۔ اپنے مشاہدات کی نفی کرتا ہے۔ اور سب طرف سے آنکھیں بند کر کے ہوائے نفس کے پیچھے ایک ہی رُخ پر انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ خواہ اس افراط کے خلاف اس کے اپنے علوم کتنی ہی محکم دلیلیں پیش کریں۔ اس کے کان کتنے ہی واقعات سُن لیں۔ اور اس کی آنکھیں کتنے ہی بُرے نتائج کا مشاہدہ کرلیں۔

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (الجاثیہ ۳)

قانونِ اسلام کی شانِ اعتدال

بے اعتدالی اور افراط و تفریط کی اس دُنیا میں صرف ایک نظامِ تمدن ایسا ہے جس میں غایت درجہ کا اعتدال و توازن پایا جاتا ہے۔ جس میں فطرتِ انسانی کے ایک ایک پہلو۔ حتیٰ کہ نہایت خفی پہلو کی بھی رعایت کی گئی ہے۔ انسان کی جسمانی ساخت اور اس کی حیوانی جبلّت اور اس کی انسانی سرشت اور اس کی نفسی خصوصیات۔ اور اس کے فطری داعیات کے متعلق نہایت مکمل اور تفصیلی علم سے کام لیا گیا ہے اور ان میں سے ایک ایک چیز کی تخلیق سے فطرت کا جو مقصد ہے اس کو بہ تمام و کمال اس طریقہ سے پُورا کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے مقصد حتیٰ کہ چھوٹے سے چھوٹے مقصد کو بھی نقصان نہیں پہنچتا۔ اور بالآخر یہ سب مقاصد مل کر اس بڑے مقصد کی تکمیل میں مددگار ہوتے ہیں جو خود انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔

یہ اعتدال، یہ توازن، یہ تناسب اتنا مکمل ہے کہ کوئی انسان خود اپنی عقل اور کوشش سے اس کو پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ انسان کا وضع کیا ہوا قانون ہو اور اس میں کسی جگہ بھی یک رخی ظاہر نہ ہو۔ ناممکن! قطعی ناممکن!! خود وضع کرنا تو درکنار حقیقت یہ ہے کہ معمولی انسان تو اس معتدل و متوازن اور انتہائی حکیمانہ قانون کی حکمتوں کو پُوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتا۔ جب تک کہ وہ غیر معمولی سلامتِ طبع نہ رکھتا ہو اور اس پر سالہا سال تک علوم اور تجربات کا اکتساب نہ کرلے۔ اور پھر برسوں غور و خوض نہ کرتا رہے۔ میں اس قانون کی تعریف اس لئے نہیں کرتا ہوں کہ میں اسلام پر ایمان لایا ہُوں۔ بلکہ دراصل میں اسلام پر ایمان لایا ہی اس لئے ہوں کہ مجھے اس میں کمال درجہ کا توازن اور تناسب اور قوانینِ فطرت کے ساتھ تطابق نظر آتا ہے۔ جسے دیکھ کر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یقیناً اس قانون کا واضع وہی ہے۔ جو زمین و آسمان کا فاطر اور غیب و شہادت کا عالم ہے۔ اور حق یہ ہے کہ مختلف سمتوں میں بہک جانے والے بنی آدم کو عدل و توسّط کا محکم طریقہ وہی بتا سکتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ
الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ
بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ
يَخْتَلِفُوْنَ۔ (الزمر۔ ۵)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

پاکستان سے کرکٹ ٹیم انگلستان گئی تھی۔ اور "گئی تھی" اس ٹیم کی شان تقدس میں کہیں گستاخی نہ سمجھی جائے۔ اس لئے عرض کیا جاتا ہے کہ "تشریف لے گئی تھی" وہاں پاکستانی ٹیم نے بہت سے میچ جیت لئے۔ بہت خوب ہوا "ہپ ہپ ہرے۔۔ "پاکستانی کھلنڈرے زندہ باد" تماشائی یہ نہیں کہتا کہ فٹ بال، ہاکی، کرکٹ کھیلنا شرعی نقطۂ نگاہ سے کوئی گناہ کی بات ہے۔ عرض کرنا صرف یہ ہے کہ وہ قوم جو کشمیر کو اب تک نہ لے سکی۔ اسے کرکٹ ٹیم کی فتح پر کیا جشن منانے کا حق پہنچتا ہے؟ وہ قوم جس کے جوانوں میں جذبۂ جہاد و سرفروشی موجزن ہونا چاہئے تھا۔ اس کرکٹ ٹیم کے ہنگامہ میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ گلیوں میں۔ کوچوں میں۔ اور سڑکوں پر جوان بلکہ بچے تک گیند بلا کھیلتے نظر دکھائی دیتے ہیں۔ اخباروں میں کرکٹ کھلاڑیوں کے فوٹو دیکھ کر اور ان کے استقبال اور خیر مقدم کی تفصیلات پڑھ کر ان کا جی بھی للچاتا ہے کہ ہم بھی اسی طرح نام اور شہرت حاصل کریں۔!

قوم کے نوجوان جب خالد سیف اللہ اور حیدر کرار بننے کے بجائے "ہابس" اور "بریڈ مین" بننے کی تمنا رکھتے ہوں۔ تو پھر تو نسل کے نشو و نما، اور ان کے ذہنی ارتقاء کا بخدا معلوم!

ہائے وہ شاہین بچے جو "زاغ و کرگس" بننا چاہتے ہوں۔!

پاکستان کی کچھ "مسماتیں" ایک خیر سگالی کا وفد لے کر چین تشریف لے گئی ہیں۔ کیا دل گردہ ہے ان "خواتین کرام" کا اور کیا ہمت ہے ان "لیڈرانیوں" کی کہ تن تنہا آزادی اڑتی پھرتی ہیں۔ یہ غیر ملکوں کے دوروں میں کیا کریں گی؟ یہی کہ غیر مردوں سے مسکرا مسکرا کر "شیک ہینڈ" کریں گی۔ ان کے ساتھ پارٹیوں اور لفزیح کے جلسوں میں شانہ بشانہ شریک ہوں گی۔ یہ اس قوم کی بہو بیٹیاں ہیں جس کے دین میں محرم مرد کے بغیر حج بیت اللہ جانے کی اجازت نہیں ہے۔ جس میں عورت کو غیر مرد سے ضرورت کے وقت بات کرنے کی ان شرطوں کے ساتھ اجازت دی گئی ہے کہ بولنے والی پردے سے بات کرے اور بات کا انداز اس طرح کا ہو کہ سننے والے کے دل میں کوئی "تمنا" پیدا نہ ہو جائے!

وہ پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اس کی عورتیں اس طرح وفود اور مشنوں میں جا جا کر پاکستان کی کتنی غلط نمائندگی کر رہی ہیں۔ پاکستان کے مقصد وجود کے ساتھ یہ کتنا دردناک مذاق ہے!

وہ اسلام جو محمد رسول اللہ نے پیش فرمایا تھا۔ اس میں تو ایسی باتیں مسلمان عورتوں کو زیب نہیں دیتیں۔ ہاں! مصطفیٰ کمال کے "اسلام" میں یہ باتیں البتہ جائز ہو سکتی ہیں!

یہ کیا ہو رہا ہے ــــ ہماری "عورتیں" کہاں جا رہی ہیں؟ پاکستان کی معاشرت کا یہ کیا رنگ ہے؟ جن کے سامنے مریمؑ و فاطمہؓ۔ خدیجہؓ و عائشہؓ کی سیرتیں ہونی چاہیئے تھیں۔ وہ بے نکشی کی نقالی کر رہی ہیں ـــ! پاکستان بننے کے بعد جہاں اور

تماشے دیکھے ہیں۔ وہاں ان کم بخت آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھ لیا۔ یہ تو ابتدا ہے اگر اس سیلاب کو چیک نہ کیا گیا! تو یہاں وہ سب کچھ ہوگا جو ننگا ہو رہا ہے طہران اور لندن اور پیرس میں ہوتا ہے!

حیا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ایمان کی شاخ" فرمایا ہے۔ جب یہ شاخ ہی مرجھا گئی تو پھر اسلامی تمدن کا آشیانہ کس شاخ پر باندھا جائے گا!

پاکستان کے وہ عوام جن میں اسلامی غیرت خدا کے فضل سے باقی ہے ان مناظر کو آخر کب تک تماشائی بن کر دیکھتے رہیں گے ---!

پاکستان کا ترانہ سات سال کے بعد بنا۔ مگر بن تو گیا۔ مطلب بننے سے ہے۔ یہ نہ کہو کہ کیسا بنا؟ اس میں کیا خامیاں ہیں ---- یا یہ کہ اسے بننا کیسا چاہیئے تھا! اور یہ ادیب، شعراء اور اخبار نویس اس ترانہ کی مخالفت جو کر رہے ہیں۔ یہ سب "حاسد" معلوم ہوتے ہیں معاصرانہ رقابت! رشک و حسد کی آگ یونہی جلتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کے کہہ دینے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ چیخا اور چلایا کریں۔ مگر "ترانہ" تو بن چکا اور پاکستان کے ریڈیو سے مسلسل نشر کیا جا رہا ہے۔ کھلے خزانے، ڈنکے کی چوٹ! اب کہیئے!

کہا جاتا ہے کہ اعتراض کرنے والوں کے پاس ترانہ کی خرابیوں کے بارے میں بہت قوی دلائل ہیں۔ ہوا کریں، مگر ؎

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند!

جو فرمادیا گیا ہے۔ تو یہ "رموزِ مملکت"، "وہ" "اسرارِ جہاں بانی" ہیں۔ ان پر گفت گو کرنا ہی بہت بڑی بے دانشی ہے! بلکہ بعض اوقات تو یہ بے دانشی اور حماقت "سول نافرمانی" بن جاتی ہے!

لوگ تو حکومت کے کاموں پر تنقید کے عادی ہو گئے ہیں۔ کوئی اچھی بات بھی ہو تو اس میں بھی مین میکھ ضرور نکال کر رہیں گے۔ ان کم بختوں کے منہ سے حکومت کی تعریف میں ایک لفظ نہیں نکلتا۔ مگر تنقید اور عیب جوئی کے دفتر کھنگال کر رکھ دیں گے۔ ناشکرے کہیں کے!

مگر حضور فیض گنجور! جان کی اماں پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ اس لئے کہ ؎

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں!

گزارش یہ ہے کہ یہ ترانہ اپنی دھن (Tune) کے اعتبار سے ہم غریب اور ناشائستہ پاکستانیوں کے مزاج کے مطابق نہیں ہے اس ترانہ کا زیر و بم۔ اس کی لے۔ اس کی موسیقی۔ اس کا ٹھاٹ اور انداز .... سو فیصدی "مغربی" ہے۔ اسے ---- جی کیا کہا..... "پاکستانیوں کا مزاج"! تو ان کا مزاج اگر بگڑ گیا ہے یا پہلے سے بگڑا ہوا ہے تو اب ٹھیک ہونا پڑے گا!

پاکستانیوں کا اول تو "مزاج" ہی کیا اور اگر ان کا "مزاج" مغرب کے ترقی یافتہ مزاج سے مطابقت نہیں کرتا تو اس کی یہ خامی دور کی جائے گی۔ اور یہ "ترانہ" اسی اصلاح مزاج کی طرف پہلا قدم ہے کہ اپنے سامعہ کو، ذوق کو، طبیعت اور مزاج کو۔ "مغربی مزاج" کے مطابق بناؤ ---- اور قدامت پرستی کا لبادہ اتار کر ترقی اور روشن خیالی کا گون (GOWN) پہن لو۔

مگر سرکار والا تبار! اس ترانہ میں اسلام کا۔ قرآن کا۔ رسول اللہ کا یعنی کسی اسلامی شعار و آثار کا نام تک نہیں آیا.....

تو اس کے بارے میں حضور کا کیا ارشاد ہے ---- پاکستان کا ترانہ فرقہ وارانہ اور رجعت پسندانہ نہیں ہے۔ اسے بین الاقوامی مصالح اور اس کی نزاکتوں پر نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ پیرس، لندن اور واشنگٹن کے رہنے والے، اسلام، قرآن اور رسول کے نام سے نامانوس ہیں۔ پاکستان ساری دنیا سے کٹ کر کس طرح رہ سکتا ہے!

بجا فرمایا حضور پُرنور نے! تو بندہ پرور! اس "ترانہ" کو پاکستانیوں میں مقبول بنانے کے لئے حضور سائنس کی مدد سے ان لوگوں کے سینوں، کھوپڑیوں اور کانوں کے پردوں کا آپریشن کر دیں اور ان میں مغرب کا دل، مغرب کا دماغ اور مغرب کا سامعہ رکھوا دیں۔ بس پھر کوئی پاکستانی اس "ترانہ" کو سُن کر چوں بھی کر جائے تو اس نیاز مند کا بلا کھٹکے کورٹ مارشل فرما دیا جائے!

اُردو زبان کے متعلق بھارت ورش کے بعض "نیتا" ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ زبان ہندوستان میں کہیں نہیں بولی جاتی یہاں تک کہ اُتر پردیش (یو۔پی) میں بھی اس کا وجود نہیں ملتا۔ بھارت کے "نیتاؤں" "مہا پُرشوں" کا کیا کہنا۔ وہ تو کچھ بھی کہہ دیں اور کر گزریں تھوڑا ہے۔ جس کے پاس حکومت ہو۔ فوج ہو، پولیس ہو۔ قید خانے اور پھانسی کے تختے ہوں۔ وہ اپنی طاقت کے زور پر جو بات بھی کہہ دے اسے ماننا پڑے گا۔ دلیلیں تو کمزور آدمی دیا کرتے ہیں۔ طاقت بلکہ یوں کہیے "ڈنڈا" اپنی جگہ خود محکم دلیل ہے۔ جسے لفظوں کے ذریعہ کسی طرح توڑا ہی نہیں جا سکتا!

بھارت کے "نیتا" اگر یہ کہنے لگیں کہ "تاج محل ایک درخت کا نام ہے ۔۔۔ ہمالیہ ایک تالاب ہے ۔۔۔ گنگا اور جمنا دو سوتیلی بہنیں ہیں ۔۔۔ خلیج بنگال ایک لق و دق ریگستان ہے ۔۔۔ تو اُن کے ان ارشادات کو بہرحال ڈنڈے کے زور پر مظلوموں کو ماننا ہی پڑے گا!

طاقت کا نشہ اور تعصب کی آگ جب مل جائیں تو ان کے امتزاج سے جو چیز تیار ہوتی ہے اس کی خوفناکی کا کیا پوچھنا۔ اللہ تعالیٰ اوچھوں اور کم ظرفوں کے سایہ سے بھی اپنی مخلوق کو بچائے رکھے ۔۔۔!

ہندوستان میں

جو حضرات فاران کا خریدار بننا چاہیں۔ وہ اپنا چندہ
مبلغ آٹھ روپے
دفتر الحسنات رامپور (یو۔پی)
کو روانہ فرما کر ہمیں مطلع فرمائیں۔

(منیجر)

ہماری نظر میں

کتاب التوحید

"کتاب التوحید" ۔ تالیف: شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب ۔ مترجم: ۔ مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن محمد السورتی ۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات (بڑا سائز) کتابت ۔ طباعت اور کاغذ خوب سے خوب تر ۔ مجلد، رنگین وحسین گرد پوش کے ساتھ ۔ ملنے کا پتہ: ۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ ۔ کراچی ۔

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کتنی مظلوم ہے کہ وہ مجاہد اٹھا تو تھا اصلاح و تجدید کا علم لے کر مگر اہلِ بدعت کے پروپیگنڈے کے زور نے اس داعیٔ توحید و سنت کو بدنام کر دیا اور بعض لکھے پڑھے لوگ تک اس غلط فہمی در جہالت کا شکار ہیں کہ شیخ عبدالوہاب نجدی نے مسلمانوں میں (معاذ اللہ) اہانتِ رسولؐ اور بزرگانِ دین کی توہین کی بنیاد ڈال دی تھی ۔ اس نسبت سے لفظ "وہابی" کتنا بدنام اور مبغوض لقب ہے ۔

اسی بدنام اور مظلوم مصلح کی معرکہ آرا تالیف "کتاب التوحید" کا ترجمہ ہمارے سامنے ہے ۔ کتاب کے شروع میں حضرت شیخ کے حالاتِ زندگی درج ہیں ۔ پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے ۔ شیخ پہلے عنوان متعین فرماتے ہیں ۔ اس کے نیچے قرآن کی آیات لکھتے ہیں پھر احادیث نبوی اور اس کے بعد "فیہ مسائل" کے تحت ضروری مگر مفید و مختصر مطالب بیان کرتے ہیں ۔ پوری کتاب کا یہی انداز ہے اور اپنے رنگ میں یہ تالیف بے مثال ہے ۔ ترجمہ بھی سلیس اور آسان ہے !

جو شخص بھی اس کتاب کو ایک بار پڑھے گا ۔ اس کے دل میں شیخ کے بارے میں اگر تکدر ہوگا تو انشاء اللہ دور ہو جائے گا ۔ اور شیخ کی عظیم شخصیت کا ایک نقش قائم ہو جائے گا !

فاضل مترجم نے جہاں ضرورت سمجھی ہے شیخ کی عبارت کی شرح بھی کر دی ہے ۔ اور کہیں کہیں شیخ کے کسی "استنباط" سے معقول انداز میں اختلاف بھی کیا ہے ! "کتاب التوحید" شرک و بدعت اور جاہلانہ رسوم و معتقدات کے خلاف نعرۂ جہاد ہے !

سنتِ رسولؐ

"سنتِ رسولؐ" ۔ از: ۔ ڈاکٹر شیخ مصطفےٰ السباعی ۔ مترجم: ۔ ملک غلام علی ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات ۔ مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ ۔ قیمت دو روپے چار آنے ۔ ملنے کا پتہ: ۔ مکتبہ چراغ راہ ۔ بیرون لوہاری دروازہ لاہور ۔

جناب مصطفےٰ الحسنی السباعی حمص (شام) کے مشہور عالم اور فاضل ادیب ہیں ۔ وہ صرف صاحبِ قلم ہی نہیں صاحبِ سیف بھی ہیں جہادِ فلسطین میں چھاپہ مار دستوں کی تنظیم انہی نے کی تھی ۔ سوریا میں اخوان المسلمون انہی کی قیادت میں منظم ہوئے تھے ۔ سباعی صاحب کا قلم اسلام کی خدمت کے لئے وقف ہے ۔ انہوں نے مصر کے بعض مغرب زدہ اہلِ قلم کے مضامین کے جواب بھی دیئے ہیں اور مسکت دلائل کے ساتھ اسلامی نقطۂ نگاہ کی اصابت کو واضح کیا ہے !

"سنتِ رسول" جناب مصطفےٰ سباعی کے ایک مقالہ کا ترجمہ ہے ۔ جس پر "تعارف" مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے ۔ ترجمہ نہایت شستہ اور سلیس ہے اور اس کی صحت کی سب سے بڑی ضمانت مولانا مسعود عالم کی تصدیق ہے کہ مرحوم نے اس ترجمہ کی تعریف کی ہے ۔

"سنتِ رسول" اپنے موضوع پر ایک جامع اور عالمانہ کتاب ہے۔ جس کے ان چند عنوانات سے کتاب کی افادیت کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے:-

۱- سنّت کا مفہوم اور نظامِ دین میں اس کا مقام۔
۲- صحابہ سنتِ رسول کو کس طرح اخذ کرتے تھے۔
۳- عہدِ نبوی میں احادیث کیوں مرتب نہیں کی گئیں۔
۴- موضوع احادیث کی ابتداء۔
۵- راویوں پر نقد و جرح اور ان کے حالات۔
۶- رواۃ کی معرفت۔
۷- اسانید کی جانچ۔

فاضل مصنف نے اُن واقعات کو بھی درج کر دیا ہے۔ جو "منکرینِ حدیث" اپنے مسلک کے ثبوت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اُن کے مقابلہ میں وہ دلائل اور روایتیں بھی پیش کر دی ہیں جن سے دین میں حدیث کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے!

کتاب اپنے موضوع پر یقیناً مفید ہے۔ لیکن کسی کے دل میں حدیث کی طرف سے شکوک پیدا ہو گئے ہوں تو اس کتاب کے بعض اجزاء کے بارے میں اندیشہ ہے کہ انھیں پڑھ کر کہیں یہ شکوک اور زیادہ قوی نہ ہو جائیں!

آہنگِ سرمدی

"آہنگِ سرمدی" یعنی "عرفانِ مختوم" ترجمہ گیتا کے منظوم۔ از:- آثم مظفر نگری۔ حجم ۱۱۶ صفحات۔ مجلد گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان۔ اُردو بازار۔ جامع مسجد۔ دہلی۔

گیتا کا منظوم ترجمہ فارسی زبان میں فیضی نے کیا تھا کہ عہدِ اکبری اس کے لئے موزوں تھا اور اب جناب آثم مظفر نگری نے ہندوستان کی "سیکولر اسٹیٹ" کے عہد میں اس کا اُردو ترجمہ فرمایا ہے۔ اور اسے مکتبہ برہان نے شائع کیا ہے۔ محکوم قوم کا حاکم قوم کے اثرات سے دامن بچانا کتنا دشوار ہے۔

سری کرشن جی نے جنگ مہابھارت میں ارجن کو جو نصیحتیں کی تھیں۔ یہ کتاب انہی مواعظ کا مجموعہ ہے۔ جس میں یقیناً معرفتِ الٰہی کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ کرشن جی نے گیتا میں سب سے زیادہ زور "عمل بے غرض" پر دیا ہے۔ کرشن مہاراج کے مواعظ میں فلسفہ آمیز تصوف ملتا ہے!

لائق مترجم نے دیباچہ (حرفِ تخمین) میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ کرشن جی نے صرف سات اشلوک میں ارجن کو نصیحت کی تھی انہی سات اشلوک کو بڑھا کر بیاس جی نے سات سو اشلوک بنا دیئے — اور یہ بھی کہ گیتا میں جہاں دیوتاؤں کی پرستش کا ذکر ہے۔ وہ سری کرشن جی کی رائے قرار نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ کرشن جی نے صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ غیر اللہ کی پوجا کسی طرح جائز نہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ "توحید و شرک" کا یہ تضاد گیتا میں ملتا ہے۔ گیتا کا وہ طرزِ بیان جس سے شرک کی بو آتی ہے۔ خدا کرے کہ الحاقی اور اضافی ہو!

جناب آثم مظفر نگری نے منظوم ترجمہ میں بڑی کاوش کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں یہ رنگ ہے:-

ہے ہر اہلِ دل فارغ کیف و کم ۔۔۔ نہ خورسند شادی نہ مجروحِ غم
بجز ذاتِ حق دو جہاں میں کوئی ۔۔۔ نہیں ہے نہیں لائقِ بندگی!

وہ پرہائے طاؤس کا سر پہ تاج | کہ حسنِ دو عالم ہے جس کا خراج

وہاں نظم بہت شگفتہ اور جاندار ہے۔ مگر جہاں ترجمہ اس انداز کا ہے۔

ع۔ جو مارے گئے مجھ سے یہ جملہ تھے

ع۔ باخلاق بد ہیں بڑے فتنہ گر

ہے آزاد ہر خصمی و دوستی | سمجھ لیجئے ہے وہی سادگی

یہ جور و ستم جمع ند کرتے ہیں | تہہ بار عصیاں بسر کرتے ہیں

وہاں وجدان بار سا محسوس کرتا ہے۔

دلگ ہو گئے ان سب سے بہرحال | کہ حاصل مقامات عین بقا! (ص ۳۰)

اس شعر میں "حاصل" کی "ح" تقطیع سے گرتی ہے۔ اسی طرح:۔

نتیجہ ہے ہر غم خوشی کا یہاں | اک حلقہ ہے ماتم کا دورِ زماں (ص ۵۰)

اس عالم میں جو آرزو مند ہے | وہ دورِ تناسخ میں پابند ہے (ص ۵۸)

حسد ہے برا اس کو بھی چھوڑنا | ہر حاسد مصیبت میں ہے مبتلا (ص ۹۷)

ان اشعار میں "حلقہ" کی "ح"۔ "عالم" کا "ع"۔ "حاسد" کی "ح" تقطیع سے خارج ہے۔ اس قسم کی غلطیاں متعدد جگہ پائی جاتی ہیں۔

حقیقت میں وہ جاہل و غافل ہے | خدا سے ہے دور اور پُر باطل ہے (ص ۱۰۱)

یہ پورا شعر ناظم کی شان نہیں بلکہ ناپختگی پر دلالت کرتا ہے۔ بعض اشعار ذرا سی کوشش سے اچھے خاصے بن سکتے ہیں۔ اور ان کا جھول دور ہو سکتا ہے۔ ع

ہر عالم میں انسان ہے مجبورِ کار | تفعل سے خالی نہیں جاندار (ص ۱۰۲)

دوسرا مصرعہ اس طرح ہوتا ع

کہ ہے فعلیت فطرتِ جاندار

تو "تفعل" کا ثقل دور ہو جاتا۔

گیتا میں "وحدت الوجود"، "ہمہ اوست" کا فلسفہ اور حسین بن منصور حلاج کے "انا الحق" کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ کتاب و سنت میں توحید خالص کی جو تعلیم ملتی ہے۔ اس کے اعتبار سے اس قسم کے تصورات خطرے سے خالی نہیں۔

اُردو عربی ڈکشنری "اردو عربی ڈکشنری" مرتبہ۔ ابوالفضل عبدالحفیظ (بلیاوی) ضخامت ۸۰۰ صفحات، قیمت چھ روپے مجلد گرد پوش کے ساتھ۔ کتابت اور کاغذ بہتر اور دیدہ زیب۔ ملنے کا پتہ۔ صغیر احمد۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء بادشاہ باغ۔ لکھنؤ۔

"اردو عربی ڈکشنری" مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ (بلیاوی) نے بڑی محنت، کاوش اور تحقیق کے ساتھ مرتب فرمائی ہے۔ جس پر پیش لفظ مولانا ابوالحسن علی میاں نے لکھا ہے۔ یہ لغت اردو کے علمی ذخیرے میں گرانقدر اضافہ ہے۔ اور نہ صرف طلبار بلکہ اہلِ علم بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کہیں کہیں کوئی لفظ کھٹکا بھی۔ مثلاً "سرجری" (Surgery) کے لئے عربی لفظ "تشریح" لکھا ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے "سرجری" کو "جراحی" کہتے ہیں اور اس فن کو "علم الجراحت"۔ "اناٹمی" کا ترجمہ "تشریح الابدان" ہے۔ جس میں "سرجری" کا مفہوم شامل نہیں ہے!

"گیان" کا ترجمہ "علم" اور "گیانی" کا ترجمہ "عالم" بھی محل نظر ہے۔ سنسکرت میں علم کو "گیان" نہیں "ودیا" اور "عالم" کو "ودوان" کہتے ہیں۔ گیان تو فکر و دانش کے لئے بولا جاتا ہے اور "گیانی" عارف۔ اہل خیر اور صاحب دانش و فکر کو کہتے ہیں!

"اردو عربی ڈکشنری" کی ترتیب پر مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ صاحب قابل مبارکباد ہیں اور اس کے ناشرین بھی کہ انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ اس کتاب کو چھاپا ہے!

بوئے دوست

"بوئے دوست" از ۔ ندیم مراد آبادی ۔ ضخامت ۵۰ صفحات ۔ قیمت آٹھ آنہ ۔
ملنے کا پتہ ۔ ضمیر حسین ۔ مرتے کش دن ۔ پیر غیب ۔ مراد آباد ۔ (بھارت)

جناب ندیم مراد آبادی کے کلام کا یہ مجموعہ ہے۔ جو ایک کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ جس سے شاعر کی بے دسیگی ظاہر ہوتی ہے کہ اس غریب کو اپنے مجموعہ کلام کی طباعت کے لئے معمولی وسائل بھی میسر نہیں آسکے۔

جناب ندیم مراد آبادی کے کلام میں جوش اور روانی پائی جاتی ہے۔ یہ شعر کتنے جاندار ہیں:-

رنگ کچھ اور نظر آتا ہے دیوانے کا — اب نہ بستی کا تصور ہے نہ ویرانے کا

کانٹوں کی کیا شکایت جب خود الجھ رہے ہیں — اپنے ہی جیب و دامن اپنی ہی آستیں سے

کیا نہ آئیں گی گلستاں میں بہاریں اب پھر — کیوں ابھی چاک گریباں کئے جاتے ہیں

موج و ساحل کی کشاکش سے گزرنے والے — زیست چڑھتے ہوئے طوفاں کے سوا کچھ بھی نہیں

چمن کے کام آتا ہے گلوں کو رنگ دیتا ہے — وہی اک قطرۂ شبنم کہ جو طوفاں نہیں ہوتا

دوسرا رخ:-

آنکھ والے اک نگاہ ذوق سے لیتے ہیں کام — عشق کو معتبر لگا ہے مکرّر دیکھ کر (ص ۱)

شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل سکے!

جنوں کا عشق میں ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں — چمن کے رخ پہ بیاباں نہیں تو کچھ بھی نہیں (ص ۱۲)

"رخ" یہاں غالباً "سمت" کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ جو وجدان کو کھرا کھرا سا لگتا ہے اور یوں بھی شعر کا مفہوم گنجلک سا ہے!

فضائے طور کیوں خاموش رہتی — برابر مسکرایا جا رہا ہے (ص ۲۵)

آخر شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟

کل تک تھا اُن سے شکوۂ نایابیٔ وفا — وہ آج مجھ سے مجھ کو چھڑا کر چلے گئے (ص ۲۷)

"نایابیٔ وفا" کی ترکیب یہاں شاعر کے مفہوم کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی۔

روح بے تابی سے تکمیل تمنا کیجئے — جس طرف سے گزرئیے اک حشر برپا کیجئے (ص ۳۱)

مصرعہ اولیٰ مہمل ہے۔ دوسرے مصرعہ ثانی میں "گزرئیے" کی "ر" کا سکون وجدان پر کس قدر گراں گزرتا ہے۔ "جس طرف سے بھی گزرئیے حشر برپا کیجئے"۔ اگر یہ مصرعہ اس طرح ہوتا تو "گزرئیے" میں جو عیب ہے وہ جاتا رہتا اور "اک" جو زائد لفظ ہے وہ بھی باقی نہ رہتا۔ (م۔ ق)

گلوں کو دے کے پیامات مسکرانے کے ۔۔۔ تفرقِ روز بہاروں کو کردیا کس نے (ص۳۴)

پیام کی جمع "پیامات" غلط ہے۔
ندیم کا ایک شعر ہے ؎

طرارے بھرنے لگے زندگی کے متوالے ۔۔۔ ہوا کے رُخ پہ غباروں کو کردیا کس نے (ص۳۴)

مصرعہ ثانی کس قیامت کا ہے۔ اس میں کتنا جوش اور جدت و تازگی ہے۔ مگر پہلا مصرعہ اس کے جوڑ کا نہیں ہے۔

نگاہِ شوق اٹھی ہے پیامِ دل بن کر ۔۔۔ ادب کے ساتھ جمالوں کی تاب لائے ہوئے (ص۳۶)

اس شعر میں ابہام نہیں اہمال پایا جاتا ہے۔ اور "جمالوں" (جو "جلوؤں" کے معنی میں غالباً استعمال ہوا ہے) نے شعر کو ایک "اعجوبہ" بنادیا۔

اک دیکھنے والی آنکھوں سے اک جلوۂ پنہاں دیکھیں گے ۔۔۔ ہم دل کا تقرب دیکھ چکے اب قربِ رگِ جاں دیکھیں گے (ص۳۷)

پورا شعر تو مشقوں کا کہا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ پھر "تقرب" کی ثقالت اس پر مستزاد! مفہوم بھی الجھا ہوا ہے۔

ذرہ ذرہ دب رہا تھا زیرِ حسنِ بے ثبات ۔۔۔ رونقِ برگ و شجر کی مٹ گئی تھی کائنات!

"حسنِ بے ثبات کے نیچے ذروں کا دبنا" ایک عجیب مشاہدہ اور نادر (؟) اندازِ بیان ہے۔ دوسرا مصرعہ اور زیادہ بچکانہ ہے۔ اس قسم کے شعر پڑھ کر اور سن کر بڑی کوفت ہوتی ہے!

بھارت میں "فاران"

ایجنٹ صاحبان کو مطلع کیا جاتا ہے کہ:-

وہ مطلوبہ کاپی جناب سید محمد یعقوب حسن صاحب نیوز پیپر ایجنٹ
معرفت مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن
سے طلب فرمائیں۔

زیادہ سہولت اسی میں ہوگی

صاحب موصوف کے نام ہر مہینہ مطلوبہ پرچوں کی رقم بعد وضع کمیشن پچیس ۲۵ فیصدی پیشگی بھیجدی جائے۔

اس سلسلہ میں جو بات

دریافت طلب ہو۔ اس کیلئے دفتر فاران کراچی اور حیدرآباد دکن سے مراسلت فرمائی جائے۔

(منیجر فاران۔ کراچی)

تفہیم القرآن

جلد دوم

سورۃ الاعراف تا سورۃ بنی اسرائیل کے لئے اندرون ملک اور
...ون ملک سے شدید تقاضا کیا جا رہا ہے کہ جلد دوم کس مرحلہ میں ہے
...لد دوم کی اشاعت میں تاخیر ملکی حالات کے سبب تقی او ہے۔
...ہیم القرآن جلد اول جس سائز پر طبع ہوئی تھی۔ اسی سائز پر جلد دوم کی
...تابت ہو کر ایک سال سے پلیٹیں تیار ہو چکی تھیں کہ مطلوبہ سائز کا کاغذ
...یاب ہو گیا۔ اور ... ہنوز نایاب ہے۔
...تی سے ... اس سائز کا
...غذ ... ملک میں بھی
...ال ... تیار نہیں
...سکا ... ان تمام
...ویوں ... کے باوجود
...یں اس "خیر یہ" ... افسوس ہے کہ ہم
...ارین تفہیم القرآن کی دلی خواہشات کو جلد پورا کرنے
...ں کامیاب نہ ہو سکے۔ جس کیلئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ ان حالات کی
...جودگی میں اسپار امپورٹ کردہ کاغذ جو بہت ہی کم مقدار ہے۔ اس کی
...اعت شروع کرا دی ہے۔ امید ہے کہ دسمبر میں جلد دوم مکمل ہو کر فرمائشو
...میل شروع ہو جائیگی انشاءاللہ۔ جن حضرات نے اپنی فرمائش درج نہ
...رائی ہو تو آج ہی اپنی فرمائش درج کرا دیں۔ فرمائشوں کی تعمیل اسی ترتیب سے
...کی جس ترتیب سے ہمارے ہاں درج ہوگی۔

...فہیم القرآن جلد اول طبع اول سورۃ فاتحہ تا الانعام صفحات پونے چھ سو
صفحات سائز ۲۲×۲۹/۸ بہت قلیل تعداد میں باقی ہے۔ ایڈیشن
...م کے متعلق نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کب تک شائع ہو۔ اگر جلد اول ابھی تک
...پ نے نہ لی ہو تو آج ہی طلب فرمائیں۔

...اظم۔ مکتبۂ تعمیر انسانیت۔ ۲۵۰ گوجر گلی۔ موچی دروازہ۔ لاہور

نعیم صدیقی صاحب کی
انوکھی اور خطرناک تصنیف
"دفتر بے معنی"
دلچسپ طنزیہ نگارشات کا مجموعہ
چھپ کر تیار ہو چکا ہے
قیمت مجلد رنگین گرد پوش
۲-۸-۰

وقت کی اہم ترین کتاب شائع ہو گئی!

سید جمال الدین افغانی

جسے صدر جمہوریہ مصر جنرل محمد نجیب
کے اسم گرامی سے (باجازت) نسبت دی گئی ہے۔
پیش لفظ از جناب عبد الرحمٰن صدیقی مرحوم
پانچ نایاب فوٹوؤں سے مزین ہے
قیمت تین روپے چھ آنے — تعداد صفحات ۲۳۰

"تعلیمی مرکز"۔ ۵۰۱ گیڈل الیکھراج روڈ
مقابل مولیدینا مسافر خانہ کراچی (۱)
سے طلب فرمایئے

علمی۔ ادبی۔ سیاسی۔ اصلاحی۔ اقتصادی جریدہ

مدیر اعلیٰ: محمد حسام الدین خان غوری — معاون: ڈرافشاں خانم

ہفت روزہ رہنما کراچی

ماضی کی روشنی، حال کی اصلاح، مستقبل کی تعمیر کیلئے

ہفت روزہ رہنما کراچی
کا مطالعہ کیجئے۔

اس کی پالیسی بے لاگ۔ اس کا دائرہ وسیع۔ علمی، ادبی اور
کاروباری حلقوں میں یکساں مقبول۔
آپ کے ذوق کی تسکین اور آپ کے کاروبار کی توسیع کا ضامن۔
سالانہ چندہ ۱۰ روپے — فی پرچہ چار آنے

مینیجر ہفت روزہ رہنما۔ قاسم آباد (لیمی پاڑہ) کراچی ۵

چمکدار لیکن

سکون بخش

جی سنز کے لیمپ قلیل مدت میں تمام پاکستان میں پھیل گئے
آپ انہیں مکانوں، آفسوں اور فیکٹریوں میں ہر جگہ پائیں گے درحقیقت
ایک اعلیٰ درجہ کی چیز عوام کی خدمت کیلئے پیش کی گئی ہے۔ آپ
جی سنز ہی استعمال کیجئے اس لئے کہ یہ بہترین ہیں

پاکستان میں بنے ہوئے

جی سنز الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ

فاران

جلد ۶ نمبر ۹

ماہنامہ

فاران

دسمبر سنہ ۱۹۵۴ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸/
آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱/

مقام اشاعت

دفتر فاران - کیمبل اسٹریٹ - کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

یہ دُنیا ہے۔ یہ عالم کون و فساد اور رزمگاہ خیر و شر ہے۔ یہاں حق و باطل کے درمیان ہمیشہ کشمکش ہوتی رہی ہے۔ ظلمت نے تاریخ کے ہر دور میں نُور پر غالب آنے کی کوشش کی ہے۔ اور ایسا ہوا بھی ہے۔ کہ بظاہر ظلمت نے نور کو چھپا لیا ہے۔ مگر نُور جب اُبھرا ہے تو پھر ظلمت کو کہیں پناہ نہیں مل سکی۔

جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا!

نیرو (NERO) زحل و مریخ میں نہیں اِسی دُنیا میں پیدا ہوا تھا۔ جس نے انسانوں کے جسموں میں آگ لگا کر چراغاں کا منظر دیکھا تھا۔ اس دردناک ظلم و بے رحمی بلکہ درندگی کے لئے نیرو کے پاس کوئی دلیل جواز نہ تھی۔ مگر ظالم کسی دلیل کے بغیر ظلم کرتا ہے۔ اس کے پاس سب سے بڑی دلیل اس کی "طاقت" ہوتی ہے۔ اور اسی نشہ میں وہ جو بھی چاہتا ہے کر گزرتا ہے!

اسی عالم آب و گِل میں ظالموں نے انسانوں کے کٹے ہوئے سروں کے ڈھیر لگا کر اُن پر تخت بچھائے ہیں۔ اور یہ بھی ہوا ہے کہ غلاموں کو درندوں کے پنجروں میں پھینک کر اُن کے پھاڑے جانے کے مناظر تالیوں اور قہقہوں کی گونج میں دیکھے گئے ہیں!

ظالم جب کمزور ہوتا ہے تو چھپ کر سازشیں کرتا اور طرح طرح کی چالیں چلتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے حریفوں کے قتل کرانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ جب وہ طاقت پکڑ جاتا ہے تو پھر اس کی سفاہت اور درندگی کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔

خفیہ سازشیں اب کھلے ہوئے ظلم سے بدل جاتی ہیں۔ اور چھپے ہوئے دشنے اب آستینوں سے نکل کر ہاتھوں میں آجاتے ہیں۔
پھر سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ:۔

ظلم ہمیشہ "اصلاح و تعمیر" کا نعرہ لگاتا ہوا منظر عام پر آتا ہے۔
تاریخ کسی ایک ایسے ظالم کا نام نہیں بتاتی۔جس نے اپنی زیادتیوں اور دراز دستیوں کو "ظلم" سے تعبیر کیا ہو۔
ظلم نے ہمیشہ اللہ کی زمین میں "اصلاح" کے نام پر فساد کیا ہے۔
مفسدین "مصلحین" کا لباس اوڑھ کر اسٹیج پر آتے ہیں۔

"و اذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض،
قالوا انما نحن مصلحون - الا انھم ھم
المفسدون ولکن لا یشعرون -"

"جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو۔ تو انھوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں!
خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں۔ مگر انھیں شعور نہیں ہے۔"

ظلم و فساد کو دیکھ کر خوددار اور عزت مند لوگ اگر کسی مصلحت کے سبب صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتے تو کم از کم وہ خاموش رہتے ہیں۔

مگر وہ لوگ جو زمانے کی ہوا کے ساتھی۔
غرض کے بندے۔
اور طاقت و اقتدار کے پجاری ہوتے ہیں۔
انہوں نے ظالموں کی شان میں قصیدے پڑھے ہیں۔
اور انھیں ٹوکنے کے بجائے بڑھاوے دے دے کر اُن کو ظلم پر اور جری بنایا ہے!

خوشامدیوں کا یہ وہ بے ضمیر گروہ ہے۔ جو ذرا سے لالچ اور تھوڑے سے خوف کے آگے سربسجود ہو جاتا ہے۔
ہوا پرستوں کی اس ٹولی نے چنگیز اور ہلاکو کو دنیا کا نجات دہندہ کہا ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں نے جب شریف عورتوں کی عصمتیں لوٹی ہیں۔ تو ان کاسہ لیسوں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر عرض کیا ہے کہ:۔

حُسن و دوشیزگی اور شباب و رعنائی تو جہاں پناہ کے شبستانِ عیش
ہی کے لئے خلق کی گئی ہے!

یہ وہ "مُرغ بادنما" ہیں کہ۔
اگر طاقت "حسینؓ" کے ہاتھ میں ہو۔ تو اُن کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔
اور اگر حسینؓ کی جگہ "یزید" برسرِ اقتدار آجائے تو پھر اپنی عقیدت کی باگیں یزید کی طرف موڑ دیں۔
شرافت و انسانیت ان لوگوں کے نام سے پناہ مانگتی ہے۔
اور نیکی ان کے سایہ سے کوسوں دُور بچکر چلتی ہے!
تاریخ نہیں قرآن کریم بتاتا ہے کہ:۔

یہ زمین انبیاء کرام تک کے خونِ ناحق سے رنگین ہو چکی ہے۔
کیوں؟
خدا کے اُن نیک اور پاک بندوں کا کوئی قصور تھا؟
جی ہاں قصور تھا۔
یہ کہ وہ حق کی تبلیغ کرتے تھے اور باطل حق پرستوں کے اس قصور کو معاف نہیں کر سکتا۔
انبیاء کرام سے زیادہ معصوم، انسانیت کا بہی خواہ اور امن و سلامتی کا مبلغ اور کون ہو سکتا ہے۔ مگر ظالموں نے اُن کا خون بہانے سے بھی گریز نہیں کیا۔
باطل کے پاس ان ظالمانہ حرکتوں کے لئے کوئی دلیل جواز تھی؟
ہاں تھی ــــــــ طاقت!
ظالم طاقت ہی کو سب سے بڑی دلیل سمجھتا ہے!
طائف کے رئیسوں اور قریش کے امیروں اور سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے صحابہؓ کے ستانے اور ایذا دینے میں کونسی کسر اُٹھا رکھی تھی۔
بلالؓ کی پیٹھ کے زخموں سے لے کر خود ذاتِ رسالت مآبؐ کے دندانِ مبارک کی جراحت تک۔
اور شعبِ ابی طالب کی سختیوں سے لے کر بدر و احد کے معرکوں تک۔
وہ کونسا حربہ ہے۔ جو گز رنہیں چکا۔ باطل نے حق کو ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے بیٹھنے دیا ہے؟ غضب خدا کا، ہدایت و صداقت کے اس پیکرِ اعظم (ہمارے جان و مال آپ پر قربان ہوں) پر باطل پرستوں اور ظالموں نے یہ تک الزام لگادیا کہ:۔
"محمد بن عبد اللہ نے ہمارے نوجوانوں کو گمراہ کر دیا ہے۔"
اس الزام کے لئے کوئی دلیل؟ ـــ دلیل کیا ہوتی۔ قریش کے ہاتھ میں طاقت تھی۔ مال و زر تھا۔ بس یہی طاقت کا نشہ اُن کی زبانوں سے تہمت و الزام بن کر ظاہر ہوتا تھا۔ دنیا بھر کے جھوٹے اور لفنگے اس ذاتِ گرامی کو جھٹلاتے تھے۔ جس کا تعلق پروردۂ وحی و الہام تھا۔ اور صداقت خود جس کے ارد گرد گھومتی تھی۔
قریش کو اسلام سے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ:۔
یہ آ گیا تو ان کی سیادت کی خیر نہیں۔
سُود، شراب، قمار بازی، بدکاری اور اس قبیل کی تمام ناجائز لذتوں سے انھیں ہاتھ دھونے پڑیں گے۔
اس لئے، ان ظالموں اور بدکاروں نے اسلام کو روکنے کے لئے اپنی جان تک کی بازی لگادی!
تاریخ ہر زمانے میں اپنے کو دہراتی رہی ہے۔ اسلام کو اُنہی لوگوں نے روکنے کی تدبیریں کی ہیں۔ جو صنادید قریش کی طرح اسلام کے قائم ہونے میں اپنی سرداری اور رنگ رلیوں کی موت سمجھتے رہے ہیں!
باطل پرستوں کی ہمیشہ یہی روش رہی ہے کہ انہوں نے دلیل و برہان کے میدان میں شکست کھا کر قبولِ حق سے نہ صرف یہ کہ گریز کیا ہے۔ بلکہ اہلِ حق کو مٹانے کی تدبیریں اختیار کی ہیں!
نمرود کے دربار میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اس جابر بادشاہ کی جھوٹی مصنوعی خدائی کو چیلنج دیا اور

معبودِ حقیقی کے وجود پر دلیل پیش فرمائی تو دربار میں:۔
" فبھت الذی کفر " کا سماں پیدا ہو گیا !
مگر باطل کو اپنی طاقت کا غرہ تھا۔ چنانچہ اس نے حضرت خلیلؑ کے لئے آتش کدہ بھڑکا دیا۔
یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پیکرِ حق و صداقت کو شعلوں سے بچالیا۔ مگر باطل جو کرنا چاہتا تھا وہ کر گزرا ——!
قرآن بتاتا ہے، سیر و تاریخ شاہد ہیں کہ:۔
حق کو مظلومیت کے دور سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔
اور:۔
چند دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظالموں کو ڈھیل دی جاتی ہے۔
ظالم چونکہ فطری طور پر اوچھے اور کم ظرف ہوتے ہیں۔ اس لئے طاقت و اقتدار کے ذرا سے نشہ میں اترانے لگتے ہیں۔
اور اوچھی باتوں پر اتر آتے ہیں!
اُن کی زبان بالکل بے لگام ہو جاتی ہے۔
معروف حقیقتوں اور مُسلّم قدروں کو وہ نہ صرف جھٹلاتے ہیں۔
بلکہ اُن کا مذاق اُڑاتے ہیں !
حدیث شریف میں آیا ہے کہ "منکر" (بُرائی) کو دیکھ کر اسے ہاتھ سے (یعنی طاقت کے زور سے) بدل دیا جائے، یا اُسے زبان سے بُرا کہے۔ یا اُسے دل میں بُرا سمجھے —— اور اس آخری شکل کو ضعف کا آخری درجہ کہا گیا ہے۔ کہ اگر کسی کا دل اس قدر غافل اور بے حس ہو گیا ہو کہ "منکر" کو پھلتا پھولتا دیکھ کر وہ ذرا سی بھی چبھن محسوس نہ کرے تو پھر یوں سمجھو کہ اس کی ایمانی موت واقع ہو گئی ——!
وہ چیزیں جن کو اللہ اور رسولؐ نے "منکر" کہا ہے۔ اُن کے خلاف کلمۂ حق بلند کرنا اور اُن کے مٹانے اور بدلنے کیلئے جد و جہد کرتے رہنا ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔
"برائی کا بدل دینا" کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں صدیاں لگ جائیں۔ اہلِ ایمان سے اللہ تعالیٰ یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے "منکرات" کو بدل کیوں نہیں دیا تھا؟ اس لئے کہ "امرِ تکوین" اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے۔ —— ہاں! اس پر باز پرس کی جائے گی کہ "منکرات" کو بدلنے کے لئے تم نے کیا جد و جہد کی؟
انتہائی ناسازگار فضا اور بدلے ہوئے ماحول میں حق پر قائم رہنا بہت بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔
امتحان و آزمائش کے آتش کدے اسی لئے بھڑکائے جاتے ہیں کہ کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جائے۔
آزمائش نہ ہو اور مصیبتیں نہ پڑیں تو اہلِ نفاق اور اہلِ خلوص میں تمیز ہی نہ ہو سکے اور یہ ہمیشہ ملے جلے رہیں!
آزمائش میں یہ تک معلوم ہو جاتا ہے کہ "عمامہ" کے کس پیچ اور "جبہ و دستار" کی کس سلوٹ میں نفاق چھپا ہوا ہے
لالچ اور خوف کے دور ہے پر جن لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ اور جن کے قدم جمے رہتے ہیں۔ اُن کو دنیا جان لیتی ہے کہ یہ منافقین کا گروہ ہے اور یہ مخلصین کا ——!

یہ جو نماز میں، اذان میں، تکبیر میں بار بار "اللہ اکبر" دُہرایا جاتا ہے۔ تو یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ :۔
عظمت اور کبریائی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے زیبا ہے۔
کائنات کی ہر بڑی سے بڑی چیز اُس کے آگے پست اور حقیر ہے۔
اللہ کی عظمت کا جب یہ تصور ذہن و قلب میں پوری طرح جاگزیں ہو جاتا ہے تو پھر سکندر جیسے فاتح، قسطنطین جیسے بادشاہ اور نپولین جیسے فوجی سپہ سالار گھاس کے تنکوں اور پانی کے بلبلوں سے زیادہ کمزور اور حقیر نظر آتے ہیں!
موت و حیات کا سررشتہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وقت سے پہلے کسی کو موت ہی نہیں آسکتی اور جب تقدیر الٰہی کے مطابق زندگی کی گھڑیاں پوری ہو جاتی ہیں تو کوئی طاقت موت کو ٹال نہیں سکتی!
موت کا فرشتہ فولادی قلعوں اور اونچے سے اونچے برجوں میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اگر اللہ کو منظور نہ ہو تو فوج کی پوری ڈویژن کسی آدمی پر گولہ باری کردے۔ پھر بھی اس شخص کے جسم کا ایک رواں بھی نہیں مڑ سکتا۔
جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!
دنیا کی کسی چیز کو ثبات نہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ فنا آمادہ اور زوال پذیر ہے۔ موت ہر نفس کے ساتھ لگی ہوئی ہے! ع
زندگی کے دل سے یہ کانٹا نکل سکتا نہیں!
جان ایک نہ ایک دن جانی ہی ہے۔ اگر یہ اللہ کی راہ میں چلی جائے تو زندگی کے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوسکتی ہے!
دنیا کی محبت اور موت کا خوف یہ دو چیزیں ہیں جو آدمی کو بزدل اور مصلحت شناس بناتی ہیں۔ یہاں تک کہ آدمی خود اپنے سایہ سے بھی ڈرنے اور جھجکنے لگتا ہے۔ دنیا کی محبت اور موت کا خوف جب دل سے نکل گیا تو پھر آدمی اس دنیا میں خدا کے سوا اور کسی کے آگے دب کر نہیں رہتا۔ اس کی خودی کا اُس وقت یہ عالم ہو جاتا ہے کہ :۔
وہ اگر ٹھوکر مار دے تو قصر و ایوان کی بلندیاں آن کی آن میں زمیں بوس ہو جائیں!
اور یہ کوئی شاعرانہ تعلّی یا افسانوی شوخیٔ فکر نہیں ہے۔ تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ :۔
جن خدا کے نیک بندوں کے دل سے دنیا کی محبت اور موت کا خوف جاتا رہا تھا۔ انہوں نے تھوڑی سی جمعیت لیکر اور جَو کے ستو پھانک کر بڑی بڑی سلطنتوں کے دھوئیں اُڑا دیئے۔ ع
عشق با نانِ جویں خیبر گشاد!

حق کی سب سے پہلی کامیابی اس کا اعلان ہے :۔
اور پھر اس کے لئے مسلسل جد و جہد کرتے رہنا۔
دنیوی فتح و شکست، سود و زیاں اور بلندی و پستی کے معیار سے حق کی کامیابی اور ناکامی کو ناپنا اور تولنا بہت بڑی بے دانشی ہے۔ حضرت سیدنا حسین علیہ السلام کامیاب رہے کہ سر کٹ گیا مگر باطل کے آگے جھکا نہیں۔ اور یزید ناکام رہا کہ وہ اپنی اتنی بھاری فوج اور ساز و سامان کے باوجود حسینؓ کے پائے استقامت کو جنبش بھی نہ دے سکا۔ حق کی راہ کا مسافر اگر غبارِ راہ بن کر بکھر جائے تو بھی کامیاب ہے!
اللہ تعالیٰ کی یہ سنت کبھی نہیں رہی کہ باطل نے ذرا سر اُٹھایا اور کسی غیبی طاقت نے اُسے فوراً کچل دیا۔ کسی نے کوئی زیادتی

کی اور وہ سے اللہ کے ہاتھ سزا مل گئی۔ یہاں ظالموں اور بدکاروں کو جان کر ڈھیل دی جاتی ہے۔ تاکہ اللہ پر کوئی حجت نہ رہے۔ اور وہ چاہیں تو اس مہلت میں توبہ کر کے اپنے رویّہ کو درست کر لیں۔ مہلت کے اس عرصے اور ڈھیل کی اس مدت میں یہ لوگ خوب رنگ رلیاں مناتے، دادِ عیش دیتے اور اپنی بڑائی کے ناقوس بجاتے ہیں۔ جیسے ساری خدائی کے سپید و سیاہ کے یہی مالک ہیں ــــ!

مگر جب پاپ کا گھڑا بھر چکتا ہے۔ جب ان لوگوں کی زیادتیاں اور بدکاریاں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت ختم ہو چکتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو ایسا سخت پکڑتا ہے کہ تاج و تخت ٹھڈ کروں میں پامال ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں ــــ!

ہٹلر اور مسولینی کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ ان "بڑے آدمیوں" کی شان و شوکت، ہیبت و جلال اور رعب و دبدبہ کی کوئی انتہا تھی۔ دُنیا ان کے اقبال کی قسم کھاتی تھی ــــ!

مگر جب اللہ کے غضب نے ان کو اپنی گرفت میں لیا تو ذلّت، بداقبالی اور رسوائی کی بھی حد ہو گئی۔ کتنی ذلّت اور خواری کی موت انھیں ملی!

ان واقعات سے بھی اگر کوئی عبرت نہ لے۔ تو اس کی بدتوفیقی کو کیا کہیئے؟

مرد مومن کی یہ شان ہے کہ :-

شدّتِ حالات سے گھبرا کر دامنِ ضبط و صبر اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

اور وہ اللہ کی سرزمین میں فساد نہیں پھیلاتا، چاہے وہ پھانسی کے تختہ پر ہی کیوں نہ ہو ــــــــــــ

اس کے فکر و نظر اور دل و دماغ کا توازن بگڑنے نہیں پاتا۔

اس لئے وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جس سے دُنیا میں طغیان و فساد برپا ہو جائے۔

اپنی توانائیوں کا استعمال وہ خوب جانچ تول کر کرتا ہے۔

وہ جوش "جس کے پیچھے تدبر اور فراست و دانائی نہ ہو۔ فرد اور قوم کو شدید خطرے میں ڈال دیتا ہے!

حق پرست جان بوجھ کر کسی آزمائش میں نہیں پڑتا۔

اور نہ تصادم و تزاحم اُس کے پروگرام میں داخل ہے۔

مگر جب کوئی آزمائش اور مصیبت اس پر آپڑتی ہے۔ تو پھر وہ مردانہ وار اس کا مقابلہ کرتا ہے۔

اہلِ حق ناسازگاریٔ حالات سے گھبرا کر ہمت نہیں ہارتے۔ بلکہ نامساعد حالات میں اُن کی جد و جہد کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔

طوفانِ حوادث سے مردوں کا منہ نہیں پھرا کرتا اور کسی انقلاب کے آگے وہ جھک نہیں جاتے۔

دریا میں حباب ابھرتے اور ڈوبتے ہی رہتے ہیں۔ مگر ان "تبدیلیوں" سے یہ تو نہیں ہوتا کہ موجیں ٹھہر جائیں اور اپنے کام کو بند کر دیں ــــ!

اللہ کے حضور! بہت کچھ کہہ دیا۔ مگر ابھی نہ جانے دل میں کتنے کانٹے چبھے ہوئے ہیں جو کاغذ پر نہیں آسکے۔ عمل و حرکت کی دُنیا میں بہت زیادہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کوئی عمل کا عزم کرلے تو

ایک حرف ہی اس کے لئے بہت ہے اور کوئی ہاتھ پیر ہلانا نہ چاہے تو اس کے لئے وعظ و بیان کے دفتر بھی "طلسم ہوش رُبا" اور "فسانۂ عجائب" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ۔۔۔!

آج سے ستائیس برس پہلے (۱۹۲۴ء) جب خلافت تحریک کی سارے ہندوستان میں دُھوم تھی ۔ تو آل انڈیا خلافت کمیٹی کا بہت بڑے پیمانے پر اجلاس ہوا تھا ۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے خطبۂ صدارت کے آخری حصّہ پر اس شمارے کے نقشِ اوّل کو ختم کیا جاتا ہے :-

"اے دلوں کے پھیر دینے والے پروردگار! تُو نے عرب کے شدید کینہ پرور، نفاق پسند سینوں میں ایمان کی حلاوت اور دین کی لذّت ڈال کر سب کو ایک کر دیا تھا ۔ تُو نے اوس و خزرج کی لڑائیوں کی آگ کو جو پُشت ہا پُشت سے بھڑکتی چلی آ رہی تھی ، محبّتِ اسلام کے پانی سے دم کے دم میں فرو کر دیا تھا ۔ تُو آج بھی وہی ہے ۔ جو سدا سے تھا ۔ آج اپنے نام کا کلمہ پڑھنے والوں کو توفیق دے کہ خلوص و محبّت کے ساتھ ایک دُوسرے سے مِل کر تیرے دین کی خدمت پر آمادہ ہو جائیں ۔ ان کے سینوں کو نفاق سے پاک کر دے اور ان کے دماغوں اور عقلوں سے مادی قوتوں اور طاغوتی حکومتوں کی مرعوبیت اور ہیبت دُور کر دے ۔۔۔!" (آمین)

ماہر القادری

۲۲ نومبر ۱۹۵۱ء

شیخ احمد
(ناندیڑ دکن)

پیر و مرید

بالِ جبریل

مریدِ ہندی:-

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں — علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں!

پیرِ رومی:-

علم را برتن زنی مارے بود! — علم را بردل زنی یارے بود!

تشریح:- دورِ حاضر میں علوم و فنون نے بے انتہا ترقی کی ہے اور سائنس کے نت نئے انکشافات نے علم و فن کی ایک ایک شاخ میں ارتقائی رفتار کو اتنا تیز کر دیا ہے کہ اس سے پہلے انسان کے پاس معلومات کا ایسا وسیع و ہمہ گیر ذخیرہ کبھی اکٹھا نہ ہو سکا تھا۔ اس صورتِ حال کا لازمی تقاضا تو یہ تھا کہ انسان اپنی انسانیت اور اپنے اخلاق میں بھی ٹھیک اسی رفتار سے ترقی کرتا۔ جس رفتار سے اس نے علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں ترقی کی ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ جتنا جتنا اس راہ میں بڑھتا گیا اسی قدر دینی احکام کی تعمیل اور دینی تعلیم و تربیت پر مُردنی چھاتی چلی گئی اور نظامِ دین بحیثیتِ مجموعی خستہ و خوار ہو کر رہ گیا جس کے نظارے سے بینائی رکھنے والی آنکھیں خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ اقبال اس کا سبب معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا رومی کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ جس علم کا مقصد صرف پیٹ اور نفس کے مطالبات پورے کرنا ہے وہ انسان اور انسانیت کے حق میں زہر ہے اور چونکہ دورِ حاضر کا علمی و فنی ارتقا سراسر مادی بنیادوں پر ہوا ہے اس لئے وہ مضر اور مہلک بن کر رہ گیا ہے۔ برخلاف اس کے جس علم کا مقصد تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس ہے بس وہی انسانیت کے لئے مفید ہے اور اس علم کی جڑ شریعتِ الٰہی میں مضمر ہے۔ لہٰذا انسان اس راہ سے ہٹ کر علم و فن کے جس جس شعبہ میں ترقی کرے گا جسمانی مطالبات کو فراخی و اطمینان کے ساتھ پورا کرنے کا اہل تو بن سکے گا۔ مگر اپنی روحانیت اور اپنے اخلاقی احساسات پر موت طاری کرے گا۔

مریدِ ہندی:-

اے امامِ عاشقانِ دردمند — یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند!
"خشک مغز و خشک تار و خشک پوست — از کجا می آید ایں آوازِ دوست!"
دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سرور! — بے ثبات و بے یقین و بے حضور!
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا! — دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا!
آہ یورپ! بافروغ و تابناک — نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

پیرِ رومی:-

ہر سماع راست ہر کس چیز نیست — طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست!

تشریح۔ اقبال مولانا رومی سے ان کے ایک شعر کو پیش کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ آپ خشک مغز، خشک تار اور خشک پوست میں (جس کے مجموعہ کا نام ستار ہے) دوست کی آواز سن رہے ہیں مگر عہدِ حاضر ساز و چنگ میں مست ہونے کے باوجود بے سرور ہے۔ مادیات دیکھتیں اور حضوری سے محروم۔ جس نغمہ کے اندر آپ دوست کی آواز کو صاف سن رہے ہیں وہی نغمہ یورپ کو مادیت کی طرف دھکیل رہا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کی تابناکی اور ظاہری چمک دمک لوگوں کی نظروں کو خیرہ کئے دے رہی ہے۔ مولانا جواب میں فرماتے ہیں کہ بلند ہونے والی مختلف آوازوں میں راست و ناراست کی تمیز کرنا اور صحیح آواز پر کان دھرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انجیر کا کھانا اور ہضم کرنا ہر چھوٹے بڑے پرندے کے بس کی بات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص مادیت کو روحانیت کا تابع کر کے روحانی مراحل میں ارتقاء کا راز جانتا ہو اس کے لئے مادی آوازوں میں خدائے برحق کی آواز سن لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ مگر یہ یورپ جو مادیت میں سرتا پا غرق ہے۔ اس کے لئے تو دوست اور دوست کی آواز ایک رازہی راز ہے۔ جس کے سمجھنے پر وہ قادر نہیں ہے۔

مرید ہندی:-

پڑھ لئے میں نے علومِ شرق و غرب ۔۔۔ روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب!

پیر رومی:-

دستِ ہر نااہل بیمارت کند ۔۔۔ سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

تشریح:- اقبال کو اس بات پر حیرت ہے کہ میں نے مشرقی و مغربی سارے علوم پڑھ ڈالے۔ لیکن روح میں اب تک درد و کرب باقی ہے۔ مولانا رومی یہ فرما کر ان کی حیرت دور کرتے ہیں کہ ہر کس و ناکس کا ہاتھ تجھے بیمار کردے گا۔ اپنی اطاد کی تیمارداری نگہداشت اور حفاظت جس محبت، ہمدردی اور دل سوزی سے ماں کر سکتی ہے۔ اس کی توقع دوسروں سے نہیں کی جاسکتی۔ مطلب یہ ہے کہ امراض کی تشخیص، نسخوں کی تجویز اور بیمار کی تیمارداری و خدمت ایسی چیزیں نہیں ہیں جنہیں ہر نااہل انجام دے سکے۔ اگر کوئی صحت مند اور تنومند آدمی نااہلوں کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اسے بیمار ڈال دیں اور اگر ایسے نااہل کسی بیمار کی تیمارداری کرنے بیٹھیں تو اندیشہ ہے کہ کہیں مرض کے ساتھ مریض ہی ختم نہ ہو جائے۔ بالکل اسی طرح موجودہ دور کے علوم بھی اپنے اندر روحانی و اخلاقی بیماریوں کا کوئی علاج نہیں رکھتے۔ ان کے سمندر بھی اگر کوئی شخص پی جائے تب بھی اس سے سیری نہیں ہوتی۔ اس کے لئے تو آدمی کو علم کے حقیقی سرچشمے کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور وہ ہے کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ۔ اس منبع علم و فکر میں روح کی آسودگی اور اطمینان کا پورا سامان موجود ہے۔

مرید ہندی:-

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد ۔۔۔ کھول مجھ پر نکتۂ حکمِ جہاد

پیر رومی:-

نقشِ حق را ہم بامرِ حق شکن! ۔۔۔ بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

تشریح:- یورپ کے مفکرین و مصنفین نے مسئلہ جہاد کے سلسلہ میں ایسی مکروہ اور ہیبت انگیز تصویریں کھینچی ہیں کہ اچھے خاصے معقول لوگوں کے لئے بھی اس مسئلہ کو اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ سمجھنا مشکل ہو گیا۔ یورپ کی تعبیر کے مطابق اسلام ایک خونخوار، امن شکن اور غارت گر مذہب نظر آتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مولانا! اس مسئلہ میں میرے دل کی گرہ کھول دیجئے اور بتایئے کہ

آخر اس جہاد کے حکم میں کیا مصلحت ہے جبکہ بظاہر اس میں جان و مال کا کافی اتلاف نظر آتا ہے۔ مولانا رومی کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جان و مال ہی نہیں دنیا کا سارا انتظام خدا کے حکم اور اس کی مشیت کا مظہر ہے اور خدا خود ہی یہ چاہتا ہے کہ اس کی دنیا شر و فساد اور سرکشی و بغاوت سے پاک ہو۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے علمبرداران شر و فساد کو راستے سے ہٹانا اور سرکشوں اور باغیوں کی سرکوبی کرنا قیام امن و صلح کے لئے ضروری ہے۔ اس میں جان و مال کا جو اتلاف دکھائی دیتا ہے۔ یہ خود خدا ہی کے حکم کے مطابق ہے اور جب جان و مال کا حقیقی مالک خدا ہے اور وہ خود ہی ایک بڑے خیر کے لئے تھوڑی سی جانوں اور تھوڑے سے مالوں کا نقصان چاہتا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ حق کے قائم کردہ نقوش کو حق کے حکم ہی سے توڑ ڈال اور اس کے بنائے ہوئے شیشہ خانہ کو اسی کے پتھر سے چکنا چور کر دے۔

مریدِ ہندی:-

ہے نگاہِ خاوراں مسحورِ غرب　　حورِ جنّت سے ہے خوشتر حورِ غرب!

پیرِ رومی:-

ظاہرِ نقرہ گر اسپیداست و نو　　دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو!

تشریح:- اقبال کو شکایت ہے کہ اہل مشرق، اہل مغرب کی ایک ایک ادا پر جان دیتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت، ان کے علوم و فنون، ان کی تہذیب، ان کا تمدن، ان کی مادی ترقی اور ان کا سیاسی عروج۔ غرض ان کی ایک ایک چیز مشرق کے رہنے والوں کی نگاہوں کو مسحور کئے ہوئے ہے اور وہ مغرب کے حسن پر بری طرح ریجھے جا رہے ہیں۔ مولانا رومی ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ محض ظاہری چمک دمک ہے جس پر صرف بصارت فریفتہ ہو رہی ہے۔ ورنہ بصیرت کی آنکھیں تو اس کے نتائج دیکھ دیکھ کر عبرت کے آنسو بہا رہی ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ نئی اور عمدہ چاندی کتنی سفید اور نظر فریب ہوتی ہے۔ لیکن اس کے مسلسل استعمال سے ہاتھ اور کپڑے سب سیاہ ہو جاتے ہیں۔

مریدِ ہندی:-

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں!　　ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں!

پیرِ رومی:-

مرغِ پر نارستہ چوں پراں شود　　طعمۂ ہر گربۂ درّاں شود!

تشریح:- اقبال جب ان نوخیز نسلوں کو دیکھتے ہیں جو کالجوں اور بڑے بڑے علمی اداروں میں زیرِ تعلیم و تربیت ہیں تو ان کا دل خون ہو جاتا ہے۔ اور وہ ان نوجوانوں پر حسرت و افسوس کرنے لگتے ہیں جو اپنے اندر اعلیٰ درجہ کی علمی و عملی صلاحیتیں رکھتے ہیں مگر موجودہ تعلیم کے نتیجے میں صرف مغرب کے گرویدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ نوجوان اپنی مستعدی و سرگرمی سے دنیا میں فکری و تہذیبی انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ وہ مغرب اور مغربیت کی ایک ایک چیز پر مائل ہو کر صیدِ زبوں بن گئے ہیں۔ اور ان پر مرعوبیت و انفعالیت طاری ہو چکی ہے۔

پیر رومی بتاتے ہیں کہ جس پرندے کے ابھی تک بال و پر پیدا نہیں ہوتے ہیں اگر وہ اڑنے کی کوشش کرے گا تو لازماً کسی پھاڑنے والے جانور کا لقمہ بن جائے گا۔ بالکل اسی طرح علمی و فکری پختگی اور اعلیٰ درجہ کی عملی تربیت کے بغیر جب یہ نوجوان مکتبوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں تو علمی حیثیت سے ان پر وہی رنگ چھا جاتا ہے جو

وہاں کے نظام ہائے تعلیم کا خاصہ ہے اور عملی حیثیت سے یہ نسل اتنی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے کہ ہر غالب تہذیب اسے اپنا خادم و گرویدہ بنا لیتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ جب تک ان میں پرواز کی طاقت پیدا نہ ہو انھیں فضائے بسیط میں نہ چھوڑا جائے۔

مرید ہندی :-

تا کجا آویزشِ دین و وطن جو ہر جاں پر مقدم ہے بدن ؟

پیر رومی :-

قلب پہلوی زند بازر بشب انتظار روزمی دارد ذہب

تشریح :- دین و وطن کی آویزش کا مسئلہ آج کی سیاسی دنیا کا ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ کیا دین و وطن کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟ کیا آج کی مادی دنیا میں مذہبی و روحانی اقدار کو وطنی و ملکی اقتدار پر غالب کرنے کی کوئی کامیاب کوشش ممکن بھی ہے؟ کیا مذہبیت کو وطنیت سے الگ نہیں کر دینا چاہیئے ؟ کیا دین و وطن دونوں کی خدمت ایک ساتھ نہیں کی جا سکتی ؟ کیا وطنیت کا سیاسی نقطۂ نظر مذہب کے احکام و قوانین سے ٹکراتا ہے ؟ کیا وطن کی محبت ایمان کا جزو نہیں ہے؟ کیا الدین للہ والوطن للجمیع کا نظریہ مادی حیثیت سے کامیاب نظریہ نہیں ہے ؟ کیا مذہبی نظریات کو وطنی نظریات کے تابع رکھنا صحیح نہیں ہے ؟

یہ اور ایسے ہی متعدد سوالات ہیں۔ جن کے جوابات آج کی دنیا مختلف طور پر دے رہی ہے اور یہ جوابات محض علمی حیثیت نہیں رکھتے۔ بلکہ جد و جہد اور انقلاب و عمل کے میدان میں متعدد بڑے بڑے باصلاحیت گروہوں نے مختلف جوابات کو اپنا رکھا ہے۔ غیر مسلم تو غیر مسلم خود مسلمان ممالک میں دین و وطن کی کشمکش زوروں پر ہے۔ بقول اقبال یہ معرکہ خیبر کے معرکہ سے بھی کچھ بڑھ کر ہی ہے۔ اس لئے آج اسے سر کرنے کے لئے کسی حیدرِ کرار کی ضرورت ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ کیا بدن، جوہرِ جاں پر مقدم ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ دین و وطن کی آویزش کب تک ؟

مولانا فرماتے ہیں کہ مذہب کی چمک دمک اور قدر و قیمت زرِ خالص کے مانند ہے۔ مگر سے رات کے وقت پرکھا نہیں جا سکتا۔ اس کی اصلیت تو دن کی پوری روشنی میں نگاہوں کے سامنے آ سکتی ہے۔ آج جبکہ چاروں طرف علم اور روشنی کے پرشور دعووں کے باوجود جہالت اور جاہلیت کی گہری تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ مذہبی اقدار کی اصلی قدر و قیمت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ جیسے جیسے علم صحیح کی روشنی پھیلے گی لوگوں کی سمجھ میں یہ بات خود بخود آ جائے گی کہ مذہب کے نقطۂ نظر کو تمام مسائل میں ایک زبردست فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔

مرید ہندی :-

سِرِّ آدم سے مجھے آگاہ کر خاک کے ذرّے کو مہر و ماہ کر !

پیر رومی :-

ظاہرش را پشۂ آرد بچرخ باطنش آمد محیط ہفت چرخ !

تشریح :- "سِرِّ آدم" سے آگاہی کی طلب ہر اس شخص کے اندر پیدا ہونا ضروری ہے اور ہر زمانے میں پیدا ہوتی رہی ہے جو کائنات کے اندر اس مشتِ خاک کے کارناموں کو دیکھنے اور اس کی صحیح قدر و قیمت جاننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اقبال بھی اس طلب میں حصہ دار ہیں اور چاہتے ہیں کہ مرشدِ روم ان اسرار کو واشگاف کر کے خاک کے ذرّے کو مہر و ماہ کی طاقت بخشیں

مرشد رومی نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان دو حیثیتوں کا مالک ہے۔ اس کی ایک حیثیت اس کے جسمانی و مادی وجود کی ہے اور دوسری حیثیت اس کے روحانی و اخلاقی وجود کی۔ ظاہری حیثیت میں وہ گوشت پوست اور ہڈیوں کا ایک معمولی ڈھانچہ رکھتا ہے جو اس قدر کمزور ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے عوارض اسے متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ یہاں تک کہ مچھر جیسی حقیر مخلوق بھی اس کو پریشان کر کے چکرا دیتی ہے۔ مگر باطنی حیثیت میں وہ ایسی زبردست طاقت کا حامل ہے کہ کائنات کی ایک ایک چیز سے اپنی خدمت لیتا اور اس پر ایک طرح کا ت اہرانہ تسلط رکھتا ہے۔ اس کے اندر ملکوتی، لاہوتی اور جبروتی اتنی طاقتیں بھردی گئی ہیں کہ اس کے باطن نے گویا سات آسمانوں کا احاطہ کر رکھا ہے۔

مرید ہندی:-

خاک تیرے نور سے روشن بصر　　غایتِ آدم خبر ہے یا نظر ؟

پیر رومی:-

آدمی دید است باقی پوست است　　دید آں باشد کہ دید دوست است !

تشریح:- اقبال پوچھتے ہیں کہ انسان کی غایت کیا ہے؟ آیا یہ کہ وہ محض عقل و خرد کی رہنمائی میں منطقی استدلال و استنتاج تک پہنچ کر رہ جائے یا یہ کہ وہ حقائق کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لے۔

مولانا کا جواب یہ ہے کہ انسانیت "خبر" سے بہت آگے کا مطالبہ کرتی ہے۔ فکری استدلال پر قانع ہو رہنا اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اسے عشق کی آنکھ سے راست حقائق اشیاء کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اسی کے ذریعہ اس کے ایمان و وثوق میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ پس غایت آدم صرف "دید" ہے۔ باقی عقل و قیاس کے سارے استخراجات "پوست" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ مگر یہ اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ نظر صرف وہی صحیح ہے جس کے ذریعہ حقائق عالم میں اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کے کارفرما ہونے کا یقین حاصل ہو۔ محض کسی چیز کو ہدفِ نظر بنا لینا انسانیت کا کمال نہیں ہے۔

مرید ہندی:-

زندہ ہے مشرق تری گفتار سے　　اُمتیں مرتی ہیں کس آزار سے ؟

پیر رومی:-

ہر ہلاکِ امت پیشیں کہ بود　　زانکہ بر جندل گماں بردند عود !

تشریح:- قوموں کے عروج و زوال کا مسئلہ ایک مفکر کی فکر کے لئے بہت کچھ سامان فکر دیتا ہے اور مفکر تو مفکر ایک معمولی اور عامی آدمی کے لئے بھی یہ سوال حل طلب ہوا کرتا ہے کیونکہ قوموں کے گرنے اور اُٹھنے کے انقلاب انگیز حادثات ہر وقت لوگوں کو کچھ نہ کچھ سوچنے اور علت و سبب دریافت کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ کتاب زمانہ کے اوراق مسلسل اُلٹتے جا رہے ہیں اور ہر انقلاب پر یہ سوال ضرور کھڑا ہو جاتا ہے کہ "ایسا کیوں ہوا؟"

اقبال ایسی قوم کے فرد تھے جس کو مرے صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس لئے وہ خاص طور پر قوموں کی موت کا سبب دریافت کرتے ہیں۔ پیر رومی کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جو قومیں اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں کر سکتیں اور بُروں پر اچھوں کا گمان کر کے انھیں اپنی اجتماعی اور قومی زندگی کی باگ ڈور سپرد کر دیتی ہیں وہ بالآخر ہلاک ہو جایا کرتی ہیں۔ کیونکہ جو قوم پتھر اور عود میں بھی امتیاز نہیں کر سکتی وہ اپنے اس فعل ہی سے اپنی نااہلیت کا پورا ثبوت دے دیتی ہے اور خدا کے قانون کے مطابق اسے اور سویرا پنے سے اہل تر قوموں کیلئے

بہر حال جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔

مرید ہندی :-

اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بُو   سرد کیونکر ہو گیا اس کا لہو ؟

پیر رومی :-

تا دلِ صاحبدلے نامد بدرد   ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد !

تشریح :- کون ہے جو مسلمانوں کی موجودہ دینی و اخلاقی حالت کو دیکھ کر یہ سوال نہ کرے گا کہ آخر ان کا لہو سرد کیونکر ہو گیا ؟
اقبال کے سامنے مسلمانوں کا جاندار ماضی اور بے جان حال تقابلی حیثیت سے رہے ہیں۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ یہ سوال کئے بغیر رہ جاتے
مرشد روم نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ جب تک کسی صاحب دل کے دل کو تکلیف نہیں پہنچتی خدا کبھی کسی قوم کو رسوا نہیں کرتا۔ مطلب
یہ ہے کہ جب فساق و فجار قومی سیادت و قیادت کے مقام پر آجاتے ہیں اور قوم اپنے اہل دل افراد کی تذلیل و تحقیر اور دل آزاری
پر اتر آتی ہے تو اس کے سچے دل ختم ہو جاتے ہیں اور ذلت و پستی اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔

مرید ہندی :-

گرچہ بے رونق ہے بازار وجود   کون سے سودے میں ہے مردوں کا سُود ؟

پیر رومی :-

زیرکی بفروش و حیرانی بخر   زیرکی ظن است و حیرانی نظر !

تشریح :- یہ دنیا اور اس کے مسائل و معاملات در اصل ایک لین دین کی نوعیت رکھتے ہیں۔ یہاں علم و عمل کے ہر میدان میں ایک
ایک چیز دے کر کوئی دوسری چیز خریدی جاتی ہے کوئی دنیا کے عوض آخرت خرید رہا ہے۔ کوئی آخرت بیچ کر دنیا حاصل کر رہا ہے۔ کوئی
دور رس نقصان سے بچنے کے لئے فوری فائدے کو ترک کر رہا ہے۔ کوئی مستقل فائدے کی امید پر عارضی نقصانات برداشت کر رہا ہے۔
لین دین کی اس کثرت کو دیکھ کر اقبال پوچھنا چاہتے ہیں کہ مردان خدا کے لئے کونسا سودا نفع کا سودا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا فرماتے
ہیں کہ مجرد عقل و خرد، جو ظن و قیاس کے حدود اربعہ میں محدود ہے۔ بیچ ڈال اور اس کے بدلے عشق کی وہ گراں مایہ دولت حاصل کر لے
جو آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے حاصل ہوا کرتی ہے جب آدمی اس مشاہدے میں کھو جاتا ہے تو وہ خدا کی حکمت و قدرت پر حیران رہ
جاتا ہے۔ پس زیرکی کے مقابلہ میں یہی حیرانی تیرے لئے سود مند ہے۔

مرید ہندی :-

ہم نفس میرے سلاطیں کے ندیم   میں فقیرِ بے کلاہ و بے گلیم !

پیر رومی :-

بندۂ یک مردِ روشندل شوی !   بہ کہ بر فرقِ سرِ شاہاں روی !

تشریح :- دنیا اور دنیا کی عزت و جاہ وہ چیزیں ہیں جن کی ہوس کم و بیش ہر ایک کے دل میں موجود رہتی ہے۔ جب تک نفس کا
پوری طرح تزکیہ۔ قلب کا پوری طرح تصفیہ اور روح کا پوری طرح تجلیہ نہ ہو جائے۔ اس ہوس کے کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہونے کو روکا نہیں
جا سکتا۔ دنیا اپنی ظاہری حیثیت میں اتنی لذیذ اور پرکشش ہے کہ اس سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق رہنا مشکل ہے۔ اور یہاں اچھے
اچھوں کے قدم لڑکھڑاتے رہے ہیں۔ اقبال دنیوی لذائذ و فوائد کے رسیا نہ تھے۔ ان تمام چیزوں سے انہوں نے ہمیشہ نفسیاتی

بے نیازی برتی۔ مگر انھیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ خود میرے ساتھی ترقی کرتے کرتے دنیوی جاہ و جلال کے اونچے مرتبوں تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ امراء و سلاطین کے درباروں میں اُن کی رسائی ہے اور وہ ان کے پہلو بہ پہلو جگہ پاتے ہیں اور میرا یہ حال ہے کہ پہننے کے لئے ٹوپی اور اوڑھنے کے لئے کمبل تک میسر نہیں ہے۔

مرشدِ روشن ضمیر انھیں تسلی دیتے ہیں کہ تیرے لئے کسی مردِ روشندل سے ارادت رکھنا اور اس کی صحبت و معیت اختیار کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ تو امراء و سلاطین کے سروں کی مانگ پر چلے۔ مطلب یہ ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کا اگر تو منظورِ نظر بلکہ اُن کی ناک کا بال اور آنکھ کا تارا بھی بن جائے تو اس کے مقابلہ میں تیرے لئے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ تجھے کسی مردِ باخدا اور حق شناس کی صحبت اور ہم نشینی میسر ہو! بادشاہوں کی دربارداری ممکن ہے تیری دُنیا کو درست کر دے۔ مگر تیری آخرت کی بربادی کا خطرہ ہے۔ اور مردِ مومن کے پیشِ نظر ہر وقت "آخرت" ہی رہنی چاہیئے ۔

مُرید ہندی :-

اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر　　　میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

پیر رومی :-

بال بازاں را سوئے سلطاں برد　　　بال زاغاں را بگورستاں برد

تشریح :- الٰہیاتی مسائل میں جبر و قدر کا مسئلہ ہمیشہ سے ایک معرکہ آرا مسئلہ رہا ہے۔ اگرچہ ہر پہلو سے اطمینان بخش طریق پر اس کا کوئی حل انسانی عقل کے بس میں نہیں۔ لیکن انسان کبھی اس مسئلہ کو چھیڑنے اور اس پر گفتگو کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ کیونکہ انسان کی جبر و اختیار والی زندگی اسے مجبور کرتی ہے کہ اس مسئلہ میں وہ کوئی نہ کوئی رائے ضرور قائم کرے۔ اسی لئے اقبال بھی اپنے پیر و مرشد سے اس مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

مولانا نے جواباً جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ چند لفظوں میں پوری اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کا جو کچھ حل پیش کیا ہے۔ وہ یقیناً اطمینان بخش ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی اپنی سمجھ بوجھ کے حدود معین کرے اور جو کچھ عقل و فکر سے ماوراء ہے اسے عقل و فکر کی حدود کے اندر لانے کی کوشش نہ کرے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ جس شخص کی جیسی کچھ جبلت ہوا کرتی ہے۔ اسی کے مطابق اس کی تقدیر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ باز کے پر اسکو بادشاہ کی طرف لے جاتے ہیں اور کوے کے پر اس کو قبرستان کی طرف۔ اس طرح دونوں کو اڑنے کی آزادی تو ضرور حاصل ہے۔ مگر یہ آزادی چند ایسی مجبوریوں سے بھری ہوئی ہے جو اُن کی فطرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ پس انسان کے لئے اتنا سمجھ لینا بالکل کافی ہے کہ وہ مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ جو کچھ تقدیر میں ہوگا وہ تو بہرحال ہو گا ہی۔ مگر انسان کی آزادی کا لازمی تقاضا سعی و عمل ہے۔ "تقدیر الٰہی" پر اعتقاد رکھتے ہوئے ایک مسلمان کو ایک لمحہ کے لئے بھی سعی و عمل سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔

مُرید ہندی :-

کاروبارِ خسروی یا راہبی ؟　　　کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبیؐ ؟

پیر رومی :-

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ　　　مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوہ !

تشریح :- دُنیا کے تمام ادیان و ملل میں دو مختلف نقطہ ہائے نظر شدت سے کارفرما رہے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ

دُنیا اور اس کے سارے متعلقات پرہیز کرنے اور حذر کرنے کی چیز ہیں۔ دُنیا کو دُنیا داروں کے لئے چھوڑ کر اپنی نجات کی فکر میں لگ جانا چاہیئے ہے!

دُوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نظامِ حکومت و سیاست پر قبضہ و تسلط کے بغیر انسان کی اجتماعی زندگی کبھی درست نہیں ہو سکتی۔ پس یہ ضروری ہے کہ سیاسی طاقت فراہم کی جائے۔ دینِ اسلام کے علمبرداروں میں ایک گروہ ایسا موجود رہا ہے۔ جو پہلے نقطۂ نظر کا حامل تھا۔ اور اس طرزِ عمل کو دینداری کا مکمل تصور کرتا تھا۔ اس لئے اقبال پوچھتے ہیں کہ کیا یہ نقطۂ نظر درست ہے؟ آخر دینِ نبیؐ کی غایت کیا ہے؟

مولانا نے جواب دیتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ جو لوگ اسلام میں رہبانیت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہ بلاشک و شبہ غلطی پر ہیں۔ رہبانیت تو عیسائیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہمارا دین یہ تعلیم کبھی نہیں دیتا کہ انسانی بستیوں سے بھاگ کر غاروں اور پہاڑوں میں گیان دھیان کیا جائے اور انسانی تمدن و اجتماعیت سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ ہمارے دین کی ساری بھلائی اور ترقی و فروغ اس میں مضمر ہے کہ دوسرے نظام ہائے حیات سے مسلسل اور مستقل طور پر نبرد آزمائی جاری رہے جس کے نتیجہ میں اسے تمام ادیان پر غلبہ و تفوق حاصل ہو جائے۔

هو الذی ارسل رسولهٗ بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون۔

مریدِ ہندی:۔

کس طرح قابو میں آئے آب و گِل؟ کس طرح بیدار ہو سینے میں دل؟

پیرِ رومی:۔

بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند! چوں جنازہ نے کہ بر گردن برند!

تشریح:۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ اپنی مادیت کو روحانیت سے کس طرح مغلوب کیا جا سکتا ہے اور دل میں حق شناسی کے جذبات کیونکر پیدا کئے جا سکتے ہیں؟ جواب کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کی بندگی میں دیدے اور اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو جا۔ بس اس طرح آدمی اپنی روحانیت کو ترقی دے سکتا اور اپنے سینہ میں دلِ بیدار پیدا کر سکتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ خود دار و مستغنی بن اور اپنا بوجھ کسی پر نہ ڈال۔ جو لوگ آرام طلب۔ تن آسان اور ہر وقت دوسروں کے دست نگر رہا کرتے ہیں۔ اُن کی مثال جنازہ کی سی ہے جسے لوگ گردن پر اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔

مریدِ ہندی:۔

سرِّ دیں ادراک میں آتا نہیں! کس طرح آئے قیامت کا یقیں؟

پیرِ رومی:۔

پس قیامت شو قیامت را بہ بیں! دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں!

تشریح:۔ اقبال مابعد الطبیعی امور سے متعلق یقین و اطمینان حاصل کرنے کا ذریعہ پوچھتے ہیں۔ پیرِ رومی بتاتے ہیں کہ جو چیزیں عقل و حواس سے ماورا ہیں ان کو یقین و اطمینان کے دائرے میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ان سے متعلقہ عقائد پر سختی کے ساتھ عمل کرے۔ اس طرح جو چیزیں آنکھوں سے نہیں دیکھی جاتیں عمل کرنے سے دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اگر تجھے قیامت کا یقین حاصل کرنا ہے تو ضروری ہے کہ تو خود قیامت بن جا۔ یعنی دین اس سلسلہ میں جو کچھ تصورات و عقائد دیتا ہے اس کا عملی نمونہ بن جا

تجھے وہ چیز جو بظاہر دکھائی نہیں دیتی عمل کی دنیا میں یقیناً نظر آجائے گی -

مُرید ہندی :-

آسماں میں راہ کرتی ہے خودی ! صید مہر و ماہ کرتی ہے خودی !
بے حضور و با فروغ و بے فراغ ! اپنے نخچیروں کے ہاتھوں داغ داغ !

پیر رومی :-

آں کہ ارزد صید را عشق است و بس لیکن او کے گنجد اندر دام کس !

تشریح :- یہ ممکن نہیں کہ اقبال کی شاعری کا ذکر ہو اور خودی کا مضمون زیر بحث نہ آئے۔ یہ دونوں چیزیں شئے واحد ہو کر رہ گئی ہیں۔ چونکہ اقبال نے اپنے کلام کا ایک معتدبہ حصہ خودی کی حقیقت کو بتانے اور اس کی توضیح و تشریح کرنے کے لئے وقف کر دیا ہے۔ وہ اس مقام پر مجرد خودی کی طاقت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-
"اس چیز نے کائنات کی مختلف چیزوں کو اپنا مطیع و مسخر بنا رکھا ہے اور زمین سے آسمان تک اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے لیکن بایں ہمہ فروغ اس کو فراغ و حضور نصیب نہیں ہے اور وہ اپنے ہی نخچیروں کے ہاتھوں زار و نزار ہوئی جا رہی ہے۔"
پیر رومی جواب میں فرماتے ہیں کہ جو چیز شکار کے لائق ہے وہ صرف عشق ہے۔ اگر گرویدہ ہونا ہے تو اس کا گرویدہ ہو رہو اور اس کی معجز نمائیوں کا مشاہدہ کر مگر یہ چیز ہر ایک کے دام میں آنے کی نہیں۔ اس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی قوت درکار ہے جو اس کی متحمل ہو سکے جو خودی عشق کی طاقت سے پروان چڑھتی ہے وہی کمال کے درجہ پر پہنچتی ہے۔ ورنہ مجرد خودی جس کو اپنا شکار بنائے گی۔ خود اس کا شکار ہو کر رہ جائے گی -

مُرید ہندی :-

تجھ پہ روشن ہے ضمیر کائنات کس طرح محکم ہو ملت کی حیات ؟

پیر رومی :-

دانہ باشی مرغکانت برچنند ! غنچہ باشی کودکانت برکنند !
دانہ پنہاں کن سراپا دام شو ! غنچہ پنہاں کن گیاہ بام شو !

تشریح :- اقبال اوپر پوچھ چکے ہیں کہ قومیں کس مرض سے مرا کرتی ہیں۔ اب یہاں پوچھتے ہیں کہ قوم کی زندگی کس طرح محکم ہو سکتی ہے۔ پیر رومی کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے مظاہر اور ظاہری شان و شوکت کے آثار وہ اصل چیز نہیں ہیں جس سے کوئی قوم زندہ رہتی ہے۔ اور جس کی ساکھ اور دھاک دوسری قوموں پر بیٹھا کرتی ہے۔ بلکہ حقیقی تعمیر و ترقی اور زندگی کا واحد ذریعہ اس کے علوم و فنون کی طاقت اور اس کے قومی کردار کی مضبوطی ہے۔ اگر تجھے ملت کی حیات مطلوب ہے تو ظاہری آن بان کی بجائے ان قوتوں اور صلاحیتوں کے اُجاگر کرنے اور پروان چڑھانے کی فکر کر جن سے قومی حیات کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں -

مُرید ہندی :-

تو یہ کہتا ہے کہ دل کی کر تلاش "طالب دل باش و در پیکار باش"
جو مرا دل ہے مرے سینے میں ہے میرا جوہر میرے آئینے میں ہے !

پیر رومی :-

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست دل فراز عرش باشد نے بہ پست !

تو دل خود را دلے پنداشتی! جستجوئے اہلِ دل بگزاشتی!

تشریح :- اقبال پیر رومی کے ایک مصرعہ کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس دل کی "تلاش و جستجو" کا آپ حکم دیتے ہیں۔ وہ تو میرے سینے میں موجود ہے۔ آخر "دل کی تلاش" سے آپ کے نزدیک کن چیزوں کی تلاش مراد ہے۔ پیر روم فرماتے ہیں کہ ہماری زبان میں دل اس گوشت کے لوتھڑے کا نام نہیں ہے جو سینہ میں لٹک رہا ہے۔ اس سے مراد در اصل وہ خدا شناسی کے جذبات ہیں جو عرشِ الٰہی سے رشتہ رکھتے ہیں۔ تم نے اپنے دل ہی کو دل سمجھا اسی لئے تو اہلِ دل کی تلاش چھوڑ رکھی ہے۔ اہلِ دل سے پوچھو کہ جو دل معرفتِ الٰہی کے جذبات کا مخزن ہے اس کا کیا مرتبہ ہے؟

مریدِ ہندی :-

آسمانوں پر مرا فکرِ بلند! میں زمیں پر خوار و زار و دردمند!

کارِ دُنیا میں رہا جاتا ہوں میں! ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں!

کیوں مرے بس کا نہیں کارِ زمیں! ابلہِ دُنیا ہے کیوں دانائے دیں!

پیر رومی :-

آنکہ بر افلاک رفتارش بود بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود!

تشریح :- اقبال فرماتے ہیں کہ میں فکری دُنیا میں بہت بلند پرواز ہوں۔ مگر دُنیوی امور و معاملات میں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھا رہا ہوں اور ذلیل و خوار ہوں۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین کی پوری معرفت حاصل ہونے کے باوجود دُنیا کے معاملہ میں میں کچھ بھی سمجھ بوجھ نہیں رکھتا۔

مولانا جواب دیتے ہیں کہ دین در اصل دُنیا کے معاملات کو ٹھیک طریقہ سے چلانے اور سلجھائے رکھنے ہی کے لئے تو آتا ہے۔ جو شخص دین سے واقف ہو وہ دُنیا کے کام میں کیسے پیچھے رہ سکتا ہے بلکہ اس کے پورے مسائل و معاملات نہایت خوبی سے حل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کا گزر آسمانوں پر ہو اس کے لئے زمین پر چلنا کیا دشوار ہے۔ اسی طرح جس کا فکر آسمانوں کی خبر لاتا ہے وہ زمین پر خوار و زار کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہے تو یہ ایک شدید غلط فہمی اور خود فریبی ہے جو دانائے دیں ہے وہ کبھی ابلہِ دُنیا نہیں ہو سکتا۔ اور جو ابلہِ دُنیا ہے وہ یقیناً دانائے دیں نہیں ہے۔

مریدِ ہندی :-

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ؟ کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

پیر رومی :-

علم و حکمت زاید از نانِ حلال! عشق و رقت آید از نانِ حلال!

تشریح :- اقبال علم و حکمت کے حاصل ہونے اور عشق و سوز پیدا کرنے کا ذریعہ دریافت کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں صرف نانِ حلال سے پیدا ہوتی ہیں۔ نانِ حلال یا کسبِ حلال کو محض ایک جذباتی چیز سمجھنا حقائق ثابتہ کا منہ چڑانا ہے۔ کسبِ حلال اور کسبِ حرام کی تمیز، ذہنیت، خیالات، اخلاق، معاملات ہر ایک چیز پر نہایت گہرا اور دُور رس اثر ڈالتی ہے۔ پس جو شخص اس تمیز سے بہرہ ور ہے وہ انسانیت کاملہ کی صفت سے متصف ہے اور جو شخص حرام کے پیچھے ہوتے سہل الحصول ذرائع کو چھوڑ کر وجہِ حلال پر قناعت کرتا ہے در اصل اسی کا دل و دماغ اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس میں علم و حکمت

اور عشق و رقت جیسی بیش بہا نعمتوں کا گزر ہو سکے۔

مُرید ہندی:۔

ہے زمانے کا تقاضا انجمن　　اور بے خلوت نہیں سوزِ سخن!

پیرِ رومی:۔

خلوت از اغیار باید نے زیار　　پوستیں بہرِ دے آمد نے بہار

تشریح:۔ اقبال پوچھتے ہیں کہ آج کا یہ زمانہ پبلک اور سوشل لائف کا متقاضی ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ خلوت کے بغیر سوزِ سخن حاصل بھی نہیں ہوتا۔ اب آخر صحیح طریق کار کیا ہے؟

مولانا فرماتے ہیں کہ علیحدگی تو ان لوگوں سے ہونی چاہیئے جو ناحق شناس اور دُنیا پرست ہیں۔ ہم خیال، ہم مشرب اور ہمراز لوگوں کے ساتھ تو صحبت و معیت کے بغیر چارہ نہیں اور خلوت در انجمن کا مطلب بھی یہی ہے۔ تم برے اور ناآشنائے راز لوگوں میں گھر جاؤ تو انجمن میں رہ کر بھی تمہیں خلوت نشین ہونا چاہیئے اور اگر ایک آدمی بھی تمہارا ہم خیال ہو کر تمہاری صحبت میں بیٹھے تو یہ تمہارے لئے انجمن سے کم نہیں ہے۔

مُرید ہندی:۔

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز!　　اہل دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز!

پیرِ رومی:۔

کارِ مرداں روشنی و گرمی است!　　کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

تشریح:۔ ہندوستان کی حالت زار اقبال اپنے پیر کے سامنے رکھتے ہیں اور اہل دل کی بدنصیبی کا شکوہ کرتے ہیں۔ کہ انہیں نہ کہیں نور میسّر ہے نہ سوز۔ حضرت رومؒ فرماتے ہیں کہ مردانِ خدا کا کام تو سوز و گرمی سے بہرہ ور ہونا اور اپنے ماحول کو روشن کرنے کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ وہ تاریخ ساز ہوتے ہیں۔ ماحول کے غلام نہیں ہوتے۔ وہ حیلہ بازیاں اور بہانہ سازیاں تو یہ صرف کمزور اور پست حوصلہ لوگوں ہی کا کام ہے۔ جو بے شرمی کی زندگی گزارنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اور دُنیا میں ذلیل ہو کر رہتے ہیں ——!

اسرار احمد سہاوری

ترقی پسندوں کا اسلامی اور غیر اسلامی ادب

کسی زمانے میں ترقی پسندی اور اشتراکیت ہم معنی الفاظ ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اب کچھ ترقی پسند ادیبوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے کہ:-

"ہم سیاسی طور پر اشتراکی نہیں"

لیکن ان کی اشتراکی ذہنیت اس دعوے سے بہت کم بدلی ہے۔ اکثریت اب بھی ایسے ہی لوگوں کی ہے جو علی الاعلان خود کو اشتراکی کہتے ہیں۔ بعض نے مصلحتاً بظاہر اس چولے کو بدل لیا ہے۔ خال خال ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنہوں نے واقعی اشتراکیت اور اس کے پرچار کو سیاسی حیثیت سے ترک کر دیا ہے۔ ہم اس مضمون میں ان حضرات کا وہ ادب آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ جس میں انہوں نے نہایت دیدہ دلیری سے مذہب اور خدا کا مذاق اڑایا ہے اور مذہب کی پیدا کردہ اخلاقی قدروں کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ساتھ ساتھ وہ ادب بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جس پر مذہبی نقطۂ نظر سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور اس کو جائز اور مفید ادب کہا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند ادب میں جائز ادب کی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے اتنا وزن ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اچھی چیزیں جس جگہ بھی ملے اٹھا لینی چاہیئے اور اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ترقی پسند ادب اپنے وسیع ترین معنی میں وہ ادب ہے جس نے زندگی کی پرانی قدروں سے بغاوت کر کے معاشرے میں نئی قدریں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اور اگر چند پرانی قدروں کو باقی بھی رکھا تو ان کی صورت تقریباً بالکل بدل ڈالی زندگی کی پرانی قدروں پر سب سے بڑی چوٹ یورپ کے صنعتی انقلاب سے پڑی۔ اس صنعتی انقلاب نے زندگی کے ہر گوشہ میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ سائنس نے نئی نئی چیزیں ایجاد اور معلوم کیں۔ ضروریات زندگی میں تبدیلی ہوئی۔ لوگوں نے نئے نئے ڈھنگ پر سوچنا شروع کیا۔ تخیلات کی تبدیلی کے ساتھ ادب بھی بدلتا چلا گیا۔

صنعتی انقلاب کا ایک بڑا ردِ عمل یہ ہوا کہ ایک زبردست طبقہ سرمایہ داروں کا پیدا ہو گیا۔ اور ساتھ ساتھ ایک گروہ مزدوروں کا وجود میں آیا۔ ان دونوں طبقوں میں فطرتی طور پر زبردست کشمکش پیدا ہو گئی۔ دوسری طرف سائنس کی معلومات کو پادریوں نے خوف و ہراس کی نظر سے دیکھا۔ انہوں نے اپنی فوقیت اور برتری کے طلسم کو ٹوٹتے دیکھا تو مہرے سے سائنس اور اس کی ایجادات کے دشمن ہو گئے۔

چنانچہ اس لحاظ سے بھی لوگوں کے دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ پادریوں کا طرفدار ہو گیا۔ دوسرا سائنسدانوں کا موجدوں کا اور ان دونوں طبقوں میں بھی زندگی اور موت کی کشمکش پیدا ہو گئی۔ اس نزاع کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ غلط طریقے سے پادریوں کی دشمنی کو مذہب کی دشمنی سمجھنے لگے۔ اور اب محاذ مذہب اور سائنس کے درمیان قائم ہو گیا۔ حالانکہ درحقیقت

ایجادات اور دنیاوی ترقی کا نہ کوئی مذہب دشمن ہے نہ ہو سکتا ہے۔ یہ محض غلط انداز فکر تھا جس نے مذہب اور سائنس کے درمیان یہ صورت حال پیدا کر دی اور یہ صورت حال اب تک غلط طریقے سے جاری ہے۔ لوگ مذہب اور سائنس کو اب تک ایک دوسرے کا حریف سمجھتے ہیں۔ اس کشمکش کا ایک طویل مدت کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ دنیا کے دو ملکوں سے مذہب کو دیس نکالا دے دیا گیا۔ اور سرمایہ داروں کے طبقہ کا بھی نام مٹا دیا گیا۔ گو بہت سے سرمایہ داروں کو ختم کر کے اب حکومت نے ان کی جگہ لے لی ہے اور اب اس کے کارندے عوام کا خون چوس رہے ہیں اور عوام اب بھی وہیں ہیں جہاں کہ انقلاب سے پہلے تھے۔

۱۹۱۷ء میں روس میں بالشویک حکومت برسر اقتدار آگئی، اور مذہبیت کا کلیتاً استیصال کر دیا گیا۔ اسی زمانے سے اشتراکیت نے دوسرے ممالک میں بھی قدم جمانے شروع کر دیئے۔ سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ اس تحریک نے ادب اور اس کے نظریات پر بھی اثر ڈالنا شروع کیا۔

۱۹۳۵ء میں لندن میں ہندوستان کے چند پڑھے لکھے لوگوں نے مل کر ایک اجلاس کیا اور اس اجلاس میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد رکھی اور اسی جگہ بیٹھ کر ان لوگوں نے اس نئی انجمن کا منشور بھی تیار کیا۔ یہ منشور پوری طرح زندگی میں مارکس کے مادی نقطۂ نظر کا علمبردار تھا۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین نے پہلی مرتبہ لکھنؤ میں ہند گیر اجلاس کیا۔ اس اجلاس کی صدارت کے لئے منشی پریم چند کو چنا گیا۔ یہ ہندوستان میں پہلی نیم سیاسی اور نیم ادبی جماعت تھی۔ اس تحریک سے پہلے بھی ہندوستان کے ادیب یورپ کے ادب کو پڑھ کر اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر ملک کے غریب طبقے سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس باقاعدہ انجمن کو دیکھ کر نہایت تیزی سے اس کی تنظیم میں شامل ہو گئے۔ اس انجمن میں اس وقت تک سیاست پر ادب حاوی تھا اور اسی وجہ سے اس میں منشی پریم چند۔ جواہر لال نہرو۔ مولوی عبدالحق۔ ملک احمد علی۔ رشید جہاں۔ راج نند۔ سجاد ظہیر وغیرہ شامل ہو گئے۔ یہ دور دنیا میں ایک معاشی بحران کا دور تھا۔ جنگ کی عالمگیر تباہ کاریاں لوگوں کو پریشان کر رہی تھیں۔ ہندوستان میں نیچے طبقے کے لوگوں کی زندگی وبال ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی کا میسر آنا مشکل تھا۔ پڑھے لکھے طبقے کو معاشرے کی خرابیوں کا نہایت شدید احساس تھا۔ ان حالات کا بعد میں یہ نتیجہ ہوا کہ ترقی پسند ادیبوں میں سے اکثر نے اشتراکیت کو باقاعدہ زندگی کے ایک نظریہ کی حیثیت سے اپنا لیا اور ایسے لوگ ادیب کم اور سیاست دان زیادہ ہو گئے۔ جواہر لال نے اس تحریک کو آزادی حاصل کرنے کے سلسلہ میں ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔

ترقی پسند ادیبوں کی سالانہ کل ہند کانفرنس ہوتی رہی اور وہ اپنے نصب العین کا تھوڑی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اعلان کرتے رہتے۔ پانچویں کانفرنس کے اعلان نامہ میں اس قسم کی عبارت موجود ہے:۔

"سوویٹ یونین کے اشتراکی سماج میں سرمایہ داروں کی آزادی ختم کی جا چکی ہے۔ وہاں
جمہوریت پسند ادیبوں کو پوری آزادی حاصل ہے اور سوویٹ یونین کا ادب اس وقت دنیا
بھر کے ترقی پسند ادیبوں کی رہنمائی کرتا ہے۔"

اس طرح ترقی پسند ادیب اشتراکیت کی گود میں جا پڑے اور آہستہ آہستہ ترقی پسندی اور اشتراکیت مترادف الفاظ ہو کر رہ گئے۔ ان ادیبوں نے مذہب کا۔ خدا کا۔ اخلاقی اقدار کا دل کھول کر مذاق اڑایا۔

اب چند ترقی پسند ادیبوں کی کاوشوں کے تھوڑے سے نمونے بھی آپ کے سامنے پیش کر دیئے جائیں۔ تاکہ دعوی بغیر دلیل کے نہ رہے۔ بنگال کے مشہور انقلابی شاعر نذر الاسلام صاحب فرماتے ہیں:۔

"تم اپنی پیٹھ پر خواہ کتنی ہی کتابوں کا بار لادے پھرو۔ قرآن۔ پران۔ انجیل۔ وید۔ تمہارا جی چاہے تو انھیں گھول کر پی جاؤ۔ لیکن یہ تو کہو کہ اس درد سرسے تمہارا مدعا کیا ہے۔ قرآن۔ وید۔ انجیل کو یہ کم بخت چوم چوم کر مرے جاتے ہیں۔ یہ ناسمجھ کتابوں کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی انھیں بتلائے کہ انسان کتابیں بناتا ہے۔ کتابیں انسان پیدا نہیں کر سکتیں۔"

اسی طرح جوش ملیح آبادی خدا اور شاہ کو معزول کر دینے کی تجویز اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

کر بھی دے معزول ان ارباب عزوجاہ کو ! 　　آسمانوں سے خدا کو اور زمیں سے شاہ کو !

ن، م، راشد صاحب اپنی ایک آزاد نظم میں اپنی آزاد محبوبہ سے اس طرح خطاب فرماتے ہیں :۔

"اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے۔
اپنے بیکار خدا کی مانند۔
اُونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں۔
ایک افلاس کا مارا ہوا مُلّائے حزیں !

زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے
تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سرا پردۂ نسیاں میں ہے
تُو مسرت ہے۔ تُو بیداری ہے
تُو مجھے آغوش میں لے۔

خداوند تعالیٰ کے متعلق ان لوگوں نے جو جو گستاخیاں روا رکھی ہیں۔ ان تمام کا بیان مشکل ہے۔ بہرحال آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ خدا کے متعلق یہ کس قسم کے خیالات کی پرورش کرتے ہیں۔

شاعر انقلاب قاضی نذر الاسلام[1] کی ایک نظم 　　"نعرۂ انقلاب" کے چند جملوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو :۔

"نیکی کے پودے پر صرف گناہ کے پھول کھلتے ہیں
کوئی اوتار اور کوئی پیغمبر اپنے کو بے داغ ثابت نہیں کر سکتا۔
اس نے اپنی روح اگر ثواب کے حوالے کی تو جسم گناہ کے سپرد کیا"

"یہ دنیا سیاہ خانہ ہے۔ جہاں مذہب کی پیٹھ پر ثواب کا خیالی پالان پڑا ہے"

"نطفۂ تحقیق ہو یا ناتحقیق۔ وہ شہوت کا ہی انجام ہوتا ہے۔ اگر عصمت فروش ماں کا بیٹا حرامی ہے تو شہوت پرست باپ کا

---

[1] یہ وہی نذر الاسلام ہیں جن کو علامہ اقبال کے مد مقابل لایا جا رہا ہے۔ اور جن کے نام سے اُس پاکستان میں، انجمنیں قائم ہیں جو صرف اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے (ر۔ ق)

بیٹا بھی یقینی حرامی ٹھہرایا جائے گا۔

قاضی نذر الاسلام صاحب اپنی نظم "باغی" میں فرماتے ہیں:۔

"میں سرکش، سنگدل اور آتش زباں ہوں۔
ہر چیز کو چکنا چور کر دیتا ہوں۔ لاابالی ہوں۔ اصول شکن ہوں۔
قانون، قاعدوں اور پابندیوں کو پیر کے نیچے روند ڈالتا ہوں۔
سماج کی بندشوں سے آزاد ہو چکا ہوں۔
جو دل میں آتا ہے کرتا ہوں۔ غارت گر ہوں۔
میں فانی ہوں۔ میں باقی ہوں۔ میں ازلی ہوں۔ میں ابدی ہوں۔
میں وہ وحدت ہوں جو کثرت سے بالاتر ہے۔
میں خدا ہوں۔ میں دیوانگی ہوں۔ وحشت ہوں"

نظم کے اس ٹکڑے سے آپ کو ترقی پسندوں کے اخلاقی معیار اور خلاقی اقدار کا بھی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی نظم میں قاضی صاحب دیوانگی و وحشت کا ترانہ گاتے ہوئے حسن و عشق کے گلزار میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"کسی دوشیزہ کی زلف پریشاں کا جوڑا ہوں۔ ترچھی آنکھوں کا تیر ہوں۔
کسی حسینہ کا اولین بوسہ ہوں۔
دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہونے والی تھرتھری ہوں۔
جو دیہاتی لڑکی جوانی کے بوجھ سے دبی جاتی ہو۔ اس کے دامن کا نچوڑ ہوں"

آپ نے اس نظم میں توازن اور ہم آہنگی ملاحظہ فرمائی۔ کہاں تو نذر صاحب کا باغی۔ غارتگر ہے۔ خدا ہے۔ دیوانگی ہے۔ وحشت ہے۔ اور کہاں پھر بوسہ۔ تھرتھری۔ سہمی ہوئی نگاہ۔ جوانی کے دامن کا نچوڑ۔ اور خدا جانے کیا کیا بن جاتا ہے۔ اور دامن کے نچوڑ کے تو معنی بھی سمجھنا مشکل ہیں۔ شاعر خود ہی خوب جانتا ہوگا کہ اس سے اس نے کیا مطلب لیا ہے۔

قاضی صاحب اپنی ایک نظم "گناہ" میں فرماتے ہیں:۔

"میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔ سب گنہگار میرے ہی بھائی بہن ہیں۔
اور میں تو دریائے معاصی میں ڈوبتے تیرتے پاپیوں کا سردار ہوں۔
یہ تو بستی ہی پاپیوں کی ہے۔
مادرِ گیتی کا حسن سدا بہار ہے اور اس پر کسی جبار و قہار کا حکم نہیں چلتا۔
بلکہ اس پر محبت کا دیوتا اپنی رانی کے ساتھ فرمانروائی کرتا ہے"

احمد ندیم قاسمی صاحب اپنی ایک نظم "ردِ عمل" میں مشیت کو اس طرح للکارتے ہیں:۔

اب میرا جہاں حسن و جوانی کا جہاں ہے　　　مقصد میرا اب خواجگئ کون و مکاں ہے
اے جبرِ مشیت تیرا ادت اب کہاں ہے!

خالق کون و مکاں نے انسان کی کم ظرفی کا کس قدر صحیح تجزیہ کیا ہے کہ وہ آسائش میں ہو تو مغرور ہو کر خدا کو بھلا دیتا ہے اور

ذراسی تکلیف بڑھ جائے تو بے صبر ہو کر گلے شکوے کرنے لگتا ہے۔ ندیم صاحب ذرا دیر کے لئے حسن و جوانی کا جہان دیکھتے ہی کیسے آپے سے باہر ہو گئے کہ مشیت کو للکارنے لگے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

ایک دوسرے ترقی پسند شاعر سلام مچھلی شہری اپنی نظم "پلکوں کی چھاؤں" میں فرماتے ہیں ؎

میری جو رات کو لے کر یہی مدھم سا چراغ — دیکھتی رہتی ہو نمناک نگاہوں سے مجھے
میری ہر مرد خموشی پہ بظاہر ہنس کر — بھینچ لیتی ہو جو اکثر اپنی بانہوں سے مجھے

ساحر صاحب لدھیانوی اپنے ایک شعر میں عقائد کو "وہم" اور مذہب کو "خیالِ خام" قرار دیتے ہیں ؎

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

اپنی ایک نظم "چکلہ" میں اس طرح گوہر افشانی فرماتے ہیں ؎

"بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ — یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ — ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

"طلوعِ نو" میں تو گویا جامے سے باہر ہو گئے ہیں ؎

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر — پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر
انسان الٹ رہا ہے رخِ زیست سے نقاب — مذہب کے اہتمامِ فسوں پروری کی خیر
الحاد کر رہا ہے مرتب جہانِ نو — دیر و حرم کے حیلۂ غارتگری کی خیر

علی سردار جعفری "سرمایہ دار لڑکیاں" میں فرماتے ہیں ؎

اہرمن تو اہرمن ہو جائے یزداں بھی شکار — ان کا ہر انداز تاجر ہر ادا سرمایہ دار

"اشتراکی" میں ہم مشربوں کی اس طرح حوصلہ افزائی کرتے ہیں ؎

برہمن تجھ کو سمجھتا ہے نجس — مولوی کے لئے کافر تو ہے
توڑ دے جھوٹے خداؤں کا طلسم — صبحِ صادق کا پیمبر تو ہے

"ترقی پسند مصنفین" میں فرماتے ہیں ؎

کعبہ و دیر و کلیسا کی بجھا دیں قندیل — ہر طرف مشرق و مغرب میں اجالا کر دیں
رنگِ خوں بھر کے بنائیں وہ نئی تصویریں — کاوشِ مانی و بہزاد کو حیران کر دیں
دے کے احساس نیا ہند کے مہ پاروں کو — حسنِ یوسف کو چراغِ تہِ داماں کر دیں
کھول دیں سب کے لئے قفلِ درِ میخانہ — حضرتِ جوش کو سرحلقۂ رنداں کر دیں

یہ تصویر کا تاریک رخ تھا۔ اب میں چند ترقی پسند حضرات کے کچھ وہ اشعار آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ جن کو ہم جائز ادب میں شمار کر سکتے ہیں۔ جن پر اسلام کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے ہم کوئی اعتراض نہیں کر سکتے۔ اور جو فنی اور اثر انگیزی کے لحاظ سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔

فیض احمد فیض کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا　　تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

دقتِ حرمان دیاس رہتا ہے !　　دل ہے اکثر اُداس رہتا ہے

تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو　　مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

ایک اور غزل میں فیضؔ کے تیور ملاحظہ ہوں۔ یہ غزل قید خانے میں لکھی گئی ہے ؎

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے　　جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی　　ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک

اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

قتیل شفائی صاحب فرماتے ہیں ؎

کانٹا ہے وہ کہ جس نے چمن کو لہو دیا　　خونِ بہار جس نے پیا ہے وہ پھول ہے

لُٹ کر بچھے ہیں کہ دام ہیں راہ زن　　کتنی حسین اہلِ مروت کی بھول ہے

علی سردار جعفری کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا　　اُٹھ اُٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

اپنی ایک نظم "متاعِ ہنر" میں کہا ہے ؎

طلوعِ مہرِ درخشاں نمودِ صبحِ بہار　　شفق کا رنگ جبینِ سحر کی تابانی

متاعِ ذوقِ نظارہ گراں نہیں لیکن　　گراں ہے مجھ کو متاعِ ہنر کی ارزانی

"جوانی" میں فرماتے ہیں ؎

مرے نعروں میں ہے جاہ و جلالِ جوشِ طوفانی　　مری آہوں میں بل کھاتی ہوئی موجوں کی طغیانی

مری افسردہ نظروں میں نہاں دُنیا کی قیمت ہے　　مری چینِ جبیں پر نقش تاریخِ حقیقت ہے

مرے زخموں میں حدتِ زندگی کے آفتابوں کی　　مری ٹھوکر میں پنہاں داستانیں انقلابوں کی

جوشؔ ملیح آبادی کا پہلا مجموعہ نظر سے گزرا تو تعجب ہوا کہ اس قدر اچھے قسم کا مسلمان آگے جا کر بے دین۔ دہریہ اور اشتراکی خیال کا ہو گیا۔ ان کا پہلا مجموعہ "روحِ ادب" حمد، نعت اور سنجیدہ قسم کی نظموں سے بھرا ہوا ہے۔ آج اس مجموعے کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کلام جوشؔ ملیح آبادی کا ہو سکتا ہے۔ نمونہ کے لئے صرف ایک نظم پیش کروں گا ؎

بے تعلق ہوں دین و دُنیا سے　　حُبِ ثروت نہ فکرِ جنت ہے

نہ مجھے شوقِ صبح آسائش　　نہ مجھے ذوقِ شامِ عشرت ہے

نہ تو حور و قصور پر مائل　　اور نہ ساقی و مے سے رغبت ہے

نہ تقاضائے منصب و جاگیر　　نہ تمنائے شان و شوکت ہے

کچھ مجھے تیرے در سے مل جائے　　کس منافق کو اس کی حسرت ہے

کیا کروں گا میں نعمتیں لے کر — میری ہر سانس ایک نعمت ہے
تجھ پہ روشن ہے اے مرے مولا — کہ میرے دل میں سوزِ وحدت ہے
تیرے انعام کی نہیں خواہش
بلکہ مجھ کو تری ضرورت ہے

ایک اور نظم "فرائض" اس سلسلہ میں پیش کی جاسکتی ہے ؎

تجھ کو اے دل خود تڑپنا بھی ہے تڑپانا بھی ہے — آگ بننا ہی نہیں ہے آگ برسانا بھی ہے
آسماں لائے کی ہیں دوہری خدمتیں تیرے سپرد — چونکنا بھی ہے، تجھے دنیا کو چونکانا بھی ہے
صرف سننا ہی نہیں تجھ کو پیامِ زندگی — بلکہ اس پیغام کو دنیا میں پھیلانا بھی ہے
خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام — تجھ کو اس ظلمت کدے میں نور برسانا بھی ہے
تا بکے دیکھے گا خود ہی جوہرِ تیغِ اجل — اُٹھ کہ اب اس تیغ کے جوہر کو منوانا بھی ہے
موت سے بڑھ کر نہیں کوئی نگہبانِ حیات — تجھ کو یہ نکتہ سمجھنا بھی ہے سمجھانا بھی ہے
اے دلِ ناعاقبت اندیش تلکے بے مراد
بزم میں ساقی بھی ہے موجود پیمانا بھی ہے

اب احمد ندیم قاسمی صاحب کا کچھ جائز قسم کا ادب ملاحظہ ہو۔ بارگاہِ نیاز میں فرماتے ہیں ؎

جھکتے ہیں سرکشوں کے شب و روز سر یہاں — رہتا ہے حسنِ نورِ ازل جلوہ گر یہاں
جن کے قدم جرس کی صدا پر نہ اٹھ سکے — کرتے ہیں پل میں کون و مکاں کا سفر یہاں
ایک ایک پل ہے زندگیٔ جاوداں ندیم
پاتا ہوں عمرِ خضر کو بھی مختصر یہاں

"گناہِ بے گناہی" میں ارشاد ہوتا ہے ؎

لہو ٹپکا کے گرد آلود اور آوارہ تنکوں پر — زمیں کے چپے چپے کو گلستاں کر دیا میں نے
قدم بوسی ہی جن بدبخت ذروں کا مقدر تھی — جلا دے کر انھیں مہرِ درخشاں کر دیا میں نے
جلا کر شمعِ احساس و تفکر جانے دل میں — اندھیرے رہگزاروں پر چراغاں کر دیا میں نے

"بے قراریوں" کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے خوب ہیں ؎

دل میں جب بے کلی نہیں رہتی — زندگی زندگی نہیں رہتی
زندگی شاہراہِ پُرخم ہے — زندگی اضطرابِ پیہم ہے
رعشۂ برق ہے حیات اپنی — بے نوائی ہے کائنات اپنی

ندیم صاحب نے "تذبذب" میں چند معرفت کے اشعار کہے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خوب کہے ہیں۔ احساس کی شدت - عبارت کی روانی - الفاظ کا انتخاب قابلِ داد ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کسی کو مل نہ سکی بارگاہِ ناز تیری — مگر ازل سے اسی کی تلاش جاری ہے

مرے خیال میں پرتو ہے تیرے جلوے کا — وہ ایک خمار سا جو آگہی پہ طاری ہے
فقیہہ شہر کا اصرار ہے کہ یہ مستی — فقط فسردہ خیالی کی سحرکاری ہے
مری نگاہ میں لیکن وہ کاہن عرفاں بھی
مگر بدست سہی روشنی سے عاری ہے

اگر نجوم میں تو ہے تو چاند میں ہے کون — ترے جمال کی تقسیم ہو نہیں سکتی !
ازل، ابد کا تصور، فقط تصور ہے — ترے وجود کی تقویم ہو نہیں سکتی !
حرم میں تو ہے تو آخر کنشت میں ہے کون — کہ ایک ذات تو دو نیم ہو نہیں سکتی !
جو قوتیں ہوں تیری منتشر تو سچ کہہ دوں
کہ اس جہان کی تنظیم ہو نہیں سکتی

ندیم صاحب اپنے ایک فلسفی دوست سے کیا خوب فرماتے ہیں ؎

بحثِ ادراک کہاں ڈوب چلی — جب نظر آئے مقاماتِ جمال
فکرِ ماضی میں رہوں کیوں مغموم — اب نگاہوں میں ہیں مستقبل وحال
عشق نے دل کو حرارت بخشی — عقل جینے کو سمجھتی ہے وبال
زندگی خواب ہوئی جاتی ہے — آفریں ! شعبدہ بازیٔ خیال
امتیازاتِ من و تو کیا ہیں — نقشِ اوہام کے پھیلے ہوئے جال
مادہ قہقہہ بن جاتا ہے — ذوق و وجدان ہوں جب شاملِ حال

دو قطعے ملاحظہ ہوں ؎

یہ مری آرزو کا پرتو ہے — میرے اوہام کا غبار نہیں
یہ وہی تو ہے شمعِ ہستی کی — جس کی تقدیر میں مزار نہیں

میں تھکن سے نڈھال ہوں لیکن — کیوں ادھورا رہے سفر میرا
تب کروں گا میں اعترافِ شکست — موت جب تھام لے گی سر میرا

"سہارا" ملاحظہ ہو ؎

جنونِ خام سہی آرزوئے منزلِ دوست — فریبِ رنگ سہی پرتوِ جمالِ حبیب
سراب ایک سہارا تو ہے مسافر کا — سفر دراز سہی وہ تو جو رہے ہیں قریب
یہ عزم خواب سہی خواب کا وجود تو ہے — غمِ حیات کے دم سے دمِ حیات ملا
وہ اپنی موت کو بھی زندگی بنا لے گا — اگر ندیم کو مرکزِ حریمِ ذات ملا

"احساسِ غلامی" میں سلاست و روانی ملاحظہ ہو ؎

مٹی میں مل گئی مری فرخندہ اختری — وہ خاک پر پڑا ہے مرا تاجِ سروری !
اک موجِ تند و تیز بہا لے گئی مجھے — کام آ سکا نہ دقت پہ فنِ شناوری

احساس مردہ، عشق فسردہ، زباں گنگ — کیا ڈھونڈتی ہے مجھ میں نگاہِ ہنروری
اب مائلِ زوال ہے ہر فنِ دلپذیر — الفاظ کی نمائش کہ تا اِلِ سخنوری
بندوں کے نقشِ پا پہ جبیں سجدہ ریز ہے — بھولا ہوا ہوں میں روشِ بندہ پروری

"نقشِ فردا" میں ندیم صاحب کا عزم ملاحظہ ہو ؎

میں آرزوئے چشمۂ حیواں نہ کروں گا — مر جاؤں گا پہ حسرتِ داماں نہ کروں گا
اب تیری رضا میرے لئے عین خوشی ہے — اب شکوۂ غمہائے فراواں نہ کروں گا
بے ربط مرے نالے کے آگے نہ بکیں گے — برباد کبھی دولتِ عرفاں نہ کروں گا
یہ جنسِ گراں مایہ ہے غیرت کا دفینہ — غیرت کو کبھی سر بگریباں نہ کروں گا
اشعار نہیں راز ہیں یہ ارض و سما کے — دولت کے لئے شعر کو ارزاں نہ کروں گا

فیض ترقی پسندوں میں ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کا معیار بلند ہے۔ "سُرخ سویرے" کا پروپیگنڈا اندھا دھند نہیں کرتے "ننگی بھوک" کی شکایت ہمہ وقت ان کا مشغلہ نہیں۔ طرزِ کلام سنجیدہ ہے۔ احساس کی شدت، الفاظ کا انتخاب، تراکیب کی ہم آہنگی، عبارت میں ترنم بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے کلام میں سے اچھا خاصا حصّہ ایسا نکل سکتا ہے جس کو ہم اپنا سکتے ہیں۔[1] ان کے کلام میں تاثیر ہے۔ درد ہے اور خلوص ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج — ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی — اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

ایک غزل میں عبارت کا ترنم، سلاست اور روانی قابلِ داد ہے ؎

حسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز — عشق منت کشِ فسونِ نیاز!
دل کا ہر تار لرزشِ پیہم — جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز
سوزشِ دردِ دل کسے معلوم — کون جانے کسی کے عشق کا راز
میری خاموشیوں میں لرزاں ہے — میرے نالوں کی گم شدہ آواز
تو ہے اور اک تغافلِ پیہم — میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

توقعِ ناکامی امید ہے فیض
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

ایک قطعہ میں فرماتے ہیں ؎

مرت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا — کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا!
ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ — وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا

---

[1] ۔ نہ جانے اس "اپنانے سے" فاضل مضمون نگار کا کیا مقصد ہے؟ کارل مارکس اور اسٹالن جیسے ملحدین اور منکرینِ خدا کے اقوال اور ملفوظات کے بعض حصّوں کو بھی ہم "اپنا سکتے ہیں"۔ (م۔ق)

عرصۂ دہر کے ہنگامے تہہ خواب سہی　　　گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا
ساقیا رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل　　　اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پیمانہ اپنا
بیش قیمت ہیں یہ غم ہائے محبت مت بھول
ظلمتِ یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا

فیض احمد فیض کے قید خانے میں کہے ہوئے کلام میں درد اور تاثر دوبالا ہو گئی ہے۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے　　　کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں ہم نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا۔ کہ رکھ دی ہے　　　ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں ہم نے

"صبحِ آزادی" انقلاب کی ناکامی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر　　　وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
جگر کی آگ، نظر کی امنگ دل کی جلن　　　کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کدھر سے آئی نگارِ صبا۔ کدھر کو گئی　　　ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی　　　نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

قتیل شفائی کی ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

خیال و خواب سے چل کر شعور تک پہنچے　　　تری تلاش میں ہم دور دور تک پہنچے
مذاقِ اہلِ نظر سے نہ کوئی کھیل سکا　　　پہنچنے والے غیاب و حضور تک پہنچے
اگر خلوص بھی شامل ہو رقصِ بسمل میں　　　تو بے بسی کا فسانہ غرور تک پہنچے
توہمات کی شبنم میں آپ غلطاں تھے　　　ہم آنچ بن کے خرد کی حضور تک پہنچے
مزاجِ دیدہ و دل میں کچھ اختلاف سا ہے　　　وگرنہ تلخیٔ غم بھی سرور تک پہنچے
قتیل اس کی مروت کا کیا ٹھکانا ہے　　　وہ اک نظر جو دلِ ناصبور تک پہنچے

ایک اور نظم ملاحظہ ہو ؎

ضمیرِ لالہ و گل کی پکار بن کے اٹھو　　　اٹھو تو شعلۂ رنگِ بہار بن کے اٹھو
تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے تارے　　　دلوں میں دردِ غمِ انتظار بن کے اٹھو
بڑھو خلوص تہور سے جانبِ منزل　　　غرورِ گردِ سرِ رہگزار بن کے اٹھو
ابھی خزاں کے تلاطم میں ہے سفینۂ گل　　　روش روش سے نشانِ وقار بن کے اٹھو
نکھر نکھر کے ملے گا جمالِ سرو سمن　　　سرودِ خونِ رگِ شاخسار بن کے اٹھو

محترمہ آدا بدایونی کی "تعمیرِ نو" ملاحظہ فرمایئے ؎

شرمندگیٔ کوششِ ناکام کہاں تک　　　مجروحیٔ تقدیر کا الزام کہاں تک
دنیا کو ضرورت ہے ترے عزمِ جواں کی　　　سرگشتہ رہے گی صفتِ جام کہاں تک

کب تک ترے ہونٹوں پہ حدیثِ رُخِ تاباں — سر میں ترے سودائے لبِ بام کہاں تک
بیلائے حقیقت سے بھی ہو جا کبھی دوچار — خوابوں کی حسیں چھاؤں میں آرام کہاں تک
رُخ گردشِ دوراں کا پلٹ سکتا ہے تو خود — نادان گلۂ گردشِ ایام کہاں تک
کب تک ترے سینے میں خلش تیرِ مژہ کی ! — یادِ لبِ میگوں سحر و شام کہاں تک
اے ذرۂ ناچیز مجلی مہر کو کردے ! — افتادہ و تفتیدہ و گمنام کہاں تک

جز ہم نہیں قیدِ رہ و رسمِ زمانہ
اے طائرِ آزاد ! تو دام کہاں تک

ایک دوسری نظم "کمیاب نگاہیں" بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

ارزاں وہ نگاہیں ہیں زمانے میں کہ جن کو — ہر منظرِ خوش رنگ کے انداز لبھائیں
ہر پھول کے دامن پہ کریں ناز سے سجدہ — ہر غنچۂ نورس کو کلیجے سے لگائیں
گر تشنگیٔ حسن ستارے لیں دریں تشکر — ذروں کو کہہ ہمدم و ہمراز بنائیں

کمیاب ہیں لیکن وہ جہاں سوز نگاہیں
بڑھ کر جو کمندِ انجم و خورشید پہ ڈالیں

اسرار الحق مجاز کی ایک غزل پر مضمون کو ختم کرتا ہوں ؎

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں — یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں
تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا — بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں
یہ میرے عشق کی مجبوریاں، معاذ اللہ — تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں
بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل — ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

مجھے سُنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت
مجاز ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

فاضل مضمون نگار کی یہ وسعتِ ظرف اور جوہر شناسی کی دلیل ہے کہ انہوں نے زاویۂ نگاہ کے اختلاف کے باوجود ترقی پسند شاعروں کی اچھی چیزوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ حالانکہ اب سے چند سال قبل "بارگاہِ ترقی پسندی" سے بعض اُن شاعروں کے بارے میں جو "اسلام پسند" ہیں ترقی پسند مجلّوں اور جریدوں کو حکم نامے بھیجے گئے تھے کہ ان لوگوں کا کلام شائع نہ کیا جائے :

نمونے کے طور پر جو اشعار اس مضمون میں پیش کئے گئے ہیں وہ ہم نے کسی تنقید کے بغیر جوں کے توں چھاپ دیئے ہیں۔ اگرچہ اظہار و خیال کی بعض اشعار میں خامیاں پائی جاتی ہیں !

اس مقالے کے سلسلہ میں ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ خدا ۔ اخلاق اور مذہب کے شدید سے شدید منکر شاعروں اور ادیبوں کے کلام اور مضامین میں ہر شعر اور ہر تحریر میں تو کفر، الحاد اور مذہب و اخلاق کا استہزاء نہیں ہوتا۔ عقیدہ نگاہ کے شدید اختلاف کے باوجود ہر شاعر اور ادیب کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہتا ہے جس پر "قدرِ مشترک" کا اطلاق ہوتا ہے۔ "زہرِ عشق" کتنی بدنام مثنوی ہے اور اس میں ہوا و ہوس کی کس قدر رنگ آرائی ہے مگر اس مثنوی سے بھی ایسے اشعار چنے جاسکتے ہیں جن کو "جائز ادب" کہہ سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی شاعر کا کلام پڑھ کر عام طور پر طبیعت کیا اثر قبول کرتی ہے ! (م۔ ق)

از محمد امام الدین رام نگری

نعت

محمد جانِ ایماں، روحِ دین ست — محمد غازہ روئے یقین ست
محمد سید و سردارِ کونین — امامِ اولین و آخرین ست
محمد حاملِ وحی و سکینہ — محمد مہبطِ روح الامین ست
محمد شمعِ حق ۔ نورِ ہدایت — محمد شرحِ قرآنِ مبین ست
محمد صاحبِ اخلاقِ حسنہ — محمد رحمۃ للعالمین ست
چہ اسما و چہ القابش چہ اوصاف — بشیر ست و نذیر ست و امین ست
مثالِ او نہ پیدا کرد گیتی — مثالِ او نہ بر روئے زمین ست
نثارِ ذاتِ او جانِ دو عالم — کہ او محبوبِ ربّ العالمین ست

پئے تسکینِ دل ایں بس کہ حافظ
نبیِ ما شفیع المذنبین ست

ماہر القادری

مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے

پاک دل، پاک نفس، پاک نظر کیا کہنا — بعد مکہ کے مدینہ کا سفر کیا کہنا
جیسے جنّت کے دریچوں سے جھلکتی ہو بہار — پہلی منزل ہی کے انوارِ سحر کیا کہنا
تپشِ شوق بھی ہے، گرمیٔ موسم بھی ہے — اور پھر اس پہ مرا سوزِ جگر کیا کہنا
راہِ طیبہ کی ببولوں پہ مچلتی ہے نگاہ — مرحبا! دیدۂ فردوس نگر کیا کہنا
خشک آنکھوں کو مبارک یہ طغیانیٔ شوق — ہیں رواں اشک بہ اندازِ دگر کیا کہنا

سنگریزے ہیں کہ جاگی ہوئی قسمت کے نجوم
خارِ منزل ہیں کہ انگشتِ خضر کیا کہنا!

عاصی کرنالی

محرومیٔ احساس

سرگشتہ ہے، حیراں ہے، پریشاں ہے مجھے کیا
انساں ہے اور گردشِ دوراں ہے مجھے کیا

افلاک سے بجلی شرر افشاں ہے مجھے کیا
اندیشہ ہے اور خرمنِ دہقاں ہے مجھے کیا

میں کشتیٔ ملت کا محافظ تو نہیں ہوں
گرداب ہے، سیلاب ہے، طوفاں ہے مجھے کیا

تاریخ کے دامن پہ یہ داغ ہیں، پھر ہوں
افسانے میں کچھ خونِ شہیداں ہے مجھے کیا

دامن کوئی ہوتا ہے اگر چاک، بلا سے
عورت کوئی بے پردہ و عریاں ہے مجھے کیا

کلیاں بھی ہیں اور پھول بھی دامانِ ہوس میں
یہ شیوۂ اربابِ گلستاں ہے مجھے کیا

وہ لوٹ پڑے عصمتِ آدم پہ درندے
اب جیب ہے، دامن ہے، گریباں ہے مجھے کیا

پردوں سے گزرتی ہیں ہوس کار نگاہیں
یہ شوق بقدرِ لب و دنداں ہے مجھے کیا

افلاس کی جلتی ہوئی آنکھوں کی حدوں میں
جو نیند ہے اک خوابِ پریشاں ہے مجھے کیا

اس عہدِ ترقی میں ضرورت بھی نہیں تھی
قرآن کا شیرازہ پریشاں ہے مجھے کیا

اسلام اگر زندہ رہا بھی تو کہاں تک ؟
بیمار یہ دو روز کا مہماں ہے مجھے کیا

قائم ہے ابھی گردشِ دوراں کا تسلسل !
دوبارہ کسی حشر کا امکاں ہے مجھے کیا

گونجا نہیں مدت سے کوئی نعرۂ تکبیر
مسجد نہیں، اک شہرِ خموشاں ہے مجھے کیا

اٹھا نہیں برسوں سے کوئی مردِ مجاہد
مکتب نہیں، اک گورِ غریباں ہے مجھے کیا

افلاس کے گھر میں تو اندھیرا ہی رہے گا
میں ہوں، مری محفل ہے، چراغاں ہے مجھے کیا

رہنے دو۔ یہ مزدور تو روتے ہی رہیں گے
رقاصہ ہے اور سازِ غزل خواں ہے مجھے کیا

میں نعمتِ احساس سے محروم ہی اچھا
یہ چیز کسی اور کے شایاں ہے مجھے کیا

اجڑی ہوئی، بے خواب فضاؤں سے بہت دور
اک خواب مرے کیف کا ساماں ہے مجھے کیا

یہ چھپتا ہوا وقت، یہ سہمے ہوئے حالات!
پہلو میں اک آرامِ دلِ ویراں ہے مجھے کیا

شبنم سبحانی

کامراں ہے اُسی انسان کا مرنا جینا
جس کو اللہ نے بخشی ہو نگاہِ بینا

ہم اسی شان سے دیکھیں گے دیارِ جاناں
ہم کو سکھلا نہ خود چاکِ گریباں سینا

آپ کے لطف نما سنگِ گراں سے ٹوٹے
کتنے دل، جیسے شکستہ ہو کوئی آئینا

بادۂ صافیٔ توحید ہے درکار ہمیں
ہم کو آتا نہیں دردِ تہِ ساغر پینا

عزم و امکاں

عبدالکریم ثمر

سلیقے سے اٹھاؤ زیست کی تمہید فرزانو
تمہیں ہر بات کی تاویل بن جانا بھی آتا ہے

حرا کے غار سے لیکر شب معراج کی حد تک
نفس کو نغمۂ جبریل بن جانا بھی آتا ہے

جہاں والے جنہیں اب دار کے قابل سمجھتے ہیں
انہیں شبیر و اسمٰعیل بن جانا بھی آتا ہے

عصائے موسوی چھینا اگر فرعون زادوں نے
کہ اشکوں کو رودِ نیل بن جانا بھی آتا ہے

قدامت کی تہوں میں چھپنے والے داغوں کو
بہر لمحہ نئی تخئیل بن جانا بھی آتا ہے

غبارِ راہ میں کیوں مضطرب ہیں قافلے والے
مرے جادے کو سنگِ میل بن جانا بھی آتا ہے

ستاروں کی طرح چمکیں گے ذرے آخر شب میں
ہمیں خود نور کی قندیل بن جانا بھی آتا ہے

کہاں ہوں گے ؟

عروج زیدی بدایونی

نہ بالائے زمیں ہونگے نہ زیرِ آسماں ہوں گے
یہی جو رہنماں ہے تو خدا جانے کہاں ہوں گے ؟

جنہیں دنیا رہِ منزل سے ناواقف بتاتی ہے
رہِ منزل میں ابتک ان کے قدموں کے نشاں ہوں گے

تجلی ایک لہراتی ہوئی بجلی سہی لیکن
ہمیں تو سامنا کرنا ہے گو آتش بجاں ہوں گے

غرورِ حسن جب شایانِ وفا پر خندہ زن ہوگا
بتا اس وقت ہمارے نازِ خودداری کہاں ہوں گے ؟

قدم جو بڑھ چکا ہے اب وہ پیچھے ہٹ نہیں سکتا
مٹیں گے یا ہمارے نام کے سکے رواں ہوں گے

وہی ہاں ان ہی اب وجہِ تسکینِ خاطر ہیں
ہمیں جن سے توقع تھی کہ یہ آرامِ جاں ہوں گے

جنہیں تم سست گام و مردہ دل رہرو سمجھتے ہو
اگر عزمِ سفر کرلیں تو میرِ کارواں ہوں گے

وہ بربادی کے جشنِ عام کی تائید کرتے ہیں
جنہیں دعویٰ تھا ہم پیغمبرِ امن و اماں ہوں گے

عروج! آئینِ دیں سمجھیں نہ دستورِ جہاں جانیں
مگر دعویٰ یہ ہے ہم نازشِ کون و مکاں ہوں گے

ل بھی سکتا ہے یہ زمانہ

آزاد مظفرپوری بی کام

نہ ہو سکے وہ قریب مجھ سے، بہک سکی گردشِ زمانہ
رہے عجیب کشمکش میں دونوں جو بات بنتی گئی فسانہ

چرا کے کلیوں کے رنگ و بو کو چلے ہیں جو اپنا گھر سجانے
یہ بات شاید وہ بھولتے ہیں بدل بھی سکتا ہے یہ زمانہ

ہزار طوفان سر سے گذرے ہزار بجلی تڑپ کے آئے
بنانے والے بنا ہی لیں گے کسی طرح اپنا آشیانہ

سمجھ نہ پائے جو تم مرا غم، تو کچھ مجھے اس کا غم نہیں ہے
حقیقتوں پر نگاہ پڑتی ہے اکثر انساں کی طائرانہ

شفیق جونپوری

تاثرات

کبھی مستوں کو خوفِ گردشِ دوراں نہیں ہوتا
بہار آئے نہ آئے میکدہ ویراں نہیں ہوتا

اسیرانِ قفس کو اعتبارِ بوئے گل کیا ہو
چمن کا راز بھی کم بخت سے پنہاں نہیں ہوتا

وہی ہوتا ہے موقع انتقامِ دستِ قدرت کا
کوئی دنیا میں جب مظلوم کا پرساں نہیں ہوتا

چمن رنگیں سہی لیکن طلوعِ مہر سے پہلے
کبھی شبنم کا قطرہ گوہرِ تاباں نہیں ہوتا

جو ہوتی ہے تو برسوں روشنی ہوتی ہے عرفاں کی
نہیں ہوتا تو صدیوں آدمی انساں نہیں ہوتا

یہ ظالم بھی ہمارا ہی گریباں چاک کرتا ہے
جنوں سے کچھ علاجِ تنگیٔ داماں نہیں ہوتا

خدا کی دین ہے جس کو ملے اعزازِ رسوائی!
محبت میں ملامت کا مقام آساں نہیں ہوتا

عجب عالم ہے راضی بر رضائے دوست رہنے کا
کہ آنکھیں نم رہا کرتی ہیں دل گریاں نہیں ہوتا

محبت پر بنائے زندگی ہے حضرتِ ناصح!
یہ شے جب تک نہ ہو کارِ حیات آساں نہیں ہوتا

کسی کی یاد میں اے چارہ گر آنسو بہانے دے
کہ جب تک رو نہیں لیتا ہوں دل خنداں نہیں ہوتا

ہزاروں حور و غلماں ہوں تو کیا جنت میں اے واعظ
وہاں رونق نہیں ہوتی جہاں انساں نہیں ہوتا

اسیروں کے خدا فریاد ہے تیری مشیت سے
چمن برباد ہوتا ہے قفس ویراں نہیں ہوتا

کنارے سے کبھی پہچان لیتے تھے تلاطم کو
اور اب منجدھار میں اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

شفیق اک طرفہ آسائش کی جا ہے قبر کی منزل
یہ گھر آباد ہو کر حشر تک ویراں نہیں ہوتا

حکیم سید شہیر نجمی

غنچہ و گل نے پکارا ہے گلستاں سے ہمیں
اب الجھنا ہی پڑے گا درِ زنداں سے ہمیں

دلِ بیتاب بڑی چیز ہے مرگِ ناکام
زندگی یاد کرے گی، کئی عنواں سے ہمیں

سامنے آ، کہ نگاہوں کو ملے سوزِ دوام
دیکھنے والے۔ حجابِ غمِ دوراں سے ہمیں

ڈوبتے وقت جو ساحل سے نظر ٹکرائی
واسطہ ہو گیا اک اور بھی طوفاں سے ہمیں

حاصلِ عشق بھی ہے، غائتِ تخلیق بھی ہے
وہ لطافت جو ملی لذتِ ایماں سے ہمیں

ہمصفیرانِ چمن آؤ کہ رخصت ہو لیں
کون پھر لائے گا اس بزم میں زنداں سے ہمیں

کیا خبر جشنِ بہاراں ہے کہ بزمِ ماتم
کوئی آواز تو آتی ہے گلستاں سے ہمیں

جانِ نظارہ تمہاری ہی تجلی ہے شہیر
کس نے ٹکرایا ہے آئینۂ حیراں سے ہمیں

روحِ انتخاب

زبان کے معاملہ میں فقط سمجھ لینا کافی نہیں۔ مشق اور کثرتِ استعمال ایک ضروری شرط ہے۔ اکثر غلطیاں جو ہم لوگوں سے گفتگو اور تحریر فارسی میں ہوتی ہیں۔ ان کا سبب یہ ہے کہ ہم کو اُن کے ہر قسم کے الفاظ پر اور مناسب مقام محاوروں پر عبور نہیں۔ یہ بات دو طرح سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ ہمیشہ اہلِ زبان کے ساتھ نشست و برخاست رہے اور ہر وقت اُن سے ہم کلام رہیں۔ یہ نہ ہو سکے تو اُن کے کلام کو ہر وقت پڑھتے رہیں اور زبان پر جاری کرتے رہیں!

اسے اندر نہ آنے دینا — ہندی کہیگا — "این را درون آمدن نہ دہید" اہلِ زبان کہیگا: "مگزار کہ سر فرش بیاید" — اگر کہنا ہو کہ "اسے باہر نکال دو" تو ہم کہتے ہیں "این را بیرون کن" اہلِ زبان کہتے ہیں "بدرش کن" — ہم ایک بچّے سے پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں "بدستِ شما چہ چیز است" ایرانی کہتا ہے "بدستت چہ داری۔ در دست چہ داری۔ بدستت چیست؟" ایرانی حکیم بیمار سے کہتا ہے۔ "دستت بمن بدہ، نبضت بیا"

ہم کہتے ہیں تیرا قلم کیا ہوا۔ "قلمِ تو چہ شد"۔ "قلمِ تو کجا رفت" اہلِ زبان کہتا ہے۔ "قلمت را چہ کردی؟ قلمت چہ شد؟" — "ایک خط کا لفافہ چاہیئے" تو ہم پوچھیں گے "نزدِ جناب لفافہ ہست۔ پیشِ شما لفافہ ہست؟" اہلِ زبان کہیگا۔ "لفافہ ہست؟ لفافہ دارید؟" — جواب میں ہم کہیں گے "نزدِ من نیست۔ نزدِ بندہ نیست۔ پیشِ بندہ نیست" ایرانی کہیگا — "ندارم، ندارم آغا۔ پیشِ من نیست آغا" — یہ تصویریں تمہارے پاس کہاں سے آئیں؟ ہم ترجمہ کریں گے — "این تصویرہا پیشِ شما از کجا آمدند" ایرانی کہیگا۔ "این تصویرہا از کجا یافتید" تمہیں ان میں سے کونسی چاہیئے؟ ہندی کہتا ہے۔ "شما را ازیں تصویرہا کدام تصویر درکار است" اہلِ زبان کہیگا — "شما کدامش می خواہید"

دکاندار سے تم نے ایک چاقو مانگا۔ اور پسند نہ آیا۔ تم کہتے ہو یہ میرے کام کا نہیں۔ ہم خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں پھر بھی مطلب ادا نہیں ہوتا۔ صاحبِ زبان کہہ دیتا ہے۔ "بکارم نمیخورد" —!

ایک شخص کے سامنے دوا کا پیالہ دھرا ہے۔ کہتا ہے کیا کروں نہیں پیا جاتا۔ ہم کہتے ہیں "چہ کنم نوشیدہ نمی شود" — اہلِ زبان دو لفظوں میں فیصلہ کر دیتا ہے۔ "چہ کنم کہ نمی توانم"

ایک لڑکا فارسی زبان کا شوقین کوٹھے پر جانے لگا۔ کسی نے پوچھا۔ "کجا میروید آغا؟" اس نے کہا۔ "برائے گزاشتن کتاب بالا میروم" لفظی ترجمہ تو درست ہے۔ اوپر کتاب رکھنے جاتا ہوں! محاورہ سے واقف ہوتا تو کہتا۔ "میروم کتاب بالا بگزارم" — ایک غریب نواب صاحب کے ہاں گیا۔ دربان نے جانے نہ دیا فارسی میں کہتا ہے۔ "خانہ نواب صاحب رفتہ بودم دربان رفتن نہ داد" اہلِ زبان کہتا ہے۔ "خانہ نواب رفتہ بودم دربان نگزاشت کہ درون روم" — "جانے دو" ہندی کہتا ہے

ؔ اب ایران میں لفافہ کو پاکٹ کہتے ہیں —!

رستن بدہ!" اہلِ زبان کہتا ہے "بگزار کہ میرود" ــ نہ جانے دینا ــ "نگزار کہ میرود!"

کسی بہادر کی تعریف کے موقع پر ہندی کہتے ہیں "وہ بڑا بہادر ہے۔ جب شیر مارا ہے تلوار ہی سے مارا ہے" یہ لوگ کہتے ہیں
"دلبیار بہادر ست، وقتیکہ شیر را زدہ است۔ بہ شمشیر زدہ است" اہلِ زبان ہرگز اس طرح نہ کہیگا۔ وہ کہیگا "خیلے دلاور
است، شیر را گاہے نکشتہ مگر بہ شمشیر" ــ

"اس کا تیر نشانہ پر لگا۔ کسی کی دعا لگ گئی۔ میرے کئی برس اس کام میں لگے۔ اور اس کے پاؤں میں چوٹ لگ گئی" جو
لوگ محاورہ سے ناواقف ہیں کہہ دیتے ہیں "تیر بہ نشانہ چسپید۔ دعائے کسے چسپیدہ است ۔ چندیں سال بریں کار چسپ
ضرب بہ پایش چسپید" مگر زبان داں کہیگا "تیرش بہ ہدف رسید۔ یا تیرش بر ہدف نشست ۔ دعائے کسے اثر کرد ــ
دعائے فلانے زدہ است اورا ۔ چندیں سالم دریں کار گزشت یا سالہا دریں کار صرف کردم۔ سالہا صرف کارش
کردم۔ ضربِ سخت بپایش رسیدہ"!

ناواقفوں نے پینے کے لئے "نوشیدن" سنا ہوا ہے۔ اس لئے کہتے ہیں "بسم اللہ حقہ نوشید" اہلِ زبان کہتا
ہے "قلیان بکشید یا میل بفرمائید" ــ!

ایک جلسہ میں یہ مثل ترجمہ کے لئے پیش ہوئی "شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں" یاروں نے انواع و اقسام سے
آپس میں طبع آزمائیاں کیں "شیر و گوسفند در کنارے آب می نوشند۔ شیر و گوسفند بریک چشمہ از آب سیری شوند ــ
شیر و بز بر ساحلے آب می نوشند ۔ اور ۔ بیک جا آب می آشامند ــ اصل وہی ہے کہ شیر و بز بیکجا آب می خورد!

اہلِ ہند نے کتاب میں پڑھا ہے کہ "نہادن" رکھنا ۔ چنانچہ جب کہنا چاہتے ہیں کہ "گلاب کا شیشہ طاق میں رکھ دو
میری کتاب طاق پر رکھ دو" تو فارسی میں کہتے ہیں کہ "شیشۂ گلاب در طاق بنہید اور عمامہ بسر بنہید" کوئی زیادہ
فصاحت خرچ کرتا ہے تو کہتا ہے "کتاب من بر طاق گزارید یا کتاب بندہ بہ طاق گزارید" واقف زبان کہیگا "شیشۂ
بر طاق بگزارید۔ کتابم بر طاق بگزارید۔ عمامہ بر سر بگزارید"

ہم کہتے ہیں ــ نان از مربائے سیب خوردم۔
اہلِ زبان کہیگا ــ نان بہ مربائے سیب خوردم۔
ہم کہتے ہیں ــ ایں عبارت را از روشنائی بنویسید و ایں را از شنگرف۔
اہلِ زبان کہیگا ــ ایں عبارت را بہ مرکب بنویسید و ایں را بہ شنگرف۔
خوشدامن یہاں ساس کو کہتے ہیں۔ وہاں "مادرزن" یا "خشو" کہتے ہیں۔

(سخندانِ پارس ــ محمد حسین آزاد)

م نسیم

سراب اور سحاب

"اے عبدل یہاں آؤ ذرا۔"

ہوٹل کے مالک نے منحنی سی آواز میں عبدل کو پکارا۔

عبدل گردن اُوپر اور ہاتھ پشت کی جانب کئے دیوار پر ٹنگا ہوا ایک طغرا پڑھ رہا تھا۔ بڑے خوبصورت الفاظ میں عربی متن اور اس کے نیچے ترجمہ لکھا تھا۔

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک وہ سارے گناہ بخش دے گا۔ بلاشبہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

یہ طغرا ہوٹل کے مالک نے غالباً بخشش کی گارنٹی کے طور پر آویزاں کر رکھا تھا تاکہ سند رہے اور کام بھی آسکے۔ متن اور ترجمہ وہ بہت دیر کا پڑھ چکا تھا۔ اب ان الفاظ پر اس کی آنکھیں جمی تھیں۔ اور خیالات دُور — بہت دُور نکل گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا — پر ابھی وہ سوچنے ہی والا تھا کہ اس کے کان پکار پر کھڑے ہو گئے۔ اس نے مڑ کر مالک کی طرف دیکھا اور کاؤنٹر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا!

"دیکھو اس سامنے والے لڑکے سے جھاڑن لو اور اس میز کو آکر صاف کرو۔"

اس نے اس حکم پر پھر آہستہ سے گردن موڑ کر اس سندھی لڑکے کی طرف دیکھا۔ جو بڑے مزے میں جھاڑن کندھے پر ڈالے خالی پلیٹیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ رہا تھا۔ اسی آہستگی کے انداز میں اس لڑکے کی پشت پر اس نے جھاڑن اس کے کندھے سے اُتار لی۔ چونک کر وہ سندھی لڑکا مڑا اور جھاڑن کو پھر اس کے ہاتھ سے کھینچتے ہوئے بولا "کیا ہے ڑے پناہ گیر ڑے؟" اس نے جھاڑن ہاتھ سے چھوڑی نہیں۔ بلکہ مڑ کر مالک کی طرف یوں دیکھا کہ خود دیکھ لو!

"ارے چھوڑ دے۔ تو دوسری لے لے۔ تم یہ لے آؤ عبدل۔ چلو کوئی بات نہیں۔"

مالک نے اس کی آنکھوں میں مظلومیت کی جھلک دیکھ کر پچکارا۔ عبدل اسی طرح میز کے پاس پہنچا۔ جھاڑن میل سے سیاہ ہونے کے علاوہ گیلی میزیں پونچھنے کے سبب چپچپی ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سی نفرت اور کراہت کا احساس۔ شدید احساس اس کے دل میں جاگ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ جھاڑن بڑے زور سے کس کے منہ پر دے مارے۔ کس کے منہ پر۔ یہ نہیں معلوم۔

"چھوڑو جی۔ اس طرح کے گندے کاموں سے تو بیکاری اچھی۔"

وہ شاید دل کے اس مشورے پر عمل کر ڈالتا کہ مالک نے اس کا تامل دیکھ کر ذرا سخت لہجہ میں کہا:۔

"کھڑے مت رہو بھئی۔ کام کرو۔ کام — پھرتی سے۔"

وہ چونک کر جھاڑن کو موڑ کر گدی سی بنانے لگا۔ پھر اس نے بڑی نفاست سے میز صاف کی اور جھاڑن اُٹھا کر وہ مڑنے ہی والا تھا کہ ایک قریبی کرسی پر اسے آدریخ کی کچھ زرد زرد چھینٹیں اور بیڑی کی راکھ نظر آئی۔ وہ جھاڑن لے کر بڑھا کہ اسے بھی صاف کر دے۔ لیکن پھر گیلی جھاڑن کو دیکھ کر رُک گیا۔ اس جھاڑن سے تو کرسی بھی چپکنے لگے گی۔ ذرا ہی کچھ فیصلہ کر کے اس نے اپنی آستین میں اُڑسا

ہوا ایک رومال نکالا اور پہلے پھونک مار کر بیڑی کا گل اڑا دیا ۔ پھر رومال سے جھٹک کر کرسی کی چھینٹیں خشک کر دیں ۔ جب رومال کو آستین میں رکھتے ہوئے وہ واپس مڑا تو مالک سے اس کی آنکھیں چار ہو گئیں ۔ جو کافی دیر سے اسے ہی دیکھ رہا تھا ۔ معلوم نہیں کیوں اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور مالک کاؤنٹر کے سنگ مرمر پر ایک انگلی بجا کے دیکھنے لگا ۔

آج اس کا پہلا دن تھا ۔

یہ نوکری اسے کل ملی تھی ۔ جب شام کو اس ہوٹل میں چائے پی کر وہ کاؤنٹر کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ پیسے دیتے ہوئے اس نے بڑی جھجک سے پوچھا " دیکھئے ۔ کیا آپ نوکر رکھیں گے ۔ مجھ کو " یہ کہتے ہوئے اس کی انگلی اپنے سینہ پر ٹک گئی ۔ ہوٹل کا مالک اس کے مخاطب کرنے کے طرز پر کچھ چونک کر اسے سر اٹھا کر دیکھنے لگا ۔ ہوٹل میں جو بیرے تھے وہ سب راجپوت ، ٹھاکروں اور جاٹوں سے ملتے جلتے تھے ۔ ان کی کرخت بولی اور اکھڑ لہجہ اسے پسند نہیں تھا اس لئے اسے ایسے ایک لڑکے کو جو قرینے سے کپڑے پہنے ہوئے اس سے مہذب انداز میں نوکری کے لئے پوچھ رہا تھا ۔ نوکر رکھ لینے میں کوئی تامل نہ تھا ۔ چاہے کسی سندھی لڑکے کو الگ ہی کرنا پڑے ۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے اس کا جائزہ لینے کے بعد اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا ۔ پھر اس کا حال معلوم کیا ۔ لڑکے نے بتایا کہ ۔۔

" وہ پانی پت کا رہنے والا ہے ۔ عبد العزیز نام ہے ۔ وہاں وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا ۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور وہ چھوٹی بہن اور ماں کے ساتھ رہتا تھا ۔ فسادات کی ابتداء ہی میں وہ پاکستان چلے آئے ۔ اس کی ماں کڑھائی کا کام اچھا جانتی تھی ۔ اور لاہور کے والٹن کیمپ میں وہ شہر سے ماں کے لئے کڑھائی لے آتا جس کی مزدوری سے گزر ہو جاتی تھی ۔ لیکن گھر چھٹنے کے صدمے اور کمزوری نے اس کی ماں کی نظر کو کام کے قابل نہ رہنے دیا ۔ لاہور سے اپنے باپ کے ایک دوست کی تلاش میں وہ کچھ دن ملتان ٹھہرتا ہوا کراچی پہنچا تھا ۔ اور اب اسے نوکری کی تلاش میں پھرنا پڑ رہا تھا ۔ دفتر کے لئے نہ اس کی عمر تھی اور نہ تعلیم ۔ مگر ابھی تک کہیں دوسری جگہ بھی اسے نوکری نہ مل سکی تھی "

یہ سب سنتے ہوئے مالک نے اپنے فوری فیصلے میں تھوڑی ترمیم کی اور اسے ذرا روکھے لہجہ میں بتایا کہ وہ کل صبح آئے تب اسے بتایا جائے گا کہ نوکری ملے گی یا نہیں ۔

عبد العزیز کو اس کے آخری لہجہ سے پھر اپنی امید ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ لیکن کل آنے کا یقین دلا کر وہ چلا آیا ۔ بازاروں میں پھرتے ہوئے اسے وہ گرد اڑاتی سڑک یاد آ گئی ۔ جس پر ملتان میں اسکول جانے کا راستہ اس کے لئے بن گیا تھا ۔ اس دھول میں کتنی اپنائیت تھی اور اس صفائی میں کتنی بیگانگی ۔ اسے اس سڑک پر چلتے ہوئے ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے وہ بے ٹکٹ ریل میں سفر کر رہا ہو ۔ کسی لمحہ بھی کوئی آکر اسے اس سڑک پر سے ہٹا دے گا ۔ اور اس کے قدم بے اختیار سڑک سے ہٹ گئے ۔ فٹ پاتھ سے بھی پرے چلے گئے اور وہ کنکریلی زمین پر آ گیا ۔ یہاں سے حکومت کے دفتر شروع ہو جاتے تھے ۔ سڑک سے ہٹ کر مسلسل بارکوں کی قطاریں تھیں اور ہر ایک بارک ایک محکمہ کا دفتر ۔ بارکوں کی اوٹ سے اسمبلی کی عمارت جھانک رہی تھی ۔

چلتے چلتے دفتر ختم ہو گئے ۔ اسمبلی چھپ گئی اور کنکریلی زمین بھی ختم ہو گئی ۔ چوراہا آ گیا اور وہ پھر بھیڑ میں گم ہو گیا ۔

رات گئے تک وہ یونہی گھومتا رہا ۔ ایک ریسٹوران کے سامنے سے گزرتے ہوئے کھانے کی مہک نے اس کی بھوک چمکا دی ۔ بھوک سے اسے کھانا یاد آیا اور کھانے سے گھر ۔ وہ گھر کی طرف مڑ گیا ۔

یہ گھر اس کا اپنا بنایا ہوا تھا ۔ اس کا اپنا تھا ۔ ٹاٹ اور گھر کی موٹی چادروں کو سی کر اس کی ماں نے دیواروں کا سامان کر دیا تھا ۔ اور اپنے ایک پڑوسی مہاجر کے مشورے سے وہ ٹین کی چار چادریں آبادکاری کے محکمہ میں سے کئی دن کی دوڑ دھوپ کے بعد لے آیا تھا ۔ یہ پہلی امداد تھی جو اس نے حکومت سے لی تھی ۔ اور حکومتیں اپنے آپ کو امداد دینے سے اس وقت تک معذور سمجھتی ہیں جب تک کہ ہاتھ پھیلیں نہیں ۔

...بانیں گڑگڑائیں نہیں۔ اور شاید وہ کافی عاجزی اور نیاز مندی سے گڑگڑایا نہیں تھا۔ اسی لئے اس کے مکان کی چھت پوری ڈھکی نہیں تھی۔
...یار چادروں نے بمشکل آدھی چھت ڈھکی تھی۔ اس سے زیادہ امداد اُسے نہیں ملی تھی۔ بجبوراً یہ چاروں چادریں ہی بانسوں کے سہارے دامن
...پھیلائے اپنے مکینوں پر سایہ کئے ہوئے تھیں۔ یا شاید اس کے بدلے اور امداد مانگ رہی تھیں!

اس کی ماں اور چھوٹی بہن کھانا کھا کر سو چکی تھیں۔ اس نے رفتہ رفتہ ماں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کھانے کے لئے بس کا انتظار نہ
...کیا کریں۔ نہ معلوم وہ کب تک لوٹا کرے۔

وہ گھر میں داخل ہوا۔ آہستہ سے جوتے اُتارے اور دبے پاؤں باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ یہ باورچی خانہ جو صرف چولہے پر مشتمل تھا گھر کے
...یک کونے میں فرض کر لیا گیا تھا۔ برتن جو کچھ بھی تھے وہ ہر شام صندوق میں بند کر دیئے جاتے تھے جو سونے کی جگہ کے سرہانے رکھا ہوا تھا۔ اب
...ثاثہ بس یہی صندوق رہ گیا تھا۔ دبے پاؤں کھانے کی طرف بڑھتے ہوئے اسے بے اختیار اپنے اُوپر چور ہونے کا شبہ ہوا۔ اس نے سوچا
...طرح تو کوئی بھی چپکے سے گھر میں گھس کر جو جی چاہے اٹھا لے جا سکتا ہے۔ جلدی سے اس نے مڑ کر صندوق کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ رکھا تھا۔
...پنی اس عجیب سوچ پر وہ مسکرا دیا۔

مٹی کی پیالی میں دال۔ دو موٹی روٹیوں سے ڈھکی چولہے پر رکھی تھی۔ چولہے میں سے گرم راکھ کی ہلکی سی بھاپ آ رہی تھی۔ روٹیوں پر کتری ہوئی پیاز
...رکھی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے اسے اس سینک میں لطف آنے لگا۔ یہ آنچ بالکل ماں تھی۔ ابدی اور دائمی۔ یہ چولھا ماں تھا۔ جو محبت کی سوندھی خوشبو
...سے بسی ہوئی دال اس کے لئے گرم رکھتا تھا اور خود خالی تھا۔ بھوکی ماں کے معدے کی طرح!

کھانا کھا کر وہ ذرا گھومنے باہر نکل گیا۔ یہ اس کی روز کی عادت تھی۔ مگر تھوڑی ہی دور جا کر اُسے یاد آیا کہ کل صبح تو وہ ہوٹل کے مالک سے
...ملنے کا وعدہ کر کے آیا ہے۔ اگر دیر میں سونے کی وجہ سے صبح وہ دیر سے اٹھا تو ـــــ یہ سوچ کر وہ لوٹ آیا اور ماں کے برابر ہی دوسری طرف
...لیٹ گیا۔ اس طرف اس کی بہن سوتی ہوئی تھی۔

بہن کو سوتا دیکھ کر اس کے خیالات بہت دُور چلے گئے۔ "اگر میری کوئی بڑی بہن ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا! ـــ کتنا اچھا ہوتا؟ کیا یہ
...اچھا نہیں کہ میری ایک چھوٹی بہن ہے؟ انسان درحقیقت کتنا چھوٹا ہے۔ اپنے سے بڑے کو پا کر چھوٹے کی تمنا کرتا ہے۔ اور چھوٹے کے مل جانے پر
...بڑے کو مانگتا ہے۔ کبھی چھوٹا بھائی بن کر اور کبھی بڑا آدمی ہو کر ـــــ یہ چھوٹائی نہیں ناشکری ہے۔ ناشکری بھی نہیں، شاید کمینگی
...ہے!" تھوڑی دیر بعد وہ سو گیا۔

دوسرے دن اسے ہوٹل میں نوکری مل گئی اور آج اس کا پہلا دن تھا۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ اور مہینہ ختم ہو گیا۔ مالک تنخواہ دینے میں بڑا پابند تھا (جیسا کہ کام لینے میں) وہ مہینے کے خاتمہ
...تک تین ہفتوں سے کچھ دن زیادہ کام کر چکا تھا۔ مالک نے باقی دنوں کے پیسے گھٹا کر اسے تنخواہ دے دی۔ چھوٹی سی رقم کو لا کر جب اس نے
...ماں کو دی تو اسے ایسا لگا جیسے عمر کی کئی منزلیں پھاند کر وہ ایک دم بہت بڑا ہو گیا ہے۔ اب وہ بھی جوان ہو گیا ہے۔ اس پر بھی چند دن بعد
...سے خمیدہ۔ ان فکر مند لوگوں کی نظریں پڑنے لگیں گی جو اپنی ایک لڑکی کا بوجھ اسے سونپ کر دوسری لڑکی کی فکر میں مبتلا ہونا چاہتے
...ہوں گے۔ اس کی چھوٹی بہن بھی تو ایک ایسی ہی لڑکی ہے۔ اس نے ماں کی آنکھوں میں اس فکر کو دھند کی طرح چھاتے دیکھا۔ اور وہ سوچنے لگا۔
...اگر یہ کسی کو سونپ دی گئی تو پھر ماں کی فکر باقی نہیں رہے گی۔ کسی اور چھوٹی بہن کی باری نہیں آئے گی۔ یہ سوچ کر وہ اور بھی تندہی سے کام
...کرنے لگا!

اس طرح جیسے جیسے کام کی عادت پڑتی گئی۔ اسے بیروں میں نمایاں حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ وہ گو بہت پھرتی سے کام نہیں کرتا تھا۔

پھر بھی اس کا کام مالک کے لئے دوسروں سے زیادہ تسلی بخش تھا۔ اس کی مسکراہٹ کے ساتھ گاہکوں کو خوش آمدید پھر مہذبانہ انداز سے آرڈر لینا اور اس کی تکمیل۔ اور اس پر اس کی نفاست۔ یہ سب چیزیں اکثر عمدہ اور خوش پوش آنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ دوسرے بیرے اس سے جلنے لگے تھے۔ اور اس کا اظہار کبھی کبھی کسی کام میں ان کے رویہ سے ہو جاتا۔ مگر کسی کا کوئی بس نہیں چلتا تھا۔

لیکن کچھ دنوں بعد اس کی مستعدی میں فرق آنے لگا۔ وہ اب اکثر وقت کھڑا ہوا طغرے پڑھا کرتا۔ وہ طغرے جن کو پڑھ کر اس کی نگاہیں تو طغرے ہی پر رہتیں لیکن خیالات بہت دور نکل جاتے۔ وہ سوچنے لگتا ــــــ لیکن وہ کیا سوچنے لگتا۔ یہ تو خود اسے نہیں معلوم تھا۔ بس ایسا لگتا کہ جیسے مکڑی کے لا انتہا جالے اس کے دماغ کے اوپر اور تہوں میں بنتے چلے جاتے اور اس کی سوچ اس میں پھنستی جاتی۔ اگر کوئی جاننے والا اس کے خیالات کا تجزیہ کرتا تو اس کی اتفاقی کاہلی کا سبب ایک عجیب ذہنی کشمکش نکلتی جس میں کچھ قنوطیت تھی اور کچھ امید کی شکستگی۔ اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ تاثر اس کے ذہن پر اردگرد کی بلند عمارتوں، جو ہوٹل کے چاروں طرف چھائی ہوئی تھیں اور ان کے پُرشوکت مکینوں کے متعلق سوچتے رہنے سے پیدا ہوا تھا۔ پہلے اس جذبہ نے رشک کی صورت اختیار کی۔ اس کا دل چاہا کہ کسی طرح وہ ویسی ہی بلڈنگوں کے ایک مکین کی حیثیت اختیار کرلے۔ مگر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ محنت کے پسینہ کی آخری بوند نچوڑنے اور مشقت کے گرد و غبار سے جسم کا بال بال اَٹ جانے پر بھی اس کا حصول ممکن نہیں۔ یہ لوگ اپنے اونچے مقاموں کے لئے ان چیزوں کے مرہون منت نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اسے اپنی محنت کا پھل پایا ہوا نظر نہیں آیا۔ سب اتفاقی اونچے تھے۔ کسی کو الاٹمنٹ نے کامیاب بنایا تھا۔ کسی کو ماحول کی اچانک سازگاری نے اور کوئی دوسروں کی ناحق چھینی ہوئی دولت کے بل پر اتنا اونچا تھا۔

اس جذبۂ رشک نے آخر اپنے لئے راہ نہ پا کر حسد کے لئے جگہ خالی کردی۔ لیکن یہ بھی کچھ دنوں میں اپنے اثرات چھوڑ کر مایوسی میں تبدیل ہو گیا۔ جس کی شکل یہ قنوطیت اور بیزاری تھی جو کاہلی اور بے پروائی کی شکل میں اب اس کے کاموں سے ظاہر ہونے لگی تھی!

یہ سب تبدیلیاں چپکے سے آ کر ہوتی رہیں اور اس کے چھوڑے ہوئے اثرات اپنے اندر لئے ہوئے بھی۔ وہ ان کی کیفیت سے بے خبر تھا۔ اور اسے اب خود حیرانی تھی کہ آخر اس کاہلی کا سبب کیا ہے؟

پھر کئی اور باتیں بھی اس کے ساتھ ہی اس میں پیدا ہو رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے ہوٹل کے ہر شخص کو ان کا علم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہوٹل میں آمدنی بڑھانے کے لئے ریڈیو کے ساتھ اب لاؤڈ اسپیکر بھی فٹ کر دیا گیا تھا۔ بیرے اسے خوب اونچی آواز میں کھلا رکھتے۔ کیونکہ مقابل کے پرانے ہوٹل کا ریڈیو اپنی گلے بازی دکھاتا اور اس کے مقابلے کے لئے وہ اپنے ریڈیو کی رگ حمیت کو چھیڑ دیتے۔ ریڈیو کا وقت ختم ہونے پر گراموفون کے ریکارڈ شروع کر دیئے جاتے۔ خصوصاً ایک خاص ریکارڈ جسے بیرے شاید بہت پسند کرتے تھے۔ دن اور رات کے اکثر حصوں میں بڑی جگر سوزی اور ہمدردی کے ساتھ متنبہ کرتا۔

"رین گئی، اب ہوا سویرا"

شاید یہ سامنے والے ہوٹل پر چوٹ تھی جو اس ہوٹل کے چلنے کے بعد سے اپنی وہ پہلی سی شان قائم نہ رکھ سکا تھا۔ اس ریکارڈ کے ذریعہ بیرے اسے نصیحت کیا کرتے کہ اب تمہارا زمانہ ختم ہوا۔ ہماری صبح کے آگے تمہارے رات کے دیئے اب ٹمٹما رہے ہیں۔ مگر مقابل کا ریڈیو اتنا مایوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بار بار اپنا پسندیدہ گانا گا کر دل کو تسلی دیتا۔

"ابھی تو میں جوان ہوں!"

اس مقابلہ میں دونوں ریڈیو اور گراموفون صبح بازار کھلنے سے لے کر رات کے آدھے گزر جانے تک چیختے رہتے چلاتے رہتے۔ ہوٹل کے بیرے اب عبدل کی اس عادت کو خوب بھانپ گئے تھے۔ کہ جب بھی ریڈیو یا گراموفون میں ان کا پسندیدہ ریکارڈ خوب زور سے

بج رہا ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طرح آگ سے بہت ہی دھیما کر دیتا۔ بعض اوقات اسے اس کے لئے گاہکوں سے بے زاری برتنی پڑتی۔ کئی مرتبہ وہ کچھ چھوٹا موٹا نقصان بھی کر بیٹھتا۔ لیکن یہ جیسے اس کے ذمہ فرض کر دیا تھا کہ ریڈیو کو اس طرح خود اپنی شان میں گانے نہ دے۔ اسے اس آواز میں ایک مغرور قہقہہ گونجتا معلوم ہوتا۔ یہ عمدہ سا ہوٹل اسی طرح سامنے والے ہوٹل پر پھبتیاں کس رہا تھا۔ یہ اس گھٹیا قسم کے ریسٹوران پر اپنی برتری کا سکہ ہی نہیں جما رہا تھا۔ یہ اونچا پن نیچائی کا منہ چڑا رہا تھا۔ یہ امارت غربت پر ہنس رہی تھی۔ یہ آج کے انسان کی کمینگی کا کھلا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا۔۔۔ انسان کی کمینگی! جو چھوٹا بن کر بڑا بننا چاہتی ہے۔ اونچا بن کر نیچے ہونے کی تمنا کرنے لگتی ہے یا پھر اونچی ہو کر نیچوں سے بھاگتی ہے۔ نیچائی ہی سے ناک پر معطر رومال رکھے گزر جاتی ہے۔ مگر ناک بھوں چڑھانے کے سوا کچھ نہیں کرتی۔ کبھی اس لئے چیختی ہے کہ یہ سب کیوں۔ اور کبھی اس لئے یہ سب کیوں نہیں۔۔۔ مگر ناشکرا پن نہیں چھوڑتی! اپنی اصلیت پر قانع نہیں ہوتی۔۔۔!!

دماغ میں جالوں کے تانے بانے کبھی کستے، کبھی ڈھیلے ہو جاتے اور کبھی کسی بگولے سے تتر بتر ہو جاتے اور ریڈیو کو ہلکا کرتے ہی پُرسکون سا ہو جاتا۔۔۔!!

یہ حالت مستقل ہو گئی تو پھر ایک نئی عادت نے جنم لیا۔ ریڈیو پر خبروں کے وقت عموماً کچھ کام نہ ہوتا۔ کیونکہ لوگ خبریں سننے میں محو ہو جاتے۔ کچھ دیر کو خیالات بھٹکنے سے رک جاتے اور وہ بھی خبریں سننے لگتا۔ پھر اسے ان خبروں میں کچھ اور سننے کو جی چاہنے لگا۔ یہ کچھ اور کیا تھا۔ یہ شاید اس کی اپنی مبہم تمنائیں تھیں۔ وہ خبروں میں ان تمناؤں کے متعلق سننا چاہتا تھا۔ تاکہ بدگمانی کے اس نئے جھگڑے کا مقابلہ کر سکے۔ جو اس کے دماغ کی دنیا میں اٹھتا جا رہا تھا۔ اسے کانوں میں سیٹیاں سی بجتی معلوم ہونے لگتیں۔ پھر ہر ایک سیٹی ایک چیخ بن جاتی۔۔

"یہ سب یونہی رہے گا۔ یہ یونہی رہے گا۔ کچھ نہ بدلے گا"

ان چیخوں کو روکنے کے لئے وہ ہر خبر کو ٹٹولتا کہ شاید کسی بات سے اس کے کانوں کو سکون مل جائے۔ اس کے دماغ سے جالوں کے پھندے ٹوٹ جائیں۔ ایک دم کوئی ایسی بات سنائی دے۔

"آج عجیب تبدیلی ہو گئی۔ چند اونچوں کو نیچا کر دیا گیا۔ کہ انھیں اونچا رہنے کا حق نہیں تھا۔ اور چند نیچے اپنا حق پا کر اونچے ہو گئے"

پھر ایک اور ایسی ہی ایک خبر۔ پھر ایک اور۔ پھر اور۔ پھر اور۔ یہاں تک کہ سامنے والے ریڈیو کا نوحہ اچانک خوشی کی چیخوں میں بدل جائے۔ اور شکوے کے بجائے اس میں سے شکر ابل پڑے۔ پھر ہر جگہ سے آواز آنے لگے۔

"رین گئی۔ اب بھا سویرا"!

لیکن ایک دن بھی ریڈیو سے ایسی تبدیلی کی آواز نہیں آئی۔ ایک بار بھی اس نے نہیں بتایا کہ کسی نیچے کی بیکسی کا آج مداوا ہو گیا۔ ایک دفعہ بھی اس نے کسی اونچے کے قصوروار ہونے کا اقرار نہیں کیا۔ بلکہ وہ چیختا۔۔۔

"آج ایک اسپیشل ٹرین اور مہاجروں کو لے آئی۔ ایک اور سیلون کار والی اسپیشل الیکشن کی آگ دہکانے چند اونچوں کو لاد کر چلی گئی۔ کل شام کی عصر کی دعوت میں آبادکاری کے ایک نئے منصوبے کا ذکر کیا گیا۔ اور کل رات الیکشن کو کامیاب کرنے کے لئے چند اونچوں کو ہوٹل میٹروپول میں اور ڈنر دیا گیا"!

ان ہیچ سالہ منصوبوں میں اسے اپنی ٹین کی چارپائیاں نظر آتیں۔ جو دامن پھیلائے ان اسکیموں کا ماتم کر رہی ہوتیں۔ اسے میٹروپول کے ڈنر کی داستان سے مٹی کی پیالی میں دو روٹیوں سے ڈھکی ہوئی وہ دال یاد آ جاتی جو چولھے کی گرم بھوبل پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔

دیکھتے دیکھتے وہ پیالی پھیلتی — بڑی ہو جاتی — اور بڑی — اور بڑی — یہاں تک کہ ایک بے انتہا وسیع حوض بن جاتی۔ پھر چولھے کی آگ بھڑک اٹھتی۔ سامنے شعلہ جو الاؤ بن جاتی اور حوض میں سب کچھ کھولنے لگتا۔ میٹروپول کی بتیاں اس میں ناچتیں۔ چھریاں کھلکھلا کر لفری آوازیں پیدا کرتیں۔ اور کانٹے انسانی سروں کو چھیدتے ہوئے مستعد تیروں کی طرح تیزی سے ادھر ادھر دوڑتے اور پھر —؟

اس کا ذہن اکتاہٹ سی محسوس کرنے لگتا۔ سوچنے سے اسے وحشت سی ہونے لگتی۔ اور اکثر اسی وقت ریڈیو میں خبروں کے خاتمہ پر موسم کا حال بتایا جا رہا ہوتا۔ وہ جھٹ ریڈیو کا سوئچ گھما کر کوئی اور اسٹیشن لگانے لگتا۔ اسے سب سے زیادہ چڑ اس موسم کی پیشن گوئی سے تھی۔ کل کا حال کسے معلوم ہے۔ یونہی بکے جاتا ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں موسم ایسا رہیگا۔ اور یوں ہوگا۔ کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہ دلیل اس کے دل نے اسے مطمئن کرنے کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ اگر یہاں بھی کوئی جاننے والا اس کے خیالوں کو ٹوٹتا۔ تو یہ ریڈیو سے چڑ کسی اور بات کا نتیجہ نظر آتی۔ اس کے دل میں یہ خیال پیوست ہو چکا تھا کہ آئندہ کوئی تبدیلی یہاں نہ ہو سکے گی۔ جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ بھی ہونا ہے وہ بس ایسے ہی ہوتا رہے گا۔ یہ اوپر نیچے، اونچے ہی رہیں گے اور نچائی کے مسکین کبھی اوپر کی طرف نہ بڑھ سکیں گے۔ پھر یہ آئندہ کی امید کیسی؟ آئندہ کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ سب جھوٹی باتیں ہیں۔ دل کو بہلاوا دینے کو۔

لاشعور کے ان خیالات میں تاروں کی طرح جتنا کساؤ آتا گیا۔ اس کے ذہن میں واقعات کی مضراب سے اتنے ہی زور سے جھنجھناہٹ پیدا ہونے لگی۔ پھر یہ جھنجھناہٹ اتنی تیز ہوئی کہ اسے ذہن ماؤف محسوس ہونے لگا۔ اور جب کسر اتنی رہ گئی ایک اور کساؤ! اور بس۔ ذہنی توازن کا سارا کھیل ختم! — تو اسے ایک دن ایک عجیب حادثہ پیش آگیا!

اس دن ریڈیو کے پیچھے اوٹ میں جھکا ہوا وہ ایریل کا تار فٹ کر رہا تھا جو دیوار جھاڑتے ہوئے کسی بیرے سے بے دھیانی میں نکل پڑا تھا۔ کہ مالک کی آواز سن کر وہ جلدی سے گردن نکال کر دیکھنے لگا۔ اس طرح مالک اسی وقت آواز دیتا جب کوئی اچھا گاہک ریسٹوران میں داخل ہوتا تھا۔ "عبدو — ل۔ چلو!" وہ منحنی سی آواز میں کاؤنٹر پر سے پکارتا اور عبدل آنے والے گاہک کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

پر اس وقت اس نے گردن نکال کر جب آنے والے خوش پوش لوگوں کو دیکھا تو وہ بوکھلا گیا۔ ہاتھ کہنیوں تک الماری کی پشت سے لگ لگ کر خوب گرد آلود ہو گئے تھے۔ اور انگلیاں ایریل کے تار سے کالی ہو رہی تھیں۔ اس صورت میں تو وہ ایسے شریف گاہکوں کے سامنے بالکل نہ جائے گا۔ مالک کو کسی سے دام لینے میں مصروف دیکھ کر وہ جلدی سے اندرونی دروازہ سے باورچی خانہ کی طرف مڑ گیا۔
جب سے وہ ہوٹل میں نوکر ہوا تھا۔ یہاں آکر ہاتھ منہ دھونے کا یہ دوسرا یا تیسرا موقع تھا۔ چاروں طرف بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی پتیلیاں اور میلے برتنوں کو پھلانگتا۔ وہ نل کے پاس پہنچا اور پھرتی سے منہ ہاتھ دھو کر آستین میں سے رومال نکال، منہ پونچھتا ہوا وہ باہر میز کی طرف آیا۔ اب ان لوگوں پر اطمینان سے اس کی نظر پڑی۔

ان میں سے دو تو پہلے سے آنے والوں میں تھے۔ مگر تیسرا اجنبی تھا۔ پہلے دونوں کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے۔ لیکن گلے میں ٹائیاں نہ تھیں۔ اور دفاتر کے لوگوں کے روایتی لباس کی طرح دونوں کے کوٹ کسی اور کپڑے کے تھے اور پتلونیں کسی اور قسم کی۔ اجنبی ٹوئیڈ کے موٹے کپڑے کی بھوری شیروانی پہنے تھا جس کے اوپر کے دو تین بٹن کھلے تھے۔ اس کی آنکھوں پر بہت موٹے سیاہ فریم کی عینک لگی تھی۔ جس کے شیشوں کے اس پار سے اس کی مطمئن اور پرسکون آنکھیں ایسی نظر آتی تھیں جیسے جھیل کا ٹھہرا ہوا پانی۔ کالا فریم اس کی چھوٹی سی بھوری ڈاڑھی کے ساتھ کچھ میل نہیں کھا رہا تھا۔ تو بھی یہ جوڑ بدنما نہیں لگ رہا تھا۔

عبدل میز کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر تینوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ کیونکہ کچھ انتظار کے بعد وہ اپنی پہلی گفتگو کو جو غالباً وہ پہلے سے کر رہے تھے، پھر جاری کر چکے تھے۔ عبدل نے رومال کو پھر آستین میں سے نکالا۔ اور ہاتھوں کے بقیہ

گیلے حصے کو پونچھنا شروع کیا۔ اسے تجربے سے ان لوگوں کی ان باتوں کی حقیقت معلوم ہو چکی تھی جو بطور تفریح ہمیشہ ہی جاری رہتی تھی۔ مگر اس بار اس اجنبی کے ساتھ ان کی گفتگو اس نوعیت کی نہ تھی اور عبدل ہاتھ خشک کر کے بھی رومال کو واپس آستین میں رکھنے کے بجائے ان کی گفتگو سننے لگا۔ اجنبی کے انداز میں ایک عجیب یقین اور زور تھا۔ جس کے سبب باقی دونوں کا لہجہ قدرے مرعوب نہ ہو گیا تھا۔ اسے گفتگو اب دلچسپ معلوم ہونے لگی۔ اجنبی بول رہا تھا:۔

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ یہ سب ایک دن میں ہو جائے گا۔ آپ درحقیقت میری ایک بات کو باقی باتوں سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ اسی سبب سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے۔ تبدیلی تو بہرحال ہوتی ہی ہے۔ مگر ایک تبدیلی آن واحد میں سب کچھ ملیامیٹ کرنے سے پیدا ہو گی۔ جو بُری تبدیلی ہو گی اور دوسری حکمت اور تدبیر کے ساتھ آہستہ آہستہ۔۔۔ اپنی حدود کے اندر۔۔۔۔۔۔۔ یوں سمجھئے۔۔۔۔۔۔؟"

اور اجنبی ان کو اس حکمت والی تبدیلی کے طریقے اور اس کے آثار بتانے لگا۔ عبدل کو ایسا لگا کہ ریڈیو سے جن چیزوں کے اعلان کی پرانی آرزو اس کے دل میں دبی ہوئی تھی وہ بغیر فرمائش یہ اجنبی پوری کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اجنبی کی پُشت پر جا کر اپنا سر ٹکا دے۔ اور اس عجیب سی خوشی کی زیادتی کے باعث رو دے جو اچانک اس طرح پیدا ہو گئی تھی۔ مگر وہ صرف ایک اضطرابی حرکت کے ساتھ ابھی پہلو ہی بدل سکا تھا کہ ان میں سے ایک نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"ارے عبدل! کہاں تھے بھئی؟ اچھے تو ہو؟" تینوں نے مُڑ کر اُسے دیکھا۔

بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اجنبی کی طرف رُخ کر کے سلام کیا۔ اجنبی جو اسے نہ معلوم کیوں غور سے دیکھنے لگا تھا۔ سلام کا جواب دے کر۔ پھر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ عبدل کو کچھ بے چینی سی ہوئی۔ مگر اسے یاد آ گیا کہ ان میں سے ایک نے اس کی مزاج پرسی کی ہے۔ فوراً اس نے رُخ بدل کر کہا:۔

"جی ہاں۔ آپ کی عنایت ہے" پھر قدرے توقف کے بعد کہا۔ "فرمائیے۔"

"ہاں بھئی چائے لے آؤ۔ ایک ٹرے تین کے لئے"!

عبدل فوراً مستعدی کے ساتھ چائے لینے کے لئے چلا گیا۔

چائے لا کر اُس نے بڑی آہستگی کے ساتھ اُن کے سامنے رکھ دی۔ مُڑتے ہوئے پھر اُس نے اجنبی کو دیکھا اور اسے اپنی طرف ہی دیکھتے پا کر پھر پہلے جیسی بے چینی محسوس کی۔ وہ قدرے دُور جب کر اس طرح در سے لگ کر کھڑا ہو گیا کہ ان لوگوں کی طرف بھی توجہ نہ معلوم ہو اور ان کی باتیں بھی سُن سکے۔ اسے اس اجنبی کی آنکھوں میں نہ معلوم کیا معلوم ہوتا تھا۔ جو نہ خوف تھا نہ تجسس۔ بلکہ ایک عجیب طرح کی سوالیہ نظریں تھیں جو اس سے وہ سب کچھ پُوچھ رہی تھیں جو وہ بتانا چاہتا تھا۔ اس کا دل اُس اجنبی کی طرف کھنچ رہا تھا۔ جہاں وہ ساری باتیں نہ تھیں جن سے وہ اب تک چڑ رہا تھا۔ اور وہ ساری چیزیں تھیں جن کے ہو جانے کا وہ خواہش مند تھا۔

"ارے میاں عبدل! آؤ بھئی!"

وہ چونک کر ان کی طرف مڑا۔ اور اس بار بھی اجنبی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ جلدی سے نیچی نظر کر کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔ اجنبی نے شاید اس کی کیفیت ہی دیکھ کر اپنا مُنہ ایک طرف پھیر لیا۔ ٹرے میں چائے کا سامان جوڑنے کے لئے وہ جُھکا تو ایک نے کہا:۔

"میاں دیکھو۔ ایک گلاس پانی لاؤ" ذرا تامل کے بعد کہا۔ "اور ہاں۔ بل بھی لے آؤ"

وہ یونہی مُڑ کر واپس چلا گیا۔ مگر جاتے جاتے اس کے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے اجنبی باقی دونوں سے اس کے متعلق کوئی

سوال کر رہا ہو۔ اس کا جی ٹھہرنے کو بہت چاہا۔ مگر اب ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ دیکھ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ لمحہ بھر میں وہ گلاس چھوٹی ٹرے میں رکھے کاؤنٹر پر کھڑا بل بنوا رہا تھا۔ یہ لوگ اپنا بل خود آکر ادا کرتے تھے ان میں سے ذرا ایک دوسرے کے بعد جب ادائیگی کر چکے تب اس کا بل بن سکا۔ مالک کے ہاتھ سے بل کو قریباً جھپٹتے ہوئے وہ تیزی سے اُن تینوں کی طرف گیا۔ مگر اس نے دیکھا کہ اجنبی اپنے سوال کا جواب سُن کر اور شاید اس پر اپنی رائے بھی دے کر اب چُپ ہو گیا ہے اور بقیہ دونوں میں سے ایک بول رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے قدم سُست پڑ گئے۔ اسے اجنبی کی رائے ہی سننے کا تو اتنا اشتیاق تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کر اس نے چائے کا پھیلا ہوا سامان ہٹایا اور اسے برابر کی دوسری میز پر جمع کیا۔ پھر بل کی پلیٹ میز کے بیچ پر تمیز سے رکھ کر وہ الگ کھڑا ہو گیا۔

اجنبی کے برابر بیٹھے ہوئے شخص نے گلاس اٹھا کر تھوڑا سا پانی پیا۔ اور گلاس اپنے سامنے رکھ کر پینٹ کی جیب سے ایک ہاتھ سے بٹوا نکالا اور دوسرے سے بل کی پلیٹ اپنے سامنے کھسکالی۔ عبدل بیٹھے اُن کی طرف کر کے اس طرح کھڑا ہو گیا کہ ان کو کنکھیوں سے دیکھ سکے مگر بظاہر بے تعلق معلوم ہو۔ بل بارہ آنے کا تھا۔ اس کے پاس بٹوے میں ریزگاری تھی۔ اس نے پلیٹ میں گن کر کچھ ریزگاری ڈال دی۔ مگر اجنبی نے ایک سکہ اس میں سے اٹھا کر اسے لوٹاتے ہوئے کہا۔ "بس کرو" اس نے جواب میں کچھ آہستگی سے کہا۔ مگر اس کے ہاتھ کے دوبارہ دباؤ دینے پر سکہ لے کر جیب میں ڈال لیا۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ عبدل نے سُنا۔ وہ شخص اجنبی سے پوچھ رہا تھا "بات کیا ہے" ؟ مگر اجنبی خاموشی سے بڑھ کر باہر چلا گیا اور دونوں اس کے پیچھے۔

عبدل مُڑ کر میز کے پاس گیا۔ پلیٹ میں بل کے اوپر بارہ آنے پڑے تھے۔ اسے کچھ تعجب ہوا۔ شبہ دفع کرنے کے لئے اس نے بل اٹھا کر دیکھا۔ نیچے کچھ نہ تھا۔ یکدم اسے اجنبی کا سکہ اُٹھا کر دینا اور اصرار کرنا یاد آ گیا۔ غصے اور رنج کی ایک تیز لپٹ اس کے جسم میں اٹھی۔ اور آن کی آن میں اجنبی کے متعلق تمام اچھے خیالات جل کر راکھ ہو گئے۔ اسے عموماً ایسے گاہکوں سے روز سابقہ پیش آتا تھا جو بل کے ساتھ بطور بخشش یا انعام کچھ بھی نہ دیتے تھے۔ یا خود جا کر کاؤنٹر پر بل ادا کرتے تھے۔ مگر اسے کوئی خاص دھیان اس بارے میں نہ ہوتا تھا۔ مگر اس وقت اسے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اجنبی نے جان بوجھ کر اس کی ٹِپ اصرار کر کے واپس اٹھائی۔ حالانکہ چند ہی منٹ پہلے اس اجنبی کی باتیں سُن کر وہ ایک ایسی جنت میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں انصاف کی چھاؤں میں رہے ہر وہ بات ہوتی نظر آ رہی تھی جس کا ہونا اس کے لئے اب تک ایک انہونی بات تھی۔ جس کے ہو جانے کے لئے اس اجنبی کے کہنے کے مطابق دُنیا کے سب سے زیادہ بھلے انسانوں نے کوشش کی ہے۔ اور جس کے ہونے ہی سے وہ سب کچھ مٹ سکتا ہے جو اُسے رات دن بے چین اور ملول رکھتا تھا۔

"پر یہ ___ یہ تو" اور وہ بات سوچ کر پھر غصے کی لہر اس کے سارے جسم میں پھیل گئی۔ "جھوٹا کہیں کا" اس نے بڑی جرأت کے بعد دل ہی دل میں اُسے یہ گالی دی۔ "بس باتیں بنانا جانتا تھا اوروں کی طرح۔ اور جب وقت آیا تو یہ ___ یہ ذرا سی ٹِپ بھی بُری لگی" غصے سے اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی امید ہی بیکار ہے" اس کے ذہن نے فیصلہ کر دیا اور وہ جھک کر آہستہ آہستہ چائے کا سامان میز پر سے ٹرے میں جمع کرنے لگا۔

دو تین دن گزر گئے۔

اس کے مزاج کی گرمی کے ساتھ موسم میں بھی اچانک حدت بڑھ گئی تھی۔ دھوپ کی تیزی کے سبب پیاس کی شدت لوگوں میں زیادہ ہو گئی۔ اور ہوٹل کا کام معمول سے بہت زیادہ تیز ہو گیا۔

"عبدل ___ چلو" یہ مخصوص پکار سُن کر عبدل کچھ چونک پڑا۔ ذرا آگے بڑھ کر اس نے آنے والے گاہک کو دیکھا اور وہیں ٹھٹک کے کھڑا ہو گیا۔ وہی اجنبی۔ وہی ٹوئیڈ کی شیروانی پہنے۔ ہاتھ میں ایک بنڈل سا لئے۔ پہلو کے بیرے والے کیبن کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے مالک کے پاس جا کر کہا ___

"صاحب کریم کو بھیج دو۔ میں ذرا کام میں ہوں۔"

"ارے۔ کریم گڑبڑ کرتا ہے۔ تم ہی جاؤ۔ جاؤ جلدی۔"

وہ کوئی چارہ کار نہ پا کر کیبن کی طرف چلا گیا۔ میز کے پاس پہنچ کر وہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

"دیکھئے۔" اجنبی نے اسے دیکھ کر قدرے تامل اور کسی قدر جھجک کے ساتھ کہا۔ "ذرا دو ٹھنڈے اور یخ لے آیئے۔"

وہ مڑ کر واپس لوٹ گیا۔ اور یخ کھلواتے وقت اسے خیال آیا کہ وہ تو اکیلا ہی ہے مگر دو اور یخ منگوائے ہیں۔ کیا دونوں اپنے لئے؟

"اور کیا۔" اس کے ذہن نے جواباً سوچا۔ "یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اپنے لئے سب کچھ۔ دوسروں کے لئے کچھ نہیں۔ بس خالی باتیں۔" بے پروائی سے دونوں گلاس ٹرے میں رکھ کر اس نے سیپر ڈالے اور لے جا کر اجنبی کے سامنے رکھ دیئے۔

"بیٹھ جایئے۔" وہ چونک پڑا۔ اجنبی نے بڑی نرمی سے برابر کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "ہاں ہاں۔ بیٹھ جایئے نا میاں۔" وہ اسے متامل دیکھ کر پھر بولا۔ نہ معلوم کیوں وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارا نام میاں۔ کیا عبدل ہے؟" اس نے ایک گلاس عبدل کی طرف کھسکایا۔ وہ بات کاٹ کر بولا۔

"جی۔ جی نہیں۔ میرا نام عبدالعزیز ہے۔"

"تو عبدل صرف یہ ——"

"جی وہ تو۔" وہ بولا۔ "وہ تو صاحب نے رکھا ہے۔" اور اس نے گردن ذرا موڑ کر باہر کاؤنٹر کی طرف جھانکا۔

"اوہ! تم ہندوستان سے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"کب؟"

"کئی سال ہو گئے۔"

"میں "تم" کہہ کر بات کر رہا ہوں۔ برا تو نہیں لگتا۔"

"جی۔ جی نہیں۔"

عبدل کو بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اس کا سارا غصہ اس وقت نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ اپنا لہجہ کوشش کرنے پر بھی روکھا نہ بنا سکا۔

"تمہیں یاد ہے۔ پہلی بار جب میں اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ آیا تھا تو میں نے تمہیں ٹپ نہیں دینے دی تھی۔ تم کو برا لگا ہوگا۔ ہیں نا؟"

عبدل چپ رہا۔

"ضرور لگا ہوگا۔" اس نے یقینی لہجہ میں کہا۔ عبدل انکار نہ کر سکا۔ اس نے گردن جھکا لی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی جرم کر چکا ہو۔ اسی طرح سر جھکائے ہوئے اجنبی جو کچھ پوچھتا وہ اس کا جواب ہاں یا نا یا کچھ اور کہہ کر دے دیتا۔

"ارے! دیکھو۔ باتوں میں خیال نہیں رہا۔ اور یخ یونہی رکھا ہے جب سے۔ گرم ہو گیا ہوگا۔" اس نے گلاس ہاتھ سے چھوا۔

"لایئے برف ڈال لاؤں۔" عبدل اٹھا۔

"نہیں نہیں۔ ابھی گرم نہیں ہوا۔ بیٹھ جاؤ۔" اجنبی نے اس کے سامنے ایک گلاس بڑھایا۔ "لو۔" اسے چپ دیکھ کر وہ بولا۔ "کیا کچھ ناراض ہو۔ میری پچھلی حرکت پر؟"

عبدل نے جلدی سے گلاس اپنی طرف کھینچ لیا۔ اجنبی مسکرانے لگا۔ قریب آدھا گلاس پی کر اجنبی رکا۔ "عبدل میاں۔" عبدل کو

ایسا لگا جیسے وہ کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا ہو۔

"تم کو عجیب لگ رہا ہوگا کچھ۔ مگر میں جھوٹ نہیں بولتا مجھے ...." وہ پھر رکا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے دوسری طرف نظر

کرکے کہنا شروع کیا:۔

"میرا ایک بھائی تھا چھوٹا۔ اب بھی ہے۔ تم سے کچھ بڑا ہوگا ــــ میں اسے بہت پیار کرتا تھا۔ ہمیشہ میرے ہی پاس رہتا تھا۔

میں نے اس کی پرورش کی تھی۔ مجھے اس سے بڑی امیدیں تھیں۔ میرا خیال تھا وہ میرے کام، میرے مقصد میں میرا ساتھی بنے گا۔ اپنا مقصد

عبدل میاں، میں تم کو پھر بتاؤں گا۔ مگر وہ ہے بہت بڑا مقصد بہت بڑا کام۔ میں خود ابھی اپنے کو پوری طرح اس کے قابل بھی نہیں بنا سکا ہوں

مگر مجھے امید تھی کہ میرا بھائی رشید میری اس کمی کو پورا کردے گا۔ اور ہم دونوں۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح یہاں ایک بہت بڑی تبدیلی کی

کوشش کر سکیں گے۔ مگر۔ مگر وہ مجھے چھوڑ گیا۔ اس نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ مجھے آپ کا طریقہ پسند نہیں۔ مجھے یہ مُلّا پن نہیں چاہئے

اس نے اسے مُلّا پن کہا۔ اور میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ میری ساری امیدیں ٹوٹ گئیں۔ اور ــــ میں" ایک ٹھنڈی سانس بھر کر

اجنبی چپ ہو گیا۔

عبدل کو اپنی پیٹھ پر ٹھنڈی لہریں دوڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے

تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہی اجنبی کا بھائی رشید ہو اور یہ ــــ سب کچھ اس نے اس سے کہا ہو۔ جذبات کی شدت سے اس کی

آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس نے اجنبی کے چپ ہو جانے پر ان آنسوؤں کو چھپانے کے لئے منہ موڑ لیا۔

"عبدل میاں"! عبدل کو ایسا لگا کہ اس کے کانوں میں کہیں دور سے ایک بہت میٹھی آواز پہنچ رہی ہو۔

"ارے! رو رہے ہو؟" اس نے بڑے پیار سے چمکار کر اسے کہا۔ "نہیں میاں روؤ نہیں۔ میں اب اس سے رنجیدہ نہیں۔ صرف اس کی حالت

پر کبھی کبھی افسوس کرتا ہوں۔ اس نے مجھ سے الگ ہو کر ایسے لوگوں سے رشتہ جوڑ لیا۔ جو صرف اپنی مطلب براری کے لئے غریبوں کی ہمدردی کا

دم بھرتے ہیں۔ مگر صرف ان سے کام نکالتے ہیں۔ مجھے اس کا ساتھ چھوٹنے کا افسوس ہے مگر کچھ خوشی بھی ہے۔ مجھے تم کو دیکھ کر خوشی ہوتی

ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔ مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جو بات رشید نہ کر سکا، تم کر سکو گے ــــ عبدل میاں! کیا تم مجھے بھائی جان

کہنا پسند کرو گے۔ رشید بھی یہی کہتا تھا۔ مگر اب وہ کتنی دور ہے۔ کتنی دور" اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

عبدل کے رخساروں پر آنسوؤں کی دو بوندیں ڈھلک گئیں۔ اسے احساس ہو رہا تھا جیسے اتنے عرصے وہی رشید کے بھیس میں اپنے

بھائی جان کو رنج دیتا رہا ہے۔ ضبط کی کوشش میں اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکل گئی۔

"ارے!" اجنبی جیسے اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ "نہیں نہیں روؤ نہیں۔ عبدل کیا اب مجھے اور رنج دینا چاہتے ہو" اور رومال

بڑھا کر اجنبی نے بڑے دلار سے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔

"ادھر دیکھو" اس نے بنڈل میز پر کھول کر اس کے سامنے سرج کا ایک سرمئی رنگ والا کوٹ پھیلا دیا۔ "یہ میں نے آج سے تین سال

پہلے اس کے لئے بڑی آرزوؤں سے سلوایا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اسے پسند کرے گا۔ مگر وہ اسے دیکھ کر یونہی چھوڑ کر چل دیا۔ کاش وہ صرف پہن

ہی لیتا۔ یہ حسرت میرے دل میں اب تک ہے۔ میں تب اس کے لئے لایا تھا مگر اب ــــ اب تمہارے لئے یہ کوٹ لایا ہوں۔ کیا تم اسے

بھائی جان کا تحفہ سمجھ کر لے لو گے؟ ــــ بولو! یہ میری بہت بڑی تمنا ہے ــــ بولو!"

عبدل نے سر جھکائے ہوئے سر کے اشارے سے ہاں کہی۔ اس کا دل اب رنج میں نہیں۔ مارے خوشی کے رونے کو چاہ رہا تھا۔ مگر وہ

ایک عجیب شرم کے سے عالم میں چپ بیٹھا تھا۔

"میں نے تم کو یہاں سے ہٹا کر اسکول میں داخل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تمہارے ہوٹل کے مالک صاحب سے بھی دوپہر کو آ کر بات
کر لی تھی۔ اب تمہاری مرضی ہو تو میں تم کو کل اسکول لے چلوں۔ کیوں؟ بولو!"

"جی" عبدل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"شاباش! مجھے امید ہے تم وہی کچھ بنو گے جو میں چاہتا ہوں اور جو اس ملک کی ضرورت ہے۔ پھر بھائی جان کا ہاتھ بٹانا۔ ہیں نا؟"
ٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

عبدل کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر اس سے لپٹ جائے اور کہے:۔

"مجھے ابھی لے چلئے۔ بھائی جان میں کب سے یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ مگر کہاں جاؤں یہ معلوم نہ تھا۔ آپ آ گئے۔ اب مجھے لے چلئے
ابھی لے چلئے" مگر وہ بیٹھا رہا اور اجنبی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کل صبح تمہارے گھر آؤں گا۔ تم اسکول چلنے کو تیار رہنا۔ اور اپنی امّی سے کہنا کہ آپ کا ایک اور بیٹا آپکو
ام کہتا ہے"

عبدل نہ معلوم کب تک اسی طرح بیٹھا رہا کہ بیروں میں سے ایک سندھی لڑکے نے آ کر اسے چونکا دیا۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا:۔

"ارے عبدل! چل نا۔ ارے اور یہ سب ایسا ہی رکھا ہے۔ کیا گاہک پی کر نہیں گیا؟"

اس نے دیکھا کہ اجنبی کا گلاس نصف اور اس کا پونچی رکھا ہے۔ مسکرا کر اس نے سندھی لڑکے کو دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"ارے۔ یہ کیا۔ کوٹ ہے۔ چھوڑ گیا کیا گاہک؟"

"نہیں۔ بھائی جان دے گئے ہیں" اس نے کچھ فخر سے کہا۔

"بھائی جان؟ ارے تیرے بھائی جان تھے۔ تو۔ تو یہاں کیوں کام کرتا ہے رے؟"

"یہ ـــ یہ ابھی آئے ہیں۔ کل میں اُن کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ پڑھنے۔"

سندھی لڑکا اس دوران میں کوٹ اٹھا کر لٹکائے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ تو تمہارے چھوٹا ہو گا۔ دیکھو نا" اس نے عبدل کو نظروں سے ناپتے ہوئے کہا۔

"اے عبدل! ہم کو دے دے نا رے!" اس نے کسی قدر رک کر بڑی لجاجت سے کہا۔

عبدل گردن موڑ کر ایک لمحہ چپ چاپ دیکھا کیا۔ پھر اچانک آگے بڑھ کر اس نے اس لڑکے کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بولا:۔

"یہ نہیں بھیا۔ یہ نہ لے۔ دیکھ۔ اگلے مہینے کی پوری تنخواہ میری لے لے۔ اس سے بنا لیجو۔ ایسا ہی بن جائے گا۔ ہیں؟"

اس لڑکے نے سر ہلا کر اچھا کہا۔ اور پھر کوٹ کو اپنے اوپر رکھ کر ناچنے لگا۔ عبدل کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا
وہ ایک دم اونچا بہت اونچا اٹھ گیا ہے۔ جہاں سب طرف مسرت و شادمانیاں قہقہے لگا رہی ہیں۔ اور مسرتیں رقص کرتی پھر رہی ہیں۔ آج وہ کھلا
اتھا۔ بات بات پر ہنستا اور اس پھرتی سے کام کر رہا تھا کہ اس کا وجود ہوٹل میں ہر جگہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے تنخواہ کی بات مالک سے جا کر
۔ پھر اپنے کوٹ کو لپیٹ کر بنڈل بنایا اور اسے ریڈیو کے پاس والی الماری میں احتیاط سے رکھ کر رات کا انتظار کرنے لگا۔

اور رات دھیرے دھیرے آ گئی۔

وہ ریڈیو کے پاس ہی کھڑا تھا کہ خبریں شروع ہو گئیں۔ مگر اس بار نہ تو وہ دور ہٹا اور نہ اس نے ریڈیو ہلکا کیا۔ بلکہ خبروں کے رسیا کی
ب کرسی کی پشت سے ہاتھ کا سہارا لے کر وہ کھڑا غور سے سب سنتا رہا۔

سندھی لڑکا کئی بار آتے جاتے اسے دیکھ چکا تھا۔ مگر فرصت نہ ملنے کے سبب بات نہ کر سکا۔ جب گاہک ذرا کم ہوئے تو وہ اُس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر بولا نہیں۔ پھر نہ معلوم کیا سوچ کر اس نے آگے بڑھ کر ریڈیو کی آواز دھیمی کر دی۔ اس وقت خبروں کے خاتمہ پر موٹی سُرخیاں پھر سُنائی جا رہی تھیں۔

عبدل نے چونک کر اسے روکا اور ہاتھ بڑھا کر آواز پھر بلند کر دی۔

اناؤنسر اب موسم کا حال بتا رہا تھا۔

"موسم پچھلے کافی عرصے سے خشک ہے۔ مگر آج آسمان پر بادل نظر آ رہے ہیں۔ اور ہوا میں خنکی بھی ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں کے لئے موسم کی پیشین گوئی یہ ہے۔ مزید خوشگوار موسم۔ اور خوب بارش ہونے کا امکان۔ خبریں ختم ہوئیں۔"

عبدل نے مڑ کر فخریہ انداز سے سندھی لڑکے کی طرف دیکھا۔

"دیکھا! ہے نا تھوڑی بات سچ۔ کل بارش ضرور ہو گی۔" اس نے کہا اور مسکرا دیا۔

سندھی لڑکا بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

پھر اس نے اب خود ہی ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بند کر دیا۔ جس میں ایک بائی جی اعلان کے مطابق ٹھمری دادرے میں بھوگ گانے ہی والی تھیں ———!!

ہماری نظر میں

حدیثِ دفاع

"حدیثِ دفاع" از میجر جنرل محمد اکبر خاں ــــ مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ ضخامت ۳۳۶ صفحات
قیمت پانچ روپے ــــ ملنے کا پتہ :- فیروز سنز۔ کراچی۔

"عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ" کے مؤلف ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (سابق استاد جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن۔ حال مقیم پیرس) غالباً پہلے شخص ہیں، جنہوں نے بہ نفسِ نفیس حجاز جا کر غزوات کے میدانوں کو جب کر دیکھا اور نقشہ ہائے جنگ مرتب فرمائے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ کوشش علمی اور دینی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہے گی ــــ مگر اس کام کو آگے بڑھانے کی سعادت میجر جنرل محمد اکبر خاں کے مقدر میں لکھی تھی۔ صاحب موصوف نے حضورؐ کے غزوات پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ جو اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے گرانقدر بلکہ بے مثل کتاب ہے۔

"حدیثِ دفاع" کے مصنف محمد اکبر خاں صاحب "میجر جنرل" ہیں۔ انہوں نے صرف پریڈ گراؤنڈ ہی پر کیڈٹوں کو تربیت نہیں بلکہ جنگ کے میدانوں میں فوجوں کی کمان کی ہے۔ اس لئے عسکری علوم (Military Science) سے وہ اچھی طرح علمی طور پر واقف ہیں۔ پس ان کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات پر جنگی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کریں۔ اس خصوص میں ان کی بات بہت بڑا وزن رکھتی ہے۔ اور ان کی رائے کو "سند" کا درجہ حاصل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی بہت سی کتابیں مغازی کے نام سے مشہور ہیں۔ اور سیرت نگاروں نے غزوات کو خود پھیلا کر بیان کیا ہے۔ مگر ان لکھنے والوں میں فنِ جنگ کا ماہر شاید ایک بھی نہ تھا۔ اس لئے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ میجر جنرل محمد اکبر خاں نے حضورؐ کے غزوات پر عسکری نقطۂ نگاہ سے جس تفصیل اور دقتِ نظر کے ساتھ بحث کی ہے۔ وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

سیرت نگار غزوات کے سلسلہ میں مشہور روایتیں نقل کر کے گزر جاتے ہیں یا بہت سے بہت ان کے بعض اسباب بیان کر دیتے ہیں مگر "حدیثِ دفاع" کے مصنف نے ایک ایک غزوہ کو سامنے رکھ کر نہ صرف یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible] شرکت فرمائی اور ان میں جو تدابیر اختیار کیں وہ فوجی نقطۂ نگاہ سے کس قدر ضروری تھیں۔ [illegible] اور ہر حیثیت سے کامل تھیں۔

میجر جنرل محمد اکبر خاں نے دلائل و شواہد کے ساتھ اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے بڑا [illegible] سپہ سالار دنیا نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں :-

"جس طرح آنحضرتؐ کی ذات دوسرے تمام اعتبارات سے واجب التعظیم ہے اسی طرح سپہ سالار[1]، مجاہد، دفاعی سیاست کے ماہر اور حق سے محبت [illegible]

---

[1] :- لیکن علامہ شبلی نعمانی کا کہنا یہ ہے کہ :- "پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں۔ اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح، سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے۔ پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط و خال، تقدس، نزاہت، حلم و کرم، زہد و عبادت اور ایثار رہتا ہے۔ بلکہ عین اس وقت جبکہ اس پر سکندرِ اعظم کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ژرف بیں نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتۂ یزدانی ہے" (سیرۃ النبی)

امام کی حیثیت سے بھی واجب التقلید ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ دُنیا کتنی ہی ترقی کر جائے، مادی اسباب و وسائل کتنے ہی فراہم ہو جائیں۔ مگر اصول و فن اور عمل کے اعتبار سے آپؐ کے نظام سے آگے کوئی اور مقام پیدا نہیں کیا جا سکتا۔"

یقیناً "انسانِ کامل" کی یہی شان ہونی چاہیئے!

حضورؐ کی ہجرت کو یورپ کے متعصب مورخین "فرار" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر فاضل مصنف نے دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ہجرت ایک زبردست دفاعی منصوبہ تھا۔

"صحابہ کرامؓ کو اس کا علم تھا۔ یہی وجہ ہے انہوں نے اسلامی سنہ واقعہ ہجرت سے شروع کر کے اس کی اہمیت کا اعلان کیا۔ دُنیا میں کسی قوم نے آج تک اپنی شکست یا کمزوری کی دائمی یادگار قائم نہیں کی۔ یہ انسانی نفسیات کے خلاف ہے......"

صفحہ ۷۹ پر ایک جلی سُرخی: "بانی اسلام کا بچپن اور جوانی" ہے۔ یہ غلط فہمی عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ حالانکہ اسلام کی بانی خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور دُنیا کا سب سے پہلا انسان فطرت پر پیدا ہوا تھا۔ اس لئے وہ "مسلمان" تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بنار نہیں ڈالی تھی۔ بلکہ اسلام اور ایمان کے مٹے ہوئے نقوش کو اُبھارا تھا۔ حضورؐ بانی اسلام نہیں داعی اسلام تھے۔

صفحہ ۹۴ پر "بنی تغلب" کو "بنی ثعلب" لکھا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

صفحہ ۱۲۶ پر "سَبلی" کو "سُبلی" لکھا ہے یعنی "پر زبر کی جگہ" پیش "(ضمہ) کی جدت غالباً کاتب صاحب کی شوخیٔ قلم کا ظہور ہے۔

صفحہ ۱۶۳۔ "آپؐ کی فوجی چال سے دشمن کو اس کا قطعی علم نہ ہو سکا" اگر "چال" کی جگہ "حکمت عملی" یا "تدبیر" ہوتا تو بہتر تھا کہ اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ ہے۔

صفحہ ۱۷۵۔ "غزوۂ احد کے بواعث"۔ بواعث (باعث کی جمع) غلط نہیں ہے۔ مگر "اسباب" اس سے زیادہ جامع، مشہور اور مانوس لفظ موجود ہے!

صفحہ ۱۷۹ "مسلم خواتین کا ایک دستہ بھی مدینہ سے آگیا ہے اور اپنے عزیزوں کے شانہ بشانہ جنگ کر رہا ہے"

نہ جانے اس عبارت کا ماخذ کونسی کتاب ہے؟ غزوۂ احد میں مسلم خواتین کا کوئی باقاعدہ دستہ کافروں سے لڑنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلیمؓ مشک بھر بھر کر زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ اور حضرت ابوسعید خدری کی والدہ حضرت ام سلیط بھی یہی خدمت انجام دیتی تھیں۔ صحابیات میں سے حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا نے البتہ حضورؐ کے پاس پہنچ کر کافروں کو آگے بڑھنے سے روکا اور ابن قمیہ پر تلوار کا وار بھی کیا۔ مگر وہ دشمن رسول دو دو زرہیں پہنے ہوئے تھا اس لئے تلوار اُچٹ گئی!

اس کتاب میں غزوات کے کئی نقشے ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کا کیا کہنا؟ کتاب کی زبان سلیس و سادہ اور اندازِ بیان شگفتہ ہے — صرف ایک اقتباس :-

"جس طرح آنحضرتؐ کے تمام دوسرے اقوال اور اعمال واجب التقلید ہیں اور اسوۂ عمل کا حکم رکھتے ہیں، اسی طرح آپؐ کی دفاعی حیثیت واجب التعمیل اور واجب التقلید ہے — اے کاش! بانیٔ اسلام کی راہ پر چلنے کا دعویٰ کرنے والے اب بھی بیدار ہو جائیں۔ اب بھی دیدہ بینا سے دیکھیں اور گوش شنوا سے سنیں کہ داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلام کے بقاء و استحکام کے لئے کیا کیا؟ اسلام کس لئے آیا تھا اور ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے فائدوں، ذلیل مصلحتوں اور تجدد فروشیوں میں کس طرح مست ہیں۔ وقت کی پکار کیا ہے؟ اور ہم

رخصت و عافیت کے گوشوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ شخصی سود و زیاں کو کس طرح تول رہے ہیں۔ یوں قوم میں ارباب علم و مشیخت بھی ہیں اور اصحاب درس و افتاء بھی۔ فکر و نظر رکھنے والے بھی ہیں اور سحر طراز اہل قلم بھی۔ شاطران بزم سیاست بھی ہیں اور منبر و محراب کو زینت بخشنے والے بھی۔ لیکن عزم و یقین اور جرأت و حوصلہ رکھنے والے کہاں ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے مر مٹنے والے کتنے ہیں۔ مصلحت بینی و قیل و قال کو چھوڑ کر میدان عمل میں کون آنے کو تیار ہے؟ رسول اکرمؐ کے راستہ پر کون چلنا چاہتا ہے۔ توفیق الٰہی کی سعادت اندوزیاں کس کا مقصد حیات ہیں؟ اسلام اس کا جواب چاہتا ہے۔ زمان اس کا جواب چاہتا ہے۔ وقت اس کا جواب چاہتا ہے ؎

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند

کس بمیداں درنمی آید سواراں راچہ شد!

عوام تک تو یہ پیام کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جائے گا۔ کاش! ہمارے "اکابر" اور "بڑے لوگوں" کے ایوانوں اور عشرت کدوں میں بھی اس دعوتِ عزیمت کو سنا جا سکے!

"حدیث دفاع" فوجی تربیت گاہوں اور عسکری اداروں کے کورس میں شامل ہونے کی مستحق ہے۔ مصنف اور ناشرین دونوں کو اللہ تعالیٰ دارین میں اجر عطا فرمائے گا کہ اس دور مادہ پرستی میں دین کے لئے جو کوئی جس نہج پر بھی کام کر رہا ہے۔ وہ لائق تبریک و تحسین ہے!

محمد علی

"محمد علی" — ذاتی ڈائری کے چند ورق (حصہ اول) از:- مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ضخامت ۴۰۴ صفحات۔ قیمت چھ روپے آٹھ آنے (مجلد) ملنے کا پتہ:- (۱) دار المصنفین اعظم گڑھ۔ اور (۲) صدق بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ۔

ہماری قوم احترام و عقیدت کے اظہار اور خطاب و القاب عطا کرنے میں بڑی دریا دل اور سخی واقع ہوئی ہے کتنے "نیم ملاؤں" کو قوم نے "علامہ" بنا رکھا ہے۔ کتنے جاہ پرست اور مداہنہ ساز ہیں جو "مجاہدین ملت" بنے پھرتے ہیں۔ اور کتنے وہ لوگ جو اسلام کے بنیادی ارکان کو بھی پورا نہ کرتے تھے۔ مرنے کے بعد "رحمۃ اللہ علیہ" اور "قدس سرہٗ" کہلاتے ہیں۔ مگر مولانا محمد علی حقیقت میں قیادت و رہنمائی کے اس مقام پر فائز تھے جن کو بجا طور پر "رحمۃ اللہ علیہ" کہا جا سکتا ہے۔ اللہ کی رحمت "محمد علی" پر نازل نہ ہوگی تو اور کس پر ہوگی کہ ان کا دل ملت کے غم اور اسلام کے درد سے لبریز تھا۔ اللہ کا خوف اور رسول اللہ کی محبت ان کے ریشہ ریشہ میں پیوست تھی۔ اور اسلام کی سربلندی کے خیال سے ان کا ایک نفس بھی غافل نہ تھا — رحمۃ اللہ علیہ، قدس سرہٗ۔ نور اللہ مرقدہٗ۔ برد اللہ مضجعہ، وکثر اللہ امثالہ (آمین)!

ہندوستان کی تاریخ آزادی کے چند باب تو انہی "محمد علی" کی قربانیوں سے شروع ہوتے ہیں۔ کانگریس کے چھکڑے کو برق و بخار کی قوت "علی برادران" ہی کے نفس گرم اور دل پرسوز نے عطا کی۔ گاندھی جی کی شہرت، ہر دلعزیزی اور مقبولیت میں مولانا محمد علی کا ایثار بھی شریک ہے — مولانا محمد علی بلا مبالغہ اتنے بڑے آدمی تھے کہ اتنے بڑے آدمی صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں!

مولانا عبدالماجد دریابادی کو مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے دلچسپی نہیں عقیدت اور عشق ہے۔ یہی عشق جب ان کے قلم سے ظاہر ہوتا ہے تو لفظ و معانی کا سحر حلال بن جاتا ہے۔ مولانا دریابادی اردو انشاپردازی میں طرز خاص کے موجد ہیں — "بیوگرافی" کو اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کی روشنی میں مرتب کرنا یہ تو صاحب موصوف کے خامہ حقیقت رقم کا حصہ ہو کر رہ گیا ہے۔ "حکیم الامت" کے بعد یہ دوسری کتاب اس خاص رنگ میں منظر عام پر آئی ہے!

فاضل مصنف کی "ذاتی ڈائری کے چند ورق" حقیقت میں ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ ہے۔ جسے اگرچہ تاریخ کے انداز پر نہیں لکھا گیا۔ مگر اس میں وہ سب کچھ آ گیا ہے جسے "تاریخ" کہا جا سکتا ہے۔ اس گرانقدر کتاب میں کتنے ایسے نقوش کو جلاء دیکر

اُبھارا گیا ہے۔ جو لوگوں کے حافظہ سے قریب قریب مٹ چکے تھے۔ یہ کتاب ہمیں بہت سی اہم شخصیتوں سے روشناس کراتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ مولانا محمد علی مرحوم کی سیرت و شخصیت کی تصویر کے ساتھ کچھ اور حسن کے بھی کھنچ گئے ہیں جس نے اس کتاب کو سیرتوں کا "مرقع" بنا دیا ہے۔

مولانا محمد علی کا اصل میدان انگریزی زبان میں خطابت اور صحافت تھی۔ مگر اُردو میں بھی اُن کی انشاپردازی کے جوہر اس طرح چمکتے ہیں:۔

"جوہری جب نگین تراشی میں مصروف ہوتا ہے تو زیادہ وقت اس کا اس تراش خراش میں صرف نہیں ہوتا جو عوام کو نظر آسکے۔ بلکہ ایسی باریک اصلاح میں جس کا نظر آنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور جو کچھ وہ گھنٹوں کی محنت میں تراشتا ہے وہ نہایت باریک خاک کے ذرّے ہوتے ہیں۔ جن کو تراشتے تراشتے ہی ہوا لے اُڑتی ہے۔ مصنف کسی طرح جوہر فروش سے کم نہیں۔ اور اس سے زیادہ باریک بین نقاد اس کی تصنیف کا اور کوئی نہ ہونا چاہیے۔"

ایک اور اقتباس:۔

"کلام پاک ریشم کے جزدانوں اور الماری کے بالاترین حصوں اور وہاں کے گرد و غبار کے لئے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کا ہر نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان۔ کاغذ کی پٹیاں۔ بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے والے کسی کتاب کو نہیں پڑھتے۔ نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ......"

اس عبارت کی جزالت اور صاحب تحریر کے تبحر علمی کا اندازہ لگائیے:۔

"غزالی کا فلسفہ مجھ سے زیادہ آپ نے پڑھا ہوگا۔ ان کی احیاء العلوم کا اگر ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو گیا ہوتا۔ تو ڈیکارٹ کو دنیا چور سمجھتی۔ مگر ان کی خود تصنیف کردہ سیرت بلکہ سوانح قلبی و دماغی کو ملاحظہ فرمائیے۔ آخر میں اسی کا اعتراف ہے کہ اصل وہی مشاہدہ ہے جو حیات ظاہرہ سے مستغنی اور استدلال و حجت سے بے نیاز ہے۔"

خود مولانا عبد الماجد دریابادی کی انشاء پردازی اس کتاب میں معراج کو پہنچی ہوئی ہے۔ مولانا محمد علی کی شہرت اور ہر دلعزیزی دکھانا چاہتے ہیں۔ اس کا اظہار کس اچھوتے انداز میں کیا ہے:۔

"محمد علی اب انسان کاہے کو تھے۔ محض ایک "خبر" ہو کر رہ گئے تھے جو روزانہ چھپتی رہتی ......"

مولانا محمد علی کا مشہور انگریزی اخبار "کامریڈ" بند ہوتا ہے۔ اس پر سیرت نگار اپنے غم کو چھپا نہیں سکتا۔ لکھتے ہیں:۔

"کامریڈ جس دن بند ہوا ہے۔ حکام والا مقام کے علاوہ خود ہم چشم لیڈروں میں سے بھی خدا جانے کتنوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ ایک بڑا کانٹا پہلو سے دُور ہو گیا۔ وہ درّہ احتساب گم ہو گیا جو بڑے اور چھوٹے کے درمیان صرف انصاف کرنا جانتا تھا۔ کامریڈ نامی ایک اخبار بند نہیں ہوا۔ مظلوموں کا ایک فریاد رس اور مسلمانوں کا ایک بڑا ترجمان دنیا سے اُٹھ گیا۔"

شریف حسین اور سلطان ابن سعود کی آویزش کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں جو دو گروہ ہو گئے تھے اور اُن میں جو رسہ کشی ہوئی ہے اور مولانا محمد علی مرحوم نے اپنی مقبولیت کو خطرے میں ڈال کر حق کی حمایت کی ہے ۔۔ وہ حصّہ ذرا طویل ہو گیا ہے۔ فاضل مصنف زبان کے معاملہ میں بہت زیادہ محتاط ہیں۔ اور زبان و محاورہ کے باریک اور نازک فرق پر اُن کی نگاہ رہتی ہے۔ مگر دو چار جگہ اُن کا بیان محل نظر ہے:۔

"عین یہی زمانہ تھا کہ والد مرحوم کی خبرِ وفات عین حج کے بعد مکہ معظمہ سے موصول ہوئی۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔" (صفحہ ۱۴)

"ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے" انتہائی حیرت کے موقع پر بولتے ہیں۔ اس میں غم کا پہلو شریک نہیں ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

اُس نے دیکھا جو اُٹھ کے سوتے سے — اُڑ گئے آئینے کے توتے سے

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔ شدتِ غم کے اظہار کے لئے یہ ضرب المثل نہیں بولی جاتی۔

"جو اُن کے مہمان نہ بھی ہوتے انہیں بھی پکڑ پکڑ لاتے اور ٹھونس ٹھونس کر انہیں کھلاتے ضرور۔" (صفحہ ۲۲۳)

"ٹھونس ٹھونس کر کھلاتے" میں ذم پایا جاتا ہے اور اس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی کی میزبانی اور سیر چشمی کی تعریف مقصود ہے۔ وہ مہمانوں اور دوستوں کے منہ میں لقمہ رکھ کر جبراً ٹھونستے تھے۔ یہاں محل "اصرار کرنے" کا تھا۔

"اہلِ حدیث جہاں کہیں تھے۔ پنجاب میں ہوں یا بنگال میں۔ مولانا سے کد جاری رکھے ہوئے تھے۔" (صفحہ ۳۹۳)

"کد جاری رکھے ہوئے تھے" یہ ادا پر کتنا گراں گزرتا ہے۔

ایک لفظ "لق و دق" ہے۔ جو فاضل مصنف کو نہ جانے اتنا کیوں پسند ہے کہ اسے بار بار لائے ہیں!

ایک حسین و متناسب چہرے پر چند چھائیوں سے حسن و خوبی میں کوئی کمی تھوڑی آتی ہے۔ اور بہت سوں کی تو اُن پر نگاہ بھی نہیں جاتی۔ کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب ہر اعتبار سے بلند پایہ۔ انتہائی دلچسپ اور اُردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہے۔ ایسی اچھی کتابیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ دینی نقطۂ نگاہ سے بھی اس کا مطالعہ مفید ہے!!

اسبابِ زوالِ اُمت

"اسبابِ زوالِ اُمت" از:۔ امیر شکیب ارسلان۔ ضخامت ۱۳۰ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ ملنے کا پتہ:۔ نور محمد۔ کارخانہ تجارت کتب آرام باغ۔ کراچی۔

امیر شکیب ارسلان مرحوم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ یہ انہی کی عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں عمل و حرکت کی تعلیم ملتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے دل و دماغ کی مغرب سے مرعوبیت دُور ہوتی ہے اور یہ کتاب بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب "اسلام" نہیں ہے۔ بلکہ خود ان کے وہ اعمال ہیں جو اپنی جگہ اسلام کی ضد ہیں!

کتاب کا ترجمہ[1] سلیس اور آسان ہے۔

مکاتیبِ سلیمان

"مکاتیبِ سلیمان" مرتبہ۔ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ مجلد۔ خوبصورت گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپے چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ چراغِ راہ۔ بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم نے نصف صدی تک اسلام کی خدمت کی ہے۔ اور وہ اپنے پیچھے ایسے فاضل تلامذہ چھوڑ گئے ہیں۔ جن کے زبان و قلم دین کی خدمت کے لئے وقف ہیں۔ اس "خیر جاری" کا مرحوم کو ہمیشہ ثواب ملتا رہیگا!

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم بھی علامہ سید سلیمان ندوی کے فیض یافتہ اور اس قدر لائق شاگرد تھے کہ علامہ مرحوم اُن پر فخر کرتے تھے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اُستاد کی وفات کے چند ماہ بعد وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (رحمہما اللہ تعالیٰ)

حضرت علامہ مرحوم سے مولانا مسعود عالم ندوی کی برسوں مراسلت رہی ہے۔ یہ کتاب انہی خطوط کا مجموعہ ہے۔ شاگرد کی

---

[1] "واللہ مع الصابرین" (اور اللہ جھیل جانے والوں کا ساتھی ہے) "صبر کرنے والوں" ہی لکھنا ٹھیک تھا کہ صبر کے مفہوم سے سب واقف ہیں۔ "جھیل جانے والے" ایک نامانوس اندازِ بیان ہے۔ (م۔ق)

استاد سے عقیدت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تین تین چار چار سطروں کے خطوں کو بھی سینت رکھا ہے۔ اور استاد کی لکھی ہوئی شاید ایک سطر کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا!

ان مکاتیب میں کاتب اور مکتوب الیہ کے ذاتی معاملات بھی ہیں، دارالعلوم ندوہ کے انتظامی نزاع کا بھی ذکر ہے۔ ادب اور دین کے بعض مسائل پر تبصرے اور تنقیدیں بھی ہیں۔ فاضل مرتب نے مکاتیب میں مندرج واقعات اور شخصیتوں کے بارے میں ذیلی نوٹ دے کر کتاب کی افادیت کو وسیع تر کر دیا ہے!

حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری۔ جو "تاریخ الامت" کے مصنف کہے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں سید صاحب مرحوم نے اپنے خط میں لکھا:۔

"اسلم صاحب نے تاریخ نجد کسی عربی تاریخ نجد کا ترجمہ کیا ہوگا، وہ خود کیا اس بارے میں جانتے ہیں؟"

اس پر مولانا مسعود عالم ندوی نے مندرجہ ذیل نوٹ دیا ہے:۔

"حضرت الاستاذ کی بات صحیح نکلی۔ اسلم صاحب نے محمود شکری آلوسی (ف ۱۳۴۲ھ) کی تاریخ نجد کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے۔ خضری کی محاضرات الامم الاسلامیہ کا ترجمہ "تاریخ الامت" کے نام سے اپنی تالیف بنا کر پیش کر چکے ہیں اور پھر ڈھٹائی یہ ہے کہ ٹوکنے پر فرمایا جاتا ہے۔ "ہاں تصنیف کے وقت زیادہ تر خضری کی کتاب پیش نظر رہی ہے" گویا ان کے خیال میں محمد بک الخضری کی "محاضرات" ہند و پاکستان میں کسی کے پاس موجود ہی نہیں۔ جن لوگوں کی اپنی تصنیفی دیانت کا یہ عالم ہو وہ ائمہ حدیث کی دیانت پر منہ آتے ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔" فاعتبروا یا اولی الابصار

"توسل" کے مسئلہ پر حضرت سید صاحبؒ نے یہ رائے دی ہے:۔

"توسل بالذات بے شبہ جائز ہے۔ احیاء میں تو کلام کسی کو نہیں۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کے توسل سے استسقا کیا۔ رہ گیا اموات کے ساتھ۔ اموات سے توسل کے یہ معنی ہیں کہ ان کے اعمال خیر و مقبولہ سے توسل کیا جائے جس طرح اپنے اعمال خیر سے توسل جائز ہے۔ جیسا کہ حدیث الغار سے ثابت ہے۔ کما رواہ البخاری! اسی طرح دوسرے احیاء و اموات کے اعمال خیر سے بھی۔! وابتغوا الیہ الوسیلہ ...... کی تفسیر بھی توسل بالاعمال سے کی گئی۔ البتہ اموات سے خطاب کر کے اگر مستقلاً ان سے مانگا جائے تو یہ شرک ہے۔ اور اگر ان سے یہ کہا جائے کہ میرے لئے وہ خدا سے دعا کریں۔ تو اہل دیوبند جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن میں اس کو بدعت سمجھتا ہوں۔ کہ یہ طریق دعا منقول و ثابت نہیں۔ علامہ آلوسی نے (روح المعانی) آیت کریمہ وابتغوا الیہ الوسیلہ کی تفسیر میں اس کو بدعت کہا ہے۔ بعد کو شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتاویٰ میں بھی یہ ملا۔ مولانا تھانوی بھی یہی فرماتے ہیں۔ اور بعد میں ان رایوں کے توافق سے مجھے تسکین ہوئی"

مکتبہ چراغ راہ نے اس کتاب کو خاصے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے۔ خصوصاً سرورق سادہ اور حسین ہے!

خندۂ گل

"خندۂ گل" از:۔ سلطان امین۔ حجم ۱۲۷ صفحات۔ مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ دینی بک ڈپو۔ جھنگ بازار۔ لائلپور۔

جناب سلطان امین دگنوری کے کلام کا مجموعہ "خندۂ گل" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ جس پر "تعارف" خواجہ محمد شفیع دہلوی نے لکھا ہے۔

سلطان آمین صاحب ایک نیم مزاحیہ شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ظرافت کے ساتھ ساتھ اصلاح کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری خیالی نہیں بلکہ واقعاتی ہے۔ کوئی تاثر ہے جو ان سے شعر کہلواتا ہے۔

آمین صاحب کی رومانی شاعری کا یہ انداز ہے۔

یہ رسم ہے یا ٹوٹکا ہے یا کوئی معمول
دانستہ شرارت کہ جوانی کی کوئی بھول !
وارفتہ مزاجی کا اسے کچھوں میں داہے
یا تم ہی سے پوچھوں کہ گرتے ہیں یہ کیوں پھول

دوسرا رُخ :-

جو ہو اس میں کچھ فنیت کے خلاف
برائے کرم اس کو کر دیں معاف ! (صفحہ ۱۴)

"فنیت" میں کس درجہ ثقالت ہے۔ "علم و فن" کہتے تو یہ ثقالت جاتی رہتی۔

دلا دیں گے میاں بیوی تمام عالم کو آزادی (صفحہ ۶۷)

"عالم" کا "ع" تقطیع سے گر گیا۔

"محل" نظم پر منظوم تنقید پر انھیں اگرچہ رسٹ واچ انعام میں مل گئی۔ مگر اخلاقی اعتبار سے اس نظم کا کیا وزن ہے ؟

آمین صاحب اگر اکبر الہ آبادی کے انداز کو اپنا لیں تو اس زمانے میں تہذیب و اخلاق کی وہ بڑی خدمت انجام دیں گے۔

جمال الدین افغانی

"جمال الدین افغانی" از:- ضیاء الدین احمد برنی۔ ضخامت ۲۰۲ صفحے۔ مجلد۔ گرد پوش کے ساتھ۔ (ٹائپ میں چھپی ہوئی) قیمت تین روپے چھ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ تعلیمی مرکز۔ گیدول بیکمراج روڈ۔ مقابل مولیدینا مسافر خانہ۔ کراچی۔

ہمارے دوست جناب ضیاء الدین احمد برنی علم و ادب کی کچھ نہ کچھ خدمت کرتے ہی رہتے ہیں۔ چند سال میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور اب بعلِ جلیل۔ زعیم الشرق سید جمال الدین افغانی کی تالیف انہوں نے ترتیب دی ہے۔ عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ بھی اس میں شامل ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جامعہ ملیہ دہلی نے ۱۹۲۳ء میں چھاپا تھا۔ اور اب یہ دوسرا ایڈیشن پورے تیس سال بعد جدید اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ کتاب کا انتساب "صدر جمہوریہ مصر" ہز ایکسیلنسی جنرل محمد نجیب کے نام سے کیا گیا ہے۔ مگر اب جبکہ یہ تنقید لکھی جا رہی ہے۔ جنرل نجیب حکومت مصر کا نظر بند ہے۔ جمال ناصر کی سازش نے مصر کی تاریخ کو انتہائی خطرناک موڑ پر کھڑا کر دیا ہے ـــ !

سید جمال الدین افغانی ایک انقلابی قائد تھے۔ اسلام اور ملت کا درد اپنے دل میں رکھتے تھے۔ اور یہی درد انھیں تمام دنیا میں لئے لئے پھرتا تھا۔ روس، ایران، ہندوستان، عراق، مصر، ترکی، فرانس، انگلستان۔ کہاں کہاں وہ نہیں گئے۔ سیر سپاٹے کے لئے نہیں، اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کی جد و جہد کے لئے۔ مگر یہ شخص جہاں بھی گیا حکومتوں نے اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ کیوں ؟ اس لئے کہ وہ حکومتوں کی زیادتیوں اور ناروا باتوں پر تنقید کرتا تھا۔ اور اصلاح کی دعوت دیتا تھا۔ مزاج شاہانہ بھلا اس کو کہاں گوارا کر سکتا تھا۔

جناب ضیاء الدین احمد برنی نے اس مفکر اور مجاہد انسان کی تالیف لکھ کر علم و اخلاق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ واقعات کو بڑے سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ زبان بھی عام فہم اور سلیس ہے !

صفحہ ج - اور صفحہ ۱۸۲ پر "عزام بے" کو "عظام" اور "تعبارعانہ" کو "جارحانہ" لکھا ہے - یہ کمپوزیٹر کی غلطی ہے۔ مگر صفحہ ۱۸۹ پر "بےنیل مرام" کی جگہ "بےنیل ومرام" چھپا ہوا ملتا ہے۔ اس غلطی کا ذمہ دار کسے ٹھہرائیں؟

توقع کی جاتی ہے کہ یہ کتاب عوام وخواص میں مقبول ہوگی کہ اس میں تاریخ اور بین الاقوامی سیاست کے ساتھ دین واخلاق کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں -

JAMAAT-E ISLAMI PAKISTAN

"جماعتِ اسلامی پاکستان" از:- علی احمد خان - ضخامت ۲۰ صفحے - قیمت دو آنہ - ملنے کا پتہ:- مکتبہ جماعتِ اسلامی ۲۰۵ نواب پور روڈ - ڈھاکہ -

جناب علی احمد خاں صاحب نے انگریزی میں یہ کتابچہ لکھا ہے - جس میں "جماعتِ اسلامی" کا مؤثر انداز میں تعارف کرایا گیا ہے - کہ وہ کیا ہے اور کیا چاہتی ہے؟ اس کتابچے کے اہم عنوانات یہ ہیں:-

جماعتِ اسلامی کی دعوت اور اس کا مشن کیا ہے — جماعت کا لٹریچر — خدمتِ خلق کی اسکیمیں — تعلیمی ادارے - تنظیم — کردار سازی — جماعت نے اب تک کس قسم کے لوگوں کو متاثر کیا ہے — شعبۂ خواتین — جماعتِ اسلامی کی مختصر تاریخ — مغربی تمدن کے ساتھ جماعت کا کیا رویہ ہے؟ — اقتصادی اور سیاسی پروگرام — قیادت کی تبدیلی - جماعتِ اسلامی پر حکومت کے وار — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو سزائے موت کا حکم — جماعت کا موجودہ پروگرام -

جو لوگ جماعتِ اسلامی کو سمجھنا چاہتے ہیں - وہ اس کتابچے کا ضرور مطالعہ کریں!

تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث

"تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی" - ترجمہ:- پروفیسر سید ابوظفر ندوی - حجم ۱۶۸ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ -

شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی (ولادت ۹۱۳ھ ہجری - شہادت ۹۸۶ھ ہجری) گجرات کی خاک سے اٹھے - اور اپنے علم وفضل کے سبب بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی - شیخ کی کتاب "مجمع البحار" بہت مشہور ہے - لغتِ حدیث میں اس پایہ کی کوئی دوسری کتاب غالباً نہیں لکھی گئی - شافیہ کی شرح — کفایۃ المفرطین بھی آپ کی یادگار تصنیف ہے -

شیخ محمد بن طاہر قدس سرہ کو حدیث کے پرکھنے اور جانچنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ودیعت کی تھی - آپ کی کتابیں — "تذکرۃ الموضوعات اور قانون الموضوعات بڑی معرکہ کی کتابیں ہیں -

اس کتاب (تذکرہ) میں شیخ عبدالوہاب نقشی "النفحات" (متوفی ۱۰۳۲ھ) کے رسالہ "مناقب" کا ترجمہ بھی آخری صفحات میں ملتا ہے - مگر کتاب کی افادیت اور اہمیت کا سہرا مولانا سید ابوظفر ندوی کے سر ہے جنہوں نے صاحبِ سیرت کے حالات معتبر ماخذوں سے چن کر یکجا کر دیئے ہیں!

حضرت شیخ کے حالات کے طفیل میں گجرات کے تاریخی انقلابات بھی درمیان میں آگئے ہیں اور فرقۂ مہدویہ کے تفصیلی تذکرے نے کتاب کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے - علمی حلقوں میں اس کتاب کو یقیناً پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا!

چمکدار لیکن

حی سنز کے لیمپ قلیل مدت میں تمام پاکستان میں پھیل گئے
آپ انہیں مکانوں، آفسوں اور فیکٹریوں میں ہر جگہ پائیں گے درحقیقت
ایک اعلیٰ درجہ کی چیز عوام کی خدمت کیلئے پیش کی گئی ہے۔ آپ
حی سنز ہی استعمال کیجئے اس لئے کہ یہ بہترین ہیں

پاکستان میں بنے ہوئے

حی سنز الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ

H.P.A.L

ماہنامہ
فاران
ماہر القادری

جلد (۶) 　　　 نمبر (۱)

ماہنامہ

فاران

جنوری ۱۹۵۵ء ——— ایڈیٹر ——— ماہرالقادری

چندہ سالانہ

چھ روپے　(پاکستانی)　فی پرچہ ۸/

آٹھ روپے　(ہندوستانی)　فی پرچہ ۱۱/

مقام اشاعت

دفتر فاران ۔ کیمبل اسٹریٹ ۔ کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

"عالمِ اسلام[1] کے پاس اب بھی دُنیا کے لئے نیا پیغام اور زندگی کی نئی دعوت ہے۔ یہ وہی پیغام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اس کے حوالے کیا تھا۔ یہ ایک بڑا طاقتور، واضح اور روشن پیغام ہے۔ جس سے زیادہ منصفانہ، بلند و برتر اور مبارک پیغام اس پورے عرصہ میں دنیا نے کسی کی زبان سے نہیں سُنا۔

یہ بعینہٖ وہی پیغام ہے جس کو لے کر مسلمان مدینہ طیبہ سے نکلے اور تمام دُنیا میں پھیل گئے۔ اور جس کو ایک مسلمان سفیر نے شاہ ایران کے اس سوال پر کہ تم ہمارے ملک میں کیسے آئے؟ مختصر لفظوں میں اس طرح بیان کیا تھا:۔

"اللہ نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے تاکہ ہم اس کی مشیت سے لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اس وحدہٗ لاشریک کی بندگی میں، دُنیا کی تنگی سے اس کی وسعت میں اور مذاہب کے ظلم و ناانصافی سے اسلام کے عدل و انصاف میں داخل کریں۔"

اس پیغام میں آج بھی ایک حرف کی کمی بیشی کی ضرورت نہیں۔ آج کی بیسویں صدی کی دُنیا کے لئے بھی وہ ایسا ہی نیا اور تازہ اور مناسبِ حال ہے۔ جیسا چھٹی صدی مسیحی کی دُنیا کے لئے تھا۔

آج بھی لوگ تراشیدہ اور ناتراشیدہ بتوں کے سامنے سربسجود ہیں۔ آج بھی اللہ واحد کی بندگی اجنبی و نامانوس ہو رہی ہے۔ آج بھی غیر اللہ کی عبادت و طاقت کا بازار گرم ہے۔ آج بھی خواہشاتِ نفس کا بُت بر سرِ راہ پُج رہا ہے۔ آج بھی احبار و رہبان (عالم و درویش) ملوک و سلاطین

---

[1] اس ماہ کا نقشِ اول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی معرکہ آرا کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کے اُردو ترجمہ "انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے اقتباسات سے مزین ہے۔ (م۔ق)

صاحب طاقت اور اہلِ دولت، زعماء وقت اور سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر ارباب من دون اللہ بنے ہوئے ہیں۔ جن کے لئے ویسے ہی قربانیاں پیش کی جا رہی ہیں اور انہی کے آستانوں پر اسی طرح سے ناصیہ فرسائی ہو رہی ہے جیسے معبودانِ باطل کے سامنے ہوتی تھی!

آج عالمِ انسانیت اپنی وسعت، وسائلِ سفر کی فراوانی، نقل و حرکت کی آسانی اور اقوام و ممالک کے قرب و اتصال کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ تنگ ہے۔ اس وقت کا مادہ پرست انسان اس دنیا میں کسی دوسرے کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور اپنے فوائد و خواہشاتِ نفس اور خود پرستی کے سوا اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ خود غرضی نے اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی کہ کسی لمبے چوڑے ملک میں دو آدمی بھی زندہ رہ سکیں۔ تنگ نظر وطن پرستی ہر ایسے انسان کو جو اس کے وطن کے باہر پیدا ہو جانے کا قصور وار ہے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اس کے ہر کمال کی منکر ہے اور اس کو ہر حق سے محروم کرتی ہے!

پھر اس زندگی کی رہی سہی وسعت کو ان اہلِ سیاست و حکومت نے اور تنگ کر دیا ہے۔ جو زندگی، وسائلِ معیشت اور خوراک کے سرچشموں اور ذخیروں پر قابض ہیں۔ وہ جس کے لئے چاہتے ہیں اس زندگی کو تنگ کر دیتے ہیں اور جس کے لئے چاہتے ہیں وسیع کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے وسیع شہر اور شاداب و زرخیز ملک لوگوں کے قبضے سے نکل گئے ہیں۔ قوموں کی قومیں اور پوری پوری آبادیاں نابالغ بچوں اور ناسمجھ یتیموں کی طرح دوسروں کی ماتحتی اور تولیت میں زندگی گزار رہی ہیں۔ انسان کا انسان پر اعتماد نہیں رہا۔ ہر ایک دوسرے کو بدگمانی اور شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اپنا حریف سمجھتا ہے۔ قرآن مجید کے بلیغ اور معجزانہ الفاظ کے مطابق زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی ہے اور طبیعتیں اندر ہی اندر بھینچے لگی ہیں تمدن اور حکومت کی نئی نئی بیڑیاں اور غلامی کے طوق لوگوں پر پڑتے جا رہے ہیں۔ ہر وقت ٹیکسوں اور نئے نئے محاصل کی بھرمار سے مصنوعی قحطوں کا خطرہ ہے۔ بیرونی اور اندرونی جنگیں سروں پر منڈلا رہی ہیں!

بیشک آج بھی مذاہب کی نا انصافی سے اسلام کے عدل و انصاف کی طرف لانے کی ضرورت ہے۔ اس روشن خیال اور ترقی یافتہ زمانے میں بھی ایسے مذاہب پائے جاتے ہیں، جن کے عقائد و تعلیمات مضحکہ خیز ہیں۔ جو اپنے پیروؤں کو بے عقل اور بے شعور جانوروں کی طرح بے تدبیر رکھتے ہیں۔ اور ان کو اپنی عقل و تفکر سے کام لینے کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر کچھ مذاہب و نظام ایسے ہیں جو مذہب کہلانے کے روادار تو نہیں۔ لیکن اپنے تسلط و اقتدار میں اپنی غیر محدود طاقت و حکومت میں۔ اور اپنے پیروؤں کی اندھی تقلید اور پرجوش عقیدت میں قدیم مذاہب سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

یہ وہ سیاسی نظام اور اقتصادی نظریات ہیں۔ جن پر آج لوگ اسی طرح سے ایمان لا رہے ہیں۔ جیسے پہلے مذاہب و ادیان پر ایمان لاتے تھے۔ یہ اس عصر کی قوم پرستی، وطن پرستی، جمہوریت، اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ ہے۔ یہ نئے مذاہب اپنی ناروا داری، تنگ نظری اور بے رحمی میں قدیم جاہلی ادیان و مذاہب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ کسی سیاسی عقیدہ یا معاشی نظریہ سے اختلاف کی سزا آج اس سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ جتنی زمانہ سابق میں کسی مذہب یا عقیدہ سے اختلاف کی تھی۔

آج جب کسی پارٹی یا اصول کا اقتدار قائم ہوتا ہے تو مخالف جماعت کو زندگی کا حق بھی نہیں دیا جاتا۔ اور اس کو اپنے اختلاف کی سخت سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس زمانے کی دو بڑی جنگیں کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر یا کسی مذہبی گروہ کی تحریک سے نہیں ہوئیں بلکہ محض سیاسی اغراض کے تصادم اور قومی خود غرضیوں کی بنا پر ہوئیں۔ اسپین، چین کی خانہ جنگیاں۔ جن کے سامنے چھٹی صدی مسیحی کی عیسوی دنیا کی مذہبی خانہ جنگی اور قرون وسطیٰ کی کلیسا اور علم و فن کی کشمکش بھی گرد ہے۔ کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر نہ تھیں۔ بلکہ محض ایک سیاسی اصول کے اختلاف اور اقتدار پسند گروہوں کی کشمکش تھی!

آج بھی عالمِ اسلامی کا پیغام خدائے واحد کی عبادت اور اطاعتِ مطلق، اللہ کے پیغمبروں کی رسالت، بالخصوص آخری اور سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت اور آخرت کے عقیدے پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔ اس دعوت کو قبول کرنے کا انعام اور صلہ یہ ہوگا کہ پہلا

تو بہ تو تاریکیوں سے نکل کر جن میں وہ صدیوں سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ روشنی کی طرف آ جائے گا۔ اپنے جیسے انسانوں کی بندگی سے نجات پاکر خدائے واحد کی بندگی کی نعمت پائے گا۔ زندگی کے اس جیل خانہ سے نجات پاکر جس میں وہ صدیوں سے محبوس ہے۔ زندگی کے کھلے میدان اور دُنیا کی آزاد فضا میں قدم رکھیگا۔ اقتصادی اور سیاسی مذاہب کی جکڑ بندیوں سے رہائی پاکر وہ دینِ فطرت اور شریعت الٰہی کے سایۂ عدل میں جگہ پائے گا۔

اس پیغام کی ضرورت و اہمیت، اس کی بلندی و برتری جیسی اس زمانے میں واضح ہوئی ہے اور جیسا آج اس کا سمجھنا آسان ہوگیا ہے۔ ویسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج جاہلیت سر بازار رُسوا ہو چکی ہے۔ اس کے چھپے ڈھکے عیب کھل گئے ہیں۔ لوگ زندگی سے عاجز ہیں اور اس وقت کے ناخداؤں سے مایوس ہیں۔ دُنیا کی قیادت میں اصولی تبدیلی کا یہ خاص وقت ہے۔ اس وقت تک دُنیا کی قیادت میں جو کچھ تبدیلیاں ہوئیں وہ اس زمانہ سے زائد نہیں کہ جب کشتی کا ملاح کشتی کھیتے کھیتے تھک جاتا ہے تو وہ کشتی کا پتوار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ جب وہ ہاتھ بھی تھک جاتا ہے تو پھر پتوار بدل لیتا ہے۔ برطانیہ سے امریکہ یا امریکہ سے روس کی طرف عالمگیر رہنمائی یا بین الاقوامی اثر و اقتدار کی تبدیلی کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہیں کہ ملاح نے کشتی کا پتوار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ ناخدا کی تبدیلی یا اصولِ جہازرانی کی تبدیلی یا سمتِ سفر کی تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ صرف دائیں بائیں ہاتھ کا کھیل ہے!

انسانیت کی مشکل کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ عالمگیر قیادت اور زندگی کی جہازرانی ان مجرم اور انسانیت کے خون سے رنگین ہاتھوں سے نکل کر جنہوں نے انسانیت کے قافلے کو غرق کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ان امانت دار۔ فرض شناس۔ خدا ترس۔ تجربہ کار ہاتھوں کی طرف منتقل ہو۔ جو انسانیت کی جہازرانی کے لئے روزِ ازل سے بنائے گئے ہیں۔

نتیجہ خیز اور کارآمد انقلاب صرف یہ ہے کہ دُنیا کی رہنمائی اور انسانیت کی سربراہی جاہلیت کے کیمپ سے جس میں برطانیہ۔ امریکہ۔ روس اور ان کی غاشیہ بردار مشرقی اور ایشیائی قومیں ہیں۔ اور جس کی زمامِ قیادت مترفین اور اکابر مجرمین کے ہاتھوں میں ہے منتقل ہو کر اس امت کے ہاتھوں میں آجائے جس کی قیادت انسانیت کے معلم اعظم رحمتِ عالم سیدِ ولدِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو اس دنیا کی تعمیر نو اور انسانیت کے نشاۃ ثانیہ کے لئے علم اور واضح اصول و تعلیمات رکھتی ہے اور جس کا ایمان دُنیا کو اس وقت کی جاہلیت سے بھی اسی طرح نکال سکتا ہے جس طرح اس نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے نکالا تھا۔۔۔!

نیا ایمان

لیکن اس کارِ عظیم کیلئے عالمِ اسلام کو خود تیاری اور اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے پہلی تیاری یہ ہے کہ عالمِ اسلام۔ اسلام پر نیا اور تازہ ایمان لائے۔ عالمِ اسلام کو نئے دین۔ نئے پیغمبر، نئی شریعت اور نئی تعلیم کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اسلام آفتاب کی طرح نہ کبھی پرانا تھا۔ نہ اب پرانا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت دائمی اور آخری نبوت ہے۔ آپکا دین محفوظ ہے۔ اور آپ کی تعلیمات زندہ۔ لیکن عالمِ اسلام کو بلاشبہ نئے ایمان کی ضرورت ہے۔ نئے فتنوں، نئی طاقتوں، نئی ترغیبوں، نئی دعوتوں کا مقابلہ کمزور ایمان اور مجرد رسوم و عادات سے نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بوسیدہ عمارت کسی نئے طوفان اور کسی نئے سیلاب کو برداشت نہیں کر سکتی۔ پھر داعی کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اپنی دعوت پر غیر متزلزل یقین ہو۔ اس میں ایک ایسے انسان کا جوش ہو جو کسی نئے عقیدے پر نیا ایمان لایا ہے۔ ایک ایسے انسان کا سرور اور سرخوشی ہو جس نے کوئی نیا خزانہ پالیا ہو یا نیا ملک دریافت کیا ہو۔ عالمِ اسلام اگر دُنیائے انسانیت میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے اندر نئی ایمانی روح۔ تازہ یقین اور نیا جوش و خروش پیدا کرنا ہوگا۔۔۔!

معنوی تیاری

عالمِ اسلامی کو اس مقدس فریضہ کو ادا کرنے کے لئے معنوی تیاری اور اندرونی تبدیلی کی بھی ضرورت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ عالمِ اسلام خدا ناشناس یورپ کا مقابلہ تمدن و تہذیب کے کھوکھلے مظاہر، مغربی زبانوں کی مہارت اور زندگی کے اس رنگ ڈھنگ کے اختیار کر لینے سے نہیں کر سکتا جس کو قوموں کی ترقی میں کوئی دخل نہیں۔ وہ اپنا پیغام اس روح اور معنوی طاقت کی مدد ہی سے

پہنچا سکتا ہے۔ جس میں یورپ روز بروز دیوالیہ ہوتا جا رہا ہے۔

عالم اسلام اپنے مدمقابل پر صرف اسی صورت میں غلبہ حاصل کر سکتا ہے کہ وہ اپنے حریف سے ایمان میں فائق ہو۔ زندگی کی محبت اس کے دل سے نکل چکی ہو۔ خواہشات نفسانی کے بندے سے آزاد ہو چکا ہو۔ اس کے افراد شہادت کے حریص ہوں۔ جنت کا شوق اُن کے دل میں چٹکیاں لیتا ہو۔ دُنیا کا فانی مال و متاع ان کی نگاہ میں وقعت نہ رکھتا ہو۔ اللہ کے راستے کی تکلیفیں اور مصیبتیں وہ ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوں۔

درحقیقت ایک خدا ناشناس منکر آخرت کے مقابلہ میں مومن کا یہی امتیاز ہے اور اسی بنا پر اس سے یہ توقع کی گئی ہے کہ اس میں برداشت کی طاقت زیادہ ہوگی۔ قرآن مجید میں ہے:۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ
كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُونَ۔ (النساء ع ۱۵)

اور مخالف قوم کے تعاقب میں ہمت نہ ہارو۔ اگر تمہیں دُکھ پہنچتا ہے تو اُن کو بھی دُکھ پہنچتا ہے۔ جیسے تم کو پہنچتا ہے اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو جن کی وہ امید نہیں رکھتے۔

واقعہ یہ ہے کہ مومن کی طاقت اور اس کے فتح و غلبہ کا راز یہ ہے کہ ان کو آخرت کا یقین اور اللہ کے اجر و ثواب کی امید ہوتی ہے۔ اگر عالم اسلامی کے سامنے بھی تمام تر وہی دُنیاوی مقاصد اور مادی منافع ہیں اور وہ بھی محض محسوسات و مادیات کے طلسم میں گرفتار ہے تو یورپ کو اپنی مادی طاقت، صدیوں کی تیاری اور وسیع ساز و سامان کی بنا پر غلبہ اور اقتدار کا زیادہ حق ہے!

عالم اسلامی پر ایک طویل دَور ایسا گزرا ہے کہ اس کو اس معنوی طاقت کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ نہ اس کو اس کی حفاظت کی فکر تھی۔ نہ وہ اس کو غذا پہنچانے کی طرف متوجہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سوتے خشک ہوتے چلے گئے۔ اور تیزی سے ان میں انحطاط واقع ہوا۔ اسی عرصہ میں عالم اسلامی کو مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں ایسے معرکے پیش آئے۔ جن میں اس کو ایمان بالغیب، صبر و تحمل اور ثبات و استقامت کی ضرورت بشدت محسوس ہوئی اور جو ان صفات کے بغیر جیتے نہیں جا سکتے تھے۔ جب اسلامی طاقتوں کو دھکا لگا اور انہوں نے اس معنوی طاقت کا سہارا لینا چاہا۔ جس کی جگہ مسلمانوں کے دل تھے۔ تو اُن کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ یہ طاقت عرصہ ہوا گم ہو چکی ہے۔ اور دل کی انگیٹھیاں سرد ہو چکی ہیں۔ اس وقت عالم اسلامی کو یہ محسوس ہوا کہ اس نے اس روحانی طاقت کی ناقدری کر کے اور اس سے غفلت برت کر اپنے اُوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ اس وقت اس نے اپنے ذخیرے کا جائزہ لیا۔ تو اس کو کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جو اس خلا کو پُر کر سکے اور اس نقصان کی تلافی کر سکے!

اسی عرصہ میں عالم اسلامی کو ایسے معرکے بھی پیش آئے جن میں اسلام کی عزت و حرمت کا سوال تھا۔ اس کو خیال تھا کہ تمام عالم کے مسلمانوں میں قیامت برپا ہو جائے گی اور وہ اسلام کی طرف سے مدافعت، مقامات مقدسہ کی حفاظت اور دینی جوش و حمیت میں از خود رفتہ ہو جائیں گے اور تمام اسلامی ممالک میں آگ سی لگ جائے گی۔ لیکن عالم اسلام پر ان واقعات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ زندگی کے کام بدستور ہوتے رہے۔ کہیں کہیں سے کچھ آواز بلند ہوئی اور خاموش ہو گئی۔ اور پھر دُنیا اپنے کام میں لگ گئی۔ اس وقت عالم اسلام کے مفکرین اور اہل نظر کو معلوم ہوا کہ دینی حمیت اور اسلامی احساس کمزور پڑ چکا ہے۔ اور ایمان کا شعلہ اگر پورے طور پر بجھا نہیں تو بہت دب گیا ہے۔ اس وقت دوسروں کو بھی عالم اسلام کی یہ کمزوری معلوم ہوئی اور اندرونی انحطاط اور اضمحلال کا احساس ہوا۔ اور اس کا وہ رعب جاتا رہا جو اس کی مجاہدانہ تاریخ پڑھ پڑھ کر دل و دماغ پر پڑتا تھا۔

آج عالم اسلامی کے قائدین و مفکرین اور اس کی جماعتوں اور حکومتوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کا تخم

دوبارہ پیدا ہونے کی کوشش کریں۔ جذبۂ دینی کو پھر متحرک کریں۔ اور پہلی اسلامی دعوت کے اصول و طریق کار کے مطابق مسلمانوں کو ایمان کی دعوت دیں۔ اور اللہ، رسول اور آخرت کے عقیدے کی پوری طاقت کیساتھ دوبارہ تبلیغ و تلقین کریں۔ اس کے لئے وہ سب طریقے استعمال کریں جو اسلام کے ابتدائی داعیوں نے اختیار کئے تھے۔ نیز وہ تمام وسائل اور طاقتیں کام میں لائیں جو عصر جدید نے پیدا کر دی ہیں۔

قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ابدی زندگی اور طاقت کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے عالم اسلام کی خشک رگوں میں زندگی کا گرم اور تازہ خون پھر دوڑ سکتا ہے۔ ان کے مطالعہ اور اثر سے اس جاہل دنیا کے خلاف جد و جہد کا جذبہ ابھرتا ہے اور ان کی تاثیر سے ایک اونگھتی سوتی قوم ایک پُرجوش، بے چین اور سرگرم عمل قوم بن جاتی ہے۔ ان کے اثر سے (اگر ان کو اثر کرنے کا موقع دیا جائے) پھر ایک بار ایمان اور نفاق، یقین اور شک، وقتی فائدہ اور مستحکم عقائد، موقع پرست ذہنیت اور حق پرست ضمیر، عقل مصلحت بیں اور عشق مصلحت سوز کے درمیان پھر معرکہ کارزار گرم ہوتا ہے۔ پھر جسمانی راحت اور قلب کے سکون، تن آسانی کی زندگی اور شہادت کی موت کے درمیان کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ وہ مبارک کش مکش جو ہر پیغمبر نے اپنے اپنے وقت میں پیدا کی تھی۔ اور جس کے بغیر حق و باطل کا فیصلہ اور اس دنیا کی اصلاح و انقلاب کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس وقت عالم اسلامی کے گوشے گوشے اور مسلمانوں کے ایک ایک گھر اور ایک ایک خاندان میں ایسے صاحب ایمان نوجوان پیدا ہوں گے جن کی تعریف قرآن مجید میں اس طرح کی گئی ہے:-

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ
إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ
إِلَٰهًا لَّقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا ۔　　(الکہف ع ۲)

وہ لوگ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے جب کہ وہ (دین میں) پختہ ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی ہی بیجا بات کہی ؛

اس وقت پھر دنیا میں ایک بار بلالؓ و عمارؓ، خبابؓ و خبیبؓ، صہیبؓ و مصعب بن عمیرؓ، عثمان بن مظعونؓ اور انس بن النضرؓ کے جوش ایمانی اور ایثار و قربانی کے نمونے نگاہوں کے سامنے آئیں گے۔ جنت کی ہوائیں، دور قرن اول کے ایمانی جھونکے دوبارہ چلیں گے۔ اور ایک نیا عالم اسلام ظہور میں آئے گا۔ جس سے موجودہ عالم اسلام کو کوئی نسبت نہیں۔

موجودہ عالم اسلام کی بیماری، پریشانی اور بے اطمینانی نہیں ہے۔ بلکہ حد سے بڑھا ہوا اطمینان و سکون، دنیا کی زندگی پر قناعت اور حالات سے مصالحت ہے۔ آج دنیا کا عالمگیر فساد اور انسانیت کا زوال اور ماحول کی خرابی اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں پیدا کرتی۔ اس کو زندگی کے اس نقشہ میں کوئی چیز غلط اور بے محل نظر نہیں آتی۔ اس کی نظر اپنے ذاتی مسائل اور مادی فوائد سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کی موجودہ افسردگی اور مُردہ دلی کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کا پہلو خلش سے اور اس کا دل تپش سے خالی ہے ؎

طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

اس لئے ضرورت ہے کہ یہ مبارک کش مکش پھر پیدا کی جائے اور اس امت کا سکون برہم کیا جائے۔ اس کو اپنی ذات اور اپنے مسائل کی فکر کے بجائے جو جاہل قوموں کا شعار ہے، انسانیت کا درد و غم، ہدایت و رحمت کی فکر اور آخرت و محاسبہ الٰہی کا خطرہ پیدا ہو۔ اس امت کی خیر خواہی

اس میں نہیں ہے کہ اس کے لئے سکون و اطمینان کی دعا کی جائے۔ بلکہ اس میں ہے کہ اس کے لئے درد و اضطراب کی دعا کی جائے اور یوں کہا جائے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!

شعور کی تربیت

کسی قوم کے لئے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ صحیح شعور سے خالی ہو۔ ایک ایسی قوم جو ہر طرح کی صلاحیت رکھتی ہو، دینی و دُنیاوی دولتوں سے مالا مال ہو لیکن اس کو نیک و بد کی تمیز نہ ہو۔ وہ اپنے دوست و دشمن کو نہ پہچانتی ہو۔ پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی اس میں صلاحیت نہ ہو۔ اپنے رہنماؤں اور قائدین کا احتساب کرنے کی اور قومی مجرموں کو سزا دینے کی اس میں جرأت نہ ہو۔ وہ خود غرض رہنماؤں کی چرب زبانی و شیریں کلامی سے مسحور ہو جاتی ہو اور ہر مرتبہ نیا دھوکا کھانے کے لئے تیار رہتی ہو۔ وہ قوم اپنی تمام دینی ترقیات اور دُنیاوی سرفرازیوں کے باوجود قابلِ اعتماد نہیں۔ وہ ہمیشہ در دِ خود غرض رہنماؤں اور منافق قائدین کا کھلونا بن جاتی ہے۔ ان کو قوم کی سادہ لوحی اور بے شعوری کی بنا پر من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع ملتا ہے اور اُن کو اس کا اطمینان ہوتا ہے کہ کبھی ان کا محاسبہ اور ان سے بازپرس نہیں کی جائے گی۔

مسلم ممالک کے متعلق اگر ہم یہ کہنے سے احتیاط کریں کہ وہ بیداری اور شعور سے بالکل محروم ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ ان کا شعور بہت کمزور ہے اور وہ بیداری کی ابتدائی منزل میں ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خیر خواہ اور بدخواہ کے ساتھ ان کا معاملہ تقریباً یکساں ہے۔ بلکہ بعض اوقات بدخواہ اور غیر مخلص اشخاص مسلمانوں میں زیادہ ہر دلعزیز اور معتمد بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:۔

"مومن سانپ کے ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا"

لیکن مسلمان ممالک کے باشندے ہزار ہزار بار ڈسے جانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان کا حافظہ نہایت کمزور ہے اور وہ اپنے قائدین اور رہنماؤں کے ماضی کو اور ماضی قریب کے واقعات کو فوراً بھول جاتے ہیں۔ ان کا دینی اور شہری شعور کمزور اور سیاسی شعور تقریباً ناپید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غالب قوموں، اور خود غرض رہنماؤں کا بازیچۂ اطفال بنے ہوئے ہیں۔ اور آسانی کے ساتھ ان کا رُخ ہر طرف موڑا جا سکتا ہے۔ حکومتیں اُن کی مرضی کے خلاف فیصلے کرتی رہتی ہیں اور جس طرف چاہتی ہیں ایک لاٹھی سے ہانکے جاتی ہیں۔

مغربی قومیں اپنے روحانی اور اخلاقی افلاس اور اُن تمام خرابیوں کے باوجود جن کی تشریح ہم نے اس سے پہلے کی ہے شہری اور سیاسی شعور کی مالک ہیں۔ وہ سیاسی بلوغ کو پہنچ چکی ہیں۔ وہ اپنے نفع و نقصان کو پہچانتی ہیں۔ مخلص و منافق۔ اہل و نااہل کے فرق کو جانتی ہیں۔ وہ اپنی نیابت ایسوں کے سپرد نہیں کرتیں جو نااہل ضعیف اور خائن ہیں۔ وہ جب اپنے معاملات کسی کے سپرد کرتی ہیں تو ڈرتے ہوئے اور احتیاط کے ساتھ۔ اور جس مرحلہ پر بھی اُن کی نااہلی یا خیانت کا اظہار ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھتی ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کر چکے اور اُن کا کام ختم ہو گیا تو ان کو وہ اپنے منصب سے سبکدوش کر دیتی ہیں اور اُن کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتی ہیں جو اُن سے زیادہ اہلیت کے مالک اور موقع کے مناسب ہوتے ہیں۔ اس موقع پر کسی رہنما یا معتمد کی سابقہ خدمات، شاندار ماضی اور کسی معرکہ میں نمایاں کامیابی اس قومی فیصلے میں حائل نہیں ہوتی۔

یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں سیاسی پیشہ وروں اور نااہل اور خائن رہنماؤں سے محفوظ ہیں۔ اُن کے سیاسی رہنما اور اُن کے نائندے بھی محتاط اور امانت دار بننے پر مجبور رہیں۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ قوم کی سرزنش، عوام کے عتاب و احتساب اور رائے عامہ کی قہرناکی سے وہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

عالمِ اسلام کی ایک بہت بڑی ضرورت اور اس کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ امت کے مختلف طبقات اور عوام میں صحیح شعور پیدا کیا جائے اور جمہور کی عقلی، مدنی اور سیاسی تربیت کی جائے۔

یاد رہے کہ تعلیم کی اشاعت اور تعلیم یافتہ اشخاص کی کثرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قوم میں شعور بھی موجود ہے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ

تعلیم کے عموم اور علوم کی اشاعت سے شعور کے بیدار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن شعور پیدا کرنے کے لئے بہرحال مستقل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ مسلمان رہنماؤں اور مسلمانوں میں اصلاحی کام کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جس قوم میں شعور کی کمی ہے۔ وہ قوم اعتماد کے لائق نہیں۔ خواہ اس کو اپنے قائدین پر کتنا ہی اعتماد ہو اور وہ ان کی پیروی اور اطاعت میں کیسی ہی چستی اور سرگرمی دکھائے اور اُن کی دعوت پر کتنی ہی عظیم قربانیاں پیش کرے۔ ایسے کہ جب تک اس کا شعور تیار نہیں اور وہ بالغ نظر اور پختہ خیال نہیں ہوئی ہر آن اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی دوسری دعوت اور تحریک کا آلۂ کار بن جائے گی۔ اور آن کی آن میں سالہا سال کی محنت پر پانی پھر جائیگا۔ جس قوم کا شعور بیدار نہیں ہوا اور جس میں خود سوچنے اور اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پَر میدان میں پڑا ہو اور مختلف سمت کی ہوائیں اس کو اِدھر سے اُدھر اڑاتی پھرتی ہوں۔

اسلام گرچہ ایک آسمانی مذہب ہے اور اس کی بنیاد وحی و نبوت پر ہے۔ لیکن اس نے بھی اپنے پیروؤں میں ایک خاص شعور پیدا کیا جو شعور کی تمام اقسام میں زیادہ عمیق، زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ گہرا ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں میں ایک خاص قسم کا طریق فکر پیدا کیا جو جاہلی طریق فکر سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو ایک بیدار اور خود دار شعور عطا کیا۔ جو اپنی وسعت اور قدرتی لچک کے باوجود ان افکار و نظریات کو انگیز نہیں کر سکتا جو اس کے مسلمات سے جوڑ نہ کھاتے ہوں۔ اور نہ اُن عناصر و اجزاء کو ہضم کرنے کے لئے تیار ہے جو اس کی رُوح اور اس کے اصول سے تضاد رکھتے ہوں۔

اس اسلامی شعور کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و صحبت سے صحابہ کرام کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ ظلم ایک قبیح شئے اور ایک دینی و اخلاقی جرم ہے۔ جو کسی کے لئے بھی جائز نہیں۔ وہ اس پر ایمان لا چکے تھے کہ مسلمان کو ہر شخص کے ساتھ انصاف کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ قریب ہو یا بعید۔ دوست ہو یا دشمن۔ اپنا ہو یا بیگانہ۔ انہوں نے جاہلانہ حمیّت اور قومی، قبائلی اور خاندانی تعصبات سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی تھی اور سمجھ لیا تھا کہ اسلام میں اس اندھے تعصب کی کوئی جگہ نہیں۔ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے خواہ حق کسی طرف ہو۔ یہ اُن کا عقیدہ بن گیا تھا اور اُن کے خمیر میں داخل ہو گیا تھا۔

ایک دن اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے وہ سنتے ہیں کہ:-

"اپنے بھائی کی مدد کرو۔ خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم"

اگر اُن کی تربیت میں ذرا بھی خامی اور اُن کے ذہن میں کچھ بھی انتشار ہوتا تو وہ خاموشی کے ساتھ اس بات کو سن لیتے اور اس قول کو اُس کے جاہلی مفہوم میں قبول کر لیتے جس کے مطابق ان کا نشو و نما ہوا تھا۔ اور ساری عمر اسی پر عمل کرنے میں گزری تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کی، کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کہتے۔ وہ سراسر وحی ہوتی ہے۔ اُن سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب کرنے والا اور آپ کی تمام باتوں کا بے چون و چرا تسلیم کرنے والا نہیں تھا۔ لیکن بایں ہمہ۔ وہ خاموش نہ رہ سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اُن کے عقیدے اور اس مشترکہ فہم سے ٹکرایا جو آپ ہی کی تعلیمات و تربیت کا نتیجہ تھا۔ اس سے اُن کے اسلامی شعور پر ایک ضرب لگی اور اُن کے دماغ کی چولیں ہل گئیں۔ وہ اپنی اس تکلیف کو چھپا نہ سکے۔ اور انہوں نے استعجاب کے ساتھ پوچھا کہ:-

"ہم مظلوم کی تو مدد کریں لیکن ظالم کی کیسے مدد کریں؟"

اس پر آنحضرت صلعم نے اپنے قول کی شرح فرمائی کہ:-

"ظالم بھائی کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا جائے اور اس کو ظلم سے باز رکھا جائے"

یہ سنتے ہی گرہ کھل گئی اور اُن کے اسلامی ذہن نے اس ارشاد کو اس طرح قبول کیا جیسے کہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہوتی ہے۔ یہ اسلامی شعور کی نزاکت اور اسلامی ذکاوت حس کی واضح مثال ہے۔

ایک دوسری مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج بھیجی اور ایک صحابی کو اس کا امیر بنایا اور ان کو امیر کی اطاعت کی تاکید فرمائی۔ ﷽ یاں یہ واقعہ پیش آیا کہ امیر اس سفر میں کسی بات پر ناراض ہو گئے جس کی وجہ سے انہوں نے آگ جلوائی اور اپنے ساتھیوں کو اس میں داخل ہونے کا حکم فرمایا۔ انہوں نے انکار کر دیا اور کہا ہم نے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع آگ سے نجات حاصل کرنے ہی کے لئے کیا تھا کیا اب اس میں داخل ہو جائیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کی تصویب کی اور فرمایا کہ:-

"اگر وہ آگ میں کود پڑتے تو کبھی نہ نکلتے"

صحابہ کرام کا یہ انکار اسی بنا پر تھا کہ وہ اس اصول پر ایمان لا چکے تھے کہ خالق کی نافرمانی کے ساتھ کسی مخلوق کی فرمانبرداری صحیح نہیں ——— لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔ حدیث شریف) اور یہ کہ اطاعت اسی وقت فرض ہے جب نیک بات کا حکم دیا جائے۔

اسلامی شعور اور اسلامی تربیت کی وجہ سے صحابہ کرام کسی غلط کام اور کسی ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ خواہ اس کا صدور خلیفۂ وقت سے کیوں نہ ہو۔ وہ اگر خلیفہ کی کوئی زیادتی دیکھتے تو برسر منبر اس کو ٹوک دینے میں اُن کو تامل نہ ہوتا۔ حضرت عمرؓ خطبہ کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ اُن کے جسم پر پورا جوڑا ہے جو زائد دو کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے اور فرماتے ہیں۔ "لوگو! سنتے نہیں۔" مسلمان کہتے ہیں "ہم نہیں سنتے"۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "کیوں؟" وہ کہتے ہیں کہ "تم نے ہم کو تو ایک ایک کپڑا تقسیم کیا اور تم پورے جوڑے میں ملبوس ہو" وہ فرماتے ہیں۔ عجلت مت کرو۔ پھر اپنے صاحبزادے عبداللہ کو آواز دیتے ہیں۔ پہلی آواز پر کوئی جواب نہیں ملتا۔ پھر فرماتے ہیں کہ اے عمر کے بیٹے عبداللہ! عبداللہ بن عمرؓ جواب دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے جس کپڑے کی تہمد باندھ رکھی ہے یہ تمہارا ہی کپڑا ہے؟ وہ اثبات میں جواب دیتے ہیں۔ اس پر مسلمان کہتے ہیں۔ "ہاں امیر المومنین اب فرمایئے ہم سب سنیں گے"۔

اس اسلامی شعور اور اسلامی تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ بنی امیہ کو اپنا شاہی اقتدار قائم رکھنے میں بڑی زحمتیں پیش آئیں۔ اسلامی روح نے بار بار اس اقتدار کے خلاف سخت احتجاج کیا اور بار بار اس عرب شاہی کے خلاف علم جہاد بلند ہوا اموی فرمانرواؤں کو اس وقت تک سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ جب تک وہ نسل ختم نہیں ہو گئی جس نے اسلامی اصولوں پر تربیت پائی تھی۔ اور جو خلافت اسلامی اور اسلام کے نظام حکومت اور طریق حکمرانی سے عشق رکھتی تھی۔ اور اس سے انحراف کو بدعت اور تحریف کا مرادف سمجھتی تھی!

آج جس چیز کو یورپ نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور ان کمزوریوں کے ساتھ جن کے ساتھ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ صرف زندہ ہی نہیں بلکہ برسر اقتدار ہے۔ وہ شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس اور سیاسی شعور ہے۔ ابھی تک انگریزوں اور امریکیوں میں ایسے لوگوں کی مثالیں شاذ و نادر ہیں جو قومی خیانت کا ارتکاب کرتے ہوں۔ یا اپنے ملک کو سستے داموں فروخت کر ڈالتے ہوں۔ یا یہ حکومت کے اسرار فاش کر دیتے ہوں۔ یا خراب و ناکارہ اسلحہ اور ذخیرہ جنگ کی خریداری کے مجرم ہوں۔

ایسی مثالیں مشرق میں عام اور یورپ میں بہت کمیاب اور تقریباً نایاب ہیں۔ یورپ کا اخلاقی بگاڑ انفرادی دائروں میں محدود ہے۔ اس کے ذمہ دار بیشک بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں۔ قوموں کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ اور بڑی بڑی قوموں کو پامال کر سکتے ہیں۔ مگر یہ اپنے ذاتی فوائد اور اغراض کے لئے نہیں بلکہ قومی و ملکی مصالح کے لئے۔ یقیناً اسلام میں ان مجرمانہ افعال کی گنجائش نہیں۔ اور بداخلاقی خواہ فرد کے ساتھ ہو۔ خواہ جماعت کے ساتھ۔ خواہ انفرادی محرکات کی بنا پر یا اجتماعی محرکات و قومی محرکات کی بنا پر۔ بداخلاقی ہی ہے۔ لیکن مغربی جو کچھ کرتا ہے ایک شعور اور اپنے مخصوص فلسفۂ اخلاق کے تحت، مشرقی جو کچھ کرتا ہے بے شعوری اور شخصی اغراض و محرکات کے ماتحت!

مسلمان ممالک کے قائدین سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کبھی اپنے کسی حقیر فائدہ یا لذت و خواہش کے ماتحت اپنے ملک کو رہن رکھ دیں۔ یا اس کا بیعنامہ کر دیں۔ یا اپنی قوم کو بھیڑ بکری کی طرح فروخت کر دیں۔ یا اپنی قوم کو کسی ایسی جنگ میں جھونک دیں جو اس کی مرضی و مصلحت کے خلاف ہو۔ اس سے

زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قوم اس کے باوجود بھی ان کی قیادت کا جھنڈا لے کر چلتی رہی ہے۔ وہ اُن کی زندگی کے نعرے لگاتے اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ یہ صورتِ حال اس کے سوا اور کس بات کی دلیل ہے کہ قوم کا ضمیر مردہ، اس کے قوائے فکر معطل اور وہ شعور کی دولت سے محروم ہے۔

بہت سے مسلمان ملک ایسے ہیں، جہاں عوام کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے، جہاں عوام صرف محنت و مشقت کے لئے اور خواص صرف عیش و عشرت کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کھلم کھلا نافرمانیاں ہوتی ہیں۔ اور انسانیت سوز افعال و جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے، شریعت کے احکام پامال کئے جاتے ہیں، لیکن نہ عوام اور جمہور مسلمین میں اس سے غم و غصہ کی کوئی لہر پیدا ہوتی ہے۔ نہ کسی قلب کو اس سے اذیت پہنچتی ہے، یہ سب درحقیقت انسانی غیرت اور اسلامی خودداری کے فقدان کا نتیجہ ہے اور نہایت خطرناک صورتِ حال ہے!

کسی انقلاب کی کوئی قیمت نہیں (خواہ ظاہری طور پر وہ ملک و قوم کے لئے کتنا ہی مفید ہو) جب تک کہ اس کی بنیاد میں کوئی پختہ عقیدہ، فکر صحیح، اور تربیت یافتہ اور عاقلانہ شعور نہ ہو، جب تک کہ رائے عامہ پورے طور پر تیار نہ ہو، اس وقت تک کسی بادشاہ کی جلاوطنی، کوئی انقلاب حکومت اور وزارت کی کوئی تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اور بالکل قابل اعتبار نہیں ہے۔ اگر قوم میں ان افعال اور اس رویہ سے نفرت نہیں ہے، تو ایک غلط شخص یا غلط جماعت کی جگہ پر دوسرا غلط شخص اور دوسری غلط جماعت آسکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ قوم کو اس کا احساس بھی نہ ہونے پائے۔ اس لئے اصل قابل اعتبار چیز یہ ہے کہ قوم کا ضمیر اور شعور اتنا بیدار ہو جائے کہ وہ کسی غلط چیز اور مجرمانہ فعل کو کسی حالت میں اور کسی شخص کے لئے بھی برداشت نہ کر سکے!

اس لئے عالمِ اسلام کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں صحیح شعور پیدا کیا جائے۔ ایسا شعور جو نہ کسی ظلم و ناانصافی کو برداشت کر سکے۔ نہ دین و اخلاق سے انحراف کو۔ جو صحیح اور غلط، خلوص اور نفاق، دوست اور دشمن اور مصلح اور مفسد کے درمیان آسانی سے تمیز کر سکے۔ مجرم اس کی ناراضگی اور عتاب سے بچ نہ سکیں اور مخلص اس کے اعتراف اور قدر شناسی سے محروم نہ رہیں۔ وہ اپنے تمدنی، سیاسی، اجتماعی اور دینی مسائل و معاملات میں ایک عاقل و بالغ انسان کی طرح غور کر سکنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جب تک یہ شعور پیدا نہ ہو، کسی اسلامی ملک و قوم کا جوش عمل، صلاحیت کار، دینی جذبات اور مذہبی زندگی کے مظاہر و مناظر کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے!

وہ عہد جس کا نقشہ الف لیلہ کے قصوں اور کہانیوں میں کھینچا گیا ہے اور "آغانی" کی تاریخ و ادب میں جس کی تصویر لی گئی ہے۔ وہ نہ اسلامی عہد تھا، نہ عقل اور منطق کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا، اس کو اسلام بھی ناقابل قبول قرار دیتا ہے اور عقل بھی اس کا انکار کرتی ہے۔ اسلام اس غیر فطری عہد کے زوال کا پیغام تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد کا نام "جاہلیت" رکھا۔ اس پر تعریض کی۔ اس کے علمبردار اور فرمانروا کسریٰ و قیصر کے خاتمہ کی خبر دی۔ یہ عہد کسی زمانہ میں اور دنیا کے کسی حصہ میں بھی زندگی کی صلاحیت اور باقی رہنے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ یہ اسی وقت باقی رہ سکتا ہے، جب لوگ حالات سے بے بس اور مجبور ہو گئے ہوں یا بیداری اور شعور کی دولت سے محروم ہو چکے ہوں اور اُن کی زندگی دم توڑ چکی ہو!

اس صورتِ حال کو عقل برداشت نہیں کر سکتی۔ کون شخص اس کو پسند کریگا کہ چند افراد کو کھانے پینے کی زیادتی کی وجہ سے تخمہ ہو جائے، اور دوسری طرف ہزاروں آدمی بھوک اور فاقہ کشی سے جاں بلب ہوں۔ کس کو یہ اچھا لگے گا کہ ایک بادشاہ اور اس کے بیٹے مال و دولت کے ساتھ مجنونوں کی طرح کھیلیں، اور لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے ایک وقت کا کھانا اور ستر پوشی کے لئے ایک کپڑا نصیب نہ ہو۔ اس پر کون راضی ہو سکتا ہے کہ ایک طبقہ جو اکثریت میں ہو۔ اس کا کام تو صرف یہ ہو کہ پیدا اور بڑھائے، زمین سے غذا پیدا کرے۔ صبح سے شام تک بیل کی طرح جتا رہے۔ اور ایک طبقہ جو انگلیوں پر گنا جاتا ہو۔ اس کا کام یہ ہو کہ اُن کی محنتوں اور عرق ریزیوں کا ثمرہ کھائے اور ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور یہ سب شکر و احسان مندی کے ایک کلمہ کے بغیر اور احساس و شعور سے بالکل خالی ہو کر۔ یہ کون گوارا کر سکتا ہے کہ اہل صنعت و حرفت، اہل عقل و خرد، ارباب کمال اور مختلف صلاحیتیں اور ذہنی طاقتیں رکھنے والے لوگ ہمیشہ تکلیف ہی اٹھاتے رہیں اور وہ لوگ عیش کریں اور رنگ رلیاں منائیں جن کو اسراف و فضول خرچی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ جو فسق و فجور میں

ڈوبے رہنے اور شراب پینے کے علاوہ کوئی کام نہیں جانتے۔ یہ کس کی نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ اہلیت رکھنے والے، ارباب دانش، امین و دیانت دار، عالی دماغ اور دقیق النظر لوگوں سے اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا جائے اور بادشاہ و امراء و رؤساء کے اردگرد خسیس النفس دنی الطبع، بے دماغ اور مجبر فروشوں کی ایک ٹولی ہو۔ جن کی سب سے بڑی فکر حصول دولت اور نفسانی خواہشات کی تسکین ہو۔ جنہوں نے اس دنیا میں چاپلوسی اور خوشامد اور بے گناہوں کے خلاف سازش کے علاوہ کوئی فن نہ سیکھا ہو اور جن کی آنکھوں کا پانی مر چکا ہو اور ان کا شعور و احساس فنا ہو گیا ہو!

یہ ایک غیر طبعی حالت ہے جس کو ایک دن بھی باقی نہ رہنا چاہئے، کہ برسوں تک! اگر تاریخ کے کسی دور میں یہ صورت حال پیدا ہوئی اور عرصہ دراز تک قائم رہی تو یہ قوم کی غفلت و لاپروائی کا نتیجہ تھی۔ یا اس کی مرضی اور پسند کے خلاف زبردستی اس کے سر تھوپی گئی اور اسلام کے ضعف اور جاہلیت کی قوت کی وجہ سے ایسا ہوا۔ لیکن جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ شعور بیدار ہوا اور قوم میں احتساب اور جائزہ کی شان پیدا ہو گئی تو یہ ساری عمارت فوراً منہدم ہو گئی!

الف لیلہ کا زمانہ گیا، اور اس کی بساط الٹ چکی۔ عالم اسلام کو اپنے نفس کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ اور اپنے کو گاڑی کے اس پہیے سے نہیں باندھنا چاہیئے جو ٹوٹ چکا ہے۔ خود غرضی، اور نفس پرستی ایک چراغ سحری ہے۔ جس کا تیل ختم ہو چکا ہے۔ اس کا فتیلہ جل کر خاک ہو گیا ہے۔ وہ بجھ جائے گا ہوا کا جھونکا آئے یا نہ آئے!

اسلام میں اس طرح کی انانیت اور خود غرضی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں شخصی برتری یا خاندانی برتری اور خود غرضی کو پیر رکھنے کی بھی جگہ نہیں جو آج بعض مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ اس میں اس وسیع اور منظم خود غرضی کی بھی کوئی جگہ نہیں۔ جو آج یورپ، امریکہ اور روس میں نظر آتی ہے۔ یورپ میں اس کی شکل ایک پارٹی اور جماعت کے اقتدار و تسلط کی ہے اور امریکہ میں سرمایہ داروں کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ روس میں وہ اس چھوٹے سے گروہ کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جو کمیونزم پر ایمان لا چکا ہے۔ وہ اکثریت پر زبردستی سے حاوی ہے۔ اور مزدوروں اور قیدیوں کے ساتھ اس سفاکی اور سنگدلی اور بے دردی کے ساتھ سلوک کرتا ہے جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی!

یہ انانیت اور خود غرضی اپنی تمام صورتوں، شکلوں کے ساتھ ختم ہو کر رہے گی۔ زخم خوردہ انسانیت اس سے سخت انتقام لے گی۔ دنیا کا مستقبل اب صرف عدل پسند، رحمدل، اعتزاز اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ چاہے خود غرضی کو تھوڑی سی اور مہلت مل جائے چاہے اس کی لگام ڈھیلی ہو جائے اور چاہے اس کو اپنی سرکشی، گمراہی، طغیانی میں گزارنے کے لئے کچھ دن اور مل جائیں!

خود غرضی اور انانیت شخصی ہو یا خاندانی، جماعتی ہو یا طبقاتی۔ قوم کی زندگی کے لئے ایک غیر طبعی چیز ہے۔ جس سے اس کو پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ نہ اسلام میں اس کی کوئی جگہ ہے۔ نہ اس بیدار سوسائٹی میں جو بلوغ اور سن رشد کو پہنچ گئی۔ مسلمانوں کے لئے اور عربوں کے لئے اور ان کے رہنماؤں اور حکمرانوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اس سے آزاد ہو جائیں۔ اور اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیں قبل اس کے کہ وہ اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے!

مشرق میں بھی اب اس کوتاہ نظری کا چل چلاؤ ہے۔ اور اس کا وقت سفر قریب ہے۔ اس کے عروج و اقبال کے تارے غروب ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ زید اور عمرو و بکر کا مسئلہ نہیں یہ ایک عہد کا مسئلہ ہے جو ختم ہو رہا ہے۔ ایک مدرسۂ فکر اور مکتب خیال کا معاملہ ہے۔ جس کا دم واپسیں ہے۔ جو ابھی تک اس کے سہارے جی رہے ہیں۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سفینہ اب ڈوبنے والا ہے!

صنعتی اور جنگی تیاری

عالم اسلامی کا کام یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ اگر اس کو اسلام کے پیغام کی اشاعت کی خواہش ہے اور وہ دنیا کی قیادت و رہنمائی کا فرض انجام دینا چاہتا ہے۔ تو اس کو اس کے لئے ہمت و قوت، ادو تربیت، صنعت و علوم، تجارت اور فن حرب میں پوری تیاری کی ضرورت ہو گی۔ اس کو زندگی کے ہر شعبہ اور اپنی ہر ضرورت میں مغرب سے مستغنی اور بے نیاز ہونا پڑے گا۔ وہ اس سطح پر ہو کہ

اپنے پہننے اور کھانے کا سامان کر سکے۔ اپنے لئے ہتھیار تیار کر سکے۔ اپنی زندگی کے معاملات کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو۔ اپنی زمین کے خزانے وہ خود برآمد کر سکے اور اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ اپنی حکومتوں کو اپنی دولت اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ چلائے۔ اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندروں میں اس کے بحری بیڑے اور جہاز شور کر رہے ہوں۔ وہ دشمن کا مقابلہ اپنے یہاں کے جنگی جہازوں، توپوں اور ہتھیاروں سے کرے۔ اس کی برآمد اس کی درآمد سے زیادہ ہو اور اس کو مغربی ممالک سے قرض لینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس کو اس کے کسی جھنڈے کے پیچھے آنا پڑے اور وہ کسی کیمپ میں شامل ہونے پر مجبور نہ ہو!

جب تک عالم اسلامی علم و سیاست، صنعت و تجارت میں مغرب کا محتاج رہیگا، مغرب اس کا خون چوستا رہیگا۔ اس کی زمین کا آب حیات نکالیگا۔ اس کا سامانِ تجارت اور مصنوعات ہر روز اس کی منڈیوں، بازاروں اور جیبوں پر چھاپہ مارا کریں گی اور اس کی ہر چیز پر ہاتھ صاف کرتی رہیں گی۔ جب تک عالم اسلامی مغرب سے قرض لیتا رہے گا، اور اپنی حکومت کا انتظام کرنے، اہم اور کلیدی عہدوں کو پُر کرنے، اپنی فوج کو ٹریننگ دینے کے لئے مغرب کے آدمیوں کا رہینِ منت رہیگا۔ وہاں کا سامانِ تجارت و صنعت منگائے گا اور اس کو اپنا اتالیق اور استاد، مربّی اور سرپرست حاکم اور سردار سمجھے گا۔ اس کے حکم اور اس کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا۔ اس وقت تک وہ مغرب سے مقابلہ کرنا تو درکنار اس سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتا۔

(ماخوذ)

> بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
> خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن کی نوید سکینت اور استعینوا بالصبر والصلٰوۃ کی دعوت صبر و استقامت نہ دی گئی ہوتی تو کیا عجب تھا کہ مصر کی ٹریجڈی اور وادیٔ نیل کے حزنیہ پر حساس مسلمانوں کے سینے فرطِ غم اور شدت اندوہ و ملال سے شق ہو جاتے! ان خونیں واقعات پر کم سے کم ماتم و بکا، سینہ کوبی اور گریبان چاک کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر اسلام نے ایسی باتیں کرنے سے ہمیں روکا ہے۔ اہل ایمان کے غم میں بھی سنجیدگی، وقار اور صبر و عزیمت کی شان پائی جاتی ہے!

کوئی شک نہیں کہ دلوں پر قیامت بیت گئی۔ غم و الم کا ایک ہلیسانی قافلہ تھا جو بے دردی کے ساتھ دلوں کو روندتا ہوا گزر گیا۔ مصر کے اندوہناک واقعات کی خبریں پڑھیں تو آنکھوں کو خراشیں اور خبریں سنیں تو کانوں کو جراحتیں ملیں۔ نہ جانے کتنے نشتر قلب و جگر میں ٹوٹ کر رہ گئے —— ان تمام اذیتوں اور دردناکیوں کے باوجود ہم نے اپنا حزن و ملال اور درد و غم اپنے خدا کے ہی حضور پیش کیا اور پریشان و بدحواس ہو کر غیروں کو ہنسنے اور خوش ہونے اور اپنوں کو اور زیادہ ملول ہونے کا موقع نہیں دیا ——!

توقع نہ تھی کہ مصر میں "اخوان المسلمین" کے مقابلہ میں "اخوان الشیاطین" اتنا زور پکڑ جائیں گے۔ کہ حوالات کی کوٹھریوں سے لے کر پھانسی کے تختے تک عقوبت و تعذیب کا ہر مرحلہ ان کے تصرف میں ہو گا اور ظلم و ستم، سفاکی و شقاوت اور درندگی میں یہ لوگ فرعون و چنگیز اور فرود و ہامان کو بھی منزلیں پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ کرنل جمال ناصر اور اس کے ہواخواہوں نے حق و صداقت کے مجاہدوں کے ساتھ جو وحشیانہ مظالم روا رکھے ہیں، اس نے حجاج اور ابن ہبیرہ کے ظالمانہ کارناموں کو گرد کر دیا ہے ——!

"اخوان المسلمین" کوئی خفیہ تحریک نہیں ہے۔ اس کے عزائم اور پروگرام سب کو معلوم ہیں۔ اس کے جلیل القدر بانی حضرت حسن البنا شہید کی زندگی سب کے سامنے ہے کہ اس مرد مجاہد نے کس قدر نامساعد ماحول میں حق کی آواز بلند کی تھی۔ اور کتنے ناموافق حالات میں دین کی طرف لوگوں کو بلایا تھا۔ ایک ایک مصری جانتا ہے کہ "اخوان" اسلام کے کس قدر جانباز خادم اور وطن کے کتنے مخلص خدمت گزار ہیں۔ اسی مقدس تحریک نے مصر، شام، عراق، سوڈان اور شرق اردن کے لاکھوں نوجوانوں کو الحاد و اشتراکیت مادہ پرستی اور مغرب زدگی کے چنگل سے چھڑا کر ایمان و یقین اور پاکبازی کے آغوش میں لا بٹھایا۔ اور بے شمار زندگیوں کا رُخ قحبہ خانوں، کلب گھروں اور ڈانسنگ ہالوں سے موڑ کر منبر و محراب اور مسجد و خانقاہ کی طرف پھیر دیا۔

فلسطین کے میدانوں میں "اخوان" نے جس سرفروشی کا مظاہرہ کیا تھا اس کے دیکھنے والے ابھی زندہ ہیں۔ مسلمانوں کے قبلۂ اول کی حفاظت اور مسجد اقصیٰ کی حرمت کے لئے ان نوجوانوں نے جو اپنا خون پیش کیا ہے۔ اس کی سرخی تل ابیب اور بیت لحم کے ذرّوں میں ابھی تک باقی ہے۔ نہر سویز کے مسئلہ میں اخوان نے جس فراست، عزیمت اور استقامت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ بھی کسی شہادت کا محتاج نہیں ہے۔ اور یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ فاروق کی جابرانہ ملوکیت کو اخوان نے اس وقت چیلنج دیا تھا جب کرنل جمال ناصر شاہ فاروق کو ادب و عجز کے ساتھ سلامی دیتا تھا ــــ اتنے اچھے، نیک، مخلص اور بلند کردار و پاکیزہ سیرت لوگوں پر مصر کی غداری، انگریزوں سے ساز باز اور اسلام سے بے وفائی کا الزام اتنا بڑا جھوٹ ہے جو اس زمین کے اوپر دو چار بار ہی بولا گیا ہوگا۔ یہ ایسی ہی بے بنیاد تہمت اور بے سروپا الزام ہے۔ جیسے کوئی یہ کہنے لگے کہ شبنم کے قطرے باغ میں آگ لگانے کی سازش کرتے ہیں۔ سورج اندھیر پھیلا رہا ہے۔ بلبلیں اور قمریاں شپرّوں اور کھٹیریوں سے ساز باز میں مصروف ہیں۔ دودھ دینے والے جانور دودھ نہیں تیزاب دیتے ہیں اور پھولوں کی پتیاں تلوار بن کر باغ کے مالیوں کو ہلاک کر رہی ہیں۔ مصری فوجی حکومت جھوٹ بولنے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتی ــــ!

مصر کی فوجی عدالت میں "اخوان المسلمین" کے زعماء اور کارکنوں کے خلاف یہ بنایا ہوا مقدمہ جس انداز سے پیش ہوا جس طریقے پر اس کی سماعت ہوئی اور ان "بے گناہ" ملزموں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس نے عدل و انصاف کی رسوائی اور آئین و قانون کی ذلت کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ دنیا میں بے انصافیاں اور جانب داریاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن اتنی نہیں کہ بے انصافی اور مکر و سازش اتنی بے نقاب ہو جائے کہ اس کے جسم پر شرم و حیا کا ایک تار بھی باقی نہ رہے! اور پھر ستم ظریفی یہ کہ بے ضمیر قانونیوں اور بے درد جلادوں کی اس ٹولی کا نام "عدالت" (COURT) رکھا گیا۔ "عدالت" کے لفظ و معنی کی اتنی توہین اس طرح پہلے کبھی کم ہی ہوئی ہوگی! مصر میں فرعونیت بہت دن کے بعد جاگی۔ مگر حق و صداقت کو دعوتِ مبارزت دیتی ہوئی جاگی کہ اب مصر میں سچائی اور حق شناسی کا نشان بھی رہ جائے تو میں جانوں! جس کسی کے دل میں صداقت و حق پرستی کا شائبہ بھی باقی ہے اور جو کوئی اقامتِ دین کا ذرا سا بھی داعیہ اپنے اندر رکھتا ہے اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تعذیب و عقوبت کا نشانہ بنایا جائے گا، اسی طرح جس طرح فرعون نے بنی اسرائیل کے پیدا ہونے والے بچوں کو نیست و نابود کیا تھا۔!

جمال ناصر اور اس کے مددگار و ہوا خواہو! تم پر خدا کی اور اس کے فرشتوں کی پھٹکار کہ تم نے یزید، شمر اور حجاج کی روحوں کو اپنے کارناموں سے خوش کیا۔ اور اے "اخوان" کے شہیدو! تم پر خدا کی رحمت ہو کہ تمہاری استقامت، ثابت قدمی اور سرفروشی نے حسینؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ کی مقدس روحوں کو مزید مسرت پہنچائی۔ اور دم زدن میں قاہرہ کا پھانسی گھر کربلا کی مقدس سرزمین سے جا ملا! تمہیں جو کوئی "مرا ہوا" کہتا ہے۔ وہ بے شعور ہے۔ تم زندہ ہو اور اپنے رب کے پاس اس طرح زندہ ہو کہ قرب و معیت کے نعمت خانے

سے کہیں رزق دیا جاتا ہے۔ اس مادہ پرستی، غرض مندی اور تن آسانی کے دور میں جبکہ تھوڑے سے لالچ کے بدلے ضمیر تک بک جاتے ہیں اور ذرا سا دباؤ زبانوں کو گنگ اور پیشانیوں کو خم کر دیتا ہے۔ صرف اعلاء کلمۃ الحق کے لئے تمہارا پھانسی کے تختہ کی طرف جھوم جھوم کر چلنا اور مسکرا مسکرا کر جان دینا دورِ حاضر کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ تم نے حق کی شہادت زبان کے ساتھ اپنے خون سے بھی دی۔ تختۂ دار پر چڑھ کر، پھانسی پر لٹک کر، جان دے کر! اس سے بڑی سعادت اور ہو ہی کیا سکتی ہے! موت تو تمہیں ایک نہ ایک دن آنی ہی تھی مگر تمہاری اس "موت" پر ہزاروں زندگیاں قربان! تم نے اسلام و صداقت کی تاریخ کو پھر سے دہرا کر بتا دیا کہ اللہ کے وفادار بندے اور رسول اللہ کے مخلص اُمتی موت سے اس طرح کھیلا کرتے ہیں۔! تمہاری قربانیاں رائیگاں نہیں جا سکتیں۔ تمہارا خون مٹی میں مل کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ قاہرہ کی خاک سے ہزاروں عودہ، فرغلی اور یوسف طلعت انشاء اللہ پیدا ہوں گے۔ جو ظالمانہ اقتدار کے تاج و تخت کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ اور اس وقت اُن کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہو گی کہ چاہیں تو ظالموں سے انتقام لیں یا انھیں معاف کر دیں!

ان چھ شہادتوں کے بعد مصر کے فرعونوں کی آتشِ ظلم و ستم سرد نہیں ہوئی۔ وہ اور تیزی کے ساتھ بھڑک رہی ہے۔ جو "اخوان" جیل خانوں اور حوالاتوں میں ہیں، اُن کے ساتھ انتہائی دردناک مظالم کئے جا رہے ہیں۔ مصر کی اس خون جما دینے والی سردی میں انھیں بستر کے بغیر قیدیوں کے لباس میں زیرِ سما کھلے ہوئے صحن میں راتوں کو لٹانا۔ اُن کے جسموں میں ہوا بھرنا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو جائیں، ان کے سروں پر بجلی کی ٹوپیاں (ELECTRIC CAPS) رکھ کر، اُن کے جسموں کو پھونک دے کر اور رات دن مسلسل جگا کر، اقبالِ جرم پر مجبور کرنا، ان کو بیدوں اور کوڑوں سے پیٹنا! یہ تو اُن مظلوموں کی حالت ہے جو قید و بند میں ہیں۔ مگر ان کے جو متعلقین اور اہلِ خانہ جیلوں سے باہر ہیں وہ فقر و فاقہ کی مصیبتوں کا شکار ہیں! اور جن کو "اخوان" سے تعلق رکھنے یا اقامتِ دین کی تحریک سے متاثر ہونے کے جرم میں ملازمتوں سے نکالا گیا ہے۔ اُن پر روزگار کی راہیں بند کر دی گئی ہیں۔ ان بیچاروں کی واجب تنخواہیں بھی نہیں دی گئیں۔ جو دوسرے لوگ ان مظلوم خاندانوں کی تھوڑی بہت مدد کرنا چاہتے ہیں اُن کو ڈرایا اور دھمکایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کام کے لئے عورتوں کی ایک خفیہ پولیس تیار کی گئی ہے۔ جو یہ پتہ لگاتی رہتی ہے کہ "اخوان" کے کس گھرانے کی کس شخص نے مدد کی —!

مصر کے یہ خونیں حادثات اور لرزہ براندام واقعات عبرت کا سبق دے رہے ہیں کہ فوجی حکومت کتنی خوفناک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ملک کو اس "صورتِ حال" سے محفوظ رکھے۔ جہاں آئین و ضوابط تہہ کر کے رکھ دیئے جائیں۔ اور چند "بڑے آدمیوں" کی زبان ہی سب کچھ ہو۔ قانون بھی، دستور بھی، فرمان بھی اور ضابطۂ اخلاق بھی! سنگینوں اور مارشلاؤں سے کسی صالح تحریک کو کچھ دن کے لئے دبایا تو جا سکتا ہے مگر اُسے فنا نہیں کیا جا سکتا۔ دستور و قانون اور جمہوریت کے سیدھے سادے راستے کو روک کر طاقت اور جبر کا استعمال بے آئینی اور انارکی کی راہیں کھولتا ہے۔ اور اس کے "عمل" اور "ردِعمل" کا چکر مدتِ دراز تک کسی ملک کو خزاں دیدہ پتوں کی طرح آوارہ، پریشان اور منتشر رکھتا ہے!

مصر کے ان خونیں واقعات پر انگلستان کے روزناموں اور قادیانی اخباروں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا ہے۔ جیسے اُن کی دلی مراد بر آئی اور جو کچھ ہوا وہ اُن کی تمناؤں اور امیدوں کے عین مطابق تھا۔ قادیانیوں سے مسلمان اپنے زخموں پر نمک پاشی ہی کی امید رکھتے ہیں۔ ترکی کی شکست پر سارا عالمِ اسلام رنج و غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگر قادیانیوں نے خوشی کے چراغ جلائے۔ مسلمانوں کے سینہ کا ہر زخم ان مرزائیوں کے باغِ امید کا گلِ صد برگ ہوتا ہے۔ اس گروہ کو سب سے زیادہ چڑ بلکہ دشمنی اسلامی نظام سے ہے۔ کیونکہ یہ

ـک نظام اسلامی اور قادیانیت کو ایک دوسرے کا حریف سمجھتے ہیں اور چند مہینوں سے نہ جانے کس کی شہ پاکر ان لوگوں کی جرأتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ
ـم انسانی اخلاق کے حدود کا بھی ان کے اخبار اور اکابر پاس نہیں کرتے!

آج دُنیا میں تین طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ روس۔ امریکہ اور انگریز ـــ انگریز ہندوستان نکل جانے کے بعد بہت کمزور ہوگیا ہے۔ مگر
ـس کی ڈپلومیسی اب بھی سب پر بھاری ہے۔ امریکہ کے پاس ہر طرح کی طاقت ہے۔ لیکن وہ دانش و تدبیر میں انگریز سے پیچھے ہے۔ روس کے پاس طاقت
ـی ہے اور دانش و تدبیر بھی ہے۔ اصل مقابلہ امریکہ اور روس کا ہے۔ مگر انگریز بھی اپنی چالوں سے غافل نہیں ہے۔ اور جن خطوں میں اُس کا
ـر و اقتدار ہے وہاں اپنی ڈپلومیسی کے جال کے پھندوں کو وہ ڈھیلا نہیں ہونے دیتا۔ انھیں کستا ہی رہتا ہے!

دُنیا اب ان سیاسی شیشہ گروں کے ہاتھوں دو بلاکوں میں بٹ سی گئی ہے۔ چین۔ تبت۔ برما۔ ملایا۔ جنوبی ہند۔ انڈونیشیا اور بعض دُوسرے
ـلکوں تک روس کے اثرات پہنچ چکے ہیں۔ دُوسرا بلاک عرب ممالک ترکی۔ ایران اور پاکستان کا رہ جاتا ہے۔ وہاں انگریز اور امریکہ نے اپنی دوستی۔
ـداد، معاونت اور مشفقانہ سرپرستی کے دام بچھا رکھے ہیں۔

ہندوستان رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے بہت بڑا ملک ہے۔ اس لئے روس اور امریکہ دونوں طاقتیں اس پر ڈورے ڈالتی رہتی ہیں۔ لیکن
ـسی کے قابو میں نہیں آتا۔ وہ اس طوفانِ سیاست میں نمک کی ڈلی کی طرح گھل جانا نہیں چاہتا۔ بلکہ اُس کا یہ عزم ہے کہ وہ ایک محکم چٹان بن کر رہے
ـر طاقت اُس کے وزن اور انفرادیت کو محسوس کرے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے اخلاص کا یہ عالم ہے کہ وہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کی خاطر وزارتِ عظمیٰ
ـتک بڑی فراخدلی کے ساتھ چھوڑ سکتے ہیں۔ حقیقت میں ایسے مخلص رہنما ہی اپنی قوموں اور ملکوں کی تقدیر سنوارتے ہیں۔ نہ کہ وہ جو اقتدار کی کرسیوں
ـسے چمٹے رہیں چاہے ملک کا تیا پانچہ ہی کیوں نہ ہو جائے!

انگریز اور امریکہ سیاست کی غائب شطرنج کھیلنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ جس ملک کی بساطِ سیاست پر اُن کا بس چلے گا وہاں یہ اپنی مُہرے لا
ـنے اور رہنے دیں گے جو ان کے استعماری مقاصد کے لئے آسانی کے ساتھ استعمال کئے جا سکیں۔ ملک کے اونچے طبقہ کی توانائیوں، صلاحیتوں
ـر ذہانتوں کو ایک دُوسرے کو گرانے اور بچھانے کی کوشش میں اُلجھائے رکھنا ان مغربی طاقتوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے!

مصر میں انگریز نے محسوس کیا کہ "اخوان المسلمین" ایک فعال جماعت ہے جو روز بروز قوت پکڑتی جا رہی ہے۔ اس کے اثرات مصر ہی تک محدود
ـنہیں رہے، شام۔ عراق، سوڈان، اُردن اور مراکش و الجزائر تک اس کی دعوت پھیل رہی ہے۔ یہ ایسی مذہبی جماعت بھی نہیں ہے کہ جو کافرانہ نظامِ
ـحکومت کے سایہ میں نمازیں پڑھ کر، روزے رکھ کر اور میلاد النبیؐ کے جلسے منعقد کر کے مطمئن ہو جائے کہ اسلام اللہ کے فضل اور بزرگانِ دین کی دُعاؤں
ـسے زندہ اور پائندہ ہے ـــ اس جماعت کے موسس، بانی اور مرشدِ اول کا تو یہ عقیدہ تھا:۔

"ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کے احکام دُنیوی و اخروی دونوں زندگیوں سے متعلق ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی تعلیمات
زندگی کے روحانی یا عباداتی شعبے کی حد تک ہیں اور دُوسرے شعبہ ہائے حیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے وہ سخت غلطی پر ہیں بلکہ
حقیقت یہ ہے کہ اسلام عقیدہ بھی ہے اور عبادت بھی۔ وطن بھی ہے اور نسل بھی۔ دین بھی ہے اور حکومت بھی۔ روحانیت بھی ہے اور عمل بھی۔
قرآن بھی ہے اور تلوار بھی"۔ (حسن البناء شہید)

پھر اخوان بے لچک کردار اور پاکیزہ سیرت کے حامل ہیں۔ اُن کو کسی قیمت پر بھی نہیں خریدا جا سکتا۔ یہ لوگ خانقاہی مزاج بھی نہیں رکھتے۔ ان کے
ـجوانوں نے تو فلسطین کے میدانِ جہاد میں یہودیوں سے ٹکر لی ہے اور اپنی سرفروشی، جانبازی اور پامردی کی یادگاریں قائم کر دی ہیں۔ ان کے پاس علم نہیں
ـبھی ہے، فراست اور نیکوکاری ہی نہیں جرأت اور حوصلہ بھی ہے۔ اگر یہ لوگ کہیں غالب آگئے تو برطانیہ کی "چودھراہٹ" کی خیر نہیں! "اخوان" کی
ـسرگرمیوں کو اگر یُوں ہی جاری رہنے دیا گیا تو کم سے کم عرب ممالک میں اسلام بہت جلد "قوتِ غالب" بن جائیگا اور اسلام کا غلبہ ہر باطل طاقت کیلئے

پیغام موت ہے ---!

مصر میں جمال ناصر اور اس کے ہم نواؤں اور ہوا خواہوں کی ہوس اقتدار اور فاسقانہ رجحانات ہی تنہا "اخوان" کے قتل و تباہی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ نہر سویز کے مسئلہ کی تمام اہمیت اور نزاکت بھی اس میں شریک کار ہے۔ اور سیاست افرنگ جمال ناصر سے نیکلسن اور ڈائر کا کام لے رہی ہے۔ مغرب کے یہ ارباب سیاست شعبدہ باز ہی نہیں بہت زیادہ نفسیات شناس بھی ہیں۔ انہیں جب اپنے لئے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو دکن سے صادق۔ بنگال سے جعفر۔ مصر سے جمال ناصر، شرق اردن سے امیر عبداللہ جیسے ملت فروش رہنماؤں اور "بے ضمیر بڑے آدمیوں" کو چھانٹ لیتے ہیں۔ ہزار افسوس کہ صلیبی جنگوں میں جس "عیسائیت" نے ہار مان لی تھی۔ مصر میں وہ آج اسلام سے انتقام لے رہی ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مسلمان کا ہاتھ مسلمان کے خون سے رنگا ہوا ہے!

مصر کے خونیں حادثات تمام اسلامی ممالک کے لئے خطرہ کا الارم "alaam" ہیں کہ وہ خود اپنے یہاں کی سیاست اور داخلی و خارجی معاملات کا جائزہ لیں کہ کون کیا کر رہا ہے؟ کس ملک کی سیاسیات کس رخ پر جا رہی ہے؟ اور کیوں جا رہی ہے؟ ملک میں کوئی انقلاب آتا ہے تو کیوں آتا ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ ملک کی سیاسیات باہر والوں کے دباؤ کو کس حد تک قبول کر رہی ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ کون شخصیت کیا ہے؟ اس کی پچھلی زندگی کیسی رہی ہے اور اب کیا ہے؟ اس نے ملک کا کوئی ذمہ دارانہ عہدہ صرف خدمت کے لئے قبول کیا ہے یا اس میں ہوس اقتدار بھی شامل ہے؟ وہ قوم، ملت اور ملک و حکومت کا خادم بن کر کام کر رہی ہے یا "مخدوم" بن کر! اس کا ذاتی کردار کیسا ہے اور اس کے اجتماعی رجحانات کیا ہیں؟

اسی طرح ملک کی دینی جماعتوں کو جانچا جائیگا کہ پچھلے دور میں کس جماعت کا کیا رول (role) رہا ہے۔ کون مخلص ہے اور کون نعرہ باز اور مفاد پرست ہے۔ ان جماعتوں کا نصب العین اور طریق کار کیا ہے؟ قوم کے پیسے وہ کس طرح صرف کرتی ہیں، دیانت اور احتیاط کیساتھ یا مسرف امیروں کی طرح؟ کس جماعت کے کارکنوں اور رہنماؤں نے کتنی اور کس قسم کی قربانی دی ہے۔ ان کے کاموں، کوششوں، جد و جہد میں اخلاص، تسلسل اور یک رنگی اور عزیمت و ثبات قدمی رہی ہے یا ان کی تگ و تاز کے محور زمانے کی ہوا کے ساتھ بدلتے رہے ہیں ---- اور جماعتوں کیساتھ کوٹ پتلون ہی کو نہیں جبہ و دستار اور عمامہ و تسبیح کو بھی پرکھا اور جانچا جائیگا کہ ان کی خلوت و جلوت کا کیا رنگ رہتا ہے؟ ان کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟ قصر دیوان سے ان "بزرگوں" کے کیسے تعلقات ہیں؟ اور کیوں ہیں؟ ان میں کون کون ہے جو درباروں میں مقرب بننے کی کوشش کرتا ہے اور کون ہے جو گروہی عصبیت میں اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ اسلام کے مفاد کو اپنے گروہ اور حلقہ کی عزت اور ناموری کی خاطر پس پشت ڈال سکتا ہے!

جو لوگ اپنی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں رکھتے، جن کا مقصد حیات شکم پروری، تن پوشی اور لطف و تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جو ہر اس کے ساتھی اور "ہر اقتدار" کے نیاز مند اور ہوا خواہ بلکہ نقارچی ہیں اور جن کی اقتدار پرستی کا یہ عالم ہے کہ کسی اسلامی ملک میں خدانخواستہ جاپانیوں کا تسلط ہو جائے تو یہ ان کو بھی "نجات دہندہ" اور "محافظ اسلام" ہی کہیں گے۔ ان سے ہم مخاطب ہیں اور نہ وہ خود ملک، ملت اور اسلام کے غم میں مبتلا ہونا چاہتے ہیں۔ ہمارے مخاطب اسلامی ممالک کے وہ افراد ہیں جو اپنے اندر ملت اور اسلام کا درد رکھتے ہیں، اور جن کو اس کا احساس بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک دن انہیں اپنے قول و عمل کا جواب بھی دینا ہے، ان لوگوں کو تمام مسائل اور ان کے عواقب کو سنجیدگی کیساتھ سوچنا ہے کہ اگر ان کے یہاں بھی "جمال ناصر" اور "صلاح سالم" پیدا ہو گئے تو اپنے ملکوں کو وہ "مصر" بننے سے کس طرح روک سکیں گے؟ غور و فکر کا یہ انداز منتقمانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ اور حالات کو بدلنے کیلئے جد و جہد، کمیونسٹوں کے طور طریق پر نہیں بلکہ اسلام کے ضابطۂ اخلاق اور کتاب و سنت کی بتائی ہوئی حدود کے اندر ہونی چاہیئے ---- !

جن لوگوں کی زندگی کا مقصد اقامت دین ہے ان کو ناروں اور مفادوں کے کھلونے دے کر نہیں بہلایا جا سکتا۔ وہ اگر اس قسم کی سودے بازی کریں گے تو اپنے خدا سے بیوفائی اور اپنے مشن سے غداری کریں گے، جو کوئی کسی عہدے، منصب اور دنیوی منفعت کے لالچ سے مصروف جد و جہد ہے تو وہ اپنے خدا کو دھوکا دے رہا ہے۔ اس خدا کو جو دلوں کے پوشیدہ ارادوں کی بھی خبر رکھتا ہے۔ اقامت دین کی جد و جہد کیلئے ایسے مخلص کارکن چاہئیں جن کے غم اور مسرت کا پیمانہ "رضائے الٰہی" کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ جن کی دوستی اور دشمنی اور صلح و جنگ صرف خدا کیلئے ہو۔ اس بلند کردار اور پاکیزہ سیرت کے لوگ جب تعداد و قطار اور روش بروش کھڑے ہو کر جد و جہد کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت ان کا ساتھ دے گی اور پھر اسلامی انقلاب کسی کے روکے رک نہ سکے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی دنیا کے کس ملک کو اس سعادت کا شرف سب سے پہلے حاصل ہوتا ہے ---- !

از ملا واحدی

نبی اور نبی کے قول و عمل کا مقام

(جناب ملا واحدی کی زیر ترتیب کتاب "حیاتِ سرورِ کائنات" کے چند ورق)

اردو زبان کی ایک کہاوت ہے۔ دلی کی پرانی عورتیں اسے بہت بولا کرتی تھیں۔ "اللہ کو دیکھا نہیں، عقل سے پہچانا"۔ عقل سے اللہ تعالیٰ ضرور پہچانا جا سکتا ہے کہ زمین و آسمان کا کارخانہ خود بخود نہیں بن گیا اور خود بخود نہیں چل رہا۔ کسی نے اسے بنایا ہے اور وہی اسے چلاتا ہے۔ اور وہ بڑا صاحبِ قدرت ہے ــــ لیکن اللہ تعالیٰ کیسا ہے۔ یہ بتانا ممکن نہیں ہے۔ بغیر دیکھے بھلا کوئی کیونکر بتا دے ــــ علیٰ ہذا نبی کو بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ نبوت کی ماہیت کو سمجھنا اور سمجھانا محال ہے۔

نبی یقیناً انسان ہوتا ہے۔ انسانوں کی طرح جنم لیتا ہے۔ انسانوں کی طرح پلتا بڑھتا ہے اور انسانوں کی طرح جیتا مرتا ہے۔ مگر اس میں عام انسانوں میں، اور اس میں بڑا فرق ہے۔ اتنا فرق کہ فرق کا اندازہ کرنا بھی ناممکن ہے۔

عام انسان تک تو سب یکساں ہوتے نہیں۔ دیوانوں اور فرزانوں، بدوں اور نیکوں، سب کو اعضا یکساں ملتے ہیں۔ لیکن روح یکساں نہیں ملتی۔ فرزانوں میں ایسا فرزانہ، اور نیکوں میں ایسا نیک ہوتا ہے کہ اس کی فرزانگی اور نیکی کے تصور سے انسانی دماغ عاجز ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰىٓ اِلَيَّ (اے رسول) کہو کہ میں تم جیسا انسان ہوں (لیکن) مجھ پر وحی آتی ہے ــــ حضور انسانوں میں شامل ہیں۔ مگر انسانوں سے ممتاز ہیں۔ کیونکہ حضور پر وحی آتی تھی۔ انسانوں میں [illegible] نہیں۔ انسانوں سے ممتاز ہیں۔

اگر کہا جاتا کہ میں تم جیسا انسان ہوں مگر تم سے زیادہ قوی ہوں۔ تم سے زیادہ عاقل ہوں۔ یا تمہارا بادشاہ اور حاکم ہوں۔ تو تصور کیا جا سکتا۔ لوگوں میں جو ممتاز ہوتے ہیں ان کا تصور ہم کر لیتے ہیں۔ ارسطو و افلاطون اور شاہ جہان و اورنگ زیب کا تصور مشکل نہیں ہے۔ لیکن جو انسانوں سے ممتاز ہو اس کا تصور اس کی صفت کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ یعنی یہی جانتے ہیں کہ نبوت کس شان کا امتیاز ہے ــــ جسے ایک شے سے واسطہ نہ پڑا ہو وہ اس شے کی ماہیت کیا جانے گا۔ آب جو کی کیفیت، اور کھانے کی لذت سونگھائے اور چکھائے بغیر نہیں بتائی جا سکتی تو وحی تو سونگھی اور چکھی بھی نہیں جا سکتی۔ لہذا ــــ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کا یقین کرنے کے ساتھ يُوحٰىٓ اِلَيَّ کی حرمت تو رکھنی چاہیئے۔ يُوحٰىٓ اِلَيَّ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور ہر نبی کو اور سب انسانوں سے اس طرح ممتاز کر دیتا ہے جس طرح انسان حیوانوں سے ممتاز ہے۔

سچ کہا ہے مسلمانوں اور خلفائے راشدین میں شاید ایک آدھ وصف مشترک نکل آئے لیکن خلفائے راشدین کی یہ مجال نہیں ہے کہ انبیاء کی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اولی الامر کو مامور من اللہ سے بھلا کیا نسبت۔ انبیاء کی نوع ہی الگ ہے۔ ع

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا!

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ یہ نبوت اللہ کا فضل ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ منصبِ نبوت محنت و کوشش، عبادت و ریاضت سے نہیں ملتا۔ نبی قوائے نبوت پیدائش کے وقت ساتھ لاتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ میں اس

وقت نبی تھا جب آدمؑ مستول آب و گل ہی تھے"۔

۔ سے محنت و کوشش اور عبادت و ریاضت کی تنقیص مت سمجھئے۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت اکتسابی شئے نہیں ہے۔ عبادت و ریاضت سے انسانیت ترقی کر سکتی ہے۔ روحانیت بڑھ سکتی ہے۔ انسان ولی بن سکتا ہے۔ لیکن نبی نہیں بن سکتا جس طرح فرشتہ نہیں بن سکتا۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ جسے چاہے جانور پیدا کردے۔ جسے چاہے انسان پیدا کردے۔ اور جسے چاہے نبی پیدا کردے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔ اللہ ہی خوب واقف ہے کہ اپنی پیام بری کا منصب کسے دے۔

انبیاء نبوت پانے سے قبل جو عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے وہ بیشک اللہ ان سے قبولیت وحی کی استعداد بڑھانے کے لئے کراتا تھا۔ مگر انبیاء کی ریاضتیں ایسی ہی ہیں جیسے انسان انسانیت کے ممکن الحصول کمالات حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرے۔ جب عام انسان اللہ کو خالق مان لینے کے بعد اللہ کے آگے جھکتا ہے اور چاہتا ہے کہ حق بندگی بجالاؤں تو نبی تو نبی ہے۔ نبی ہونے والے انسان سے زیادہ حق بندگی ادا کرنے کا احساس اور کسے ہوگا۔ المختصر نبوت عبادت و ریاضت کے صلے میں نہیں عطا کی جاتی۔ عبادت و ریاضت آثار نبوت میں سے ہے اور نبی پر لازم ہے کہ وہ عبادت و ریاضت کرے۔ عبادت و ریاضت کے لئے لازم نہیں ہے کہ اس کا کرنے والا نبی بن جائے۔ اچھا نسب، خوش شکلی، نیک طینتی، معتدل مزاجی، سنجیدگی و متانت، راست بازی، امانت داری وغیرہ بھی آثار نبوت میں ہیں۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر صحیح النسب، خوب صورت، نیک طینت، معتدل مزاج، سنجیدہ و متین، راست گفتار اور امانت دار نبی ہو۔ نبی کے محاسن قبل از بعثت اور غیر نبی کے محاسن میں کچھ نہ کچھ فرق رہ ہی جاتا ہے۔ غیر نبی ٹھوکر کھاتے ہیں اور نبی کی شان یہ ہے۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ تمہارے ساتھی (محمد رسول اللہ) نہ (کبھی) گمراہ ہوئے اور نہ (کبھی) بہکے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى۔ ان کی نگاہ صراط مستقیم سے (کبھی) نہیں ہٹی اور انہوں نے (کبھی) سرکشی نہیں کی۔

نبی قبل نبوت انتہائی صعبہ ہوتا ہے۔ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ۔ شروع سے اللہ تعالیٰ اس کی خاص نگرانی رکھتا ہے۔ اس کا دماغ غلط بات نہیں سوچتا اور اس کی آنکھ ٹیڑھا راستہ نہیں پکڑتی۔ اسے ایک روشنی دی جاتی ہے[۱]۔ جو غیر نبی کو نہیں دی جاتی اور نبوت کے بعد خواہ اسے کتنا ہی اقتدار حاصل...

---

[۱] علمائے اسلام نے اس روشنی کا نام وحی خفی رکھا ہے۔ وحی خفی کی چند مثالیں :-
پارہ عم یتساءلون کی قریباً تمام صورتیں مکی ہیں۔ لیکن یہ پارہ ترتیب میں تیسواں اور آخری پارہ ہے۔ اور سورۂ تَبَّتْ يَدَا کو بلحاظ پارے کی صرف تین سورتوں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ سے پہلے جگہ ملی ہے۔ حالانکہ تَبَّتْ يَدَا کے نزول کا زمانہ بالکل ابتدائی تھا۔ غرضکہ سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی ترتیب تنزیل کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن مجید تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہتا تھا اور حضورؐ حکم دیتے رہتے تھے کہ فلاں آیت فلاں آیت کے آگے رکھ دو۔ حضورؐ کا یہ عمل اسی روشنی یا وحی خفی کے تحت تھا۔ کیونکہ یوں ترتیب دینے کا حکم وحی جلی قرآن مجید میں نہیں ہے۔ البتہ یہ ذکر قرآن مجید میں ہے کہ محمدؐ کو اپنی طرف سے قرآن میں رد و بدل کا اختیار نہیں ہے۔ محمدؐ فقط وحی کے تابعدار ہیں۔ ارشاد ہے۔ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۤئِ نَفْسِيْ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ۔ (۲) یا ایک آیت ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ۔ یعنی ورثہ، وصیت اور قرض کی رقم ادا کرکے تقسیم ہونا چاہیئے۔ اس آیت کی رو سے وصیت مقدم ہے اور قرض موخر۔ مگر حضورؐ نے عملاً قرض کو مقدم کردیا اور وصیت کو موخر۔ اس تقدیم و تاخیر کی قرآن مجید میں ہدایت نہیں ہے۔ لیکن حضورؐ نے وحی خفی کے ذریعہ ترتیب بدل دی۔ (۳) ایک آیت ہے۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ۔ یعنی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بیوی سے رازدارانہ طور پر کوئی بات کہی (وہ اس بیوی نے اسے راز نہ رکھا) اور جب نبیؐ نے (اللہ کی ظاہر کی ہوئی) بات کا کچھ حصہ (اس بیوی سے) بیان کیا اور کچھ حصہ
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ں میں غرور و تکبر، درشت مزاجی اور جفاکاری نہیں آتی - وہ ذرا سی لغزش کرتا ہے تو فوراً ٹوک دیا جاتا ہے۔ اُسے صراطِ مستقیم سے بال برابر نہیں
ہنے نہیں دیا جاتا ۔

جس طرح حیوانوں پر نوعِ انسان کو نطق اور عقل و دماغ اور ذی اختیاری کے سبب فوقیت ہے اسی طرح انسانوں پر انبیاء نبوت کی وجہ سے فائق ہیں
نبیاء کو اللہ تعالیٰ جو دماغی توازن اور عقلی و روحانی قوت دیتا ہے وہ دُوسرے انسانوں کو نہیں دیتا - انبیاء دودھ سے وفات تک راہ راست پر
دہی قائم نہیں رہتے، اوروں کو راہ راست پر لانے کی اللہ تعالیٰ انہیں غیر معمولی قابلیت بخشتا ہے - انبیاء اچھے بُرے اور صحیح و غلط میں تمیز کرنے
حقیق صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُن کا علم وجدانی ہوتا ہے۔ وہ اچھائی بُرائی کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح انسان بھوک اور پیاس کو جانتا ہے - جس
ح انسان حرکت کرنے کے لئے ارادے اور اختیار کا محتاج ہے اسی طرح ارادے اور اختیار کو صحیح راستے پر لگانے کے لئے نبی کا ضرورت مند ہے -
ں کی رہنمائی کے بغیر محدود انسان بہیمیت کے پھندے سے چھٹکارا نہیں پا سکتا - اور اس کی ملکوتی قوت کبھی قوت پر غالب نہیں آسکتی -
اللہ کا ہر انسان قائل ہے - اللہ کے اقرار پر انسانی فطرت مجبول و مجبور ہے - کوئی اللہ کہہ کر مانتے یا خدا کہہ کر - گاڈ کہہ کر مانتے یا پرمیشور کہہ کر
اللہ کے وجود کا منکر بھی ایک طاقت کا مقر ہے - دولت اور اقتدار کے نشے میں سرشار رہ جانے والوں کو بھی کبھی نہ کبھی اللہ کا سہارا ڈھونڈنا
جاتا ہے۔ لہٰذا اسلام محض اللہ کو ماننے اور اللہ کے آگے جھکنے کا نام نہیں ہے - اسلام نام ہے اللہ کو اس طرح ماننے اور اللہ کے آگے اس طرح
جھکنے کا جس طرح اللہ کے رسولؐ نے بتایا ہے - مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَقَدْ دَخَلَ جَنَّةَ ۔ بالکل بجا سہی - مگر یہ کس کا قول ہے - محمدؐ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا - یہ قول صحیح جب ہے جب اس کے کہنے والے کو سچّا تسلیم کرلیا جائے - مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَقَدْ دَخَلَ
جَنَّةَ ۔ کا مطلب ہوا کہ محمد رسول اللہ کے قول کے مطابق اللہ کی وحدانیت کا قائل جنتی ہے - اس قول کے صحیح تسلیم کرنے میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ
وسلم کو رسول اللہ تسلیم کرنا مضمر ہے - اللہ کو واحد بھی بہت سے غیر مسلم مانتے ہیں - اللہ کو واحد ماننا اسلام کے ساتھ مختص نہیں ہے - اللہ کا

(بقیہ حاشیہ) بیان نہیں کیا۔ (جیسے جب نبیؐ نے اُن بیوی کو جتایا تو بیوی نے پوچھا آپ سے کس نے کہا، نبیؐ نے جواب دیا - یہ مجھ سے علیم و خبیر اللہ نے کہا ہے - اللہ کا
کہنا جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے قرآن میں نہیں ہے - وہ وحی خفی کے ذریعہ کہا گیا تھا - (۲) اللہ تعالیٰ نے جب بیت المقدس کی بجائے بیت الحرام کو قبلہ بنانے کا
حکم فرمایا تو بیت المقدس کے سابقہ تقرر کا ذکر ان الفاظ میں کیا کہ جس قبلہ کی طرف رُخ کرکے (تم اب تک نماز پڑھتے رہے تھے اُسے ہم نے (عارضی طور پر) صرف اس لئے (قبلہ)
مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں) (وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ (الخ) حالانکہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم قرآن میں نہیں ہے - یہ حکم بھی
وحی خفی کے ذریعہ آیا تھا - قرآن مجید میں ہے - مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۔
کسی بھی آدمی انسان اس قابل نہیں ہے کہ بجز ان تین طریقوں کے (براہ راست) اللہ سے ہمکلام ہو سکے - (۱) یا وحی آئے گی - (۲) یا پردے کے پیچھے سے بات کی جائیگی -
(۳) یا پیغام رساں (جبریل فرشتے) کو بھیجا جائیگا اور وہ اللہ کی اجازت سے اللہ کی مشیت کے مطابق وحی کریں گے - مطلب یہ نکلا کہ حضرت جبرئیلؑ ہی وحی نہیں لاتے تھے -
ان کے توسط کے بغیر بھی وحی آتی تھی - وہی وحی خفی تھی - نیز پردے کے پیچھے سے بھی ہمکلامی ہوتی تھی جیسی حضرت موسیٰؑ سے کوہ طور پر ہوئی تھی (واحدی)

ل ۔ نہیں ہے بقول چونکہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بیٹے کو ڈوبتے دیکھا تو چیخ اٹھے - الٰہی ! یہ میرا بیٹا ہے - اللہ نے
سمجھا دیا کہ بیٹا تو ہے مگر بداعمال ہے - اس لئے تمہارا اہل اور ساتھی نہیں ہے - إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ - إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامنے عصا
کے سانپ دیکھے تو ڈر گئے - اللہ نے اطمینان دلادیا - لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلٰى - حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک غریب نابینا متقی کی بات
نہ سنی - منہ پھیر لیا - ذرا تیوری چڑھائی - آیت نازل ہوگئی - عَبَسَ وَتَوَلّٰى أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمٰى - یا حضورؐ نے شہد نہ کھانے کا عہد کرلیا - آیت اُتری -
لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ - جسے اللہ نے حلال کیا ہے اُسے تم (اپنے اُوپر) کیوں حرام کرتے ہو - (واحدی)

واحد ماننا، اسلام اور بہت سے اور مذاہب میں مشترک ہے۔ مسلمان کو نامسلمان سے متمیز کرنے والا حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ماننا ہے۔ پہلے حضورؐ کو پہچانئے اور حضورؐ کی ہدایتوں کو سمجھئے۔ پھر حضورؐ کے ذریعہ اور حضورؐ کی ہدایتوں کے تحت اللہ تک پہنچئے۔

امتیازِ ما از نامِ مصطفےٰ است!

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ اے محمدؐ! کہو کہ تم اگر اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔

حضورؐ کی معرفت قرآن مجید، اللہ کا بنایا ہوا ضابطۂ حیات آیا اور حضورؐ نے اپنے قول وعمل اور رولنگز (Rulings) سے اسے سمجھایا۔ اس کی مراد متعین کی[1]۔ قرآن مجید کو حضورؐ نے لفظ بہ لفظ لکھوا دیا۔ اور حفظ کرا دیا۔ اس کی حفاظت کا یہاں تک اہتمام فرمایا کہ ایک دفعہ کہا کہ قرآن کے علاوہ مجھ سے جو کچھ اور سنو، اسے مت لکھو اور کچھ لکھ لیا ہے تو تلف کر دو۔ لا تكتبوا عني سوى القرآن ومن كتب عني شيئاً فليمحه۔ منشاء یہ تھا کہ قرآن مجید میں قرآن مجید کی توضیحیں اور تشریحیں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ قرآن کو اپنی اصلی حالت میں رہنا چاہیئے۔ توضیحوں اور تشریحوں کو لکھنے لکھانے کی حضورؐ کی موجودگی میں ضرورت بھی کیا تھی۔ چنانچہ حضورؐ کے زمانے میں یعنی تکمیلِ قرآن کے وقت تک حضورؐ کے اقوال واعمال اور رولنگز بالالتزام اور تعمیم کے ساتھ قلمبند نہیں کئے گئے۔ صحابہؓ ذاتی طور پر نوٹ کرتے رہے اور یاد رکھتے رہے۔ یاد رکھنے کے اعتبار سے عربوں کا دنیا میں کوئی جواب نہیں تھا۔ زمانہ جاہلیت کا جتنا ادبی ذخیرہ آج موجود ہے۔ سب عربوں کی یادداشت سے جمع کیا گیا ہے۔ عرب اونٹوں اور گھوڑوں کے نسب تک یاد رکھتے تھے تو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال واعمال اور رولنگز یاد رکھنے انہیں کیوں دشوار ہوتے۔ انہوں نے حضورؐ کے اقوال واعمال اور رولنگز کو ایسا یاد رکھا جو یاد رکھنے کا حق تھا۔ دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ حکمت وموعظت سے لے کر ایسی باتیں تک محفوظ ہیں کہ حضورؐ کس طرح چلتے تھے۔ کس طرح بیٹھتے تھے۔ لیٹتے تھے تو پاؤں پر پاؤں ہوتا تھا یا نہیں۔ حضورؐ کے سوا بھلا ایسے عشاق کسے مل سکتے ہیں جو اتنی معمولی معمولی باتوں کو بھی حرزِ جان بنالیں۔ اور آنکھوں والے کے لئے ان باتوں میں بھی حکمت وموعظت کے خزانے پنہاں ہیں۔

قرآن مجید مکمل اور منضبط ہو چکا اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالمِ فانی سے عالمِ باقی تشریف لے جا چکے تو احادیث کے بیان کا زیادہ موقع آیا۔ احادیث بیان حضورؐ کے زمانے میں بھی کی جاتی تھیں۔ جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے۔ کہ مجھ سے غلط بات منسوب کرنا جہنمی بننا ہے[2]۔ صحابہ جو سنتے تھے اور دیکھتے تھے وہ ایک دوسرے سے ضرور بیان کرتے تھے۔ لیکن حضورؐ کی وفات کے بعد احادیث کے بیان کی ضرورت زیادہ بڑھ گئی[3]۔ اوّل تو حضورؐ کا ذکر باعثِ تسکین تھا۔ دوم قرآن مجید کے مطالب سمجھنے کے لئے حضورؐ کی بجائے اب حضورؐ کے قول وعمل اور رولنگز سے سند لینی پڑتی تھی۔ احادیثِ رسولؐ قرآن پاک ہی کی عملی تفصیل اور قولی تفسیر ہیں۔ اور مسلمانوں کو اللہ کا حکم ہے کہ رسولؐ تمہیں جو ہدایت

---

[1] مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے ایمانوں میں ظلم کی آمیزش نہیں رکھی۔ وہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے امن ہے اور وہ راہِ ہدایت پر ہیں۔
اس آیت میں ظلم سے مراد اگر معمولی گناہ ہے تو معمولی گناہ سے باستثناء انبیاء کون نہیں کرتا۔ پھر امن کسے ملا اور راہ ہدایت کس نے پائی۔ حضورؐ نے ظلم کے معنی متعین کر دیئے۔ اور اس آیت میں ظلم کے معنی شرک بتائے۔ (ر۔ احمدی)

[2] یہ بھی صحیح ہے کہ بعض صحابہ کرام نے حضورؐ کی احادیث کو تحریری شکل میں محفوظ کیا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ حضرت ابوشاہ یمنی رضی اللہ عنہ کو خود حضورؐ نے کچھ احکام لکھوائے تھے۔ اور کتاب الصدقات لکھوا کر حضورؐ نے عمرو بن حزم انصاریؓ کو بھیجی تھی۔ (م۔ ق)

(نوٹ [3] و [4] اگلے صفحہ پر)

دیں اسے قبول کرو اور جس بات کو منع کریں اُسے چھوڑ دو۔ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ ۔ اور اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ صرف اللہ کی طرف نہیں۔ رسولؐ کی طرف بھی رجوع کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اقوال و اعمال رسولؐ پر نظر رکھے بغیر رسولؐ کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کی تعمیل کی جا سکتی ہے۔ اقوال و اعمال رسولؐ نظر انداز کر دیئے جاتے تو اسلام آدھا رہ جاتا۔ دین کی اور ہی شکل بن جاتی۔ حقیقت بے نقاب نہ ہوتی۔

خلفائے راشدین اور اکابر امت حضورؐ کی اس حدیث کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ کوئی غلط قول و عمل نہ بیان ہونے پائے۔ قال او کما قال یعنی حضورؐ نے یہ فرمایا۔ یا اس سے کچھ کم۔ یا اس سے کچھ زیادہ۔ یا اس سے ملتا جلتا احادیثؐ کے مجموعوں میں آج تک لکھا جاتا ہے۔ یہ فقرہ عہد صحابہ کی یادگار ہے۔ چونکہ قرآن مجید کی مانند احادیث کے الفاظ حفظ نہیں کئے گئے تھے۔ عموماً فقط مفہوم یاد تھا[۲] صحابہ احادیث بیان کرتے ہوئے لرزتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی زبان سے صرف "قال" نکل گیا۔ "کما قال" کہنا بھول گئے۔ بس پریشانی

(بقیہ حاشیہ ۳ و ۴ صفحہ ۲۰) حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت سلمہ بن اکوعؓ راوی ہیں کہ حضور سرور کائنات نے فرمایا: "جو شخص مجھ سے غلط بات منسوب کرے وہ جہنم کی آگ کے واسطے تیار رہے" اور فرمایا کہ مجھ سے (جو سنو اس میں سے اتنا بیان کرو جتنا بیان کرنا ناگزیر ضروری ہو) زیادہ حدیثیں نہ روایت کرتے پھرو۔ لیکن ان تہدیدوں کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نفس روایت ہی کو منع فرما دیا تھا۔ اپنے قول و عمل کو نظر انداز کرا دینے کے معنی تو یہ ہیں کہ حضورؐ کی بعثت غیر ضروری تھی۔ قرآن مجید فرشتوں کے ذریعہ ہر ہر شخص کے گھر پہنچا دیا جاتا، اور ہر ہر شخص اسے خود سوچتا سمجھتا رہتا۔ (واحدی)

۲ احادیث کو کتابی شکل میں سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے گورنر مدینہ امام ابوبکر ابن حزمؒ سے جمع کرایا تھا۔ (واحدی)

۱ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اقوال و اعمال کی تعمیل و تقلید واجب اور فرض ہے اور بعض کی تعمیل و تقلید مستحب۔ صحابہ کرام نے جو معاملہ حضورؐ کے اقوال و اعمال کے ساتھ کیا۔ وہ ہمارے لئے نمونہ ہے۔ صحابہ اُن چیزوں میں جنہیں اب دینداری کہا جاتا ہے حضورؐ کے اقوال و اعمال کی تعمیل و تقلید حرف بحرف اور قدم بہ قدم کرتے تھے۔ طابق النعل بالنعل۔ اور جنہیں اب دنیاداری کہا جاتا ہے۔ جیسے سیاست ہے یا تمدن و معاشرت ہے۔ ان چیزوں میں حرف بہ حرف اور قدم بہ قدم تعمیل و تقلید کی پابندی نہیں کرتے تھے بلکہ حضورؐ کا منشاء سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور منشاء کی پیروی کرتے تھے۔ ایسی دنیاداری بھی دین ہے۔ دنیاداری اور دینداری کے الفاظ خدا معلوم کہاں سے چل پڑے ہیں۔ مسلمان اپنے جس کام میں اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی مدنظر رکھے اس کا وہ کام دین ہے۔ دنیا کو اللہ اور رسولؐ کے احکام کے مطابق استعمال کرنا اسلام میں دنیاداری نہیں ہے، دینداری ہے۔ سیاست اور تمدن و معاشرت میں تقاضائے حالات کو پیش نظر رکھنا خود سنت اور دین ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے مسلمانوں کی عقلیں معطل نہیں کی ہیں۔ ہم اہل ہوں تو اجتہاد کا اور روایات پر جرح و قدح کا ہمیں آج بھی حق ہے۔ ہمارے پاس صرف حدیثوں کا انبار ہی نہیں ہے۔ محدثین میں جو اختلافات رہے وہ بھی محفوظ ہیں۔ اور ہر ایک کے دلائل و شواہد کے ساتھ محفوظ ہیں۔ ہم انہیں پڑھ کر اور حالات پر نظر رکھ کر نیک نیتی سے ریسرچ کریں تو کون روکتا ہے۔ جرح و قدح اس امر میں کی جا سکتی ہے کہ فلاں قول و عمل اُس ذات والاصفات کا ہو سکتا ہے یا نہیں جس پر قرآن جیسی بلند پایہ اور معیاری کتاب اُتری تھی۔ اور جس کی بابت حضرت عائشہ صدیقہؓ فرما گئی ہیں۔ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن۔ یعنی حضورؐ کا قول و عمل بالکل قرآن مجید کے مطابق تھا۔ جرح و قدح اس امر میں نہیں کی جا سکتی کہ حضورؐ کے قول و عمل اور قول و عمل کے منشاء کی تعمیل و تقلید کی جائے یا نہ کی جائے۔ (واحدی)

۲ نظم کے الفاظ یاد رہ جاتے ہیں نثر کے الفاظ یاد نہیں رہتے۔ نثر کا عموماً مفہوم یاد رہتا ہے۔ قرآن مجید ہی فقط ایک نثر ہے کہ طویل ہونے کے باوجود نو نو برس کے مسلمان بچے اسے نظم سے زیادہ آسانی کے ساتھ یاد کر لیتے ہیں۔ (واحدی)

کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گریبان کھول دیا اور رونے لگے۔ اور بالآخر "کا قال" کہا۔

ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے بیان کیا :-

"میں نے حضور سے سُنا ہے کہ تین بار آواز دینے پر بھی گھر میں سے جواب نہ آئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ جسے بلایا جا رہا ہے وہ اس وقت نہیں مل سکتا۔ اور وہاں سے چلا جانا چاہیئے۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے پوچھا۔ "جب حضورؐ نے یہ فرمایا تھا تو سننے والے تم اکیلے تھے یا کسی اور نے بھی تمہارے ساتھ سُنا تھا۔ اکیلے تھے تو تم نے اپنے اوپر اہم ذمہ داری لے لی ہے۔ میں اس کی تحقیق کروں گا۔ یا تمہیں سزا دوں گا۔ اور روایت میں کوئی اور شریک ہے تو اُسے پیش کرو۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جلیل القدر صحابی ہیں۔ لیکن ذرا سی جرأت کر کے پکڑے گئے۔ وہ گواہ نہ پیش کرتے تو یقیناً سزا پاتے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فوراً اصلاح کی کہ روایت غلط ہے۔ کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ گرم پانی سے وضو نہیں کیا جا سکتا۔ شاید حضرت ابو ہریرہ سے ہی یہ روایت مروی ہے۔ یا ممکن ہے راوی اور صحابی ہوں۔ مگر مشہور روایت ہے کہ نوحہ کرنے سے مُردے کو عذاب ہوتا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ نے سُنا تو فرمایا۔ کیا کہتے ہو، قرآن میں ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ایک کے قصور کا خمیازہ دوسرا نہیں بھگتے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ فتح مکہ نہیں، غزوہ بدر سے پہلے کے مسلمان ہیں۔ وہ نہایت برگزیدہ صحابی ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے کے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے بعد کے مسلمانوں پر فوقیت دی ہے۔ لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ اور غزوہ بدر سے پہلے کے صحابیوں کا مرتبہ تو بہت ہی بلند ہے۔ لیکن لازمی نہیں تھا کہ فتح مکہ اور غزوہ بدر سے پہلے کے تمام صحابی حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے برابر فقیہ بھی ہوتے۔

جس شخص نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو بحالت اسلام ایک نظر دیکھ لیا ہے اُس کی فضیلت کے ہم کیا غوث و قطب معترف ہیں۔ تاہم دیکھنے دیکھنے میں فرق ہے۔ جس نے حضورؐ کو دیکھا وہ اُس پر فائق ہے جس نے حضور کو نہیں دیکھا۔ لیکن دیکھنے والوں کے آپس کے امتیاز سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کل صحابی یکساں دماغ اور یکساں ذمہ دارانہ طبیعت و ذہنیت کے مالک نہیں تھے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کی بصیرت اور دقیقہ رسی کا بدوی صحابی کیسے مقابلہ کر سکتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ جیسا تفقہ اور اجتہاد کا مادہ ہر ہر صحابی میں نہیں تھا۔ حضرت عائشہؓ میں ملکہ تھا کہ جہاں قرآن مجید کے خلاف حدیث سُنی اور حضرت عائشہؓ نے آیت پڑھی۔ حضرت عائشہؓ صحابہ سے فرمایا کرتی تھیں کہ تم لوگ دروغ گو نہیں ہو لیکن تمہارے کان غلطی کر سکتے ہیں۔

غرض بے حد چھان پھٹک احادیث کے معاملہ میں کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ جب محدثین احادیث کو مدوّن کرنے بیٹھے تو امام بخاریؒ نے تو چھ لاکھ[1] و[2]

---

[1] یہ جو کہا جاتا ہے کہ امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں سے صحیح حدیثوں کا انتخاب کیا تھا، اس سے لوگ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اصل واقعہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ محدثین حدیث کو اس کی "سند" کے اعتبار سے شمار کرتے ہیں۔ مثلاً کسی حدیث کا متن تو ایک ہے مگر اس کی سندیں دس ہیں۔ تو دس ایسے متن احادیث شمار کریں گے۔ حالانکہ وہ ایک ہی حدیث ہے۔ نیز محدثین کے یہاں آثار صحابہ و تابعین کیلئے بھی حدیث ہی کا لفظ "تغلیباً" استعمال ہوتا ہے۔ چھ لاکھ احادیث میں تمام مجموعی طرق اسناد، و صحابہ کرام کے فتاویٰ بھی شامل ہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ لاکھ اقوال کے متن موجود تھے۔ علامہ حافظ ابن حجرؒ کی تصریح کے مطابق صحیح بخاری میں موقوفات و مقطوعات کے علاوہ کل احادیث نو ہزار بیاسی ہیں اور ان میں مکررات بھی شامل ہیں۔ اگر مکررات کو حذف کر دیا جائے تو اُن کی تعداد چار ہزار کے قریب رہ جاتی ہے۔ (م - ق)

[2] حدیثیں چھ لاکھ کی چھ لاکھ ریکارڈ کر لی گئی ہیں تاکہ حدیثوں میں مزید اضافہ نہ ہو۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی شدید تنبیہ کے باوجود لوگ رستے اتنے سچے جھوٹے قول و عمل حضورؐ سے منسوب کئے کہ یہی ایک وجہ حدیثوں کی تدوین کی تھی۔ تدوین سے حدیثیں وضع کرنے کا دروازہ بند ہو گیا۔ (باقی صفحہ پر)

حدیثوں میں سے پانچ لاکھ چورانوے ہزار حدیثیں سے نظر المعیار قرار دے دیں اور تجسس و تحقیق کی انتہا کر دی۔ محدثین نے آنکھیں بند کر کے روایتوں کو نہیں قبول کر لیا تھا۔ محدثین نے روایتوں کی صحت کا وہ التزام کیا کہ دوسرے تمام صحف آسمانی کی صحت کا ۔۔ رکھ سکے تھے۔

روایات کی تحقیق و تدقیق نے درایت، اسماء الرجال دو فن ایجاد کرا دیئے۔ تقریباً تیرہ ہزار اسماء اُن بزرگوں کے مع حالات جمع کر لئے گئے جنہیں حضور سرور کائنات کی ہم نشینی کا شرف حاصل رہا تھا۔[1] روایتوں کے پرکھنے (یعنی درایت) کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص کوئی واقعہ بیان کرتا وہ یا تو اس واقعہ میں خود شریک ہوتا یا شریک واقعہ تک تمام راویوں کے نام ترتیب وار بتاتا۔ پھر دیکھا جاتا کہ راوی کس قسم کے ہیں۔ ان کے چال چلن۔ اُن کے پیشے۔ اُن کا علم و فضل۔ اُن کی ثقاہت۔ اُن کی عقل۔ ایک ایک بات کو پرکھا جاتا۔ محدثین لمبے لمبے سفر کر کے راویوں کے شہروں اور قصبوں میں پہنچے۔ اور راویوں کے دیکھنے والوں سے راویوں کی بابت پوچھ گچھ کرتے۔ اور بال کی کھال نکالتے۔ ذرا سا جھکاؤ پڑ جاتا تو ساری محنت خاک میں ملا دیتے۔ اور ساری محنت پر پانی پھیر دیتے۔ جن سے پوچھ گچھ کرتے اُن کا بھی جائزہ لیا جاتا۔ مثلاً ایک صاحب تھے، جن سے پوچھ گچھ کے لئے محدث نے سفر کیا تھا۔ محدث کو معلوم ہوا کہ وہ صاحب سجدے میں ہاتھوں کی انگلیاں ملا کر نہیں رکھتے۔ محدث واپس لوٹ آئے کہ جسے نماز پڑھنے کی تمیز نہیں ہے وہ مجھے کیا بتائے گا۔ راویوں کی لڑی میں ایک شخص مشتبہ پایا جاتا تو لڑی کی لڑی توڑ دیتے تھے اور جن روایتوں سے حلال و حرام اور احکام کا تعلق ہوتا اُن کی تحقیق و تعدیل میں تو جانیں لڑا دی جاتی تھیں۔ اور خون پانی ایک کر دیا جاتا تھا۔ احتیاط بلکہ سختی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا تھا۔ جس درجہ کی روایت ہوتی تھی۔ اُسی درجہ کی شہادت طلب کرتے تھے۔[2]

امام بخاریؒ نے محمد بن اسحٰقؒ جیسے بزرگوں کی روایتیں بخاری میں نہیں لیں۔ ان کا قصور یہ تھا کہ غزوہ خیبر کے واقعات انہوں نے ایسے مسلمانوں سے سُن کر لکھ لئے تھے جو غزوے کے وقت یہودی تھے۔

امام زہریؒ، امام مالکؒ کے اُستاد کے اُستاد ہیں اور امام بخاریؒ کے اُستادوں کے اُستاد۔ ۵۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹا کر روایتیں جمع کی تھیں۔ لیکن امام بخاری نے اُن کی بھی بہت سی روایتوں کو منقطع کہہ کر ناقابل قبول قرار دے دیا۔

مسلمانوں کا محدثین کی بابت یہ عقیدہ نہیں ہے کہ وہ نبیوں کی مانند معصوم تھے، غلطی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ قطعی ممکن ہے کہ جن حدیثوں کو انہوں نے قبول نہیں کیا ہے اُن میں قبول کرنے کے لائق کوئی حدیث رہ گئی ہو اور جن حدیثوں کو انہوں نے قبول کر لیا ہے اُن میں کوئی حدیث ایسی آ گئی ہو جسے قبول نہ کرنا چاہیئے تھا۔ تاہم جتنی تحقیق و جستجو انسان کے بس کی ہے اس میں محدثین نے کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اتنی تحقیق و جستجو کے باوجود مسلمان احادیث

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) واضعین احادیث میں صرف منافق، شریر اور بدنیت لوگ ہی نہیں تھے۔ نیک نیت مسلمان بھی تھے جو بات کو قوی تر بنانے کے لئے حدیثیں گھڑ لیتے تھے اور انہیں ایسا پھیلا دیتے تھے کہ اگر کوئی تردید کرتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے تھے۔ (واحدی)

[1] جرمن مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے کہ پانچ لاکھ حضرات ہیں جن کے نام اور حالات روایات کے سلسلہ میں ضبط تحریر میں لائے گئے تھے (واحدی)

[2] بعض باتیں جنہیں شاید اس زمانے میں بالکل قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا، مثلاً ازواج مطہرات کی صحیح تاریخ ہائے وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ حضرت عائشہؓ کے عقد کے وقت کی عمر جو مشہور ہو گئی ہے اسکی وجہ بھی ممکن ہے یہی ہو کہ اس روایت کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا۔ عمر کم تھی تو کیا اور زیادہ تھی تو کیا۔ عمر کا ذکر یا عمر کا تفاوت قدیم زمانہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس پر دماغ لڑایا جاتا۔ ایک روایت ہے کہ جس وقت حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا ہے اُس وقت حضرت عمرؓ پورے ستائیس سال کے ہو چکے تھے۔ ستائیسویں سال میں تھے۔ دوسری روایت ہے کہ حضرت حفصہؓ بنت حضرت عمرؓ کا عقد حضور سرور کائنات سے ۳ھ میں ہوا یعنی جبکہ حضرت عمرؓ ۲۷+۱۳+۳ = زیادہ سے زیادہ ۴۳ برس کے تھے۔ تیسری روایت ہے کہ حضرت حفصہؓ کی عمر حضورؐ سے عقد کے وقت ۳۵ برس کی تھی۔ یعنی باپ سے صرف ۸ برس کم۔ کسی نے ایک روایت کو قبول کرتے وقت دوسری روایتوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ (واحدی)

کو قرآن کا درجہ ہرگز نہیں دیتے۔ قرآن مجید کی صحت اور احادیث کی صحیح ترین کتاب بخاری کی صحت میں فرق کرنا مسلمانوں کا ایمان ہے۔ بخاری کی تعریف میں یہ فقرہ بولا جاتا ہے۔ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ۔ قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب۔ صرف ذہنیت یہ رہنی چاہیئے کہ اللہ کے حکم کے بموجب حضورؐ سرورِ کائنات کے احکام کی تعمیل کرنی ہے۔ باقی یہ نہیں ہے کہ عربی زبان کا جو قول مل جائے اسے حضورؐ کا قول تسلیم کر لیا جائے اور جس عمل کی بابت کوئی کہدے کہ حضورؐ نے ایسا کیا تھا اُسے حضورؐ کا عمل مان لیا جائے بلکہ قرآن مجید کے زیر، زبر، پیش تک اس طرح محفوظ ہیں جس طرح حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے تھے۔ اور بخاری میں جو حدیثیں ہیں وہ حضورؐ کی مرتب کردہ نہیں ہیں امام بخاریؒ کی مرتب کردہ ہیں۔

سے کچھ روایتوں میں جو طریقۂ اظہار و بیان اور تمدن و معاشرت کے اختلاف کی وجہ سے اوٹ پٹانگ اور عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ انھیں اسی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ اور انھیں اپنے طور طریقے اور ذوق پر نہیں کسنا چاہیئے۔ بھارت اور پاکستان کے تمام صوبوں میں ہر ہر بات یکساں نہیں ملتی تو عرب تو دوسرا ملک تھا اور ہے۔ ہمارے ہاں بیٹی والوں کی طرف سے رشتہ کا پیغام نہیں جاتا۔ عرب اس تکلف کو ضروری نہیں گردانتے تھے۔ حضرت حفصہؓ بیوہ ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ سے تحریک کی کہ میری بیٹی سے عقد کرو۔

ہم اگر کسی بوڑھے مرد کے متعلق سُن پائیں کہ وہ بیوی کی موجودگی میں نہیں بیوی کے مرجانے کے بعد دوبارہ گھر بسانا چاہتا ہے تو ہنس پڑیں گے۔ بخلاف اس کے عرب اسے ناپسند کرتے تھے کہ عورت کسی بے ہاتھ رہنے دیں۔ عرب مرد عرب عورت سے براہ راست اور بے دھڑک کہہ سکتا تھا کہ "تو اپنے نفس کو میرے واسطے ہبہ کردے" ہمیں یہ الفاظ کھٹکتے ہیں حالانکہ عورت دُنیا بھر میں نکاح کے وقت مرد سے جو الفاظ کہتی ہے یا اپنے وکیل کو کہنے کی اجازت دیتی ہے اُن کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ میں اپنا نفس تیرے واسطے ہبہ کرتی ہوں۔ ایک بات کی عادت پڑ گئی ہے۔ دُوسری کی عادت نہیں پڑی۔ روایات کی کسوٹی بھی محدثین نے بتا دی ہے جو آگے ملاحظہ سے گزرے گی۔ بہرحال اسلام ساری دُنیا کو مجبور نہیں کرتا کہ عرب کے طور طریقے ضرور اختیار کئے جائیں۔ طور طریقے تو اب خود عربوں کے وہ نہیں ہیں جو چودہ سو برس قبل تھے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے زمانے کی چند غذائیں مرغوب تھیں۔ لیکن ہم آزاد ہیں کہ اپنے زمانے کی اور اپنی مرغوب غذائیں کھائیں۔ حضورؐ تہبند باندھتے تھے اور کُرتا پہنتے تھے یہی حضورؐ کے زمانے کا شریفانہ لباس تھا۔ لیکن اسلام آپ سے نہیں کہتا کہ آپ آج بھی تہبند باندھیں اور کُرتا پہنیں۔ حضورؐ سے غیر معمولی محبت ہونے کے سبب حضورؐ کی غذا اور حضورؐ کا لباس اختیار کیا جائے تو یہ دُوسری بات ہے۔ محبت کی افراط اس قسم کے مطالبے کر سکتی ہے۔ مگر اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ تمدن و معاشرت اور سیاست میں حضورؐ کے قول و عمل کی روح سمجھ لی جائے۔ حضورؐ کی مرغوب غذا کھانی مسنون نہیں ہے۔ غذا کی سادگی اور ایک وقت کئی کئی غذائیں نہ کھانا مسنون ہے۔ حضورؐ وہ لباس پہنتے تھے جو اُس زمانے کے سب مسلمانوں کا لباس تھا اور وہ لباس نہیں پہنتے تھے جو اُس زمانے کے مغروروں اور متکبروں کا لباس تھا۔ تو سنت حضورؐ کے لباس کی نقل نہیں ہے۔ سنت اُس لباس کا پہننا ہے جسے سب مسلمان پہن سکیں۔ اور جس لباس کو مغرور اور متکبر جانتے ہیں اُن کا ترک سنت ہے۔ میں پہلے بھی لکھ آیا ہوں کہ حضورؐ کے قول و عمل کی تعمیل و تقلید بعض معاملوں میں حرف بحرف اور قدم بقدم کی جاتی ہے اور بعض معاملوں میں قول و عمل کے صرف منشاء کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ تمدن و معاشرت میں بھی کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی تعمیل و تقلید حرف بحرف اور قدم بقدم کی جاتی ہے۔ مثلاً داڑھی بڑھانا اور مونچھیں ترشوانا۔ لیکن تمدن و معاشرت میں زیادہ تر تو روح عمل کو منشاء رہی کافی رہتا ہے ـــ اُوپر میں طریقۂ اظہار و بیان کا ذکر کر آیا ہوں۔ چودہ سو برس قبل کے بعض عرب راویوں کا طریقۂ اظہار و بیان ہمارے آجکل کے طریقۂ اظہار و بیان سے مختلف ضرور تھا۔ لیکن عربی میں وہ اب بھی اتنا گراں نہیں گزرتا جتنا اُردو میں گزرتا ہے۔ اور ترجمے کرنے والے چاہتے تو عربی کے مفہوم کو اپنے طریقے سے ادا کر سکتے تھے۔ چودہ سو برس قبل کیا بہت بعد کے علماء اس قسم کے فقرے لکھ جاتے ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاید قرآن کو سنت کے تابع کر دیا ہے اور سنت کو قرآن سے بڑھا دیا ہے۔ علامہ مکحول لدمشقی فرماتے ہیں۔ القرآن احوج الی السنۃ من السنۃ الی القرآن۔

(باقی ص ۲۵ پر)

بخاری اور حدیث کی پانچ اور کتابوں کے نام کے ساتھ صحیح کا لفظ لگایا جاتا ہے۔ صحیح بخاری۔ صحیح مسلم وغیرہ۔ یہ "صحیح" لفظ غلط کے مقابلہ کا صحیح نہیں ہے۔ یہ محدثین کی اصطلاح ہے۔ اصطلاح میں ظن غالب کو صحیح کہتے ہیں۔

قرآن کی ایک بات کے انکار سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ لیکن بخاری کی کسی خاص حدیث کا انکار کفر نہیں ہے۔ خود ائمہ حدیث نے آپس میں اختلاف کیا ہے۔ صحیح مسلم، صحیح ترمذی اور صحیح نسائی کے مؤلفین امام بخاری کے شاگرد ہیں۔ مگر استاد سے کہیں کہیں اختلاف کرتے ہیں۔

قرآن مجید کے بعد جس شے سے انحراف خطرناک ہے وہ اجماع امت ہے۔ جن احادیث کو اجماع کی تائید حاصل ہو گئی ہے ان میں قیل۔ قال اور چون وچرا نہیں کرنی چاہیئے۔ مثلاً قرآن مجید میں صرف اتنا حکم ہے کہ دو بہنوں سے بیک وقت نکاح نہ کیا جائے۔ حضورؐ نے پھوپی۔ بھتیجی اور خالہ بھانجی سے بھی بیک وقت نکاح کرنے کو منع فرما دیا۔ چنانچہ بالکل دو بہنوں کی طرح پھوپی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کا جمع کرنا حرام ہے ——— یا نماز کے پانچ وقتوں کا قرآن مجید میں[1] ذکر نہیں ہے۔ مگر پانچ وقت کی فرضیت سے مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہیں۔ اسے اجماع اور تواتر کی اعانت و قوت حاصل ہے۔ کہ حضورؐ نے پانچ وقت کی نمازیں فرض بتائی تھیں۔ لہٰذا اگر کہا جائے کہ نماز پانچ وقت کی فرض نہیں ہے تو احادیث کا اس نوعیت کا انکار، اسلام کا انکار سمجھا جائیگا۔ لیکن نماز ہاتھ باندھ کر پڑھنی چاہیئے یا ہاتھ چھوڑ کر۔ سینے پر ہاتھ باندھ کر پڑھنی چاہیئے یا ناف کے نیچے ہاتھ باندھ کر۔ اس نوعیت کی حدیثوں میں اختلاف کرنے سے کچھ نہیں بگڑتا۔ صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ۔ جس طرح بھی تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا اس طرح نماز پڑھو (مگر پڑھو ضرور) چنانچہ ایک طریقے کے عامل دوسرے طریقے کے عامل کو گمراہ نہیں کہتے۔

قرآن کے ماننے اور احادیث کے ماننے میں ایسا فرق سمجھئے جیسا فرق ماں کے ماں ماننے اور باپ کے باپ ماننے میں ہوتا ہے۔ ماں کا ماں ہونا یقینی ہے اور باپ کا باپ ہونا ظنی۔ لیکن ماں اور باپ کے ساتھ اولاد معاملہ اتنا یکساں کرتی ہے کہ یقین اور ظن کا فرق مٹ جاتا ہے۔ مظنونات پر عمل کرنا ہی پڑتا ہے۔ مظنونات پر عمل نہ کیا جائے تو دنیا کے کام نہ چلیں۔ ریلوں اور ہوائی جہازوں کے حادثے روز پیش آتے ہیں۔ پھر بھی لوگ یہ سمجھ کر ریلوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کئے جاتے ہیں کہ ریل اور ہوائی جہاز ہمیں بخیرو عافیت پہنچا دیں گے۔ دوا کی تاثیر ظنی ہوتی ہے اور دوا پی جاتی ہے۔ تجارت میں کامیابی ظنی ہوتی ہے اور تجارت کی جاتی ہے۔ عقد نکاح میں وکالت وشہادت ظنی ہوتی ہے مگر وکیل اور شاہد کو سچا تسلیم کیا جاتا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ظن کارفرما ہے۔ ظن پر عمل نہ ہو تو نظام عالم درہم برہم اور مختل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔
لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ۔ یعنی چار گواہ کیوں نہ لے آئے۔ حالانکہ چار گواہ بھی تو جھوٹے ہو سکتے ہیں۔ چار گواہوں کی گواہی ظنی ہے لیکن اللہ کے فرمان کی رو سے مقبول ہے اور ردہ دو ہی گواہوں کی گواہی پر ترک کر دیا جاتا ہے۔

محدثین یہ نہیں کہتے کہ یہ وہ الفاظ ہیں جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے تھے۔ ان پر ایمان لاؤ۔ یہ کہتے ہیں کہ ظن غالب ہے کہ یہ حضورؐ کے ارشادات ہیں۔ لہٰذا ان پر عمل کرو۔

کوئی حدیث قرآن مجید کے خلاف ہو، یعنی متناقض۔ تو قرآن پر عمل کیا جائے گا۔ حدیث پر نہیں۔ اور خلاف سے مراد اگر یہ ہے کہ قرآن مجید

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) قرآن سنت کا زیادہ محتاج ہے بہ سنت کو قرآن کی اتنی احتیاج نہیں ہے۔ علامہ یحییٰ بن ابی کثیر فرماتے ہیں۔ السنة قاضية على الكتاب وليس الكتاب قاضياً على السنة۔ سنت قرآن کیلئے قاضی (حکم) بھی ہے۔ قرآن سنت کے لئے قاضی نہیں ہے۔ مطلب یہ تھا کہ سنت قرآن مجید کی شارح ہے۔ قرآن سنت کا شارح نہیں ہے۔ قرآن تو متن ہے اور سنت مبیّن۔ اس مطلب کے اظہار و بیان کا جو طریقہ ان حضرات نے اختیار کیا وہ اردو میں کم از کم آجکل، رائج نہیں ہے۔ پچاس ساٹھ برس قبل تک رائج ہو تو ہو۔ (واحدی)

[1] یعنی اس صراحت ترتیب کے ساتھ ذکر نہیں ہے جو فقہی کتابوں میں پائی جاتی ہے (م۔ق)

کے اجمال کی حدیث میں تفصیل ہے یا قرآن سے زائد مضمون کا بیان ہے اور اس مضمون کی اجماع نے تائید کر دی ہے تو اس پر عمل بھی ہوگا اور اسے مانا بھی جائے گا۔ مگر یہ ماننا واجب کے درجے کا نہیں ہے۔ مثلاً اہل سنت والجماعت کے ہاں اس روایت کو اجماع کی تائید حاصل ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہؓ سے دوسری ازواج مطہرات کی نسبت زیادہ محبت کرتے تھے۔ چنانچہ اہل سنت والجماعت اسے مانتے ہیں۔ مگر یہ ماننا اہل سنت والجماعت کے ہاں جزو ایمان نہیں ہے۔ یہ نہ مانا جائے۔ جیسا کہ شیعہ حضرات نہیں مانتے۔ تو اس کے نہ ماننے سے شیعہ کافر نہیں ہو جاتے۔

بہر حال ظاہر ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید پہنچا کر خاموش نہیں بیٹھ جاتے تھے۔ صحابہ کرام کو دن رات تعلیم و تلقین کرتے رہتے تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے احسان جتایا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے تم ہی میں سے ایک رسول پیدا کیا ہے جو ہماری آیتیں تمہیں سناتا ہے۔ اور تمہارا تزکیۂ نفس کرتا ہے۔ اور تمہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔

حضورؐ کو اللہ کی طرف سے محض قرآن رسانی کا کام نہیں دیا گیا تھا۔ حضورؐ قرآن کے معلم بھی تھے۔ اور ہمیں قرآن کے سانچے میں ڈھالنا بھی حضورؐ کا فرض تھا۔ حضورؐ تیار ... کے ... مسلمانوں کے لئے نمونہ ہیں۔ نیز حضورؐ کی بابت ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔

محمدؐ جو کچھ کہتے ہیں ہوائے نفس کی بناء پر نہیں کہتے۔ اُن کی بات وحی ہوتی ہے جو اُن پر نازل کی جاتی ہے۔ اور ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ جو نبی کرنے کو کہے وہ کرو اور جس کرنے سے وہ روکے اس سے باز رہو۔ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔

کسی مومن اور مومنہ کو یہ نہیں چاہیئے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے میں کوئی فیصلہ دے دے تو (وہ اسے نہ مانیں اور) اپنے معاملے کا خود فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں۔ جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔ [1]

حضورؐ بشیر اور نذیر ہیں۔ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اور یہ بشارت اور انذار کا کام موقت نہیں تھا۔ حضورؐ کے بعد چونکہ اور کوئی نبی نہیں آئے گا حضورؐ قیامت تک کے انسانوں کے لئے بشیر و نذیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔

حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے کامل پیرو اور اقوال و اعمال رسولؐ کے بالکل مطابق عمل کرنے والے جب تک موجود رہے احادیث کی تدوین کی عام ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ حکمت و موعظت کا خزانہ سینوں میں جمع تھا۔ لیکن جب اشتباہ و نسیان کا امکان نظر آنے لگا۔ اور

---

[1] ... احکام باری تعالیٰ۔ اور محدثین کی دیدہ ریزی کے باوجود کچھ لوگ ایسے گزرے ہیں جو احادیث کو مطلق ناقابل اعتبار و استناد کہتے تھے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے ان کے رد میں مفتاح الجنة فی الاحتجاج بالسنة ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ علامہ ابن حزم اندلسی بھی اپنی کتاب الاحکام الاحکام میں انکار حدیث کا ذکر کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ انسان قرآن کو کلام اللہ مانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوت کا قائل ہو اور پھر احادیث کی حجیت سے یکسر انکار کر دے۔ یہ تعجب کی بات ہے۔ (واحدی)

عمل میں کمی پڑنے لگی تو اللہ کے چند بندے اُٹھے اور انہوں نے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کر کے حدیثوں کو محفوظ کر دیا۔ قرآن مجید اور قرآن مجید کا لفظ لفظ معجزہ ہے۔ قرآن مجید کو اوّل ہی دن سے محفوظ ہونا چاہیئے تھا۔ احادیث میں اللہ کے احکام کی تعمیل اور مشق کے اذکار ہیں۔ مشق اور پریکٹس کو قلمبند کرنا اُس وقت ضروری ہوتا ہے جب عمل میں کمی دکھائی دے۔

محدثین نے حدیثوں کے غیر معتبر ہونے کے اصول مقرر کئے ہیں۔ مثلاً :۔

۱۔ جو حدیث عقل کے خلاف ہو اور جس میں فضول باتیں ہوں۔
۲۔ جو حدیث مشاہدے اور محسوسات کے خلاف ہو۔
۳۔ جو حدیث احادیث متواتر اور مسلّمات کے خلاف ہو۔
۴۔ جو حدیث قرآن مجید کے خلاف ہو۔
۵۔ جو حدیث نبیوں کے شایان شان نہ ہو اور جس میں رکاکت ہو۔
۶۔ جو حدیث ایسی بات یا ایسے واقعہ کے متعلق ہو جسے ہر ہر شخص کو جاننا چاہیئے تھا اور اسے بیان فقط ایک شخص کرتا ہو۔
۷۔ جن حدیثوں میں سنہ اور تاریخ کے ساتھ پیشین گوئی ہو۔
۸۔ جن حدیثوں میں معمولی قصور پر سخت عذاب اور معمولی نیکی پر بڑے انعام کا ذکر ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک صحابی نے کہا: میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں مدتوں مسلسل حاضر رہا ہوں۔ میں نے حضورؐ سے نہیں سنا کہ حشرات الارض حرام ہیں۔ محدثین نے جواب دے دیا کہ آپ کے نہ سننے سے کیا ہوتا ہے۔

حضرت محمود بن الربیعؓ پانچ برس کے تھے جب حضورؐ کی وفات ہوئی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ حضورؐ نے پیار میں میرے مُنہ پر کلّی کر دی تھی۔ پانچ برس کا بچّہ اتنی بات یاد رکھ سکتا ہے۔ اور بات ایسی ہے کہ مان لینے میں نقصان نہیں ہے۔ چنانچہ مان لیا گیا۔ لیکن یہی صحابی کوئی ایسا واقعہ سنائیں جسے پانچ برس کی عمر میں سمجھنا ممکن نہ ہو۔ تو اسے نہیں مانا جائے گا۔ علیٰ ہٰذا اُن کم عمر صحابیوں کی روایات کے ساتھ بھی محدثین نے یہی معاملہ کیا ہے جن کی بابت معلوم ہے کہ وہ فقیہہ نہیں تھے۔ اُن کی کسی روایت میں اُلجھاؤ ہے اور اس سے قیاس پر ضرب پڑتی ہے تو صرف صحابی ہونا محدث کے نزدیک کافی نہیں ہوگا۔ حضورؐ کی ولادت کے زمانے کے لوگ اس وقت زندہ نہیں تھے۔ جس وقت روایتوں کا دور شروع ہوا ہے۔ لہٰذا بخاری ومسلم میں وہ روایتیں جگہ نہیں پاسکیں جو عام طور سے میلاد کی محفلوں میں بیان کی جاتی ہیں۔

ایک روایت ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ دینے سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ اور اس کی تحریر دے دی تھی جسے معاویہؓ نے لکھا تھا اور جس پر سعد بن معاذؓ کی شہادت کے دستخط تھے۔ مُلّا علی قاریؒ اس روایت کی بابت فرماتے ہیں کہ معاویہؓ اس وقت مسلمان کب تھے جو تحریر لکھتے۔ وہ تو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ اور سعدؓ بن معاذ کا غزوہ خیبر سے قبل انتقال ہو چکا تھا۔ غزوۂ خندق میں۔

مُلّا علی قاری لکھتے ہیں کہ ایسی روائتیں قطعی غلط ہیں۔ اور ایسی روائتیں بھی ناقابل قبول ہیں کہ :۔

۱۔ بینگن کھانے سے ہر مرض چلا جاتا ہے۔
۲۔ دھوپ میں رکھے رکھے پانی گرم ہو جائے تو اُس سے مت نہاؤ ورنہ برص کا مرض لگ جائیگا۔
۳۔ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔
۴۔ عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا۔

۵ - دُنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے۔

۶ - لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ایک بار کہا جاتا ہے تو اللہ ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کے منہ میں ستر زبانیں ہوتی ہیں۔ الخ۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرضکہ محدثین نے عظیم الشان کام کیا ہے۔ وہ اگر فقط اتنا ہی کر جاتے کہ جتنی روایتیں صحیح اور غلط انھیں ملی تھیں اُن کو جمع کر دیتے اور درایت و انتخاب اگلی نسل کے لئے چھوڑ دیتے تو یہی کچھ کم کام نہ تھا۔ چھ لاکھ دو سو حدیثوں کا جمع کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ غور کیجئے کہ اس قدر روایتوں کو سمیٹنے میں انہوں نے کیسی محنتِ شاقہ برداشت کی ہوگی۔ ساری روایتیں ریکارڈ کر دینے سے جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ مزید روایتیں گھڑنے کا دروازہ بند ہو گیا۔ محدثین کے اسی احسان سے مسلمان سر نہیں اٹھا سکتے۔ گویا کہ روایتیں ریکارڈ کر کے ایک ایک روایت کو تولا گیا اور ہمیں بڑی نعمت دے دی گئی۔ اللہ تعالیٰ محدثین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اُن کے ذریعہ حکمت و موعظت کا ایک خزانہ ہم تک پہنچا ہے۔

واضح رہے کہ سیرت اور مغازی لکھنے والوں کی جماعت الگ ہے اور محدثین کی جماعت الگ۔ محدثین بعض اوقات اس سے گھبراتے ہیں کہ روایت محض اس واسطے صحیح تسلیم کر لی جائے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کوئی مقرب صحابی اُس کا راوی ہے۔ اُن کے نزدیک خالی تقرب صحتِ روایت کی دلیل نہیں ہے۔ اور سیر نویس اس قسم کی روایتیں لکھ جاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مسلمان ہونے سے پہلے اپنی بہن حضرت فاطمہؓ سے سورہ حدید کی آیتیں سُنی تھیں۔ اور نہیں سوچتے کہ سورہ حدید تو مدینہ منورہ میں اُتری ہے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے اُس وقت دراصل سورہ طٰہٰ کی آیتیں پڑھی گئی تھیں۔

خلاصہ مضمون یہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اُمتیوں سے حضورؐ کے اقوال و اعمال اور رُولنگز بیان کرنے یا انھیں صحیح و غلط قرار دینے میں اگر غلطی نظر آئے تو دُوسرے اُمتی اُس پر جرح و قدح تو کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا نہ کرنا چاہیئے کہ غلطی کے امکان کو بنیاد بنا کر حضورؐ کے قول و عمل اور رُولنگز کی اہمیت ہی کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔ ایسا کرنا قرآن مجید کے احکام کی خلاف ورزی ہے۔ جو قول و عمل اور رُولنگز (Rulings) واقعی حضورؐ کے ہیں اُن کا بڑا بلند مقام ہے۔ وہ جزوِ اسلام ہیں۔

محمد ارشاد خاں

ادب اور ہم

اگر ہم اپنے ملک کے ادبی معیار کا جائزہ لیں تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہمارا ادب "برائے زندگی" تو درکنار برائے ادب بھی نہیں بلکہ "ادب برائے بے ادبی" ضرور ہے۔ اور ہم اسے بخوبی نبھا رہے ہیں۔ "ٹھنڈا گوشت"، "ٹیڑھی لکیر"، اور "سیدھی لکیر" کے مصنف ہماری ادبی دنیا کے درخشاں ستارے بنے ہوئے ہیں جو اپنے فحش ناولوں سے ہمارا مذاق "بلند" کر رہے ہیں۔ "شمع" اور اسی قسم کے دیگر رسالوں کی تعداد اشاعت اس کے "پروانوں" نے لاکھوں تک پہنچادی ہے۔ اگر ہمارا ادبی معیار یہی رہا اور ہم نے اسے درست نہ کیا تو یہ وبا آنے والی نسلوں پر کوڑھ کی بیماری کی طرح منتقل ہو جائے گی۔ ایسے اس وقت ہمیں اپنے ادب کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس گھناؤنی ادبی دنیا سے خود بھی نکل سکیں اور دوسروں کو بھی اس گندگی میں گرنے سے بچائیں ۔۔۔!

ادب اور انسان :۔

پیدائش اور موت تک کا فاصلہ تو کسی نہ کسی طرح حیوان بھی طے کر لیتا ہے۔ لیکن "انسان" (جسے خدا نے کچھ خاص قسم کی قوتیں عطا فرمائی ہیں اور اسے پیدائش سے موت تک کے فاصلے کو طے کرنے کا سلیقہ بھی بتایا ہے) کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی قوتوں سے فائدہ حاصل کرے اور زندگی کے ہر شعبہ اور کارگاہِ عمل میں اپنے کو حیوان سے بلند اور ممتاز رکھے ۔!

انسان کے ظاہر کو تو قدرت نے خود ہی حیوانات سے ممتاز بنایا ہے۔ البتہ باطن کو پاکیزہ اور بلند تر رکھنا انسان کا اپنا کام ہے ۔ اور یہ کمی صالح اخلاق سے ہی پوری ہو سکتی ہے اور صالح اخلاق پیدا کرنے میں پاکیزہ ادب مدد دیتا ہے۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ اب جبکہ تعلیم کی سہولتیں پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہیں، انسان کی اخلاقی حالت گرتی چلی جا رہی ہے۔ کیوں ؟ اس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہے !

سابقہ ہندوستانی ادب اور اس کی تقلید :۔

ہماری قوم میں ادیبوں اور شاعروں کی کمی کسی زمانے میں بھی نہیں رہی۔ لیکن پاکیزہ ادب پیش کرنے والے ادیب اور شاعر صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اکثریت نے اپنی تمام تر ذہنی کاوشوں کو "بہارِ عشق" "لذتِ عشق" اور "زہرِ عشق" پھیلانے اور بادشاہوں کی مدح کرنے میں صرف کیا ہے ۔ افسوس کہ ان کا گھولا ہوا زہر قوم "امرت" سمجھ کر پی رہی ہے۔ اس لئے کہ اسے اچھائی برائی کا شعور نہیں ہے۔ جو رطب و یابس ادیب یا شاعر کی زبان سے نکلتا ہے اسے "ادب" سمجھ کر قبول کر لیا جاتا ہے۔ لوگوں کو کپڑے، ترکاری اور خوراک کی اچھائی برائی کا شعور ہے لیکن ادب کا نہیں۔ کوئی شخص سڑا ہوا انار یا خربوزہ کھانا پسند نہ کرے گا۔ لیکن ایک گندہ افسانہ یا نظم پڑھتے ہوئے اس کے ذوق کو بالکل متلی نہ ہوگی۔ شعراء کے کلام پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر صرف حسن و محبت کے چٹخارے بیان کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور انھیں دین و دنیا کے کسی اور کام سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ یہ احساس مولانا حالی کے قلم سے ان لفظوں میں ظاہر ہوا :۔

"ہماری شاعری اب زیادہ تر دو قسم کے مضامین پر منحصر ہے۔ (۱) عشقیہ۔ (۲) مدحیہ۔ عشقیہ مضامین اکثر غزل اور مثنوی میں ہوتے ہیں اور مدحیہ مضامین زیادہ تر قصائد میں۔ سو ان دونوں صنفوں میں شاعر کا کام یہ سمجھا جا رہا ہے کہ جو مضامین قدیم سے

بندھے چلے آئے ہیں اور جو بندھے بندھے بمنزلۂ اصول مسلّم ہو گئے ہیں انہی کو بہ ادنیٰ تغیر باندھتا ہے اور ان سے سرمو تجاوز نہ کرے۔ مثلاً غزل میں ہمیشہ معشوق کو بے وفا بے مروّت۔ بے مہر۔ ظالم۔ قاتل۔ صیّاد۔ جلّاد۔ ہرجائی۔ اپنے سے نفرت کرنیوالا اوروں سے ملنے والا۔ سچی محبت پر یقین نہ لانے والا یا ناز و ادا و دیگر حرکات صبر انگیز کے سوا اور تمام ایسی برائیوں کے ساتھ اس کو موصوف کرنا جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کر سکتا ہے اور اپنے تئیں غم زدہ۔ مصیبت زدہ۔ فلک زدہ۔ ضعیف بجان۔ بدبخت۔ آوارہ۔ بدنام۔ مردود خلایق۔ آوارگی پسند۔ بدنامی کا خواہاں۔ حسن قبول سے نفور۔ خوشی اور عافیت سے کنارہ کرنے والا۔ میخوار۔ بدمست۔ مدہوش۔ خود فراموش۔ وفادار۔ جفاکش۔ کہیں آزاد طبع اور کہیں گرفتاری کا خواہاں۔ کہیں صابر اور کہیں بے قرار۔ کہیں دیوانہ اور کہیں ہوشیار۔ کہیں غیور اور کہیں چکنا گھڑا۔ رشک کا پتلا۔ رقیبوں کا دشمن۔ سارے جہان سے بدگمان۔ آسمان کا شاکی۔ زمین سے نالاں۔ زمانے کے ہاتھ تنگ۔ غرضکہ ایک عشق اور وفاداری کے سوا اپنے تئیں ان تمام صفات سے متصف کرنا جو عموماً انسان کے لئے قابل فراموش خیال کی جاتی ہیں۔ یا مثلاً آسمان اور زمانہ یا نصیب اور ستارہ کی شکایت کرنا یا زاہد و واعظ و صوفی کو لتاڑنا اور بادہ کش اور بادہ فروش اور ساقی و خمّار کی تعریف کرنا اور ان سے حسن عقیدت ظاہر کرنا۔ ایمان، اسلام و زہد و طاعت سے نفرت اور کفر و بے دینی و گناہ و معصیت سے رغبت ظاہر کرنی "

(مقدمہ شعر و شاعری)

زیادہ تر ہمارے شعراء اپنے کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات پر دلالت کریں۔ کہیں ان کی نزاکت کی تصویر کھینچتے ہیں اور کہیں ان کے چہرے کے نقوش اور خط و خال کی عکاسی فرماتے ہیں اور یہ اس قوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہے جو "پردہ" کا دعویٰ کرتی ہو۔ کیونکہ اگر عورت جس کا وہ اپنے کلام میں ذکر کرتے ہیں۔ کوئی منکوحہ یا مخطوبہ ہے تو اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنا اور اس کے کرشمۂ ناز و ادا کی تصویر کھینچنا گویا اپنے ننگ و ناموس کو اپنوں اور پرایوں سے متعارف (introduce) کرانا ہے۔ اور اگر کوئی آوارہ منش عورت ہے تو اپنی بدکاری اور بدکرداری کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے!

شعر کے بعد افسانہ کا نمبر آتا ہے۔ اگرچہ افسانہ شعر کے بعد وجود میں آیا ہے۔ لیکن افسانہ کی بنیاد بھی اسی اصول پر رکھی گئی۔ بلکہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ شعراء کے بیہودہ کلام کی زیادہ واضح طور پر افسانوی رنگ میں تشریح کر دی گئی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ پھر اشتراکی حضرات نے تو افسانہ میں عریانی اور فحاشی کا اضافہ کر کے اسے تباہی اور فحاشی کا معجون مرکب بنا دیا۔ جس نے عوام میں بیہودگی اور بداخلاقی کو رواج دیا۔ اس سلسلہ میں ان کے افسانوں کی چند مثالیں پیش کرنا ضروری تھا۔ لیکن ہمارا ذوق اور اخلاق، سے برداشت نہ کر سکیں گے۔ اس لئے ہم صرف ایک ایسے ادیب کے الفاظ درج کر دیتے ہیں جو "ترقی پسندوں" کا سرتاج مانا جاتا ہے:-

"معلوم نہیں کیوں؟ لیکن میں بہت پی رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میری آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ کہاں بمبئی کی زندگی اور کہاں نئے بنے ہوئے پاکستان میں لاہور کی زندگی۔ یوں تو میں نے فسادات کے آغاز ہی میں شیام مرحوم (فلم ایکٹر) کے ساتھ دن رات پینا شروع کر دی تھی۔ لیکن لاہور آ کر جب مجھے اس کا احساس ہوا کہ یہاں سوائے مقدموں کے اور کوئی چیز نہیں (مجھ پر فحش نگاری کے سلسلہ میں کئی مقدمے چل چکے ہیں) تو میں نے غم غلط کرنے کیلئے اور زیادہ پینا شروع کر دی "

(سعادت حسن منٹو "ڈائرکٹر" لاہور اگست ۱۹۵۲ء)

ان الفاظ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ صاحب عریاں نویسی کے کس قدر عادی ہو چکے ہیں اور اگر انھیں اس سے روکا جائے تو ان پر غم کی گھٹا میں چھا جاتی ہیں اور اس غم کو غلط کرنے کیلئے وہ اور زیادہ شراب پینے لگتے ہیں اور اگر کہیں شراب پینا ممنوع قرار دے دیا گیا تو نہ معلوم یہ صاحب اور کیا گزریں!

"ترقی پسند" اپنے آپ کو مزدوروں کا ہمدرد دکھتے ہیں اور اُن کی بھوک اور دُوسری تکلیفوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جیسے واقعی یہ اُن کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر اُن کے کیرکٹر پر نظر ڈالی جائے تو یہ بھی اپنی زندگی کسی سرمایہ دار سے کم نہیں گزارتے - ورنہ یہ پچاس پچاس روپے روزانہ کی شراب پینا کیا معنی رکھتی ہے ؟ اور سینکڑوں روپے عیاشی پر خرچ کرنے کے لئے کہاں سے آتے ہیں ؟ یہ سب مزدوروں کی حالت پر "خشک آنسو" بہاکر اور انھیں "روٹی" کا سبز باغ دکھا کر اُن کی تباہ حالی کے ساتھ مذاق کرتے ہیں - ایک مرتبہ میں ایک صاحب سے ملنے کے لئے گرانٹ ہوٹل میں گیا - جب میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو ایک بھاری سے بدن اور "اسٹالن نما" مونچھوں والا آدمی یک صوفہ پر بیٹھا بڑبڑا رہا تھا - میں سمجھا کہ شاید بخار کی شدت سے اُن پر یہ کیفیت طاری تھی - اُن صاحب سے جن سے میں ملنے گیا تھا ان حضرت کے متعلق پوچھا کہ انھیں کیا تکلیف تھی - انہوں نے بتایا کہ آپ "مولانا..... حسن..... ٭ ہیں - انھیں کوئی تکلیف نہیں - صرف شراب کے "سرور" میں یہ کیفیت طاری تھی -

جب قوم کی اپنی تحریروں سے تربیت کرنے والوں کا - کردار یہ تو ظاہر ہے کہ بداخلاقی کے جرائم کہاں کہاں سرائیت نہ کر جائیں گے - یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا اجتماعی اخلاق بہت پست اور قومی کردار بہت بودا ہے - موجودہ رائج ادب نے ہمارے لئے ادبی غنڈہ گردی در لفنگے پن کے سوا اور کوئی کردار قائم نہیں کیا - عشق بازی بھی اگر کوئی قومی کیرکٹر ہو سکتا ہے تو بس صرف اُس کی تعلیم ہمارے موجودہ ادب نے دی ہے -

اصلاح و ترقی کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک نصب العین واضح طور پر سامنے ہو - اس نصب العین کے تقاضے معلوم ہوں اور اسے حاصل کرنے کے ذرائع پاکیزہ ہوں اسے سامنے رکھ کر ہمارا ادب تخلیق پائے - اس نصب العین کے لئے راہ ہموار کرے اور کردار پیدا کرے !

ہم مسلمانوں کے لئے ہمارا قومی نصب العین اسلام کی سربلندی ہے - جسے دُوسرے لفظوں میں "اقامت دین" کہہ سکتے ہیں - شاعروں اور ادیبوں کو چاہیئے کہ وہ اسلام کے نمونے ذہنوں کے سامنے رکھ کر ایسے کردار حاصل کریں اور انھیں ادب میں درج کریں - جب ہمارے لئے اسلام کے صحیح اصول اور اسلامی کردار کے نمونے بھی تاریخ اور معاشرے میں موجود ہیں اور خدا کا کلام موجود ہے - جو ادب کا بہترین نمونہ ہے تو ہمیں چاہیئے کہ ہم صالح ادب کے فروغ میں اس سے مدد لیں - اس لئے کہ اسی میں انسانیت کی فلاح و بہبود ہے اور یہی اس بگڑے ہوئے ماحول کو سنبھالنے کا واحد ذریعہ ہے اور اسی پر ہم ایمان بھی رکھتے ہیں کہ ہماری مشکلات کا حل یہی ہے !

اس میں شک نہیں کہ بداخلاقی بے حیائی اور فواحش بے انتہا پھیل چکے ہیں - لیکن ظاہر ہے کہ بیماری اس وقت علاج کی سب سے زیادہ محتاج ہوتی ہے جب وہ سب سے زیادہ سخت حملہ ہو ، ضرورت ہے کہ ادبی اصلاح اور تعمیر نو کیلئے ادب میں نئے تعمیری ، اخلاقی رجحانات پر مشتمل ایک گروہ منظم ہو - اس سلسلہ میں حلقۂ ادب اسلامی پاکستان لاہور ترقی پسند مصنفین کے نام سے دو ادبی ادارے کام کر رہے ہیں - لیکن اس رجحان کو زیادہ پھیلانے کیلئے ضرورت ہے کہ سب ادیب ، شاعر اپنے آپ کو انہی "تعمیری" رجحانات سے وابستہ کریں -

ایسا ادب جس کا ذکر میں نے کیا ہے پروفیسر عاصی ضیائی رامپوری نے جو حلقۂ ادب اسلامی سے وابستہ ہیں ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے :-

۱ - چونکہ اسلامی تحریک میں نمایاں ترین چیز متانت اور وقار ہے اس لئے یہی بات اس ادب میں پائی جاتی ہے - یہ ادب کسی کی پگڑی نہیں اچھالتا - اور نہ کسی سے اُلٹی جنگ نکالنے کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ اصولی اختلاف کا اظہار بھی حقوق طور پر کرتا ہے - اس کا طنز بھی دل آزاری کے بجائے دل سوزی اور خلوص پر مبنی ہوتا ہے -

۲ - یہ ادب ہر طرح کے پارٹی تعصب سے آزاد ہے جس بات کو اس تحریک کے ساتھی حق سمجھتے ہیں اسے نہ صرف خود پیش کرتے ہیں بلکہ ان سے اختلاف رکھنے والے گروہوں یا افراد میں سے بھی اگر کوئی شخص وہی بات کہے تو بے تامل اسے اپنے دائرے میں جگہ دیتے ہیں -

۳ - ان ادیبوں میں سے اکثر وہ ہیں جن کو ترقی پسند ادب کے اسلوب انداز نے بہت متاثر کیا ہے - اس لئے یہ بھی اظہار حق کیلئے وہی حربے کام میں لاتے ہیں جو اُن کے حریف استعمال کر چکے ہیں یا کرتے رہتے ہیں -

۴ - ان میں پندارِ ذاتی اور جماعتی احتساب اس حد تک پایا جاتا ہے کہ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں انھیں تامل نہیں ہوتا - اور ان کے اپنے ساتھی کے قلم سے اگر کوئی غیر موزوں بات نکل جائے تو اس کو حق بجانب ٹھہرانے پر اصرار کرنے کے بجائے اس کو تنبیہ کرتے ہیں ←

٭ کہیں مولانا حسرت موہانی (مرحوم) نہ سمجھ لیجئے گا - (م-ق)

عاصی کرنالی

نعت

آپ کی بعثت سے پہلے تھا ہر منظر، ہر نقشِ دو عالم
اُجڑا اُجڑا۔ پھیکا پھیکا۔ ہلکا ہلکا۔ مدھم مدھم

حُسن کا چہرہ اُترا اُترا۔ عشق کی رنگت بدلی بدلی
دہر کا نقشہ بگڑا بگڑا۔ زیست کا مقصد مبہم مبہم

آنکھ کی پتلی سہمی سہمی۔ دل کی دھڑکن ٹھہری ٹھہری
شوق کا دریا سمٹا سمٹا۔ جوشِ خودی کے طوفاں کم کم

چاند کی کرنیں میلی میلی۔ صبح کے جلوے دُھندلے دُھندلے
کوچۂ ہستی سُونا سُونا۔ محفلِ فطرت برہم برہم

دُنیا کی ہر شے آزردہ۔ ہر چیز افسردہ، پژمردہ
تارا تارا۔ ذرّہ ذرّہ۔ موتی موتی۔ شبنم شبنم

اتنے میں مشرق کے افق سے مہرِ رسالت کی ضو اُبھری
خنداں خنداں، روشن روشن۔ افزوں افزوں محکم محکم

چاک ہوا باطل کا پردہ، اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوقًا
نورِ ہدایت، آیۂ رحمت، صلی اللہ علیہ وسلّم

صدر نشینِ محفلِ قدرت۔ سرتاجِ اقلیمِ نبوّت
نورِ ظہورِ گلشنِ ہستی۔ چشم و چراغِ خانۂ آدمؑ

مظہرِ انوارِ یزدانی۔ منزلِ معراجِ انسانی
ذاتِ مطہّر۔ عبدِ مقرّب۔ پیکرِ اقدس۔ روحِ مکرّم

آپؐ کی ہر گفتار و عمل میں تشریحِ احکامِ الٰہی
آپؐ کی صورت۔ آپ کی سیرت۔ تفسیرِ قرآنِ معظم

آپؐ نے تشریف ارزانی سے دُنیا پر احسان کیا ہے
آپؐ خدا کے خاص پیمبر، آپؐ جہاں کے محسنِ اعظم

ماہر القادری

اَلوَداعْ

الوداع اے عرب کی پاک زمیں! — تیرے ذرّے ہیں رفعتوں کے امیں
الوداع اے جہانِ ذکر و صلوٰۃ — الوداع اے مقامِ عفو و نجات
الوداع ارضِ بے زراعت و کشت — الوداع اے نگاہ و دل کی بہشت
الوداع اے فضائے کیف و سرور — الوداع اے ہوائے دامنِ نور
رخصت اے بوقبیس و کوہِ صفا — رخصت اے غارِ ثور و غارِ حرا
الفراق اے مقامِ ابراہیمؑ — الوداع اے مطاف و رکن و حطیم
الوداع اے کبوترانِ حرم — ہم نشینانِ خاصگانِ حرم
الوداع اے جوارِ بیت اللہ — بیکسوں غمزدوں کی جائے پناہ
چاہِ زمزم ہے یا خدا کی سبیل — رخصت اے یادگارِ اسمٰعیلؑ
تجھ کو ہر دم حضورِ حق ہے نصیب — بارک اللہ اے دیارِ حبیب!
تیری مٹی میں ہے وفا کا خمیر — رخصت اے سرزمینِ پاک ضمیر
رخصت اے روضۂ نبیؐ کریم — رخصت اے حجلۂ رءوف و رحیم
رخصت اے جلوہ گاہِ قدس جناب — رخصت اے بارگاہِ وحی و کتاب
رخصت اے جالیوں کے نظّارے — رخصت اے رحمتوں کے گہوارے
رخصت اے قبرِ حضرتِ صدّیقؓ — تجھ پہ رحمت ہوئے نبیؐ کے رفیق
رخصت اے مرقدِ جنابِ عمرؓ — تیرے ذرّے نشانِ فتح و ظفر
رخصت اے منبرِ رسولِ خدا — رخصت اے مرکزِ پیامِ ہدیٰ
اللہ اللہ مسجدِ نبوی — رخصت اے سجدہ گاہِ مصطفوی

رخصت اے ارضِ قبلتین و قبا — رخصت اے خندق و احد کی فضا
کپکپانے لگی مری آواز — رخصت اے قبرِ حمزہؓ جانباز
الوداع الفراق خلدِ بقیع — ذرّہ ذرّہ ترا جبیں و دقیع
کتنے شمس و قمر ہیں تجھ میں نہاں — سنگریزے ترے ہیں کاہکشاں
کچھ شہیدانِ سینہ چاک بھی ہیں — اہلِ بیتِ رسولِ پاک بھی ہیں
شہِ لولاک کی بنات بھی ہیں — اور ازواجِ طاہرات بھی ہیں
رخصت آرام گاہِ ذی النورینؓ — رخصت اے فاتحانِ بدر و حنین
اے شکستہ مزارِ پاک بتولؓ — تجھ پہ قربان رحمتوں کے پھول
اب بھی ہیں بے قرار تیرے لئے — کتنے آنسو مری عقیدت کے
الوداع اے حدودِ ملکِ حجاز — رخصت اے سجدہ گاہِ اہلِ نیاز
تیری مٹی نہیں دفینہ ہے — صدق و اخلاص کا خزینہ ہے
تُو زمیں پر خدا کی آیت ہے — شام بھی تیری صبحِ جنت ہے
شانِ حق کا ظہور کیا کہنا — تیری راتوں کا نور کیا کہنا
اے عناں گیرِ گردشِ ایام — تیری شام و سحر کو میرا سلام!
سوئے خود ہیں بسوئے من منگر — میری کوتاہیوں سے صرفِ نظر
اب بھی باقی ہے میرے دل میں خلش — لے کہ تُو ہے جہانِ جذب و کشش

پھر مرے سامنے یہ منظر ہو
پھر مجھے حاضری میسّر ہو

اللہ اللہ!

ابو محمد امام الدین رام نگری

یہ روضہ، یہ آنکھوں کا نور اللہ اللہ! — یہ اہلِ محبت کا طور، اللہ اللہ!
یہ معراجِ تقدیر کی انتہا ہے — کہ حاصل ہے ان کا حضور اللہ اللہ!
یہ آنکھوں میں کھبتا ہوا سبز گنبد! — قرارِ دلِ ناصبور - اللہ اللہ!
اُدھر ماہ کامل - اِدھر سبز گنبد — وہ آنکھوں کا، یہ دل کا نور اللہ اللہ!
نگاہوں میں رقصاں ہیں جلوے ہی جلوے — چپ و راست، نزدیک و دور اللہ اللہ!
نہ کسریٰ کی پروا - نہ قیصر کی پروا — گدائے نبیؐ کا غرور - اللہ اللہ!

سید رضوان بریلوی

مشاہدات

شاعر ہوں ستاروں کی طرف دیکھ رہا ہوں
فطرت کے اشاروں کی طرف دیکھ رہا ہوں

یہ دورِ پُر آشوب یہ افلاس یہ غربت
تقدیر کے ماروں کی طرف دیکھ رہا ہوں

یہ بحرِ پُر آفات یہ منجدھار یہ طوفاں
بوسیدہ کناروں کی طرف دیکھ رہا ہوں

سنسان سی راہوں پہ یہ بھٹکے ہوئے راہی
ناکام سہاروں کی طرف دیکھ رہا ہوں

زخموں سے بھرا ہے دلِ اربابِ گلستاں
مجروح بہاروں کی طرف دیکھ رہا ہوں

مدت سے جو آوارہ ہیں بھٹکے ہوئے فضا میں
ان شوخ ستاروں کی طرف دیکھ رہا ہوں

یہ ریشمیں پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو
ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرف دیکھ رہا ہوں

شاید کہ کھلیں عظمتِ آدم کے کچھ اسرار
پامال مزاروں کی طرف دیکھ رہا ہوں!

کوثر نیازی

موجِ کوثر

منزلِ مقصود کب ہے یہ تقاضا آج کل !
چھوڑ کر ہر کام سرگرمِ سفر ہو جائیے !

ہائے! یہ بیچارگی خود باغباں کا حکم ہے
باغ میں رہنا ہے تو بے بال و پر ہو جائیے!

کب تلک اے حضرتِ عشق، اہلِ دنیا سے نباہ
آئیے۔ گم کردہ راہوں کے خضر ہو جائیے!

کائناتِ حسن ہے کوثر یہ حسنِ کائنات
جی میں آتا ہے کہ سرتا پا نظر ہو جائیے!

امید رضوی

شعاعِ امید

غمِ آفاق سے کیوں دل کو ہراساں کر لیں
آؤ اس کو بھی شریکِ غمِ جاناں کر لیں

کہہ دو صیاد سے فطرت ہے چمن ساز اپنی
ہم اگر چاہیں قفس ہی کو گلستاں کر لیں

کسی کا وقتِ رواں منتظر نہیں رہتا
یہی ازل سے ہے دستورِ عالمِ موجود

نیر جہلمی

تاثرات

حکایتِ غمِ تنہا تو دیتے حدیثِ کون و مکاں سے پہلے
مگر یہ سوچا کئے کہ آخر شروع کیجے کہاں سے پہلے

گلوں کے پہلو میں بلبلوں کو یقیناً اہلِ چمن نے دیکھا
بہار آئی ضرور آئی مگر مرے آشیاں سے پہلے

مری قیادت میں چلنے والے شبک روانِ جنوں سے کہہ دو
مجھے نہ پھر کوئی پا سکیگا چلا جو میں کارواں سے پہلے

چمن پہ یورش ہے بجلیوں کی خدا محافظ نشیمنوں کا
زمیں تھا میرا بھی آشیانہ دھواں اٹھا تھا جہاں سے پہلے

یہ شوقِ منزل کا ہے کرشمہ کہ جذبِ کامل کی رہنمائی !
چلے بچھڑ کر جو کارواں سے پہنچ گئے کارواں سے پہلے!

روحِ انتخاب

اخلاق کی قدریں

زندگی میں انسان سے شدید احتیاط کے باوجود بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ تمناؤں اور آرزوؤں کے دوراہے پر بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ منزلِ حیات کے کسی نہ کسی موڑ پر ٹھوکر ضرور لگتی ہے۔ مگر ارباب ہوش اور اہل خرد ہر ٹھوکر پر چونکتے ہیں۔ ہر لغزش پر اُن کو تنبیہ ہوتی ہے اور ہر غلطی اُن کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ جو لوگ فطرتاً نیک واقع ہوئے ہیں۔ جن کی طبیعت بُرائیوں سے ساز باز نہیں کرتی۔ جو دُنیا کے ہر گوشے کو خیر و امن اور صلح و راحت سے لبریز دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی غلطیوں، لغزشوں اور کوتاہیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مریض کی طرح جو اپنے مرض اور بیماری پر مطلع ہونے کے بعد مرض کے دُور کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے، پرہیز کرتا ہے اور مرض میں اضافہ کرنے والی چیزوں کے قریب تک نہیں جاتا۔

یہ ایک مانی ہوئی بات اور تجربہ کی ہوئی حقیقت ہے کہ جو آدمی جس قدر نیک اور خیر سرشت ہے۔ اُتنا ہی اس کا وجود انسانوں کی سوسائٹی کے لئے مفید اور کار آمد ہے۔ نیکی در اصل اعتدال و اقتصاد اور توازن و ہم آہنگی کا سنگم ہے۔ جہاں نیکی ہوگی وہاں امن ہوگا۔ حقیقی مسرتیں پائی جائیں گی، اور انسانی معاشرہ طغیان و فساد کی لعنتوں سے دُور رہے گا!

اس کے برخلاف جب نفس گناہوں اور لغزشوں کی تاویلیں کرنے لگے۔ ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی آنکھ نہ کھلے۔ بد اخلاقی اور معصیت کوشی کو فلسفہ کی خوشنما اصطلاحوں کے ذریعہ ہلکا بلکہ جائز ثابت کرنے کی کوشش کی جائے تو پھر سمجھ لیجئے کہ پستی اور گمراہی کی یہ وہ آخری حد ہے جہاں ضمیر بے حس یقین متزلزل اور ہوش و خرد آوارہ ہو جاتے ہیں۔!

یہ مادہ پرست دَور جہاں صرف "روٹی" کو انسانیت کا محور اور مقصد و بنا دیا گیا ہے۔ اس کا مزاج بدی کے لئے تاویلیں تراشنے اور دلیلیں فراہم کرنے سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔ اسی تعلیم کا یہ اثر ہے جو کسی جھجک کے بغیر ڈنکے کی چوٹ کہا جا رہا ہے کہ "ہر زمانہ میں اخلاق کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔" اس نظریہ کی تائید میں ٹھوس مضامین اور عالمانہ مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ اور تبلیغ کی جا رہی ہے کہ اخلاق آج اپنی پُرانی قدر و قیمت کھو بیٹھا۔ جاننے والے جانتے ہیں اور جاننے کیا ہیں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں کہ "قدرِ اخلاق" کی یہ اصطلاح نیکی اور اخلاق کی اہمیت گھٹانے کے لئے سوچ سمجھ کر وضع کی گئی ہے!

جو آدمی نادانستہ طور پر غلطی کرتا ہے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ مگر جو جان بُوجھ کر غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے اور اپنی غلطیوں پر اصرار کرتا ہے اس کی اصلاح محالات سے ہے۔ یہ اخلاقی دق کا وہ آخری درجہ ہے، کہ جب کوئی دوا کارگر اور کوئی علاج فائدہ مند نہیں ہوتا۔ میں یہ مضمون اس ذہنیت کے افراد کی اصلاح و درستی کے لئے نہیں بلکہ اُن حضرات کی تفہیم کے واسطے لکھ رہا ہوں جو نادانستہ اس غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یا ان میں اس نوع کے رجحانات پائے جاتے ہیں! افسوس ہے کہ "قدرِ اخلاق" پر بحث کرنے والے فلسفۂ اخلاق سے یا تو نابلد ہیں یا پھر حق کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے اپنے اس مضمون میں مذہبی تصورات و معتقدات سے بالقصد بحث نہیں کی — مجرد فلسفۂ اخلاق پر گفتگو کی ہے!

حکما اور فلاسفہ:- دُنیا کی تاریخ معلوم سے آج تک یعنی سو بیسٹالیس صدی عیسوی کی ۲۲۔ اگست تک ہر زمانہ میں اخلاق کے بنیادی اصول سدا یکساں رہے ہیں۔ عدل، خیر، نیک چلنی اور راست بازی یہ وہ چند بنیادی اصطلاحیں ہیں جن کو ہر زمانے میں مانا گیا ہے۔ دُہرایا گیا ہے اور خیر پسند انسانوں نے اُن پر عمل بھی کیا ہے۔ ہزاروں سال پہلے کے حجری کتبات جو محکمہ اکتشافِ آثارِ قدیمہ (آرکیولوجیکل ڈیپارٹمنٹ) کی کوششوں کی بدولت دستیاب ہوئے ہیں۔ اُن میں خوش اخلاقی کی تعلیم۔ انصاف کی تلقین۔ راست بازی کی تبلیغ۔ اور نیکی کا ذکر ملتا ہے۔ بابل و نینوا کی اینٹوں سے لے کر اشوک کی لاٹ تک ہر جگہ نیکی نظر آتی ہے۔ نیکی، اخلاق کی بنیاد ہے۔ انصاف، مساوات، ہمدردی، پاکبازی اور نیک چلنی یہ سب اخلاق کے بچے اور نیکی کی مقدس بیٹیاں ہیں۔

دُنیا کے تمام حکماء اور علماء نے نیکی کی تعلیم دی ہے اور اخلاق کی اہمیت پر بار بار زور دیا ہے۔ مشہور فلسفی ہرقلیطس کو جب ایران کے نامور شہنشاہ دارا نے اپنے دربار میں بُلایا کہ مجھے حکیمانہ پند و نصائح سے مستفید فرمائیے تو اس نے دارا کو جو خط لکھا اس میں لوگوں کے راستی سے ہٹ جانے پر افسوس کیا اور آخر میں یہاں تک لکھ دیا۔

"میں دربارِ سرکار کی عزت کو سخت حقارت کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ تھوڑے پر قناعت کرتا ہوں۔ اور یہاں جس طرح چاہتا ہوں رہتا ہوں"!

قناعت بھی اخلاق کی ایک شاخ ہے اور ہرقلیطس سے صدیوں بعد شیخ سعدی اور ابن یمین نے قناعت کے موضوع پر بہت کچھ کہا۔ تو اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد قناعت کی "قدر" (VALUE) بدلی نہیں بلکہ اور زیادہ واضح اور مستحکم ہو گئی۔ اسی طرح "عزتِ نفس" بھی "اخلاق" کا ایک شعبہ ہے اور شہنشاہوں اور امیروں کے درباروں میں یہ مجروح ہو جاتی ہے۔ تو آج بھی "عزتِ نفس" نے اپنی "قدر و قیمت" کو ضائع نہیں کیا اور لوگوں کو اس کا احساس ہے!

سقراط اور افلاطون کے تو فلسفہ کی بنیاد ہی نیکی اور علم صحیح پر ہے۔ مشہور فلسفی انکساغورس جب ایک ایک پیسے کے لئے محتاج ہو گیا تو اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔

"فلسفے نے میری دُنیا برباد کر دی۔ مگر میری عاقبت سنوار دی"۔

عاقبت کا تصور اور آخرت کا یقین "اخلاق" ہی کا ایک مظہر ہے۔ سقراط کے حالات میں اس کے مستند شاگرد زنافن نے لکھا ہے کہ:-

"سقراط کو کسی نے بد اخلاقی کا مرتکب نہیں پایا۔ اس نیک سرشت فلسفی نے وقتی لذت کو کبھی نیک چلنی پر ترجیح نہیں دی"۔

دیوجانس کلبی نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

"جن مضامین سے انسان کی اخلاقی زندگی کوئی مفید اثر قبول نہ کرے۔ وہ فضول بلکہ ایک حد تک مضرت رساں ہیں"!

اصلیت و واقعیت (REALISM) کے نام پر عریانی و فحاشی کے مصورات با کمال شن رہے ہیں؟

مشہور فلسفی اینٹس کا بھی یہی مقولہ تھا کہ:-

"مجھے نفس پرست ہونے کے مقابلے میں مجنون بننا گوارا ہے"۔

جن حکماء کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اُن کے زمانے سے لے کر اب تک ہر دور کے حکماء اور اہلِ علم نے "اخلاق" کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

اخلاق کے بنیادی تصورات ہمارے زمانے میں بھی ہزاروں سال قبل کے اخلاقی بنیادی تصورات اپنے قدر و قیمت کے اعتبار سے تبدیل نہیں ہوئے اور نہ انہوں نے اپنی اہمیت کو ضائع کیا۔ آج بھی　اس قتل و خونریزی اور درندگی کے

باوجود ہر جگہ سے یہی آوازیں آرہی ہیں کہ عدل کرو۔ انصاف سے کام لو، مفتوح رعایا سے نیکی کے ساتھ پیش آؤ۔ ہزاروں سال پہلے بھی نیکی کا عقیدہ تھا اور آج بھی اس کی اہمیت تسلیم کی جاری ہے۔ کوئی سیاہ باطن اگر ظلم بھی کرتا ہے اور اپنے ظلم کا اقرار کرنا نہیں چاہتا تو وہ بھی یہی کہتا ہے۔ اگرچہ اس کا دعویٰ سراسر غلط ہوتا ہے کہ میں نے تو "انصاف کیا تھا"۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "عدل" اور "نیکی" کی اہمیت سب تسلیم کرتے ہیں۔ اور اخلاق کی قدر و قیمت گھٹانے یا اُن کے بدل دینے کا اقرار کرکے مجرم بننا کوئی نہیں چاہتا!

یورپ اخلاقی طور پر کتنا پست ہو گیا ہے۔ نفس پرستی کس قدر عام ہو گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود اخباروں کے ذریعہ ہم تک اس قسم کی اطلاعات بھی پہنچتی رہتی ہیں کہ فلاں صاحب بہادر نے جذبۂ غیرت سے مغلوب ہو کر اپنی بیوی یا لڑکی کے آشنا کو قتل کر دیا۔ کسی نے اپنی محبوب اور چہیتی بیوی کو طلاق دے دی۔ ہم آج بھی بہادر ڈاکو کے مقابلہ میں بہادر سپاہی کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں!

بعض شاعروں اور ادیبوں نے ظالم اور بداخلاق بادشاہوں کی تعریفیں تو کی ہیں مگر "ظلم، فساد، بدچلنی اور بُرائی" کو کبھی نہیں سراہا۔ بلکہ ان قصائد و مناقب میں بھی ظالموں کی تعریف "نیک، عادل اور شریف" جیسی اخلاقی اصطلاحوں کے ساتھ کی ہے!

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اخلاق کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی نگاہ تغیرات کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ مثلاً والدین کی عزت کرنا بھی اخلاق ہی نے ہم کو سکھایا ہے اور ہر زمانے میں والدین کی عزت کی جاتی رہی ہے۔ مگر آجکل بیٹے باپ کے سامنے ننگے سر بیٹھتے ہیں اور اب سے پہلے باپ کے سامنے سر کھولنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس تبدیلی سے اخلاق کی قدر پھر بھی نہیں بدلی۔ ہمارے اس زمانے کا کوئی بیٹا باپ کے سامنے اس تصور کے ساتھ ننگے سر نہیں ہوتا کہ ننگے سر رہ کر وہ باپ کی توہین کر رہا ہے۔ باپ کی عزت کا اخلاقی تصور آج بھی موجود ہے!

آخری بات

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر کوئی جماعت اخلاق کے بنیادی تصورات سے گریز کرتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نفس اخلاق کی قدر و قیمت بدل گئی۔ لوگوں کے بدل جانے سے حقائق نہیں بدل جاتے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں خطّہ کے باشندوں نے اخلاق کی قدر کو بدل دیا مگر یہ کہنے کا آپ کو حق نہیں ہے کہ خود اخلاق کی قدر اپنی جگہ سے کچھ کی کچھ ہو گئی۔ بھلائی پھر بھی بھلائی ہی رہے گی۔ چاہے ساری دُنیا بُری ہو جائے اور بُرائی کو خود لوگ اپنی غلطی اور کمزوری کے سبب اچھا ہی کیوں نہ سمجھنے لگیں!

سونے چاندی کی طرح اخلاق کا بھاؤ گھٹتا بڑھتا نہیں رہتا کہ لڑائی کا زور ہوا تو سونے کا بھاؤ نوّے روپے تولہ ہو گیا اور صلح کی خبر آئی تو یہ نرخ گر کر ساٹھ تک پہنچ گیا۔ جن لوگوں نے اخلاق کو ناپائیدار اور ہنگامی (TRANSITORY) سمجھ رکھا ہے۔ وہ سب کے سب توہینِ انسانیت کے مجرم ہیں۔ اخلاق فطرت کا مطالبہ ہے۔ اور فطرتِ صحیحہ بداخلاقی اور بُرائی پر مطمئن اور رضامند ہو ہی نہیں سکتی!!

(ماہرالقادری رسالہ عالمگیر۔ نومبر ۱۹۴۵ء)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

"اپوا" ــــــ زبان پہ بارِ خدایا کس کا نام آیا (مصرعۂ ثانی ہم نے جان کر نہیں لکھا کہ حدِ ادب سے تجاوز ہوگا) ہاں تو، اسی "اپوا" کی ایک سرگرم کارکن "تعدادِ ازدواج" کے سلسلہ میں کوئی قانونی پابندی عائد کرانا چاہتی ہیں اور وہ "صنفِ نازک" کی بہت بڑی ہمدرد بلکہ مصلح بن کر میدان میں آئی ہیں۔ ع

زنے از غیب بروں آید و کارے بکند!

ہم خاک نشین اُن بلند بام بیگم صاحبہ کی خدمتِ گرامی میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے عورتوں کی اخلاقی تربیت کی طرف بھی کوئی توجہ کی اور یہ جو پاکستان میں مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط میں بے تحاشا، بے محابا اور بے تکانہ ترقی ہو رہی ہے اور یہ "سلسلہ" روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے روکنے کی بھی کوئی تدبیر سوچی۔ ایک مسلمان "عورت" کے ساتھ دوسری عورت سب سے بڑی ہمدردی اور خیر خواہی جو وہ کر سکتی ہے۔ یہ ہے کہ اُسے اُس راہ پر چلانے کی کوشش کرے جس راہ میں خدیجہؓ۔ عائشہؓ۔ فاطمہؓ اور رابعہ بصری کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں!

شرم و غیرت۔ اخلاق۔ وفاداری، حجاب و حیا۔ عورت کا جوہر ہیں۔ یہی وہ عناصر ہیں جن سے "نسائیت" مرکب ہے۔ ان میں سے کسی پر ذرا سی بھی آنچ آئی تو سمجھو کہ عورت کے عورت پن کی خیر نہیں۔ اب رہا یورپ اور اس کا تمدن تو ہم یورپ کے اُس معیارِ اخلاق اور اصولِ معاشرت کو نہیں مانتے جس نے انسانوں کو سچ مچ ریچھ اور بندر بنا دیا ہے! ہمارے سامنے تو اسلام کا پیش کیا ہوا معیارِ اخلاق ہے۔ جس میں اس عورت کو جو خوشبو لگا کر باہر نکلتی ہے "زانیہ" کہا گیا ہے!

تماشائی کو یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ "اپوا" جو کچھ اب تک کرتی رہی ہے۔ اُس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کی خواتین کو یورپ کی لیڈیوں کی سطح پر لے آنا اس کا مقصود ہے اور اسی پروگرام کو طرح طرح سے بروئے کار لایا جا رہا ہے!

پاکستان میں جو عورتیں برقعوں میں رہتی تھیں، وہ بے نقاب ہو گئیں، جو پہلے سے بے نقاب تھیں اُن کا لباس مختصر ہو گیا، اور اب تو یہ بھی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ جن لپ اسٹک زدہ ہونٹوں میں سگریٹ دبے رہتے تھے اب وہی لب ہائے نازک و رنگین جامِ شراب کو بھی چھو رہے ہیں۔!

تو اے قوم کی لیڈرانیو!

اگر عورت کے ناموس کی حفاظت چاہتی ہو تو "تعدادِ ازدواج" پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرنے سے پہلے۔ عورتوں کی بے باکی، آزادی اور بے حیائی پر پابندی لگائے جانے کا مطالبہ کرو! مغربی زندگی کا سیلاب بڑی تیزی سے فراٹے بھرتا اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا پاکستان میں آ رہا ہے۔ بلکہ آ چکا ہے۔ تمہیں اگر ناموسِ غیرت کے سفینہ کو بچانا ہے تو اس سیلاب کے روکنے کی تدبیریں سوچو!

اسکولوں اور کالجوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کے اختلاط کے کیا نتائج نکل رہے ہیں؟ اس کی ٹوہ لگاؤ۔ ڈاکٹروں، دائیوں اور نرسوں سے پوچھو، وہ تمہیں بتائیں گے کہ اُن کے پاس پوشیدہ طور پر کس طرح کے "Cases" آتے رہتے ہیں اور کس مقصد کے لئے کیا "دوائیں" طلب کی جاتی ہیں عقلمند کے لئے بس ایک اشارہ کافی ہوتا ہے ــــ حالات یقیناً خراب ہیں مگر ابھی پانی سر سے اونچا نہیں ہوا ہے۔ ان فتنوں کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔

بشرطیکہ ان بُرائیوں کے "بُرے ہونے" کا احساس ہو!

اگر کوئی "غیرت"، "پاکبازی"، حیا اور عصمت و اخلاق کو out of date سمجھتا ہو اور اس کا یہ خیال ہو کہ زمانہ ان حد بندیوں سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ تو پھر ہم عرض کریں گے ؎

کیں راہ کہ می روی بہ ترکستان است!

یہ اصلاح نہیں فساد اور بناؤ نہیں بگاڑ ہے!

پاکستان میں کُشتیاں ہوئیں، پاکستان کے پہلوانوں اور یورپ کے پہلوانوں سے۔ مگر اُس انداز پر نہیں جس انداز پر "گاما" اور "زبسکو" کے درمیان اب سے تقریباً بائیس تیئیس سال پہلے کشتی کا مقابلہ ہوا تھا۔ اور گاما کو "رستمِ زماں" کا خطاب دیا گیا تھا۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اگلے طور طریق بدل چکے ہیں اور پھر یہ پاکستان ہے۔ کوئی دقیانوسی سلطنت نہیں ہے۔ یہاں بڑا بڑا روشن دماغ اور عالی خیال پڑا ہوا ہے۔ وہ زبان کے "بڑے لوگوں" کا بس نہیں چلتا اور نہ اب تک کوئی ایسی مشین ایجاد ہوئی ہے جو شہروں اور بستیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دے۔ اگر ایسی مشین وجود میں آ جائے تو لندن اور پیرس کے خاص خاص محلوں کو کراچی اور لاہور میں کسی دن رکھا ہوا دیکھ لیجئے گا!

یہ ہندوستان میں تقسیم سے پہلے جو کُشتیاں ہوا کرتی تھیں۔ بھلا وہ کوئی "کُشتیاں" تھیں۔ کہ دو پہلوان ہاتھ پاؤں بچا کر لڑتے تھے کہ کسی کے چوٹ چپیٹ نہ آ جائے۔ جو پہلوان اپنے حریف کے جسم کے کسی حصّہ کو ضرر پہنچانے کی کوشش کرتا تھا اسے اکھاڑے سے باہر کر دیا جاتا کہ پہلوانی کا یہ ظالمانہ انداز ہے۔ کُشتی کا اصل مقصد جسمانی طاقت کے ساتھ پھرتی اور فن کا اظہار بھی تھا۔ مگر حضرت والا! یہ سب بزدلی کی باتیں تھیں۔ وہ زمانہ لد گیا۔ اب پاکستان ایک آزاد مملکت ہے اور آزاد ملک کے باشندوں کو جری اور جسور ہونا چاہیئے!

چنانچہ:۔

یورپ کے "فری اسٹائل" کی کُشتیوں کا مقابلہ کراچی میں ہوا۔ "بین الاقوامی دنگل"۔ سارے شہر میں اس کی دھوم تھی۔ ریڈیو سے اس کُشتی کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا گیا۔ تاکہ جو اس دنگل میں کسی وجہ سے نہ آ سکے اور اُن کی آنکھیں اس "معرکۂ حرب و ضرب" کے دیکھنے سے محروم رہیں۔ وہ کم سے کم کانوں سے تو اس داستان کو سُن لیں!

ہوا کیا؟ یہ نہ پوچھئے اور اگر پوچھنا ہے تو پہلے دل کو "فولادی" بنا لیجئے۔ سچ مچ پتھر کا دل جو کوئی اثر قبول نہ کرے۔ ایک پہلوان نے دُوسرے پہلوان کو مار مار کر بیہوش کر دیا اور اس حالت میں چھوڑا کہ جیسے اُس میں جان ہی نہیں رہی۔ کسی پہلوان کا کندھا اُتر گیا۔ کسی کے مُنہ پر وہ زور کی لات پڑی کہ جبڑا ہل گیا۔ کسی کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اور کُشتی کے یہ ظالمانہ مناظر پاکستان کے باشندے تالیوں اور سیٹیوں کی گونج میں دیکھتے رہے۔ کیا کہنے ہیں ان لوگوں کے دل گردے کے! یہاں تک کہ ایک دن تماشائیوں کے ٹوٹ جانے سے کئی آدمی شدید زخمی ہو گئے۔ مگر کُشتی موقوف نہیں ہوئی۔ واقعی ثبات و استقلال دکھانے کا یہی موقع تھا۔ اگر زخمیوں کی دردناک چیخوں اور کراہوں سے متاثر ہو کر کُشتیاں روک دی جاتیں تو ساری دُنیا میں پاکستان کی وہ بدنامی ہوتی کہ کوئی پاکستانی شرم کے مارے آنکھیں نہ اُٹھا سکتا۔ دُوسرے ملکوں کے لوگ طنز کرتے طعنے دیتے کہ پاکستان کے رہنے والوں کے سینوں میں دل تو ہیں مگر بکری کے دل ہیں۔ چھوٹی موٹی اور دھان پان کہیں گے! حادثات تو اس دُنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں اور لوگوں کا مر جانا یا زخمی ہو جانا بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اور جو زخمی ہوتا ہے تو وہ چلّایا ہی کرتا ہے۔ زخمی چیخے چلّائے اور کراہے گا نہیں تو کیا گیت گائے گا اور غزلیں سُنائے گا۔ ایسے حادثات چاہے وہ کتنے ہی اندوہناک کیوں نہ ہوں۔ اُن کے لئے بنا بنایا پروگرام تو ملتوی نہیں کیا جا سکتا!

شاباش! اے پاکستانی قوم شاباش! زندہ باد! تیرے نرم اور متاثر ہونے والے دل کے پتھر بن جانے پر نوید فرحت، تبریک اور مبارکباد! تیرے "بڑے لوگ" تو پہلے ہی سے "مضبوط" دل رکھتے ہیں اور Iron hearted واقع ہوئے ہیں اب تجھے بھی یہ دولت مل گئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ رومۃ الکبریٰ کے امیر اپنے غلاموں کو شیروں اور چیتوں کے سامنے چھوڑ کر ان کے پھاڑے جانے کا منظر لطف لے لے کر دیکھا کرتے تھے۔ اور غلاموں میں دست بدست خونیں جنگ بھی ہوتی تھی۔ تو اے پاکستانی قوم! تیری جرأت اور سنگ دلی کا آغاز بتا رہا ہے کہ یہ تو پہلا قدم ہے۔ اگلا قدم زیادہ جری اور بے خوف ہوگا۔ اور ہم جیسے "ملا" شور ہی مچاتے رہیں گے مگر پاکستان کے "روشن خیال" جس قافلے کے امیر و رہنما ہیں وہ قافلہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ . . . .

(بزدلی کے سبب آواز گلوگیر ہوگئی . . . . اس لئے فقط . . . . . . زیادہ حد ادب!)

پاکستان کے "ارباب فکر" (؟) اور "بڑے لوگوں" کی نگاہ میں جن فنکاروں نے دنیا میں پاکستان کا نام اونچا کیا ہے۔ ان میں ایک حضرت بلبل چودھری رحمۃ اللہ علیہ (؟) بھی تھے۔ جنہوں نے مغربی ممالک میں ناچ کر، تھرک کر، کولہے مٹکا کر پاکستانی آرٹ کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہ بے ذوق اور آرٹ ناشناس "ملانے" شور ہی مچاتے رہے کہ کسی بعید سے بعید تاویل اور ضعیف سے ضعیف روایت کے ذریعہ بھی "ناچ" کو جائز اور مباح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو کھلا ہوا فسق ہے —— مگر ان "ملاؤں" کے شور مچانے اور واویلا کرنے سے ہوتا کیا ہے۔ یہ ناشدنی اور گردن زدنی تو "فنون لطیفہ" کے ازل سے دشمن واقع ہوئے ہیں۔ شراب، سود، رقص و سرود، گھڑ دوڑ کی شرطیں، کلب گھروں کی قماربازی، مرد و زن کا اختلاط۔ تصویر کشی۔ مجسمہ سازی، غرض تمام لطف کی باتیں ان خشک مزاجوں کے یہاں حرام ہیں! اللہ میاں نے آنکھیں دیکھنے دکھلانے کے لئے ہی دی ہیں اور یہ "ملانے" کہتے ہیں کہ غیر محرم مرد کا کسی کی ماں، بہن اور بیٹی کو گھورنا اور لذت کی نگاہ سے دیکھنا ناجائز ہے بلکہ یہ لوگ زور میں آکر یہاں تک بکار اٹھتے ہیں کہ "آنکھیں بھی بدکاری کرتی ہیں" تو ان حضرات کو چاہیئے کہ راستوں، گلی کوچوں، اور بازاروں میں چلیں تو اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیا کریں! بے ذوق اور خشک دماغ کہیں کے!

ہاں تو کہنا یہ ہے کہ یہ "ملانے" شور کرتے رہے اور بلبل چودھری کے رقص کے جلسے ہوتے رہے۔ پاکستان کے اخباروں میں ان ملاؤں کے علی الرغم رقص کے مناظر کی دھڑلے سے تصویریں چھپتی رہیں اور سات سمندر پار کے ملکوں میں پاکستانی حکومت کے خود سفراء ناچ کے جلسوں کی سرپرستی فرما کر پاکستان کے نام کو روشن کرتے رہے بلکہ چار چاند لگاتے رہے۔ نہ جانے اس رقاص اعظم۔ بلبل چودھری کو کس حاسد اور پاکستان کے دشمن کی نظر کھا گئی کہ یہ عظیم فن کار اپنی جوانی ہی میں "رحمۃ اللہ علیہ" ہوگیا اور پاکستان کے نہ جانے کتنے "دام اقبالہم" کو روتا بسورتا چھوڑ کر اپنے قبیل کے "رحمۃ اللہ علیہم" سے جا ملا۔!

ہائے پاکستان کے لئے وہ دن کتنا منحوس تھا جس دن "بلبل چودھری" کے طائر روح نے قفس عنصری سے پرواز کی تھی

آسمان را حق بود گر خوں بچکد بر زمیں!

"اپوا" کے حلقوں میں تو سنا ہے کہ اس دن صف ماتم بچھ گئی۔ کتنے نازک آبگینوں کو ٹھیس لگی اس حادثۂ جانکاہ سے! اور نہ جانے کتنی آنکھوں کا کاجل آنسوؤں سے دھل گیا۔! کتنے لب اس دن "لپ اسٹک" سے محروم رہے!

اب "بلبل چودھری" مرحوم کی بیوہ نے اپیل کی ہے کہ ان کے شوہر کی یادگار میں اس فن لطیف کو زندہ رکھنے کے لئے ایک سوسائٹی یا یوں سمجھئے کہ "آرٹ سرکل" قائم کیا جائے! یہ اپیل روزنامہ "ڈان" نے بڑی اہمیت کے ساتھ چھاپی ہے۔ اور بلبل چودھری کی بیوہ کی ایک عدد تصویر کے ساتھ چھاپی ہے۔ اس اپیل کی "اہمیت" اور "افادیت" میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے، پاکستانی قوم نے "ناچنے" کے فن کی اگر جلا دیا!

اور بلبل چودھری جیسے عظیم رقاص کی یادگار قائم نہ کی تو ایسی قدر ناشناس قوم بھلا دُنیا کی قوموں میں عزّت کا مقام حاصل کر سکتی ہے!
ضرورت ہے اور فوری ضرورت ہے۔ اتنی فوری کہ پلک جھپکاتے یہ کام ہو جانا چاہیئے۔ یعنی پاکستان کے ہر گھر میں بیاد بلبل چودھری صبح شام گھنگروؤں کی چھنک سے فضا گونجنی چاہیئے۔ مرد، عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے سب ناچیں اور اس جوش خروش کے ساتھ ناچیں کہ بلبل چودھری کی روح عالمِ برزخ میں خوش ہو کر "جزاک اللہ" پکار اُٹھے۔ اور اگر یہ پاکستانی مُلّانے "ناجائز، ناجائز" کا شور شرابہ مچائیں تو ناچ کے جواز کے لئے مصر کے اُن "علمائے حق" اور "علمبردارانِ صداقت" سے فتویٰ منگوا لیا جائے۔ جنہوں نے سُنا ہے کہ اخوان المسلمین کے کفر و الحاد پر مہریں ثبت فرما دی ہیں ——!

اور ہاں! فتویٰ لینے کے لئے پاکستان ٹائمز کے "عالی مرتبت" ایڈیٹر مسٹر سہروردی کو مصر بھیجا جائے۔ اس لئے کہ ایک تو وہ اخوان المسلمین کے لیڈروں کے پھانسی دیئے جانے پر محافظِ اسلام، امیر المومنین جمال ناصر کی خدمت میں مبارکباد پیش کرنے کے فریضے سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ دوسرے پاکستان سے باہر اگر کسی کے پاس "پیامِ سلام" بھیجنا ہو تو اس کام کے لئے اُن سے زیادہ "معتبر" اور بھروسہ کا آدمی پورے پاکستان میں چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو دستیاب ہو نہیں سکتا۔ اور دستیاب کہاں سے ہو گا جبکہ اس عجیب و غریب صلاحیت کا بس یہ ایک ہی آدمی خلق فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد اس سانچے کو ہی توڑ ڈالا گیا ——!

اور ہم کہتے ہیں کہ "رقص و سرود" کے جواز پر باہر سے فتویٰ منگانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ پاکستان ٹائمز کے لیڈنگ آرٹیکل اس کے گواہ ہیں کہ "اجماع" کے مسئلہ پر اس فاضل و عالم ایڈیٹر کے قلم سے کیسی کیسی نازک باتیں بے ساختہ نکل گئی ہیں اور کتنے مشکل مسائل کی گُتھی ہوئی گرہیں کھُل گئی ہیں۔ تو اتنے بڑے فقیہہ اور فقیہ المثال مفتی کے ہوتے ہوئے کسی اور سے فتویٰ لینے کی ضرورت کیا ہے ——!

مسٹر سہروردی اور دین کے مسائل میں فتویٰ دیں گے۔ کیا فرما رہے ہیں آپ؟ جی! میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں۔ سوچ سمجھ کر ہی عرض کر رہا ہوں! وجہ سنیئے۔ اس کا سبب سماعت فرمائیے! مگر اس کو علمِ عروض کا "سبب" اور "وتد" نہ سمجھ لیجئے گا۔ یہ وہ سبب ہے جو دلیل و ثبوت کے لئے دیا جایا کرتا ہے مسٹر سہروردی علم و افکار کے جس مقام پر فائز ہو چکے ہیں۔ اُس کی بلندی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا یہی سبب تو ہے کہ وہ اس بلندی سے جب پکارتے ہیں تو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے مفکرِ اسلام کو "A. MODUDI" کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ جیسے وہ کسی کمتر، ناتراش اور ناقابلِ ذکر آدمی کا نام لے رہے ہیں۔ مگر یہ باتیں شائستہ لوگوں کو تو زیب نہیں دیتیں۔ جی! اگلے زمانے میں نہ دیتی ہوں گی۔ مگر اب تو زیب دیتی ہیں ——!

لیکن دُنیا مسٹر سہروردی کے کہنے سے مولانا مودودی کو بے علم یا "نیم عالم" کیسے مان لے گی۔ اور یہ جو اُن کی درجنوں کتابیں ہر موضوع پر ملتی ہیں۔ قرآن، حدیث، فقہ، دستور، سیاسیات و معیشت کا کونسا ایسا اہم موضوع ہے۔ جس پر مولانا مودودی نے سیر حاصل مضامین نہ لکھے ہوں۔ اور تو اور جبر و قدر جیسے نازک مسئلہ پر اُن کی ایک تصنیف موجود ہے۔ اتنی جامع شخصیت کے عالم کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں اور پھر استدلال کے تو وہ بادشاہ ہیں —— جی! ہو سکتا ہے کہ مولانا مودودی نے یہ کتابیں خود نہ لکھی ہوں بلکہ اُجرت دے کر کسی سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرا دی ہوں۔ ان جماعتِ اسلامی والوں کے پاس روپے کی کیا کمی ہے۔ امریکہ، روس، ہندوستان غرض ہر حکومت کے پاس سے اُن کے پاس روپیہ آتا ہے۔ اور لاہور کے ایک مولوی صاحب نے تو یہاں تک فرما دیا کہ ہندوستان سے ایک ایک لاکھ روپے کے منی آرڈر ان لوگوں کے پاس آتے ہیں!

اور یہ جو مولانا مودودی کے علم و فضل کی حجاز، عراق اور مصر و شام میں دُھوم مچی ہوئی ہے۔ اس کو کیا کیجئے گا؟ یہ بھی "جماعتِ اسلامی" کے روپے کی کرامت ہے کہ ہر جگہ روپے کے زور سے اپنے امیر کی شہرت کے ڈنکے بجوا دیتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے جماعتِ اسلامی والوں کو پارس پتھر مل گیا ہو کہ لوہے پر رگڑا اور کھرا سونا بنا بنایا تیار! کیمیا ساز معلوم ہوتے ہیں یہ لوگ! ان جماعتِ اسلامی والوں سے متاثر ہو کر

جو لوگ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں۔ اور دوسری برائیوں سے بچتے ہیں کیا عجب ہے کہ اُن کی انہوں نے اپنے بیت المال سے تنخواہیں مقرر کر رکھی ہوں اس تناسب کے ساتھ کہ:-

پانچوں وقت کی نماز گھر میں پڑھنے والا	تنخواہ تیس روپے ماہوار
" " مسجد میں پڑھنے والا	" پچاس " "
" " اور تہجد پڑھنے والا	" ستر " "
حرام کمائی سے بچنے والا	" سو " "

وغیرہ وغیرہ!

اس کردار، و سیرت کے لوگوں کو دیکھ کر جب عوام "بڑے آدمیوں" کی زندگیوں کو جانچیں گے تو اُن میں جو "جذبہ" اُبھرے گا۔ اُس کا نتیجہ ملک اور قوم کے لئے چاہے کتنا ہی اچھا ہو۔ مگر "کرسیوں" کے حق میں شاید مفید ثابت نہ ہو۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ نیکی اور اخلاق کے ان جذبوں کو جس طرح ہو سکے کمزور اور پست کیا جائے۔ تعزیرات میں جرائم کی دفعات کی کوئی کمی ہے؟ ہر دفعہ سے اٹھایا جا سکتا ہے اور جہاں تعزیرات کو "شکوۂ کوتاہیٔ داماں" ہوگا وہاں "سیفٹی" "آرڈیننس" کو بطنِ اقتدار جنم دے گا، اور مسٹر سہروردی جیسے ہوا خواہ اس "غمزۂ ترکانہ" کی داد دیں گے کہ حضور کو عمرِ خضر عطا ہو۔ مخالفوں کو زیر کرنے کے لئے کیا شاہ ضرب لگائی ہے!!

ہماری نظر میں

...نسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

"انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"۔ از سید ابوالحسن علی ندوی۔ حجم ۱۴۳ صفحات۔ مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپے بارہ آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ اسلام۔ گوئن روڈ۔ لکھنؤ۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت علم و عمل کا سنگم اور حرکت و دانش کا مجمع البحرین ہے۔ اُن کا سینہ ملّتِ اسلامیہ کے لئے ...د ہمدردی سے بریز ہے۔ "خدمتِ دین" اور "رضائے الٰہی" اُن کے قلم و زبان کا موضوع اور اُن کی زندگی کا مقصود ہے۔ دین کے بارے میں ...احب موصوف کا نقطۂ نگاہ محدود نہیں۔ انتہائی وسیع اور بیکراں ہے۔ وہ اس عقیدے کے مبلّغ ہیں کہ اللہ کے دین کو زندگی کے ہر شعبہ پر غالب ...نا چاہیئے۔ اور اہلِ ایمان بہت دن تک مظلوم اور مجبور بن کر نہیں رہ سکتے۔ کائنات کی زمام کار کے جائز حقدار "صالحین" ہی ہیں۔ جب تک دنیا ...ی عنانِ قیادت غلط ہاتھوں سے چھین کر نیک لوگوں کے ہاتھوں میں نہ دی جائے گی انسان کی یہ درماندگی اور دنیا کی یہ بے چینی ختم نہیں ہو سکتی!

مولانا ابوالحسن علی میاں نے عربی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کا نام "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" تھا۔ یہ معرکۃ الآرا ...کتاب عرب ممالک میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کی افادیت اور اہمیت کی سب سے بڑی سند یہ ہے کہ مصر میں اخوان المسلمین کے تعلیمی اور ...بیتی سلسلہ میں اسے شامل کیا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں اس کتاب کا ترجمہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" کے نام سے شائع ہوا۔ اور ...د فاضل مصنف نے اپنی کتاب کو اُردو میں منتقل فرمایا۔ اس کے بعد اصل کتاب میں بہت سے مفید اضافے ہوتے رہے اور کمیت کے ساتھ کیفیت ...ی بڑھتی رہی۔ اب یہ کتاب نئے ابواب اور اضافوں کے ترجمہ کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے جس کو بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ اس اہم کام ...کا بڑا حصہ مولوی عبداللہ صاحب پھلواروی ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء کے قلم کار ہینِ منت ہے اور باقی کام مولوی محمد رابع ...ندوی اور مولانا محمد حسنی نے پورا کیا ہے۔ جس کے لئے یہ تینوں حضرات تمام اُردو داں طبقہ کی جانب سے شکریہ کے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ...جر کے مستحق ہیں!

اصل عربی کتاب پر مصر کے کئی علماء اور اہلِ قلم نے تعارف اور دیباچے لکھے تھے۔ مگر اُردو ترجمہ میں صرف سید قطب کا مقدمہ شامل کیا ...گیا ہے۔ سید قطب مصر کے نامور اہلِ قلم اور اسلامی رجحانات کے پُر جوش ترجمان ہیں انہوں نے مقدمہ کیا لکھا ہے۔ یُوں سمجھیئے کہ چند سطروں میں ...اتنی ضخیم کتاب کی "روح کھینچ لی ہے"!

کتاب کے شروع کے تقریباً سو صفحے "بعثتِ محمدی سے پہلے" کے عنوان کے لئے وقف ہیں۔ اس حصہ میں فاضل مصنف نے اس ...جاہلیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے جو حضورؐ کی بعثت سے پہلے دنیا میں پائی جاتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے کتاب کا یہ حصہ بہت اہم ہے اور ...مصنف کی وسعتِ نظر، تبحرِ علمی اور تاریخی معلومات کی شہادت دیتا ہے!

دوسرے باب کا عنوان "بعثتِ محمدی کے بعد" ہے۔ جس میں فکر و نظر، علم و عمل اور تہذیب و تمدن کے اس عظیم الشان انقلاب کو پیش

کیا گیا ہے، جو حضورؐ کی بعثت کے بعد ظہور پذیر ہوا۔ اس باب کی ایک ایک سطر ایمان افروز ہے۔ کتاب کے اس حصے کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف یقین و ایمان کی شمعیں روشن ہیں اور اُن مخلصین اور مجاہدین (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کا قافلۂ زندگی کی منزل میں رواں دواں ہے جن سے بہتر انسان (انبیاء کرام کے بعد) آج تک پیدا نہیں ہوئے!

"مسلمانوں کا دورِ قیادت" تیسرا باب اور چوتھا باب "مسلمانوں کا تنزل" ہے۔ اس باب میں مسلمانوں کے تنزل کا آغاز اور اس کے اسباب بتلائے گئے ہیں اور اس کے بعد کا باب پنجم بھی اسی متن کی شرح ہے۔ اس میں اُن تمام فتنوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے دنیا دوچار ہے!

"مغربی عہدِ اقتدار میں دنیا کے معنوی خسارے" اور "عالم اسلام زندگی کے میدان میں" یہ کتاب کے آخری باب ہیں۔ پوری کتاب اوّل سے آخر تک مصنف کی بلندیٔ فکر، ژرف نگاہی، فراستِ ایمانی، ذہانت اور علمی تبحر کی بولتی ہوئی شہادت ہے!

اس ماہ کا "نقشِ اوّل" اسی گرانقدر کتاب کے اقتباس سے مزیّن ہے۔ اس سے کسی حد تک اندازہ ہو سکے گا کہ مولانا علی میاں مدظلہٗ نے وقت کی ضرورت کا صحیح احساس ... کر کے یہ پیغام ملّت کے سامنے پیش کیا ہے —— اس ایک اقتباس کو پڑھیئے اور اندازہ لگائیے مصنف کی نبض شناسی کا۔

"فرائشِ دولت کے بحرانی عہد میں اور ڈیکلیشن کے پُرمعنی الفاظ ہیں۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت مند بن جانے کا شوق رکھنے والے" لوگوں کے اقتدار میں ایک زبردست تجارتی مقابلہ جاری ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تفریحی صنعتوں، آرائش کے سامان اور لباس و زینت کے انواع و اقسام کا ایک سیلاب ہر روز کارخانوں اور صنعت گاہوں سے شہروں پر اُمنڈ آتا ہے۔ بازار نئی نئی تراش خراش کے لباس، نئی نئی قطع کے جوتوں اور جُوتیوں سے اور دوسرے سامانِ آرائش سے جگمگاتے رہتے ہیں۔ پھر فوراً یہ چیزیں پُرانی اور فرسودہ قرار پا جاتی ہیں۔ اور بڑے نام و ترمیم کے ساتھ نیا سامان اُن کی جگہ لے لیتا ہے۔ زینت، حُسن و ترقی کا معیار روزانہ بدلتا ہے اور برابر بڑھ رہا ہے۔ اس میں بڑا دخل کاشانوں کی اس بے ضرورت تفریحی پیداوار اور اس مسابقت اور رقابت کو ہے جو تجارتی مرکزوں اور صنعت گاہوں میں کام کر رہی ہے۔ اور جو لوگوں کے اخلاق و معاشرت نیز قوّتِ خرید سے بالکل بے نیاز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی روز بروز گراں، معیارِ زندگی ہر گزرنے والے دن سے بلند، زندگی کے مطالبات اور فرضی لوازمِ زندگی روز افزوں اور اُن کی تکمیل کے لئے بڑی سے بڑی آمدنی ناکافی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قناعت ایک لفظِ بے معنی بنتا جا رہا ہے۔ سکون و اطمینانِ قلب خواب و خیال ہو گیا ہے۔ ہر شخص اپنے سامنے اپنے سے بلند معیارِ زندگی رکھتا ہے۔ اور وہاں تک پہنچنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہے۔ ایک مدّت اسی جد و جہد میں گزرتی ہے۔ جب وہ بامِ مقصود تک پہنچنے لگتا ہے تو وہ اور بلند ہو جاتا ہے اور ایک دوسرا بلند تر معیارِ زندگی سامنے آ جاتا ہے۔ اس طرح زندگی ایک غیر مختتم جد و جہد اور ایک ایسا ریس کا میدان ہے۔ جس کا سرا اور کوئی انتہا نہیں۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ ہے کہ زندگی میں تلخی اور کوفت بہت بڑھ گئی ہے اور جو گھر آسانی کے ساتھ جنّت کا نمونہ ہو سکتے تھے اور جن میں زندگی کے فطری و حقیقی لوازم سب پائے جاتے ہیں۔ کسی نہ کسی موہوم اور خیالی چیز کی کمی کی وجہ سے دوزخ کا نمونہ ہیں۔ حقیقی عیش اور قلبی سکون عنقا ہے!"

اور:-

"خدا طلبی کے بجائے یہ دنیا طلبی کا دور ہے۔ اس مغربی تہذیب و اقتدار کے دور میں دنیا طلبی اور شکم پُری کا جو طوفان آیا ہے اُس کے لئے بحران و ہیجان سے کم الفاظ کفایت نہیں کرتے۔ مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی بھوک اور ایک نہ بجھنے والی پیاس ہے۔ جس کو جوع البقر کہیئے یا استسقاء کا مرض۔ ہر طرف "ھل من مزید" کی صدا بلند ہے۔ زندگی کی ہوس اتنی بڑھ گئی ہے اور معیارِ زندگی اتنا بلند ہو گیا ہے کہ مسافرِ طمع کو کسی منزل پر قرار اور طائرِ حرص کا کسی بلند بام پر بھی آشیانہ نہیں۔ دولت اور عزّ و جاہ کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار اور اونچی سے اونچی سطح تشفّی کے لئے کافی نہیں ہے"

لوگوں کی بے ضمیری، بے مقصد زندگی اور غرض پرستی کا یہ عالم ہے:-

"اس زمانے کے اہلِ دانش نے اپنے علم، لیاقت اور ذہانت کو نیلام پر چڑھا رکھا ہے کہ جو زیادہ بولی بولے گا اس کے ہاتھ فروخت کر دیں گے، اگر کوئی اسلامی ادارہ ستر روپے دے رہا ہے اور کسی نصرانی ادارے نے ایک سو پانچ لگائے تو اس کی طرف منتقل ہو گئے۔ اگر کوئی یہودی اسٹیٹ قائم ہو جائے اور وہ پانچ بڑھا کر بولی دے تو اس کے ہاتھ بک جائیں گے۔ مناسبت موضوع اور ذوق کی بھی کوئی شرط نہیں۔ اگر حالات اجازت دیں تو محکمۂ تعلیم کا آدمی برائے نام ترقی پر پولیس کے محکمہ یا جہازرانی کے صیغہ کی طرف بخوشی منتقل ہو سکتا ہے۔"

"آج کسی انشا پرداز کو اس میں ذرا تکلف نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی قلم سے ایک مجاہدِ اعظم کی سیرت لکھے، پھر اسی قلم سے کسی قوم فروش کی منقبت لکھے۔"

لائق و فاضل مصنف نے عربوں سے بڑی حقیقت اور انتہائی حسنِ ظن ہے۔ انہوں نے کتاب کے آخری حصہ میں عربوں ہی سے خطاب کیا ہے۔ کہ ساڑھے تیرہ سو سال قبل دنیا کی قیادت انہوں نے کی تھی۔ وہ اب بھی تاریخ کو چاہیئے کہ اپنے کو دہرائے اور عرب پھر صالح قیادت کے سزاوار بن جائیں —!

مصنف کا یہ جملہ:-

"..... انہوں نے (بعض مسلمانوں نے) فلسفۂ اشراق کے مباحث اور وحدۃ الوجود کے مسائل میں اپنا ضرورت سے زیادہ وقت اور طاقت صرف کی۔" (صفحہ ۱۹۲)

اگرچہ حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ مگر ان طبائع پر گراں گزرے گا۔ جو "وحدت الوجود" کو صفتِ "احسان" کا سب سے بڑا مظہر سمجھتے ہیں۔ اور اس کے نہ ماننے والے کو نا آشنائے اسرارِ لدنی، بد توفیق اور اہلِ ظاہر کہتے ہیں۔

فاضل مصنف نے قرنِ اوّل کو مسلمانوں کے عروج و اقبال کا بہترین دور بتایا ہے اور صحیح بتایا ہے۔ مگر جب انہوں نے مسلمانوں کے انحطاط کا نقشہ کھینچا ہے تو وہ رخصت و صرفِ نظر کے اس مقام غنیمت تک آ گئے ہیں کہ اگر ہمارے امیروں، حاکموں اور دولت مند طبقہ میں صدیق و عثمانؓ کی جگہ کوئی "عبد الرحیم خانخاناں" ہی پیدا ہو جائے، تو بھی بڑی بات ہے۔ حالانکہ ؎

مدد عین خلق بہ حسن ہر ذرہ		بمارد ستے وبرو دیش آفتاب انداز

کتاب کا ترجمہ انتہائی شگفتہ، رواں، سلیس اور اثر انگیز ہے۔ کتاب پڑھنے میں محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ "ترجمہ" ہے۔ مولانا سید ابو الحسن ندوی نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف یہ کہ مسلمانوں پر بلکہ عصرِ حاضر پر احسان کیا ہے۔ یہ کتاب ان تمام مغرب زدہ لوگوں کے طنز و تعریض کا جواب ہے، جو دینی فکر پر "ملائیت" کی پھبتی چست کیا کرتے ہیں۔ یہ کتاب انہیں بتلائے گی کہ معیشت و اقتصادیات اور سیاست و تہذیب کے نازک سے نازک مسائل کی گرہ فراستِ ایمانی کس توازنِ فکر و ہوش کے ساتھ کھولتی ہے!

آدابِ اخلاق

"آداب و اخلاق" از:- منشی عبد الرحمٰن خاں۔ ضخامت ۴۱۶ صفحات۔ مجلد گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:- ایم ثناء اللہ خاں۔ ۲۶ ریلوے روڈ۔ لاہور۔

جناب منشی عبد الرحمٰن خاں صاحب نے یہ کتاب لکھ کر دین و اخلاق کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر

لہ "جب ان کے نفوس کے اثرات ان کے نفوس سے زائل ہو گئے"۔ (صفحہ ۱۴۰) اور "قہرمانی"۔ بس دو مقامات پر کھٹک پیدا ہوئی۔ (م۔ ق)

مشتمل ہے:-

(۱) باب العبادات۔ (۲) باب العلم۔ (۳) باب الاخلاق۔ (۴) باب الحقوق۔ (۵) باب البدن۔ (۶) باب الطہارت۔

(۷) باب المعاشرت۔ (۸) باب المعاملات۔ (۹) باب المتفرقات اور (۱۰) باب الموت۔

ہر عنوان کے تحت متعدد ذیلی ابواب ہیں۔ جن میں کتاب و سنت، سیرت و آثار۔ فقہ اور صلحائے امت کے تواتر و معمول کو سامنے رکھ کر آداب و اخلاق کی سہل اور آسان انداز میں تعلیم دی گئی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے یقیناً تزکیۂ قلب و دماغ ہوتا ہے، فاضل مرتب نے نفسیاتِ انسانی کا بھی ہر جگہ لحاظ رکھا ہے اور افراط و تفریط سے دامن بچانے کی کامیاب کوشش کی ہے!

"آداب النبی" کے تحت لکھتے ہیں:-

"ان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ نہ کسی کی اس درجہ ذہنی غلامی قبول کرے۔"

بات سو فیصدی ٹھیک ہے۔ مگر یہی بات جماعت اسلامی کی طرف سے کہی جاتی ہے تو بعض عقیدت کرام فتوؤں کی توپیں داغ دیتے ہیں کہ یہ گمراہی ہے اور اس عقیدے سے صحابہ کرام اور ائمہ کی توہین ہوتی ہے۔ (معاذ اللہ) ع

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند!

(صفحہ ۴۴) "جن انوار الٰہی کے مشاہدہ کی تاب موسیٰ علیہ السلام ایسا اولوالعزم پیغمبر نہ لا سکا وہ کلام پاک کے الفاظ میں مستور کر کے امت محمدیہ کو عطا فرمائے گئے"

قرآن کی عظمت اور نورِ ہدایت پر یہ عجیب و غریب دلیل لائی گئی ہے اور تدبر فی القرآن کا یہ عجیب انداز ہے؟

"آدابِ مشاعرہ" اور "آدابِ سماع" کے عنوان دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی!

"قوالی یعنی سماع ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اہلِ حق کے نزدیک یہ قطعاً حرام اور داخلِ گناہ ہے۔ امام سفیان، امام شافعی، امام مالک اور امام ابوحنیفہ سب کا اس پر اتفاق ہے۔ مگر بعض اہلِ تصوف کے نزدیک یہ نہ صرف جائز بلکہ داخلِ ثواب ہے . . . . "

کاش ان بعض "اربابِ تصوف" کے نام بھی لکھ دیئے جاتے۔ تاکہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو جاتا کہ سماع کو "داخلِ ثواب" سمجھنے والے کیا سفیان اور ابوحنیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے پایہ کے لوگ ہیں؟ "آدابِ سماع" کو کتاب میں شامل کر کے مرتب نے ایک فتنہ کا دروازہ کھول دیا ہے۔ مشاعرہ اور قوالی کے آداب بتانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بعض وقت زاویۂ نگاہ کو وسیع کرنے کی کوشش کتنی بے جوڑ ہو جاتی ہے!

صفحہ ۵۰ پر "کمنذرات و مزامات" نظر سے گزرا۔ اردو اور فارسی عربی کے لفظوں کے درمیان کی جگہ واو عطف کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔

"آدابِ چشم" کی جگہ "آدابِ نگاہ" ہوتا تو خوب تر ہوتا۔

صفحہ ۴۷۹ پر "لیلۃ القدر کی رات" پڑھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ــــ ان لغزشوں کے باوجود کتاب بہرحال مفید ہے۔ اور اس کے مطالعے سے دل و دماغ اچھا ہی اثر قبول کریں گے۔ منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے بڑے خلوص کے ساتھ کتاب کو مرتب فرمایا ہے۔ اور بڑے کام کی باتیں اس میں جمع کر دی ہیں۔ عبادات، معاملات اور حقوق میں اعتدال اور حسن کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ یہی اس کتاب کا موضوع اور مؤلف کا محورِ فکر ہے۔

شیخ نیازی

"شیخ نیازی" از:- رشید احمد صدیقی - ضخامت ۷۲ صفحات - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ -
ملنے کا پتہ:- سرسید بک ڈپو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ -

"بہت دن ہوئے ایڈیٹر پیام تعلیم (مکتبۂ جامعہ دہلی) کی فرمائش پر میں نے شیخ نیازی کے عنوان سے متعدد مضامین بڑی روا روی میں بچوں کے لئے لکھے تھے - جن کو بغیر اصلاح و ترمیم کے یکجا کر کے اسی زمانے میں شائع کر دیا گیا - بدلے ہوئے حالات کے رو سے[1] کتاب پر نظر ثانی کی بڑی حد تک اصلاح کر دی گئی ہے - جو اس سے پہلے راہ پا گئی تھیں - متعدد واقعات کا اضافہ کیا گیا - بہت سی باتیں نکال دی گئیں - زبان زیادہ آسان کر دی گئی - انداز بیان بدل دیا گیا - اس طرح بہ حیثیت مجموعی کتاب کچھ کی کچھ ہو گئی "

فاضل مصنف کے اس بیان سے اُن کی اس خصوصیت کا پتہ چلا کہ وہ اپنی لکھی ہوئی پچھلی تحریروں پر نظر ثانی اور اضافہ و ترمیم کر کے "کچھ کا کچھ" بنا دیتے ہیں - ہر انشا پرداز میں یہ استعداد نہیں ہوتی!

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نام ہی اُن کی کتاب کے دل چسپ اور باغ و بہار ہونے کی دلیل ہے - "شیخ نیازی" میں انہوں نے خوب خوب کردار نگاری کی ہے - بلکہ یوں کہیے کہ پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں اور پھول برسائے ہیں - رشید صاحب کے طنز و مزاح میں فلسفہ کی آمیزش بھی ہوتی ہے - اور اُن کی یہ خصوصیت بچوں کی اس ہلکی پھلکی کتاب تک میں پائی جاتی ہے -

جس بات کو ہم یوں لکھتے: "جواب دو" اس کو انہوں نے یوں لکھا تھا: "جواب دو" اتنا لطیف مزاح پہلی بار ہماری نظر سے گزرا -

"شیخ نے پھل توڑ کر منہ میں رکھ لیا - نتیجہ یہ ہوا کہ منہ کے اندر آتما پرماتما کی کھینچ تان شروع ہو گئی - ہونٹ نیلے پڑ گئے - زبان کھنچنے لگی - منہ سے جھاگ نکلنے لگے - گرتے پڑتے گھر واپس آئے - دوڑ دھوپ ہوئی - تھوڑی دیر میں آنکھیں کھول دیں اور چند دن میں تپیا کر کے اچھے ہو گئے" (صفحہ ۱۲)

"دوڑ دھوپ ہوئی" سے غالباً مضمون نگار کی یہ مراد ہے کہ شیخ جی کی دوا دارو کیلئے دُوسروں نے دوڑ دھوپ کی - اور "تپیا" سے اس مفہوم کا اظہار غالباً مقصود ہے کہ شیخ جی چند دن پرہیز کر کے اور بیماری کی تکلیف اٹھا کر اچھے ہو گئے - مگر اس جملہ میں "دوڑ دھوپ ہوئی" اور "تپیا" اکھڑے اکھڑے سے لگتے ہیں - ٹھیک طرح جوڑ بیٹھا نہیں -

اسی صفحہ پر میر حسن کے اس شعر میں ؎

نہ شدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی ۔۔۔ نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی!

کاتب صاحب نے اپنی یک رنگی اور یک نگری کا یہ ثبوت دیا کہ دونوں مصرعوں میں "جنگل" لکھ دیا -

"ڈھول دھپے کے بجائے دل لگی والے سے کام لیا گیا" (صفحہ ۱۵) "دل لگی والے" کی ترکیب کچھ عجیب سی ہے - مضمون نگار نے اس مفہوم کو زیادہ طویل جملہ میں ادا کرنے کے بجائے مختصر نویسی سے کام لیا ہے - جس سے تحریر میں جھول پیدا ہو گیا -

(صفحہ ۳۴) "مجھے رُکتا دیکھ کر مجمع بھی جہاں تہاں سے ڈگمگانے لگا" "مجمع کا جہاں تہاں سے ڈگمگانے لگا" ترقی پسندانہ انداز ہے - جو رشید احمد صدیقی جیسے بلند اور پختہ مشق انشا پرداز کو کسی عنوان زیب نہیں دیتا -

(صفحہ ۱۱۵) "اُسے بھی کسی نے کان سے پکڑ کر اٹھا لیا ہو" رشید صاحب بھی اس انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں - حیرت اور شدید حیرت! "سے" یہاں زائد ہے - "اُسے بھی کسی نے کان پکڑ کر اٹھا لیا ہو" ہونا اور لکھنا چاہیے - "سے" سے تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ "اس شخص کو کسی نے

---

[1] یہ جملہ اُلجھا اُلجھا سا ہے - (م - ق)

اپنے کان سے پکڑ کر اٹھا لیا۔

"طوطوں کو جیسا کہ تم جانتے ہو جو کچھ پڑھا دیجئے، وہ پڑھنے دہرانے لگتے ہیں" (صفحہ ۱۲۶) "پڑھنے دہرانے لگتے ہیں" یہ کیا اندازِ بیان اور اسلوب

نجاہے ہے؟ ممکن ہے کہ کتابت میں جلد کچھ سے کچھ ہو گیا ہو۔

"شیخ نیازی" دل چسپ اتنی ہے کہ پوری کتاب ختم کئے بغیر آپ اسے ادھوری چھوڑ کر کچھ اور کام کاج شاید نہ کر سکیں۔

کلیاتِ ولی

"کلیات ولی" مرتبہ :- سید نور الحسن ہاشمی۔ حجم ۴۳۱ صفحات۔ قیمت پانچ روپے۔

ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ کراچی۔

ولی (گجراتی یا دکنی) کا کلیات انجمن ترقی اُردو پاکستان نے تیسری بار دیدہ زیب ٹائپ پر شائع کیا ہے۔ جس کو جناب سید نور الحسن ہاشمی

نے مرتب فرمایا ہے۔ اس ایڈیشن کو کلیات ولی کے مستند قلمی نسخوں سے مطابق کر کے ترتیب دیا گیا ہے۔ طبع اول میں ۴۲۲ غزلیں تھیں۔

طبع دوم میں ۴۵۶ ہو گئیں۔ اور اس تیسرے ایڈیشن میں ۴۴۹ رہ گئیں۔ اسی طرح فردیات کے اضافہ و ترمیم کی یہ صورت ہے :-

طبع اول ۴۰ - طبع دوم - ۹۳ - طبع سوم ۸۶ -

فاضل مرتب لکھتے ہیں :-

"بعض شعر جو اُن کی طرف منسوب ہوتے تھے مگر اُن کے ثابت نہیں ہوتے نکال دیئے گئے۔ مثنوی "دہ مجلس" ولی ویلوری کی ثابت ہوئی نہ کہ

ولی اورنگ آبادی کی۔ اس لئے اس کو بھی خارج کر دیا گیا۔"

کلیات ولی کا پہلا ایڈیشن حضرت احسن مارہروی مرحوم نے مرتب فرمایا تھا۔ جسے ۱۹۲۷ء میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے مولوی عبدالحق

صاحب کے مقدمے اور ضمیمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کام کو سید نور الحسن ہاشمی کے ذوقِ جستجو نے اور آگے بڑھایا جس کے لئے وہ اُردو

کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

ولی کو اُردو شاعری میں وہی درجہ حاصل ہے جو چاسر کا انگریزی میں اور رودکی کا فارسی میں ہے! حیرت ہوتی ہے کہ اب سے تقریباً پونے تین

سال پہلے جبکہ اُردو زبان بالکل عالمِ طفولیت میں تھی اور گھٹنیوں چل رہی تھی۔ اتنا بلند پایہ شاعر کیسے پیدا ہو گیا کہ ۱۹۵۴ء میں جبکہ زبان کہاں

سے کہاں پہنچ گئی ہے، اس کے اشعار پڑھتے ہیں اور لطف لیتے ہیں۔ اگر تقدم "کوئی" "فضل" ہے۔ اور بلاشبہ ہے، تو ولی اس فضل و

شرف میں اپنا کوئی حریف نہیں رکھتا :-

اثر ہے میرے شعروں میں شرابِ پرتگالی کا
عجب کچھ لطف رکھتا ہے زمانہ نیم خوابی کا

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا

وفا کو ترک مت کر ہرگز اے دل! — محبت ہے وفا بن سست بنیاد

خوشہ چینِ جمالِ جاناں ہیں — خرمن ماہ و خوشۂ پروین!

اثر بادۂ جوانی سے — کر گیا ہوں سوال کچھ کا کچھ

اے ولی اُس بے وفا کی مہربانی پر نہ بھول — دل کا دشمن ہے مگر کرتا ہے باتیں پیار کی

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

وفا کر حُسن پر مغرور مت ہو — وفاداری بہارِ بے خزاں ہے

یہ قدم چھوڑ کر نہ جاؤں گا مجھ کو ہے تیرے خاک پا کی قسم

ہے یہ اسلام کے صحیفے میں چار اطراف صورت جدول

تپش دل نے دیا رعشۂ سیماب مجھے!

آج کل کا نازک خیال سے نازک خیال اور مشاق سے مشاق شاعر ان شعروں سے بڑھ کر اور کیا کہے گا؟ آج ہمارے سامنے اُردو زبان میں شعر و ادب اور خیال و اظہار کے بے شمار نمونے اور خاکے ہیں۔ مگر ولی کے سامنے تو ایک لوح سادہ و بے نقش تھی جس پر خود اس نے مرقعے بنائے ہیں۔

یہ زمین ہے

تو اس کی دید کو بے خود ہوا ہوتے صنم نکلے!

ولی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ جس پر غالب نے غزل کہی ہے۔

ولی جھلک کو "جھلکار" کہتا ہے۔ یہ لفظ اتنا حسین و شیریں اور نرم و نازک ہے کہ اسے آج بھی استعمال کرنا چاہیئے۔ ولی کا کلام بتاتا ہے کہ وہ خاصا پڑھا لکھا شاعر ہے ؎

یک دل نہیں آرزو سوں رہے خالی ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

ہر چند عالمگیر ہے تو حکمت اشراق میں

"حکمتِ اشراق" اور "خلا کا محال اور ملا کا ممکن" ہونا۔ یہ مسائل صرف سُنے سُنائے نہیں ہو سکتے۔ اس کے ماسوا وہ اپنے کلام میں سعدالدین تفتازانی کی مطول (شرح تلخیص المفتاح)، قطب الدین رازی کی قطبی (منطق کی درسی کتاب شمسیہ کی شرح)، ابن عرب شاہ کی اطول (قزوینی کی تلخیص المفتاح کی شرح)، لیلاوتی (علم حساب و ہندسہ کی ایک کتاب سنسکرت میں جس کا ترجمہ فیضی نے فارسی میں کیا) اور مختصر المعانی جیسی کتابوں کا ذکر کرتا ہے۔ جو دلیل ہے ولی کے صاحب علم ہونے کی۔ وہ اس سے بھی واقف ہے کہ عشاق اور حجاز عربی راگوں کے اور قانون ایک باجے کا نام ہے!

حیدرآباد دکن میں "ق" کا تلفظ "خ" کرتے ہیں۔ ولی نے بھی چقماق کو "چقماخ" باندھا ہے۔ ولی اگر واقعی گجرات ہی میں پیدا ہوا ہے۔ تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ گجرات میں "ق" کو "خ" بولتے ہیں۔ ورنہ اس حرف (ق) کا تلفظ اس گمان کو قوی کر دیتا ہے کہ ولی دکنی اور اورنگ آبادی ہے۔

ولی کے کلام میں ایسے لفظ بھی ملتے ہیں جو دلی اور لکھنؤ میں تو غالباً اب نہیں بولے جاتے مگر یو پی کے دیہات میں آج بھی رائج ہیں۔ مثلاً۔ "تیارنا" (جھاڑ دینا)۔ "جھلجھلاہٹ" (غصہ اور غیظ و غضب کا اظہار دواثر) "سنکل" (زنجیر)، "جوکھنا" (تولنا)۔ ولی کی زبان ظاہر ہے کہ ہمارے زمانہ کی زبان سے مختلف ہے۔ اور بعض الفاظ خاصے نامانوس ہیں۔ سورج کو "سرج"۔ چاہتا ہوں کو "چہتا" ہوں۔ نہیں کو "نئیں"۔ کوئی کو "کئی" اور "کو" کو "کوں" اس زمانے میں بولتے تھے۔ وہ "دراز ی" کا قافیہ "قاضی" اور "نسل" کا قافیہ "اصل" باندھتا ہے۔ اور عربی جاننے کے باوجود حَشر کو حَشَر۔ اور قَبْر کو قَبَر نظم کرتا ہے۔ دلی میں اب بھی جاہل قبر ہی بولتے ہیں۔

...ئے خلفائے راشدین۔ ؎۔ اقبال کا مصرعہ ہے "دیا ہے جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب"۔ ممکن ہے "پہاڑوں کی جگہ اقبال نے کچھ اور کہا ہو۔ کتاب اس وقت سامنے نہیں ہے۔ اور حافظہ نے شک میں ڈال دیا ہے) ولی کے اس مصرعے نے بتایا کہ اس انداز بیان اور اس ترکیب کی ایجاد کا سہرا ولی کے سر ہے۔ (م۔ ق)

اُتاںؔ ۔ کلولؔ ۔ بپاؔنتی ۔ بلاسؔ ۔ کلنکؔ ۔ روپنسؔا ــــ جیسے لفظوں کے معنی اگر نہ بتائے جائیں تو آجکل کون سمجھے گا !

ولی کے کلام میں ہوا و ہوس کی بہت زیادہ بھرمار پائی جاتی ہے۔ اس کی شاعری زلف و کمر، لب و رخسار اور محبوب کے قد و قامت کے ارد گرد گھومتی ہے۔ ہوسناکی کی انتہا ہے کہ کھیم داس، امرت لال اور گوبند لال ہندو لڑکوں کے نام لے کر ان کے حسن و جمال پر شعر کہے ہیں۔ آرٹ کے لحاظ سے اس میں چاہے کتنی بلندی کیوں نہ ہو۔ مگر اخلاقی اعتبار سے یہ گری ہوئی بات ہے۔ یہ اُس دور کے ماحول کا اثر ہے کہ مسلمان "تیغ و سناں" کو خیر باد کہہ رہے ہیں اور طاؤس و رباب کو ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں۔

ولی کی پُر گوئی کا یہ عالم ہے کہ غزل، فرد، رباعی، مستزاد، مخمس، قصیدہ، ترجیع بند، مثنوی، قطعہ، مثلث، چار در چار اور بازگشت۔ سبھی کچھ تو اُس نے کہا ہے۔ ولی کی بعض نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے بتدریج اپنی زبان کو سلیس اور ہمہ گیر بنایا ہے۔ اُردو زبان ولی کے احسان سے سُبک دوش نہیں ہو سکتی۔ اس کا نام کم سے کم قدامت کے اعتبار سے اُردو کے محسنوں کے تذکرے میں سرِ فہرست رکھنا پڑیگا۔

رباعیاتِ الہام "رباعیاتِ الہام"۔ از:۔ ڈاکٹر محمود نشہ ن راج سکینہ آلہام۔ ضخامت ۱۳۰ صفحات (مجلد) کاغذ، کتابت اور طباعت ہر چیز خوب سے خوب تر۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر۔ دفتر ادارۂ ادبیاتِ اُردو۔ خیرت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

جناب ڈاکٹر آر۔ آر سکینہ آلہام ایک مشاق اور پختہ کار شاعر ہیں۔ اُن کی مشاقی اور پختہ کاری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے شاعری میں صنفِ رباعی کو اختیار کیا ہے۔ موصوف کے مجموعۂ رباعیات پر تعارف ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اور پیش لفظ حکیم الشعراء امجد حیدر آبادی نے تحریر فرمایا ہے۔

ڈاکٹر سکینہ آلہام کی رباعیوں میں سادگی کے ساتھ فکر و خیال کا سُلجھاؤ ملتا ہے۔ وہ بات کو چیستان نہیں بناتے۔ جو کچھ کہتے ہیں عام فہم انداز میں کہتے ہیں۔ ان چند رباعیوں سے ہماری اس رائے کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے ؎

بچپن میں جو دیکھا وہ جوانی میں نہ تھا   جو آج ہے کل سرائے فانی میں نہ تھا
انسان تو ہے ایک خیالی خاکہ   یک[2] بلبلہ تھا ابھی کہ پانی میں نہ تھا

کام آئے گا کب تک یہ مرا دل یہ دماغ   جب صبح ہوئی تو جھلملائے گا چراغ
پڑتی ہے مری سالگرہ سال بہ سال   گھٹتا ہے سبو ادھر جو بھرتا ہوں ایاغ

آتا ہے زمانہ شور و شر سے لبریز   اُٹھے گا جہاں میں اک نیا پھر چنگیز
اے مردِ خدا! یہ تیری غفلت کب تک   برخیز بحقِ حق و ایماں برخیز

بعض رباعیوں میں فکر و خیال کی خستگی بھی ہیں ؎

(صفحہ ۱۰)

جیتے ہیں جو آج کل وہ گڑ جاتے ہیں   دو دن نہ رہے کہ واں بھی سڑ جاتے ہیں
حیرت یہ ہے کہ لوگ اس پہ بھی پر   کچھ حوصلہ پاتے ہی اکڑ جاتے ہیں

شاعر نے جن لفظوں میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ اُن سے رباعی بہت ہی پھسپھسی ہو کر رہ گئی ہے۔ پہلے دو مصرعے انتہائی مبہم اور بے جوڑ سے ہیں۔ "حوصلہ پانا" بھی یہاں محلِ نظر ہے !

---

[1] اب، فوراً (۲) مصیبت، بلا۔ (۳) نمائش (۴) خوشی، شادمانی (۵) کسی قدر (۶) روشنا۔
[2] کئی جگہ "اک" کو "یک" باندھا ہے جو زبان، سماعت اور وجدان پر گراں گزرتا ہے۔ (م۔ ق)

(صفحہ ۹۱) ہے اصل یہی کہ ڈینگ کی لیتا ہوں

محاورہ "ڈینگ لینا" ہے۔

ڈاکٹر سکینہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو اُردو زبان سے لگاؤ نہیں عشق رکھتے ہیں۔ اور جو زبان و ادب کے مسائل کو فرقہ واریت سے بلند ہو کر سوچتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس "نئے دکن" کے نہیں بلکہ اس "قدیم دکن" کی پیداوار ہیں۔ جب ہندو مسلمان ہل جل کر رہتے تھے۔ اور جہاں سبھائی فتنہ کو قلمروِ آصفیہ میں کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملا تھا!

اشک و آہ	"اشک و آہ" از:۔ فاضل زیدی۔ ضخامت ۲۸ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ محمد سرفراز۔ نیوز پیپر اینڈ کیمیکل ایجنٹ۔ نواب شاہ (سندھ)

"اشک و آہ" جناب فاضل زیدی کے کلام کا مجموعہ۔ بلکہ یوں کہئے کہ انتخاب ہے۔ جو ایک کتابچہ کی صورت میں منظرِ عام پر آیا ہے فاضل صاحب کو وطن چھٹنے کا بہت غم ہے اور سب سے بڑے غم کی بات یہ ہے کہ جس خطہ میں وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہاں بھی اُن کے اور دوسرے مہاجرین کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا۔ پھر حکومت کی سرد مہری اس پر مستزاد! یہی چوٹیں شعر کے قالب میں ڈھل گئی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس داستان کو اثر انگیز ہونا ہی چاہیئے۔

اُن کی شاعری کا یہ رنگ خوب ہے ؎

آڑ کے پہنچوں گلستاں تک اتنی طاقت بھی نہیں — چھوٹنا پابندِ رہنے کے برابر ہو گیا
آہ! یہ بھی خبر نہیں مجھ کو! — خانہ برباد ہوں کہ خانہ بدوش
کام مردوں کا نہیں ماحول سے ڈرنا کبھی — برق گرتی جائے، کاشانہ بناتے جائیے

دُوسرا رُخ:۔

جشنِ آزادی منائیں خاک اہلِ چمن — شادمانی کے جلو میں قتلِ عام آہی گیا (صفحہ ۶)

"قتلِ عام آہی گیا" خلافِ محاورہ ہے۔

چھٹ کے ہم خود ہی لڑ پڑے فاضل — رنگ لائی یہ کشش صیاد! (صفحہ ۱۰)

"لڑ پڑے" نے شعر کی لطافت کو خاک میں ملا دیا۔ یوں بھی شعر سپاٹ ہے!

سوچنے والے سوچتے ہی رہے — جانے والے گئے تڑاق پڑاق

"تڑاق پڑاق" تو "بولنے" کی صفت ہے۔ جانے، چلنے یا تیزی کے ساتھ چلنے کے لئے نہیں بولا جاتا۔

قحطِ انسانیت کا عالم اُف! — آدمی آدمی سے ڈرتا ہے

"اُف" کی جگہ "ہائے" ہوتا تو الف دامتزاز ہو جاتے۔ پھر آدمی سے آدمی کے ڈرنے کو "قحطِ انسانیت" کہنا بھی محلِ نظر ہے۔ یہ فن کار کا "نقشِ اول" ہے۔ یقین ہے کہ فاضل صاحب کے دوسرے مجموعے "نقشِ ثانی" اور "بہتر از اول" ہوں گے!!

رسالت خاتم النبیین	"رسالت خاتم النبیین" (جلد اول) تالیف:۔ سید عبد المجید خطیب۔ ترجمہ:۔ محمد عادل قدوسی گنگوہی۔ شائع کردہ:۔ حاجی سہار حب جی وجیہ الدین۔ ضخامت ۳۱۲ صفحات۔ قیمت چار روپے (پاکستانی)

ملنے کا پتہ:۔ انجمن اشاعت قرآنِ عظیم ۱۱۴ مرزا قلیچ بیگ روڈ نزد پارسی کالونی کراچی ۳۔

جناب سید عبد المجید خطیب (مندوب خاص و وزیر مختار دولت سعودیہ عربیہ برائے پاکستان) صرف "سفیر" ہی نہیں ہیں۔ بلکہ صاحب موصوف

عربی زبان کے بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ اُن کی انشاء اور شاعری اگرچہ قدیم طرز کی ہے مگر فصیح اور مستند ہے۔ خطیب صاحب مدینۂ حرم کعبہ کے معلم بھی رہ چکے ہیں۔ اس لئے اسلامی علوم میں درک و نظر رکھتے ہیں۔

اُن کی اس تالیف پر "تعارف" سلطان ابن سعود مرحوم کے شاعر خاص اور مملکت عربیہ سعودیہ کی مجلس شوریٰ کے نائب صدر صاحب السعادۃ شیخ ابراہیم غزاوی نے لکھا ہے۔ اور کتاب کا ترجمہ مولانا محمد عادل قدوسی گنگوہی نے کیا ہے۔ جو اس وقت سفارت سعودیہ (کراچی) میں شعبۂ اسلامیات کے ناظم ہیں اور تقسیم ہند سے پہلے دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کے رکن تھے۔

ترجمہ خاصہ رواں اور شگفتہ ہے۔ یہ فقرہ۔ " اور حضرت محمد ابن عبد اللہ نے یہ لا حاصل سعی فرمائی کہ اکابر قوم میں سے کسی کو پالیں۔ (صفحہ ۱۸۰) الجھا الجھا سا ہے۔ نہ جانے مؤلف کیا کہنا چاہتا ہے اور ترجمہ میں آکر اس کا مفہوم کیا سے کیا ہوگیا ؟

کتاب کوئی شک نہیں ہے کہ بڑی محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے اور قرآن کی آیات سے حضورؐ کی سیرت نگاری میں مؤلف نے خوب کام لیا ہے۔ جو دلیل ہے کتاب کے مستند، وزنی اور باوقار ہونے کی !

فاضل مصنف نے عبد و معبود اور نبوت و الوہیت کے فرق کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں مبالغہ کو راہ نہیں دینے دیا یہ کوشش یقیناً قابل تعریف ہے۔ مگر اس احتیاط نے کہیں کہیں تحریر کو خشک اور کھردرا بنا دیا ہے یہی باتیں علامہ شبلی نعمانی سید سلیمان ندوی اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری لکھتے تو دوسرے انداز میں لکھتے۔

اس تالیف میں حضورؐ کی پیدائش کی تاریخ ۱۲۔ ربیع الاول مطابق ۲۰۔ اگست ۵۷۰ء درج ہے۔ مگر مولانا شبلی نعمانی نے مصر کے مشہور ہیئت داں عالم محمود پاشا فلکی کے حوالہ سے تاریخ ولادت ۹۔ ربیع الاول مطابق ۲۰۔ اپریل ۵۷۱ء لکھی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قرآن کی جن آیتوں کو پڑھ کر ایمان لائے ہیں۔ اُن کو اس کتاب میں سورۂ حدید (پارہ ۲۷) کی ابتدائی آیات لکھا ہے۔ حالانکہ سورۂ حدید مدنی ہے اور حضرت عمرؓ مکہ میں ایمان لائے تھے۔

(صفحہ ۲۲۳) " انہوں نے اس نظریہ میں ہند ام ہانی بنت ابی طالب زوجہ مطہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان سے استدلال کیا ... " مؤلف سے یہ عجیب چوک ہوگئی ہے۔ ہند ام ہانی تو حضرت علی مرتضیٰ کی حقیقی بہن تھیں اور ان کا نکاح ہبیرہ بن ابی وہب سے ہوا تھا۔ جو نجران کو بھاگ گیا تھا۔ حضرت ام ہانی کو زوجہ رسول اللہ لکھنا درایت و روایت کسی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے۔

(صفحہ ۱۲۵) ان (عبد المطلب) کے دس فرزند تھے۔ جن میں سب سے چھوٹے فرزند عبد اللہ سے آپ کو بہت محبت تھی " حالانکہ عبد المطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے حضرت عباس تھے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔

صفحہ ۲۰۸ پر کتابت کی ایک غلطی نظر آئی۔ حفصہ کی جگہ خفصہ ـــ !

کوئی شک نہیں کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ع

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

کے شاعرانہ نظریہ کی یہ کتاب تردید کرتی ہے !

اسلام کا نظام عفت و عصمت

" اسلام کا نظام عفت و عصمت " از:- مولانا محمد ظفیر الدین صاحب پورہ نوڈیہاوی[1]۔ مجم ۲۹۰ صفحات - مجلد (گرد پوش کیساتھ) پانچ روپے۔ غیر مجلد چار روپے ملنے کا پتہ :- ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی -

---

[1] اپنے وطن سے محبت اور اس کا اظہار اپنی جگہ درست۔ مگر اس وطنی نسبت کے ساتھ پورا نام کتنا غیر شاعرانہ ہوگیا۔ اگر مولانا ظفیر الدین صاحب ہمارا مشورہ قبول فرمائیں تو اپنے نام کے ساتھ " پورہ نوڈیہاوی " لکھنا یک قلم بند کر دیں۔ (م۔ ق)

کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں کیا ہوگا؟ چند اہم ابواب :-

اسلام سے پہلے عورتوں کی حیثیت —— اسلام کی اصلاحی جدوجہد عورتوں کے حق میں —— عورتوں کی عصمت وعفت کا تحفظ اسلام میں —— شادی سے اجتناب اور اس کے نقصانات —— عفت وعصمت کی اہمیت اسلام میں —— شادی کرنے والوں کے اختیارات و فرائض —— شوہر کے فرائض و اختیارات —— بیوی کے فرائض و اختیارات —— عصمت وعفت کے تحفظ کے لئے چند ضروری قوانین —— دشمنانِ عفت وعصمت اسلام کی نظر میں۔

کتاب اپنے موضوع پر انتہائی مفید اور کامیاب ہے۔ جنسی روابط اور ازدواجی تعلقات کے بہت سے ضروری گوشے اس میں آ گئے ہیں۔ اس زمانے میں جبکہ مغرب زدگی اور کمیونزم نے عفت وعصمت کی قدروں ہی کو سرے سے الٹ کر رکھ دیا ہے، یہ کتاب عصمت و عفت اور اخلاق وحیا کا ایک صحیفہ بن کر منظر عام پر آئی ہے۔ مصنف کا اندازِ تحریر بہت ہی سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ احتیاط اور اعتدال اس تالیف کی خصوصیت ہے۔

آئینِ وراثت

"آئینِ وراثت": از:- قاضی محمد زاہد الحسینی۔ حجم ۴۸ صفحات۔ قیمت ۶ آنہ۔
ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت شمس آباد۔ ضلع اٹک (پاکستان)

شریعت کی رُو سے آئینِ وراثت کیا ہے اور ترکہ کی تقسیم کس طرح ہوتی ہے؟ یہ کتاب اسی موضوع پر مرتب کی گئی ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ بڑے کام کی کتاب ہے۔

عصبہ — حجب — تصحیح — عدل — رد — مناسخہ — تشبیب — اور توافق جیسی فقہی اصطلاحیں آج لکھے پڑھے مسلمانوں کے لئے اجنبی اور نامانوس ہیں۔ اس کتاب میں ان سب کی تشریح ملے گی۔ مسائل کو آسان مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔ "علم الفرائض" پر یہ نہایت ہی کارآمد کتاب ہے اور اردو دانوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔

القول السلیم

"القول السلیم فی السبط الیتیم (یعنی پوتے کی میراث)" از:- رشید احمد لدھیانوی۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت چھ آنہ۔
ملنے کا پتہ :- رشید احمد مدرس جامعہ دینیہ دارالہدیٰ ٹھیڑھی ریاست خیرپور میرس۔

پنجاب قانون ساز اسمبلی میں پوتے کی وراثت کا مسئلہ اب سے چند ماہ پہلے پیش ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں اخباروں کے صفحات پر متعدد مضامین اس موضوع پر نظر آئے۔ اصل فتنہ رسالہ "طلوعِ اسلام" نے برپا کیا تھا۔ کہ آج کل قرآن اور اسلام کے نام پر فتنوں کی "ایجاد" بس "طلوعِ اسلام" کا حصہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اس میدان میں وہ بہت سے فتنہ پردازوں کو پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

جناب مولانا رشید احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس مسئلہ کو کتاب وسنت کی روشنی میں واضح کیا ہے! اور "طلوعِ اسلام" کے اعتراضات کی تو دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔

"قتل مرتد"۔ "تعدادِ ازدواج"۔ "پوتے کی وراثت"۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کو "منکرینِ حدیث" اور مغرب زدہ لوگوں نے نشانۂ ملامت بنا رکھا ہے۔ یہ وہ حضرت ہیں جو دین کے مسائل کو خود حاملِ دین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی تعبیر و تشریح، اور قول و عمل سے ہٹ کر سوچتے ہیں۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ یہ گمراہی عام ہوتی جا رہی ہے۔

سلہ۔ "کام دکاج" (صفحہ ۱۹۲) وہ عطف کی ضرورت ہی نہ تھی۔ (م۔ق)
سٹہ۔ یہ قیمت عوام سے لی جائے گی مگر مدرسوں سے ایک روپیہ اور وکیلوں سے دو روپے۔

جس کے بس میں جتنا بھی ہے اُسے اس طوفانِ ضلالت کو رد کرنے کے لئے جد و جہد کرنی چاہیئے۔

ہفتہ وار پیغام | "ہفتہ وار پیغام"۔ مدیر:- ابوالبیان حمّاد۔ چندہ سالانہ تین روپے، بیرونی تین روپے آٹھ آنے۔ (قیمت فی پرچہ ایک آنہ) ملنے کا پتہ:- منیجر ہفتہ وار "پیغام" نمبرہ ڈسپنسری روڈ۔ بنگلور ۱۔

ہفتہ وار "پیغام" ایک دینی اور اخلاقی جریدہ ہے۔ جو ہر ہفتہ دُنیا کو اسلام کا پیغام دیتا ہے۔ اس کے مضامین بلند اور مفید ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آج اسلام کی دعوت کو سُن کر کوئی ان سُنی کردے۔ مگر یہ غفلت دیر تک جاری نہیں رہ سکتی۔ صداقت دلوں میں گھر کر کے رہیگی۔ طائف اور مکہ کے لوگ تیرہ سال تک ٹال دیتے اور اللہ تعالیٰ کے پیغام کو ہنسی میں اڑاتے رہے۔ مگر آخر کار حق و صداقت کے آگے ان کی غفلتوں کو سپر ڈال دینی پڑی۔

مولانا ابوالبیان حمّاد کو ہم اس پرچہ کی کامیاب ادارت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور حقیقی اجر تو بفضل اللہ تعالیٰ ہی عطا فرمائے گا۔

ماہر القادری (مدیر فاران)

کے سفرِ حجاز کی پہلی قسط (کراچی سے مکہ تک) نومبر کے "فاران" میں آچکی ہے۔ اسی کتاب سے مکتبہ فاران کا آغاز و افتتاح ہو رہا ہے۔ اور یہ کتاب انشاء اللہ مکتبہ فاران سے شائع ہوگی۔ کتاب کے نام۔ قیمت اور ضخامت وغیرہ کی تفصیلات آئندہ پرچے میں آپ کو ملیں گی۔ اب تک جو خطوط ہمارے پاس آئے ہیں وہ بہت حوصلہ افزا ہیں۔ ہر طبقہ میں ماہر القادری کے ان تاثرات (زیارتِ حرمین) کو پسند کیا گیا۔ یہ کتاب دینی رجحانات اور ادب و انشاء کا نادر مرقع ہوگی۔

بعونِ اللہ تعالیٰ

جلد (٦) ماہنامہ نمبر (۱۱)

فاران

فروری ۱۹۵۵ء —— ایڈیٹر —— ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ر
آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱ر

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی نمبر (۱)

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپنے گھر کی بد انتظامی اور انتشار کو دیکھ کر ہر کسی کو دُکھ ہوتا ہے۔ کوئی چاہے کتنے ہی ضبط و تحمّل سے کام کیوں نہ لے۔ مگر یہ ایسا غم ہے جو چھپائے سے چھپ نہیں سکتا۔ شدید ضبط کے باوجود ایک آدھ آہ تو نکل ہی جاتی ہے۔ ہاں! وہ شخص جو اپنے دل کو بالکل پتھر بنالے اور گھر سے اتنا بے تعلق اور بے پروا ہو جائے کہ گھر کے بننے بگڑنے کی اسے ذرا سی بھی فکر نہ ہو۔ وہ اپنی بے حسی کے لئے البتہ معذور ہے۔

اپنے گھر کے بڑے بوڑھوں اور بزرگوں کو ٹوکنا اور اُن پر تنقید کرنا ہر اُس شخص کے لئے جو عزت مند اور صاحب تمیز ہے اور جو حفظِ مراتب کی حدود بھی پہچانتا ہے، تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بزرگوں کی بھول چوک اُن کے خورد نظر انداز ہی کر دیتے ہیں۔ مگر جب معاملہ گھر کی بدنظمی بلکہ گھر کے بگاڑ کی حد تک پہنچ جائے تو پھر بزرگوں پر تنقید فرض ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ فرض ناگوار ہوتا ہے مگر اسے بہر حال ادا کرنا پڑتا ہے!

پاکستان میں اِنہی حالات سے ہم دوچار ہیں۔ یہاں کی برہمی اور بدنظمی کو دیکھ کر افسوس ہے کہ ہم ضبطِ غم پر قدرت نہیں رکھتے اور دل کا غم قلم اور زبان پر آئے بغیر نہیں رہ سکتا! اگر یہ صرف ہمارا ذاتی اور شخصی معاملہ ہوتا تو بڑی سے بڑی زیادتی اور بے عنوانی کو گوارا کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ تو پوری ملّت کا مسئلہ ہے۔ یہ تو قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر ہم اِن حالات کو دیکھتے ہوئے سرسری گزر جائیں اور کسی خوف یا مروّت کے سبب کچھ نہ کہیں تو ہماری یہ خاموشی جرم سمجھی جائے گی۔ اور یہ الزام اپنے سر لینے کے لئے ہم کسی قیمت پر تیار نہیں ہیں!

پاکستان سے ہمارا تعلق یہاں کی جغرافیائی حدود۔ دریاؤں، جھیلوں، جنگلوں، بستیوں، پھلوں، میووں اور کھیتوں کی پیداوار کا نہیں ہے بلکہ اس خطۂ پاک سے ہمارا رشتہ "اسلام" کا رشتہ ہے۔ جو نسل و رنگ اور قوم و وطن کے تمام رشتوں سے

زیادہ جامع اور مضبوط ہے۔ سب رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مگر یہ رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ تو تارِ نفس کے ساتھ وابستہ ہے۔ پاکستان کی سرزمین کا چپہ چپہ ہمارے نزدیک مسجد کی طرح مقدس ہے۔ اس لئے پاکستان کی حفاظت اور اس کی ترقی و استحکام کے لئے جدوجہد ہمارے دین و ایمان کا تقاضا ہے!

ہم نے بار بار کہا ہے اور آج پھر اپنی اس گزارش کو دہراتے ہیں کہ جائزہ و تنقید میں اگر کوئی نادرست اور غیر واقعی بات ہمارے قلم سے نکل جائے تو ہمیں اس پر متنبہ کر دینا چاہیئے۔ ہم اپنی واقعی غلطی کے اعتراف میں انشاء اللہ کبھی ہچکچائیں گے نہیں۔ کہ مقصد اصلاحِ حال ہے۔ کسی پر تہمتیں جوڑنا ہمارے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ اور مسلمان کی زبان و قلم شدید سے شدید اختلاف کی صورت میں بھی اپنی ذمہ داری اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا خیال رکھتے ہیں!

یہ انقلابات؟

کسی مریض کے جسم کا اگر کوئی عضو خراب ہو جائے تو اس کا آپریشن یقیناً ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر آپریشن کے بعد جسم سے جو خون نکل جاتا ہے اس کی تلافی بھی ضروری ہے! اگر کوئی ڈاکٹر مریض کے جسم پر آپریشن تو کرتا ہے لیکن اس کے جسم کے لئے خون کا بندوبست نہ کرے تو اس مسلسل عمل جراحی کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ مریض نیم جان ہو جائیگا۔ پاکستان کی حالت ٹھیک اس مریض کی سی ہے جس کے جسم پر جلد جلد عمل جراحی کیا گیا ہے۔ اور ہوتا یہ رہا ہے کہ آپریشن کے زخم کا اندمال بھی پورے طور پر نہیں ہونے پایا کہ آپریشن تھیٹر میں پھر دوسرے آپریشن کے لئے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہر عمل جراحی کے بعد مریض کی ٹہل اور دیکھ بھال کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم میں ادلا بدلی کی جاتی ہے۔ پچھلے ڈاکٹروں میں سے کچھ علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ڈاکٹر لائے جاتے ہیں۔ کچھ بدستور باقی رہتے ہیں۔ اور ہر آپریشن کے بعد دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ پچھلے ڈاکٹروں کی بے عنوانی اور غفلت کے سبب اس عمل کی ضرورت پیش آئی۔ اب جو تیماردار مقرر ہوئے ہیں اُن کی تیمارداری اور فرض شناسی مریض کو بھلا چنگا بنا دے گی۔ لیکن کچھ دن کے بعد پھر سیاست کا نشتر حرکت میں آتا ہے۔ اور پھر وہی سب کچھ ہوتا ہے جو اس سے پہلے ہو چکا ہے!

اوّل تو ہر بیماری کا علاج آپریشن نہیں ہے۔ پہلے دوا دارو کرنی چاہیئے کہ اس طرح بھی بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں۔ آپریشن تو آخری تدبیر ہے اور اگر آپریشن ناگزیر ہو جائے تو آپریشن کے بعد مریض کے جسم کی توانائی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اور پھر جلد جلد آپریشن کا ہونا خطرے کی نزاکت سے خالی نہیں! کوئی سرجن چاہے کتنا ہی نیک نیت اور مریض کا خیرخواہ کیوں نہ ہو مگر اصول جراحت کی غلطی تو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی!

مریض اور آپریشن کی تو ایک مثال تھی جو افہام و تفہیم میں سہولت پیدا کرنے کے لئے دی گئی ہے۔ مقصود گزارش یہ ہے کہ پاکستان میں تخریب و تباہی کا خطرہ دکھا کر تعمیر و اصلاح کے نام پر جو انقلابات جلد جلد لائے گئے ہیں۔ انہوں نے ملک کو حیرت و تشویش کے درمیان لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ جس ملک میں اس قسم کی خبریں گشت لگاتی رہتی ہوں کہ فلاں بات یوں ہو گئی تو ملک میں ملٹری رُول قائم ہو جائے گا۔ اس ملک کے عوام کی مجبوری اور بے بسی کو پُرسانہ دیجئے تو اور کیا کیجئے!

ہم اربابِ اقتدار سے اُن کی کرسیوں کی بلندی کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ دستور ساز اسمبلی توڑنے سے پہلے ملک میں برہمی و انتشار کا جو عالم بتایا جاتا تھا۔ کیا وہ ضبط و اطمینان اور سکون و خوش اندیشی سے بدل گیا؟ اصلاحِ حال کی طرف کونسا قدم بڑھا؟ عوام کے کس مطالبہ کو پورا کیا گیا؟ دلوں کی جراحتوں پر کتنے مرہم رکھے گئے؟ اگر اربابِ حکومت کے پاس ملک کے صحیح حالات پہنچائے جاتے ہیں اور وہ عوام کے جذبات و احساسات سے بے خبر نہیں رکھے جاتے تو پھر ہمارے

ان سوالات کا جواب دیتے وقت .... ع

پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے !

کا سماں اگر پیدا نہ ہو تو اور زیادہ افسوس کی بات ہے ۔۔۔ !

جتنے مختلف الخیال اور متضاد الصفات وزراء پاکستان کی موجودہ کابینہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں - اس انداز کے وزراء صدیوں، اور قرنوں پہلے کے دَور میں ہوں تو ہوں - مگر اس دَورِ جمہوری کی تو کسی حکومت میں نہیں پائے جاتے ! اس اختلافِ مزاج اور تضادِ خیال کا نتیجہ یہ ہے کہ اخبارات میں آئے دن متضاد قسم کے بیانات آتے رہتے ہیں - ایک صاحب فرماتے ہیں کہ پاکستان کا دستور اسلامی اصول پر مرتب ہوگا - دوسرے "عزت مآب" بیان دیتے ہیں کہ سرے سے دین و سیاست کی یکجائی ہی غلط اور ناقابلِ عمل ہے - ایک وزیر صاحب کا ارشاد ہے کہ میں نے جمہوریت بحال کرانے کے لئے وزارت کے عہدے کو قبول کیا ہے - دوسرے صاحب کہتے ہیں کہ پاکستان ابھی جمہوریت کے قابل کہاں ہوا ہے - ایک "آنریبل منسٹر" بھاشانی صاحب کو پکا کمیونسٹ اور پاکستان کے مفاد کے لئے انتہائی خطرناک سمجھتے ہیں اور نہ صرف اپنے دل میں سمجھتے ہیں بلکہ اس کا بار بار اعلان فرما چکے ہیں - مگر دوسرے وزیر صاحب (بالمقابل) ان کو پاکستان کا بہت بڑا خیرخواہ بتاتے ہیں -

ہمارے وزیر اعظم بہادر نے مسٹر فضل الحق کو پاکستان کا غدّار اور نادہندہ دار کہا ہے - مگر ساتھ ہی یہ خبر بھی مشہور ہے کہ مسٹر ابوحسین سرکار کو پاکستان کے اسی غدّار کے مشورے کی بناء پر کابینہ میں لیا گیا ہے - بات بہت طولانی ہو جائے گی - صرف ایک مثال لو :-

فکر و نظر، سیاسی معتقدات، عام زندگی اور پولیٹیکل لائف کے اعتبار سے ڈاکٹر خان صاحب اور مسٹر اصفہانی میں کوئی "وجہ شبہ" بھی پائی جاتی ہے؟ "بعد المشرقین" کی اصطلاح شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے وضع کی گئی ہے !

ضبط و آئین کے احترام کا یہ عالم ہے کہ دستور ساز اسمبلی کا مقدمہ عدالت عالیہ میں ابھی چل ہی رہا ہے - مگر عارضی دستور کی تیاری کا اعلان کیا جا رہا ہے - حالانکہ عوام بار بار احتجاج کر چکے ہیں کہ عارضی دستور ہمیں نہیں چاہیئے - ہمیں مستقل دستور دو - اور کتاب و سنت کی بنیادوں پر دو - کہ پاکستان اسی مقصد کے لئے وجود میں آیا ہے !

مسٹر کھوڑو کی سیاسی زندگی کیا رہی ہے ؟ وہ سب کو معلوم ہے - ان حضرت کی پولیٹیکل لائف کا شاید کوئی گوشہ بھی عوام سے چھپا ہوا نہیں ہے - مگر انھیں سندھ کی وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر بٹھانے کے لئے "پروڈا" منسوخ فرمایا گیا اور انہوں نے "وَن یونٹ" (one unit) کی تائید کے لئے جس دھمکی اور دباؤ کے ساتھ سندھ کے ارکانِ اسمبلی کی رائیں حاصل کی ہیں - اس نے جمہوریت تو کیا عام اخلاق اور انسانی حقوق کو بھی شرمندہ کر دیا ہے - مار کھو، رشوت، حوالات اور جیل خانے کے خوف سے زبانوں پر مہریں لگ گئی ہیں - لیکن ان باتوں نے نفرت و برہمی کا دلوں میں جو بیج بو دیا ہے - اس کے نتائج کیا کم خوفناک نکلیں گے - "وَن یونٹ" کی اسکیم دلوں کو جوڑنے کے لئے پیش کی گئی تھی یا انھیں پھاڑنے اور پراگندہ کرنے کیلئے !

"وَن یونٹ" کا جب شروع شروع میں اعلان کیا گیا تھا تو بتایا گیا تھا کہ اس اسکیم کی بدولت صوبہ پرستی کی لعنت ختم ہو جائے گی - کہ اس کم بخت نے پاکستان میں عجیب انتشار پھیلا رکھا ہے - مگر جب "وَن یونٹ" کی تفصیلات سامنے آئیں تو پتہ چلا کہ صوبہ پرستی کا تھوڑا سا اُوپری خول تو ضرور اتر جائیگا - مگر صوبہ پرستی کے جراثیم پورے طور پر فنا نہ ہوں گے - کہ صوبہ پرستی کی وبا کے داخل ہونے کے لئے اس اسکیم میں بھی رخنے موجود ہیں ۔۔۔ !

قصرِ دیوان کی سیاست کا اب یہ رنگ ہو گیا ہے کہ دورِ انگریز کے منظورِ نظر کنٹریکٹر تک اس میں دخیل ہو گئے ہیں۔ اور ان کے اثر و نفوذ کا یہ عالم ہے کہ ان کے رشتہ دار صرف ان کے قرابتی تعلق کی وجہ سے مرکزی وزارت میں لے لئے جاتے ہیں۔ یہی وہ باتیں ہیں جن سے رفتہ رفتہ بسا اوقات سیاست بساطِ شطرنج بن کر رہ جاتی ہے!

اخوان المسلمین پر جمال ناصر کی فوجی حکومت نے جو شرمناک مظالم کئے ہیں۔ وہ انسانی تاریخ کے سیاہ ترین اوراق میں ہیں۔ حجاج اور ابن ہبیرہ اپنے ظلم و ستم کے لئے بہت مشہور ہیں۔ مگر جمال ناصر نے درندگی اور بہیمیت میں ان سب کو منزلوں پیچھے چھوڑ دیا۔ مصر کے واقعات نے ہر مسلمان کا دل پارہ پارہ کر دیا ہے۔ مگر پاکستان میں "ٹائمز آف کراچی" نام کا ایک ایسا پرچہ بھی موجود ہے۔ جس نے اپنے ایک طویل اداریہ میں "اخوان" کو مجرم اور جمال ناصر کے مظالم کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی جماعتِ اسلامی کو بھی اس لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ایک صحافی کے اپنے ذاتی خیالات ہو سکتے ہیں، اور ہر شخص کو اپنے شخصی خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ مگر حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ پنجاب کی حکومت نے "کراچی ٹائمس" کے اس اداریہ کا اردو ترجمہ شائع ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کیا ہے۔ صرف یہ واقعہ اس امر کی پردہ کشائی کے لئے بہت کافی ہے کہ موجودہ دور میں ہمارے "بڑے لوگوں" کے ارادے اور عزائم کیا ہیں۔ دینی تحریکوں کو وہ کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کس قسم کی "صحافت" کی وہ پشت پناہی کر رہے ہیں—!

مسلم لیگ اور عوامی لیگ کے سلسلہ میں مسٹر سہروردی اور ملک فیروز خاں نون کے جو حریفانہ بیانات اخباروں میں آئے ہیں۔ وہ کیا صرف دو آدمیوں کے شخصی بیانات ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے! ان کے پیچھے دو مستقل پارٹیاں ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار کی رسہ کشی کے لئے اسباب فراہم ہوتے جا رہے ہیں—!

ذمہ دار کون ہے؟

ہمارے گورنر جنرل مسٹر غلام محمد (بالقابہم العالی) نے سیرۃ النبیؐ کے ایک جلسہ میں "محمدؐ کی غلامی" پر فخر و ناز کا اظہار کیا تھا اور انہوں نے یہ بہت اچھی بات کہی تھی کیونکہ اطاعتِ رسولؐ ہی دین و ایمان کی بنیاد ہے۔ مگر ہم انتہائی ادب و احترام کے ساتھ گورنر جنرل بہادر سے یہ دریافت کرنے کی جرأت کر رہے ہیں کہ جن کی غلامی پر وہ فخر کرتے ہیں۔ انہوں نے معروف و منکر کا جو نظام پیش فرمایا تھا۔ ان میں سے کس "معروف" کو پاکستان میں قائم کیا گیا اور کس "منکر" کو مٹایا گیا—!

عوام جو اسلام کے لئے احتجاج کرتے رہتے ہیں۔ ان کے قبضہ و اختیار میں اتنا بھی نہیں ہے کہ کسی شراب خانہ اور ناچ گھر کے دروازے کی ایک کھڑکی کو بھی وہ بند کر سکیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو انگریز کا بنایا ہوا قانون ان کی گوشمالی کے لئے موجود ہے۔ مگر ہمارے گورنر جنرل بہادر تو عوام کی طرح مجبور نہیں ہیں۔ حکومت کی ساری مشینری ان کی مٹھی میں ہے۔ دستور ساز اسمبلی کو توڑنے اور وزارتوں کو برخاست کرنے والی قوت اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے قائم کرنے میں صرف ہوتی تو پاکستان آج تمام دنیا کے لئے ایک نمونہ ہوتا اور اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظاموں کو ہم چیلنج کر سکتے تھے۔ کہ دیکھو! یہ وہ مثالی حکومت ہے جو عوام کے فلاح و نجات کی ضامن اور فطرتِ انسانیت کے عین مطابق ہے—!

ہو سکتا ہے کہ "دستور" (Constitution) کی بعض جزئیات میں ہمارے گورنر جنرل بہادر کو علماء کی ... سے اور پاکستان دستور ساز اسمبلی کی تجاویز سے اتفاق نہ ہو۔ جزئیات میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر جن چیزوں کو

کتاب و سنت میں "منکر" کہا گیا ہے۔ اُن میں تو دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ اُن کے مٹانے اور تغیر کرنے میں آخر اب تک پس و پیش کیوں ہوتا رہا؟

"ملّا کے پیش کئے ہوئے اسلام" سے اگر انھیں اختلاف ہے تو جس اسلام کو وہ حقیقی اسلام سمجھتے ہیں اسی کو قائم فرما دیتے ۔۔۔!

قیامت کے دن ہر راعی سے اس کی رعایا کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ یہاں تک کہ ایک مزدور سے اس کے چھوٹے سے گھر کی ذمہ داریوں پر پوچھ گچھ کی جائے گی! وہ شخص جس پر ایک حکومت کی ذمہ داریاں ہوں اس کی مسئولیت کی بھلا کوئی انتہا ہے؟ غریب غربا اور بے اختیار لوگوں کی ذمہ داریاں بہت کم ہیں۔ وہ آ باز پرس اور احتساب سے جلد چھٹکارا پا جائیں گے۔ مگر جن پر کروڑوں انسانوں کی نگہبانی کی ذمہ داریاں ہیں وہ تو قیامت کے دن کھنچے کھنچے پھریں گے۔ ذمہ داریوں کے اسی خوف سے حضرت امام ابوحنیفہؒ نے حکومت کی چیف جسٹسی کے عہدے کو قبول نہیں فرمایا تھا۔۔۔!

قیام معروف اور تغیر منکر تو ایک طرف رہا۔ اس دورِ حکومت کا تازہ ترین شاہکار یہ ہے کہ:۔

مشرقی بنگال میں رقص و سرود کا ایک میلہ لگا جس کی سرپرستی خود حکومت نے کی اور اس کے لئے ایک لاکھ کا عطیہ دے کر تماشے کے اس فعل برے کو نہ صرف یہ کہ سندِ جواز دی بلکہ خوشنودی کا پروانہ عطا فرما دیا۔۔۔!

سنا ہے کہ گورنر جنرل بہادر بھی اس میلہ کو اپنی شرکت کا اعزاز بخشنے کے لئے جانے والے تھے مگر علالت کے سبب اس پروگرام کو ملتوی کر دیا گیا!

"تصویر کو ہم بنیادی مسئلہ کی حیثیت دینا نہیں چاہتے اور دوسرے بڑے بڑے مسائل کے مقابلے میں اس مسئلہ کو موضوعِ بحث بنانا موجودہ حالات میں مناسب نہیں ہے۔ عرض کرنا صرف یہ ہے کہ:۔

پاکستان کے پرامیسری نوٹ اب تک سادہ اور تصویروں سے پاک تھے۔ مگر اب یہ سننے میں آ رہا ہے کہ سو روپے کے نوٹوں پر قائد اعظم مرحوم کی تصویر چھاپی جا رہی ہے۔! اس سے موجودہ عہد حکومت کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کے معاشرے کو کس رخ پر لے چلنے کا عزم ہے ۔۔!

اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے کہ پاکستان کے سکّہ کی وہ قیمت دوسرے ملکوں میں نہیں ہے۔ جو پاکستان کے محکمہ خزانہ کے رجسٹروں میں لکھی ہوئی ہے۔ ہمیں خود حجاز کا تجربہ ہے کہ:۔

ہندوستان کے سو روپے کے چہتر ریال تک وہاں چلتے تھے اور پاکستان کے سو روپے کا مبادلہ پچپن ریال تھا!

تو یہ حکومت جو نئے عزائم اور بلند دعووں کے ساتھ اقتدار کی کرسیوں پر آئی ہے۔ اسے پاکستان کی کرنسی کی اصل قیمت بحال کرنے کی تدبیر سوچنی چاہیئے تھی۔ مگر اصل کام چھوڑ کر پاکستانی نوٹوں پر "تصویر" چھاپنے کی مہم کا آغاز کیا جا رہا ہے۔۔!

عوتِ عمل

چھ سال سے ہم اربابِ حکومت سے اصلاحِ حال کے لئے درخواست کر رہے ہیں۔ عنوان اور اسلوب بدل بدل کر ہم نے انھیں چونکانے کی کوشش کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان "بلند باموں" نے ہم جیسے کوچہ گردوں کی گزارش پر ذرا سی بھی توجہ نہیں دی۔ نہ جانے نیچے کے لوگ اوپر کے حلقوں تک ہماری تحریریں پہنچنے بھی دیتے ہیں یا نہیں!

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا یہ مضمون محکمۂ قانون، دفترِ احتساب اور ادارۂ اطلاعات میں خورد بینوں کے ذریعہ پڑھا جائے۔ اگر کوئی بات ہم نے ایسی لکھی ہے جو واقعہ کے خلاف ہے۔ تو اس پر ہمیں متنبہ فرما دیا جائے۔

اگر ہماری کہی ہوئی باتیں درست اور واقعی ہیں۔ تو پھر عملی حکومت کا فرض ہے کہ:۔

وہ ہماری تحریر کو اُن "اکابر" تک پہنچائیں۔ جو حکومت کے اساطین سمجھے جاتے ہیں۔

واقعات کی نوعیت سخت سے سخت اندازِ نگارش کی متقاضی تھی۔ مگر ہم نے نرم سے نرم اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے!

ہمارا اب تک کا یہی تجربہ ہے کہ حکومتِ پاکستان کی کرسیوں سے زیادہ تر وہی لوگ چمٹے رہے ہیں۔ جو جاہ پرست اور اقتدار دوست ہیں۔ اور یہی ہوسِ اقتدار سیاسی کشمکش کا سبب بنتی رہی ہے۔

لہٰذا پاکستان کی زمام کار جب تک اس قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی، پاکستان "خوانِ یغما" بنا رہے گا۔ یہ "بڑے لوگ" اپنے مزاج اور زاویۂ فکر و عمل کے بدلنے پر بھی شاید قدرت نہیں رکھتے!

ہمارا روئے سخن "عوام" سے ہے۔ اُن عوام سے جو اس نکارو مادیت کے دور میں بھی اسلام کو پسند کرتے ہیں۔ خدا اور رسولؐ کا نام سُن کر جن کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ عوام سے ہمارا کہنا یہ ہے کہ:۔

پاکستان میں اسلامی نظام صرف تماشائی بن کر بیٹھے رہنے سے قائم نہیں ہوگا۔ اس کے لئے بہرحال جدوجہد کرنی ہوگی۔ عوام اپنے کو مجبور اور بے بس نہ سمجھیں۔ اُن کے احتجاج، اتفاق، اتحاد اور مطالبہ میں بہت بڑی قوت ہے۔ وہ جس بات پر جم جائیں اُسے حکومت کو ماننا پڑے گا۔ دُنیا میں کوئی حکومت اپنی تمام قاہرانہ طاقت کے باوجود عوام سے بے پروا ہو کر زیادہ دن تک چل نہیں سکتی۔ عوام کے مطالبہ کو کچھ دن تک ٹالا تو جا سکتا ہے۔ مگر اُسے ٹھکرایا نہیں جا سکتا!

پاکستان کے عوام کو سب سے پہلے اپنے اخلاق کو بلند کرنا ہے۔ اور جس قسم کا غیر اسلامی ماحول یہاں بنایا جا رہا ہے۔ اُس سے انھیں دُور رہنا ہے۔

اگر انہوں نے حالات کا صحیح اندازہ لگا کر معاشرے کی تطہیر نہ کی تو پھر وہ وقت کچھ دُور نہیں ہے۔ جب پاکستان کے شہروں کے چوراہوں پر "اُستاد بندو خاں" اور "بلبل چودھری" جیسے سازندوں اور مطربوں کے مجسمے نصب ہوں گے اور آنے والی نسلیں انہی کو اپنا "ہیرو" سمجھیں گی ــــ!

اسلامی اخلاق اور دینی کردار کے سایہ میں، اسلامی نظام کے قیام کے لئے جو جد و جہد آئین کے حدود میں رہ کر ہو گی۔ اس کی کامیابی میں شاید دیر لگ جائے۔ مگر یہ انقلاب پائیدار تعمیری انقلاب ہو گا۔ جو صرف کرسیوں ہی کو نہیں، فکر و نظر اور قلب و دماغ کو بھی بدل دے گا۔ اس انقلاب کا کوئی اعتبار نہیں جو اُوپری تبدیلی پیدا کر کے رہ جائے اور "باطن" سے کوئی واسطہ اور سروکار نہ رکھے۔!

حالات کتنے ہی نازک کیوں نہ ہو جائیں۔ مگر ضبط و اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھُٹنا چاہیئے۔ اور مایوسی تو اسلام میں "کفر" کے قریب قریب ہے!

ہمارا خدا حیّ و قیوم ہے۔
ہمارے نبیؐ کی سنّت زندہ ہے۔
ہمارا قرآن تر و تازہ ہے۔
ہمارے مقدس اسلاف کے دینی کارنامے آفتاب سے زیادہ روشن ہیں۔
پھر مایوسی کیسی؟

مایوسی اور بیزاری تو کافروں، اور بُت پرستوں کا شیوہ ہے۔ خدائے حیّ و قیوم کے بندے ہر عالم میں پُر امید رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ پھانسی کے تختے پر چڑھتے وقت بھی وہ ہراساں اور نا امید نہیں ہوتے!

پاکستان جن برائیوں اور گندگیوں کے سبب "ناپاک" بنا ہوا ہے۔ اُن گندگیوں کو ہمیں دھونا۔ دُور کرنا۔ اور مٹانا ہے۔ تاکہ دُنیا کے اس گندے ماحول میں ہمارا ملک "پاکیزگی" کا ایک نمونہ بن جائے۔ یہاں کی سیاست۔ تجارت۔ معیشت۔ معاشرت۔ شعر و ادب۔ غرض زندگی کے کاروبار کے تمام شعبوں کو بدلنا ہے۔ یہاں تک کہ ہر دفتر۔ ہر کارخانہ۔ ہر بازار۔ ہر ادارے اور ہر دانش گاہ سے "انا الاسلام" کی صدا آنے لگے!

ماہر القادری

۲۵ جنوری ۱۹۵۵ء

مولانا عبدالرشید نعمانی

ابن ماجہ کوفہ میں

وہ عظیم الشان اسلامی شہر جو صدیوں تک علوم اسلامیہ کا دارالعلوم بنا رہا اور جو عہد مرتضوی سے لے کر بغداد کے تعمیر ہونے تک وسعت علم و کثرت حدیث میں تمام بلاد اسلامیہ میں ممتاز تھا۔ جس کو علامہ نووی[1] دار الفضل والفضلاء بتلاتے ہیں۔ اور صاحب قاموس قبۃ الاسلام و دار ہجرۃ المسلمین لکھتے ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس شہر کو پایۂ دار الخلافہ قرار دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں:-[2]

کان اغلب قضایاہ بالکوفۃ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیشتر فیصلے کوفہ میں صادر ہوئے۔

اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین میں رقمطراز ہیں:-

"وقضایائے بسیار در ایام خلافت بر دست او ظاہر شدند"[3]

اور حافظ ابن تیمیہ منہاج السنہ میں لکھتے ہیں:-

وانما ظہر علم علی وفقھہ فی الکوفۃ بحسب مقامہ فیھا عندہ مدۃ خلافتہ[4]

بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا علم اور آپ کی فقہ کوفہ میں اسی قدر ظاہر ہوئی جتنا کہ آپ نے اپنی مدت خلافت میں وہاں ان کے پاس قیام فرمایا۔

حافظ ابن حزم نے فضائل اہل اندلس پر جو رسالہ لکھا ہے اس میں جناب امیر کے قیام کوفہ کی مدت پانچ سال اور چند ماہ بیان کی ہے[5] لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کے حاشیہ پر تصریح کی ہے کہ:-

صوابہ اربعۃ اعوام[6] صحیح یہ ہے کہ یہ مدت چار سال ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "باب مدینۃ العلم"[7] کی آمد سے کوفہ کے علمی افق پر چار چاند لگ گئے تھے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ کوفہ آپ کی تشریف آوری سے بہت پہلے عہد فاروقی ہی میں قرآن و سنت کا دار العلوم بن چکا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ کی تصریحات اس بارے میں حسب ذیل ہیں:-

---

۱ شرح صحیح مسلم از علامہ نووی "باب القراءۃ فی الظہر والعصر" ۲ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۲ طبع منیریہ مصر۔

۳ قرۃ العینین ص ۱۳۰ طبع مجتبائی دہلی۔ ۴ منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۳۷ طبع منیریہ مصر۔ ۵ یہ پورا رسالہ علامہ احمد بن محمد مقری المتوفی سنہ ۱۰۴۱ھ نے نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب کے باب سابع میں نقل کر دیا ہے۔ ۶ نفح الطیب ج ۴ ص ۱۷۱ طبع مصر ۱۲۷۹ھ

۷ حدیث میں آتا ہے انا مدینۃ العلم وعلی بابھا (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ)

(۱) وانما كان غالب علمه في الكوفة ومع هذا فاهل الكوفة كانوا يعلمون القرآن والسنة قبل ان يتولى عثمان فضلاً عن علي۔ [۱]

اور بلاشبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بیشتر علم کوفہ ہی میں رہا تاہم اہل کوفہ . . . . کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے سے بیشتر قرآن وسنت کا علم رکھتے تھے۔

(۲) فان اهل الكوفة التي كانت داره كانوا قد تعلموا الايمان والقرآن وتفسيره والفقه والسنة عن ابن مسعود وغيره قبل ان يقدم علي الكوفة۔ [۲]

کوفہ جو آپ (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ) کا گھر تھا وہاں کے لوگ ایمان، قرآن، تفسیر قرآن، فقہ اور سنت کا علم حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) وغیرہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوفہ تشریف آوری سے پہلے ہی حاصل کر چکے تھے۔

(۳) ولما ذهب الى الكوفة كان اهل الكوفة قبل ان ياتيهم قد اخذوا الدين عن سعد بن ابي وقاص وابن مسعود وحذيفة وعمار وابي موسى وغيرهم ممن ارسله عمر الى الكوفة۔ [۳]

جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کوفہ تشریف لے گئے ہیں۔ تو اہل کوفہ آپ کے وہاں آنے سے پہلے ہی حضرت سعد بن ابی وقاص۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود۔ حضرت حذیفہ حضرت عمار۔ حضرت ابو موسیٰ۔ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ روانہ کیا تھا دین حاصل کر چکے تھے۔

فقہاء کوفہ میں اس کا خاص اہتمام تھا کہ جب کسی صحابی کی وہاں آمد ہوتی تو اُن کے پاس آ کر جمع ہو جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو سننے کی خواہش ظاہر کرتے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ میں امام شعبی سے روایت ہے کہ:۔

لما قدم عدي بن حاتم الكوفة اتيناه في نفر من فقهاء اهل الكوفة فقلنا له حدثنا ما سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم (باب في القدر)

حضرت عدی بن حاتم جب کوفہ تشریف لائے تو ہم فقہاء کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کرنے لگے کہ آپ نے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے ہم سے بھی بیان فرمایئے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ باایں ہمہ وسعت نظر ہمیشہ اس بات کے درپے رہتے کہ جب کوفہ میں کوئی نامور محدث آئے تو اس کی معلومات سے اپنے علم میں اضافہ کیا جائے، چنانچہ امام نضر بن محمد مروزی جو امام صاحب کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں فرماتے ہیں:۔

ما رأيت رجلا الزم للاثر من ابي حنيفة قدم علينا يحيى بن سعيد الانصاري وهشام بن عروة وسعيد بن ابي عروبة فقال لنا ابو حنيفة انظروا اتجدون عند هؤلاء شيئاً نسمعه۔ [۴]

میں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ کسی شخص کو حدیث سے اعتنا کرنے والا نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ ہمارے پاس یحییٰ بن سعید انصاری، ہشام بن عروۃ اور سعید بن ابی عروبہ آئے تو امام ابوحنیفہ ہم سے فرمانے لگے کہ دیکھو تو ان لوگوں کے پاس تمہیں کوئی ایسی چیز بھی ملتی ہے جس کا ہم بھی سماع کریں۔

[۱] منہاج السنۃ ج ۴ ص ۱۳۹۔ [۲] ایضاً ج ۴ ص ۱۴۲۔ [۳] ایضاً ج ۴ ص ۱۵۷ -
[۴] الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ، تذکرہ نضر بن محمد۔

امام اعظم کے ایک اور شاگرد محدث عبدالعزیز بن ابی رزمہ کا بیان بھی اسی کے قریب قریب ہے۔ چنانچہ امام عبداللہ حارثی بسند ناقل ہیں کہ:-

حدثنا داؤد بن ابی العوام سمعت وهب بن زمعة سمعت عبد العزيز بن ابی رزمة وذكر علم ابی حنيفة بالحديث فقال قدم الكوفة محدث فقال ابوحنيفة لاصحابه انظروا هل عنده شئ من الحديث ليس عندنا قال وقدم علينا محدث آخر فقال لاصحابه مثل ذلك [1]

عبدالعزیز بن ابی رزمہ نے امام ابوحنیفہ کے علم حدیث کا تذکرہ چھیڑا اور اسی سلسلہ میں یہ بھی بتایا کہ ایک بار کوفہ میں ایک محدث آئے، تو امام ابوحنیفہ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ دیکھو تو کہ اس کے پاس حدیث میں کوئی ایسی چیز ہے کہ جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ عبدالعزیز کا بیان ہے کہ دوبارہ ایک اور محدث ہمارے پاس جب بھی آئے آپ نے اپنے اصحاب سے یہی فرمایا۔

کوفہ میں کتنے صحابہ نے آکر بود و باش اختیار کی اس کے متعلق حافظ ابوبشر دولابی [2]، ۳۱۰ھ سے جن کا شمار کبار

---

[1] مناقب الامام الاعظم، از صدر الائمہ مکی ج ۱ ص ۳۳۸۔

[2] دولابی، دولاب کی طرف نسبت ہے۔ یہ متعدد مواضع کا نام ہے۔ منجملہ ان کے ایک بغداد کی شرقی جانب واقع تھا۔ اور دوسرا رے کا ایک مشہور قریہ تھا۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے "الحافظ العالم ابوبشر محمد بن احمد بن حماد بن سعيد بن مسلم الانصاری الرازی الدولابی الوراق" اور میزان الاعتدال میں صراحت کے ساتھ ان کے لئے من اهل الری کے الفاظ استعمال کئے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قریہ دولاب واقع رے کے رہنے والے تھے۔ لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی، لسان المیزان میں مسلمہ بن قاسم سے ناقل ہیں کہ ان کا مسکن دولاب واقع بغداد تھا۔ انصاری بھی نسلاً نہیں ہیں بلکہ ولاءً ہیں۔ دولابی حدیث کے مشہور حفاظ میں سے ہیں، اور فن جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ طلب حدیث میں حسب تصریح ذہبی، حرمین، عراق، مصر اور شام کا سفر کیا۔ اور بہت سے شیوخ سے اس فن کی تحصیل کی۔ ابن الجوزی، المنتظم میں لکھتے ہیں۔ وحدث عن اشياخ فيهم كثرة (اتنے شیوخ سے حدیث بیان کی کہ جو بکثرت ہیں)، امام بخاری اور امام نسائی سے بھی تلمذ حاصل ہے۔ چنانچہ امام بخاری سے ان کی کتاب الضعفاء صغیر کے بھی راوی ہیں۔ حافظ ابن یونس لکھتے ہیں۔ كان الدولابی من اهل الصنعة حسن التصنيف (دولابی اہل فن میں سے ہیں اور عمدہ مصنف ہیں) حافظ مسلمہ بن قاسم فرماتے ہیں۔ كان متقدما فی العلم والرواية ومعرفة الاخبار۔ (یہ علم روایت اور معرفت احادیث میں مقدم ہیں) مسلمہ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ فقہ میں یہ حنفی مذہب کے پیرو تھے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں۔ جالس العلماء وتفقه لابی حنيفة رحمة الله (علماء کی خدمت میں رہے اور امام ابوحنیفہ کے مذہب پر تفقہ حاصل کیا) فن حدیث میں جن اکابر حفاظ نے آپ کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا ان میں ابن عدی، طبرانی، ابن المقری وغیرہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

افسوس ہے کہ ابن عدی وغیرہ بعض متعصب محدثین نے مخالفت مذہبی کی بنا پر جیسا کہ حنفیہ کے بارے میں ان لوگوں کی عام عادت ہے ان پر بھی کلام کیا ہے۔ لیکن غنیمت ہے کہ ان ہی میں سے خود محدث دارقطنی نے ان کی تردید کردی ہے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تابعین میں ہے بسند ناقل ہیں کہ:۔

حدثنی ابراھیم بن الجنید الختلی قال حدثنا نصر بن علی الازدی قال حدثنا نوح بن قیس عن ابی الرجاء محمد بن سیف عن قتادۃ قال نزل الکوفۃ الف وخمسون رجلا من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم واربعۃ وعشرون من اھل بدر۔ (کتاب الکنی والاسماء ج ص۱۲۳)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص اور چوبیس وہ بزرگ کہ جو غزوہ بدر میں آپ کے ہمرکاب رہے تھے۔ کوفہ میں آکر سکونت پذیر ہوئے تھے۔

اور امام ابوالحسن احمد بن عبد اللہ عجلی المتوفی ۲۶۱ھ (جو فن رجال میں امام احمد بن حنبل اور امام یحیی بن معین کے ہمسر شمار کئے جاتے ہیں) اپنی تاریخ میں سب سے بھی زیادہ تعداد بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

نزل الکوفۃ الف وخمسمائۃ من الصحابۃ[۱] — کوفہ میں ڈیڑھ ہزار صحابہ آکر اترے۔

امام ابوعبد اللہ حاکم صاحب المستدرک علی الصحیحین نے اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث کی "النوع الثانی والاربعین" میں ان مشاہیر صحابہ کے نام لکھے ہیں۔ کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ شریف سے دوسرے اسلامی شہروں میں منتقل ہوگئے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے سب سے پہلے کوفہ سے ابتدار کی ہے اور سب سے زیادہ تعداد یہیں آنے والوں کی ذکر کی ہے۔ منجملہ ان کے عشرہ مبشرہ میں سے حضرت علی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے بھی نام لکھے ہیں۔ بقیہ شہروں کے نام یہ ہیں۔ مکہ مکرمہ۔ بصرہ۔ مصر۔ شام۔ جزیرہ خراسان۔

صحابہ کی اس کثرت کے باوجود علماء کوفہ کے شوق طلب کا یہ عالم تھا کہ وہ برابر مدینہ طیبہ کا سفر کیا کرتے۔ اور وہاں کے اکابر صحابہ کے فیض علمی سے متمتع ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ "سنت" کے بیان میں ہم لکھ چکے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے طلب اسناد عالی کو جب سلف کی سنت جتلایا تھا۔ تو اس کی سند میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ ہی کے سفر کا تذکرہ کیا تھا۔ اور علامہ ابن تیمیہ منہاج السنۃ میں فرماتے ہیں:۔

(بقیہ حاشیہ) چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ تکلموا فیہ ما بین من امرہ الاخیر۔ لوگوں نے ان کے بارے میں چہ میگوئیاں کی ہیں۔ مگر ان میں بجز خیر کے اور کچھ ظاہر نہیں ہوا) ۲۲۴ھ میں ان کی ولادت ہوئی ۳۱۰ھ میں ذیقعدہ کے مہینہ میں بمقام عرج جو مکہ اور مدینہ کے مابین ہے، وفات پائی رحمۃ اللہ تعالی۔ انہوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں۔ جن میں سے کتاب الکنی والاسماء۔ دو جلدوں میں حیدرآباد دکن سے۔ مجلس دائرۃ المعارف نے طبع کرکے شائع کردی ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ۔ میزان الاعتدال۔ لسان المیزان۔ المنتظم)

[۱] ۔ فتح القدیر از امام ابن ہمام رح۔ ص ۹۳ طبع نولکشور لکھنؤ۔

[۲] ۔ یہ کتاب مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ کے زیر اہتمام قاہرہ کے مطبع دارالکتب المصریہ سے طبع ہوکر شائع ہوچکی ہے۔

هو (يعني ابا عبد الرحمن السلمي) وغيره من علماء الكوفة مثل علقمة والاسود والحارث الليثي وزر بن حبيش الذي قرأ عليه عاصم بن ابي النجود اخذوا القرآن عن ابن مسعود وكانوا يذهبون الى المدينة فياخذون عن عمر وعائشة ولم ياخذوا عن علي كما اخذوا عن عمر وعائشة وشريح قاضيه انما تفقه على معاذ بن جبل باليمن ؎۱

ابو عبد الرحمٰن سلمی اور دیگر علمائے کوفہ جیسے کہ علقمہ، اسود، حارث لیثی، زر بن حبیش کہ جن سے عاصم بن ابی النجود نے قرآن پاک کی قرأت حاصل کی ہے ان سب لوگوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرآن پاک سیکھا ہے نیز یہ لوگ مدینہ طیبہ جاکر حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے علم کی تحصیل کیا کرتے تھے۔ بلکہ ان لوگوں نے حضرت عمر و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے جتنا جتنا اخذ کیا اتنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اخذ نہیں کیا اور کوفہ کے قاضی شریح نے فقہ کی تعلیم حضرت معاذ بن جبل سے یمن میں حاصل کی تھی۔

اور پھر چند اوراق کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں:۔

واصحاب ابن مسعود كانوا ياخذون عن عمر وعلي وابي الدرداء ؎۲

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ حضرت عمر حضرت علی اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا کرتے تھے۔

اسی کا ثمرہ تھا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کوفہ تشریف لائے آپ نے یہاں کی فضا کو علم سے معمور پایا۔ چنانچہ امام ابوبکر عتیق بن داؤد یمانی فرماتے ہیں کہ:۔

"حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کوفہ میں ورود ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ وہاں پر لوگوں کو فقیہہ بنانے میں مصروف تھے۔ جب آمیر نے مسجد کوفہ میں آکر دیکھا تو چار سو کے قریب دواتیں رکھی ہوئی تھیں اور طلبار کتاب علم میں مصروف تھے۔ یہ دیکھ کر آپ نے ارشاد فرمایا!

لقد ترك ابن ام عبد يعني ابن مسعود رضي الله عنه هولاء سرج الكوفة

بلاشبہ ابن ام عبد یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو کوفہ کے چراغ بنا کر چھوڑا ہے۔" ؎۳

تفقہ کا درجہ علوم شرعیہ کا آخری درجہ ہے۔ اس لئے جب متعلمین فقہ کی تعداد یہ تھی تو ظاہر ہے کہ طلباء حدیث کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہو گی۔ چنانچہ حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں ابن سیرین سے جو اکابر تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ روایت نقل کی ہے:۔

قدمت الكوفة وبها اربعة الاف يطلبون الحديث ؎۴

میں کوفہ آیا تو وہاں چار ہزار حدیث کے طالب موجود تھے۔

محدث حاکم نیشاپوری نے معرفۃ علوم الحدیث کی "النوع التاسع والاربعین" میں زیر عنوان "معرفة

؎۱ منہاج السنۃ ج ۴ ص ۱۴۳۔ ؎۲ ایضاً ج ۴ ص ۱۵۶۔ ؎۳ مناقب الامام الاعظم، از صدر الائمہ مکی ج ۲ ص ۴۳۔ ؎۴ تدریب الراوی ص ۵۰۷ طبع مصر۔

(الائمة الثقات المشهورين من التابعين واتباعهم ممن يجمع حديثهم للحفظ والمذاكرة والتبرك بهم وبذكرهم من الشرق الى الغرب[۱] (یعنی تابعین اور تبع تابعین کے ان مشاہیر ائمہ ثقات کی معرفت کہ جن کی حدیثیں حفظ اور مذاکرہ کے لئے جمع کی جاتی ہیں۔ اور جن سے تبرک حاصل کیا جاتا ہے اور جن کا ذکر مشرق سے لے کر مغرب تک ہے)

بلاد اسلامیہ کے ان تمام نامور ائمہ کو نام بنام گنایا ہے کہ جو اس عنوان کے تحت آتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں حسب ذیل مقامات کے محدثین کی فہرست دی ہے:۔

مدینہ۔ مکہ۔ مصر۔ شام۔ یمن۔ یمامہ۔ کوفہ۔ جزیرہ۔ بصرہ۔ واسط۔ خراسان۔

(بغداد کے علماء محدثین کا ذکر "نوع ثانی واربعین" ہی میں کر چکے ہیں جو چند سطروں سے زائد نہیں ہے)

مگر آپ کو یہ معلوم کر کے شاید تعجب ہو کہ ان تمام مذکورہ مقامات میں یہ امتیاز صرف کوفہ ہی کو حاصل ہے کہ وہاں کے ائمہ ثقات کی فہرست پورے ساڑھے تین صفحات پر مشتمل ہے۔ جبکہ بجز بصرہ کے (کہ وہاں کے ائمہ محدثین کے نام تو بلا شبہ

---

[۱] حاکم نے ان ائمہ ثقات مشہورین کی فہرست میں امام ابوحنیفہ اور امام زفر کا بھی نام لیا ہے۔ [۲] قرآن پاک کے وہ سات قاری کہ جن کی قرأت کے مطابق ساری دنیا میں قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے۔ حافظ عبدالقادر قرشی "الجواہر المضیہ" میں فرماتے ہیں:۔

"سات ماہتاب جو ائمہ قراء ہیں یہ ہیں:۔

(۱) عبداللہ بن کثیر بن عبدالمطلب القرشی مولاہم ابومعبد۔ تابعین میں سے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے سماع کیا ہے۔ مکہ معظمہ میں ۱۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ بعض نے سنہ وفات ۱۲۲ بتایا ہے۔

(۲) نافع بن عبدالرحمٰن بن ابونعیم مولی جعونہ بن شعیب اللیثی، مدنی ہیں۔ ان کے بزرگ اصفہان کے رہنے والے تھے۔ ابورویم کنیت ہے ۱۶۹ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔

(۳) ابن عامر یہ عبداللہ بن عامر بن یزید بن تمیم بن ربیعہ الیحصبی الدمشقی ہیں۔ دمشق کے قاضی تھے۔ کبار تابعین میں سے ہیں۔ ۲۱ ہجری کے اوائل میں پیدا ہوئے اور عاشورہ کے دن ۱۱۸ھ میں وفات پائی۔ بعض نے کہا ہے کہ ۸ ہجری میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ اس قول سے ان کی عمر ایک سو دس برس کی ہوتی ہے۔

(۴) ابوعمرو بن العلاء بن عمار بن عبداللہ المقری البصری۔ ان کا نام کسی نے زبان کسی نے عریان۔ کسی نے یحییٰ۔ کسی نے عثمان۔ کسی نے محبوب اور کسی نے کچھ اور بتایا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے۔ ۱۵۴ھ میں کوفہ میں انتقال کیا۔

(۵) عاصم بن ابی النجود (بفتح نون) ابوبکر الاسدی، ۱۲۷ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔ بعض نے سنہ وفات ۱۲۸ بیان کیا ہے۔ امام سفیان اور امام احمد نے کہا ہے کہ بہدلہ، ابوالنجود کا نام ہے۔ اور عمرو بن علی الفلاس کہتے ہیں کہ ان کی ماں کا نام ہے مگر ابوبکر بن ابی داؤد نے اس کو غلط بتایا ہے۔

(۶) حمزہ بن حبیب بن عمارہ بن اسمٰعیل الزیات التیمی مولاہم الکوفی ابوعمارہ بمقام حلوان ۱۵۸ھ میں اور بقول بعض ۱۵۶ھ میں وفات پائی۔

(۷) کسائی ابوالحسن علی بن حمزہ الاسدی مولاہم الکوفی، ۱۸۹ھ میں وفات پائی انہوں نے حمزہ اسدی کے پاس قرأت کی تھی۔

ان ساتوں میں بجز ابن عامر اور ابوعمرو کے کوئی عرب نہیں ہے۔ (الجواہر المضیہ ص ۴۲۲ و ۴۲۳۔ ج ۲)

[۳] ملاحظہ ہو "الاتقان فی علوم القرآن" از علامہ سیوطی۔ ج ۲۔ ص ۱۸۹ طبع مصر ۱۳۱۷ھ

...صفحہ میں آ سکے ہیں ، باقی کسی شہر کے مشاہیر کی فہرست ایک صفحہ کو بھی پورا نہ کر سکی ۔ اسی طرح طبقات ابن سعد میں کسی مقام کے ... علماء مذکور نہیں جتنے کہ کوفہ کے ہیں ۔ چنانچہ تمام بلاد اسلامیہ میں یہ خصوصیت صرف کوفہ ہی کی ہے کہ طبقات کی پوری ایک ... جلد صرف ان ہی کے تراجم پر مشتمل ہے ۔ اس سے آپ کوفہ کی علمی منزلت کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔

قراء سبعہ میں سے عاصمؒ ، حمزہؒ اور کسائیؒ تینوں کوفی ہیں ۔ تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں ... علامہ ابن تیمیہ نے " اعلم الناس بالتفسیر " لکھا ہے ۔ سعید بن جبیر جن کو قتادہ تمام تابعین میں تفسیر کا سب سے بڑا عالم ... تے ہیں ؂ اسی کوفہ کے رہنے والے تھے ۔

حدیث کی وہاں نشر و اشاعت کا یہ عالم تھا کہ حافظ ابو محمد حسن بن عبدالرحمٰن رامہرمزی ، المحدث الفاصل بین الراوی والواعی میں ... ث بغداد حافظ عفان بن مسلم سے کہ جن کو یحییٰ بن معین فن حدیث میں ، امام مالک ، ابن جریج ، سفیان ثوری اور شعبہ کے ہم پلہ ... تسلیم کرتے ہیں ، بسند ناقل ہیں کہ :-

حدثنا عبد اللہ بن احمد بن معدان حدثنا مذکور ... سلیمان الواسطی قال سمعت عفان یقول ، وسمع قوما یقولون ... نسخنا کتب فلان ونسخنا کتب فلان . فسمعته یقول نری ... ذا الضرب من الناس لا یفلحون ، کنا نأتی ... ذا فنسمع منه ما لیس عند هذا ، و نسمع ... ن هذا ما لیس عند هذا ، فقدمنا الکوفة ... اقمنا اربعة اشهر ولو اردنا ان نکتب مائة ... ف حدیث لکتبناها فما کتبنا الا قدر خمسین ... ف حدیث ، وما رضینا من احد الا ما لا مه ... لا شریکا ، فانه ابی علینا وما رأینا بالکوفة ... عانا مجوزا . اھ ؂

انہوں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ ہم فلاں فلاں کی کتابیں نقل کر چکے ہیں ۔ اس پر فرمانے لگے کہ ہماری رائے میں اس قسم کے لوگ کامیاب نہیں ہوا کرتے ۔ ہمارا تو یہ دستور تھا کہ جب اس استاد کے پاس آتے تو اس سے وہ روایتیں سنتے جو اس استاد کے پاس نہ ہوتیں اور اس سے وہ سنتے جو اس کے پاس نہ ہوتیں ۔ چنانچہ جب ہم کوفہ آئے تو چار ماہ قیام رہا اور اگر ہم یہ چاہتے کہ ایک لاکھ حدیثیں لکھ لیں تو لکھ سکتے تھے مگر ہم نے صرف پچاس ہزار حدیثیں ہی لکھیں ۔ دپھر کسی سے امت کی مسند روایات کے علاوہ راضی نہ ہوئے سوائے شریک کے کہ انہوں نے ہم سے انکار کر دیا ۔ اور ہم نے کوفہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا کہ جو عربیت میں غلطی کرے اور اسکو روا رکھے ۔

اور علامہ تاج الدین سبکی ، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں قدوۃ المحدثین حافظ ابوبکر بن ابی داؤد سجستانی کی زبانی ان کا یہ بیان نقل کرتے ہیں :-

... دخلت الکوفة ومعی درهم واحد فاشتریت به ... ثلاثین مد باقلاء فکنت آکل مدا واکتب ... عن الاشج فکتبت عنه فی الشهر ثلاثین الف حدیث ... ما بین مقطوع ومرسل ۔ ؂

میں جب کوفہ میں آیا تو میرے پاس ایک ہی درہم رہ گیا تھا سو میں نے اس درہم کا تیس مد باقلا خرید لیا پھر ایک مد کھاتا اور اشج سے ایک ہزار حدیثیں لکھ لیتا ۔ اس طرح ایک مہینہ میں میں نے تیس ہزار حدیثیں جن میں مقطوع اور مرسل بھی شامل ہیں لکھ لیں ۔

؂ اس کتاب کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن اور کتب خانہ پیر جھنڈو حیدر آباد سندھ میں ہماری نظر سے گزرے ہیں ۔ اور مطبوعہ کتابوں میں محدث کوثری نے امام زیلعی کی نصب الرایہ پر جو تقدمہ لکھا ہے اس میں بھی اس کو نقل کر دیا ہے ۔ (ملاحظہ ہو تقدمہ نصب الرایہ ص ۳۰ مطبوعہ مصر) ؂ طبقات الشافعیہ ج ۲ ، ص ۲۳۰ طبع حسینیہ مصر ۔

ذرا تصور کیجئے اس شہر کی کثرتِ حدیث کا کہ جہاں عفّان جیسا حافظ حدیث باوجود اس قدر احتیاط کے چار ماہ میں پچاس[۱] ہزار احادیث لکھ لے (کہ جو مسند احمد جیسی ضخیم کتاب کی روایات سے بھی تعداد میں کہیں زیادہ ہیں) اور حافظ ابوبکر بن ابی داؤد ایک ہی ماہ میں تیس ہزار حدیثیں ایک ہی شیخ سے لکھ لیں وہاں حدیث و سنت کی اشاعت کا کیا عالم ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل سے جب ان کے صاحبزادے عبداللہ نے دریافت کیا کہ آپ کی رائے میں طالب علم کو کیا کرنا چاہیئے۔ آیا ایک ہی صاحب علم کی خدمت میں برابر حاضر رہ کر اسی سے حدیثیں لکھتا رہے یا اُن مقامات کا رُخ کرے کہ جہاں علم کا چرچا ہے اور وہاں جاکر علماء سے حدیث کی تحصیل کرے۔ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اسے سفر کرنا چاہیئے اور دوسرے مقامات کے علماء سے حدیثیں لکھنی چاہئیں۔ اور اُن علماء میں سب سے پہلے امام موصوف نے "کوفیین" ہی کا ذکر کیا۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:-

یرحل و یکتب عن الکوفیین والبصریین واھل المدینۃ ومکۃ[۲]

امام بخاری نے طلب حدیث میں بخارا سے لے کر مصر تک تمام اسلامی شہروں کا سفر کیا تھا۔ دو دفعہ جزیرہ گئے چار دفعہ بصرہ جانا ہوا۔ چھ سال تک حجاز میں مقیم رہے مگر اس کے باوجود کوفہ اور بغداد کی وہ اہمیت تھی کہ فرماتے ہیں:-

---

[۱] یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جب محدثین احادیث کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد متون احادیث نہیں بلکہ طرق و اسانید ہوتے ہیں۔ نیز سلف کا دستور تھا کہ وہ آثار صحابہ و تابعین اور اُن کے فتاوے کے لئے بھی حدیث کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔ حافظ سخاوی، فتح المغیث میں لکھتے ہیں:-

وکذا الآثار الصحابۃ والتابعین وغیرھم	اور اسی طرح اس تعداد میں (مکررات و موقوفات کے علاوہ)
فتاونیھم مما کان السلف یطلقون	صحابہ و تابعین وغیرہ کے آثار و فتاوی بھی داخل ہوتے ہیں۔
علی کل حدیثا (ص ۳، طبع انوار محمدی لکھنؤ)	کیونکہ ان میں سے ہر ایک کیلئے متقدمین حدیث کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

اس کے بعد سخاوی لکھتے ہیں کہ بہت سی حدیثیں ہیں کہ جو سو سندوں کے ساتھ مروی ہیں اور حدیث انما الاعمال بالنیات کے متعلق تو حافظ ابو اسمٰعیل انصاری ہروی سے منقول ہے کہ انہوں نے حدیث مذکور کو اس کے صرف ایک راوی یحییٰ بن سعید انصاری سے ان کے سات سو شاگردوں کی سند سے لکھا ہے۔

آج کل کے منکرین حدیث نے بد فریبی کے لئے یہ شور مچار کھا ہے کہ موجودہ حدیث کی کتابوں میں چند ہزار سے زائد احادیث کی تعداد پائی نہیں جاتی۔ اور محدثین یہ کہتے ہیں کہ ہم نے لاکھوں حدیثوں سے ان کا انتخاب کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ احادیث کی بڑی تعداد خود محدثین کے بیانات کے مطابق خود ساختہ ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں ان چند ہزار کا بھی کیا اعتبار رہ جاتا ہے۔ کہ جن کو لاکھوں موضوعات سے چھانٹ کر صحیح قرار دیا گیا ہو۔ اس لئے آپ خود سمجھ لیجئے کہ یہ ایک بہت ہی بڑا سنگین مغالطہ ہے۔ جو بیچارے ناواقف عوام کو دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ محدثین کے یہاں تو احادیث کی تعداد کا حساب ان کی اسانید کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ متون کے لحاظ سے۔ پس اگر کسی حدیث کی شلاً سو اسنادیں ہیں تو اس کی تعداد اپنی اسانید کے اعتبار سے سو ہوگی۔ چنانچہ حدیث انما الاعمال بالنیات کا جب شمار لگائیں گے تو اس کی سات سو اسنادوں کے اعتبار سے سات سو شمار کریں گے۔

[۲] تدریب الراوی از سیوطی ص ۱۷۷ و فتح المغیث از سخاوی ص ۳۲۱۔

لا احصی کم دخلت الی الکوفۃ و بغداد مع المحدثین۔[1]	میں شمار بھی نہیں کر سکتا کہ کوفہ اور بغداد میں مجھے محدثین کے ساتھ کتنی بار جانا پڑا۔

فن حدیث کی ترتیب سب سے پہلے اسی شہر میں ہوئی۔ صحیح احادیث کا مجموعہ بھی سب سے پہلے یہیں مرتب ہوا[2] اور فقہ کے متعلق تو پوچھنا ہی کیا۔ امام ابو حنیفہ نے اس کو "معدن العلم و الفقہ" کا لقب دیا ہے[3] اور سفیان بن عیینہ جو ائمہ حدیث میں شمار کئے جاتے ہیں، کہا کرتے تھے۔

من اراد المغازی فالمدینۃ ومن اراد المناسک فمکۃ ومن اراد الفقہ فالکوفۃ[4]	مغازی کے لئے مدینہ، مناسک سیکھنے کے لئے مکہ، اور فقہ کے لئے کوفہ ہے۔

فقہ حنفی جس پر بارہ سو برس سے اسلامی دنیا کا تقریباً دو ثلث حصہ عمل پیرا چلا آتا ہے اس کی بنیاد بھی یہیں پڑی۔
عربیت اور نحو کی تدوین بھی کوفہ اور بصرہ ان ہی دو شہروں میں ہوئی ہے۔ چنانچہ لغت اور نحو کی کتابوں میں بجز ان دو مقامات کے عام طور پر اور کسی جگہ کے علماء کا، خلاف ذکر نہیں کیا جاتا۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:-

"کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود۔ حضرت عمار بن یاسر۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم جیسے حضرات نیز صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی ایک خلقت کثیر اتری۔ پھر وہاں علقمہ۔ مسروق۔ عبیدہ اور اسود جیسے ائمہ تابعین پیدا ہوئے۔ پھر شعبی۔ نخعی۔ حکم بن عتیبہ۔ حماد۔ ابو اسحٰق۔ منصور۔ اعمش۔ وہاں کے محدث ہوئے۔"

اس کے بعد ذہبی کے الفاظ ہیں:-

وما زال بھا متوفرا الی زمان ابن عقدۃ۔	اور ابن عقدہ کے زمانے تک برابر وہاں علم کی وسعت و کثرت ہی چلی آئی۔

حافظ عصر ابن عقدہ کی وفات ۳۳۲ھ میں ہوئی ہے۔ اس حساب سے متواتر تین سو سال تک کوفہ حدیث کا دار العلم رہا ہے۔ محدث حاکم نیشاپوری نے کوفہ کا پہلا سفر ابن عقدہ کی وفات کے نو برس بعد ۳۴۱ھ میں کیا تھا۔ اس وقت تک صحابہ کی درسگاہوں کے نشانات موجود تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ان کا بیان حسب ذیل ہے:-

---

[1] مقدمہ فتح الباری از حافظ ابن حجر عسقلانی۔ ج ۲۔ ص ۴۷۹ طبع میریہ مصر۔
[2] اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصے میں آرہی ہے۔ [3] مناقب الامام الاعظم، از صدر الائمہ موفق بن احمد مکی المتوفی ۵۶۸ھ مطبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد دکن۔ ج ۱۔ ص ۵۶۔ [4] ایضاً ج ۲۔ ص ۴۲۔ علامہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں کوفہ کے ذکر میں سفیان بن عیینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ خذوا المناسک عن اھل مکۃ وخذوا القراءۃ عن اھل المدینۃ وخذوا الحلال والحرام عن اھل الکوفۃ (یعنی مناسک اہل مکہ سے حاصل کرو اور قرأت اہل مدینہ سے اور حلال و حرام کا علم اہل کوفہ سے)
[5] عہد فاروقی اور عہد عثمانی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیشتر قیام کوفہ ہی میں رہا۔ چنانچہ علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں اصبغ بن خلیل کے ترجمہ میں تصریح کرتے ہیں۔ انہ کان فی غالب دولتیھما بالکوفۃ (یعنی یہ ان دونوں کے زمانہ خلافت میں بیشتر کوفہ ہی میں رہے)

میں کوفہ میں سب سے پہلے ۳۲۲ھ میں داخل ہوا۔ ابو الحسن بن عقبہ شیبانی مجھے صحابہ کی مساجد بتلاتے جاتے تھے چنانچہ میں بہت سی مسجدوں میں گیا۔ یہ مساجد اس وقت تک آباد تھیں۔ ہم نے اپنا ٹھکانا محلہ بجیلہ میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی مسجد کو بنایا تھا۔

اس کے بعد ۳۴۵ھ میں پھر کوفہ آنا ہوا تو ابن عقبہ کی مسجد ویران ہو چکی تھی۔ اب ابو القاسم سکونی میرا ہاتھ پکڑ کر میرے ساتھ جامع مسجد کے ستونوں کے گرد گھومتے اور بتاتے جاتے تھے کہ ھذہ اسطوانة جریر۔ ھذہ اسطوانة عبد اللّٰہ۔ ھذہ اسطوانة البراء۔ یہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کا ستون ہے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے۔ یہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کا ہے۔ (جہاں یہ حضرات درس دیا کرتے تھے)"۔ [1]

امام ابن ماجہ نے جس زمانہ میں کوفہ کا سفر کیا ہے اس کی علمی رونق بدستور قائم تھی اور یہ محدثین وحفاظ حدیث سے بھرا تھا۔ چنانچہ ان میں سے جن حضرات کے سامنے آپ نے زانوئے شاگردی تہہ کیا وہ حسب ذیل ہیں:۔

حافظ ابو بکر بن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی مولاہم الکوفی۔ حافظ ذہبی نے تذکرة الحفاظ میں ان کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع کیا ہے:۔ "ابو بکر بن ابی شیبة الحافظ عدیم النظیر الثبت النحریر" بہت بڑے نامور محدث تھے۔ مصنفین صحاح ستہ میں سے امام بخاری، مسلم، ابو داؤد، اور ابن ماجہ ان کے خاص شاگرد تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں تیس اور صحیح مسلم میں ایک ہزار پانسو چالیس حدیثیں ان کی سند سے مروی ہیں۔ اسی طرح سنن ابی داؤد میں بھی بکثرت ان سے حدیثیں منقول ہیں۔ اور سنن ابن ماجہ میں تو غالباً سب سے زیادہ ان ہی کی روایتیں درج ہیں۔ عمرو بن علی فلاس کا بیان ہے کہ ان سے بڑا حافظ حدیث ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ابو عبیدہ قاسم بن سلام کہتے ہیں کہ حدیث کا علم چار شخصوں پر منتہی ہوا۔ جن میں ابو بکر بن ابی شیبہ تو حسن ادا میں، اور احمد بن حنبل تفقہ میں، اور یحییٰ بن معین جامعیت میں اور علی بن مدینی وسعت معلومات میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ایک اور موقع پر ابو عبید نے ان چاروں کے مابین ان الفاظ میں موازنہ کیا ہے کہ حدیث کے ربانی عالم چار ہیں۔ جن میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم احمد بن حنبل اور روانی وحسن سیاق میں سب سے اچھے علی بن مدینی اور تصنیف میں سب سے خوش سلیقہ ابو بکر بن ابی شیبہ اور صحیح اور غیر صحیح حدیثوں کا سب سے زیادہ علم رکھنے والے یحییٰ بن معین ہیں۔

ابو علی صالح بن محمد بغدادی کا بیان ہے کہ میں نے جن لوگوں کو پایا ان میں حدیث اور اس علل کے سب سے بڑے عالم علی بن مدینی اور فقہ حدیث میں سب سے بڑھ کر احمد بن حنبل اور تصحیف مشائخ سے سب سے زیادہ باخبر یحییٰ بن معین اور مذاکرہ کے وقت سب سے زیادہ یادداشت رکھنے والے ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں۔ [2]

ابو زرعہ کا بیان ہے کہ میں نے ابن ابی شیبہ سے ایک لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔ [3]

ابن خراش کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے ابو زرعہ کو یہ کہتے سنا کہ مارأیت احفظ من ابن ابی شیبة۔ میں نے ابن ابی

---

[1] معرفت علوم الحدیث ص ۱۹۱ و ۱۹۲ طبع مصر۔ [2] تہذیب التہذیب ترجمہ ابن ابی شیبہ۔ [3] تدریب الراوی ص ۲۷۶۔
[4] تذکرة الحفاظ ترجمہ ابراہیم بن موسیٰ ابو اسحٰق الرازی الفراء۔

بڑھ کر کسی کو حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ اس پر یحییٰ بول اٹھا کہ و اصحابنا البغدادیین (ہمارے بغداد کے اصحاب بھی نہیں) — کہنے لگے۔ دع اصحابک اصحاب المخاریق (ارے اپنے ہتھکنڈوں والے اصحاب کو رہنے بھی دو) محرم ۲۳۵ھ میں انتقال فرمایا۔

آپ نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں۔ جن میں مسند اور مصنف زیادہ مشہور ہیں۔

"مصنف" کا شمار حدیث کی ان چند بے مثل تالیفات میں ہے کہ جو اسلام کا کارنامہ فخر جہاں کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر دمشقی، البدایہ والنہایہ میں ابن ابی شیبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وصاحب المصنف الذی لم یصنف احد مثله قط لا قبله ولا بعده (ج ۱۰۔ ص ۳۱۵)	یہ اس "مصنف" کے مصنف ہیں کہ اس کی مثل کسی نے کبھی تصنیف نہیں کی نہ ان سے پہلے اور نہ ان سے بعد۔

اور حافظ ابن حزم اندلسی نے اس کتاب کو عظمت کے اعتبار سے موطا امام مالک سے بھی مقدم رکھا ہے[1]۔ اور فی الواقع صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، اور سنن ابن ماجہ میں جس کثرت سے اس کتاب کی روایتیں منقول ہیں۔ موطا کی منقول نہیں۔

"مصنف" میں صرف فقہی احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔ یعنی جن سے کوئی مسئلہ معلوم ہو سکے اور یہ اس کتاب کا خاص امتیاز ہے کہ اس میں کسی مذہب فقہی کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک روا نہیں رکھا گیا۔ بلکہ اہل حجاز اور اہل عراق دونوں کی جتنی روایات مصنف کو مل سکیں ان سب کو نہایت ہی غیر جانبداری کے ساتھ یکجا جمع کر دیا ہے۔ جس سے ہر فقیہ کو نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی تاثر کے اس مسئلہ کے بارے میں آزادی کے ساتھ رائے قائم کرنے کا موقع باقی رہتا ہے۔

افسوس ہے کہ بعد کے مصنفین ابن ابی شیبہ کے اس غیر جانبدارانہ طرز کو قائم نہ رکھ سکے۔ اور انہوں نے اپنی تصانیف میں یا صرف اپنے ہی مذہب فقہی کی روایات کے درج کرنے پر اکتفاء کی یا دوسرے مذاہب کی روایات ذکر کیں تو جہاں تک ممکن ہو سکا ان پر جرح بھی کر ڈالی۔ جس کی وجہ سے جب تک قدماء کی کتابیں پیش نظر نہ ہوں کسی مسئلہ پر غیر جانبداری کے ساتھ رائے قائم کرنا دشوار ہو گیا۔ حدیث کی بعض متداول کتابوں کے مطالعہ سے جو ظاہر بینوں کو مذہب حنفی سے عقیدت کم ہو جاتی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے!

بہرحال قدماء کی تصانیف میں احادیث احکام پر یہ جامع ترین کتاب ہے۔ دوسری ایک اور اہم خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس میں حدیث نبوی کے پہلو بہ پہلو صحابہ اور تابعین کے اقوال و فتاوے بھی درج ہیں۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر حدیث کے متعلق ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پر سلف امت کی تلقی رہی ہے یا نہیں۔ اور دور صحابہ و تابعین میں اس روایت پر عمل در آمد تھا یا نہیں۔ اور یہ اس کتاب کی وہ مخصوص افادیت ہے کہ جس میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب فقہاء و محدثین میں برابر متداول چلی آتی ہے۔ چنانچہ کتب حدیث و فقہ کی وہ شروح کہ جن میں احادیث احکام سے بحث کی جاتی ہے۔ ان میں شاید ہی کوئی کتاب ایسی ملے کہ جس میں اس کے حوالے درج نہ ہوں، اور اس کی احادیث پر بحث نہ ہو۔

صاحب کشف الظنون نے اس کتاب کا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے:۔

هو کتاب کبیر جداً جمع فیه فتاوی التابعین	یہ ایک بہت بڑی کتاب ہے جس میں فتاویٰ تابعین،
واقوال الصحابة واحادیث الرسول صلی الله	اقوال صحابہ، اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ۔ ترجمہ علامہ ابن حزم۔

علیہ وسلم علی طریقۃ المحدثین بالاسانید مرتبا علی الکتب والابواب علی ترتیب الفقہ

کو محدثین کے طریقہ پر اسانید کے ساتھ جمع کر دیا ہے اور ترتیب فقہی پر اس کی کتب و ابواب کو مرتب کیا ہے۔

اور محدث ناقد محمد زاہد کوثری رقمطراز ہیں :-

والمصنف احوج مایکون الفقیہ الیہ من الکتب الجامعۃ للمسانید والمراسیل وفتاوی الصحابۃ والتابعین، رتبہ علی الابواب لیقف المطالع علی مواطن الاتفاق والاختلاف بسھولۃ وھو من اجمع الکتب لادلۃ الفقھاء وخاصۃ اھل العراق۔[1]

مسانید و مراسیل اور فتاوئے صحابہ و تابعین کی جو جامع کتابیں ہیں ان میں ایک فقیہ کو سب سے زیادہ جس کتاب کی احتیاج ہے۔ وہ مصنّف ہے۔ جس کو ابواب پر مرتب کیا ہے۔ تاکہ اس کا مطالعہ کرنے والا سہولت کے ساتھ اتفاق و اختلاف کے مواقع سے واقف ہو جائے۔ یہ کتاب فقہاء بالخصوص اہل عراق کے دلائل کی جامع ترین کتابوں میں سے ہے

ابن ابی شیبہ نے اس کتاب میں ایک مستقل باب ابو حنیفہ کے رد میں لکھا ہے۔[2] جس کا عنوان ہے :-

---

[1] حواشی ذیول تذکرۃ الحفاظ از محدث موصوف ص ۱۰۵ طبع دمشق۔

[2] ناظرین کو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ اجتہادی مسائل میں اختلاف ناگزیر ہے اور ہر فریق کو دوسرے کے مسائل پر تنقید کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اگر کسی فن میں تنقید کو ممنوع قرار دے دیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ فن کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں نے فن استنباط و اجتہاد کو جو اس درجہ اوج کمال پر پہنچا یا کہ وہ ہر مسئلہ کا حل شریعت کی روشنی میں تلاش کر لیتے ہیں۔ اور ان کا قانون و فقہ ہر حیثیت سے مکمل و جامع ہے۔ اس کی اصل وجہ ان کی یہی علمی کاوش و تحقیق ہے۔ جس سے نصوص پر غور کرنے اور ان سے استنباط مسائل کے سارے طریقے منقح ہو کر امت کے سامنے آگئے۔ زمانہ سلف میں اکثر ائمہ نے ایک دوسرے کے مسائل پر تنقید و اعتراض کیا ہے۔

امام لیث بن سعد کا بیان ہے کہ میں نے امام مالک کے ستر مسئلے ایسے شمار کئے کہ جو سب کے سب سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے۔ چنانچہ میں نے اس بارے میں ان کو لکھ کر بھیجا ہے۔[1] خود امام شافعی نے امام مالک کی تردید میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ ان کے بہت سے مسائل احادیث کے خلاف ہیں۔

امام رازی نے مناقب الشافعی میں اس کتاب کا دیباچہ نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی جو ارباب ظواہر کے امام ہیں۔ اپنی کتب میں لکھتے ہیں کہ موطا میں ستر سے اوپر ایسی حدیثیں ہیں کہ جن پر خود امام مالک نے عمل نہیں کیا ہے۔[2] اور بعض مغاربہ نے ایک مستقل کتاب میں ان مسائل کو جمع بھی کر دیا ہے کہ جن میں مالکیہ کا عمل موطا کی احادیث کے صریحاً خلاف ہے۔[3] محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم مالکی نے جو مصر کے مشہور فقیہ اور محدث تھے، اور امام شافعی کے بھی شاگرد رہ چکے تھے۔ امام شافعی کے رد میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "الرد علی الشافعی فیما خالف فیہ الکتاب والسنۃ" یعنی ان مسائل میں شافعی کا رد کہ جن میں ان سے کتاب و سنت کے خلاف ہوا ہے۔[4] لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ العیاذ باللہ یہ سب ائمہ حدیث کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ نہیں۔ اگر ایسا کرتے تو ان کی امامت تو کیا خود ان کے اسلام پر کلام ہو جاتا ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۸ طبع خیریہ مصر۔ [2] تدریب الراوی ص ۴۳۔ [3] تعجیل المنفعہ بزوائد رجال الاربعہ از حافظ ابن حجر عسقلانی ص ۴۔ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن۔ [4] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۱ ص ۲۲۴

هذا ما خالف به ابو حنيفة الاثر الذى جاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

یہ وہ ہے جس میں ابو حنیفہ نے اس حدیث کا خلاف کیا ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہے۔

اس باب میں ابن ابی شیبہ نے ایک سو پچیس مسائل کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ احادیث آثار سے تو یہ ثابت ہے اور امام

(بقیہ حاشیہ) بات یہ ہے کہ یہ اجتہادی مسائل ہیں اور ان میں عموماً یہی ہوتا ہے کہ جو روایت ایک کے نزدیک قابل قبول ہو وہ دوسرے کے نزدیک بھی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے علم میں اس کی سند میں کوئی خرابی موجود ہو۔ یا اس کی تحقیق میں وہ منسوخ ہو یا پھر اس کے ذہن میں اس کی کوئی اور توجیہ ہو۔ چنانچہ علامہ ابن عبدالبر مالکی، جامع بیان العلم میں فرماتے ہیں:۔

ليس لاحد من علماء الامة يثبت حديثا عن النبى صلى الله عليه وسلم ثم يرده دون ادعاء نسخ عليه باثر مثله او باجماع او بعمل يجب على اصله الانقياد اليه. او طعن فى سنده ولو فعل ذلك احد سقطت عدالته فضلا ان يتخذ اماما ولزمه اثم الفسق۔

علماء امت میں سے کسی کو یہ اختیار نہیں کہ ایک حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت مانتے ہوئے پھر اس کو بغیر ادعاء نسخ کے رد کر دے خواہ اس نسخ کے ثبوت میں اسی درجہ کی حدیث پیش کرے یا اجماع کو یا کسی ایسے عمل کو کہ جس کا تسلیم کرنا اس کے اصول پر ضروری ہے یا پھر اس حدیث کی سند میں طعن کو ثابت کرے ورنہ اگر وہ یونہی رد کر دے تو اس کا امام ہونا تو درکنار اس کی عدالت ہی سرے سے ساقط ہو جائے اور فسق کا گناہ اس پر عائد ہو جائے!

چنانچہ ابن ابی شیبہ کے اس باب ہی کو لے لیجئے اور جن محدثین نے اس کا جواب لکھا ہے وہ بھی اٹھا لیجئے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ ان مسائل میں امام ابو حنیفہ کا مذہب حدیث کے مخالف ہے یا ابن ابی شیبہ کے مذہب فقہی کے۔ جہاں تک ان علماء کے متعلق یہ معلوم ہو سکا جنہوں نے ابن ابی شیبہ کے اعتراضات کا جواب لکھا ہے وہ یہ ہیں (۱) حافظ عبد القادر قرشی مصنف الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ۔ ان کی تصنیف کا نام ہے "الدرر المنیفۃ فی الرد علی ابن ابی شیبۃ فیما اورده علی ابی حنیفۃ"۔ (۲) حافظ قاسم بن قطلوبغا متوفی ۸۷۹ھ۔ ان کی کتاب کا نام ہے "الاجوبۃ المنیفۃ عن اعتراضات ابن ابی شیبۃ علی ابی حنیفۃ"۔ علامہ قاسم کا فن حدیث میں جو پایہ ہے اس کا اندازہ آپ اس سے لگا لیجئے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی جو ان کے استاد بھی ہیں ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: "الامام العلامۃ المحدث الفقیہ" اور "الشیخ الفاضل المحدث الکامل الاوحد"[1] (۳) علامہ محمد زاہد کوثری متوفی ۱۳۷۱ھ۔ ان کی تصنیف کا نام ہے "النکت الطریفۃ فی التحدث عن ردود ابن ابی شیبۃ علی ابی حنیفۃ"۔ یہ کتاب مصنف کی حیات ہی میں ۱۳۶۵ھ میں مصر سے طبع ہو کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچ چکی ہے۔

حافظ محمد بن یوسف صالحی شامی مصنف سیرۃ شامیہ نے عقود الجمان میں لکھا ہے کہ خود انہوں نے بھی ابن ابی شیبہ کے رد میں ایک مستقل تصنیف شروع کی تھی۔ اور دس حدیثوں تک جواب بھی لکھ لیا تھا مگر بعد کو جب یہ اندازہ ہوا کہ جس پیمانہ پر انہوں نے جواب لکھنا شروع کیا ہے وہ دو جلدوں میں آئے گا۔ تو قلم روک لیا کیونکہ اس زمانے میں یہ سیرت شامیہ کی تکمیل میں مصروف تھے۔

ملا کاتب چلپی نے کشف الظنون میں حافظ قرشی اور حافظ قاسم کی تالیفات کے علاوہ اس سلسلہ میں ایک اور تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کا نام ہے "الرد علی من رد علی ابی حنیفۃ وافتخر به وجعله بابا فی کتابه"۔ ملا صاحب نے اس کتاب کے مصنف کا ذکر نہیں کیا مگر یہ لکھا ہے کہ یہ ایک مختصر کتاب ہے جس کا ابتدائی جملہ الحمد للہ الذی هدانا الی الصراط المستقیم ہے اس کتاب میں اولاً ابن ابی شیبہ کے مسائل کو مع دلائل ذکر کیا ہے اور پھر اصل مسئلہ کی تقریر مع جوابات کے قلمبند کی ہے۔

---

[1] الضوء اللامع فی اعیان القرن التاسع از حافظ سخاوی، ترجمہ حافظ قاسم۔

ابو حنیفہ کا قول اس کے برخلاف ہے۔ لیکن آپ کو علماء احناف کی اس وسعت صدر پر شاید تعجب ہو کہ اس کے باوجود اس کتاب کی علمی وقعت ان کی نظر میں ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔ لیکن یہی کتاب جب ابن ابی شیبہ کے نامور شاگرد شیخ الاسلام بقی بن مخلد جن کو حافظ ابن حزم اندلسی اپنے رسالہ "فضائل اہل اندلس" میں امام بخاری و مسلم کا ہمسر بتاتے ہیں۔ اندلس میں لے کر داخل ہوئے اور ان کے پاس لوگوں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو وہاں کے فقہاء کی ایک جماعت اپنے مسائل سے اختلاف کی تاب نہ لاکر نہایت سختی سے مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ عوام نے شیخ الاسلام پر یورش کر کے کتاب کی قرأت کو موقوف کرا دیا۔ اس زمانے میں محمد بن عبدالرحمٰن اموی، اندلس کا فرمانروا تھا۔ یہ علم و علماء کا نہایت قدردان اور بڑا ذی علم تھا۔ اسے جب اس ہنگامہ کا پتہ چلا تو فوراً ہی شیخ الاسلام کو مع فریق مخالف کے اپنے حضور میں طلب کیا۔ اور مصنف کے ایک ایک جزو کا اول سے آخر تک خوب جائزہ لیا۔ بعد ازاں اپنے خازن کتب کو حکم دیا کہ:۔

هذا الكتاب لا تستغني خزانتنا عنه فانظر في نسخه لنا۔

یہ وہ کتاب ہے جس سے ہمارا کتب خانہ بھی مستغنی نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اس کی نقل کا بندوبست کرو۔

پھر امام بقی بن مخلد کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ آپ اپنے علم کی نشر و اشاعت میں مصروف رہیں اور جو روایات آپ کے پاس موجود ہیں ان کو بیان فرمائیں۔ اور فریق مخالف کو ہدایت کر دی کہ آئندہ ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ [1]

اس زمانے میں اندلس میں فقہ مالکی کی حکمرانی تھی اور مصنف میں اگرچہ امام ابو حنیفہ کی طرح امام مالک کے رد میں کوئی باب بھی نہیں ہے۔ تاہم حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ چونکہ کوفی تھے اور اس بناء پر انہوں نے اہل عراق کی روایات اور ان کے دلائل کو بھی تفصیل بیان کیا ہے۔ اور اندلس کے لوگ عام طور پر موطا اور احادیث اہل مدینہ کے علاوہ اور روایات سے ناآشنا تھے۔ ساتھ ہی ذہن میں یہ غلط مفروضہ قائم کر رکھا تھا کہ اہل عراق قلیل الحدیث ہیں اور ان کی معلومات حدیث میں برائے نام ہیں۔ اس لئے خلاف توقع جب یہ کتاب ان کے سامنے آئی تو اس کی روایات پر فقہاء مالکیہ میں سخت شورش پیدا ہوئی جو فن حدیث سے ناواقفیت کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس جماعت کے سرخیل فقیہ اصبغ بن خلیل قرطبی کو مصنف سے اس قدر برہمی تھی کہ کہا کرتے تھے:۔

لان يكون في تابوتي رأس خنزير احب الي من ان يكون فيها مصنف ابن ابي شيبة۔ [2]

اگر میری کتابوں میں خنزیر کا سر رکھا ہو تو وہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ان میں "مصنف ابن ابی شیبہ" ہو۔

قاسم بن اصبغ جو مشہور حفاظ حدیث میں ہیں، اکثر اصبغ بن خلیل کو بددعا دیتے اور کہا کرتے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے بقی بن مخلد سے حدیث نہ سننے دی۔ کیونکہ یہ میرے باپ کو کہا کرتا تھا کہ اس کو بقی کے پاس نہ جانے دینا۔ [3] یہ اصبغ بن خلیل گو فقہاء مالکیہ میں نہایت نامور ہیں مگر علم حدیث سے ناآشنا تھے۔ چنانچہ حافظ ابن الفرضی لکھتے ہیں:۔

كان اصبغ بن الخليل حافظا للرأي على مذهب مالك فقيها في الشروط بصيرا بالعقود ودار عليه الفتيا ولم يكن له علم بالحديث۔ [3]

اصبغ بن خلیل، مذہب مالک پر مسائل کے حافظ تھے، شروط میں فقیہ تھے اور معاملات پر بڑی گہری بصیرت رکھتے تھے۔ فتویٰ کا ان پر دارومدار تھا۔ لیکن حدیث کا علم ان کو نہ تھا۔

---

[1] نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب۔ ج ۳ ص ۲۷۰ طبع جدید۔ [2] میزان الاعتدال امام ذہبی، ترجمہ اصبغ بن خلیل۔
[3] لسان المیزان۔ ترجمہ اصبغ مذکور۔

مصنّف کے قلمی نسخے ہندوستان اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہماری نظر سے بھی گزرا ہے۔ مولوی عبدالتواب ملتانی مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کو طبع کر کے شائع کر دیا جائے چنانچہ انہوں نے اس کے پندرہ اجزاء میں سے جزو اول و ثانی و رابع کو ملتان سے طبع کر کے شائع بھی کیا۔ مگر پھر ان کا انتقال ہو گیا اور کتاب کی طباعت مکمل نہ ہو سکی اور مولوی صاحب موصوف کے پاس چونکہ اس کی طباعت کا کوئی مناسب انتظام نہ تھا۔ اس لئے ان اجزاء کی طباعت بھی نہایت ناقص اور بےحد خراب ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سی جگہ کتاب مسخ ہو کر رہ گئی ہے!

شیخ الاسلام الاشج۔ یہ وہی ہیں جن سے ابوبکر بن ابی داؤد نے ایک ماہ میں تیس ہزار حدیثیں لکھی تھیں۔ ان سے بھی امام ابن ماجہ نے بکثرت روایتیں کی ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ اس طرح شروع کیا ہے۔

الاشج الامام شیخ الاسلام ابو سعید عبد اللہ بن سعید بن حصین الکندی الکوفی الحافظ محدث الکوفۃ وصاحب التفسیر والتصانیف۔

تمام ارباب صحاح ستہ فن حدیث میں ان کے شاگرد ہیں۔ محمد بن احمد بن بلال شطوی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ ابوحاتم کہتے ہیں "الاشج امام زمانہ"۔ ربیع الاول ۲۵۷ھ میں جبکہ آپ کی عمر نوے سال سے متجاوز ہو چکی تھی انتقال فرمایا۔ رحمۃ اللہ (تذکرۃ الحفاظ۔ تہذیب التہذیب)

حافظ کبیر عثمان بن ابی شیبہ ابوبکر بن ابی شیبہ صاحب مصنّف کے بڑے بھائی ہیں۔ ان سے بھی امام ابن ماجہ نے بکثرت روایتیں نقل کی ہیں۔ ذہبی کے میزان الاعتدال میں ان کے متعلق یہ الفاظ ہیں:۔

احد ائمۃ الحدیث الاعلام کاخیہ ابی بکر۔

یعنی اپنے بھائی ابوبکر کی طرح یہ بھی مشاہیر ائمہ حدیث میں سے ہیں۔

امام بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ سب آپ کے شاگرد ہیں۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ:۔

"ان کی مرویات میں افراد و غرائب موجود ہیں۔ حالانکہ امام بخاری ان سے بکثرت روایت کرتے ہیں۔ مزاح میں بڑا مزاح تھا۔ حتیٰ کہ قرآن پاک کی آیات کی تصحیف سے بھی نہیں چوکتے تھے"۔

۲۳۹ھ کے اوائل میں انتقال ہوا۔ ذہبی نے ان کی تصانیف میں سے مسند اور تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ رحمۃ اللہ۔

(تذکرۃ الحفاظ۔ میزان الاعتدال)

دُرّۃ العراق حافظ محمد بن عبد اللہ بن نُمیر۔ ابو عبد الرحمٰن الہمدانی الخارفی الکوفی۔ یہ اور ان کے والد[1] عبد اللہ دونوں بڑے پایہ کے محدث گزرے ہیں۔ چنانچہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں دونوں کا تذکرہ لکھا ہے۔ امام احمد بن حنبل ان کی بہت تعظیم کرتے اور ان کو "دُرّۃ العراق" (عراق کا موتی) کہا کرتے تھے۔ علی بن الحسین بن الجنید کہتے ہیں

بالکوفۃ مثلہ جمع العلم والفہم والسنۃ والزہد۔

کوفہ میں میں نے ان کی نظیر نہیں دیکھی۔ علم، فہم، سنت اور زہد سب کے جامع تھے۔

---

[1] یہ امام ابوحنیفہ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔ چنانچہ حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ میں ان کا تذکرہ لکھا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے بھی اپنی مصنّف میں ان کے واسطے سے امام ابوحنیفہ کی متعدد روایات نقل کی ہیں۔

احمد بن صالح مصری کا بیان ہے کہ عراق میں میں نے ان دو شخصوں کے مثل نہ دیکھا۔ بغداد میں تو امام احمد کی اور کوفہ میں محمد بن عبداللہ بن نمیر کی۔ یہ دونوں جامع شخص تھے۔ جن کی نظیر سے عراق ہی میری نظر سے نہیں گزری ہے۔
امام بخاری۔ مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ سب ان کے شاگرد ہیں۔ صحیح مسلم میں ان کی سند سے پانچسو تہتر حدیثیں منقول ہیں۔ اور امام ابن ماجہ نے بھی ان سے بکثرت روایتیں کی ہیں۔ ۲۳۴ھ میں ماہ شعبان یا رمضان میں انتقال فرمایا۔ رحمۃ اللہ۔
(تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب)

محدث کوفہ ابو کریب ۔ محمد بن العلاء بن کریب الہمدانی الکوفی۔ کوفہ کے مشہور حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ تمام ارباب صحاح ستہ ان کے شاگرد تھے۔ ابن عقدہ ان کو تمام مشائخ پر حفظ وکثرت حدیث میں مقام رکھتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ ان سے کوفہ میں تین لاکھ حدیثیں شائع ہوئی ہیں۔

موسیٰ بن اسحاق کا بیان ہے کہ میں نے ابوکریب سے ایک لاکھ حدیثیں سنی ہیں۔

ابن نمیر کا قول ہے کہ عراق میں ان سے زیادہ کثیر الحدیث کوئی نہیں۔ اور ہمارے شہر کی حدیثوں کا جاننے والا بھی ان سے زیادہ کوئی نہیں۔

ابراہیم بن ابی طالب کہتے ہیں کہ مجھ سے محمد بن یحییٰ نے پوچھا کہ تم نے عراق میں سب سے بڑا حافظ حدیث کس کو دیکھا۔ تو میں نے کہا کہ احمد بن حنبل کے بعد ابوکریب کے برابر میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔

علامہ یاقوت حموی لکھتے ہیں۔ کان ثقۃ مجمعاً علیہ (یہ متفق علیہ ثقہ ہیں)

صحیح بخاری میں پچھتر اور صحیح مسلم میں پانچسو چھپن حدیثیں ان سے منقول ہیں۔ امام ابن ماجہ نے بھی ان سے بکثرت روایتیں کی ہیں۔ ۲۷۔ جمادی الاول ۲۴۸ھ کو ستاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ رحمۃ اللہ۔ (تذکرۃ الحفاظ۔ تہذیب التہذیب۔ معجم البلدان۔ ذکر کوفہ)

شیخ الکوفہ ہناد ۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ذکر ان لفظوں سے شروع کیا ہے۔
ھناد بن السری بن مصعب، الحافظ القدوۃ، الزاھد، شیخ الکوفۃ ابو السری التمیمی الدارمی المحدث۔
تمام ارباب صحاح ستہ ان کے شاگرد ہیں۔ مگر امام بخاری نے اپنی صحیح میں ان سے روایت نہیں کی۔ بلکہ اپنی دوسری تصنیف خلق افعال العباد میں کی ہے۔ امام احمد سے سوال ہوا تھا کہ کوفہ میں کس سے حدیثیں لکھی جائیں۔ کہنے لگے۔ علیکم بھناد (ہناد کو پکڑے رہو)

قتیبہ کا بیان ہے کہ میں نے وکیع کو ان کی جتنی تعظیم کرتے دیکھا کسی کی نہ دیکھا۔ کثرت عبادت کا یہ عالم تھا کہ "راہب کوفہ" کہلاتے تھے۔ "زہد" پر ان کی ایک بہت بڑی تصنیف بھی ہے۔ اکیانوے سال کی عمر میں ربیع الآخر ۲۴۳ھ میں انتقال کیا۔ رحمۃ اللہ (تذکرۃ الحفاظ)

حافظ ولید بن شجاع ابو ہمام بن ابی بدر السکونی الکوفی۔ امام مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی اور ابن ماجہ کے فن میں استاذ ہیں۔ یحییٰ بن معین نے تصریح کی ہے کہ ان کے پاس ایک لاکھ حدیثیں ثقات کی موجود تھیں۔ حافظ ذہبی نے

ؔ۵ مناقب احمد از ابن جوزی ص ۱۲۱ طبع مصر۔

اگرچہ "تذکرۃ الحفاظ" میں اُن کا ترجمہ نہیں لکھا۔ مگر میزان الاعتدال میں ان کے حافظ الحدیث ہونے کی صراحت کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ ابوہمام بن ابی بدر السکونی الکوفی الحافظ صدوق۔ ۲۴۳ھ میں انتقال کیا۔ رحمۃ اللہ۔ (میزان الاعتدال)

حافظ ہارون بن اسحٰق بن محمد بن الہمدانی ابوالقاسم الکوفی۔ امام بخاری، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کے استاد ہیں۔ امام بخاری نے جزء القرأۃ میں ان سے روایت کی ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ نہیں لکھا ہے۔ مگر حافظ مزی نے تہذیب الکمال میں اور علامہ صفی الدین خزرجی نے خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال میں ان کے حافظ الحدیث ہونے کی تصریح کی ہے۔ امام نسائی نے آپ کو ثقہ کہا ہے۔ ابن خزیمہ کہتے ہیں کان من خیار عباد اللہ۔ ۲۵۸ھ میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ۔ (تہذیب التہذیب۔ خلاصہ تذہیب)

ان حفاظ کے علاوہ کوفہ کے جن محدثین سے امام ابن ماجہؒ نے حدیث کی تحصیل کی اُن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ احمد بن بدیل بن قریش ابوجعفر الیامی قاضی الکوفہ المتوفی سنہ ۲۵۸ھ۔
۲۔ احمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن ابی السفر الہمدانی ابوعبیدہ الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۸ھ۔
۳۔ احمد بن عثمان بن حکیم الاودی ابوعبداللہ الکوفی المتوفی سنہ ۲۶۱ھ۔
۴۔ ابراہیم بن عبداللہ بن محمد بن ابراہیم ابوشیبہ۔ یہ حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ صاحب مصنف کے صاحبزادے ہیں۔
۵۔ اسمٰعیل بن بہرام بن یحییٰ الہمدانی ثم الخبذعی ابوشاور الکوفی المتوفی سنہ ۲۴۱ھ۔
۶۔ اسمٰعیل بن محمد بن اسمٰعیل التیمی الطلحی الکوفی المتوفی سنہ ۲۳۲ھ۔
۷۔ اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری ابومحمد الکوفی المتوفی سنہ ۲۴۵ھ۔
۸۔ جبارہ بن المغلس الحمانی ابومحمد الکوفی المتوفی سنہ ۲۴۱ھ۔
۹۔ حسن بن علی بن عفان العامری ابومحمد الکوفی المتوفی سنہ ۲۷۰ھ۔
۱۰۔ سفیان بن وکیع بن الجراح الرواسی ابومحمد الکوفی المتوفی سنہ ۲۴۷ھ
۱۱۔ سلم بن جنادہ بن سلم السوائی العامری ابوالسائب الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۴ھ۔
۱۲۔ عباد بن یعقوب الرواجنی الاسدی ابوسعید الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۰ھ۔
۱۳۔ عبداللہ بن الحکم بن ابی زیاد القطوانی ابوعبدالرحمٰن الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۵ھ۔
۱۴۔ عبداللہ بن سالم ابومحمد الکوفی القزاز المعروف بالمفلوج المتوفی سنہ ۲۳۵ھ۔
۱۵۔ عبداللہ بن عامر بن براد الاشعری ابوعامر الکوفی۔
۱۶۔ عبداللہ بن عامر بن زرارہ الحضرمی مولاہم ابومحمد الکوفی المتوفی سنہ ۲۳۷ھ۔
۱۷۔ عبید بن اسباط بن محمد القرشی مولاہم ابومحمد الکوفی سنہ ۲۵۰ھ۔

؎ امام ابن ماجہؒ جیسا کہ سابق میں گزرا ۲۳۳ھ کے بعد رحلت علمی کی ہے۔ اور اسمٰعیل طلحی نے ۲۳۲ھ میں قضا کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً امام ابن ماجہ قزوین سے نکل کر تحصیل حدیث کے لئے پہلے کوفہ ہی آئے ہیں۔ کیونکہ یہ اُن کے بیرونی شیوخ میں سب سے قدیم الوفات ہیں۔

۱۸ - علقمہ بن عمرو بن الحصین التمیمی الدارمی العطاردی ابوالفضل الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۶ھ۔
۱۹ - علی بن محمد بن ابی الخصیب القرشی الوشاء الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۸ھ۔
۲۰ - علی بن المنذر بن زید الاودی ابوالحسن الکوفی الطریقی المتوفی سنہ ۲۵۶ھ۔
۲۱ - عمرو بن عبداللہ بن حنش الاودی الکوفی۔
۲۲ - قاسم بن زکریا بن دینار القرشی ابومحمد الطحان الکوفی المتوفی سنہ ۲۳۵ھ۔
۲۳ - محمد بن اسمٰعیل بن سمرۃ الاحمسی ابوجعفر الکوفی السراج المتوفی سنہ ۲۶۰ھ۔
۲۴ - محمد بن ثواب بن سعید الہباری ابوعبداللہ الکوفی المتوفی سنہ ۲۶۰ھ۔
۲۵ - محمد بن جابر بن بجیر بن عقبہ المحاربی ابوبجیر الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۶ھ۔
۲۶ - محمد بن طریف بن خلیفۃ البجلی ابوجعفر الکوفی المتوفی سنہ ۲۴۲ھ۔
۲۷ - محمد بن عبید بن عتبہ الکندی ابوجعفر الکوفی۔
۲۸ - محمد بن عبید بن محمد العامری الکوفی المعروف بالحوت۔
۲۹ - محمد بن عثمان بن کرامۃ العجلی مولاہم الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۶ھ۔
۳۰ - محمد بن عمر بن ابوالولید الکندی ابوجعفر الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۶ھ۔
۳۱ - محمد بن عمیر بن ہیاج الہمدانی الصائدی ابوعبیداللہ الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۵ھ۔
۳۲ - محمد بن یزید بن محمد العجلی ابوہشام الرفاعی الکوفی قاضی بغداد المتوفی سنہ ۲۴۸ھ۔
۳۳ - مسروق بن المرزبان بن مسروق الکندی ابوسعید بن ابی النعمان الکوفی المتوفی سنہ ۲۴۰ھ۔
۳۴ - موسیٰ بن عبدالرحمٰن بن سعید الکندی المسروقی ابوعیسیٰ الکوفی المتوفی سنہ ۲۵۸ھ۔
۳۵ - واصل بن عبدالاعلیٰ بن ہلال الاسدی ابوالقاسم الکوفی المتوفی سنہ ۲۴۴ھ۔

حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات میں (باستثنار جارہ سفیان۔ عباد اور محمد بن جابر) ان سب کا تذکرہ لکھا ہے۔
امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ان تمام محدثین میں سب سے زیادہ اسمٰعیل بن موسیٰ فزاری۔ علی بن منذر اودی اور عبداللہ بن عامر بن زرارہ کوفی سے روایتیں نقل کی ہیں۔ [1]

---

[1] "ابن ماجہ اور علم حدیث" — یہ کتاب "نور محمد کارخانہ تجارت، آرام باغ کراچی" کے اہتمام سے شائع ہوگی۔ ہم مصنف اور ناشر دونوں کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس گرانقدر کتاب کا ایک حصہ "فاران" میں چھاپنے کے لئے مرحمت فرمایا۔ (م۔ق)

از مُلّا واحدی

غلامی کا اِنسداد

شراب۔ جوا۔ زنا۔ بہت سی برائیاں ہیں، جن میں کسی مسلمان کو مبتلا پایا جاتا ہے تو ذہن ادھر منتقل نہیں ہوتا کہ اسلام نے ان کی اجازت دی ہے۔ غیر مسلم تک جانتے ہیں کہ فلاں برائی مسلمانوں کے اں برائی ہے۔ لیکن غلامی کا معاملہ ایسا ہے کہ بعض مسلمان بھی سمجھنے لگے ہیں کہ غلامی[1] اسلام میں جائز ہے۔ اور غلامی کا خاتمہ اسلام نے نہیں، یورپ نے کیا ہے۔ حالانکہ اسلام آیا فقط اسی کام کے واسطے تھا کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے رہائی دلاکر اللہ واحد کا غلام بنادے۔ جس قسم کی حکومتیں خلفاء راشدین کے بعد مسلمان کرتے رہے اور جس نوعیت کی حکومتیں آجکل رائج ہیں۔ اسلام انھیں نہیں اپناتا۔ کوئی شخص، وہ عامی ہو یا حکمران۔ اپنے تئیں مسلمان کہے، اور مسلمانوں سے یہ عمل نہ کرے تو اس کے ذمہ دار حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ حضورؐ کی تعریف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس بوجھ سے نجات دلائیں گے جس کے نیچے لوگ دبے ہوئے ہوں گے اور اُن پھندوں سے نکالیں گے جن میں لوگ گرفتار رہوں گے۔

اسلام نے اس کی کھلے الفاظ میں ممانعت کی ہے کہ جہاں سے چاہا آدمی کو پکڑ لیا اور بیچ ڈالا۔ اور اعلان کیا ہے کہ :-

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۔

نہیں روا نبی کے لئے کہ ہوں اُس کے پاس قیدی۔ تا آنکہ وہ خوب خون نہ بہالے زمین میں۔

یعنی بغیر جنگ کے خرید و فروخت کے ذریعہ جو انسانوں کو قیدی اور غلام کی حیثیت سے رکھا جاتا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے قطعی اور صاف صاف حرام کردیا۔ اسلام ہر انسان کو خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم اور اسلامی علاقے میں رہتا ہو یا غیر اسلامی علاقے میں حر اور آزاد تسلیم کرتا ہے۔ اِنَّ اَھْلَ الحَرْبِ اَحْرَارٌ ۔ غیر اسلامی اور مخاصم علاقوں کے عام باشندے احرار (آزاد) ہیں۔

---

[1] "غلام" کا لفظ کان میں پڑتے ہی لوگوں کا ذہن اُن غلاموں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو روم، اکبری کے بادشاہوں اور امیروں کے یہاں پائے جاتے تھے جن کے ساتھ یہ لوگ انتہائی ظالمانہ سلوک کرتے تھے اور سوسائٹی میں ان غلاموں کی ذرہ برابر وقعت نہ تھی! حکومت امریکہ جو جمہوریت کی دعویدار ہے خود اس نے "نیگروز" کے ساتھ جو بے رحمانہ سلوک روا رکھا ہے اور جو نامنصفانہ امتیازات قائم کر دیئے ہیں وہ سب پر ظاہر ہیں۔ اسلام میں "غلام" وہ نہیں ہے جسے "slave" کہا جاتا ہے۔ وہ سوسائٹی کا ایک فرد ہے اور اس کے شہری حقوق ہیں۔ آج بھی کا فرد ان جنگ ہو تو ان کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنایا جاسکتا ہے اور ان کے حقوق کیلئے شریعت میں پورا ضابطہ موجود ہے: اسلام کے "غلام" جمہوری حکومت کے [illegible] سے بدرجہا بہتر [illegible] سے حقوق رکھتے ہیں اور ان کو حلو مسند کی جانب سے نشر و آزادی عطا کیا جاتا ہے۔ مگر [illegible] کا حقیقت کچھ [illegible] لوگ [illegible] کو سمجھتے ہیں، [illegible] اسلام میں غلامی اگر [illegible] اسلام [illegible] غالباً اموی دور حکومت کا [illegible] ہے۔ [illegible]

صرف جنگ میں پکڑے جانے والے عورت مرد ہی رکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن اُن کی بابت بھی حکم ہے۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا۔

"اس کے بعد (جنگی قیدیوں کو) یا تو فدیہ لے کر چھوڑ دو یا اُنہیں احسان کر کے چھوڑ دو۔ حتیٰ کہ جنگ ہتھیار دھر دے۔"

چنانچہ غزوہ بدر کا ایک قیدی بھی قیدی نہیں رہا۔ البتہ جب قیدیوں نے یہ کیا کہ چھٹ چھٹ کر پھر لڑنے آ گئے اور جنگ نے ہتھیار نہ دھرے تو دو ہی صورتیں تھیں کہ یا قیدیوں کو مار ڈالا جائے یا قیدیوں کو مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے!

غزوہ بدر کے موقع پر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تجویز قتل تو منظور نہیں فرمائی تھی۔ لہٰذا دوسری صورت اختیار کی گئی۔ قیدیوں کو کیا بانٹا گیا قیدیوں کے بار کو تقسیم کر دیا گیا۔ قیدیوں کے کھلانے پلانے اور تزویج کی فکر سے سبکدوشی کا ایک عارضی راستہ نکال لیا گیا۔ ورنہ مستقل صورت تو یہی ہے کہ جنگی قیدیوں کو بھی فدیہ لے کر یا احسان کر کے چھوڑ دو!

جنگ میں سامان کا ہاتھ آنا۔ جس کا اسلامی نام "غنیمت" ہے۔ اور آدمیوں کا ہاتھ آنا اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ ۱۳۷۲ھ ہجری اور ۱۹۵۲ء عیسوی میں کوریا کی تازہ بتازہ جنگ ہمارے سامنے ہے۔ اور جنگ عظیم و جنگ عالمگیر کے حالات سے بھی ہم واقف ہیں۔ جنگی قیدیوں کو کھلانا پلانا اس وقت دشوار ہے تو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں کتنا دشوار ہو گا۔ اس وقت جنگی قیدی یا موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں یا فریقین ان کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ تبادلہ اسلام کے نزدیک بھی پسندیدہ عمل ہے لیکن کفار مسلمانوں کو پکڑ لیتے تھے اور مار ڈالتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کا کفار کو پکڑنا اور قید رکھنا غیر حق بجانب نہیں تھا۔

مدت دراز سے جہاد، یعنی اسلامی جنگ ہی مفقود ہے۔ لہٰذا آجکل کہیں لونڈی غلام نظر آئیں تو اسلام سے اس کا مطلق تعلق نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اسلام میں کوئی دوسرا ذریعہ استرقاق یعنی لونڈی غلام بنانے کا نہیں ہے۔

آجکل کیا۔ تین سو ساڑھے تین سو سال پہلے کا ایک فتویٰ موجود ہے۔ ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم دولت عثمانیہ ترکیہ کا فتویٰ۔ جن کی وفات ۹۸۲ھ میں ہوئی تھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"اب غنیمت کے اموال اور غلول (خیانت) کے اموال میں فرق نہیں رہا ہے۔ جہاد کے قیدی بھی جہاد کے اموال غنیمت کے ساتھ ہی ہاتھ آیا کرتے تھے۔"

اللہ تعالیٰ نے لونڈی غلام کو "اسریٰ" یعنی اسیر اور قیدی فرمایا ہے۔ لونڈی، غلام اور ملازم و ملازمہ میں فرق یہ ہوتا ہے کہ ملازم و ملازمہ جب چاہتے ہیں ملازمت سے استعفیٰ دے سکتے ہیں۔ مگر لونڈی غلام آقا کی قید سے نہیں نکل سکتے۔ آقا انہیں اپنی قید سے نکال کر کسی اور کی قید میں دیدے یا آزاد کر کے قید سے بالکل نکال دے تو دوسری بات ہے!

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگی قیدیوں کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرنے کی ہدایت اور تاکید کی تھی کہ مسلمان گھر بھر کا کھانا قیدیوں کو کھلا دیتے تھے اور گھر بھر کھجوروں وغیرہ پر گزارہ کر لیتا تھا۔ جو قیدی فدیہ (جرمانہ) نہ دے سکتے تھے وہ اگر پڑھے لکھے ہوتے تھے تو اُن سے کہا جاتا تھا کہ چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو اور چلے جاؤ۔

متعدد قیدیوں کے فدیئے حضورؐ نے جیب خاص سے ادا کئے۔ قیدیوں کو حضورؐ رخصت کرتے تھے تو تحفے دے دے کر رخصت کرتے تھے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود تو ہمیشہ یہی کیا کہ جو قیدی حضورؐ کے حصہ میں آیا اسے آزاد کر دیا۔

پھر وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر رہا تو بندی اور غلام کی حیثیت سے نہیں رہا۔ آزاد انسان کی حیثیت سے رہا۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضورؐ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی شفقت کے آگے باپ کے گھر واپس جانا قبول نہیں کیا تھا۔ حضرت زیدؓ کو حضورؐ نے متبنّیٰ کر لیا تھا۔ اُن سے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی کر دی تھی۔ اُن کے بیٹے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور بہت سے جلیل القدر صحابہ پر افسر (کمانڈر) بنایا تھا۔ حضرت اُسامہ چھوٹے تھے تو حضورؐ دست مبارک سے اُن کی ناک پونچھا کرتے تھے۔ اور اُن سے اتنی محبت فرماتے تھے کہ ایک دن حضرت عائشہ سے کہا۔ اُسامہ بیٹی ہوتا تو میں اسے زیور پہناتا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کی وفات کے وقت زیدؓ زندہ ہوتے تو حضورؐ انھیں اپنا جانشین مقرر کر جاتے۔ حضورؐ ایک زانو پر حضرت حسن کو بٹھاتے اور ایک زانو پر حضرت اُسامہ کو۔ اور بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے :-

"یا اللہ! مجھے ان دونوں سے محبت ہے۔ تو بھی ان سے محبت کر۔"

حضورؐ کی محبت ہی کا اثر تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت اُسامہ کا وظیفہ اپنے بیٹے حضرت عبد اللہ سے زیادہ مقرر کیا تھا۔ اور حضرت عبد اللہ کو جواب دیا تھا کہ رسولؐ اللہ کے دل میں اُسامہ کے باپ کی تیرے باپ سے زیادہ جگہ تھی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایک مشرک (امیہ بن خلف) کے غلام تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں اُس مشرک سے خرید لیا۔ اور آزاد کر دیا۔ حضرت بلال کی رحلت کے وقت حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا تھا۔ "آج ہمارا آقا اٹھ گیا۔"

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک یہودی کے غلام تھے۔ خود حضورؐ نے انھیں آزاد کرایا۔ اُن کی بابت حضورؐ کا ارشاد ہے۔ سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ۔ سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ بھی نہ معلوم کس کس کے غلام رہ چکے تھے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ کا انتقال ہونے لگا۔ تو انہوں نے کہا کہ صہیب میرے جنازے کی نماز پڑھائیں۔ اور جب تک خلیفہ کا انتخاب ہو مسجد نبوی کی امامت کریں۔ اور عارضی خلیفہ کے تمام فرائض انجام دیں۔ چنانچہ تین دن حضرت صہیبؓ (care taker) خلیفہ رہے!

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی غلامی کی زندگی بسر کر چکے تھے۔ ایک دفعہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان پر تیز ہو گئے۔ حضورؐ نے حضرت خالد سے فرمایا :-

"جو عمار کو برا کہتا ہے اُسے اللہ برا کہتا ہے۔ جو عمار کو خفا کرتا ہے وہ اللہ کو خفا کرتا ہے۔ جو عمار کی تحقیر کرتا ہے۔ اللہ اُس کی تحقیر کرتا ہے۔"

حضرت سالم رضی اللہ عنہ بھی آزاد شدہ غلام تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کہا کرتے تھے کہ سالم زندہ ہوتا تو میری جانشینی کا وہ اہل تھا۔ حضرت سالم فن قرأت کے امام تھے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے ان کی اقتدا میں نماز پڑھی ہے۔

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا مشہور واقعہ ہے۔ انہوں نے حضورؐ کو ہاتھ دکھائے کہ چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے ہیں۔ ایک لونڈی یا ایک غلام مدد کے واسطے دے دیجئے۔ حضورؐ نے ان عزیز ترین بیٹی سے کہا۔ "لونڈی غلام تو تمھیں نہیں مل سکتے۔ ۳۳ دفعہ سبحان اللہ۔ ۳۳ دفعہ الحمد للہ۔ اور ۳۴ دفعہ اللہ اکبر پڑھا کرو۔ اس کا ورد رکھنا لونڈی غلام پالنے سے بہتر ہے۔ لیکن حضرت فاطمہ تو بیٹی تھیں۔ سارے مسلمان یک بیک آن کی آن لاتعداد غلاموں سے دست بردار ہو جاتے جو عرصہ دراز سے قبضہ میں چلے آتے تھے۔ یہ فطرت انسانی کے خلاف تھا۔ علاوہ ازیں اتنے غلام ایک دم آزاد ہو کر کرتے کیا؟ اور جاتے کہاں؟ غلام کیا کرتے اور کہاں جاتے۔ اور

لونڈیاں کیا کرتیں اور کہاں جاتیں۔ آزادی اُن کے حق میں مصیبت بن جاتی، اور وہ سوسائٹی کے حق میں مصیبت بن جاتے۔ اسلام نے بتدریج آزاد کر کے لونڈیوں اور غلاموں کو سوسائٹی میں کھپا دیا۔ اور اس قابل کر دیا کہ مسلمان غلام بادشاہ، وزیر، محدث اور فقیہہ گزرے ہیں۔

اسلام نے غلامی کا انسداد یوں کیا کہ بات بات پر غلام آزاد کرنے کی سزا مقرر کر دی۔ مسلمان کے ہاتھ سے مسلمان بے ارادہ مارا جائے تو قاتل، مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے اور ایک مسلمان غلام آزاد کرے۔

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا۔

کسی مسلمان کی قسم ٹوٹ جائے تو وہ دس مسکینوں کو ایسا کھانا کھلائے جیسا خود کھاتا اور بیوی بچوں کو کھلاتا ہے۔ یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنائے۔ یا ایک غلام آزاد کرے۔ اور جسے یہ چیزیں میسر نہ ہوں تو پھر اُسے تین دن متواتر روزے رکھ لینے چاہئیں۔

وَلَٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ ۖ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ
مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ
فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ۔

کوئی مسلمان طیش میں آکر بیوی سے کہہ دے کہ بس آج سے تو میری ماں بہن کی مثل ہے اور پھر تجدید تعلق کرنا چاہے۔ تو ایک غلام آزاد کرے۔

وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّا۔

ایک صحابی کو اُن کے دو غلاموں نے زچ کر رکھا تھا۔ انہوں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ میں انھیں مارتے مارتے تھک گیا ہوں۔ مگر یہ اپنی حرکات سے باز نہیں آتے۔ حضور نے فرمایا:۔

"تم انھیں اُن کے قصور کے ہموزن سزا دیتے ہو تو خیر۔ لیکن سزا کا وزن کہیں قصور کی نسبت بڑھ گیا تو اس کا تم سے اللہ بدلہ لے گا۔"

صحابی نے کہا۔ یہ بات ہے تو میں دونوں غلاموں کو آزاد کرتا ہوں۔ آپ گواہ رہیئے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حضور کے بڑے محبوب صحابیوں میں سے تھے۔ اُن کے غلام نے حضور سے شکایت کی کہ ابوذر نے میرے ساتھ درشت کلامی کی ہے۔ حضور نے ابوذر سے فرمایا:۔

"تمہاری جاہلیت کی عادت اب تک گئی نہیں۔ تمہارے غلام اب تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ نے اِن پر تمہیں فضیلت ضرور بخشی ہے۔ لیکن اللہ کی مخلوق کو ستانا نہیں چاہیئے۔ غلام تمہاری مرضی کے مطابق نہ ہو تو اسے کسی اور کے حوالے کر دو۔ ورنہ جو خود پہنو وہی اسے پہناؤ۔ جو خود کھاؤ وہی اسے کھلاؤ۔ اور اسے اتنا کام مت دو جسے وہ کر نہ سکے۔ اور زیادہ کام دو تو اس کا ہاتھ بٹاؤ۔"

ایک روز حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو زدوکوب کر رہے تھے۔ آواز آئی۔ ابومسعود! یہ غلام جتنا تمہارے بس میں ہے تم سے بہت زیادہ تم اللہ کے بس میں ہو۔ حضرت ابومسعود نے مڑ کر دیکھا تو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے تھے۔ حضرت ابومسعود بولے۔ یارسول اللہ! میں اللہ کے واسطے اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔ حضور نے فرمایا۔ ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تمہیں جھلس دیتی!

ایک صحابی نے سوال کیا۔ حضور! غلاموں کا قصور کتنی بار معاف کیا جائے۔ حضورؐ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ انہوں نے سوال کو دہرایا۔ حضورؐ پھر خاموش رہے۔ انہوں نے تیسری مرتبہ سوال کیا۔ حضورؐ نے تیسری مرتبہ سوال کرنے پر فرمایا۔ دن میں ستّر بار معاف کرو ــــ!

ایک شکل غلاموں کی رستگاری کی یہ نکالی گئی کہ غلاموں کو حق دے دیا کہ وہ چاہیں تو مالکوں سے آزادی کا زرِ معاوضہ طے کریں اور محنت مزدوری کر کے یا قرض دام کر کے یا چندہ کر کے مالک کو دے دیں۔ اسے فقہ کی اصطلاح میں مکاتبت کہتے ہیں۔ مالکوں سے کہا گیا کہ چندہ ہونے لگے تو وہ بھی اپنے غلام کی آزادی کے لئے چندہ دیں۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ

(جو لوگ تمہاری ملکیت میں اُن میں سے کچھ تم سے مکاتبت کرنی چاہیں تو اگر بھلائی سمجھو تو مکاتبت کر لو۔ اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے انھیں (اپنے سے آزادی پانے کے لئے) تھوڑی بہت رقم بطور امداد (خود بھی) دو ــــ!

اللہ تعالیٰ نے جہاں ماں باپ اور اعزاء و اقرباء کے ساتھ سلوک کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ وہیں لونڈیوں اور غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے کا ذکر ہے:۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۔!

والدین کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔ پڑوسیوں کے ساتھ۔ وہ رشتہ دار ہوں یا رشتہ دار نہ ہوں اور ملنے جلنے والوں کے ساتھ۔ اور مسافروں کے ساتھ اور ان کے ساتھ جو تمہارے قبضہ میں ہیں (یعنی لونڈی غلام) حسنِ سلوک سے پیش آؤ ــــ!

آزاد شدہ غلاموں کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا تھا۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ہاتھ میں روپیہ

ہے غزوہ مریسیع کے حال میں۔ جس کا دوسرا نام غزوہ بنو مصطلق ہے، آپ اُمّ المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی بابت پڑھ چکے ہیں۔ حضرت جویریہ قبیلہ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں۔ حارث تو لڑتے لڑتے بھاگ گیا تھا۔ لیکن حضرت جویریہ کا پہلا شوہر مسافع بن صفوان لڑا اور قتل ہوا۔ اور حضرت جویریہ جنگی قیدی یا جنگی لونڈی بن کر حضرت ثابت بن قیس بن شماس انصاریؓ کے حصہ میں آئیں۔ حارث اسے کیسے گوارا کرتا۔ جنگ ختم ہو ہی چکی تھی۔ وہ حضورؐ سرورِ کائنات کی خدمت میں پہنچا اور بولا کہ میری حیثیت کا خیال کر کے جویریہ کو چھوڑ دیجئے۔ میں زرِ فدیہ دیتا ہوں۔ حضورؐ نے حارث کی درخواست منظور فرمائی اور حضرت ثابت اور حضرت جویریہ کی نو اوقیہ سونے پر مکاتبت کرا دی۔ اور حضرت جویریہ سے خود نکاح کر لیا۔ یہ بڑی عزت کی بات تھی۔ صحابہ اس کے بعد حضرت جویریہ کے قبیلہ والوں کو قیدی یا لونڈی غلام کیا رکھتے سات سو لونڈی غلام آزاد ہو گئے اور پھر قبیلہ بنی مصطلق غلام کی بجائے حضورؐ کا فدائی رہا۔

آجاتا تو سب سے پہلے آزاد شدہ غلاموں کی مدد فرماتے تھے۔

ایک صحابی نے اپنی لونڈی سے اپنے غلام کا عقد کر دیا۔ اور چند دن بعد کہا۔ الگ ہو جاؤ۔ غلام نے حضورؐ تک بات پہنچائی۔ حضورؐ نے منبر پر چڑھ کر تقریر فرمائی۔ کہ نکاح کرنے اور طلاق دینے کا حق صرف شوہر کو ہے۔ لوگ اپنے غلاموں کا نکاح کر کے تفریق نہیں کرا سکتے۔۔۔!

حضورؐ کی ہدایت تھی کہ لونڈی کو میری بچی اور غلام کو میرا بچہ کہا کرو۔ لونڈی غلام مت کہا کرو۔ لونڈی غلام گھروں میں اس طرح رہیں جس طرح افرادِ خاندان رہتے ہیں۔ انھیں یہ احساس نہ ہونے دو کہ وہ عام انسانوں کی صف سے خارج ہیں۔۔۔!

لونڈی کے ساتھ تعلق زوجیت قائم کرو تو علی الاعلان کرو۔ چوری چھپے کا تعلق حرام ہے۔ علی الاعلان تعلق حلال ہے۔ جس اللہ نے بیوی کو نکاح کے ذریعہ حلال کیا ہے۔ اُسی اللہ نے علی الاعلان تعلق کے ذریعہ لونڈی کو حلال کر دیا ہے۔ علی الاعلان تعلق لونڈی کے ساتھ گویا نکاح ہے۔ دُنیا کے علم میں آنا چاہیئے کہ فلاں لونڈی اور فلاں مرد شریک زندگی ہیں۔ اُس لونڈی کی اولاد کے حقوق اور بیوی کی اولاد کے حقوق میں مطلق فرق نہیں ہے۔ اس لونڈی کی اولاد لونڈی یا غلام نہیں رہتی۔ بیوی کی اولاد کے بالکل برابر ہو جاتی ہے۔۔۔!

حضورؐ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفات سے قبل آخری وصیت جو کی تھی اُس میں فرمایا تھا کہ غلاموں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔۔۔!

پروفیسر اسرار احمد سہاوری

ذہنِ انسانی کی نارسائیاں

کسی چیز کی ماہیت کو پوری طرح سے وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے کہ اس کو بنایا ہو۔ اس چیز کے عناصر ترکیبی کا حال۔ اُن عناصر کا اس مرکب میں تناسب۔ اس مرکب کے کام کرنے کا طریقہ۔ اس کی ظاہری اور پوشیدہ صلاحیتیں۔ اس کی بقاء کی شرائط و ضروریات۔ غرضکہ ایسے مرکب سے متعلق ہر معاملہ کو اس کا بنانے والا ہی خوب سمجھ سکتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے کہ اس کے عناصر ترکیبی کو۔ اُن عناصر کے تناسب کو۔ اس کے کام کرنے کے طریقوں کو۔ اس کی ظاہری اور پوشیدہ صلاحیتوں کو۔ اس کی بقاء اور صحت مندی کے شرائط کو۔ اس کی خواہشات اور تمناؤں کو۔ غرضکہ اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور ان کی ضروریات کو انسان کو پیدا کرنے والا ہی کما حقہ سمجھ سکتا ہے۔ خود ایک انسان اگر انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر اور ان کی ضروریات پر۔ اس کے ظاہری و باطنی قویٰ پر پوری آگاہی رکھنے کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ قطعی غلط اور گمراہ کن ہوگا۔ اور یہ ایک ایسی فاش غلطی ہوگی جس کی بداہت کو معمولی عقل رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ کم از کم اس وقت انسان اپنے ذہن کے نشو و نما کے ذریعہ اور اپنی عقل کے ارتقائی منازل طے کرنے کے بل بوتے پر اس مقام پر نہیں پہنچا کہ اس بات کا دعویٰ بلا خوفِ تردید کر سکے کہ وہ اپنی جسمانی و روحانی ماہیت کو۔ اپنے آغاز و انجام کو۔ اپنی ظاہری و پوشیدہ قوتوں کو۔ اپنے ذہن اور دلی جذبات کو۔ اپنے شعور و لاشعور کو اچھی طرح سے سمجھ چکا ہے۔ غالباً کسی فلسفی یا سائنسدان نے ابھی تک اس بات کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ البتہ لوگ اس زندگی کے راز کو معلوم کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ شاید کبھی اس معمہ کو حل کر سکیں۔ لیکن ابھی تک تو یہ ایک چیستان ہی بنا ہوا ہے۔ بقول فانی مرحوم ؎

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ۔۔۔ زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

انسان کو اپنی زندگی میں جو بہت سی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ کسی چیز کے مستقبل کے متعلق کوئی صحیح اندازہ قائم نہیں کر سکتا۔ اپنی کسی بڑی سے بڑی کوشش کا متوقع نتیجہ پیدا کر لینے پر قادر نہیں۔ وہ ہزار کوششیں کرتا ہے۔ لاکھ حساب رکھتا ہے۔ اپنی تمام قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ لیکن بعض اوقات نتیجہ بالکل اس کی خلاف توقع برآمد ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ میں نے خدا کو اپنے ارادے کے ٹوٹ جانے (فسخِ عزائم) سے پہچانا۔

انسان کو جتنی قوتیں دی گئی ہیں۔ یا اب تک وہ جن قوتوں کو جس حد تک بروئے کار لا سکا ہے۔ وہ بہت کمزور۔ ناقص اور ناکافی ہیں۔ وہ ایک پہلو کو دیکھتا ہے تو دوسرا پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک رخنہ کو بند کرتا ہے تو سینکڑوں نئے رخنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی ایسی چیزیں اس کے عزائم اور منصوبوں میں حائل ہو جاتی ہیں۔ جن کا کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھ بینا ضرور ہے لیکن ہمہ بیں نہیں۔ اس کی عقل دانا ضرور ہے لیکن ہمہ داں نہیں۔ یہ اس کی بصارت و بصیرت کی کمزوری ہی ہے جو اس کے فیصلوں کو غلط۔ اس کی تمناؤں کو ناکام اور اس کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط کو ناقص بنا دیتی ہے۔ انسان اپنی اس کوتاہ بینی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ہی ایک ہمہ داں اور ہمہ بیں۔ ازلی و ابدی طاقت کی آرزو کرتا ہے۔ اور ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اور اس کا سہارا تلاش کرتا ہے۔

البتہ وہ لوگ ایسی طاقت کے وجود کا انکار کرتے ہیں جو اپنے ذہن کو رسا - اپنی آنکھ کو ہمہ بیں اور اپنی عقل کو ہمہ داں سمجھتے ہیں - یا پھر وہ لوگ اس مسبب الاسباب کے قائل نہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سبب بغیر مسبب کے اور مخلوق بغیر خالق کے وجود میں آسکتے ہیں - اور جن کے نزدیک ہر چیز بس یوں ہی خود بخود پیدا ہو گئی ہے - ان دونوں قسم کے دعووں پر ذرا سا غور کیا جائے تو ان کا صحیح وزن عقل میں آسکتا ہے - آج تک دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو بغیر کسی سبب کے پیدا ہو گئی ہو - پھر ایک صحیح العقل آدمی یہ کس طرح تسلیم کر سکتا ہے کہ یہ اتنی بڑی کائنات جس کی وسعت کا بھی ہماری عقل احاطہ نہیں کر سکتی خود بخود بغیر کسی سبب اور مسبب کے وجود میں آگئی ہوگی — !

اب رہا دوسرا دعویٰ کہ انسانی عقل ہمہ داں ہے - اور یہ کہ وہ اپنی تمام مشکلات خود کامیابی سے حل کر سکتا ہے - وہ اپنی ذات کو - کائنات کو - اس کے اجزائے ترکیبی کو اچھی طرح سمجھ چکا ہے - وہ اپنے آغاز و انجام کو پا چکا ہے - اس کا فیصلہ آپ ایک امریکی ڈاکٹر، فلسفی اور سائنسدان الیکسس کیرل کی زبانی سنئے - وہ آپ کو بتائے گا کہ سائنس، فلسفہ اور دوسرے علوم - کائنات کے راز کو - انسان کی حقیقت کو کس حد تک پا چکے ہیں - وہ اپنی کتاب " انسانی راز " میں لکھتا ہے :-

" وہ لوگ جو زندگی اور کائنات کے راز کو معلوم کرنے کے ارادے سے نکلے تھے گویا ایک تاریک جنگل میں بھٹک گئے ہیں - یہ جنگل ایک طلسم خانہ معلوم ہوتا ہے - جس کی ہر چیز اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے - جگہ ہی نہیں بدلتی بلکہ اپنی صورت بھی بدل دیتی ہے - ایسے حقائق کے وزن نے ان کو کچل کر رکھ دیا ہے - جن کو وہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں - لیکن ان کو محض اندازے کے طور پر بیان کر سکتے ہیں - صحیح اعداد و شمار بیان کرنا ان کے لئے ناممکن ہے - یہ تو کائنات کی دوسری چیزوں کا ذکر ہے لیکن خود انسان اور اس کے متعلقہ علوم ابھی تک خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکے ہیں - انسان ایک ایسی ناقابل تقسیم اکائی ہے - جو انتہائی پیچیدگیاں اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے - اس کو آسانی اور سادگی سے بیان کر دینا ناممکن ہے - اگرچہ ہمارے پاس سائنسدانوں، فلسفیوں، شاعروں اور صوفیوں کے اقوال و تجربات کے بڑے قیمتی ذخائر موجود ہیں - لیکن ہم ابھی تک انسانی زندگی کے صرف چند پہلوؤں کو نامکمل طریقے پر سمجھ سکے ہیں - ہم انسان کو مجموعی طور پر ابھی تک نہیں سمجھ سکے - اس کے کچھ اجزاء ہماری سمجھ میں آئے ہیں - مثلاً ہم انسان کے ذہن کو اور اس کے کام کرنے کے طریقے کو - اس کی روح کو اور اس کے بروئے کار آنے کے ذرائع کو اور ان دونوں کے آپس کے تعلقات کو - ابھی تک نہیں سمجھ سکے ہیں - ہم نہیں جانتے کہ اخلاق - انصاف اور جرأت کے جذبات کیسے اور کہاں سے پیدا ہوتے ہیں - اور کیوں ایک خاص نہج پر اثر انداز ہوتے ہیں - خوشی اور غم کیا ہیں اور کیوں پیدا ہوتے ہیں - ہم مصنوعی طریقے سے کسی شخص کے دل میں مسرت اور اطمینان پیدا نہیں کر سکتے - ہم نہیں جانتے کہ زندگی اور موت کیا ہے - ہم کسی زندہ چیز کو موت سے نجات نہیں دلا سکتے "

غرضکہ ہماری مجبوریوں اور نارسائیوں کی اتنی طویل فہرست ہے کہ جس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا - میں نے چند مجبوریاں آپ کے سامنے الیکسس کیرل کی زبانی پیش کر دی ہیں - پھر ایک یہ چیز بھی غور طلب ہے کہ ہم نے صدیوں کی محنت اور قربانی کے بعد جن چیزوں کو حاصل کیا ہے آیا وہ ہماری ہمہ دانی و ہمہ بینی کا ثبوت ہو سکتی ہیں؟ کیا ان میں ہماری فطری کمزوری داخل نہیں ہو گئی ہے؟ کیا ان میں کسی طرف کوئی تباہی لانے والا رخنہ نہیں ہے؟ کہاں سے اگر ہم نے ایک طرف کچھ حاصل کیا ہے تو دوسری طرف کچھ کھو نہیں دیا؟

میرا یہاں یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم نئی چیزیں حاصل کرنے اور آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں - ہم ایجادات سے منہ موڑ لیں - یا وقت کا دامن پکڑ کر اس کو پیچھے گھسیٹنے کی کوشش کریں - میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم ان ایجادات اور پیش قدمیوں پر مغرور

نہ ہو جائیں۔ ان کو بالکل بے عیب نہ سمجھیں۔ ان میں اصلاح کے نام سے چڑنے نہ لگیں۔ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ ہم نے جو کچھ دیا وہ حرفِ آخر ہے۔ جو مسائل حل طلب تھے وہ ہم نے حل کر لئے۔ جو چیزیں معلوم کرنے کی تھیں وہ ہم نے معلوم کر لیں۔ جو صلاحیتیں اور قوتیں ممکن تھیں وہ ہم حاصل کر چکے۔ ہم ان معلومات کے غرّے میں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ اب ہم سے بڑی کوئی طاقت کائنات میں نہیں۔ جو کچھ ہیں ہم ہیں۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ باوجود اتنی پیش قدمی، ترقی اور ایجادوں کے ابھی ہم منزل سے بہت دور ہیں۔ ابھی سمندر کا ایک قطرہ بھی ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔ ابھی ممکنات کی ایک وسیع و عریض دنیا ہمارے سامنے پھیلی پڑی ہے۔ جو ہمارے حوصلوں کی آزمائش کے لئے کافی ہے۔ ہم نے مادّی چیزوں میں بلاشبہ بہت زیادہ ترقی کر لی ہے۔ لیکن اپنی محدود بصیرت کی وجہ سے زندگی کے اخلاقی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اس طرح ہم زندگی کے توازن کو خراب کرتے چلے جا رہے ہیں۔!

اخلاقی پہلو کو بالکل نظر انداز کر کے ہم زندگی کو کامیابی اور مسرّت سے نہیں گزار سکتے۔ ایک امریکن مصنّف اپنے "ترقی یافتہ" ملک کے غیر متوازن معاشرے کا جائزہ اس طرح لیتا ہے:۔

"ہم نے اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو اپنی معاشرتی اور عمرانی زندگی سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ در اصل تہذیب جدید نے انسان کو تمام قیود و پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے۔ نیا زندگی کا تصوّر ہمیں ہر جائز و ناجائز طریقہ سے دولت حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس تصوّر نے جنسی آوارگی کا ایک طوفان برپا کر دیا ہے۔ جنسی جذبات کو بھڑکانا پھر ان کی جائز و ناجائز ذرائع سے تسکین اس تہذیب کا خاص طرّۂ امتیاز ہے۔"

یہاں اگر ایک انگریز پروفیسر کی کتاب "خاندان کی تحلیل نفسی" سے ایک عبرتناک اقتباس پیش کر دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ صفحہ ۱۹۵ پر ذیلی اشارے میں لکھتا ہے:۔

"یہ کس قدر تعجب خیز اور عبرت انگیز واقعہ ہے کہ شکاگو کے ایک کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ایک سو تین لڑکیوں کے گروہ میں سے اکہاون ایسی تھیں جنہوں نے اپنا پہلا جنسی تجربہ اپنے باپوں کے ذریعہ سے حاصل کیا۔"

کیا ان مہذب، روشن خیال اور تعلیم یافتہ معاشرے کی اخلاقی پستی کے ثبوت کے لئے اس مثال کے علاوہ کسی دوسری مثال یا دوسرے ثبوت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ کیا جو معاشرہ بھی اپنی زندگی کو اخلاقیات سے بے نیاز کرے گا اس میں اسی قسم کے واقعات رونما نہیں ہوں گے؟ دنیا نے کیا کوئی ایسا معاشرہ قائم کیا ہے جس نے اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر کے اس قسم کے روح فرسا اور جگر گداز واقعات سے دامن بچا لیا ہو۔ اگر نہیں تو پھر کیوں ہم اپنی اخلاقی قدروں سے مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔ کیا اپنی آئندہ نسلوں کی زندگی تباہ کرنے کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوگی۔ پھر جنسی جذبات میں ہیجان انگیزی، اور جنسی آوارگی کی وجہ سے ہمارے اعصاب انتہائی کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بظاہر ایک شخص انتہائی تندرست نظر آتا ہے۔ لیکن ذہنی طور پر وہ انتہائی نروس (NERVOUS) قسم کا اور عصباتی آدمی ہوتا ہے۔ دوسرے شخص کی ذرا سی بات برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اسی وجہ سے دنیا کے تمام ممالک میں خودکشی کی وارداتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہم زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمّت نہ پا کر خود اپنی زندگی ختم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

پچھلے دنوں جاپان کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اتنے چھوٹے سے جزیرے کے رہنے والوں میں ایک سال میں بائیس ہزار آدمیوں نے خودکشی کر لی۔ یہی حال تقریباً دوسرے ممالک کا بھی ہے۔ ہمارے اعصاب کی قوتِ مقابلہ تقریباً بالکل ختم ہو چکی ہے۔ خصوصاً تعلیم یافتہ

لوگ اس مرض کا بہت زیادہ شکار ہو رہے ہیں۔ ایک امریکن ڈاکٹر اور ماہر نفسیات کے قول کے مطابق آج کل دنیا میں سب سے زیادہ مریض عصبی کمزوری کے ہیں۔ بعض ریاستوں میں پاگلوں اور دیوانوں کی تعداد جن کو پاگل خانوں میں داخل کیا جا چکا ہے۔ ان مریضوں مختلف قسم کے مریضوں سے زیادہ ہے جن کو ہسپتالوں میں جگہ دی گئی ہے۔ اس ڈاکٹر کا یہ دعویٰ ہے کہ آج کل دیوانگی کا مرض معاشرے کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ کوئی چھوت کا مرض بھی اس مرض کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی ماہر نفسیات لکھتا ہے کہ مستقبل میں ہماری تہذیب کو سب سے بڑا خطرہ ہمارے سیاسی لیڈروں سے ہے۔ گو ان میں تمام خوبیاں موجود ہوں۔ لیکن اخلاقی اعتبار سے ان میں سے کوئی بھی بلند کردار کا مالک اور قابل اعتماد نہیں ہے۔ اور یہ اخلاق کی پستی ہی ہے جو اس دنیا کو کسی دن پورے طور پر تباہ و برباد کر دے گی۔ ایک معاشرت کے رکن کے قلم سے اس معاشرت پر تنقید اور ملاحظہ فرمائیے:-

"ہمارا جہان مادیت کے علوم میں انتہائی ترقی اور انسان سے متعلق علوم میں جمود اور شکست گاہی ہماری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں زندگی میں سکون حاصل نہیں۔ ہم ذہنی اور اخلاقی طور پر بڑی تیزی سے پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ ممالک اور قومیں جہاں کہ صنعتی تہذیب اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچی ہوئی ہے، اخلاقی طور پر انتہائی پستی میں جا پڑی ہیں۔ اور یہی قومیں ہیں جو کمزوری اور وحشت کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہے۔ وہ یقیناً ان تباہ کاریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو سائنس نے اخلاق کے دباؤ سے آزاد ہو کر ان کے چاروں طرف جمع کر دی ہیں۔"

موجودہ تہذیب و تمدن نے ایک اور تباہ کن سبق ہمیں دیا ہے اور اس کی تباہ کاریاں روز بروز یلغار کرتی ہوئی ہماری طرف آ رہی ہیں۔ یعنی ہماری سماجی زندگی خاندان کو ایک معاشرتی اکائی کے لحاظ سے ختم کر رہی ہے۔ اب تعلیم یافتہ مرد اور عورتیں شادی بیاہ، بال بچوں اور گھریلو ذمہ داریوں سے سخت گھبرانے لگے ہیں۔ آزادی کی زندگی کو پابندی کی زندگی سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ یعنی لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ شادی ہی نہ کریں اور آزادی کی زندگی گزاریں۔ اور اگر شادی کرنی ہی پڑ جائے تو بچے نہ ہونے دیں۔ لیکن اگر بچے پیدا ہو ہی جائیں تو سرکاری پرورش گاہوں میں پلیں۔ ہوٹلوں میں زندگی گزاریں اور سرکاری ہسپتالوں میں جا کر دم توڑ دیں۔ کیا سرکاری پرورش گاہوں میں ماں کی آغوش کی گرمی۔ محبت کا خلوص اور بچے کی بہبودی کی انتہائی آرزو میسر ہو سکتی ہے۔ کیا ماں کا سا ایثار پرورش گاہ کی نرسیں اور اُستانیاں پیش کر سکتی ہیں۔ اگر نہیں تو بچوں کی تربیت کی خرابی اور قوم کے بچوں کی تباہی کا کون ذمہ دار ہے۔ تحلیل نفسی کے دورِ حاضر کے ماہرین جب یہ کہتے ہیں کہ ماں اور باپ کے ہر ہر فعل کا بچے کے ذہن پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ تو پھر بچوں کو محبت سے خالی تربیت گاہوں میں بھیجتے وقت ان کی تحلیل نفسی کہاں چلی جاتی ہے۔ کیا وہ اس نفسیاتی اثر سے واقف نہیں جو بچوں کے کردار پر بغیر ماں کی محبت اور باپ کی پُرخلوص نگرانی سے محروم رہ جانے کی وجہ سے پڑتا ہے۔ بچہ محبت اور خلوص کو اپنی زندگی کے کسی گوشہ میں جگہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ محبت اور شفقت کے جذبہ سے خالی بچہ جس قسم کا شہری بن سکتا ہے۔ اس کا اظہار بیکار ہے۔ ہر شخص اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اور ہم دن رات اپنے بڑے بڑے بلند پایہ شہریوں کے کرداروں کو دیکھ کر صحیح نتیجہ خود بھی نکال سکتے ہیں۔ بعض اوقات ہم اپنے چوٹی کے شہریوں کی حرکات دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ بالکل خلاف توقع ہوتی ہیں۔ در اصل یہ حیرانی ہماری بے وقوفی ہے۔ کیونکہ یہ حرکات کرنے میں یہ شہری ان کا نہیں۔ بلکہ یہ ان کی تعلیم و تربیت اور سماجی ماحول کی خطا ہے!

اس کے علاوہ ہسپتالوں میں بیمار رہ کر مرنے والوں کا دل ہی جانتا ہوگا کہ وہ سچی ہمدردی اور گہرے خلوص رشتوں کی مسکراہٹ میں پا کر کیا کیا انگاروں پر لوٹتے ہوں گے۔ عزیزوں کی سی ہمدردی اور جانکاہی نرسیں بیچاری کس طرح پیدا کر سکتی ہیں۔ ان کا تبسم و التفات بھی انہی لوگوں کے لئے مخصوص ہو سکتا ہے جن سے انہیں کچھ حاصل ہونے کی توقع ہو۔ دوسرے لوگ تو ان کی نظر التفات کے مستحق نہیں ٹھہرتے!

ہم بجائے اس کے کہ اپنی گھریلو زندگی میں کچھ اصلاح کریں اس کی ناقابل برداشت خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں اس کو جڑ سے ختم کر دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر ارادہ نہیں رکھتے تو کم از کم غیر شعوری طور پر ادھر بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ خاندانی زندگی کو وبال جان سمجھنا سوسائٹی کے لئے کچھ اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ ہم ان دوسرے ممالک کو دیکھ کر جنہوں نے اپنی خانہ ویرانی کا سامان کیا ہے بغیر تجربے کی ہلاکت آفرینیوں سے دوچار ہوئے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک امریکی ماہر عمرانیات کے خیالات ملاحظہ فرمائیے:۔

> "موجودہ سماج نے خانگی تربیت کا کام کلیتاً اسکولوں کے سپرد کر کے بڑی زبردست غلطی کی ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو کنڈر گارٹن اسکولوں کے سپرد محض اس لئے کر دیتی ہیں کہ بچے ان کی تفریحات و مشغولیات میں مانع نہ ہو سکیں۔ ان کو اپنی ادبی، سیاسی، جمالیاتی، فنی ہر جنسی ان کی مصروفیات سے مہلت ہی نہیں ملتی کہ وہ اپنے گھروں اور بچوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں۔ نادان عورتیں اس طرح اپنے اس گھر کو ویران کر رہی ہیں۔ جہاں ان کے بچے مستقل طریقے سے اپنے بڑوں کے ساتھ وابستہ رہتے تھے۔ اور ان سے بہت کچھ سیکھتے تھے۔ بچے اپنے ہم عمروں کے ساتھ رہ کر وہ باتیں نہیں سیکھ سکتے جو وہ اپنے بڑوں کے ساتھ رہ کر سیکھ سکتے ہیں۔ ایک عظیم المرتبت نسل کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی بہترین نسلی خصوصیات کو باقی رکھے۔ اور ان کو آگے بڑھائے ورنہ وہ اپنی عظمت کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں انتہائی مہذب اور متمدن قومیں کچھ اچھی نسلیں پیش نہیں کر رہی ہیں۔ ان کی صفات میں اضافہ تو کجا تخفف بڑی تیزی سے رونما ہو رہا ہے۔ عورتیں مسکرات کو اور شراب پینے کی بہت تیزی سے عادی ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو بچہ کشی سے سخت رغبت ہوتی جا رہی ہے۔ یہ تمام نتائج ان کی ناقص تعلیم و تربیت کے ہیں۔ اسی نقص نے ان کے اندر خود غرضی کی ذہنیت اور کوتاہ نظری پیدا کر دی ہے۔ ہماری عورتوں کا بڑا حصہ وہ ہے جس نے خود کو بانجھ بننا پسند کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ شادی اور ازدواجی زندگی میں استقلال پیدا کیا جائے۔ اس معاملے میں غیر مستقل مزاجی زہر قاتل ثابت ہوتی ہے۔ شوہر اور بیوی اس غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے بچوں کی تنہا ذمہ داری برداشت کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر سوچتا ہے کہ اگر بچے پیدا ہو گئے اور اس کے بعد ہماری آپس میں جدائی ہو گئی تو ان بچوں کو کون پرورش کرے گا؟"

اس طویل نقل قول کے بعد یہاں، اگر اشتراکی روس کے ایک جوڑے کی طلاق اور ان کے تین سالہ بچے کے دردناک واقعہ کو بھی

ایک روسی اخبار "پراودا" میں نکلا تھا۔ مختصراً آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

"لیڈیا اور بورس نے ایک دوسرے کے ساتھ گزارا ہوتے نہ دیکھ کر علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے تین سالہ معصوم لڑکے کا خیال نہ کیا۔ لیڈیا نے کہا کہ میں ایک نوجوان عورت ہوں۔ دوسری شادی کر لوں گی۔ یہ لڑکا میری نئی زندگی کے لئے وبال ہو جائے گا۔ چھ برس تک یہ لڑکا ایگ اپنی نانی کے پاس رہا اور ماں باپ دونوں اس سے بے خبر رہے۔ چھ برس کے بعد نانی عاجز آ کر ایگ کو اس کی ماں لیڈیا کے پاس لے گئی۔ لیکن لیڈیا نے اس سے کہا کہ اماں تم میری زندگی خراب کرنا چاہتی ہو۔ اس کو اس کے باپ کے پاس کیوں نہیں لے جاتیں۔ اس نے وہاں لے جانے سے انکار کیا تو لیڈیا خود اس کو لے کر بورس کے پاس پہنچی۔ بورس نے مجبوری کچھ عرصہ تک اس کو اپنے پاس رکھا۔ پھر اس کی موجودگی سے عاجز آ کر کہا۔ اب تم کافی عرصہ تک میرے ساتھ رہ لئے ہو۔ اب اپنی ماں کے پاس چلے جاؤ۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تمہارے ساتھ لینن گراڈ تک جاؤں۔ اس لئے تم تنہا چلے جاؤ۔ ایگ کو ماں نے بھی اپنے پاس سے دھتکار دیا۔ اسی طرح ایک طویل عرصہ تک ایگ اِدھر اُدھر آتا جاتا رہا۔ کچھ عرصہ تک تو ماں باپ نے ٹکٹ لے کر دیا۔ پھر باپ نے کہہ دیا کہ اب بلا ٹکٹ سفر کرو۔ تمہاری عمر کے تمام بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ لڑکا آوارہ ہوتا گیا اور شراب خوری اور چوری کرنا سیکھ گیا۔ جب اس کی بری حرکتیں بہت بڑھ گئیں تو پولیس نے پکڑا۔ سرکاری اصلاح خانے بھیج دیا۔"

یہ اس ملک کا واقعہ ہے۔ جس کو لوگ جنتِ ارضی کہتے ہیں۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!

ایسی جنت کی بہاروں کا کیا کہنا جہاں ایک بے گناہ بچے کا عیاش اور بدکردار باپ کے ہاتھوں یہ حشر ہو!!

کمیونسٹ خود اپنے آئینے میں

مذہب اور کمیونزم ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے!

کسی تبصرے کے بغیر:-

"مقدس مقامات کی زیارت، عبادت، نماز، جنازہ اور بچوں کا ختنہ کرنا۔ مذہب اور پرانے رسم و رواج کے ایسے بچے کھچے حصے ہیں کہ جن پر آج بھی بعض مقامات پر عمل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر شہری کو مذہب کے اثرات سے بچایا جائے۔"

(قازقستان کے صدر مقام الما آتا کے ریڈیو سے اکتوبر ۱۹۵۴ء میں نشر کیا گیا)

"مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے۔ یہ ایک قسم کی روحانی شراب (ووڈکا) ہے۔ اس میں سرمایہ کے غلام اپنے انسانی خد و خال اور ایک اچھی انسانی زندگی سے متعلق اپنے دعووں کو غرق شراب کر دیتے ہیں۔"

(وی، آئی۔ لینن۔ مجموعۂ تصانیف جلد نہم۔ صفحہ ۶۵۸)

"پارٹی کی تنظیم کے سلسلہ میں جو تعلیمی کام انجام دیا جاتا ہے، اس میں مذہبی اعتقادات اور توہمات کے خلاف جد و جہد کو، اور عوام الناس کو الحادی نظریہ کے مطابق تربیت دینے کے کام کو اہم مقام حاصل ہونا چاہیئے۔"

(بالشویک۔ جولائی ۱۹۵۴ء۔ صفحہ ۵۳)

"کوئی نوجوان مرد یا عورت اس وقت تک کمیونسٹ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مذہبی اعتقادات سے آزاد نہ ہو جائے۔"

(کومسومولسکایا پراودا۔ ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

"اگر کوئی کمیونسٹ نوجوان خدا پر یقین رکھتا ہے اور گرجا جاتا ہے تو گویا وہ اپنے فرائض کی تکمیل سے قاصر رہتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے ابھی تک مذہبی توہمات سے گلو خلاصی حاصل نہیں کی اور پوری طرح ایک باشعور انسان (کمیونسٹ) نہیں بنا ہے۔"

(ینگ بالشویک نمبر ۶۔ صفحہ ۲۰۔ ۱۹۴۶ء)

"مذہب کے معاملہ میں پارٹی غیر جانبدار نہیں ہو سکتی۔ وہ کمیونسٹ جو مذہب کے خلاف وسیع ترین پروپیگنڈا کی راہ میں حائل ہیں۔ ان کے لئے پارٹی کی صفوں میں قطعی گنجائش نہیں۔"

(جے۔ وی۔ اسٹالن "امریکن مزدور وفد سے ملاقات" ۱۵ ستمبر ۱۹۲۷ء)

"ہمیں اس طرح کام کرنا چاہیئے کہ ہماری جو ضرب کلیسا کی روایات اور مذہبی پیشواؤں پر پڑے، اور وہ عام طور پر مذہب پر حملہ ہو۔ اگر مذہب کے اعتقاد سے فرقہ پرستوں (یا پروٹسٹنٹ اور ایوانجیلکلز) کو فائدہ پہنچا تو تو پھر کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔ ہمیں مذہبی عقائد سے براہ راست الحاد کی طرف جانا چاہیئے۔ ایک اندھا آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ پوپ خواہ وہ پاسٹر کہلائے خواہ اے ربن پٹریارک۔ ملّا یا پوپ کہلائے۔ اس کے خلاف جنگ کرنا کس قدر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ خدا کے خلاف جنگ کرنا بھی اسی طرح ناگزیر ہے۔ خواہ وہ جیہووا کہلائے یا عیسیٰ یا بدھ یا اللہ ؟"

(سرکاری ضابطہ جاری کردہ محکمہ تعلیمات عامہ۔ اسٹیپانوف)

"اشتراکیت اور مذہب ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں کا وجود ایک ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ مذہب کی فتح ہونے کی صورت میں اشتراکیت میں اضمحلال آ جائے گا۔ اشتراکی حکومت صرف اس معاشرے میں قائم کی جاسکتی ہے جو مذہب کے وجود سے پاک ہو" (جروس یوسکی گبلین۔)

(ڈپلومیٹک ریبک، آف دی سوویٹ یونین ۱۹۲۹ء)

"عوام کو بڑے پیمانے پر متاثر کرنے کے لئے ثقافتی انقلاب کا سب سے اہم فرض مذہب کے خلاف غیر مشروط طور پر اور باقاعدہ جنگ کرنا ہے۔ مذہب لوگوں کے لئے ایک افیون ہے۔"

(پروگرام آف دی کمیونسٹ انٹرنیشنل)

"جدلی مادیت مارکس اور لینن کا فلسفہ اور اشتراکی جماعت کی نظریاتی بنیاد مذہب سے مطابقت نہیں رکھتی۔ دنیا کے متعلق اشتراکی جماعت کا نظریہ سائنسی مفروضات پر قائم ہے۔ جبکہ مذہب سائنس کی تردید کرتا ہے۔ چونکہ اشتراکی جماعت کی سرگرمیاں سائنسی بنیاد پر قائم ہیں۔ اس لئے یہ مذہب کی مخالفت کرنے پر مجبور ہے۔"

(مولودوئی بالشویک (ینگ بالشویک)
"مذہب کے متعلق کومسومول کے خیالات"
نمبر ۵-۶ سنہ ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۸)

"مذہب کا کامل طور پر خاتمہ اس صورت میں ہوگا جب وہ تمام معاشرتی وجوہ جن سے مذہب عالم وجود میں آیا ہے ختم ہو جائیں گی۔ یعنی لوٹ کھسوٹ کرنے والا معاشرہ ختم ہو جائے اور اشتراکی معاشرے کا قیام عمل میں آ جائے۔" ("پاپلر ایجوکیشن" اپریل ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۸)

"مذہب کے خلاف جنگ صرف تصوراتی و نظریاتی حدود تک محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ اس جنگ کو عملی جماعتی تحریک سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اور اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ معاشرے سے مذہب کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکا جائے۔" (وی۔ آئی۔ لینن "درباب مذہب" صفحہ ۱۰۴)

"کومسومول یعنی اشتراکی نوجوانوں کی تحریک نے مذہب کو کبھی بھی غیر جانبدارانہ زاویہ سے نہیں دیکھا ہے۔ مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کمیونسٹ تعلیم کا جزو لاینفک ہے۔ ہماری تعلیم نوجوانوں میں ایک مادی عالمی ذہنیت اور مظاہر قدرت اور معاشرتی زندگی کی سائنسی سمجھ پیدا کرتی ہے۔ مذہبی توہمات اور تعصبات غیر سائنسی ہیں۔

میں تھے کو مسومول کے ممبروں کا نہ صرف دہریت پر یقین رکھنا اور ہر طرح کے توہمات کا مخالف ہونا کافی ہے بلکہ اُن کا فرض نوجوانوں میں توہمات اور تعصبات کے پھیلنے کو عملاً روکنا بھی ہے۔
یم۔ آئی کیلی نن نے کہا تھا کہ ہم کسی کو مذہب کو ماننے کی بنا پر ستاتے نہیں ہیں۔ بلکہ ہم مذہب کو ایک فریب تصور کرتے ہیں اور مذہب کے خلاف تعلیم کے ذریعہ سے جنگ کرتے ہیں۔"

(نوجوان کمیونسٹ کارکن۔ کومسومول ریورٹ۔ حلقۂ مطالعہ کے رہنماؤں کو ہدایت۔ صفحہ ۲۷۔ نمبر ۱۱۔ جون ۱۹۴۷ء)

" مذہب کے معاملہ میں کیمونسٹ پارٹی غیر جانبدار نہیں رہ سکتی۔ اس کا پروپیگنڈا سارے مذہبی تعصبات کے خلاف ہوتا ہے۔ کیونکہ پارٹی سائنس کی علمبردار ہے اور مذہبی تعصبات سائنس کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ ہر مذہب سائنس کی ضد ہے۔ ایسے موقعے آتے ہیں جب پارٹی کے بعض ممبر گاہ گاہ مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کے پورے طور پر مؤثر ہونے میں مانع ہوتے ہیں اگر ایسے ارکان پارٹی سے خارج کردیئے جائیں تو بڑا اچھا ہوگا۔ کیونکہ پارٹی میں ایسے کیمونسٹوں کے لئے جگہ نہیں ہے ظاہر ہے کہ وہی نوجوان کمیونسٹ مذہبی تعصبات اور توہمات کے نقصان کو صحیح طور پر واضح کرسکتا ہے جو خود ان توہمات سے محفوظ ہو۔ ایک نوجوان اس وقت تک اشتراکی نہیں ہوسکتا جب تک وہ مذہبی اعتقادات سے آزاد نہ ہو۔"

(کومسومسکایا پراودا۔ "نوجوان اشتراکی حق" رسالہ نوجوان اشتراکی۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء صفحہ ۳)

" مارکس، لینن کا فلسفہ جو کیمونسٹ پارٹی کی بنیاد ہے۔ مذہب کی ضد ہے۔ پارٹی کا عالمی تصور سائنسی حقیقتوں پر مبنی ہے اور مذہب سائنس کے خلاف۔ چونکہ پارٹی اپنا عمل سائنسی بنیاد پر قائم کرتی ہے۔ اس لئے اس کا مذہب کی مخالفت کرنا لازمی ہے۔"

(نوجوان بالشویک۔ نمبر ۵-۶۔ ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۸)

" اسکولوں میں نابالغ بچوں کو کسی قسم کی مذہبی تعلیم دینا آزادیٔ ضمیر کے (جس کی گارنٹی روس کا آئین دیتا ہے) منافی ہے۔ اس عمل کے مجرمانہ ہونے کے لئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ مذہبی اصول جو سکھائے جارہے ہیں وہ کیا ہیں اور کس قسم کے ہیں۔"

(ڈاکٹر جی۔ منشاگن۔ وشنسکایا۔ آر۔ ایس۔ ایف۔ ایس۔ آر کی شرح۔ ضابطۂ فوجداری صفحہ ۱۶۸)

" بورژوا یعنی متوسط طبقہ کے تعصبات اور توہمات کا مقابلہ کرنے کے مسائل میں پہلا مسئلہ مذہب کے خلاف جنگ ہے۔ اس جنگ میں معاملہ فہمی اور ہوشیاری کی بڑی ضرورت ہے۔ خصوصاً مزدوروں کے ان طبقوں میں جن کی روزمرہ کی زندگی میں مذہب گہرے طور پر سرایت کئے ہوئے ہے۔
پرولیتاری، سٹیٹ یعنی عوامی ریاست کو چاہیئے کہ وہ عبادت خانوں کو کسی قسم کی امداد نہ دے۔ ریاست کی طرف سے دی جانے والی تعلیم میں مذہبی اداروں کے دخل دینے کو روکے۔ بلکہ ریاست کو تو چاہیئے کہ مذہبی اداروں یا ان کے انفرادی نمائندوں کی رد انقلاب سرگرمیوں کی روک تھام کرے۔"

(تھرڈ انٹرنیشنل پروگرام)

ماہرالقادری

مکہ[1] سے عرفات تک

حج کا زمانہ بالکل قریب آپہنچا۔ زائرین ہجوم در ہجوم اور گروہ در گروہ مکہ معظمہ میں آئے چلے جا رہے ہیں۔ سڑکوں پر، گلیوں، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں ہر طرف حاجی ہی حاجی نظر آتے ہیں۔ سڑکوں پر موٹروں کی وہ کثرت ہے کہ کبھی کبھی کسی کسی موڑ پر کئی کئی منٹ ٹھہرنا پڑتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں گراں ہوگئی ہیں اور ہوتی جا رہی ہیں۔ شروع شروع میں جب ہم آئے تھے تو چار قرش میں عین زبیدہ کے میٹھے پانی کے دو ڈبے ملتے تھے۔ پھر پانچ ہوئے اس کے بعد چھ اور آٹھ قرش اور اب نصف ریال میں ملتے ہیں۔ ان دو ڈبوں میں دو بالٹی سے زیادہ پانی نہیں ہوتا۔ لیموں کے شربت کا جو گلاس ایک قرش میں ملتا تھا اب اس کے دام تین قرش ہوگئے ہیں۔ گرمی کی شدت کے سبب تربوزوں کی بہت مانگ ہے۔ ایک چھوٹا تربوز ڈھائی تین ریال میں ملتا ہے۔ ہم جیسے لوگ جو محدود رقم لے کر آئے ہیں۔ تربوزوں کے ڈھیروں کو بس دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ گراں جلانے کا کوئلہ ہے۔ ایک ریال میں ڈیڑھ سیر کے قریب کوئلہ ملتا ہے۔ ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ اور ہر تاجر اور مزدور خوب کمائی کر رہا ہے۔ مگر دہی اور دودھ والوں کو ہزار آفریں کہ انہوں نے قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ دہی کا چھوٹا پیالہ جو آج سے پندرہ بیس دن پہلے چار قرش میں ملتا تھا۔ اب بھی اس کی وہی قیمت ہے۔ حالانکہ کھانے پینے کی چیزوں میں برف کے بعد سب سے زیادہ دہی کی مانگ ہے۔ قیمت آسانی سے بڑھائی جا سکتی تھی مگر نہیں بڑھائی گئی۔ یہ دہی دودھ والے یا تو نفع خوری (profiteering) کے فن سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ یا پھر یہ بالطبع قناعت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں انسانوں کے لئے رحم ڈال دیا ہے ——!

آج ۶۔ ذی الحجہ ہے۔ جناب ظفر احمد انصاری، سلطان سعود شاہ نجد و حجاز کے قصر میں رات کے کھانے پر گئے ہوئے ہیں۔ میرے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا مگر میرا جانا نہ ہو سکا۔

لیجئے ذی الحجہ کی سات تاریخ ہوگئی۔ کل ۸۔ ذی الحجہ کو منیٰ کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ جن کو حج کے لئے آنا تھا وہ آچکے ہیں۔ مکہ مکرمہ کی چہل پہل کا کیا پوچھنا؟ حرم شریف میں نماز کے وقت زائرین کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ اگر نماز کے لئے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے آنا نہ ہو تو پھر حرم کے کسی دروازے پر یا اس کے متصل کسی گلی میں ہی جگہ مل سکتی ہے!

حج اسلام کا زندہ معجزہ اور اس کے آفاق گیر ہونے کی محسوس شہادت ہے۔ دنیا کے جس خطہ میں بھی مسلمان بستے ہیں، وہاں کا کوئی نہ کوئی مسلمان یہاں ضرور ملے گا۔ بھارت اور چین میں جہاں آبادی کی کثرت ہے۔ کسی اشنان، تیوہار اور میلے ٹھیلے میں ایک کروڑ آدمیوں کا جمگھٹا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ حج کی بات کہاں سے آئے گی کہ جہاں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے

---

[1] ماہرالقادری کے "تاثرات سفر حجاز" مکتبہ "فاران" سے عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔

دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان کھنچ کر آ گئے ہیں۔ طواف میں، سعی میں، رمی جمار میں بظاہر نفس کے لئے کوئی لذت اور کشش نہیں ہے۔ منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں کوئی نمائش نہیں لگ رہی ہے۔ کسی قسم کا کھیل تماشہ نہیں ہو رہا ہے۔ نہ قوالی ہے اور نہ شعر خوانی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے یہ بندے حضرت ابراہیم کی ملت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے فدائی اور متبع کس ذوق شوق کے ساتھ حج کے ایک ایک رکن کو ادا کر رہے ہیں۔ یہ سفر بظاہر کتنا خشک اور بے مزہ ہے۔ اور پھر اس میں دشواریاں اور مشکلیں بھی ہیں۔ لیکن صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہر ناگواری کو ہنسی خوشی گوارا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ وفادار بندے دھوپ میں تپتے ہوئے پتھروں پر کس ذوق شوق کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ اس ہجوم اور کشاکش میں حجر اسود کا چومنا نصیب ہو جاتا ہے تو دل کو کیا خوشی ہوتی ہے۔ جیسے کونین کی بہت بڑی دولت مل گئی۔ مقام ابراہیم پر یہ پُرخلوص سجدے اور ملتزم پر لپٹ لپٹ کر دعائیں اور اشک باریاں! یہ منظر ہی خود اپنی جگہ اس قدر مقدس، دلکش اور یقین افروز ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیئے۔ مسلمان اپنی نافرمانیوں کے سبب اب تک کبھی کے مٹ گئے ہوتے۔ مگر خشیت الٰہی اور حبِ رسولؐ کی یہ جھلائی ہوئی چنگاریاں جو رہ گئی ہیں انہی کی بدولت وہ اب بھی دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ولو کرہ الکافرون!

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

آج ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ ہے۔ اور ہم نماز فجر سے قبل غسل کر کے احرام پہن چکے ہیں۔ فجر کے بعد ہم اپنا ضروری سامان لے کر معلم کے یہاں پہنچے۔ دوپہر تک منیٰ پہنچنا ہے۔ صبح ہو چکی ہے۔ دھوپ چڑھتی جا رہی ہے اور ہم موٹر بس کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ بہت سے خدا کے بندے خرجیاں اور تھیلے گردنوں میں لٹکائے یا بستر بغل میں دبائے منیٰ کی طرف پیدل ہی جا رہے ہیں۔ ان کے ذوق شوق اور جرأت و عزیمت کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اگر مستورات ساتھ نہ ہوتیں تو میں بھی پیدل ہی جاتا۔

معلم صاحب نے موٹر بسوں کے لئے اپنے آدمی دوڑا دیئے ہیں۔ کم و بیش دو گھنٹے کے انتظار کے بعد منیٰ کے لئے روانگی ہوئی اور گیارہ بجے کے قریب ہم وہاں پہنچ گئے۔ معلمین کو منیٰ میں قطعات (پلاٹس) دے دیئے گئے ہیں۔ جن میں ان کے خیمے، چھولداریاں اور شامیانے نصب ہیں۔ ہر معلم کا اپنا جھنڈا ہے۔ اور ان پرچموں کے رنگوں میں امتیاز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ حجاج اپنے معلم کے خیموں کو آسانی سے پہچان سکیں۔ یہ جھنڈے کافی بلندی پر نصب ہیں اور رنگ برنگ کے پرچموں کا فضا میں لہرانا بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے!

منیٰ کی وادی کے چاروں طرف خشک پہاڑیاں ہیں۔ جن پر گھاس کا ایک ریشہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ پھر چند میل کے رقبہ میں لاکھوں آدمیوں کا ہجوم، گرمی کا موسم، اس لئے جتنی بھی تپش اور گرمی ہو کم ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا بڑا فضل فرمایا کہ عصر کی نماز سے کچھ دیر پہلے خوب تیز ہوائیں چلیں اور بارش بھی ہوئی۔ جس نے موسم کو خوشگوار بنا دیا۔ جب مینہ برس رہا تھا اور پُرشور ہوائیں چل رہی تھیں تو ہم اپنے خیمہ کی چوب تھامے ہوئے تھے۔ کئی چھولداریاں اور خیمے اکھڑ کر زمین پر گر پڑے۔ مگر ہمارا چھوٹا سا تنبو صحیح سلامت رہا!

بادل برس کر کھل گئے تو میں مسجد خیف کی طرف روانہ ہوا۔ حد نظر تک خیمے ہی خیمے اور شامیانے ہی شامیانے نظر آئے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں نہیں بازار لگے ہوئے! مسجد خیف ہماری خیمہ گاہ سے آدھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس مسجد میں جہاں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا خیمہ نصب ہوا تھا۔ وہاں قبہ بنا ہوا ہے۔ یہاں کے انوار و برکات کا کیا پوچھنا۔ مغرب کی

نماز مسجد خیف ہی میں پڑھی۔ یہاں مسٹر واحد بخش قادری (بدایونی) سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر قادری انگریزوں کے زمانے کے آئی سی ایس (I.C.S) ہیں۔ ان کے والد رزاق بخش قادری مرحوم بہت نامور بیرسٹر تھے۔ واحد بخش قادری نے امارت کی آغوش اور راحت وخوشحالی کے ماحول میں نشوونما پائی ہے۔ اب وہ پاکستان کے وزیر اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں۔ ان کے دینی شغف، خشیت الٰہی اور حب رسول کا عالم یہ ہے کہ مسجد خیف کے قبہ کو، وہاں کے درودیوار اور پہاڑیوں کو دیکھتے ہیں اور روتے جاتے ہیں۔ قلب کا یہ گداز بہت سوں کو برسوں کی عبادت کے بعد بھی میسر نہیں آتا۔ آئی سی ایس کے طبقہ میں ایسے دردمند دل شاذ و نادر ہی ہوں گے ـــ!

۹۔ ذی الحجہ کو فجر کی نماز پڑھ کر عرفات کے لئے سامان باندھا اور دن نکلتے ہی روانہ ہوگئے۔ اور دو گھنٹے میں عرفات پہنچ گئے۔ معلم صاحب کے کچھ خیمے منیٰ میں غالباً رہ گئے ہیں۔ اور حجاج کی تعداد کا اندازہ کرکے جو خیمے انہوں نے عرفات میں نصب کرائے ہیں وہ پورے نہیں پڑ رہے ہیں۔ میرے یہاں کی عورتیں دوپہر تک موٹر بس ہی میں رہیں۔ پھر معلم صاحب نے مہربانی فرما کر اپنے یہاں کی مخدرات کے خیمہ میں اُن کو جگہ دے دی۔ میں زوال آفتاب کے بعد ہی مسجد نمرہ میں جا پہنچا۔ اندر کی جگہ بھر چکی تھی۔ مجھے باہر صحن میں جگہ ملی۔ دھوپ میں اتنی تیزی تو نہ تھی جس کے افسانے سُن سُن کر ہم ڈر رہے تھے۔ مگر بہرحال یہ عرفات کی دھوپ تھی۔ چھتری نے یہاں بڑا کام دیا۔ اور سب سے بڑا اللہ تعالیٰ کا فضل یہ ہوا کہ برف کے پانی کی سبیل مجھ سے بہت ہی قریب تھی۔ جب بھی پانی مانگا، بروقت ملا اور آسانی کے ساتھ ملا۔ ورنہ میں پیاس کے معاملہ میں بڑا کچا اور بے صبر واقع ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے میری اس خلقی کمزوری کے ساتھ وہی سلوک کیا جو صرف شانِ ربوبیت کو زیبا ہے!

مسجد نمرہ میں چند گھنٹے جس عالم میں گزرے اُن کا اظہار نہ قلم کرسکتا ہے اور نہ زبان! اللہ کا فضل ہے کہ آج شیطان کی ذرا سی بھی نہ چل سکی۔ دل کی غفلت سے ساری عمر جتنی شکایت رہی ہے۔ اُتنی ہی اس کی بیداری پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ خطیب پر اللہ کی رحمتیں ہوں کہ اس نے خطبہ میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ آیات اور احادیث کیا برمحل پڑھی ہیں۔ کیا انداز خطابت تھا۔ دُعا میں کس قدر سوز اور خشیت تھی۔ کاش! وقت کی رفتار اسی مرکز پر ٹھہر جاتی!

ظہر اور عصر کی دونوں نمازیں جماعت سے ایک ساتھ ہی پڑھیں۔ حنبلی فقہ کی رُو سے غالباً چار پانچ میل پر قصر واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے مسجد نمرہ کی دونوں نمازوں میں امام نے قصر کیا۔ اور میں نے ذرا سی بھی کراہت کے بغیر حنبلی امام کی اقتدا کی۔ سُنا ہے اور ٹھیک ہی سُنا ہے کہ بعض علماء احناف جو حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے خیموں میں نمازیں پڑھیں۔ اور مسجد نمرہ میں حنبلی امام کی تقلید کو پسند نہیں کیا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حنبلی امام کو مکہ سے تین دن کی مسافت پر چلے جانا چاہیے۔ پھر وہاں سے آکر مسجد نمرہ میں نماز پڑھائے تو وہ حنفی فقہ کے مطابق مسافر ہوگا۔

میں شریعت کے مسائل میں فقہ حنفی کی تقلید کرتا ہوں کہ ہم جیسے عامیوں کو تقلید کے بغیر چارہ نہیں۔ مگر جب چاروں مذاہب فقہ حق پر ہیں تو ایسی ناگزیر صورتوں میں اگر کسی دوسرے فقہی مذہب کی وقتی طور پر تقلید کرلی جائے تو اس میں کیا قباحت اور کراہت ہے؟ مقلدین کی اسی شدت اور عدم توسع کے سبب مسلک تقلید پر غیر مقلدین کو حرف گیری کے موقعے ملتے ہیں۔

غلام محمد صاحب[1] کی رہنمائی میں ہم چند رفقا عصر کی نماز پڑھ کر جبل رحمت روانہ ہوئے۔ ایک میل سے کچھ زیادہ پیدل چلنا پڑا۔

---

[1] مکہ میں رہائش حیدرآباد کے منتظم۔

جبل رحمت کے دامن میں دعائیں کیں۔ بہت دیر تک توجہ الی اللہ کی ایسی ساعتیں زندگی میں کم ہی میسر آتی ہیں۔ ہم اس مقام سے قریب اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے تھے جہاں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حجۃ الوداع میں ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ اور ایک لاکھ سے کچھ اوپر صحابی آپؐ کے مخاطب تھے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو تھوڑی دور کے بعد مصریوں کی ایک جماعت ملی جو عجیب والہانہ انداز میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ ہم بھی اس جماعت میں شامل ہو گئے اور دعا کے ہر لفظ کو زبانِ اشک سے دہرایا!

شام ہوتی جا رہی تھی۔ ہم جبل رحمت سے جلد جلد واپس ہوئے۔ راستہ میں ایک جگہ کچھ حاجیوں میں تکرار ہو رہی تھی۔ غالباً پانی بھرنے پر! غلام محمد صاحب نے اشارہ کر کے کہا کہ اس عرفات کے میدان میں وہ شیطان کی حد ہے۔ جہاں سے کہا جاتا ہے کہ وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور حاجیوں کے دینی شغف، ذوقِ عبادت اور اطاعتِ الٰہی کے منظر کو دیکھ دیکھ کر اپنے سر پر خاک ڈالتا رہتا ہے۔ مگر کبھی کبھی بعض حاجیوں کے لڑانے کے لئے ادھر آ بھی جاتا ہے۔ اس پر سب مسکرانے لگے!

شام کا وقت ہے۔ عرفات سے مزدلفہ کے لئے حاجیوں کی روانگی شروع ہو چکی ہے۔ حجاج سے بھرے ہوئے ٹرک، بسیں اور موٹر کاریں تیزی کے ساتھ جا رہی ہیں۔ خیمے، چھولداریاں اور شامیانے اکھڑ رہے ہیں۔ عرفات میں زیادہ سے زیادہ بارہ چودہ گھنٹوں کے لئے لاکھوں آدمیوں کا یہ شہر بستا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ۹۔ ذی الحجہ کی فجر کی نماز کے وقت سے یہ بستی بسنا شروع ہوتی ہے اور دوپہر تک پورا شہر آباد ہو جاتا ہے۔ اور پھر اسی دن عشاء کی نماز تک آبادی غائب۔ اور پھر وہی جنگل کا جنگل اور میدان کا میدان!!

عرفات میں ہم جہاں ٹھہرے تھے۔ وہاں چاروں طرف خیمے ہی خیمے اور شامیانے ہی شامیانے لگے تھے، مگر مغرب کے قریب جبل رحمت سے واپس آ کر دیکھا تو ایک چھوٹی سی چھولداری بس رہ گئی ہے۔ خیموں کا دور دور تک نام نشان نہیں! اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے۔ دیکھئے مغرب کا وقت بھی آ گیا۔ مگر کسی نے نماز نہیں پڑھی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ اور رسولؐ کا یہی حکم ہے۔ کہ آج مغرب اور عشاء کی نماز ملا کر پڑھی جائے۔ اور مزدلفہ میں پڑھی جائے۔ معلوم ہوا کہ نماز بھی مقصود نہیں ہے۔ اصل مقصود تو رضائے الٰہی ہے، اور مسلمان اپنے رب کے حکم کا بندہ ہے۔ جس جگہ کے لئے حکم دے دیا کہ یہاں دوڑ کر چلو۔ وہاں دوڑ کر چلتا ہے۔ جس مقام کے طواف کے لئے ارشاد ہوا۔ وہاں کا طواف کر لیا۔ جہاں کنکریاں مارنے کا حکم ملا۔ وہاں کنکریاں مارنے ہی کو ضروری سمجھا)۔ اگر بندے کی پوری کی پوری زندگی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابع اور سنتِ رسولؐ کی مظہر بن جائے تو پھر اس زندگی کی سعادت اور خوش بختی کا کیا پوچھنا۔ اسی لئے تو فرمایا گیا ہے کہ:۔

ادخلوا فی السلم کافۃ

اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!

اسلام "قیصر و کلیسا" کی تقسیم اور حصہ بندی کا قائل نہیں ہے۔ اس میں پوری کی پوری زندگی اور ظاہر و باطن کا تمام کا تمام نظام صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ کو بھی اطاعتِ حق اور بندگیٔ رب سے مستثنیٰ اور منفک نہیں کیا جا سکتا۔ مگر افسوس ہے کہ دین کے اس تصور کامل اور اس کی جامع گیر حدود عمل کی طرف لوگوں کی توجہ بہت کم جاتی ہے۔ ہم مسلمانوں میں بہت سے تہجد و اشراق پڑھنے والے ان فیصلوں کو جو صریحاً اسلام کی ضد ہیں۔ مان لیتے ہیں۔ اور ایسا کرنے میں ہمارا دل ذرا سی بھی کچاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ اور کافرانہ نظام اور غیر اسلامی ماحول میں رہتے رہتے

فکر و نظر کا اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ اس پر متنبہ کیا جاتا ہے تو لوگوں کو دین کامل کی یہ دعوت اجنبی سی معلوم ہوتی ہے — !

مغرب کے بعد اچھا خاصا اندھیرا پھیل گیا تو ہماری موٹر بس مزدلفہ کے لئے روانہ ہوئی۔ عرفات سے مزدلفہ تک موٹر کاروں، بسوں اور ٹرکوں کی لین ڈوری لگی ہوئی ہے۔ ایک مخلوق ہے کہ رواں دواں چلی جا رہی ہے۔ خدا کے کچھ نیک بندے پاپیادہ بھی جا رہے ہیں۔ یہ ہم موٹر اور بسوں والوں سے اچھے ہیں۔ حصول خیر میں بھی اور آرام و سہولت میں بھی! ان کے لئے کوئی رکاوٹ اور دشواری نہیں۔ یہ ہم سے بہت پہلے مزدلفہ پہنچ جائیں گے۔ اور ہم بس کے ہاتھوں بے بس ہیں۔ چند میل کا فاصلہ کئی گھنٹے میں طے ہوا — !

مزدلفہ میں رات کی رات رہنا ہوتا ہے۔ لہذا وہاں خیموں، شامیانوں اور چھولداریوں کا کوئی انتظام نہیں ہوتا کھلے ہوئے میدانوں میں حجاج بسر کرتے ہیں۔ ہمارے ڈرائیور نے بھی ایک جگہ ہمیں اتار دیا۔ حاجیوں نے میدان میں اپنے اپنے بستر لگا لئے — !

ماہر القادری

جب "حقیقت" غزل بن جائے

جس دل میں خدا کا خوف رہے باطل سے گریزاں کیا ہوگا
جو موت کو خود لبیک کہے وہ حق سے گریزاں کیا ہوگا

آئینِ چمن بندی بھی نہیں، دستورِ نوا سنجی بھی نہیں
اب اس سے زیادہ گلشن کا شیرازہ پریشاں کیا ہوگا

اربابِ محبت سے یہ کہو۔ شکوے نہ کریں کچھ کام کریں
جو ظلم و ستم پر اترائے شکووں سے پشیماں کیا ہوگا

جس چوٹ سے دل میں ہلچل ہے، آہوں سے وہ ظاہر کیا ہوگی
سینے میں جو محشر برپا ہے اشکوں سے نمایاں کیا ہوگا

مدت سے کشاکش جاری ہے، صیاد میں اور گل چینوں میں
تنظیمِ گلستاں ہونے تک انجامِ گلستاں کیا ہوگا

جس کشتی کی پتواروں کو خود ملاحوں نے توڑا ہو
اس کشتی کے غمخواروں کو پھر شکوۂ طوفاں کیا ہوگا

جو لوگ ہوا کے ساتھی ہیں وہ اپنے خدا کے باغی ہیں
اس جرمِ بغاوت سے بڑھ کر ایماں کا نقصاں کیا ہوگا

اس شامِ خزاں نے اب تک تو ہر طرح سے پردہ داری کی
جب صبحِ بہار آ جائے گی اسے تنگیٔ داماں کیا ہوگا

خلوت ہو کہ جلوت ہو ماہرؔ دل کھویا کھویا رہتا ہے
اس غم کی تلافی کب ہوگی، اس درد کا درماں کیا ہوگا

تاثرات

عروج زیدی

اشکوں سے اُن کے قربِ کامل کو ڈھونڈتا ہوں
تاروں کی روشنی میں منزل کو ڈھونڈتا ہوں

ذوقِ یقین و جذبِ کامل کو ڈھونڈتا ہوں
جس دل میں تھے یہ جوہر اُس دل کو ڈھونڈتا ہوں

اوروں کی ہیں نگاہیں رنگینیٔ جہاں پر
میں اعتبارِ رنگِ محفل کو ڈھونڈتا ہوں

دستِ طلب بڑھانا توہین ہے طلب کی
خودداریٔ نگاہِ سائل کو ڈھونڈتا ہوں

کم ہمتیٔ دل ہے یہ انقلاب کب سے
طوفاں پرست ہو کر ساحل کو ڈھونڈتا ہوں

یہ کیفِ عاشقی میں گم ہو کے رہ گیا ہے
اے درد! رہبری کر میں دل کو ڈھونڈتا ہوں

میں ہوں ابھی سے تیری چشمِ کرم کا طالب
آغازِ عشق ہی میں حاصل کو ڈھونڈتا ہوں

دونوں ہی اپنی دھن میں سرگرمِ جستجو ہیں
دل مجھ کو ڈھونڈتا ہے میں دل کو ڈھونڈتا ہوں

محمد علی خاں اثر رامپوری

گلوں کو دیکھ کے دامن کو تار تار نہ کر
جنوں کے پردے میں رسوائی بہار نہ کر

قدم بڑھائے چلا جا رہِ محبت میں
نظر فریب منازل کا اعتبار نہ کر

وہ ایک لمحہ کہ جس میں نظر نظر سے ملے
یہی حیات ہے باقی کا اعتبار نہ کر

نظر کا رنگ بنا لے گا خود خزاں کو بہار
ملے شراب تو موسم کا انتظار نہ کر

وفا کے دعوے جفا کے گلے معاذ اللہ
اثر تو عشق کی فطرت کو شرمسار نہ کر

آصف طرب ندوی

اعجازِ محبت کیا کہیے اب راہ میں حائل کوئی نہیں
یا ایک زمانہ دشمن تھا یا میرے مقابل کوئی نہیں

اکثر تو حضورِ دوست مجھے محسوس یہ ہونے لگتا ہے
نظریں ہی مری خود جلوہ ہیں نظروں کے مقابل کوئی نہیں

ناواقفِ الفت ہے وہ طرب جو گم ہے تلاشِ منزل میں
یہ راہ خود اپنی منزل ہے اس راہ کی منزل کوئی نہیں

روحِ انتخاب

عورت اور تہذیبِ جدید

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ عورت جس نے اپنی زندگی جدید تہذیب کے مطابق ڈھال لی ہے اس نے اپنے آپ کو [illegible] ہے اور وہ جو مختلف قسم کی زیبائشوں کے سامان اپنے اوپر لادے ہوئے ہے اس کے لئے خوبصورتی کا باعث ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کہ نئی تہذیب نے عورت کو کچھ آزادی اور بیشتر تفریح کی سہولتیں میسر کی ہیں اور بہت سی بُری عادات اور صریح مظالم سے بھی اس کو نجات دلائی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر بعض امور میں نئی تہذیب عورت کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئی ہے تو بہت سی باتوں میں یہ اس کے لئے نحوست بھی ثابت ہوئی ہے۔ اس حقیقت کے ثبوت کے لئے مندرجہ ذیل اشارہ ہی کافی ہے:-

"ایک وقت تھا کہ عورت اپنی شرم کی وجہ سے مردوں پر ایک خاص اقتدار و غلبہ رکھتی تھی۔ وہ ہر محفل میں اپنا جسم کھول کر نہیں چلتی تھی۔ بلکہ صرف محدود حلقوں میں اپنا چہرہ ظاہر کرتی تھی اور بالکل معمولی قسم کی زینت اس کے لئے کافی تھی۔ جو اس کی قدرتی خوبصورتی کو نکھار دے اور دیکھنے والا بھی یہی محسوس کرے کہ اس میں بناوٹ اور تصنع نہیں ہے"

لیکن جدید تہذیب میں عورت نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ ڈالی، وہ ہر قسم کی محفلوں میں جانے لگی۔ بے شمار قسم کی زیبائشیں اختیار کرنے کی وجہ سے اس نے اپنی قدرتی خوبصورتی کو بھی چھپا دیا۔ اور ایسی محفلوں میں جانے لگی جہاں اس کے تمام جسم کی نمائش ہوتی ہے۔ اس نے اپنے لئے ایسی ایسی زیبائشیں لازم کر رکھی ہیں جس کے لئے اس کو اپنا تمام قیمتی وقت اور دولت ضائع کرنی پڑتی ہے۔ چاہے محفل ہو یا کوچہ اس کو ہر وقت اپنی زینت ہی کی لگن ہے۔ اس کو اگر دولت جمع کرنے کی فکر ہے تو وہ بھی اس لئے کہ اس سے وہ اپنی زینت کے اخراجات پورے کر سکے اور ساتھ ہی اس "شغل" میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرے۔ اس کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ ہمیشہ کیلئے مختلف پروگراموں، نمائشوں اور کلبوں کی زینت بنی رہے! یہ تمام کھیل کھیل چکنے کے بعد وہ سعادت مند اور آبرومند ہونا چاہتی ہے۔ لیکن نہیں ہو سکتی۔ وہ فطرت سے دور ہی جا رہی ہے، نزدیک نہیں ہو رہی۔ وہ جان توڑ کوشش کرتی ہے۔ لیکن مردوں پر پہلا جیسا غلبہ نہیں پا سکتی وہ خیال کرتی ہے کہ اس طریقہ سے وہ اپنی کرامت کی حفاظت کر رہی ہے۔ پھر جب اس پر بڑھاپا چھا جاتا ہے تو یہ زیبائش اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ لیکن ساتھ ہی وہ وقار حاصل کرنا چاہتی ہے جو پہلے زمانہ میں عام طور پر سن رسیدہ عورتوں کو حاصل رہا ہے۔ لیکن حاصل نہیں کر پاتی۔ اس لئے بڑھاپا اس کے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ پس اس طریقہ سے وہ دو مصیبتوں میں گرفتار ہے۔ ایک بڑھاپا اور دوسری بناوٹ۔ جو اس کی عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ درحقیقت عقل میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ جو جسموں اور زیبائشوں میں ظاہر ہو رہا ہے!!

(از ڈاکٹر عزام بے۔ ترجمہ رفیع اللہ)

ہماری نظر میں

مسئلہ تقدیر

"مسئلہ تقدیر از تقریرِ بخاری" از: مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔ ضخامت ۴۸ صفحات (مجلد)
ملنے کا پتہ:- کتب خانہ عثمانیہ ۳۴/۲ لال اودھا مینشن۔ بندر روڈ۔ کراچی۔

حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (ضلع سورت) میں صحیح بخاری شریف کا درس دیتے ہوئے مسئلہ تقدیر پر ایک تقریر فرمائی تھی۔ جسے لکھ لیا گیا تھا جب یہ تقریر لکھی جا چکی تو حضرت مولانا مرحوم نے اس پر نظر ثانی کر کے جا بجا اضافے کئے اور یہ تحریر ایک مستقل رسالہ کی صورت اختیار کر گئی۔

یہ رسالہ مولانا کے جیتے جی نہ چھپ سکا۔ اب اسے آپ کے چھوٹے بھائی بابو فضل حق صاحب عثمانی نے اپنے اہتمام سے چھپوایا ہے۔ صاحب موصوف حضرت علامہ قدس سرہٗ کی بعض دوسری کتابیں بھی چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر ان چند مسائل میں سے ایک ہے جو انتہائی نازک اور پیچ در پیچ ہیں اور جن پر ہزاروں صفحے اسلامی ادب میں موجود ہیں۔ یہ مسئلہ اہلِ کلام کا سب سے زیادہ بحث اور معرکہ آرا موضوع رہا ہے۔ مگر علامہ عثمانی علیہ الرحمہ کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ آپ نے اس نازک مسئلہ کو اس قدر سلجھے ہوئے اور دلنشین انداز میں بیان کیا ہے کہ تمام گرہیں ایک ایک کر کے کھلتی ہوئی چلی گئی ہیں۔ قدریہ۔ جبریہ۔ اور معتزلہ سے اس مسئلہ کی تشریح و تعیین میں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کا بڑی خوبصورتی سے رد فرمایا ہے!

جو کوئی اس رسالہ کو ایک بار سمجھ کر پڑھ لے گا۔ یقین ہے کہ افعال کے کسب و خلق، خیر و شر اور اعمال کے مجازات کے بارے میں انشاءاللہ کوئی الجھن باقی نہ رہے گی اور ان مسائل میں ذہن بالکل صاف ہو جائے گا۔

مسلم لیگ کی مخالفت کیوں؟

"مسلم لیگ کی مخالفت کیوں؟" از:- جی۔ ایم سید۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت دو روپے
(ملنے کا پتہ درج نہیں)

یہ کتاب سندھی زبان میں لکھی گئی تھی۔ زیر تنقید کتاب اصل کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ جو آسان اور عام فہم ہے۔

مسٹر جی، ایم سید کا نام سیاسی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ایک زمانہ میں مسلم لیگ کے پُرجوش کارکن رہے ہیں۔ اور پھر مسلم لیگ سے کٹ کر نیشنلسٹ گروپ میں آئے تو مخالفت کی بھی حد کر دی۔ اور اس زمانہ میں مسلم لیگ سے ٹکر لی جب مسٹر محمد علی جناح مرحوم کی قیادت عین شباب پر تھی اور مسلم لیگ کی مخالفت پوری قوم کی مخالفت تھی!

اس کتاب میں مسٹر جی، ایم سید نے مسلم لیگ کی کمزوریاں۔ خرابیاں اور بے اصولیاں ایک ایک کر کے گنائی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے:-

"اسلام اور مسلم قوم کا نام لے کر انگریزوں کے چند منظورِ نظر لوگوں نے عوام کی لیڈری کا جھنڈا استعمال کیا ہے۔" (صفحہ ۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ دسمبر ۱۹۴۵ء اور جنوری ۱۹۴۶ء میں سندھ اسمبلی کے جو انتخابات ہوئے تھے اس میں مسلم لیگ کی برسرِاقتدار جماعت نے جو طریقے استعمال کئے۔ وہ مسلم لیگ کی تاریخ کے سیاہ اوراق ہیں۔ مگر اب ۱۹۵۵ء میں یہی مسلم لیگ جس سے جی ایم سید ناراض ہیں عملاً منسوخ ہو چکی ہے۔ اس لئے اب ان کی خفگی کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جانا چاہیئے!

مسٹر جی، ایم سید مسلم لیگ کے مخالف ہیں اور وہ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ "لیگ کی مخالفت سے مسلمانان عالم کو ہلاک خطرے سے بچانا ہے۔" مگر مسلمانوں کی بہتری کے لئے خود اُن کے پاس کیا پروگرام ہے۔ ہمیں تو اُن کی اس کتاب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف پر "سندھیت" کا اس قدر غلبہ ہے کہ مسلمانوں کی "وحدت" کو وہ صوبہ پرستی کی اس دیوی پر بے دریغ بھینٹ چڑھانے کے لئے تیار ہیں۔ پھر اُن کا یہ فرمانا۔

"سیاست کو مذہب میں ضم کر دینا عموماً تباہ کن نقصان کا باعث ثابت ہوا ہے۔" (صفحہ ۵۹)

ان کے معتقدات کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ کہ وہ "اُس" کلیسا نما اسلام" کے قائل ہیں جو قیصر کو قیصر کا حصہ اور کلیسا کو کلیسا کا حصہ دے کر دین و سیاست میں تفریق پیدا کر دیتا ہے!

اسلام نے عملاً کالے اور گورے، شرقی اور غربی اور ذات پات کی بناء پر شریف اور رذیل کی تمیز اٹھا دی۔ اسلام کے غلاموں نے فرمانروائی کی ہے اور مسلمانوں نے انھیں اپنا امیر مانا ہے۔ مگر مسٹر جی، ایم سید پاکستان میں "سندھی قومیت" کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور "سندھی قومیت" کی حفاظت اُن کا مشن ہے!

پاکستان میں اگر اسی طرح ہر صوبہ اپنی "قومیت" کی حفاظت کے لئے جدوجہد شروع کر دے تو "قومیتیں" باقی رہ جائیں تو رہ جائیں۔ مگر خاکم بدہن پاکستان عملاً ختم ہو جائے گا۔ حیرت ہے کہ ایک مسلمان جو ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ "قومی وحدت" سے ہٹ کر "علاقائی تعصبات" پر سوچ کس طرح سکتا ہے؟

ضرورتِ حدیث

"ضرورتِ حدیث" از: قاضی محمد زاہد الحسینی۔ ضخامت ۳۰۴ صفحات۔ قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت والتبلیغ شمس آباد ضلع اٹک (پاکستان)

فاضل مصنف نے یہ کتاب کیا لکھی ہے۔ یوں سمجھئے کہ "فتنۂ انکارِ حدیث" کی روک تھام کے لیے ایک مضبوط پشتہ تیار کیا ہے۔ اور ایک مستحکم بند باندھا ہے۔ کتاب کے چند اہم عنوانات:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام — حدیث دین ہے — حدیث کا آئین میں معتبر ہونا — حضور کا حکم کتابتِ حدیث کے متعلق — قرنِ اول میں کتابتِ حدیث — تحفظ حدیث پر مستشرقین کی آراء — انکارِ حدیث کے نقصانات — منکرینِ حدیث کے اعتراضات کے جوابات ...... !

پوری کتاب ضروری معلومات، اور مستند جوابوں سے بھرپور ہے۔ کتاب کی زبان سلیس اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے[1]۔ جناب قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب کو اللہ تعالیٰ اس دینی خدمت پر دارین میں اجر عطا فرمائے گا۔

---

[1] "ان چند بزرگوں کو ایسا سوز و ساز پیدا ہو گیا کہ کسی طرح ان لوگوں کے پیش کردہ دین کو مٹا یا جائے۔" (صفحہ ب)۔ "سوز و ساز پیدا ہو گیا" نے مفہوم کو الجھا دیا۔! (م - ق)

جیل خانہ

"جیل خانہ" از:- سید نقی علی - ضخامت ۲۴۸ صفحات - مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ - قیمت تین روپے -
ملنے کا پتہ:- گوشۂ ادب - چوک انار کلی - لاہور -

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو مارشل لاء کی عدالت نے جس مقدمہ میں سزائے موت کا حکم سنایا تھا اور بعد میں جسے چودہ سال قید بامشقت میں تبدیل کر دیا - جناب نقی علی صاحب کو اسی مقدمہ میں نو سال قید بامشقت کا حکم ملا - مگر تقریباً ایک سال کے بعد انہیں رہائی مل گئی - نقی علی صاحب کی اپنی خدمات پہلے ہی قابل ذکر تھیں - مگر قید و بند کی اس کامیاب آزمائش نے تو اُن کی خدمات پر مہر تصدیق ثبت کر دی!

اس مرد مجاہد نے یہ کتاب کیوں لکھی ہے - اس کا جواب اس کی زبان سے سنئے:-

"قوم کو تا بحدِ امکان جیل کے اصلاحات سے باخبر کیا جائے - ہر سر اقتدار طبقہ کو اس کے فرض کی طرف متوجہ کیا جائے - قیدیوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کر کے اصلاح حال پر راغب کیا جائے!"

اور کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب ان مقاصد کو پورا کرتی ہے - اس موضوع پر اس قدر جزئی تفصیل کے ساتھ اردو زبان میں تو شاید کوئی کتاب نہیں لکھی گئی!

"جیل خانہ" نے جیل کے بعض اسرار کی پردہ کشائی بھی کی ہے - اور لوگوں کو گھر بیٹھے ہوئے جیل کی سیر بھی کرا دی ہے - حکومت کو جماعتِ اسلامی سے اگر خدا واسطے کا بیر نہ ہو تو اس کتاب سے پاکستان کا محکمہ جیل ہدایت حاصل کر سکتا ہے - قیدیوں کے لئے یہ کتاب ضابطۂ اخلاق ہے!

ناشر اور مصنف دونوں اس کتاب کی ترتیب و اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں - لکھائی، چھپائی اور کاغذ کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے - موضوع خشک اور خوفناک ہونے کے باوجود کتاب دلچسپ ہے!!

ترجمان زندگی

"ترجمان زندگی" از:- سید علی منظور حیدر آبادی - ضخامت ۲۱۶ صفحات - قیمت دو روپے آٹھ آنہ -
ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر - رفعت منزل - حیدر آباد دکن -

سید علی منظور حیدر آبادی مشاعروں کے نہیں رسائل و جرائد کے شاعر ہیں - مقصد عرض کرنے کا یہ ہے کہ لوگوں نے انہیں رسالوں کے ذریعہ جانا اور پہچانا ہے - کم و بیش تیس سال سے ان کا کلام رسالوں میں چھپ رہا ہے - موصوف ایک پختہ مشق اور رقت ور کلام شاعر ہیں - انہوں نے بعض اچھوتے موضوعات پر نظمیں کہی ہیں - خلوص ان کی شاعری کا سب سے زیادہ نمایاں وصف ہے -

"ترجمان زندگی" سید علی منظور کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے - جسے ادارۂ ادبیات اردو نے ڈاکٹر زور کے مختصر دیباچہ کے ساتھ شائع کیا ہے - ان کی نظمیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو سب سے زیادہ دلچسپی اپنی گھریلو زندگی سے ہے - بیوی بچوں اور اپنے گھر بار سے علی منظور صاحب کی یہ دلچسپی جب شاعری کے نئے نئے موضوعات اختیار کرتی ہے تو اثر انگیز بن جاتی ہے -

ان شعروں سے صاحب "ترجمانِ زندگی" کے کلام کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے:-

بچا لیتی ہے کشتی کو ہوا ایسا بھی ہوتا ہے ۔۔۔ ڈبو دیتا ہے کشتی ناخدا ایسا بھی ہوتا ہے

حسن مجنوں طلب، حسن فرہاد جو ۔۔۔ حسن معجز نما، حسن عیسیٰ نظر!

طالب زر نہیں فقط مجذوب   ان کو پوشاک چاہیئے نہ حصیر

دوڑتے پھرتے ہیں ادھر سے اُدھر   یہ بگولے نہیں ہوا کے امیر

فارسی کی مشہور ضرب المثل "برعکس نہند نام زنگی کا فور" کی اس مصرعے میں کتنی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔ ع

سیاہ فام تونگر بھی "چاند پاشا" ہے!

پھوٹی کرن نشاط کی لالے کے باغ میں   جھلکی مئے طرب مرے دل کے ایاغ میں

گم اب مری بلا ہو خوشی کے سراغ میں   ہر قسم کی خوشی ہے مرے خانہ باغ میں

گھوم رہے نگاہِ شوق! اس گلکدے میں گھوم

محنتی کوئی آرام طلب رہ نہیں سکتا   بے شیشہ و ساغر کبھی خوش رہ نہیں سکتا

سلجھاتے ہیں کاکلِ شامِ فراق کو   الجھیں گے کیا ہجوم شعاعِ سحر سے ہم

سوچنے کیسے پھر زندہ دلی بارِ محبت   ہو مجھ سا گرانبار محبت جو سبکدوش

صید گاہِ ہوس خوب دیکھی   دام ہی دام دانے ہی دانے

یہ تب و تابِ بے دلی ہے! ہے!   ہم بھی صاحب دلوں میں شامل تھے

جہاں آکر گلے ملتے ہیں دکھ سکھ   وہیں جب کر بھٹک جاتے ہیں راہی

تجھے دیکھ کر مسکرانے لگے   سنور نے سے جب اُن کو فرصت ملی

جو رہے جا پہ عجب شان تھی اُن کے رُخ کی   میں نے جمنے نہ دیا رنگ پشیمانی کا

شیخ جی دُون کی لیتے ہیں میں چپ ہوں گویا   جانتا ہی نہیں حضرت کی خدادانی کو

میں ترے حُسن کے معیار پہ جانچوں، نہیں کیا   مہر و مہ خود نظر آتے ہیں پشیمانوں میں

گیت (غریب کی بڑبڑاہٹ) کے یہ "بول" کتنے اثر انگیز ہیں:-

ٹھور نہ پاؤں دیس کے اندر جینا چپ ہوں بھوکوں مرکر   ڈالی جیسے کانپوں تھر تھر، دھرتی جیسے کھاؤں چکر

پڑوا جیسے گھوموں گھر گھر۔ بیت گیا دن یُوں ہی مجھ پر   جاگ اُٹھا من موہن چندر بھوکا ہوں میں سوؤں کیوں کر

دُوسرا رُخ:-

صفحہ ۱۰) ع "مجرباتِ بزرگاں میں شک و شبہ کہاں؟

"مجربات" نے شعر کو کتنا بوجھل بنا دیا۔ یہاں "تجربات" کا محل تھا۔ "مجربات" سُن کر تو طبیبوں کے آزمائے ہوئے نسخوں کا دھوکا ہوتا ہے!

صفحہ ۱۶) بریانی کے چاول کا نمونہ کبھی پرکھ   جانچا کبھی گھی تاکہ بگڑ جائے نہ لذت

پرکھنے کی جگہ "نمونہ" "دیکھا" اور "جانچا کبھی گھی" کی جگہ "چکھا کبھی گھی" ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۱۹) "اس نے بین دبائی اس نے بجائی تالی" بین کو مونث پہلی بار پڑھا۔

صفحہ ۳۴) زر پرستوں سے جدا چونکہ روش ہے میری   اس لئے جان مرے دل کی تپش ہے میری

مصرعہ ثانی میں تعقید وجدان پر کتنی گراں گزرتی ہے۔

(صفحہ ۶۳) دھوکا کھاؤں نہیں سرشار میں ایسا زد میں تجھے لاؤں نہیں عیار میں ایسا

ایک پختہ کار شاعر اور یہ نومشقوں کا سا انداز۔ حیرت ہے! "سرشار" سادہ لوح اور بھولے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو درست نہیں۔ "عیار" کے مقابلہ میں "سرشار" نہیں بھولا اور سادہ لوح ہی لایا جا سکتا ہے۔

(صفحہ ۷۲) پھول نہیں شرار ہیں دامن اہتزاز میں آتش دل بھڑک اٹھی راہ طرب گداز میں

پورا شعر "آورد" ہی "آورد" ہے۔ پھر راہ کو "طرب گداز" کہنا بھی اگرچہ جدت ہے مگر ناروا جدت ہے۔

(صفحہ ۸۹) "تاروں سے خجل کیوں تری آنکھیں ہیں بر باطن" "بر باطن" نے اس مصرعہ کی شعریت ہی کو غارت کر دیا۔

(صفحہ ۱۳۴) ہے ضامن فضیلت کلی یہ اتحاد! یہ اتحاد ہے شرف و فضل کا سواد

یہ موزوں کلام تو ضرور ہے مگر شعر نہیں ہے۔

(صفحہ ۱۴۰) بتاؤں میں اس کو جب بتاشا تو ہاتھ پھیلائے بے تحاشا

"بتاؤں" "دکھاؤں" کے معنی میں دکن میں بولا جاتا ہے۔

(صفحہ ۱۷۸) سمٹی ہوئی ہیں دل میں دو عالم کی وسعتیں جھجکیں نہ کیوں تری "طلب مختصر" سے ہم

آخر شاعر کہنا کیا چاہتا ہے۔ شعر کے لفظوں سے تو کچھ نہیں کھلتا۔ "جھجکیں" نے شعر کو اور مبہم بنا دیا۔

حمد و نعت و منقبت کا سلسلہ دے دماغ و دیدہ و دل کو جلا

ممکن ہے کہ کتابت کی غلطی نے شعر کو سہل بنا دیا ہو۔

نظموں کے یہ عنوانات کتنے عجیب اور نامانوس ہیں:۔

دام ضمائر اور نگاہ شاعر — کارواں بننے کی ریت — گلابی تعصب — تحریک تگ و دو — خوشتر ین قافیہ — شہودی ڈھنگ — سر دینے کے ڈھب — برادری کا لحاظ بیمار کو بھی — اللہ اللہ!

اس مجموعہ میں شاعر کی کچھ رباعیاں بھی شامل ہیں۔ جن میں سے دو تین تو جاندار ہیں باقی پھیکی اور بے مزہ ہیں۔

فتنۂ پرویز اور حقیقت حدیث

"فتنۂ پرویز و حقیقت حدیث" از:۔ منشی عبد الرحمن خاں۔ ضخامت ۲۰۸ صفحے۔ قیمت تین روپے۔ (مجلد، رنگین و خوشنما گرد پوش کیساتھ) ملنے کا پتہ:۔ ایم ثناء اللہ خاں۔ ۲۶ ریلوے روڈ۔ لاہور۔

کتنی بڑی بد توفیقی اور کفران نعمت ہے کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کوئی جوہر عطا فرمائے، اور وہ جوہر اصلاح کے بجائے "فساد" میں صرف کیا جائے۔ غلام احمد پرویز کو انشا پردازی کا سلیقہ قدرت نے عطا کیا ہے۔ مگر اس بر خود غلط نے قدرت کے اس عطیہ کو قرآن کی معنوی تحریف اور حضورؐ کی احادیث کی تکذیب و تضحیک میں صرف کیا ہے۔ "انکار حدیث" اس دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے جس کی زمام کار پرویز صاحب کے ہاتھ میں ہے۔

جناب منشی عبد الرحمن خاں صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے سہل اور سلیس انداز میں اس دجل و فریب کو برہنہ کر دیا ہے۔ موصوف نے پرویز صاحب ہی کی تحریروں کے اقتباسات سے پہلے تو ان کے خیالات کا تضاد دکھایا ہے کہ یہ حضرت (؟) کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ۔ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ اس کے بعد انہوں نے پرویزی مغالطوں کی دلائل و براہین کیساتھ

---

[1] تحریک کی جمع "تحاریک" اردو وال حضرات کیلئے نامانوس ہے۔ فاضل مصنف "تحریکوں" لکھا کریں تو اچھا ہے۔ (م۔ق)

دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں ! " منکرین حدیث " کی طرف سے احادیث پر جو اُن کے نزدیک بڑے معرکے کے الزامات اور اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں ۔ ان کا اس کتاب میں دندان شکن جواب دیا گیا ہے ۔

پیش لفظ حضرت طالوت نے لکھا ہے ۔ جو ایک شگفتہ [1] طنز کی حیثیت رکھتا ہے ۔

سالانہ روئیداد دارالعلوم کراچی

" سالانہ روئیداد دارالعلوم کراچی " ۔ مرتبہ :۔ مولوی نور احمد ناظم دارالعلوم ۔ ضخامت ۔ ۹ صفحات ۔ کاغذ ۔ کتابت ۔ طباعت ۔ ہر چیز خوب سے خوب تر) ملنے کا پتہ :۔ دارالعلوم ۔ کراچی (۱)

دارالعلوم کراچی کی یہ سالانہ روئیداد ہے ۔ جسے اس دینی درسگاہ کے ناظم مولوی نور احمد صاحب نے بڑے سلیقہ کے ساتھ مرتب فرمایا ہے ۔ دارالعلوم کے سرپرست اور رئیس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ہیں ۔ جو اپنے علمی وقار اور دیانت و حق گوئی کے سبب مسلمانوں کے ہر طبقہ میں مقبول ہیں ۔ اور لوگ ان پر اعتماد کرتے ہیں ۔ مفتی صاحب موصوف کے خلوص اور حسن نیت ہی کا یہ اثر ہے کہ بہت ہی تھوڑی مدت میں دارالعلوم نے اتنی ترقی کی ہے کہ بہت سے علمی ادارے بیسیوں برس کی کوشش میں بھی اس مرتبہ کو نہیں پہنچتے ــ !

دارالعلوم کا آغاز چھوٹے پیمانہ پر ہوا تھا ۔ مگر اب اللہ کے فضل سے اس کے سالانہ مصارف ساٹھ ہزار روپے سے بھی زاید ہیں ۔ طلبا کی تعداد تین سو سے بھی متجاوز ہے ۔ پچیس کے قریب علماء اور مدرسین ہیں اور پاکستان کے علاوہ افغانستان ، ایران ، ہندوستان اور برما وغیرہ کے طلبار بھی اس ادارے سے مستفید ہو رہے ہیں ۔ یوں سمجھئے کہ کراچی میں ایک دوسرا " دیوبند " بن گیا ہے ۔

دارالعلوم میں شعبہ دارالافتا ربھی ہے ۔ ایک کتب خانہ بھی ہے ۔ جس کی کتابوں کی مجموعی قیمت پچیس ہزار کے قریب ہو گی ۔ ان کے ماسوا دارالعلوم کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سفارت خانہ شام کے تعاون سے عربی زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے شہر میں متعدد مراکز قائم کر دیئے ہیں ۔ جن میں ڈیڑھ ہزار کے قریب تعلیم یافتہ تجار ، ملازمین ، پروفیسر ، اساتذہ اور اسکول کے طلبار عربی زبان سیکھ رہے ہیں ۔

دارالعلوم کے آمد و خرچ کی جانچ پڑتال رجسٹرڈ اکاؤنٹنٹ آڈیٹر نے کی ہے ۔ اور صداقت نامہ دیا ہے جو اس روئیداد میں شامل ہے ۔ حساب کتاب کی تفصیل کارکنوں کی دیانت کی گواہی دے رہی ہے !

دارالعلوم کے مسلک کا جہاں ذکر ہے ۔ وہاں یہ بات کھٹکی :۔

" دارالعلوم کا مسلک عقائد اہل سنت و الجماعت اور فقہ حنفی کے مطابق ، اور اس کا مشرب یعنی طریقہ فکر و عمل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہم کے مشرب کے مطابق ہوگا " (صفحہ ۱)

مسلک کے بعد پھر " مشرب " کی قید حقیقت سے کچھ " زاید " ہی معلوم ہوتی ہے !

عالمِ اسلام کے اب وہ حالات نہیں رہے ۔ جن حالات میں درس نظامی تیار کیا گیا تھا ۔ اب درس نظامی کی افادیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نہج پر طلباء کی تربیت کی ضرورت ہے کہ وہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کا جذبہ لے کر دینی درسگاہوں سے نکلیں ، اور سائنس ، فلسفہ ، تاریخ اور تمدن و سیاست کے ہر محاذ کی کمان سنبھال سکیں اور زندگی کے ہر میدان میں باطل کا مقابلہ کر سکیں !

---

[1] " . . . مذہب کے مرعوب دینے کے مشاق " (صفحہ ۱) " کے " کی جگہ " میں " ہونا چاہیئے ۔ (م ۔ ق)

دار العلوم ندوۃ العلماء کے مقابلہ میں حرکت و عمل کی توقع رکھتے ہیں اور اس کی زندگی، ترقی اور بقا کی دعا کرتے ہیں۔

ہفت روزہ "ایشیا"

"ہفت روزہ ایشیا"۔ مدیر۔ نصر اللہ خان عزیز۔ معاون:۔ ضیاء الاسلام انصاری۔ ظفر اللہ خاں ایم اے۔ قیمت فی پرچہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ہفت روزہ ایشیا۔ نزد تھانہ گوالمنڈی لاہور۔

ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز معروف صحافی، مشہور اخبار نویس اور مقبول اہل قلم ہیں۔ سہ روزہ مدینہ کے بعد مجلہ کوثر میں ان کے قلم کی روانی اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اب ان کی ادارت میں ہفت روزہ "ایشیا" منظر عام پر آیا ہے جو اپنی اصابت فکر، مضامین کے تنوع اور دوسری ادبی دلچسپیوں کے سبب تحسین و قدر شناسی کا مستحق ہے۔

فلمی پرچوں اور بازاری رسالوں نے فضا کو مسموم اور ماحول کو گندہ بنا دیا ہے۔ لوگ صرف چٹخاروں کی آڑ میں دولت کما رہے ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ وہ اس طرح ملک و قوم کا مذاق بگاڑ رہے ہیں۔ اس ماحول میں "ایشیا" ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

کا نعرہ بلند کرتا ہوا میدان میں آیا ہے۔ جو لوگ اپنے گھروں میں پاکیزہ ادب کی ترویج چاہتے ہوں۔ انھیں "ایشیا" کی خریداری سے محروم نہ رہنا چاہیئے۔ دین و دانش اور شوخیٔ فکر و سنجیدگیٔ قلم کا ایسا حسین امتزاج کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

اس فلم زدہ دور میں علمی اور دینی پرچوں کا مالی اطمینان کے ساتھ چلنا بڑا دشوار ہے۔ کیونکہ یہ پرچے اشتہاروں کے سلسلہ میں حلال و حرام کا خیال رکھتے ہیں۔ اس لئے "ایشیا" اسلام پسند طبقہ کی طرف سے تعاون و قدر شناسی کا بیش از بیش استحقاق رکھتا ہے!

چمکدار لیکن

ماہر القادری

جلد (۶) نمبر (۱۲)

ماہنامہ

فاران

مارچ ۱۹۵۵ء ——— ایڈیٹر ———← ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸/

آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱/

مقامِ اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی نمبر (۱)

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان دستور ساز اسمبلی ملک کے لئے دستور بنا رہی تھی کہ وہ اسی غرض و غایت کے لئے وجود میں آئی تھی۔ شروع کے چند سالوں میں اس کے کام کی رفتار بہت سست رہی مگر گزشتہ دو سال میں دستور سازی کی رفتار تیز تر ہوتی چلی گئی۔ اور توقع تھی کہ دسمبر ۱۹۵۴ء میں وہ اپنا کام پورا کر لے گی اور ہماری حکومت جو "دستور" کے بغیر چل رہی ہے "صاحب دستور" ہو جائیگی مگر اب سے چار مہینہ پہلے گورنر جنرل پاکستان نے اپنے فرمان کے ذریعہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا!

دستور ساز اسمبلی توڑنے کے بعد تقریباً ایک ہفتہ تک گورنر جنرل کے اس اقدام پر اظہار رائے کے لئے سخت سنسر لگا دیا گیا۔ اخباروں میں "مبارکبادیں" تو چھپتی رہیں اور حکومت کا ریڈیو تبریک و تہنیت کے ان پیاموں کو پوری فراخدلی کے ساتھ نشر کرتا رہا۔ مگر یہ تصویر کا ایک رُخ تھا۔ دوسرے رُخ کو سامنے ہی نہیں آنے دیا گیا۔ خیر یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ وہ جو اس انقلاب کو پسند نہیں کرتے تھے، انہوں نے بھی بڑے ضبط و نظم کا ثبوت دیا اور قانون و آئین کا پورا احترام کیا!

دستور ساز اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین خاں صاحب نے گورنر جنرل کے اس اقدام کے خلاف سندھ چیف کورٹ سے انصاف چاہا۔ کئی ماہ تک اس معرکہ آرا مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ اس مقدمہ میں نہ تو گواہ شاہد پیش ہوئے اور نہ تحریری دستاویز! یہ خالص دستوری اور آئینی مسئلہ تھا۔ فریقین کے وکلاء نے خوب خوب بحثیں کیں۔ عوام نے بڑی دلچسپی کے ساتھ مقدمہ کی کارروائی کو پڑھا۔ بالآخر سندھ چیف کورٹ کے تمام فاضل ججوں نے متفقہ طور پر مولوی تمیز الدین خاں کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے گورنر جنرل کے اقدام کو ناجائز قرار دے دیا!

اس فیصلے کے بعد ملک میں اس سرے سے لے کر اُس سرے تک سکون و اطمینان کی ہموار فضا قائم ہو گئی۔ مگر اس

عالم میں ہمارے وزیر داخلہ میجر جنرل اسکندر مرزا صاحب کا ایک انتباہ آمیز بیان اخبارات میں آیا۔ جس میں کہا گیا:۔

"سندھ چیف کورٹ نے مولوی تمیز الدین خاں کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ جس میں دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے سلسلہ میں گورنر جنرل کے اقدام کو بے ضابطہ اور نئے وزراء کے تقرر کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے۔ اس فیصلہ کے خلاف حکومت نے فیڈرل کورٹ سے اپیل کی ہے۔ ان واقعات سے عوام کے ذہن میں مغربی پاکستان کے اتحاد اور ملک کے لئے ایک صحت مندانہ آئین مرتب کرنے کے مسائل کے مستقبل کے بارے میں کوئی شبہ پیدا نہ ہونا چاہیئے۔ بہر صورت مذکورہ امور میں ضروری اقدام کئے جائیں گے ساتھ ہی حکومت یہ تہیہ کر چکی ہے کہ وہ امن اور قانون کو برقرار رکھے گی اور اس مقصد کے لئے جو بھی ضروری اقدام ہو گا اٹھائے گی۔ کسی حالت میں بھی کسی حلقہ سے انتشار کو برداشت نہیں کیا جائے گا"۔ (اخبار جنگ ۱۲ فروری ۱۹۵۵ء)

جس وقت گورنر جنرل بہادر نے دستور ساز اسمبلی کو توڑا تھا۔ اس وقت بھی ملک کی فضا کو سہما دیا گیا تھا۔ فرض کیجئے اس وقت اچانک انقلاب کے بعد اس تہدید و احتساب کی ضرورت تھی۔ مگر سندھ چیف کورٹ کے فیصلہ کے بعد یہ "انتباہ" بے ضرورت ہی نہیں عجیب بھی ہے!

یہ جو فرمایا گیا ہے کہ:۔

"حکومت تہیہ کر چکی ہے کہ وہ امن اور قانون کو برقرار رکھے گی"۔

تو اس سلسلہ میں ہم نیاز مندیہ عرض کرتے ہیں کہ سندھ چیف کورٹ کے فیصلہ کے بعد ملک کے "امن و قانون" کو کیا خطرہ لاحق ہو گیا ہے یا ہو سکتا ہے۔ جس کے برقرار رکھنے کے لئے حکومت کو اپنے عزم کے اظہار کی ضرورت پیش آئی؟ اور پھر یہ کہنا:۔

"..... کسی حالت میں بھی کسی حلقے سے انتشار کو برداشت نہیں کیا جائیگا"

یہ انتشار آخر کہاں ہے؟ اور اس وقت نہیں ہے تو اس "مفروضہ" انتشار کی مستقبل میں کس حلقہ سے توقع ہے؟ پھر یہ انتشار آخر ہے کس بات پر؟ اس انتشار کا کوئی سبب بھی تو ہونا چاہیئے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ چیف کورٹ کا فیصلہ جن "بڑے لوگوں" کی توقع کے خلاف صادر ہوا ہے۔ خود ان کے ذہن و فکر میں اس فیصلہ سے اضطراب پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی طرح دوسروں کو بھی شاید مضطرب الحال سمجھتے ہیں۔ اضطراب درحقیقت ہے کہاں؟ اور سمجھا کہاں جا رہا ہے؟

دستور سازی کی جائز صورت یہ ہے کہ کسی ملک اور قوم کے جو بنیادی افکار و معتقدات ہوتے ہیں۔ انہی کی اساس پر عوام کی نمائندہ جماعت دستور بناتی ہے۔ مگر پاکستان کی موجودہ کابینہ آخر کس اتھارٹی کی بنا پر "دستور" بنا رہی ہے؟ عوام نے موجودہ وزراء کو دستور سازی کا حق کس دن تفویض کیا تھا؟ چند کرسی نشینوں کے اس بنائے ہوئے دستور کی آئینی پوزیشن آخر کیا ہوگی؟ پھر یہ کروڑوں روپیہ دستور سازی پر جو اب تک خرچ ہوا ہے اور سات سال کی عرق ریزی کے بعد دستور سازی کا کام جس مرحلہ تک پہنچا ہے۔ اس پر کیا خط تنسیخ کھینچ دیا جائے گا۔ اگر ایسا نہیں ہو گا اور اسی کام کو آگے بڑھایا جائے گا تو پھر "اسلامی دستور" کی معروف و مقبول اصطلاح کو چھوڑ کر یہ "صحت مندانہ دستور" کی اصطلاح کس لئے وضع فرمائی گئی ہے!

پاکستان میں بوہے کے کھمبے اور لکڑی کے کندے نہیں آدمی بستے ہیں۔ جو شعور و فکر بھی رکھتے ہیں اور افکار و معتقدات بھی! کسی کے ارشاد کر دینے سے کہ "یہ صحت مند" اور "توانا دستور" ہے۔ لوگ آنکھ بند کر کے "سمعنا واطعنا" نہیں کہہ سکتے۔ پاکستان کے عوام کے پاس دستور و آئین کے جانچنے اور پرکھنے کا صرف ایک ہی معیار ہے اور وہ معیار "کتاب و سنت" ہے اگر یہ "صحت مند دستور" "کتاب و سنت" کے مطابق ہو تو طیب خاطر اور انشراح قلب کے ساتھ قبول کیا جائے گا اور اگر "کتاب و سنت" سے مخالف اور متصادم نظر آیا تو اُسے رد کر دیا جائے گا! دُنیا کا کوئی اقتدار جبر و طاقت سے کسی قوم کے بنیادی نظریوں کو نہیں بدل سکتا۔ کسی قوم کے یقین و ایمان اور افکار و عقائد کے خلاف کوئی نظریہ اور تصور ایجاد کر کے اُس کے انقیاد و قبول پر اصرار کرنا خود کشمکش و انتشار کو دعوت دینا ہے!

دستور و آئین اور طریقِ حکمرانی کے سلسلہ میں "امریکہ" کا ذکر بھی درمیان میں لایا جاتا ہے۔ تو اس بارے میں ہم دو ٹوک انداز میں عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ امریکہ سے ہم دوائیں، ہتھیار اور وہاں کی مصنوعات تو لے سکتے ہیں۔ مگر امریکہ سے "ہدایت" نہیں لے سکتے! ہمارے لئے ہدایت کا سرچشمہ "کتاب و سنت" ہے!

پاکستان کے وزیر داخلہ کے ارشادات کے بعد وزیر قانون کی شوخیٔ افکار کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:۔

"(حیدر آباد سندھ کی ایک گارڈن پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے) میں مجلس دستور ساز کو ایک غاصب ادارہ سمجھتا تھا اور اب بھی میرا یہی یقین ہے۔ . . . . . . میرا اور عوام کا یہ مطالبہ تھا کہ اس ادارے کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ گورنر جنرل پاکستان مسٹر غلام محمد نے ایک دلیرانہ اقدام کیا اور عوام کو اس ادارے سے نجات دلائی۔ اب سندھ چیف کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ اس دستور ساز اسمبلی کو توڑا نہیں جا سکتا۔ مسٹر سہروردی نے کہا کہ اس فیصلہ پر ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ تبصرہ کرنا قانون کے منافی ہوگا۔ حکومت اس فیصلے کے خلاف پاکستان فیڈرل کورٹ میں اپیل کرنے والی ہے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حالات زیادہ سے زیادہ سنگین صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر ایسے واقعات سامنے آئیں کہ لوگ حیران رہ جائیں انہوں نے یہ بھی کہا کہ وقتی طور پر شاید ہمیں ایسی کارروائیاں بھی کرنی پڑیں جو عوام کی توقعات کے منافی ہوں . . . ." (روزنامہ جنگ ۱۵۔ فروری ۱۹۵۵ء)

یہ بیان ہے پاکستان کے وزیر قانون کا۔ جو خود بیرسٹر بھی ہیں اور قانون و عدالت کے احترام کے تقاضوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر اس حالت میں جبکہ دستور ساز اسمبلی کے مقدمہ کی اپیل فیڈرل کورٹ میں دائر ہونے والی ہے۔ ان کا دستور ساز اسمبلی کو غاصب کہنا اور اس قسم کی تنقید کرنا کیا احترام قانون و عدالت کے عین مطابق ہے؟؟؟

مسٹر شہید سہروردی فرماتے ہیں کہ:۔

"میرا اور عوام کا مطالبہ تھا کہ اس ادارے (دستور ساز اسمبلی) کو ختم کر دیا جائے"

جی! یہ "آپ کا" تو مطالبہ تھا۔ مگر "عوام کا مطالبہ" ہرگز نہیں تھا۔ اور اگر خود آپ نے اپنی ذات کو "عوام" سمجھ رکھا ہے۔ تو آپ کی اس خوش فہمی پر بے ساختہ قہقہہ نکل جائے تو حضور معاف فرما دیں! دستور ساز اسمبلی توڑے جانے سے صرف چھتیس گھنٹے پہلے خود پاکستان کے دارالخلافہ کراچی میں عوام کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں ڈنکے کی چوٹ کہا گیا کہ کچھ اقتدار کے بھوکے دستور ساز اسمبلی توڑنے کا شور مچا رہے ہیں۔ دستور ساز اسمبلی کو اپنا کام ختم کر کے

ذمہ لینا چاہیئے تاکہ پھر دستور کے تحت نئے انتخابات ہوں۔ اور ملک کا کوئی فرد یا ادارہ ضبط و آئین سے تجاوز نہ کرے!
عوام کا یہ مطالبہ اور سہروردی صاحب قبلہ کا وہ دعویٰ!
مسٹر سہروردی نے دستور ساز اسمبلی کی شکست و تحلیل کا مطالبہ فرماتے ہیں۔ پھر اُن سے گفت و شنید کے لئے کراچی اور سوئٹزرلینڈ کا طول البلد ایک کر دیا جاتا ہے۔ دستور ساز اسمبلی بھی توڑ دی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد مسٹر سہروردی کراچی آتے ہیں اور تین چار دن کے مذاکرے کے بعد قلمدانِ وزارت انہیں سونپ دیا جاتا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا اور جس انداز ترتیب کے ساتھ ہوا۔ اس کے لئے نرم سے نرم لفظ "سازباز" ہی ہمارے ذہن میں آیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس سے زیادہ نرم لفظ ہمیں بتاسکیں تو ہم اُن کے لفظ کو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیں گے!
صاحب موصوف کا یہ ارشاد:۔

"میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حالات زیادہ سے زیادہ سنگین صورت اختیار کرتے جارہے ہیں" ——

—— قصر و ایوان کی اندرونی سیاست کی بہت کچھ غمازی کرتا ہے! اگر سہروردی صاحب نے یہ بات اپنے صاحب اختیار رفقاء کے عزائم کا اندازہ لگا کر پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی ہے تو پھر اس آنے والے سنگین حادثہ کے لئے پاکستانیوں کو ہم ابھی سے صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسے صبر کی تلقین کہ جس میں چاہے دل لہو لہو ہو مگر آنکھ سے آنسو نکلے اور نہ لب سے فریاد بلکہ لبوں پر مسکراہٹ ہو اور زبان پر تبریک و تہنیت اور "زندہ باد" کے نعرے!
چیف کورٹ کے فیصلے کے بعد وزیر داخلہ کا وہ بیان کہ:۔

"......کسی حلقہ سے انتشار کو برداشت نہیں کیا جائے گا" اور وزیر قانون کا یہ ارشاد کہ "حالات زیادہ سنگین صورت اختیار کرتے جارہے ہیں......" ذہن و فکر کے اضطراب و سراسیمگی کا پتہ دیتا ہے۔ آخر سوچا کیا جارہا ہے؟ خداوندانِ حکومت کے ارادے کیا ہیں؟

حالات کیوں سنگین ہوتے جارہے ہیں؟ کیا پبلک اس کی ذمہ دار ہے، خدانخواستہ پاکستان میں کوئی جماعت قانون شکنی کر رہی ہے، کہیں ستیا گرہ ہو رہی ہے۔ ہڑتالیں جاری ہیں۔ اگر ان باتوں میں سے ایک بات بھی نہیں ہو رہی ہے۔ تو پھر اس سنگینئ حالات کی ذمہ دار خود صاحب اقتدار کی باہمی کشمکش ہے! کرسیاں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اور اس کا خمیازہ بیچارے عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ رسہ کشی اُوپر والوں میں ہوتی ہے۔ اور بیچارہ پاکستان اس کی پیٹ میں آجاتا ہے! ہم اس حقیقت پر خدا کو گواہ کر کے کہتے ہیں کہ جب تک منصب و اقتدار کی کرسیوں پر مفاد پرستوں کا قبضہ ہے پاکستان کے نظم و نسق کی کشتی اسی طرح ڈانواڈول رہے گی۔ یہاں انتشار اور سنگینئ حالات کا خطرہ دکھا کر "اصلاح حال" کے نام پر اسی طرح کے انقلابات آتے رہیں گے۔ یہاں اتنے بہت سے "نجات دہندے" ابھر ابھر کر منظر عام پر آئیں گے جن کی تعلیوں کے شور میں عوام رفتہ رفتہ "نجات" اور "تباہی" کے درمیان فرق کرنا ہی بھول جائیں گے!

"لوگ حکومت پر اعتماد بحال رکھیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں حکومت
سے اُن کا اعتماد ہٹ جائے۔ اگر لوگ موجودہ مشکلات کو اعتماد و سکون کیساتھ
برداشت کر گئے تو کامیابی سے ہمکنار رہیں گے......"

"حکومت اور عوام کے اعتماد" کا نام لے کر مسٹر سہروردی نے ایسی بحث کو چھیڑ دیا ہے۔ جس پر کھل کر گفتگو کی جائے

تو یہ داستان بہت طولانی ہو جائے گی۔ اور شاید بات اس چھیڑ چھاڑ تک پہنچ جائے۔ کہ ع

زلفیں دراز ہیں کہ شب غم دراز ہے!

لیکن جب ذکر نکل آیا ہے تو کچھ اشارات حاضر ہیں:۔

خواجہ ناظم الدین کی وزارت پر جن خرابیوں کے پیش نظر مسٹر سہروردی عوام کے اعتماد مجروح ہو جانے کا الزام لگایا کرتے تھے۔ کیا وہ خرابیاں دُور ہو گئیں؟ موجودہ حکومت کے ان کارناموں کو بھی بتایا جائے۔ جن کے نہ ہونے کے سبب خواجہ صاحب کی وزارت سے عوام جو بیزار ہو گئے تھے تو اب وہ تشویش کامل اعتماد و عقیدت سے بدل گئی! دلائل و شواہد سے یا تو ہماری غلط فہمی دُور فرما دیجئے یا پھر اپنی خوش فہمی کا علاج کیجئے"!

"وقتی طور پر شاید ہمیں ایسی کارروائیاں بھی کرنی پڑیں جو عوام کی توقعات کے منافی ہوں۔ اس لئے ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ لوگ ہم سے بد ظن ہو جائیں۔ مگر میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ لوگوں نے صبر و تحمل اور قوت برداشت سے کام لیا تو تمام آرزوئیں پوری ہو جائیں گی"۔

ہم اس بات کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ پاکستان میں آخر وہ کون سے ایسے خطرناک مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کے سبب مسٹر سہروردی اور اُن کے ساتھی وزراء کو ایسی کارروائیاں کرنی پڑیں گی کہ جو عوام کی توقعات کے منافی بھی ہو سکتی ہیں اور لوگ اُن سے بد ظن بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسا قدم کیوں نہیں اٹھایا جاتا کہ جو عوام کی توقع کے منافی نہیں بلکہ عین مطابق ہو۔ اور لوگ بدظن ہونے کی بجائے حکومت سے خوش گمان ہو جائیں۔ پاکستان کے عوام کی قوت برداشت اور صبر و تحمل کو آخر کب تک آزمایا جائے گا۔ یہ مشق ناز کب تک جاری رہے گی؟

سندھ چیف کورٹ نے کسی کی جاگیرداری اور زمینداری کے مقدمہ کا فیصلہ نہیں سنایا۔ یہ اُس حکومت کے ایک آئینی مسئلہ کا فیصلہ ہے جو سو فیصدی عوام کی حکومت ہے۔ تو جو کوئی بھی جاگیرداروں اور زمینداروں کی موروثی جائداد اور ذاتی ملکیت کے باہمی تنازعہ کی سطح پر آکر اس فیصلہ کو سوچتا ہے۔ وہ اپنے وقار و ظرف کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیتا!

وزیر اعظم پاکستان مسٹر محمد علی نے سندھ چیف کورٹ کے فیصلہ کے بعد اپنے بیانات میں بعض ایسی باتیں کہی ہیں۔ جو اطمینان دلانے والی ہیں اور جن میں جذباتیت کی جگہ واقعیت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ مگر وزیر اعظم بہادر کے بارے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اُن کے ارشادات اور وعدوں کے خلاف بعض باتیں ظہور میں آئی ہیں۔ اور اپنے وعدوں کے مخالف اقدام کا خود انہوں نے ساتھ دیا ہے۔ اور حیرت تو اس پر ہے کہ ہر وضع اور ڈیزائن کی مشین میں وہ اپنے کو فٹ کس طرح کر لیتے ہیں!

اختلاف!

پاکستانی سیاست کی خرابی کا یہ ایک ہی رُخ نہیں ہے۔ جس رُخ پر بھی نظر ڈالئے ایک عالم دگرگوں نظر آتا ہے! اب سے چند ہفتہ قبل مسٹر شہید سہروردی کے خلاف کراچی کی دیواروں پر ایسے دشنام آمیز اشتہارات نظر آئے تھے کہ اگر یہ اشتہارات کسی دوسری جماعت یا فرد کی طرف سے شائع ہوتے تو نہ جانے کتنے تعزیری "ایکٹ" بیک وقت جنبش میں آجاتے۔ مگر اس پر حکومت نے نوٹس تک نہیں لیا اور خاموشی کے ساتھ بزرگانہ انداز میں شفقت آمیز فہمائش فرمادی ہو تو ہم اس سے بے خبر ہیں۔ اس کے بعد "اخوان" کے نام سے ایک

پارٹی وجود میں آتی ہے۔ اس پارٹی میں بعض وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سہروردی صاحب کے مخالف پوسٹ سے متعلق ہیں۔ یہ پارٹی (Pakistan Brother hood) مسٹر اسکندر مرزا کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتی ہے!

ان واقعات کو ذہن میں رکھ کر اس پہلو پر بھی غور کیجئے کہ مسٹر محمد علی وزیر اعظم جب ڈھاکہ تشریف لے جاتے ہیں تو عوامی لیگ کے کونسلر وزیر اعظم پر افتراق و جانب داری کا الزام لگاتے ہیں۔ اور یہ وہ عوامی لیگ ہے جس کے سربراہ کار مسٹر شہید سہروردی ہیں اور جن کی ہدایت و سرپرستی سے عوامی لیگ بے نیاز ہو ہی نہیں سکتی! پھر یہ بھی دیکھئے کہ پنجاب میں مسٹر فیروز خاں نون نے اُس مسلم لیگ میں جان ڈالنے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کردی ہے۔ جو مسٹر سہروردی کے ارشاد کے مطابق مر کر دفن بھی ہو چکی ہے!

یہ جو آپس میں چوٹیں چل رہی ہیں۔ تو اسے کیا محض تفنن طبع یا خوش فعلی سمجھ کر دل کو فریب دے لیا جائے! اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جن کے دل اور زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں وہ پاکستان کے اتحاد و وحدت کے پُرجوش مبلغ ہیں۔ "ون یونٹ" کی تعمیر و تشکیل کا بیڑا انہوں نے اٹھایا ہے۔ جو خود نہ جانے کتنے "یونٹوں" میں بٹے ہوئے ہیں! اس حریفانہ کشمکش کا آخر انجام کیا ہوگا؟

آپ اپنے گھر ہی میں سپاسنامے قبول کر کے اور قیمتی موٹروں پر پاکستانی جھنڈا لہرا کر خوش ہو لیجئے اور اپنی عزت و توقیر کی پتنگیں اڑاتے رہیئے۔ مگر پاکستان کے سیاسی حالات نے پاکستان کی ساکھ کو بیرونی دنیا میں جو صدمہ پہنچایا ہے اُس نے پاکستان کے ہمدردوں اور غمخواروں کے دلوں میں زخم ڈال دیئے ہیں!

جام و سنداں باختن

پاکستان کی زمام اقتدار "ملاؤں" کے ہاتھ میں تو ایک دن کے لئے بھی نہیں رہی۔ یہاں کا اقتدار "مسٹروں" اور "روشن خیال صاحب لوگوں" ہی کے ہاتھوں میں رہا ہے! اگر قدرت کو منظور ہوا اور "ملاؤں" کے قبضہ میں کبھی یہاں کی حکومت آ گئی۔ تو ملاؤں کی دیانت، فراست اور اخلاص و قابلیت کا اُس وقت پتہ چلے گا۔ ابھی تو پاکستانی عوام کو "مسٹروں" کا تجربہ ہوا ہے اور بہت تلخ تجربہ ہوا ہے!

ان پاکستانی "مسٹروں" کو ہر طرح آزمانے کے بعد پاکستانی عوام یورپ کے تمدن و تہذیب، مغربی طرز حکومت اور سیاسی شعبدہ گری سے اگر پناہ مانگتے ہیں تو اُن کی اس بیزاری کو جاہلیت اور قدامت پرستی کے طعنے دے کر حقیقت کو تو نہیں اُلٹا جا سکتا!

"ملا ازم" کیا ہے؟ یہ تجربہ بتائے گا۔ مگر "مسٹر ازم" کیا ہے؟ اسے تجربہ نے بتا دیا۔ اس مکتبۂ فکر و خیال کے کارنامے منظر عام پر آ گئے۔ اس کے وعدے بھی دیکھ لئے۔ اور اس کی کوششیں بھی دیکھ لیں۔ یہ بھی معلوم ہو چکا کہ مغرب زدہ تفکر میں "مفاد پرستی" اور "اخلاص" کا تناسب کیا ہے! اس کی نرمی کا بھی تجربہ کر لیا۔ اور اس کی گرمی اور برہم مزاجی بھی دیکھ لی۔ آزمائے ہوئے کو آپ آزماتے رہیئے "ندامت" کے سوا اور کچھ حاصل ہو نہیں سکتا!!

یہ جو پاکستان کے "بڑے لوگوں" کو انتشار و اضطراب کے خواب نظر آتے رہتے ہیں۔ اُن کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو حقیقتِ حال ظاہر ہو سکتی ہے! یہ حضرات اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اور پاکستان کی اکثریت "اسلام" کے سوا اور کسی نظریہ اور اصول کو زندگی کے کسی شعبہ میں پسند نہیں کرتی۔ قرار داد

مقاصد نے عوام کی ان تمناؤں کی سرکاری اور آئینی طور پر توثیق و تصدیق کر دی ہے کہ پاکستان کے دستور، آئین، تہذیب و تمدن اور فکر و عمل کی بنیاد "کتاب و سنت" ہی ہے — اور رہے گی!

پاکستان کا اسلامی حکومت بنانا ان "بڑے لوگوں" کو پسند نہیں ہے۔ ہم اُن کی نیت پر شبہ نہیں کرتے۔ وہ نیک نیتی کے ساتھ ہی پاکستان کے حق میں یہی مفید سمجھتے ہیں کہ اسے سیکولر اسٹیٹ بنا دیا جائے۔ مگر جب وہ اپنے اس فکر و عزم اور پاکستانی عوام کے ایمان و یقین اور اسلامی رجحانات کا مقابلہ کرتے ہیں تو انھیں یہ نظر آتا ہے کہ اُن کے عزائم کی راہ میں بڑی دشواریاں حائل ہوں گی اور یہی عزائم و افکار کا اختلاف اور "خواص" و "عوام" کے زاویہ ہائے فکر و نظر کا تضاد اُن کے ذہن میں "انتشار" و "اضطراب" کی خیالی صورت اختیار کر لیتا ہے!

ان عزائم کی راہ سے دشواریاں دُور کرنے کے لئے ایک مہم بھی باقاعدہ طور پر جاری ہے۔ رسالہ "طلوعِ اسلام" مسلسل "احادیثِ رسُول" کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔ اور "پاکستان اسٹینڈرڈ" نے تو "حدیث" و "سنت" کے اس ہلکے سے پردے کو بھی اُٹھا دیا۔ اُس کے ایڈیٹر نے کھُل کر "سنّتِ رسُول" ہی پر وار کر دیا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے دو ستونوں (کتاب و سنّت) میں سے ایک ستون (سنّتِ رسُول) کو پہلے گرا لیں تو دوسرا ستون آپ ہی آپ منہدم ہو جائے گا۔ جب دلوں میں سنّتِ رسُول ہی سے کد۔ نفرت اور بیزاری پیدا ہو گئی (خدا ایسا نہ کرے) تو "کتاب اللہ" کی عظمت آپ ہی آپ مجروح ہو جائے گی! خدا کو تو ہندو، سکھ، عیسائی اور یہودی بھی مانتے ہیں۔ حضرت خاتم النبیین سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت و اتباع کے اقرار کے بغیر مجرد "اقرارِ خدا" کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے:

پاکستان کی تہذیب کو مغرب زدہ بنانے کی مہم دوسری طرف چل رہی ہے۔ مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط، سرکاری دعوتوں میں عورتوں کے حُسن و جمال کے مظاہرے۔ آرٹ کے نام پر ناچ گانے کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی۔ پبلک کو لہو و لعب میں اُلجھا دینا...... غرض پاکستانی معاشرے کو مغرب زدہ بنانے کی کوشش خاصی سرگرمی کے ساتھ جاری ہے —!

پاکستانی عوام کے سامنے یقیناً بڑی سخت منزل اور نازک مقام ہے۔ ایک طرف دینی اور لادینی نظریوں کا تصادم ہے۔ اور دوسری طرف پاکستان کو ہر طرح کے انتشار و اضطراب سے بچانا ہے۔ عوام کی فراست اور عزم و یقین کی استقامت کا کمال یہ ہے کہ ضبط و آئین کے تقاضوں کی اہمیت کو پہچانتے ہوئے وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جائیں اور کسی طاقت سے مرعوب نہ ہوں۔ یہ "جام و سنداں باختن" کا نازک مقام ہے۔ اس مقام کے بعد ہی وہ منزل آئے گی۔ جہاں اللہ کا دین ہی غالب قوت ہو گا۔ اور پاکستان کا قافلہ "کتاب و سنت" کے سایہ میں گامزن ہو گا —!

ماہر القادری

۲۲ فروری ۱۹۵۱ء

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ چیزیں لکھنا بھی چاہتے تھے!

اللہ کے بندوں کا طریقہ ہے۔

لے یہ تمام تفصیل بخاری باب مرض النبیؐ سے ماخوذ ہے۔

عن رسول اللہ - (اعلام الموقعین جلد اول ص

سے ثابت ہے، وہ سنتوں کو چھوڑنا پڑے

اصول سیاست کو اپنا مقصد

سمجھے!

میں کیا حیثیت تھی

... حق ہے۔

الحمد للہ الذی جعل فینا من یحفظ عن نبینا !

آپ نے جواب دیا۔

... سے روایت کر کے بتاؤں گا ؟

قرآن کی ہدایت نہیں ملتی وہاں وہ حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ [illegible]

"میری مثال ان ساتھیوں کی سی ہے جو ایک ساتھ [illegible] منزل کی [illegible]

اگر میں بھی ان کے نقش قدم پر چلوں گا تو منزل مقصود تک میری رسائی ہوگی [illegible]

سعید کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ میرے [illegible]

[illegible]

[illegible] حضرت عمرؓ [illegible]

[illegible] حضرت عمرؓ نے [illegible]

آنحضرتؐ کا [illegible] معلوم ہے؟ [illegible]

[illegible] حضرت عمرؓ نے مجھ سے [illegible] حضرت محمد بن مسلمہ نے [illegible]

(بخاری جلد ۲ مطبوعہ مصر [illegible])

ان دو [illegible] حدیث رسولؐ

سے خلاف فیصلہ صادر فرماتے تھے [illegible] ہر کام میں آنحضرتؐ کی ہدایت کی تلاش و جستجو فرماتے۔ شیخین کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی

وجہ سے [illegible] حضرت عثمانؓ سے بیعت [illegible]

نبایعک علی کتاب اللہ وسنۃ رسولہ وسنۃ الشیخین من بعدہ

(ہم تمہارے ہاتھ پر اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے طریقہ پر بیعت کرتے ہیں)

حضرت عثمانؓ کا بھی [illegible] یہی رویہ تھا۔ اس کے متعلق بہت سی احادیث و تاریخ کی کتابوں میں بے شمار واقعات ملتے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ حدیث رسولؐ کے ہوتے ہوئے کسی اور طرف نظر نہیں دوڑاتے تھے۔ چنانچہ ہم اس ضمن میں یہاں دو واقعات پیش کرتے ہیں:

حضرت عثمانؓ کے روبرو یہ مسئلہ پیش ہوا کہ بیوہ عورت سوگ کی مدت اپنے شوہر کے گھر گزارے گی یا جہاں چاہے چلی جائے گی۔ تو آپ نے فریعہ بنت مالک بن سنان سے دریافت کیا کہ آنحضرتؐ نے تمہیں کیا حکم دیا تھا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور ہی کے گھر میں مدت گزارنے کا حکم ملا تھا۔ تو آپ نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ (ابو داؤد)

حضرت عثمانؓ نے ایک مرتبہ حج کے موقع پر اعلان کیا کہ موسم حج میں صرف حج ہی کیا جائے۔ تمتع نہ کیا جائے۔ حضرت علیؓ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ تم آنحضرتؐ کی سنت کے خلاف لوگوں کو فتویٰ دے رہے ہو۔ حضرت عثمانؓ نے یہ سن کر کہا کہ میں نے اس معاملہ میں اپنی ایک رائے دی تھی۔ اگر سنت میں تمتع کی اجازت ہو تو ہر شخص تمتع کرسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے اس سال تمتع ہی کیا تھا۔

حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کا دور خلافت آتا ہے۔ حضرت علیؓ نے بھی اپنے زمانۂ خلافت میں انہی اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ جن اصولوں پر شیخین کے دور میں نظم سلطنت قائم تھا۔ جس طرح حضرت ابوبکر و عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ کو سب سے مقدم رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت علیؓ بھی کتاب اللہ کے بعد اللہ کے رسول کی سنت ہی کو اپنے لئے مشعل راہ بناتے تھے۔

حضرت علیؓ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ آپ خطبہ میں یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ :-

"خداوندا! جس طرح تُو نے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی ٹھیک ٹھیک ہدایت کی، اسی طرح میری بھی حق کی طرف رہنمائی کر۔ ان نیک خلفاء سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

یہ سن کر حضرت علیؓ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور فرمایا :-

هم حبیبای ابوبکر وعمرؓ اماما الهدی وشیخا الاسلام ورجلا قریش المقتدی بهما بعد رسول الله من اقتدی بهما عصم ومن اتبع آثارهما هدی الی صراط مستقیم ومن تمسک بهما فهو من حزب الله۔ (تاریخ الخلفاء ص۱۳۱)

وہ میرے محبوب ہدایت کے امام اور اسلام کی بڑی شخصیتیں قریش کے دو شخص ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں آنحضرتؐ کے بعد جن کی اتباع لازمی ہے جو شخص ان کے راستہ کی اتباع کرے گا وہ راہ راست پائے گا اور جو شخص ان کے طریقہ پر جما رہے گا وہ حزب اللہ میں شامل رہے گا۔

حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ فرمایا۔ اگر دین عقل و رائے ہی پر منحصر ہوتا تو موزوں کے نیچے مسح کیا جاتا۔ لیکن آنحضرتؐ نے موزوں کے اوپر مسح کیا ہے۔ اس لئے ہمیں بھی موزوں کے اوپر ہی مسح کرنا چاہئے۔ (ابوداؤد)

فی الجملہ آنحضرتؐ کے بعد خلفائے راشدین کا حدیث کے بارے میں کیا رویہ تھا۔ سے امام بخاری کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے :-

وکانت الائمة بعد النبیؐ یستشیرون الامناء من اهل العلم فی الامور المباحة لیاخذوا باسهلها فاذا وضح الکتاب والسنة لم یتعدوه الی غیره اقتداء بالنبیؐ ورای ابوبکر قتال من منع الزکوة فقال عمرؓ کیف تقاتل وقد قال رسول الله امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا اله الا الله فاذا قالوا لا اله الا الله عصموا منی دماءهم واموالهم الا بحقها فقال ابوبکرؓ والله لاقاتلن من فرق بین ما جمع رسول الله ثم تابعه عمر فلم یلتفت ابوبکر الی مشورة اذ کان عنده حکم رسول الله فی الذین فرقوا بین الصلوة والزکوة وارادوا تبدیل الدین واحکامه وقال النبیؐ من بدل دینه فاقتلوه (بخاری جلد ۴ مطبوعہ مصر ص۱۹۳)

آنحضرتؐ کے بعد خلفاء اپنے امین لوگوں سے مباح چیزوں میں مشورہ کر لیا کرتے تھے تاکہ مناسب چیز اختیار کر سکیں جب اللہ کی کتاب یا رسول اللہ کی سنت واضح طور پر مل جاتی تو کسی اور چیز کی طرف نظر نہیں اٹھاتے تھے تاکہ آنحضرتؐ کے حکم کی پوری پوری اتباع ہو۔ حضرت ابوبکرؓ مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی مخالفت کی اور کہا کہ مانعین زکوٰۃ سے قتال نہیں کر سکتے کیونکہ نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ مجھے لا الٰہ الا اللہ کے کہنے تک جہاد کا حکم دیا گیا ہے جب وہ لا الٰہ کا اقرار کر لیں تو ان کی جان و مال محفوظ ہیں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا قسم خدا کی جو شخص بھی آنحضرتؐ کی جمع کردہ دو چیزوں میں تفریق ڈالے گا میں اس سے جہاد کروں گا حضرت ابوبکرؓ کے پاس جب آنحضرتؐ کا صحیح حکم موجود تھا تو آپ نے کسی مشورہ کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کی حضورؐ نے فرمایا جس نے اپنے دین کو بدلا اسے قتل کر دو۔

خبر آحاد پر عمل

اوپر کے بعض واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صحابہ خبر واحد پر عمل نہیں کرتے تھے۔ مثلاً حضرت مغیرہؓ سے حضرت عمرؓ نے ان کی روایت پر تائید طلب کی تھی اور ایسے ہی حضرت ابوبکرؓ نے بھی

اُن سے تائید طلب کی تھی - اسی قسم کے اور بھی کچھ واقعات، احادیث و تاریخ سے ثابت ہوتے ہیں - جن سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ بعض اوقات راوی سے اس کی روایت کی تائید میں ایک دوسرے شخص کی شہادت مانگتے تھے - ان چند واقعات سے اہل قرآن حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ خلفائے راشدین صحابہ کی روایات پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور کبھی وہ خبر واحد پر عمل نہیں کرتے تھے - حالانکہ ہم نے خود اس مقالہ میں بہت سارے ایسے واقعات پیش کئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کے پاس ایک شخص کی روایت قابلِ قبول بلکہ واجب العمل تھی - حضرت ابوبکرؓ تنہا سقیفۂ بنو ساعدہ میں "الامراء من قریش" کی روایت پیش کرتے ہیں اور تمام صحابہ بے چون وچرا قبول کر لیتے ہیں - حج کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کی روایت پر حضرت عثمانؓ اپنے خیال سے رجوع کر لیتے ہیں -

جن واقعات سے بظاہر خبر واحد کی تردید کا گمان ہوتا ہے - اگر ان کے متعلق ہم اہل قرآن کے خیال کی ہمنوائی کریں تو ہمیں صحابہ کو متہم بالکذب ماننا پڑے گا - اس لئے ہم چند ایسے واقعات پیش کریں گے جن سے صاف طور پر واضح ہو جائیگا کہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں خبر واحد پر عمل ہوتا تھا -

(۱) حضرت عمرؓ ایک مرتبہ شام کے ارادہ سے نکلے - جب مقام سرغ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ملک شام میں اس وقت طاعون عام ہو گیا ہے - آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو صحابہ مختلف الرائے ہو گئے - اتنے میں حضرت عبدالرحمن بن عوف نے خبر دی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "اگر کسی ملک میں وبا پھیلی ہوئی ہو تو تمہیں وہاں نہ جانا چاہیئے - البتہ جہاں ہو وہیں وبا پیدا ہو جائے تو وہاں سے بھاگ نہیں جانا چاہیئے" - یہ سُن کر صحابہ کے تمام اختلافات ختم ہو گئے اور حضرت عمرؓ لشکر کے ساتھ مدینہ پہنچ گئے -

(۲) فارس کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا اہل فارس سے جزیہ لیا جا سکتا ہے یا نہیں - کیونکہ اس بارے میں قرآن میں کوئی صریح ہدایت نہیں ملتی - آپ نے صحابہ سے دریافت کیا کہ آنحضرتؐ نے اس کے بارے میں کوئی ہدایت دی ہے؟ عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا کہ آنحضرتؐ نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے - اس ہدایت کے معلوم ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے اہل فارس سے بھی جزیہ لینا شروع کر دیا -

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت سعدؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ آنحضرتؐ نے موزوں پر مسح کیا ہے - میں نے اس کے متعلق حضرت عمرؓ سے تصدیق کرنی چاہی تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ جب سعدؓ کوئی حدیث روایت کریں تو اس کے متعلق کسی دوسرے سے دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں - (بخاری)

اس حدیث کی شرح میں امام شوکانی حافظ ابن حجر کا بیان نقل کرتے ہیں :-

فیہ دلیل علی ان الصفات الموجبۃ للترجیح اذا اجتمعت فی الراوی کانت من جملۃ القرائن التی اذا حفت خبر الواحد قامت مقام الاشخاص المتعددۃ . . . . وعلی ان عمر کان یقبل خبر الواحد وما نقل عنہ من التوقف انما کان عند وقوع ریبۃ لہ فی بعض المواضع (نیل الاوطار جلد اول ص ۲۲۵)

اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جب راوی میں ترجیح کے اسباب جمع ہو جائیں تو اس کی خبر واحد بھی متعدد اشخاص کی روایت کے قائم مقام ہو جاتی ہے . . . . نیز اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ حضرت عمرؓ خبر واحد کو قبول کرتے تھے - جن روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ خبر واحد سُن کر توقف فرماتے تھے تو وہ کسی شک کی وجہ سے ہوتا تھا !

اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ سے خبرِ واحد کے قبول کرنے میں توقف ثابت ہے۔ وہ کسی عارضی سبب کے باعث تھا۔ [illegible] چند [illegible] واقعات سے یہ کلیہ ہرگز نہیں قائم کر سکتے کہ صحابہ کے دور میں خبرِ واحد پر عمل ہوتا ہی نہیں تھا۔

شیخ محمد خضری لکھتے ہیں:

[illegible] عملوا بخبر الواحد في وقائع لا تحصى [illegible] [illegible] [illegible] اجماعهم على وجوب العمل [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] عن عمر يقول وقد سمع هذا لقضينا بغيره وكانوا يرجعون الى امهات المؤمنين في كثير من الحوادث ليعلموا ما كان رسول الله يفعل فاذا علموه لم يتجاوزوه وعلى ذلك جرت سنة التابعين من بعدهم فثبت ان ذلك مجمع عليه من السلف وانما الخلاف حدث بعدهم۔

(اصول الفقہ ص۲۳۵)

صحابہ کے بے شمار واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خبرِ واحد پر عمل کیا کرتے تھے اور مجموعی طور پر ان تمام واقعات سے ثابت ہو سکتا ہے کہ صحابہ کے نزدیک خبرِ واحد پر عمل کرنا واجب تھا۔ بہت سارے معاملات میں وہ آنحضرتؐ کی حدیث کی وجہ سے اپنے اجتہاد سے رجوع کر لیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ اگر یہ حدیث ہمیں معلوم نہ ہوتی تو ہم اس کے خلاف فیصلہ کرتے [illegible] امہات المومنین کی طرف بہت سارے مسائل میں رجوع کیا کرتے تھے تاکہ ان مسائل میں آنحضرتؐ کا عمل معلوم ہو سکے۔ جب انھیں اس کا پتہ لگ جاتا تو کسی دوسری جانب تجاوز نہیں کرتے اور اسی طریقہ پر تابعین کا بھی عمل تھا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ خبرِ واحد کی حجیت پر صحابہ و تابعین متفق ہو چکے تھے اور جو کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ بعد کے زمانے کا پیدا کردہ ہے!

امام بخاری نے خبرِ واحد کی حجیت پر ایک مستقل باب باندھا ہے:

باب ما جاء في اجازة خبر الواحد الصدوق في الاذان والصلاة والصوم والفرائض والاحكام وقول الله فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون ويسمى الرجل طائفة لقوله تعالى وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فلو اقتتل رجلان دخلا في معنى الآية وكيف بعث النبيؐ امراءه واحدا بعد واحد فان سها احد منهم رد الى السنة۔

(بخاری جلد ۴ مطبوعہ مصر ص[illegible])

باب اس بات کے بیان میں کہ تنہا صادق شخص کی خبر حجت ہے اذان، نماز، روزے اور دوسرے تمام فرائض اور احکام کے سلسلہ میں۔ اللہ کا فرمان ہے کیوں نہ ہر گروہ میں ایک ایسی جماعت ہو جو دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرے، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس پہنچے تو انھیں ڈرائیں اور ایک آدمی کو بھی "طائفہ" کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب مومنوں کی دو جماعتیں لڑیں۔ اگر صرف دو ہی آدمی لڑیں تو بھی اس آیت کے حکم میں شامل ہو جائیں گے۔ آنحضرتؐ نے اپنے امراء و حکام کو یکے بعد دیگرے بھیجا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی کوئی بات بھول جاتا تو سنت کی طرف رجوع کرتا۔

ہم نے خبرِ واحد کی حجیت پر تفصیلی کلام اس لئے کیا ہے کیونکہ اہلِ قرآن چند منتشر واقعات سے متبعین حدیث پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ دورِ صحابہ میں خبرِ واحد پر عمل نہیں ہوا کرتا تھا۔ اور آج بیشتر احکامِ شرعیہ کا دارومدار اخبارِ آحاد ہی ہیں!

اب اپنے ہمدردوں و ثقات روایات کا جائزہ لیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام خصوصاً خلفائے راشدین روایت حدیث سے منع کیا کرتے تھے۔ احادیث کے نسخوں کو جلا دیتے تھے۔ راویان حدیث کو قید و بند کی سزا دیتے تھے۔ یہ روایات [illegible]

اس قسم کی روایت پر تبصرہ کرنے سے قبل ہم ایک نہایت حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں [illegible] سے مذکورہ [illegible] روایت سے پوری پوری تحقیق کے ساتھ [illegible] ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ صحابہ [illegible] سنت کو مقدم کیا کرتے تھے۔ [illegible] روایات کے پیش نظر [illegible] حدیث [illegible] نہیں کرتے تھے

تاریخ حدیث کی [illegible] یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ جن مواقع پر آنحضرت [illegible] کو نہیں ہوتی تھی۔ [illegible] پریشان ہوتے تھے [illegible] کہ ہم نے [illegible] میں آنحضرت سے تفصیل نہیں طلب کی۔

حضرت ابوبکر افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ کاش میں آنحضرت سے ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کر لیتا:-

پہلی یہ کہ آنحضرت کے بعد خلافت کا بار کون سنبھالے گا۔

دوسرے یہ کیا انصار کو خلافت کا حق ہے۔

تیسری چیز بھتیجی اور پھوپھی کی میراث سے متعلق ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ میں مجھے کچھ خلش باقی ہے۔ [illegible]

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مسئلہ ربوا قرآن میں سب سے آخر میں نازل ہوا [illegible] آنحضرت نے اس کے متعلق زیادہ تفصیلات نہیں بتائیں۔ اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سود کو اور جس میں سود کا شبہ ہو اسے بھی چھوڑ دینا چاہیئے۔

اس مقام پر اس قسم کے تمام واقعات کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ صحابہ کرام آنحضرت کے قول و عمل کو کس طرح اپنے لئے مشعل راہ بناتے تھے۔ اور جہاں کہیں وہ اس ہدایت کو نہ پاتے، افسوس کرتے کہ کیوں ہم نے تفصیلی معلومات اس سلسلہ میں نہیں حاصل کیں!

حضرت عمر ایک مرتبہ اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:-

"لوگو! تمہارے روبرو اللہ کے بتائے ہوئے احکام اور اس کے رسول کی سنت موجود ہے۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ اگر تم دائیں بائیں ہو جاؤ گے تو راہ راست سے ہٹ جاؤ گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ آنحضرت نے رجم کیا اور ہم بھی رجم کرتے ہیں آج کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ رجم کا حکم ہم کتاب اللہ میں نہیں پا رہے ہیں اس لئے اس پر عمل نہیں کر سکتے۔" (کتاب الاعتصام شاطبی جلد اول ص ۸۹)

جو لوگ آنحضرت کی ہدایت کو محفوظ نہیں رکھتے تھے، اور احکام شرعیہ میں من مانی تاویل و توضیح کیا کرتے تھے حضرت عمر نے ان پر سخت تنقید کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

ایاکم و اصحاب الرأی فانہم اعداء السنن اعیتہم الاحادیث ان یحفظوھا فقالوا بالرأی فضلوا واضلوا۔	تم اصحاب رائے سے بچے رہو کیونکہ وہ سنت کے دشمن ہیں۔ حدیث کے حفظ سے وہ عاجز ہیں اس لئے انہوں نے اپنی رائے سے فیصلہ دینا شروع کر دیا۔ تاکہ اس طرح خود بھی گمراہ ہوں اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں۔

امام ابن قیمؒ حضرت عمرؓ سے اس کے ہم معنی اور بہت ساری روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

وسانید هذه الآثار عن عمرؓ فی غایة الصحة (اعلام الموقعین جلد اول ص۳۴)

"حضرت عمرؓ اس قسم کی روایات کی سند میں صد درجہ مستند ہیں"

ایک طرف تو تاریخ وحدیث کے یہ مستند بیانات اور دوسری طرف وہ ضعیف روایات جو بعض ایسی کتابوں میں پائی جاتی ہیں جن کے مصنفین نے صحت کا التزام کئے بغیر رطب ویابس کو جمع کردیا ہے اور آج اہل قرآن ان ہی ضعیف روایات کو نمک مرچ لگا کر بڑے آب وتاب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اگر درایت بھی کوئی چیز ہے جسے فن تاریخ میں خصوصی اہمیت حاصل ہے تو ہم ان تمام بیانات کی بآسانی تغلیط کرسکتے ہیں۔ جو اس "تواتر مجموعی" کے خلاف منقول ہوئی ہیں۔ جسے احادیث وتاریخ کا ذخیرہ پیش کرتا ہے!

اگر آدمی واقعات کا اس دور کی مجموعی فضا اور ماحول سے قطع نظر مطالعہ کرنے لگے اس زمانے کے حالات اور اجتماعی فکر سے صرف نظر کرکے حالات کا جائزہ لینے لگے اور مسلسل ومتواتر بیانات کو پس پشت ڈال کر صرف ضعیف راویوں کے بیانات پر اعتماد کرنے لگے تو تاریخ کے اہم سے اہم واقعہ کا بھی انکار کرسکتا ہے

کیا ابراہیم۔ موسیٰ۔ اور محمد کے وجود گرامی۔ زرتشت۔ کنفیوشس۔ بدھ۔ رام چندر جیسی شخصیات۔ سکندر۔ سولین۔ نپولین۔ ہٹلر جیسی ہستیوں کا علم بلکہ اذعان ہمیں تواتر کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے حاصل ہوا ہے۔ کیا آج ہم ان تمام بیانات کی بآسانی تردید نہیں کردیتے ہیں۔ جو اس تواتر کے علی الرغم پیش کئے جاتے ہیں۔

لیکن ہم اس مقام پر روایت سے قطع نظر خالص تاریخی نقطۂ نظر سے بھی ایسی چند روایات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جن پر کہ اہل قرآن کے سارے علم وفن کا مدار ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا روایت حدیث سے منع کرنا

حضرت ابوبکرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں کو جمع کرکے خطبہ دیا کہ آج تم احادیث کی روایت وبیان میں آپس میں مختلف ہو۔ تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اور بھی زیادہ اختلافات میں مبتلا ہوجائیں گے۔ لہذا آنحضرت سے کوئی حدیث نہ بیان کرو۔ اگر تم سے کوئی حدیث کے متعلق سوال کرے تو صرف ایک ہی جواب دے دو کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے۔ اس میں جو کچھ حلال ہے اسے ہم حلال سمجھتے ہیں۔ اور جو حرام ہے اسے حرام سمجھتے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۳)

اہل قرآن (منکرین حدیث) حضرات اس روایت کیلئے کر شور مچاتے ہیں کہ جب صدیق اکبرؓ کے زمانے ہی میں احادیث ناقابل اعتبار تھیں تو آج چودہ صدی گزرنے کے بعد کس طرح قابل اعتماد قرار پاگئیں! اور جب حضرت ابوبکرؓ نے روایت حدیث سے منع کردیا تو تم کون ہو جو روایات کو ہمارے سر تھپتے ہو۔ لیکن خود اس روایت کا حال یہ ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے جن پر اس روایت کا دارومدار ہے ۱۱۷ھ میں وفات پائی ہے اور حافظ ذہبی کا سن وفات ہے ۷۴۸ھ۔ حافظ ذہبی نے یہ نہیں بتایا کہ ان تک یہ روایت کس طرح پہنچی ہے؟

علاوہ ازیں یہ روایت ابن ابی ملیکہ سے حضرت ابوبکرؓ تک بھی مرفوع نہیں ہے۔ بلکہ خود حافظ ذہبی کے بیان کے مطابق مرسل ہے۔ یعنی سلسلۂ سند کی درمیانی کڑیاں منقطع ہیں!

چونکہ یہ روایت حضرت ابوبکرؓ کے سلسلہ کی مستند تاریخ کے خلاف پڑتی تھی۔ اس لئے حافظ ذہبی نے پریشان ہو کر ایک نوٹ دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"فھذا المرسل یدلک ان مراد الصدیق التثبت فی الاخبار والتحری لا سد باب الروایۃ"

اس کے بعد وہ دوسری کچھ ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے حضرت ابوبکرؓ کا حدیث پر عمل کرنا ثابت ہوتا ہے:-

حضرت ابوبکرؓ کا احادیث جلادینا

حافظ ذہبی نے تذکرہ جلد اول صفحہ ۵ پر امام حاکم کی سند سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے پانسو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ تیار ہونے کے بعد رات بھر بے چین رہے اور کافی غور و خوض کے بعد ناقابل اعتبار پا کر جلادیا"

نقل روایت کے سلسلہ میں امام حاکم کا تساہل مشہور و معروف ہے۔ اس روایت میں بھی ان کا یہی تساہل شریک کار ہے۔ سلسلۂ سند میں ایک راوی محمد بن موسیٰ البربری واقع ہے۔ جس کے بارے میں امام دارقطنی لکھتے ہیں۔ "لیس بثقۃ" یعنی وہ قابل اعتماد شخص نہیں ہے۔ (میزان الاعتدال)

یہ ہے اس روایت کی حقیقت جس کے بل بوتے پر اہل قرآن واویلا مچاتے ہیں کہ جب صدیق اکبرؓ کا جمع کردہ صحیفہ ہی قابل اعتماد نہ ہو تو دو سو سال بعد امام بخاری و مسلم کی تیار کردہ کتابیں کس طرح قابل اعتماد ہوگئیں!

حضرت عمرؓ کا روایت حدیث سے منع کرنا

شعبی قرظہ بنت کعب سے روایت کرتے ہیں۔ قرظہ نے کہا کہ جب ہمیں حضرت عمرؓ نے عراق بھیجا تو ہمارے ساتھ مشایعت کرتے ہوئے کچھ دور چلے اور کہا کہ آج میں تمہیں ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ تم ایسے لوگوں کے پاس جارہے ہو جنہیں قرآن کے ساتھ خاص شغف ہے۔ احادیث بیان کرکے قرآن سے ان کی توجہ نہ پھیر دینا۔ لہٰذا روایت کم کرو۔ قرآن کو پھیلاؤ۔ (تذکرہ جلد اول ص۷)

یہ روایت چند در چند وجوہ سے مجروح ہے:-

(۱) سلسلۂ سند کے آخری راوی شعبی ہیں جو بالاتفاق دوسری صدی کے ہیں۔ اور جیسے کہ پہلے بھی بتایا جاچکا ہے۔ حافظ ذہبی آٹھویں صدی کے ہیں۔ ذہبی نے اس روایت میں سلسلۂ سند نہیں بیان کیا ہے۔

(۲) شعبی نے اس بات کی تصریح نہیں کی کہ آیا انہوں نے قرظہ سے سنا بھی ہے یا نہیں۔ اور مورخین نے ثابت کردیا ہے کہ قرظہ سے شعبی کی ملاقات نہیں ہے۔ کیونکہ قرظہ کا انتقال اس زمانے میں ہوا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ عراق کے گورنر تھے اور باتفاق مغیرہ کا انتقال ۵۰ھ میں ہوا ہے۔ اس وقت شعبی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ لہٰذا ملاقات اور روایات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ اگر بعض دوسرے محققین کی بات تسلیم کرلی جائے کہ قرظہ کا انتقال حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ہوا ہے تو اس وقت شاید شعبی پیدا بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔ (توجیہ النظر ص۱)

(۳) اگر ہم ان تمام اسقام سے قطع نظر صرف الفاظ پر غور کرتے بھی ہیں تو یہ روایت بہت زیادہ مجروح معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے قرظہ کو تو روایت کے کم کرنے کا حکم دیا ہے اور خود حضرت عمرؓ سے پانسو سے زیادہ احادیث مروی ہیں!

حضرت ابن مسعودؓ کا قید کیا جانا

سب سے زیادہ حیرتناک وہ روایت ہے اور جس کے بار بار دہرانے میں اہل قرآن کو خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ "حضرت عمرؓ نے بکثرت احادیث روایت کرنے کے جرم میں عبداللہ بن مسعود۔ ابوالدرداء۔ ابومسعود انصاری کو قید کردیا تھا" (تذکرہ ص۷ جلد اول)

اس روایت میں فنی اور معنوی چند در چند اسقام پائے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر حدیث کا احتیاط کے ساتھ بیان کرنا کارِ ثواب ہے تو جس قدر اس کی توسیع و اشاعت میں حصہ لیا جائے گا۔ موجب خیر و برکت ہوگا۔ اگر روایت کا بیان کرنا موجبِ شر ہے تو کثرت و قلت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ شر کو بالکلیہ روک دینا چاہیئے۔

علاوہ ازیں ان تینوں بزرگوں میں صرف عبداللہ بن مسعود کثیر الروایت شخص ہیں۔ باقی ابو الدرداءؓ اور ابو مسعود انصاریؓ مقلین روایت میں سے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا۔ اگر کثرتِ روایت ہی جرم ہے تو اس جرم کی سزا سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو ملنی چاہیئے!

روایت میں ایک ایسے شخص کے قید کی خبر دی گئی ہے۔ جن کا روایت حدیث کے سلسلہ میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ "روایت کرتے ہوئے ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ کانپنے لگتے تھے" اگر ایسا محتاط شخص بھی روایت حدیث کا ناقل قرار پائے تو پھر ثقاہت شاید آسمان ہی سے اتریں گے!

حضرت عبداللہ بن مسعود کا علمی پایہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ جب انہیں دیکھتے تو بے اختیار کہہ اٹھتے کہ "علم سے بھرا ہوا ایک برتن ہے" (تذکرہ ص۱۴)

اور خود حضرت عمرؓ مسائل شرعیہ میں ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ شعبی کہتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ، عبداللہ بن مسعود اور ابن ثابت مسائل میں ایک دوسرے کی طرف مراجعت کیا کرتے تھے" (اعلام الموقعین جلد اول ص۱۲)

حضرت عمرؓ نے جب انہیں کوفہ کے لئے معلم مقرر کیا۔ تو اہلِ کوفہ کے نام لکھا:-

وقد آثرتکم بعبد اللہ بن مسعود علی نفسی (تذکرہ جلد اول ص۱۳)

"میں نے عبداللہ بن مسعود کو اپنی ذات پر ترجیح دی ہے"

اگر آپ کی وجہ سے لوگ گمراہ ہو سکتے تھے اور آپ کو روایت حدیث کا سلیقہ نہیں تھا تو حضرت عمرؓ نے کیسے آپ کو معلم بنا کر بھیجا اور ان شاندار الفاظ میں ان کی تعریف کی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ خوب جانتے تھے کہ یہ وہ شخص ہے جسے آنحضرتؐ کے دربار سے علمی سند عطا ہو چکی تھی۔

ان تمام پہلوؤں سے قطع نظر اگر ہم صرف سندِ روایت پر غور کریں تو بھی ہمیں مایوسی ہوتی ہے!

سلسلۂ سند میں روایت کا مدار سعید بن ابراہیم پر ہے۔ جن کے بارے میں خود حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔ "سعید لا یدری" سعید مجہول، مجہول الحال شخص ہے۔ (میزان الاعتدال جلد اول ص۳۷۵)

اس روایت کی آخری کڑی منقطع ہوتی ہے۔ معن بن عیسیٰ القزاز پر جس کا سال وفات ۱۹۸ھ ہے (تہذیب جلد ۱۰ ص۲۵۲)

اور اگر ہم معن بن عیسیٰ البجلی بھی تسلیم کر لیں۔ تو بھی اس کی عمر اتنی طویل نہیں ہو سکتی کہ آٹھویں صدی میں وہ حافظ ذہبی سے روایت کرنے لگے!

علاوہ ازیں ابن حزم نے لکھا ہے کہ یہ حدیث شعبہ سے مشکوک ہے۔ یعنی محدثین کے نزدیک شعبہ کی یہ روایت قابل اعتماد نہیں ہے۔ سافی یہ بھی لکھتے ہیں:-

ثم ہو فی نفسہ ظاہر الکذب والتولید

یعنی یہ روایت بداہۃً طور پر جھوٹی اور جعلی معلوم ہوتی ہے۔ (توجیہ النظر ص۱۸)

حضرت ابوہریرہؓ کا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں روایت حدیث سے اجتناب

جس طرح بعض بعض صحابہ بعض بعض خصوصیات میں ممتاز تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کا صدق۔ حضرت عمرؓ کا جوش ایمان اور قوت تدبر۔ حضرت علیؓ کی قضاء۔ ابن مسعودؓ کی فقہ۔ ابی ابن کعبؓ کی تفسیر۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ تمام صحابہ میں علم حدیث میں زیادہ شہرت رکھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسا متبع سنت اور آنحضرتؐ کے اقوال و افعال پر وسیع نظر رکھنے والا شخص آپ کے بارے میں کہتا ہے:۔

ان کان الزمنا لرسول اللہ واعلمنا بحدیثہ

یعنی حضرت ابوہریرہؓ ہم میں سب سے زیادہ آنحضرتؐ کی صحبت میں رہتے تھے اور ہم میں سب سے زیادہ حدیث کا علم رکھتے تھے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

"ابوھریرۃ احفظ من روی الحدیث ....." ابوہریرہ صحابہ میں سب سے زیادہ حدیث کے جاننے والے ہیں۔

جس وقت آپ مشرف باسلام ہوئے اس وقت آپ کی عمر تیس سال کی تھی۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جبکہ آدمی میں پختگی کمال۔ واقعات کی تحقیق و تدقیق احکام کی علل و توجیہات پانے کی کامل استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے تقریباً چار سال آنحضرتؐ کی معیت میں شب و روز بسر کئے۔

اس عاشق حدیث نے اپنے اس ذوق و شوق کو دور رسالت ہی تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اکابر صحابہ میں سے بہتیرے صحابہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ جن میں حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ۔ ابی ابن کعبؓ۔ اسامہ بن زیدؓ۔ فضل بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ جیسے اساطین علم حدیث شامل ہیں۔ بلکہ مدینہ کے حالات و واقعات سے آگاہ ہونے کے لئے ایک ایک صحابی سے تحقیق و تدقیق کا سلسلہ جاری رکھا (اصابہ ج ۴ ص ۲۰۹)

حفظ حدیث کا یہ عالم اور احتیاط کی یہ کیفیت تھی کہ جب کبھی حدیث سناتے پہلے اس وعید کو دہرا لیتے۔ جو حضورؐ نے جھوٹی حدیث کہنے پر سنائی ہے۔ (اصابہ ج جلد ص ۲۰۹) اور بعض اوقات قیامت کے احوال و واقعات بیان کرتے ہوئے آپ پر غشی طاری ہو جاتی تھی (ترمذی)

ایک طرف آپ اس سب سے بڑے راوی حدیث کے متعلق ان مستند حالات کو پیش نظر رکھئے اور دوسری طرف حافظ ذہبی کے نقل کردہ اس اثر کو سامنے لایئے۔ جس میں خود حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:۔

لو کنت احدث فی زمان عمر مثل ما احدثکم لضربنی بمخفقتہ ۔ (تذکرہ ج اول ص)

"جس طرح میں تم سے حدیثیں بیان کرتا ہوں اس طرح اگر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیان کرتا تو وہ دُرّے سے مارتے"

اس فقرے سے منکرین حدیث یہ مطلب اخذ کرتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) حضرت ابوہریرہؓ احادیث تراشا کیا کرتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اُن کی دال نہیں گل سکی تھی۔ اور وہ اپنی مہم میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ بعد کے ادوار میں انھیں خوب خوب مواقع فراہم ہوئے اور انہوں نے احادیث کا ایک طومار لگا دیا۔

اوّل تو اس "اثر" کو ہم مجروح سمجھتے ہیں کہ اس اثر کا آخری راوی (راوندی) غالباً تیسری صدی کا ہے۔ اور امام ذہبی آٹھویں صدی کے ہیں۔ نہ معلوم حافظ ذہبی نے یہ اثر کہاں سے لیا ہے اور اس کا پورا سلسلۂ سند کیا ہے؟

پھر اس "اثر" پر ہم درایت کی رُو سے نگاہ کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ یہ بات کہہ کر خود اپنے سر

دیک تہمت لے رہے ہیں کہ انہوں نے (معاذ اللہ) احادیث تراشی کے کام کو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شروع کر دیا تھا۔ مگر
حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے خوف سے اس وقت یہ مہم نہ چلائی جا سکی۔ مگر ان کی شہادت کے بعد حالات کو سازگار پا کر یہ کام
بڑی شد و مد سے کیا۔ کیا ایک صحابیٔ رسولؐ سے ہم اس گھٹیا قسم کے کردار کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ (خاک بدہن گستاخ)

منکرینِ حدیث یہ تو ثابت کریں کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے جو احادیث مروی ہیں وہ دوسرے لوگوں نے غلط طور پر ان سے
منسوب کر دی ہیں، اور اگر یہ بات وہ ثابت نہیں کر سکتے تو پھر کوئی صاحبِ عقل اور اہلِ ایمان اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی صحابی اپنی طرف سے گھڑ کر اتنی بہت سی احادیث حضورؐ کی طرف منسوب کرے! یہ بات
جو حضورؐ کی تربیت اور فیضِ صحبت پر حرف لاتی ہے!

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ

اسی طرح منکرینِ حدیث صحابہ کرام میں حضرت عبد اللہؓ بن عباس کو سب سے زیادہ موردِ طعن
تشنیع ٹھہراتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ ایک ایسا شخص جس کی عمر آنحضرتؐ
کے انتقال کے وقت تیرہ سال سے زائد نہ ہو (تذکرہ جلد اول ص۲۵) وہ آنحضرتؐ کی سینکڑوں حدیثیں بیان کرنے لگتا ہے اور
حدیث میں امامت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ ایک کمسن لڑکا جو گفتگو کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ واقعات و حالات کی سراغرسانی
نہیں کر سکتا۔ تحقیق و تنقید کی صلاحیت سے خالی۔ غور و فکر سے نا آشنا۔ کس طرح احادیث کو ضبط کر سکتا تھا اور ان کی
حکمتوں اور باریکیوں سے آگاہی پا سکتا تھا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرتؐ کے وصال کے وقت حضرت عبد اللہؓ بن عباس کمسن تھے۔ لیکن یہ سوال ایسا ہی سوال
ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ امام بخاری نے تین سو سال بعد کس طرح ہزارہا احادیث سے واقفیت حاصل کر لی؟ کسی فن میں مہارت
حاصل کرنا آدمی کی کد و کاوش اور فطری صلاحیتوں پر منحصر ہے!

جب کوئی صحابی کوئی حدیث بیان کرتا ہے تو عموماً یہی تصور لوگوں کے ذہنوں پر حاوی ہوتا ہے کہ اس نے آنحضرتؐ
سے براہ راست سنا ہوگا۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کتنے ہی صحابہ ایسے ہیں جنہوں نے صغر سنی یا اور بہت سے دیگر
وجوہ کے باعث آفتابِ رسالت سے براہ راست اکتساب نہیں کیا۔ بلکہ درسگاہ نبوی کے فیض یافتہ بزرگوں سے حقائق
معارف کی دولت حاصل کی۔

مشہور راوی حدیث حضرت انسؓ فرماتے ہیں:۔

ما کل ما حدثناہ سمعناہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی ہر وہ چیز جسے ہم نے بیان کیا ہے ضروری نہیں کہ آنحضرتؐ ہی سے سنی ہو۔ بلکہ ہم آپس میں بھی ایک دوسرے سے روایت کیا کرتے تھے!
یہی حال عبد اللہؓ بن عباس کا بھی ہے۔ آپ نے کتاب و سنت کا علم آنحضرتؐ سے زیادہ صحابہ سے حاصل کیا۔ حضرت عبد اللہؓ
بن عباس کے مشہور شاگرد معمر کا قول ہے۔ ابن عباس کے علم کا بیشتر حصہ عمرؓ، علیؓ اور ابی ابن کعبؓ سے ماخوذ ہے (اعلام الموقعین
جلد اول) اور واقعات معمر کے اس قول کی تائید کرتے ہیں کیونکہ حضرت عمرؓ آپ کو ہمیشہ اپنی مجالس علمیہ میں جگہ دیتے تھے۔ اکابر
صحابہ کے دوش بدوش آپ کو بٹھاتے تھے۔ اسی طرح حضرت علیؓ کے ساتھ آپ مدتوں رہے۔ احادیث پر غور کرنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے قضایا اور روایات پر آپ کو کافی عبور حاصل تھا۔ ایک مرتبہ بعض لوگوں نے جعلی احادیث
ایک مجموعہ حضرت علیؓ سے انتساب کر کے آپ کے روبرو پیش کیا تو آپ نے اس کی تردید کر دی اور کہا کہ حضرت علیؓ کی احادیث

اور فیصلے ہو ہی نہیں سکتے۔ (مقدمہ مسلم)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے صرف ان ہی تین بزرگوں سے علم حاصل نہیں کیا۔ بلکہ ہر اُس صحابی سے اخذِ حدیث کی جس کے متعلق انھیں علم ہوتا کہ وہ اللہ کے رسول کا کوئی قول جانتا ہے۔ (اصابہ ج ۲ ص ۳۳۲)

ایک انصاری فرماتے ہیں، جب آنحضرتؐ کا وصال ہوا تو عبداللہ نے مجھ سے کہا کہ چلو ہم ذخیرۂ احادیث کو جمع کریں، اور ایک ایک صحابی سے اس علم کو حاصل کریں۔ میں نے اس وقت عبداللہ کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن زمانے نے ثابت کر دیا کہ عبداللہ اپنی رائے میں صائب تھے اور وہ علم میں بہت بڑے عالم بن گئے۔ (اصابہ ج ۲ ص ۳۳۳)

ایک طرف علم حدیث کی تلاش و جستجو کا یہ عالم، اور دوسری طرف حافظہ کی یہ کیفیت کہ عمر بن ابی ربیعہ کے ستر شعر کا ایک قصیدہ ایک ہی مرتبہ سن کر دوبارہ سنا دیا۔ جب لوگوں نے حیرت و استعجاب کیا تو فرمایا "او سمع شیئاً احد ولا یحفظہ" کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی ایک مرتبہ ایک بات سنے اور اُسے یاد نہ رکھے۔ اگر ایسا شخص چند سو احادیث روایت کرتا ہے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے!

اصابہ جلد ۲ ص ۳۳۲ کی ایک روایت سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض مخصوص صحابہ کی روایات کو آپ قلم بند بھی کر لیا کرتے تھے۔ آپ ابورافع صحابی کے پاس جاتے اور ان سے مختلف حالات و واقعات کے متعلق دریافت کرتے اور آپ کا کاتب انھیں نوٹ کیا کرتا تھا۔

یہ تو اخذ روایت اور حفظ روایت کا حال ہوا۔ ساتھ ہی تفقہ کا یہ حال تھا کہ اکابر صحابہ آپ کی فقاہت کے قائل تھے۔ مشہور تابعی طاؤس فرماتے ہیں کہ میں نے ستر صحابہ کو دیکھا۔ جو جب کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے تو ابن عباسؓ کے قول کو لیتے تھے (اصابہ جلد ۲ ص ۳۳۲) حضرت زید بن ثابتؓ کا جب انتقال ہوا تو حضرت ابوہریرہؓ فرمانے لگے کہ اس امت کا ماہر علم وصال کر گیا۔ شاید اس کی جگہ ابن عباسؓ ہی کے ذریعہ پُر ہو گی۔ (اصابہ)

آپ کا شمار اُن صحابہ میں ہوتا ہے جو علم شریعت کے ساتھ روحِ شریعت سے بھی کامل آگہی رکھتے تھے۔

ایک آدمی احادیث کا حافظ ہو۔ بلکہ اس کے پاس تحریری سرمایہ بھی ہے اور ساتھ ہی وہ فقیہ بھی ہو تو روایت حدیث کا اس سے بڑھ کر کسے حق پہنچتا ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کثرتِ روایت کی ایک دوسری بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ کا انتقال ۶۸ھ میں ہوا۔ اس طرح آنحضرتؐ کے بعد آپ ۵۸ سال اس دارِ فانی میں رہے۔ اس طرح اگر آپ ہفتہ میں ایک حدیث بھی بیان کرتے رہے تو ان مرویات کی تعداد پوری ہو جاتی ہے۔ جو آج اُن کی نسبت کتب حدیث میں پائی جاتی ہے!

دورِ صحابہ میں حفاظتِ حدیث کا سامان

صحابہ کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ روئے زمین پر اُن سے زیادہ خدا ترس۔ تقویٰ شعار۔ اور خشیتِ الٰہی رکھنے والا گروہ آج تک وجود میں نہیں آیا۔ اللہ کے خوف سے شب و روز اُن کے دل کانپتے رہتے تھے۔ انہوں نے آخرت کی خاطر دنیا کو ٹھوکر ماری۔ بڑے سے بڑے دنیوی مفاد کو رضائے الٰہی کے لئے قربان کیا۔ کیا ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دیدہ و دانستہ اللہ کے رسول پر جھوٹ بول سکتے ہیں۔ اگر اس پاکیزہ جماعت کے متعلق ہمارا یہی تصور ہو تو ہم کس طرح یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید ہمارے پاس من و عن محفوظ ہے۔ کیونکہ قرآن بھی تو اُن ہی کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے۔ یہ صحابہ کے کردار کی

ایسی بھیانک تصویر ہے جسے ایک مسلمان تو کیا ایک غیر مسلم بھی قبول نہیں کر سکتا۔

اگر آپ غیر جانبداری سے صحابہ کے حالات کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نازک ترین مواقع پر بھی انہوں نے آنحضرتؐ کی جانب غلط حدیث منسوب نہیں کی اور دنیا کی کوئی دولت بھی انھیں اس فعل پر آمادہ نہیں کر سکی!

حضرت علیؓ کے دور خلافت میں جبکہ خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا تھا اور حضرت علیؓ ایک فریق کی حیثیت سے اس میں حصہ لے رہے تھے تو لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے حق بجانب ہونے پر آنحضرتؐ نے کوئی حدیث سنائی تھی۔ یا یہ جو کچھ ہو رہا ہے آپ کے اجتہاد پر مبنی ہے؟

حضرت علیؓ نے جواب دیا "میں نے سب سے پہلے آنحضرتؐ کی تصدیق کی۔ کیا اب میں آنحضرتؐ پر افترا بازی میں بھی سبقت لے جاؤں؟ آنحضرتؐ نے میری خلافت کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں پہلے ہی دن حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت کرتا۔" (تاریخ الخلفاء)

غور کیجئے یہ کیسا نازک موقع تھا۔ اگر حضرت علیؓ ایک جھوٹی حدیث آنحضرتؐ کی طرف منسوب کر دیتے۔ تو راستے عام ان کے لئے کس قدر ہموار ہو سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ صحابہ کی خود احتیاط اور جھوٹی حدیث سنانے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وعید "من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار" (جو شخص میری جانب جھوٹی بات منسوب کرے وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنالے) ان چیزوں نے روایات میں احتیاط و صداقت کی روح بھر دی!

یہ حدیث صحابہ کے زمانے میں خوب پھیلی ہوئی تھی۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے اس کے طرق روایت کو جمع کیا تو صرف صحابہ میں اس کے دو سو راوی پائے گئے۔ (مقدمہ مسلم)

اسی وعید کی وجہ سے عبد اللہ بن مسعودؓ جب حدیث سناتے تو کانپ اٹھتے۔ حضرت ابوہریرہؓ حدیث سنانے سے پہلے اس وعید کا تصور ذہن میں تازہ کر لیتے۔ عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت حدیث میں احتیاط کی یہ کیفیت تھی کہ ایک لفظ کی زیادتی اور کمی کو روا نہیں رکھتے تھے۔

حضرت عبد اللہؓ نے اپنے والد محترم حضرت زبیرؓ سے دریافت کیا کہ آپ کیوں احادیث بہت کم روایت کرتے ہیں؟ تو جواب دیا "گو کہ مجھے آنحضرتؐ کی صحبت میں رہنے کا بہت کچھ شرف حاصل ہے۔ لیکن کذب حدیث پر جو وعید سنائی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے میرا دل کانپتا ہے!

صحابہ کی احتیاط اور آنحضرتؐ کی دل ہلا دینے والی وعید کے ساتھ روایت حدیث کے معاملہ میں خلفائے راشدین نے جو احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔ اس وجہ سے اس دور میں احادیث میں کسی قسم کی ترمیم و تبدیلی نہیں ہو سکی اور کسی بد باطن کو دراندازی کا کوئی موقع نہیں ملا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں احادیث اپنے اصل خدوخال کے ساتھ پائی جاتی تھیں خصوصیت سے حضرت عمرؓ کی سختی نے لوگوں کو اور بھی پابند کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت معاویہ فرماتے ہیں:-

علیکم من الحدیث بما کان فی عہد عمر فانہ کان قد اخاف الناس فی الحدیث عن رسول اللہ۔ (تذکرہ جلد اول ص۲)	جو احادیث حضرت عمرؓ کے زمانے میں ثابت شدہ ہیں انھیں تھامے رہو۔ کیونکہ انہوں نے احادیث کے بارے میں لوگوں کو محتاط بنا دیا تھا!

شیخ محمد خضری لکھتے ہیں :-

ان ائمۃ المسلمین وقادتھم فی ذالک العھد انما کانوا یشیرون بتقلیل الروایۃ خشیۃ ان ینتشر الکذب والخطأ عن رسول اللہ ولذالک کانوا یتثبتون فیما یروی لھم فلم یکن ابوبکر وعمر یقبلان من الاحادیث الا ما شھد اثنان انھما سمعاہ من رسول اللہ حتی طلب ابوبکر من یقوی المغیرۃ بن شعبۃ فی روایۃ وطلب عمر من یقوی المغیرۃ وابا موسی وابیا وھما ھما فی الثقۃ بھم لرفعۃ مقامھم وعلو کعبھم وکان علی یستحلف الراوی واذا تثبتوا واطمانوا عملوا بمقتضی ما یروی لھم عن رسول اللہ ولم یخالفوہ۔

(تاریخ التشریع الاسلامی ص۱۱۱)

صحابہ کے دور میں مسلمانوں کے امام و رہنما روایت کے کم کرنے کا حکم دیتے تھے تا کہ روایت میں کذب اور غلطی راہ نہ پائے۔ اسی وجہ سے جب کبھی ان کے پاس روایت پہنچاتی تو اس کا ثبوت فراہم کرنے کی سعی کرتے۔ ابوبکرؓ و عمرؓ ان ہی روایات کو قبول کرتے تھے جن کے متعلق دو شخص گواہی دیتے کہ انہوں نے ان روایات کو سُنا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مغیرہ سے شہادت طلب کی اور حضرت عمرؓ نے مغیرہ۔ ابو موسیٰ اور ابیؓ سے شہادت مانگی۔ حالانکہ یہ لوگ ثقہ تھے اور قابل اعتماد۔ حضرت علیؓ راوی سے قسم لیا کرتے تھے جب روایت کی تحقیق کر لیتے اور مطمئن ہو جاتے تو آنحضرتؐ کی حدیث کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔

◆ ◆ ◆

کتابتِ حدیث کے عام نہ ہونے کے اسباب

اس مقام پر ایک اہم سوال بار بار ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب آنحضرتؐ کی احادیث کی دین میں اتنی سخت اہمیت تھی اور اُن کی حفاظت کی صحابہ نے اس قدر جد و جہد کی تو کیوں نہ انہوں نے احادیث کو ضبط تحریر میں لے لیا؟ اس کی تین وجہیں ہو سکتی ہیں :-

۱- حفظ کو کمال کا ہم معنی سمجھنا۔ کسی دَور کے حالات و واقعات پر تبصرہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس دَور کی مجموعی فضا کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ صحابہ اور مابعد کے ادوار میں بھی کتابت حدیث کو کمال کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ اگر یہ حقیقت سامنے رہے تو ان تمام واقعات کی بآسانی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ بعض تابعین نے صحیفوں کو جلا دیا۔ یا احادیث لکھی ہوئی تختیوں کو دھو دیا۔ یا کتابتِ حدیث سے منع کیا۔

واقعات سے ہمیں یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ قرآن کی کتابت کو بھی اس دَور میں لکھنا کچھ ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مشہور تابعی علقمہ سے مسروق نے کہا کہ مجھے قرآن کی چند سورتیں لکھا دیجئے۔ تو علقمہ نے جواب دیا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے اسلاف کتابت کو ناپسند کیا کرتے تھے ؟

۲- عربوں کا اپنے حافظہ پر اعتماد۔ اہلِ عرب اپنی قوتِ حافظہ کے لحاظ سے بہت مشہور ہیں۔ صد ہا قصائد اُن کی نوکِ زبان رہتے تھے۔ شعراء کے کلام کے مجموعے اور دواوین شعر حافظہ ہی میں محفوظ رہتے تھے۔ پشتہا پشت تک نسب یاد رکھنا ان کی خصوصیت تھی۔ حتیٰ کہ گھوڑوں کے نسب نامے تک انہیں ازبر ہوتے تھے۔

شعبی کہتے ہیں کہ میں نے شعر کی روایت بہت کم کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر میں چاہوں تو ایک ماہ مسلسل اشعار سُناتا رہوں اور کوئی شعر مکرر نہ آئے۔

اصمعی قبل بلوغ ہی بارہ ہزار شعر حفظ کر چکا تھا۔

امام زہری کہتے ہیں کہ جب میں بازار سے گزرتا تو کانوں میں روئی رکھ لیتا تاکہ کوئی ناجائز بات میرے کانوں میں نہ پڑے۔ کیونکہ جو کوئی بات میرے کانوں میں پڑ جاتی پھر میرے ذہن سے نہیں نکلتی۔

یہ بھی ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب آدمی اپنی کسی خاص قوت کو فروغ دینا چاہے تو اسے معراج کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ حدیث کے معاملہ میں راویان حدیث کا یہی حال ہوا۔ وہ اپنی قوت حافظہ کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا چاہتے تھے۔ اُن کی جدوجہد کا بیشتر حصہ احادیث کے حفظ ہی پر صرف ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ صحابہ احادیث کو محض ایک فن کی حیثیت سے یاد رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ وہ احادیث کو ایک ایسے برگزیدہ شخص کے اقوال و افعال سمجھتے تھے جو اُن کے نزدیک سند الٰہی تھا۔ جس کے ہر قول کو وہ سرچشمۂ ہدایت اور ہر فعل کو نور بصیرت سمجھتے تھے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ امانت ہیں جنہیں بلا کم و کاست دوسروں تک پہنچانا ہے۔

روایات کے حفظ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز گفتگو کو بھی خاص دخل ہے۔ اگر کوئی شخص فی سیکنڈ ایک درجن جملے کہنے کی فکر کرے تو ظاہر ہے کہ اس کے الفاظ کو یاد رکھنا دشوار ہوگا۔ اس کے برعکس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز گفتگو کے بارے میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں "انی تعلم بعلمۃ اعادھا ثلثہ" (بخاری کتاب العلم) یعنی جب آپ گفتگو کرتے تو ہر کلمہ کو تین تین مرتبہ دُہراتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عائشہؓ سے خطاب کرکے کچھ کہہ رہے تھے۔ اور وہ نماز میں مصروف تھیں، جب نماز سے فارغ ہوئیں تو فرمایا "ابوہریرہؓ کس قدر تیزی سے گفتگو کرتے ہیں"۔ حالانکہ آنحضرتؐ کی گفتگو کا یہ حال ہوتا کہ اگر کوئی آپ کے کلمات شمار کرنا چاہتا تو شمار کر لیتا۔ (مسلم ص [illegible] جلد ۲)

۳۔ قرآن سے اختلاط کا اندیشہ۔ تیسرا سبب جس کی وجہ سے احادیث قلمبند نہیں کی گئیں۔ یہ ہے کہ صحابہ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ احادیث قرآن کے ساتھ خلط ملط ہو جائیں گی۔ مسلم کی حدیث "لا تکتبوا عنی غیر القرآن" کو محدثین نے اسی اندیشہ پر محمول کیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں احادیث کو جمع کرنے کا خیال کیا اور صحابہ سے مشورہ کیا تو صحابہ نے اس خیال کی تائید کی۔ لیکن خود حضرت عمرؓ کی رائے بعد میں بدل گئی۔ جسے انہوں نے ان الفاظ میں ظاہر کیا:-

انی کنت ارید ان اکتب السنن وانی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتابا فاکبوا علیھا وترکوا کتاب اللہ وانی واللہ لا اشوب کتاب اللہ بشیئ ابدا
(جامع بیان العلم جلد اول ص [illegible])

میں نے احادیث کی کتابت کا خیال کیا تھا۔ لیکن میں نے اگلی قوموں کا خیال کیا۔ جنہوں نے کتابیں لکھ لیں اور اسی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور اللہ کی کتاب کو نظر انداز کر دیا قسم بخدا میں اللہ کی کتاب کو کسی چیز کے ساتھ خلط ملط نہیں کر سکتا۔

اگر صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیث حجت نہ ہوتی تو سرے سے یہ بحث ہی نہ چھڑتی کہ احادیث آیا قلمبند کی جائیں یا نہیں۔ کیونکہ وہ صاف کہہ دیتے کہ جب حدیث ہمارے لئے بے سود اور لایعنی چیز ہے تو اس کی حفاظت میں کیوں سر کھپایا جائے۔ لیکن اس کے برعکس اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ حجت حدیث کے قائل تھے لیکن اسے ضبط تحریر میں لانے کے لئے کچھ اور چیزیں مانع ہو رہی تھیں۔ وہ کیا اندیشہ تھا جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ احادیث کو قید تحریر میں نہیں

لائے ؟ وہ یہ کہ قرآن کے نزول پر صرف دو چار سال کا عرصہ گزرا ہے - اس کی سیاہی ابھی تک خشک نہیں ہوئی ہے - قرآن کے اطراف و اکناف عالم میں پھیلانے کا کوئی موزوں انتظام نہیں ہو سکا ہے - ایسے حالات میں اگر حدیث کی کتابت کا بھی ایک عام اجتماعی کام شروع کر دیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ کلام اللہ اور کلام الرسول ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جاتے - تفسیر و تشریح کے نام سے ایک، ایک چیز کتاب اللہ کے اندر شامل ہو جاتی!

حضرت عمرؓ کی آنکھوں کے روبرو گزشتہ اقوام کی امت، توریت و انجیل کے نمونے موجود تھے کہ کس طرح بزرگوں کی تشریحات لوگوں کے اقوال مفسرین کی تفسیریں اصل کتاب اللہ میں شامل ہوتی چلی گئیں اور بالآخر کتاب اللہ میں تحریف ہوئی کہ اصل و نقل میں تمیز ناممکن ہو گئی!

اس دور میں تحریر کا فن اس قدر عام نہیں تھا جس قدر آج عام ہے - اور نہ وسائل نشر و اشاعت کی وہ آسانیاں فراہم تھیں جو آج پائی جاتی ہیں - کہ احادیث و قرآن میں کامل امتیاز کر لیا جاتا - اسی وجہ سے صحابہ کرام میں دو گروہ پیدا ہو گئے ایک وہ گروہ جو کتابت حدیث کو ناپسند کرتا تھا - دوسرا وہ گروہ جو کتابت حدیث کو مفید سمجھتا تھا اور اس پر عمل کرتا تھا - چنانچہ حضرت عمرؓ - عبداللہ بن مسعود - زید بن ثابت - ابو موسیٰ - ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم اور دوسرے چند صحابہ پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں - اور دوسرے گروہ میں حضرت علیؓ - حسنؓ - انسؓ - عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم اور کچھ اور صحابہ پائے جاتے ہیں - (مقدمہ ابن صلاح ص)

لیکن بعد کے ادوار میں جب یہ موانع رفع ہو گئے تو امت نے حدیث کی کتابت پر اجماع کر لیا چنانچہ ابن صلاح لکھتے ہیں:-

ثم انہ زال ذالک الخلاف واجمع المسلمون علی تسویغ ذالک واباحتہ - (ص)

بعد میں یہ اختلاف رفع ہو گیا اور امت نے کتابت حدیث کے جواز پر اجماع کر لیا۔

امام نودی، قاضی عیاض کا قول نقل کرتے ہیں:-

کان بین السلف من الصحابہ والتابعین اختلاف کثیر فی کتابۃ العلم فکرھھا کثیرون منھم واجازھا اکثرھم ثم اجمع المسلمون علی جوازھا وزال ذالک الخلاف -

حدیث کی کتابت کے بارے میں صحابہ و تابعین کے درمیان اختلاف پایا جاتا تھا - بہتیرے اصحاب نے اسے ناپسند کیا اور بہت سے لوگوں نے جائز قرار دیا - پھر زمانہ مابعد میں کتابت حدیث پر مسلمانوں کا اتفاق ہو گیا اور یہ اختلاف جاتا رہا -

(صحیح مسلم جلد ثانی ص ۳۲۴ مطبوعہ ہند)

یہ وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے دور صحابہ میں حدیث کی کتابت عام نہ ہو سکی - کچھ لوگ لکھ لیا کرتے تھے اور کچھ لوگ زبانی روایت کیا کرتے تھے - کتابت حدیث کے بارے میں اختلاف کو اہل قرآن حجیت حدیث کا اختلاف بلکہ انکار حدیث کے مترادف سمجھتے ہیں - تو یہ صحابہ کرام پر سراسر اتہام ہے اور یہ حقیقت کی بالکل غلط اور گمراہ کن تاویل ہے!

ملّا واحدی

اس قسم کے واقعات آپ نے متعدد بار دیکھے یا سنے ہوں گے کہ انسان کے بچّے کو جانور لے گیا۔ وہ بچّہ جانوروں میں رہتا رہا۔ اور انسان کی بجائے جانور بن گیا!

پچھلے ہی دنوں بھارت سے خبر آئی تھی کہ گیارہ بارہ برس کا ایسا بچّہ لکھنؤ کے قریب ہاتھ لگا ہے جو چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا ہے کچّا گوشت بہ رغبت کھاتا ہے اور پکّے گوشت سے گھبراتا ہے!

جانوروں میں جتنی عقل ہوتی ہے، جانوروں میں نشو و نما پانے والے انسان اُس سے بھی خالی رہ جاتے ہیں۔ جانوروں کو پیدا ہوتے ہی عقل ملا کرتی ہے۔ پھر وہ بڑھتی نہیں۔ انسان کو ماحول سے عقل سیکھنی پڑتی ہے۔ ماحول اچھا میسّر آئے تو انسان انسان بن جاتا ہے، فرشتوں سے اونچا، ورنہ حیوان رہ جاتا ہے، بلکہ حیوان سے بدتر!

جس طرح انسانی افراد کی عقل ترقی کرتی ہے۔ اسی طرح انسانی نوع کی عقل نے ترقی کی ہے۔ نوعِ انسانی نے طفلی کا دَور گزارا ہے اور چودہ سو برس سے پختگی کا دَور گزار رہی ہے!

دَورِ طفلی کے نمونے دیہاتوں میں آج تک نظر آ سکتے ہیں۔ جوانی دِوانی کی مثالیں بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ اور پختگی کا تو خیر دَور دورہ ہی ہے!

نوعِ انسان کے دَورِ جوانی کے چند حکما مشہور ہیں۔ ارسطو، افلاطون وغیرہ۔ آج ارسطو اور افلاطون جیسے خدا معلوم کتنے ہیں جو ارسطو و افلاطون کے کان کترتے ہیں!

فقط نبیوں کی شخصیت ایسی تھی، جنہیں خالقِ کائنات ماحول سے بے نیاز کر دیتا تھا۔ نبی ماحول کے رنگ میں نہیں رنگے جاتے تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں ماحول کو اپنے رنگ میں رنگنے کی طاقت عطا فرماتا تھا۔ انسانوں میں سے بعض انسانوں کو اللہ تعالیٰ اس کام کے لئے چُن لیتا تھا کہ نوعِ انسان کی تربیت کریں اور منشاء الٰہی کے مطابق ماحول کو ڈھالیں۔ اور ماحول کو ترقی دیں۔ آگے بڑھائیں۔ آج نوعِ انسان جو کچھ جانتی ہے اُس جاننے کی بنیاد نبیوں کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ ہمارے جسم کی آنکھیں سورج کی روشنی کی محتاج ہیں اور ہماری عقل کی آنکھیں بیکار رہ جائیں اگر وحی کی روشنی اُن کی رہنمائی نہ فرماتی۔[1]

---

[1] ہمارے زمانہ میں عقلیت کا بہت زور ہے۔ یہ عقلیت کہیں نہ ملتی کہ اگر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دُنیا کو وہم پرستی سے نہ نکالتا۔ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے قدیم انبیاء کی نسبت حیران کن معجزے کم اور عقل افزا معجزے زیادہ اسی لئے دیئے تھے کہ دُنیا اب عقل کا اُس طرح استعمال کرے جس طرح بلوغ کے بعد کیا جاتا ہے۔

علیٰ ہٰذا دُنیا سے ضابطے قاعدے کے اندر تعلق رکھنا بھی حضورؐ کے ذریعہ سکھایا گیا۔ ورنہ حضورؐ سے پہلے دُنیا کے معاملات میں حصّہ نہ لینا خوبی
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابتداءً ایسے نبی مبعوث ہوئے جیسے نوعِ انسان کے دورِ طفلی میں ہونے چاہیئے تھے۔ یا انہوں نے نوعِ انسان کو اس طرح سبق پڑھائے جس طرح دورِ طفلی میں پڑھانے چاہیئے تھے۔ پھر وہ نبی آئے اور وہ تعلیمی کورس لائے جو نوعِ انسان کے دورِ جوانی کے لئے موزوں و مناسب تھا[1]۔ یہ نبی دنیا کے گوشے گوشے میں آئے۔ ایک ایک وقت میں کئی کئی آئے۔ ایک ایک جگہ بہت سے آئے۔ وحیِ الٰہی نے نوعِ انسان کو پرائمری پاس کرائی۔ ہائی کلاسوں کے امتحان دلوائے۔ یہاں تک کہ کالج میں پہنچا دیا۔ ہائی کلاسوں میں پرائمری کی کتابوں کی ضرورت نہیں رہی اور کالج میں جانے کے بعد ہائی کلاسوں کی کتابیں غیر ضروری ہو گئیں۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا۔ ہم اپنے دیئے ہوئے سبقوں میں جب کسی سبق کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس کی بجائے اس سے اعلیٰ یا اسی جیسی (دوسری) آیت (سبق) لے آتے ہیں۔

(اَللّٰهُ) اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ۔ (اللہ) خوب جانتا ہے کہ کیا (کس وقت) نازل کرنا چاہیئے۔

تعلیم کی جڑ اور بنیاد ایک ہی تھی۔ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی۔ جو کچھ قرآن میں ہے وہی پہلے صحیفوں میں تھا۔ لیکن تعلیم علیٰ قدرِ عقول دی جاتی تھی۔

طالب علم بالآخر کالج کی تعلیم سے بھی فارغ ہو جاتا ہے اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اب تم میں حصولِ علم کی صلاحیت آگئی۔ اب علم کو خود بڑھاتے رہو۔ نوعِ انسان کو بھی بتدریج ایک اور صرف ایک نبی کے زیرِ ہدایت لایا گیا۔ اور بالآخر کہہ دیا:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔

(تم عاقل و بالغ ہو چکے) اب ہم نے تمہارا نظامِ حیات مکمل کر دیا[2] اور تمہیں اپنی پوری نعمت دے دی۔ (اسے سنبھالو۔ اس کی روشنی میں زندگی کا مقرر کردہ ہادی اور ہدایت نامے بھیجنے کا سلسلہ ختم ہوا۔ قرآن کے ذریعہ اللہ نے آسمان اور زمین اور آسمان و زمین کے درمیان کی ہر چیز کو سمجھنے اور برتنے کی عقل تمہیں بخش دی ہے)

دیکھا یا جاسکتا، یا خیال کیا جاتا تھا۔ حضورؐ کے ہاتھوں روحانیت اور مادیت سمو دی گئی۔ آپ نے عدل و قانون، معاشرت و معیشت، حکومت و سیاست صلح و جنگ۔ تہذیب و تمدن کسی میدان میں بھی کوئی قدم اچھا اٹھا دیکھئے۔ وہ اسلام کی تقلید ہوگا۔ تقلید کامل نہیں تقلید ناقص۔

[1] اس کے یہ معنی نہیں کہ اصول یا مقصد میں فرق تھا۔ نبیوں کی تعلیم اصول اور مقصد کے اعتبار سے ہمیشہ ایک رہی اور نبیوں نے نجات کا راستہ ہمیشہ ایک ہی بتایا۔ فرق صرف پرائمری، ہائی کلاسز اور کالج کا تھا۔ ورنہ ارشاد ہے: شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ۔ یعنی (اے محمدؐ!) اللہ نے جس راستے پر چلنے کا نوحؑ کو حکم دیا تھا وہی راستہ تمہارے واسطے مقرر کیا ہے۔ اسی کی وحی (اے محمدؐ!) ہم نے تمہیں بھیجی اور اسی کی بابت ابراہیمؑ اور موسیٰ اور عیسیٰ سے کہا کہ اس دین کو ٹھیک رکھو اور اس میں تفرقہ مت پڑنے دو۔ قرآن انہی کی ہدایت کرتا ہے جو قرآن کے ماننے کے ساتھ قرآن سے پہلے کے آسمانی صحیفوں کو بھی مانیں۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا آخری ہدایت نامہ ہے۔ یا ہدایت ناموں کا آخری ایڈیشن ہے۔ قرآن مجید میں حسب ضرورت کچھ باتیں بڑھائی ہیں اور کچھ حذف کر دی ہیں۔ لیکن اصول اور مقصد میں مطلق فرق نہیں آیا۔

[2] مولانا محمد علی مرحوم کا شعر ہے ؎ جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا ۔ تو زندگی کے لئے آخری نظام آیا۔

اب تک ایسا ہوتا رہا تھا کہ:۔
وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ۔
ہم نے (اے محمدؐ!) تم سے پہلے کوئی رسول (ایسا) نہیں بھیجا اور نہ کوئی نبی (جس کے ساتھ یہ نہ ہوا ہو کہ جب اس نے (اللہ کے حکموں) کی تلاوت کی تو شیطان نے اس کے تلاوت کردہ (احکام) میں کچھ نہ کچھ آمیزش کر دی۔ اللہ (پھر دوسرا رسول بھیجتا تھا اور وہ) شیطانی آمیزش کو نکال دیتا تھا اور اپنے احکام کو دوبارہ محکم کرتا تھا۔ لیکن اب اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ قرآن میں ردوبدل نہ ہوگا۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ یقیناً ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کریں گے (کیونکہ اب وہ نبی آگیا جو ساری دنیا کے لئے ہے۔ اور جو کچھ اس نبی کے ذریعہ پہنچایا گیا وہ مستقل طور سے نافذ العمل رہنے کے لئے ہے۔ زمین کی طنابیں عنقریب کھینچ جائیں گی اور دنیا ایک بستی کی سی صورت اختیار کر لے گی۔ لہٰذا الگ الگ پیغمبر بھیجنے کی حاجت نہیں رہی۔ اور دنیا اب عقل کی بات سنے گی اور قرآن میں عقل کی باتوں کا اتنا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے کہ اور اضافہ کی گنجائش نہیں ہے)۔ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ۔ کہو حق آگیا۔ اب باطل سر نہیں اٹھا سکتا۔ اور لوٹ کر نہیں آسکتا۔ أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي۔ میں اور میرے متبع (حق کی طرف لوگوں کو) علی وجہ بصیرت بلاتے ہیں۔ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ۔ قرآن تمام دنیا کو اُن کے بھولے ہوئے حقائق یاد دلانے والا ہے (اب آدم وحوا کے بیٹے پختہ عمر کے ہوگئے۔ اُن کے پاس دماغ ہیں۔ جن سے وہ سوچتے ہیں۔ اور اُن کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں۔ وہ بس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہ ماریں۔ آفتاب وحی کی ضیا کو اپنا رہنما بنالیں۔ فلاح یاب ہو جائیں گے۔
حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط اپنے زمانے کی دنیا کے رہنما نہیں ہیں۔ اُن کے بعد رہنما ہیں جو قیامت تک پیدا ہوں گے۔ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ۔ محمدؐ کو بعد میں پیدا ہونے والی نسل کا بھی رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور محمدؐ کا لایا ہوا نظامِ حیات قیامت تک کے دوسرے نظام ہائے حیات پر غالب رہے گا۔ خواہ دوسرے اس سے برا مانا کریں۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ اللہ وہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو (کامل) ہدایت اور (مکمل) دینِ حق دے کر بھیجا ہے۔ تاکہ اسے تمام (اگلے پچھلے) دینوں پر غالب کرے خواہ اس سے مشرکین کتنا ہی بگڑیں۔

مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ۔
محمدؐ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں (یعنی اُن کا کوئی بیٹا زندہ نہیں ہے) لیکن (اس سے اُن کی شان میں کیا کمی آسکتی ہے) وہ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اور (پیغمبر بھی کیسے) خاتم النبیین۔
ختم کے معنی ایسا بند کرنے کے ہیں جیسے لاکھ لگا کر لفافہ بند کیا کرتے ہیں۔ کہ اندر کی چیز باہر نہ آسکے اور باہر کی چیز اندر نہ جا سکے۔ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ۔ یعنی (کچھ لوگ ہیں کہ) اُن کے دلوں پر ختام کر دیا گیا ہے (کہ محمدؐ کی باتیں اُن کے دلوں کے اندر جا ہی نہیں سکتیں) انگوٹھی کو خاتم اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے عمل ختم (ختام) میں کام لیا جاتا ہے۔

خَاتَمَ النَّبِیّٖن کا مطلب ہے جس پر نبوت ختم ہوگئی۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکمل دین لے آئے اور اُسے اس طرح سربمہر کردیا گیا کہ دنیا چاہے بھی تو اس میں خس وخاشاک شامل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات، یہ اعلان، یہ دعویٰ کہ حضورؐ آخری پیغمبر ہیں بجائے خود ایک معجزانہ پیشین گوئی ہے۔ تیرہ سو چودہ سو برس گزر چکے دُنیا کے کسی گوشہ میں کوئی نبی نہیں پیدا ہوا۔ تیرہ سو چودہ سو برس کا وقفہ کبھی دو نبیوں کے درمیان نہیں رہا۔ جھوٹے نبی حضورؐ کے بعد اُٹھے بھی تو بتاشے کی طرح بیٹھ گئے۔ کسی کی نبوت نے زندگی نہیں پائی اور آئندہ بھی کوئی نبوت زندگی نہیں پائے گی۔ جھوٹے نبیوں سے وہ زیادہ کامیاب رہے جنہوں نے حضورؐ کا نائب بن کر کام کیا۔ اُن کے نام باقی ہیں۔ جھوٹے نبیوں کو کوئی جانتا بھی نہیں۔

حضورؐ بشیر اور نذیر ہیں۔ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور بشارت دینے اور ڈرانے کا کام حضورؐ کے زمانۂ حیات تک محدود نہیں تھا۔ حضورؐ قیامت تک کے انسانوں کے لئے بشیر و نذیر ہیں۔ انسان قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے اور چونکہ اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی صاف لفظوں میں فرمایا۔ لا نبی بعدی۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ مشہور صحابی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:-

"میری اور مجھ سے قبل کے نبیوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے مکان بنایا اور مکان کو خوب آراستہ و پیراستہ کیا۔ مگر اس کے کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ لوگ مکان دیکھنے بڑے شوق سے آتے ہیں اور مکان دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی کہتے ہیں کہ اینٹ کی جگہ خالی کیوں ہے۔ میں نے اُسی اینٹ کی جگہ کو پُر کیا ہے۔ اور میں نبوت کی آخری اینٹ ہوں۔ جس سے تعمیرِ نبوت مکمل ہوگیا۔ میں آخر الانبیاء ہوں"

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتا فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہٗ ویقولون ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ وانا خاتم النبیین۔ (بخاری)

مسلم میں ہے:-

فکنت انا سددت موضع اللبنۃ وختم بی البنیان وختم بی الرسل۔

حدیثیں متعدد ہیں۔ مگر وہ سب سنانے کی بجائے میں اب ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق کی کتاب "حرفِ محرمانہ" کا ایک ٹکڑا ملخصاً نقل کردینا کافی سمجھتا ہوں۔ یہ کتاب میرے عزیز دوست مولوی محمد عظمت اللہ صاحب دہلوی ایڈوکیٹ کراچی نے ابھی ابھی دکھائی ہے۔ پوری کتاب پڑھنے کا وقت نہیں ملا۔ کتاب کی ضخامت چار سو چالیس صفحے ہے

لہ اور اگر لاکھ ڈیڑھ لاکھ حقا بھی جھوٹے اور خود ساختہ نبی کے گرد جمع ہوجائیں تو کروڑوں مسلمانوں میں یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ۔۔۔ کے خارج از ملت ہونے کی دلیل ہے! (ایڈیٹر)

ور اس میں تر ۵۴ صفحوں پر برق صاحب نے مسئلہ ختمِ نبوت کو بیان فرمایا ہے۔ میں ختمِ نبوت کا مضمون بھی بس اتنا پڑھ کا جس کا خلاصہ درج ذیل کیا جا رہا ہے اور جو مجھے بہت بھایا۔ برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"لفظ خاتم وجہ نزاع بنا ہوا ہے۔ احمدی بھائی خاتم کا ترجمہ بتاتے ہیں "محمد علیہ السلام انبیاء کی مہر ہیں" یعنی اُمّتِ محمدیہ کے انبیاء حضورؐ کے مہر شدہ فرمان سے آئیں گے اور باقی مسلمان خاتم کے معنی آخری کرتے ہیں۔

دونوں تفسیروں میں انتہائی تضاد ہے۔ ایک کی رُو سے سلسلۂ انبیاء جاری رہتا ہے اور دُوسرے سے بند ہو جاتا ہے۔ اس جھگڑے کا فیصلہ تین عدالتیں کر سکتی ہیں:۔

(۱) لغت۔ (۲) قرآن۔ (۳) حدیث۔

المنجد میں ہے۔ اَلْخَاتَمُ وَالْخَاتِمُ عَاقِبَۃُ کُلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کے آخر کو خاتَم اور خاتِم کہتے ہیں۔

منتہی العرب میں ہے:۔ خاتِم = مُہر۔ انگوٹھی۔ پایانِ کار۔

خاتَم = آخرِ ہر شے۔ پایانِ آن و آخرِ قوم۔

صراح۔ قاموس۔ تہذیب (ازہری) لسان العرب۔ تاج العروس۔ مجمع البحار۔ صحاح العربیہ اور کلیات ابی البقاء ں خاتِم اور خاتَم کے معنی قریباً ایک جیسے دیئے ہوئے ہیں۔ یعنی:۔

۱۔ وہ نگینہ جس پر نام کندہ ہو۔

۲۔ انگوٹھی۔

۳۔ آخر، انجام۔

۴۔ کسی چیز کو ختم کرنے والا۔

۵۔ کاغذ پر مُہر کا نقش۔

دیکھنا یہ ہے کہ آیۂ زیرِ بحث میں کون سے معنی چسپاں ہوتے ہیں۔ "آخری نبی" کا مفہوم تو بالکل صاف ہے۔ لیکن نبیوں کی مُہر یا انگوٹھی" کا کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ ذرا ان فقروں کو پڑھیئے:۔

۱۔ یہ مُہر زید کی ہے۔

۲۔ یہ مُہر عدالت کی ہے۔

۳۔ یہ مُہر مجسٹریٹوں کی ہے۔

کیا آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اس مُہر سے مجسٹریٹ بنتے ہیں۔ اور کیا دُوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس مُہر سے عدالتیں تیار ہوتی ہیں۔ اگر یہ مفہوم غلط ہیں تو پھر خاتم الانبیاء (نبیوں کی مُہر) کی یہ تفسیر کیسے درست ہے کہ:۔

"ایسی مُہر جس سے نبی بنتے ہیں"۔

علاوہ ازیں جب لفظ خاتم کسی جماعت یا گروہ کی طرف مضاف ہو تو وہ لازماً "آخری" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً خاتم المہاجرین (آخری مہاجر) خاتم الخلفاء (آخری خلفاء) اور خاتم الانبیاء (آخری نبی) عربوں کے وسیع لٹریچر میں اس کی لاکھوں مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اس قاعدہ کے خلاف ایک بھی مثال نہیں ہے۔ بہر حال لغت، نحو اور کلام عرب

کی روشنی میں خاتم الانبیاء کے معنی صرف "آخری نبی" ہو سکتے ہیں۔

آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ خود قرآن مجید نے "خاتم" کی کیا تفسیر پیش کی ہے۔ اگر ہم صحائفِ اولیٰ پر نظر ڈالیں تو ہمیں جابجا آنے والے انبیاء کے متعلق بشارت ملتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ مکہ میں ایک رسول کے ظہور کی دعا مانگ رہے ہیں:۔

"رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا ۔ (اے اللہ! اہلِ مکہ کی طرف رسول بھیج"

حضرت موسیٰؑ مسلسل کسی نبی کی بشارت سنا رہے ہیں:۔

"خداوند، تیرا خداوند تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کریگا۔"

(استثنا باب ۱۸۔ آیت ۱۵)

حضرت یسعیاہ ایک اُمّی نبی کی خبر دے رہے ہیں: "وہ کتاب ایک ان پڑھ کو دیں اور کہیں کہ پڑھ اور وہ کہے میں نو خواندہ ہوں۔" (یسعیاہ باب ۲۹۔ آیت ۱۲)

تورات مقدس خداوند کا جلال پھر وادیٔ فاران میں دیکھ رہی ہے:۔

"خداوند سینا سے آیا۔ شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں اُن کے لئے ایک آتشیں شریعت تھی۔" استثنا باب ۳۳۔ آیت ۳۱)

حضرت زکریاؑ ایک نجات دہندہ کا ذکر فرما رہے ہیں:۔

"اے یروشلم کی بیٹی! تو خوب للکار کہ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے۔ وہ صادق ہے اور نجات دینا اس کے ذمہ ہے۔"

حضرت مسیحؑ بیسیوں پیرایوں میں ایک پُر جلال رسول کی آمد کا اعلان کر رہے ہیں:۔

"اس کے بعد میں تم سے بہت باتیں نہیں کروں گا۔ کیونکہ دُنیا کا سردار آتا ہے۔" (یوحنا۔ باب ۱۴۔ آیت ۳۰)

ہر قدیم صحیفے میں آنے والے نبی کا ذکر ہے۔ لیکن قرآن حکیم میں کسی آنے والے نبی کا اشارۃً تک نہیں ہے۔ بلکہ حضورؐ کو خاتم الانبیاء قرار دینے کے علاوہ قریباً ایک سو آیات میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ اب قیامت تک کوئی وحی نازل نہیں ہوگی۔ تمام آیتوں کا درج کرنا دشوار ہے۔ چند ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات میں مومنوں کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے، اور صلوٰۃ و زکوٰۃ پر کاربند ہوتے اور وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۔ وہ اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی اور جو تم سے پہلے انبیاء کو دی گئی۔ اور پھر قیامت پر ایمان لاتے ہیں۔

غور کرو کہ حضور علیہ السلام اور قیامت کے درمیان کسی وحی کا ذکر موجود نہیں۔ مسلمان کی تعریف صرف اتنی ہی بتائی ہے کہ وہ حضورؐ اور سابق انبیاء کی وحی پر ایمان لانے کے بعد قیامت پر یقین رکھتا ہو۔ اگر حضورؐ کے بعد کسی نبی کی آمد مقدر ہوتی تو جس اللہ نے صلوٰۃ و زکوٰۃ پر اندازاً ڈیڑھ سو اور مطالعہ کائنات پر ساڑھے سات سو آیات نازل کیں۔ جس نے زمین پر چلنے، گفتگو کرنے، نکاح، طلاق، وضو، قربانی، تجارت اور قرض جیسے چھوٹے چھوٹے مسائل کو کھول کھول کر بیان کیا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ امتِ مسلمہ کو ایک نبی کی آمد سے غافل رکھتا؟ اور حضور علیہ السلام کے بعد صرف قیامت پر ایمان لانے کا حکم دیتا؟ جس اللہ نے پہلے انبیاء کو بار بار تاکید کی تھی کہ بعد میں آنے والے انبیاء پر بھی ایمان لانا اور جن کے صحائف اس قسم کی پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں۔ وہ اللہ مسلمانوں پر یہ ظلم نہیں کر سکتا تھا کہ پہلے تو حضورؐ کو

خاتم النبیین قرار دیتا۔ پھر یک سو آیات میں آنہی حضورؐ پر اور حضورؐ سے پہلے کے انبیاء کی وحی پر ایمان لانے کے بعد قیامت پر یقین رکھنے کی ہدایت کرتا۔ اور ایسے لوگوں کو اُولٰئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْن۔ ہدایت یافتہ و ناجی قرار دیتا۔ اور پھر چپکے سے ایک رسول بھی بھیج دیتا۔

۲۔ حضور علیہ السلام کو اپنی امت سے عشق تھا۔

عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ۔

محمدؐ کو تمہاری تکلیف شاق گزرتی ہے۔ وہ تمہیں سر بلند دیکھنے کے لئے مضطرب ہیں۔ وہ تم پر بے حد مہربان اور شفیق ہیں۔ تو جس رسولؐ کو اپنی امت سے اس قدر محبت ہو کیا وہ برداشت کر سکتا تھا کہ ساری اُمت آنے والے نبی سے غافل رہ کر جہنم کا ایندھن بن جائے! یقیناً کسی نبی کی بعثت مقدر ہی نہیں تھی ورنہ حضورؐ کی وحی میں لازماً اس کا ذکر ہوتا!

۳۔ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ اے مسلمانو! خدا، رسولِ عربی اور اپنے فرمانرواکی جو تم میں سے ہو اطاعت کرو۔ اگر رسولِ عربی صلعم کے بعد کسی نبی کو بھی آنا ہوتا تو اللہ اس کی اطاعت کی بھی ہدایت کرتا۔ اولی الامر کی اطاعت کا حکم دینا اور کسی نبی کا ذکر تک نہ کرنا صاف اعلان کرتا ہے اس حقیقت کا کہ حضورؐ آخری نبی تھے!

۴۔ آمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْکِتَابِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَ الْکِتَابِ الَّذِیْ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ۔

اے لوگو! خدا و رسولِ عربی پر ایمان لانے کے بعد اس کتاب کو جو رسولِ عربی پر اتری ہے اور اُن کتابوں کو جو پہلے اُتر چکی ہیں مانو۔

یہاں پہلی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم تو موجود ہے لیکن بعد میں آنے والی کسی وحی کا ذکر نہیں ہے۔

غور کا مقام ہے کہ جس اللہ نے حضورؐ اور گزشتہ انبیاء کی وحی پر ایمان لانے کا سو مرتبہ حکم دیا۔ کیا وہ صرف ایک مرتبہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

وَمَا یُنْزَلُ مِنْ بَعْدِکَ!

کہ مومن آنے والے انبیاء پر بھی ایمان لائے گا۔ کیوں نہیں کہا؟ کیا اللہ کو ہماری گمراہی مقصود تھی؟ کیا کسی نبی پر ایمان لانا اس قدر مشکل فرض تھا کہ اللہ نے اُسے صیغۂ راز ہی میں رکھنا مناسب سمجھا۔ جو مسلمان پہلے ڈیڑھ لاکھ انبیاء پر ایمان لا سکتا ہے اسے صرف ایک اور نبی کو تسلیم کرنے میں تکلیف نہ ہوتی۔ صاف بات ہے کہ کسی نبی کی آمد مقدر ہی نہیں تھی۔ ورنہ ساڑھے چھ ہزار آیات نازل کرنے والا خدا کم از کم ایک آیت تو اس موضوع پر بھی نازل کرتا!

(زیر ترتیب کتاب "سرورِ کائنات" سے لیا گیا)

نو بہ نو

ماہر القادری

اب اس طرح ستم روزگار ہوتا ہے
قفس کے سامنے ذکرِ بہار ہوتا ہے

خدا کے واسطے دامن کا چاک سینے دو
کبھی کبھی تو جنوں ہوشیار ہوتا ہے

وفا کا ذکر ہی کیوں چھیڑتے ہیں اہلِ وفا
جب اُن کی خاطرِ نازک پہ بار ہوتا ہے

وہ سامنے ہوں تو آنسو نکل ہی جاتے ہیں!
یہ جرم وہ ہے جو بے اختیار ہوتا ہے!

میں مطمئن ہوں اگرچہ خراب ہے ماحول
خزاں کے بعد کا عالم بہار ہوتا ہے

حیرت شملوی

زیرک ہیں، ذہین ہیں، نہ ذی ہوش
جو لوگ ہیں عاقبت فراموش

کچھ اور بھی تیز نعرۂ حق
ہیں اہلِ جہاں بہت گراں گوش

لبیک کوئی کہے، تو اب بھی
رحمت کا کھلا ہوا ہے آغوش

ہم اپنے فرائضِ وفا سے
کوشش تو کریں کہ ہوں سبکدوش

حیرت، وہ نہیں ہیں ہم کہ جن کو
جو کچھ بھی ملا، وہ کر لیا نوش

عروج زیدی بدایونی

دردِ دل عیشِ دوعالم سے بھی پیارا ہے مجھے
تم نے کس رنگ سے شیشے میں اُتارا ہے مجھے

"حسنِ کردار" نے اس درجہ نکھارا ہے مجھے
اپنے ماحول پہ تنقید گوارا ہے مجھے

تلخیٔ زیست بہ صد شکر گوارا ہے مجھے
اس میں کچھ آپ کا درپردہ اشارا ہے مجھے

میرا ذمّہ وہ اگر میری تمنّا نہ کریں
اپنی بے لوث محبت کا سہارا ہے مجھے

غمِ دوری کے تصوّر سے لرز جاتا ہوں
غمِ دوراں بسروچشم گوارا ہے مجھے

میری بھیگی ہوئی پلکوں نے بھرم کھول دیا
ناز یہ تھا کہ ابھی صبر کا یارا ہے مجھے

مجھ پہ رعنائیٔ کونین کو رشک آتا ہے
دستِ قدرت نے بایں حسن سنوارا ہے مجھے

کورذوقی ہے کہ آواز پہ آواز نہ دوں
"زر و نکہت" کی فضاؤں نے پکارا ہے مجھے

عقل کو، عقل کے اندازِ سیاست کو سلام
دل نے "اعلانِ بغاوت" پہ ابھارا ہے مجھے

ہر توجہ میں ہے بیگانہ ادائی کی نمود
بےرُخی سے بھی گراں تر یہ مدارا ہے مجھے

قدرداراں غمِ دل اُن کی نگاہیں نہ رہیں
غمِ دل! اب تری توہین گوارا ہے مجھے

بے نیازِ کرمِ مرگ ہے میری ہستی
التفاتِ نگہِ ناز نے مارا ہے مجھے

عرش کو فرشِ رہِ شوق سمجھتا ہوں عروج!
کس بلندی سے محبت نے پکارا ہے مجھے

غزلیں

ابرؔ احسنی گنوری:-

آج تک نہیں بیٹھے ہم کہیں ٹھکانے سے
کس گھڑی کے اُٹھے تھے تیرے آستانے سے

وہ جمود ہے میرے تھک کے بیٹھ جانے سے
چھین لی گئیں جیسے گردشیں زمانے سے

آندھیوں سے کھیلوں گا برق کے قدم لوں گا
پہلے سوچ رکھا ہے آشیاں بنانے سے

داستاں قیامت کی دے ہی دی گئی ترتیب
لے کے کچھ ورق میری زیست کے فسانے سے

پیار آ بھی جاتا ہے لغزشوں پہ رحمت کو
مل بھی جاتی ہے منزل پاؤں ڈگمگانے سے

آپ ناصحِ مشفق یہ رموز کیا جانیں
زندگی سنورتی ہے دل پہ چوٹ کھانے سے

کیوں مری پکار اُس کے کان تک نہیں جاتی
مَیں نکل گیا آگے غالباً زمانے سے

خون رو رہا ہے دل اور ہنس رہا ہوں میں
غم کی شان بڑھتی ہے ابرؔ مسکرانے سے

چٹک غنچوں کی دیتی ہے پیامِ چاکِ دامانی
لبِ فطرت کا کوئی لفظ ہو، مبہم نہیں ہوتا

خوشی کی پھر خوشی کیا ہو کرے کیوں غم کا غم کوئی
خوشی پیہم نہیں ہوتی۔ مسلسل غم نہیں ہوتا

ستارے نور برساتے ہیں جگنو جگمگاتے ہیں
مگر پھر بھی مرے گھر کا اندھیرا کم نہیں ہوتا

ہر اک عالم کی حد شاید تری محفل سے ملتی ہے
یہاں آ کر نظر میں پھر کوئی عالم نہیں ہوتا

عنبر چغتائی

ہٹ کے ساقی سے نظر جام تک آ پہنچی ہے
تشنگی اب طلبِ خام تک آ پہنچی ہے

آگ لگنے کے ڈر سے تو چھوڑا تھا نشیمن اپنا
آگ بڑھ کر قفس و دام تک آ پہنچی ہے

آپ کی یاد غمِ ہجر کی تاریکی میں
چاندنی ہے کہ در و بام تک آ پہنچی ہے

سازشِ اہلِ کلیسا کی سلگتی ہوئی آگ
شیخ کے جامۂ احرام تک آ پہنچی ہے

دستِ ساقی سے ابھی چھین لے بڑھ کر ساغر
جرأتِ رند اس اقدام تک آ پہنچی ہے

روحِ انتخاب

حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا:-

طالبِ علم کے لئے تین علامتیں ہیں۔ اللہ کا علم - اور اُن چیزوں کا علم جنہیں اللہ پسند کرتا ہے اور اُن چیزوں کا علم جنہیں اللہ ناپسند کرتا ہے - ریاکار کی تین علامتیں ہیں۔ جب تنہا ہو تو کاہلی کرے۔ جب اُسے کوئی دیکھتا ہو تو عمل میں تیزی کرے اور اپنے ہر کام میں اپنی تعریف پسند کرے۔ حاسد کی تین علامتیں ہیں۔ جب غائب ہو تو غیبت کرے۔ جب موجود ہو تو اُس کے پاس تقرب چاہے۔ مصیبت پر طعنہ زنی کرے۔ منافق کی تین علامتیں ہیں۔ اُس کی زبان اُس کے قلب کی - قول اُس کے فعل کی، اور اس کا ظاہر اس کے باطن کی مخالفت کرے۔ یوم الجمل میں فرمایا - کہ موت تیز رفتار طلب گار ہے۔ نہ ٹھہرنے والا اُسے عاجز کر سکتا ہے نہ بھاگنے والا اُس سے بچ سکتا ہے۔ آگے بڑھو اور بزدلی نہ دکھاؤ۔ موت سے کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے۔ اگر تم نہ بھی قتل کئے گئے۔ جب بھی ضرور مرو گے - مگر بہترین موت قتل ہے۔ قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے "تلوار کی ایک ہزار ضرب بستر کی موت سے سہل ہے !

فرمایا۔ خاموشی حلم ہے، سکوت سلامتی ہے۔ چھپانا سعادت ہے۔ اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ اللہ کو ناپسند وہ بندہ ہے۔ جس نے اپنے کو نفس کے سپرد کر دیا۔ جو راہِ راست سے ہٹنے والا اور کلامِ بدعت کا دلدادہ ہے۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم ہے۔ مال جمع کرنے والے مر گئے اور علماء زندہ ہیں۔ علماء اُس وقت تک باقی ہیں جب تک زمانہ باقی ہے۔ اُن کے بدن مفقود ہیں - مگر اُن کی مثالیں دلوں میں موجود ہیں۔ اے لوگو! سوائے اپنے پروردگار کے کسی سے امید نہ رکھو اور سوائے اپنے گناہوں کے کسی چیز سے نہ ڈرو وہ جو نہیں جانتا وہ سیکھنے سے نہ شرمائے اور جو جانتا ہے وہ بتانے سے نہ شرمائے۔ تمہیں جاننا چاہیئے کہ صبر ایمان کا ایسا ہی جزو ہے، جیسے سر بدن کا !

جس نے لوگوں سے معاملہ کیا۔ مگر اُن پر ظلم نہیں کیا اور اُن سے بات کہی مگر اُن سے جھوٹ نہیں بولا۔ اُن سے وعدہ کیا مگر اُن سے وعدہ خلافی نہیں کی تو یہ اُن لوگوں میں سے ہو گیا جن کی غیبت حرام ہے اور اس کی مروت کامل ہو گئی، اس کا عدل ظاہر ہو گیا، اور اس کا ملنا واجب ہو گیا۔ جو آدمی کذب و خیانت سے بری ہے وہ ہر روز و شب دو میں سے ایک نیکی کا انتظار کرتا ہے یا تو اللہ کے داعی (موت) کا کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس کے لئے بہتر ہے یا اللہ کی طرف سے فتح (کامیابی) کا !

دنیا صالحین کی محنت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں انہی میں کرے۔ اے کاش! میں اپنے دوست سے یہ سنتا جو وہ کہتے ہیں کہ میرا ہاتھ تنگ ہے۔ اس تنگی کے سوا میں انہیں یہ کہتے سنتا کہ شفقت و محبت اُس شخص کی طرف جو اللہ کو دوست رکھے اور مجھے دوست رکھے اس سے زیادہ تیزی سے آتی ہے جتنا سیلاب اپنی گزرگاہوں کی طرف تیز تیز آتا ہے۔ اے گروہِ نوجوانان! تم ادب کے ذریعہ اپنی آبروئیں محفوظ کرو - اور علم سے پنادین۔ ہدایت کا چراغ بن جاؤ - گمراہی کا جھنڈا نہ بنو۔ اس ترح (دل لگی) کو ناپسند کرو جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرے !

(تاریخ طبری - ترجمہ مولانا عبداللہ العمادی مرحوم)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

"قوم کے لیڈر اور بڑے لوگ" تو اعلان ہی کرتے رہے کہ پاکستان کے لئے ضرورت پڑی تو ہم اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ مگر نواب شاہ کے ایک جانباز مسلمان نے اپنے اس بے پناہ جذبہ کا، اعلان بھی نہیں کیا اور ملک و ملت کے لئے چپکے سے جان دے دی۔ ہوا یہ کہ یہ "شہید قوم" نواب شاہ کے کسی ہوٹل میں کرکٹ کمنٹری سُن رہا تھا۔ پاکستانی ٹیم کے ایک کھلاڑی کی سنچری میں بس ایک رَن کی کمی رہ گئی تھی کہ وہ میدان باہر (آؤٹ) ہو گیا۔ اس "حادثۂ عظیم" کی تاب نہ لا کر اُس شخص نے ایک آہ کھینچی اور تھوڑی سی دیر میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی!

اصل مسئلہ کی نوعیت یہ ہے —— کہ اس شخص کے جان فدا کرنے میں اپنی کوئی غرض شریک نہ تھی۔ پاکستان کرکٹ ٹیم کی محبت میں "خالصتہً" اس نے جان دی۔ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کی جیت ہار کا تعلق پاکستان کے وقار سے وابستہ ہے۔ یعنی نصیبِ دشمناں خاک بدہن گستاخ اگر پاکستانی ٹیم ہار جائے تو پاکستان کی مونچھ نیچی ہو جائے۔ اس لئے فقیہانِ سیاستِ متین" کا فتویٰ یہ ہے۔ چونکہ یہ موت دراصل پاکستان کی محبت میں واقع ہوئی ہے اس لئے مرنے والا "شہید" ہو کر داخلِ جنت ہو چکا کہ شہیدوں کو حساب کتاب لئے بغیر داخلِ جنت کر دیا جاتا ہے!

حیرت ہے کہ پاکستانی کرکٹ بورڈ نے اس خبر کو سُنا اور اس کی طرف سے کسی قسم کی سرگرمی کا اظہار نہیں ہوا۔ اس غفلت کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے —— ہو سکتا ہے کہ کرکٹ بورڈ ٹیسٹ میچوں کے کاروبار میں مصروف ہو اور اسی مصروفیت اور انہماک کے سبب اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی ہو! مگر ٹیسٹ میچوں کے ختم ہونے کے بعد پاکستان کے کرکٹ بورڈ کو چاہیئے کہ اس "مردِ شہید" کی قبر پر عالی شان گنبد تعمیر کرائے اور جب گنبد بن جائے تو پھر اس "رحمتہ اللہ علیہ" کی قبر پر چراغاں ہو۔ میلہ لگے۔ قوالوں کی چوکیاں دُور دُور سے آئیں۔ دھمال صاحب کا رقص ہو!

عُرس کے قائم کرنے اور جاری رکھنے میں شروع شروع میں تو کرکٹ بورڈ کو روپیہ خرچ کرنا پڑے گا۔ مگر دو چار سال عُرس ہوتا رہا تو پھر اتنی آمدنی ہوگی کہ اس "مردِ شہید" کے مزار کی تولیت، مجاورت اور سجادہ نشینی کے لئے عقیدت مندوں میں مقدمہ بازی شروع ہو جائے گی۔ کوئی صاحب فرمائیں گے کہ "چراغی" کا حق مجھے ملنا چاہیئے۔ دوسرے صاحب دعویٰ کریں گے کہ لنگر مبارک کا سارا انتظام یہ "خادمِ درگاہ" انجام دے گا۔ تیسرے صاحب کہیں گے کہ قبر مبارک پر جو چڑھاوا چڑھتا ہے۔ اس کا واحد اور بلا شرکت غیرے حق دار میں ہوں! اس مقدمہ بازی سے اس مزار کی اور شہرت ہوگی اور پھر کچھ دن میں یہ قیمت ہو جائے گی یہاں کے تبرکات کی کہ مجاور نے کسی زائر کے سر پر دو چار دھاگے کلاوے کے باندھے۔ "چراغ مبارک" کی راکھ چٹائی اور مٹھی گرم کر لی!

اگر ہم جیسے نیاز مندوں کی بات سُنی جا سکے تو عرض کریں کہ قبل اس کے کہ ان "کرکٹ شاہ" صاحب علیہ الرحمۃ کی درگاہ

کی سجادہ نشینی، تولیت اور مجاورت کی نزاع پیدا ہو۔ اس درگاہ کا سجادہ نشین پاکستانی ٹیم کے کپتان مسٹر کاردار کو کیوں نہ بنا دیا جائے۔ وہ اپنی سرکاری نوکری کے مقابلہ میں اس سجادہ نشینی میں ہر طرح خوش اور مطمئن رہیں گے! نوکری چاہے کتنی بڑی اور اونچی کیوں نہ ہو۔ وہ پھر غلامی ہے۔ اور سجادہ نشینی ایک آزاد پیشہ ہے۔ اور پیشہ نہیں ہے تو بادشاہت ہے! الطف ہی لطف اور فراغت ہی فراغت! سجادہ نشینوں کے احوال و کوائف میں راوی ہمیشہ چین ہی چین لکھتا ہے!

"پاکستان اور بھارت کے تنازعات صرف براہِ راست مذاکرات ہی سے طے ہو سکتے ہیں۔"

"سلامتی کونسل میں صرف تقریریں ہوتی ہیں۔ مگر نتیجہ نہیں نکلتا۔"

(راجہ غضنفر علی کا اعلان)

بجا فرمایا "راجہ صاحب"! ایشور آپ کو راجہ سے "راجۂ راجایان" بلکہ "مہاراجہ" بنا دے۔ مگر ہم "غریب غربا" جان کی امان پائیں تو عرض کریں کہ سات آٹھ سال کے بعد حضور پر یہ "کشف" اور "شرح صدر" ہوا ہے کہ سلامتی کونسل میں صرف تقریریں ہی ہوتی رہتی ہیں۔ مگر نتیجہ نہیں نکلتا! "زندہ باد" "جگ جگ جیو"! ہم کہتے ہیں کہ اگر ساری عمر آپ کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تو آپ کا کوئی کیا کر لیتا۔ اور کوئی کچھ کہتا بھی تو اس پر ملک میں انتشار پھیلانے کا جرم عاید کر دیا جاتا۔ کہ یہ "جنونی" ملک کے اکابر کو بدنام کر کے حکومت کی ساکھ بگاڑنا چاہتا ہے:

بھارت سے آپ سلامتی کونسل کے توسط کے بغیر "براہِ راست" گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ بہت خوب! اور ہم خاک نشیں "خوب" نہ کہیں تو "ناخوب" کہہ کر کیا اپنے اوپر "سیفٹی ایکٹ" لگوا لیں ——! عرض کرنا صرف یہ ہے کہ اور وہ بھی کھل کر نہیں۔ اشاروں، کنایوں اور استعاروں میں کہ ہندوستان نے جب سلامتی کونسل میں آپ کے سوالیوں کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تو پھر "براہِ راست" مذاکرے کیا چھو منتر ہیں کہ ادھر یہ بات چیت شروع ہوئی اور ادھر ایک ایک کر کے تمام گرہیں کھل گئیں —— اور ہندوستان یہی تو چاہتا تھا کہ سلامتی کونسل سے آپ اپنے مقدمہ کو اٹھا لیں اور آپ نے پہلے "براہِ راست گفتگو" کا اعلان کر کے سلامتی کونسل سے اپنے مقدمہ کو رسماً نہیں، بلکہ عملاً اٹھا لیا۔ یہ کس کی جیت ہوئی راجہ صاحب! پاکستان کا اب موقف کیا ہے؟

اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے تنازعات صرف "مذاکرات" ہی سے طے ہو سکتے ہیں۔ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ جس ملک میں اقتدار و مناصب کی کرسیاں آپس میں لڑتی رہی ہوں۔ جہاں جلد جلد انقلابات آتے رہے ہوں۔ اور جہاں سیاست کے ساتھ فوج کا نام بھی لیا جاتا ہو —— وہاں "مذاکرات" کے علاوہ کسی اور "تدبیر" پر عمل کرنے کی جرأت ہی کس میں ہے؟

سات آٹھ سال تو سلامتی کونسل کے چکّر میں گزر گئے اور کچھ مدت ان "براہِ راست مذاکروں" میں بیت جائے گی۔ اس عرصہ میں قوم کے دل و دماغ پر کشمیر کے جو دھندلے سے نقش باقی رہ گئے ہیں۔ وہ بھی اڑن چھو ہو جائیں گے۔ اور اس زمانہ میں جو نسل اٹھے گی اسے تو شاید پتہ بھی نہ ہو گا کہ ہمارے ملک میں کشمیر نام کا کوئی مسئلہ تھا بھی؟ یہ جو "رائے عامہ" کا تھوڑا بہت خیال بڑے لوگوں کو ہے اور جس کی وجہ سے بیانات کے یہ شوشے چھوڑے جاتے ہیں اور یہ طفل تسلیاں دی جاتی ہیں اُن کی زحمت سے بھی چھٹکارا مل جائے گا ——!

چیف کورٹ نے جب سے مولوی تمیز الدین خاں صاحب کی موافقت میں فیصلہ دیا ہے۔ پاکستان کے سب سے اونچے اور بڑے لوگ ضرورت سے زیادہ نازک مزاج ہوگئے ہیں۔ حالانکہ یہ مقام زیادہ سے زیادہ سنجیدہ اور صاحبِ تحمل بن جانے کا تھا۔ اے حکومت کے "ہز ہیلو!" اور "ہز ایکسیلنسیو!" یہ غمزۂ ترکانہ آپ نے کہاں سے سیکھا ؟ دلبرانِ سیماب وش کے یہ انداز آپ میں کہاں سے آگئے ؟ عوام اور خواص کو ڈانٹنے ڈپٹنے اور انھیں "تنبیہ" کرنے کا بھی آخر کوئی موقع محل اور ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یہ کیا کہ ذرا کوئی بات مزاجِ شاہانہ کے خلاف ہوئی اور دن سے ایک بیان داغ دیا!

آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ملک میں چاہے جو کچھ ہوتا رہے۔ مگر ہر کوئی "تک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم" بن کر رہ جائے۔ سب لوگ اپنے لبوں پر امریکہ کی سنگر مشین سے بخیہ کرلیں اور زبانوں میں تالے ڈال لیں۔ آخر پاکستان میں سبھی لوگ تو چاپلوس زمانہ ساز، ہوا پرست اور مصلحت اندیش نہیں رہتے! یہ دیکھو کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے ؟ اس طرح نہ سوچو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ہماری کرسیوں کے حق میں مفید ہے یا مضر ہے!

اور اے ملک کے مائی باپو! اپنے بچوں اور بالکوں پر "کرودھ" کی جگہ "دیا" سے کام لو۔ یہ بات بات پر گھرکنا ٹھیک نہیں۔ اس سے تو بچے اور دلیر ہو جائیں گے ؟ بچوں کو جلدی جلدی ڈراتے اور دھمکاتے رہنا کوئی اچھی بات نہیں ہے! دل پیار محبت سے جیتے جاتے ہیں۔ قوت سے نہیں!

قاہرہ کی "بنات النیل" کی ایک بنت دُریہ شفیق پاکستان نہ جانے خود تشریف لائی تھیں یا انھیں لایا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں سنا ہے کہ "تعداد ازدواج" کی مخالفت میں قرآن سے ایسی ایسی دلیلیں پیش کیں کہ سب لوگ دم بخود ہو کر رہ گئے! دم بخود اس لئے ہوئے کہ ایک طرف تو بے شمار مفسرین، محدثین اور فقہا کی تحریریں، اور دلیلیں اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ اور دوسری طرف دُریہ شفیق اور اُن کے چند ہمنواؤں کے بیانات ہیں! صحابہ کرام نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں متعدد شادیاں کی تھیں۔ لیکن تاریخ نہیں بتاتی کہ حضورؐ نے صحابہ کو ایک سے زیادہ شادی کرنے پر ٹوکا ہو۔ ناشناس بڑی مشکل میں ہے۔ آیا صحابہ کرام کے "عمل" کو صحیح مانے یا دُریہ شفیق کی بات کو! قرآن کو رسول اللہ اور صحابہ کرامؓ زیادہ سمجھتے تھے یا یہ دُریہ شفیق!

مصر میں مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط نے وہاں فحاشی اور بے حیائی کو عام کر دیا ہے۔ اس کی اصلاح کی طرف بھی کبھی توجہ فرمائی! اس طبیب کو کیا کہیئے کہ جو تڑپتے ہوئے مریض کو چھوڑ کر درختوں کی چھالوں پر مرہم لگاتا پھرتا ہو!

خدا کی نیک بندیو! اسلام اور قرآن کے نام پر تو قرآن کی خلاف ورزی نہ کرو۔ تم اپنی خواہشوں پر چلنا چاہتی ہو تو اپنی اس روش پر قرآن کا جھوٹا لیبل تو نہ لگاؤ! اسلام کی سربلندی کے نام پر اسلام کو ذلیل اور رسوا تو نہ کرو!

"بنات النیل" اور "اپوا" کی "لیڈرانیوں" کا بڑا احسان ہوگا۔ اگر وہ "قرآن" کو تفسیر بالہواء کا تختۂ مشق نہ بنائیں۔ قرآن کریم اور دُریہ شفیق جیسی مفسر، اس سے بڑی قرآن کی مظلومیت اور کیا ہو سکتی ہے!!

ہماری نظر میں

اُردو کی نثری داستانیں

"اُردو کی نثری داستانیں" (انیسویں صدی تک) از ۔ ڈاکٹر گیان چند ۔ ضخامت ۶۲۰ صفحات
قیمت ۹ روپے ۔ ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اُردو پاکستان ۔ اُردو روڈ ۔ کراچی ۔

انیسویں صدی عیسوی تک کی اُردو زبان کے قصص و حکایات کی یہ تاریخ ہے ۔ جو ڈاکٹر گیان چند جین ایم اے ، ڈی فل صدر شعبۂ اُردو حمیدیہ کالج بھوپال نے بڑی محنت اور کمال سلیقہ کے ساتھ مرتب فرمائی ہے ۔ اپنے انداز و نوع کی اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس قدر تفصیل و تنقید اور تاریخی حوالوں کیساتھ منظرِ عام پر آئی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کو اس تحقیقی مقالہ پر الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی ہے اور واقعی وہ اس کاوش و تحقیق پر اس علمی اعزاز کے مستحق تھے !

یہ کتاب سات ابواب اور تین ضمیموں پر مشتمل ہے ۔ جن کے عنوانات سے اُن کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے :-

(۱) قصوں کا آغاز و ارتقاء ۔ (۲) تاریخ ، مصنف ، ماخذ ، نسخے ۔ (۳) داستان کی خصوصیات ۔ (۴) طویل داستانیں ۔ (۵) مختصر داستانیں ۔ (۶) کہانیوں کے مجموعے ۔ (۷) داستانوں کی ترقی و زوال کے اسباب ۔ معائب ۔ محاسن ، داستانوں کا مرتبہ ۔ (ضمیمہ نمبر ۱) شمالی ہند کے قصوں کی فہرست ۔ (نمبر ۲) چند غیر مطبوعہ داستانوں کی صراحت ۔ (نمبر ۳) داستانوں کے مختصر ملخص ترجمے ۔

یہ داستانیں خود کیا ہیں ؟ اس کا جواب فاضل مصنف کی زبان سے سنئے :-

" داستانیں ایک بے عمل ، آرام طلب سوسائٹی کی پیداوار ہیں ۔ لیکن یہ خود عمل اور زندگی سے بھرپور ہیں ۔ ان میں ٹھہراؤ کہیں نہیں ، ہر جگہ رفتار ، تیز رفتار ، تغیر اور انقلاب ہے ۔ یہ ہیرو کے سفر کی سرگزشت ہیں ۔ سفر بھی وہ جس کی ہر منزل ہفت خواں ہے ، ایک حوصلہ ہے جو آزمائے لئے جاتا ہے ۔ ۔ ۔ "

داستان امیر حمزہ پر تنقید کا ایک مختصر سا اقتباس :-

" داستان میں نقائص بھی کافی ہیں ۔ فنی نقائص بھی اور دوسرے ۔ مثلاً ایرج نامے اور ہوشربا کے بعد داستان لوٹتی معلوم ہوتی ہے ۔ اسے آگے بڑھانے میں محض اطناب سے کام لیا جاتا ہے ، ارتقا نہیں رہتا ۔ داستان میں جو بھی نقائص ہیں وہ اس کے بے جا طول کا نتیجہ ہیں ۔ لیکن ان سب نقائص کو اس کی خوبیوں اور حُسن نے ڈھک دیا ہے ۔ اس کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے پڑھنے سے دماغ سب نکتہ چینی اور عیب جوئی بھول جاتا ہے ۔ "

غدر ۱۸۵۷ء کے معرکۂ ابتلا کا اُردو کی داستان نگاری پر کیا اثر ہوا ؟ :-

" غدر کے انیسویں صدی کے آخر میں قوم پر صحیح معنوں میں اضمحلال چھایا ہوا تھا ۔ مسلمانوں کی حالت خاص طور سے پست تھی ۔ غدر کے بعد انھیں سختی سے دبایا گیا تھا ۔ سلطنت کے جانے کا گھاؤ ، اُوپر سے نمک پاشی ۔ حوصلے اور دل ٹوٹ چکے تھے ۔ اُس وقت عیش و عشرت کی داستانیں کب تک بہلاتیں ۔ یہ تو بے وقت کی بھیرویں تھی !

جہاز طوفان سے دوچار ہے۔ اس وقت شہنائی بجانے کا کیا موقع۔ ع

تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں!

حقیقت بے نقاب ہو چکی تھی۔ اب رنگین پردے نہیں بہلا سکتے تھے۔ کب تک سراب میں رہتے۔ خواب کی دنیا خواب کی دنیا ہے۔ جب نیند اُچاٹ ہو گئی وہ دُنیا اور کیف آگیں خواب بھی مسمار ہو گئے۔ مصنوعی عشرت جلی قوت کے افسانوں کا اندرونی خول نظر آیا۔ اُس وقت اپنی حالت پر نظر ڈالنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ناولوں میں زندگی کے عکس نظر آئے، اُن کے کردار کسی پانچویں، دسویں صدی کے نہیں تھے۔ غدر کے بعد انیسویں صدی کے کلیم ظاہر دار بیگ، ابن الوقت، مبتلا، آزاد، خوجی وغیرہ سب ہم عصر تھے۔ ہر جگہ کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ انھیں دُنیا کے غموں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ نذیر احمد نے قدرت پسندی کے بارے میں لیکچر دیئے۔ اخلاق کی تعلیم دی، سرشار مسخرے نے ناکارہ، مالشی تہذیب کا مذاق اُڑایا۔ اہل مغرب سے مقابلہ کر کے اُن کی معاشرت کی برتری دکھائی۔ داستانوں کی دُنیا ناولوں کے ساتھ کوچ کر گئی۔۔۔"

لائق مصنف کی محنت، عرق ریزی اور وسعت مطالعہ کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نے اُردو داستانوں کے اصل ماخذ کا پتہ چلایا ہے۔ ضمیمہ نمبر اخاص طور سے بہت اہم ہے۔ مثلاً "الف لیلہ" کے سلسلہ میں مصنف نے اس کی تفصیل دی ہے کہ اس کتاب کے عربی ایڈیشن کس سنہ میں اور کس مطبع سے شائع ہوئے۔ پھر ترکی، فارسی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی، ڈینش، اُردو زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے کب چھپے اور کس نام سے چھپے۔

ڈاکٹر گیان چند نے شاہ خافری بادشاہ مصر (سنہ ۴ قبل مسیح) کے عہد کے ایک افسانہ کو دُنیا کا سب سے پہلا لکھا ہوا افسانہ تسلیم کیا ہے۔ اُن کا کہنا۔

"تہذیب کی آمد سے پہلے کوئی مذہب، قانون اور اخلاق نہ تھا جو انسانوں کی محافظت کر سکتا۔" (صفحہ ۴)

درست نہیں ہے۔ دُنیا میں جس زمانہ سے بھی انسان کا وجود ملتا ہے اخلاق و مذہب کی ہدایت اس کے ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے۔

"جو مارے اسی کی تلوار کا گہرا اصول تھا۔" (صفحہ ۴)۔ اصول کے ساتھ "گہرا" اجنبی اجنبی سا لگتا ہے۔

"رات کو شہزادی کو منگا کر صبح کو واپس بھیج دیتا ہے۔" (صفحہ ۱۲۵) "منگانا" غیر ذی روح اشیاء کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہاں "بلا کر" کا محل تھا۔

اُردو کی جن داستانوں کی تاریخ اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ وہ داستانیں بہت دلچسپ ہیں۔ اُن میں کردار نگاری بھی خوب کی گئی ہے۔ مگر جہاں حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ اور وصل و قربت کی تصویریں کھینچی ہیں۔ وہاں اخلاق و شرافت کو اپنی آنکھیں شرم کے مارے بند کر لینی پڑتی ہیں!

اس کتاب نے کوئی شک نہیں اُردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔ اور انجمن ترقی اُردو پاکستان نے "اُردو کی نثری داستانیں" چھاپ کر اُردو و تاریخ کا دامن وسیع تر کر دیا ہے۔

اذان اور دوسرے افسانے

"اذان اور دوسرے افسانے" از جیلانی بی اے۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات۔ مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ چراغ راہ۔ ۹ وٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

جناب جیلانی بی اے کے پندرہ افسانوں کا یہ مجموعہ مکتبہ چراغ راہ نے خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔
یہ افسانے اپنے اندر مقصدیت رکھتے ہیں اور اس مقصدیت کی حدود اخلاق و تہذیب اور خدا شناسی سے جا کر مل جاتی ہیں۔ اس دور میں جبکہ ہماری معاشرت میں افسانوں کی راہ سے اخلاقی گندگی آرہی ہے۔ اس قسم کے پاکیزہ افسانوں کی تخلیق انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔

جناب جیلانی بی اے کی شہرت کا سنگِ بنیاد ان کا مشہور افسانہ "آخو یہ" ہے۔ اس افسانے نے لوگوں کو چونکایا کہ ایک عظیم فن کار ادب کی کارگاہ میں دبے پاؤں آچکا ہے۔ یہ افسانہ اس کتاب میں شامل ہے۔ کاش! اس ٹکر کے دوسرے افسانے بھی اس مجموعے میں ہوتے۔

ایک اقتباس:۔

"فلسفہ کیا ہے؟ میں نے اس پر اپنی زندگی کا ایک حصہ صرف کر دیا ہے۔ لیکن ہمیشہ میری جستجو اوڈیپس کے اسفار کی سی رہی ہے۔ میں نے کتابیں کھنگالیں۔ علم کے صحرائی ذرّوں کو چھان ڈالا۔ لیکن فلسفہ کہاں تھا؟ کسی نے کہا یہ علوم کے تاروں سے اپنی تبا بنتا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں اگر تار ہی کچے ہوں تو تبا کیسی ہوگی؟ کوئی کہتا ہے یہ کل کی روشنی میں جزو کا مطالعہ کرتا ہے۔ میں ہنس دیتا ہوں اور لفظ روشنی کاٹ کر سایہ لکھ دیتا ہوں۔۔۔"

"تحریک چلتی چلتی چل پڑی۔" (صفحہ ۱۴) "چلتے چلتے" لکھنا چاہیئے تھا۔ "اور ہم تفکر کے توسل سے روح پر مرہم لگاتے ہیں۔" (صفحہ ۱۸) یہ جملہ بالکل نوشتقوں کا "ترجمہ" سا معلوم ہوتا ہے۔ "روح پر مرہم لگائے جاتے ہیں۔" یہ پہلی بار ہمارے علم میں آیا ہے ـــ توبہ! "اس نے عائشہ کو چوٹی سے پکڑا۔" (صفحہ ۴۶) یہ غلطی عام ہوتی جا رہی ہے۔ کہنا یہ چاہیئے تھا۔ "اس نے عائشہ کی چوٹی پکڑی۔" (صفحہ ۶۳) "اعترافِ شکست سے میں نے کہا۔" "سے" نے جملہ کو بے ربط بنا دیا۔ "میں نے اعترافِ شکست کرتے ہوئے کہا۔" لکھنا تھا۔ (صفحہ ۷۵) "جہاں سے مختلف راستے پھوٹتے تھے۔" راستے کے لئے "پھٹنا" بولتے ہیں۔ "پھوٹنا" چشمہ کے لئے آتا ہے۔

(صفحہ ۸۷) "اس نے دیہاتی کو بازو سے پکڑا۔" "دیہاتی کا بازو پکڑا۔" صحیح ہے۔ (صفحہ ۹۳) "سان و گمان" اور "تال و تناسب" میں "واؤ" عطف غلط استعمال ہوا ہے۔ (صفحہ ۱۱۷) "اور کسی کے پھبن سے اس کی نیت تاڑ لیتا ہوں۔" جانے افسانہ نگار کہنا کیا چاہتا ہے۔ "پھبن" نے سارے جملہ کو مہمل بنا دیا۔ (صفحہ ۱۵۰) "وہ سلام کر کے رسوئی میں گئی۔" ممکن ہے پنجاب کے بعض مسلمان گھرانوں میں "رسوئی" بولا جاتا ہو۔ مگر یوپی میں تو "رسوئی" ہندوؤں کی زبان ہے مسلمان "باورچی خانہ" بولتے ہیں۔

"اس نے زعفرانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔" (صفحہ ۱۵۳) "وہ زعفرانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔" لکھنا تھا۔ "بیاہ سے پہلے صفیہ ہی نے گھر کا بار اٹھایا ہوا تھا۔" (صفحہ ۱۵۷) "بیاہ سے پہلے صفیہ ہی گھر کا بار اٹھائے ہوئے تھی۔" تحریر کرنا تھا۔ "اپنے محاذ کو مت چھوڑو۔" (صفحہ ۲۲۹) یہ گاؤں کے چودھری کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔ گاؤں کا چودھری "محاذ" قیامت تک نہیں بول سکتا۔ "مورچہ" بولے گا۔ "میں الم کے جہنم میں لٹکا ہوا تھا۔" (صفحہ ۲۵۲) یہ جملہ کتنا غیر ادیبانہ ہے۔ "اس کا چہرہ گندم کے دانے کی طرح سنہری اور دلربا نظر آنے لگا۔" (صفحہ ۲۸۲) دانہ گندم کی دلربائی اور پھر اس کی خوبصورت چہرے سے تشبیہ ایک عجیب تاثر اور نرالا مشاہدہ ہے؟ "مستری چراغ تیشہ لئے لکڑی

چھیل رہا تھا۔" (صفحہ ۲۲۴)، گر پنجاب میں "بسولے" کو تیشہ بولتے ہیں اور یہ وہاں کا روز مرہ ہے تو درست ہے۔ "ہماری تو آنکھیں بھی راہ دیکھتے دیکھتے پک گئیں۔" (صفحہ ۱۵۳)، "تھک گئیں"۔ "کہنا تھا"۔ "بکنا" کا توں کے لئے بولتے ہیں۔

یک دو، فسانوں میں ہیرو کے فکری انقلاب کے لئے کسی قوی محرک کو پیش نہیں کیا اور کہیں کہیں، فسانہ واقعات کی یک ڈائری بن کر رہ گیا ہے۔ ان خامیوں کے باوجود جیلانی صاحب کی افسانہ نگاری کے کمال سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا "فسانہ نگار پیدا ہونے میں شاعر کی طرح!" ان کے قلم میں روانی نہیں جزئیات کی عکاسی کی قوت بھی ہے۔ جیلانی اگر "توبہ" کے انداز کو ترقی دیں تو ان کی افسانہ نگاری میں انفرادیت پیدا ہو جائے گی۔

اسلامی کیلنڈر

ضروری تصحیح

۱۰ جنوری ۵۵ء کے "فاران" میں "نبی اور نبی کے قول و عمل کا مقام" جو مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس میں حسب ذیل تصحیح ضروری ہے:-

صفحہ ۲۱۔ سطر ۱۴۔ "احادیث کو سرکاری طور پر کتابی شکل میں سب سے پہلے حضرت عمرؒ ابن عبد العزیز نے اپنے گورنر مدینہ امام ابوبکرؒ ابن حزم سے جمع کرایا تھا۔"

صفحہ ۲۲۔ سطر ۱۲ تا ۱۶۔ حضرت ابوہریرہؓ فتح مکہ سے پہلے کے مسلمان ہیں۔ اور نہایت برگزیدہ صحابی ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے کے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے بعد کے مسلمانوں پر فوقیت دی ہے۔ لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ لیکن لازمی نہیں تھا کہ فتح مکہ سے پہلے کے تمام صحابی حضرت عبد اللہ ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ کے برابر فقیہہ بھی ہوتے۔

صفحہ ۳۳۔ سطر ۲۱۔ واضعین حدیث میں صرف منافق اور شریر لوگ ہی نہیں تھے۔ نادان دوست بھی تھے۔

فروری ۵۵ء کے "فاران" میں ماہرالقادری کی غزل کا مطلع غلط چھپ گیا۔ اصل شعر یہ ہے:-

جس دل میں خدا کا خوف رہے باطل سے ہراساں کیا ہوگا
جو موت کو خود لبیک کہے وہ حق سے گریزاں کیا ہوگا

مطبوعہ ادبی پریس۔ رابسن روڈ۔ کراچی ——— پرنٹر و پبلشر۔ مسرور حسین